پاکستان کی سیاسی تاریخ 12

"اسلامی بلاک" کے نام پر
پاکستان امریکہ کا غلام کیسے بنا؟

زاہد چودھری

تکمیل و ترتیب: حسن جعفر زیدی

ادارہ مطالعۂ تاریخ

پاکستان کی سیاسی تاریخ

جلد 12

''اسلامی بلاک'' کے نام پر

پاکستان امریکہ کا غلام کیسے بنا؟

زاہد چودھری

تکمیل وترتیب:

حسن جعفر زیدی

ادارہ مطالعہ تاریخ

فہرست

باب 2: لیاقت علی کا دورہ برطانیہ اور سوویت یونین کے خلاف ہر قسم کے اسلامی وغیر اسلامی بلاک بنانے کے سلسلے میں تعاون کی یقین دہانی

باب4: لیاقت کا دورہ برطانیہ و مشرق وسطیٰ، اینگلو۔امریکی سامراج کے حق میں اسلامی بلاک وضع کرنے کی ابتدائی کوشش

باب 6: خلیق الزماں کا دورہ مشرق وسطیٰ برائے ''اسلامستان'' برطانوی سازش کا بھانڈا جو لندن کے چوراہے میں پھوٹا

باب 8: لیاقت کا دورہ امریکہ اور جنگ کوریا میں اس کا امریکی پٹھو کا کردار

باب 9: مسئلہ نہر سویز اور لیاقت کی برطانیہ نواز پالیسی، کمیونزم کے خلاف مذہب کے استعمال میں اضافہ

باب 10: لیاقت کی سامراج نواز خارجہ پالیسی اور ملک میں اسلام فروشی کا کاروبار

دیباچہ ایڈیشن دوم

9/11 کے بعد امریکہ اور اس کی حلیف مغربی طاقتوں کی القاعدہ، طالبان اور اسی قبیل کی دیگر اسلامی انتہا پسند تنظیموں کے خلاف لڑائی جاری ہے جسے ''دہشت کے خلاف جنگ'' کا نام دیا گیا ہے۔ پاکستان بھی اس جنگ میں شریک ہے اور اس کے ہزارہا معصوم نہتے شہریوں کے علاوہ کثیر تعداد میں پولیس اور فوج کے افسر اور جوان شہید ہو چکے ہیں جبکہ مالی نقصان کا تخمینہ اربوں روپے تک پہنچ جاتا ہے۔

بعض حلقے جو اسلامی انتہا پسندوں سے ہمدردی رکھتے ہیں یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ مغرب اور اسلام کی جنگ ازلی و ابدی ہے، یہ ہمیشہ سے جاری ہے اور مغربی طاقتوں کی مکمل شکست اور پوری دنیا پر اسلام کے مکمل غلبہ تک جاری رہے گی۔ حالانکہ ابھی کل کی بات ہے کہ افغانستان کے اسلامی جہاد کو مغربی طاقتوں کی جانب سے نہ صرف ہر قسم کی فوجی اور مالی امدادی جارہی تھی بلکہ مغربی ذرائع ابلاغ، افغان جہادیوں کو حریت پسند مجاہدین قرار دیتے ہوئے ان کے کارناموں اور کامیابیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا کرتے تھے۔ پاکستان کی اسٹبلشمنٹ اور مذہبی جماعتیں امریکہ اور مغربی طاقتوں کی دوستی اور حمایت کا دم بھرتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ معاملہ صرف افغان جہاد سے شروع نہیں ہوا تھا، جنگ عظیم دوم کے خاتمہ کے بعد امریکہ اور اس کی حلیف مغربی طاقتوں نے کمیونسٹ بلاک کی حصار بندی کے لئے مذہب کو بطور نظریاتی ہتھیار استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، خاص طور سے ایشیا اور مشرق وسطیٰ کے مسلمان ممالک میں اپنے پٹھو حکمرانوں اور مذہبی جماعتوں کی مدد سے اسلام اور ''اسلامی بلاک'' کے نام پر یہ کام شروع کر دیا تھا۔ نوزائیدہ پاکستان کے حکمران طبقے، سول بیوروکریسی اور فوجی اسٹبلشمنٹ جو اپنے برطانوی آقاؤں کے فرمانبردار تھے، شروع دن سے ہی اینگلو۔امریکی سامراج کے اس ایجنڈے کا حصہ بن گئے۔ شروع شروع میں ان میں سے کچھ لوگ مذہب کو ملوث کئے بغیر صرف جمہوریت، بشری حقوق اور آزادیوں کے حوالے سے یہ کام انجام دینا چاہتے تھے لیکن کچھ عرصہ بعد وہ بھی اسی وسیع ایجنڈے کا حصہ بن گئے جس میں

اسلام کے نام پر مسلمان ملکوں کا کمیونسٹ بلاک کے خلاف متحدہ ''اسلامی بلاک'' یا ''اسلامستان'' بنانے کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔ پان اسلام ازم کا تصور پہلے سے موجود تھا جس پر مُلّا جمال الدین افغانی، تحریک خلافت کے علی برادران و دیگر خلافتی رہنما اور علامہ اقبال کام کر چکے تھے۔ یہ مفروضہ مہیا کر دیا گیا تھا کہ اگر تمام مسلم ممالک اسلامی اُمہ کے نام پر متحد ہو جائیں تو یہ دنیا کی بہت بڑی طاقت بن جائیں گے اور کمیونسٹ بلاک اور سرمایہ داری بلاک دونوں پر غلبہ پا لیں گے۔ لیکن اصل حقیقت یہ تھی کہ ان تمام مسلمان ملکوں کے حکمران یا تو بادشاہ تھے، یا شیوخ تھے یا جاگیردار اور سردار تھے جن کے مفادات فطری طور پر مغربی طاقتوں کیساتھ وابستہ تھے، یہ مسلمان ممالک سائنسی اور صنعتی میدان میں بہت پیچھے تھے اور ان کا تمام تر دار و مدار مغربی ممالک پر تھا۔ لہذا جب مسلمان رہنما ''اسلامی بلاک'' کی بات کرتے تھے تو ان کو مغربی ممالک کی پشت پناہی حاصل ہوتی تھی۔ یہ بلاک انہی کے زیر نگیں تھا جسے وہ اپنی صوابدید کے مطابق استعمال کر سکتے تھے۔

زیر نظر کتاب میں پاکستان کے ابتدائی دور کا جائزہ لیا گیا ہے جس میں پاکستان کے حکمران طبقوں، سول و فوجی اسٹیبلشمنٹ نے ''اسلامی بلاک'' کے نام پر ملک کو مکمل طور پر امریکی غلامی میں دے دیا تھا۔ انہوں نے خود کمیونسٹ بلاک کے خلاف فرنٹ لائن کے طور پر خدمات پیش کیں اور انتہائی تابعداری کے ساتھ اپنی سرزمین پر انہیں فوجی اڈے بھی مہیا کئے۔ سوویت یونین کی جانب سے دورے کی دعوت کو نظر انداز کر کے امریکیوں سے وفاداری کا دائمی رشتہ اُستوار کیا۔ کوریا کی جنگ میں غیر جانب دار رہنے کی بجائے سب سے آگے بڑھ کر اپنی خدمات امریکہ کو پیش کیں جبکہ کشمیر اور فلسطین پر مغربی سامراجیوں نے ہمیشہ مکمل سرد مہری کا مظاہرہ کیا تھا۔

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن 1996ء میں شائع ہوا تو سوویت یونین کا سقوط ہو چکا تھا اور دنیا دو سپر طاقتوں کی کشمکش سے نکل کر یک قطبی ہو گئی تھی۔ نئے ورلڈ آرڈر کا سرغنہ امریکہ دنیا پر بلا شرکت غیرے غلبہ حاصل کر چکا تھا۔ مگر اس غلبہ کو مستحکم کرنے کے لئے اسے ایک دشمن کی ضرورت تھی جس کی کوئی سرحدیں نہ ہوں جس کی بیخ کنی کرنے کے بہانے وہ دنیا کے ہر کونے میں فوج کشی کر سکے۔ القاعدہ اور طالبان نے اس ضرورت کو پورا کر دیا۔ پاکستان جو امریکہ کی دائمی غلامی میں تھا، اپنے آقا کی پیروی میں راتوں رات یوٹرن لے چکا تھا۔

اس موضوع پر کہ ''اسلامی بلاک'' کے نام پر پاکستان امریکہ کا غلام کیسے بنا؟ کوئی اور کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔ آج کے تناظر میں اس پس منظر کو جاننے اور سمجھنے کیلئے اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن پیش خدمت ہے۔

حسن جعفر زیدی

لاہور

فروری 2014ء

دیباچہ ایڈیشن اوّل

پاکستان کی سیاسی تاریخ کے اس سلسلہ کی یہ آخری جلد ہے۔ بارہ جلدوں پر مشتمل اس سلسلہ میں ''پاکستان کیسے بنا؟'' سے لے کر ''پاکستان امریکہ کا غلام کیسے بنا؟'' تک کی داستان، پاکستان کے داخلی اور خارجی تضادات اور ان کے پس پشت محرکات کے پس منظر میں بیان کی گئی ہے۔ اس طرح زیر نظر جلد کو گزشتہ گیارہ جلدوں کے تناظر میں رکھ کر دیکھا جاسکتا ہے۔

دوسری عالمی جنگ کے خاتمہ پر دنیا جن دو قوتوں میں بٹ گئی تھی ان میں ایک جانب سوویت یونین اور ایشیا کے نقشے پر ابھرتے ہوئے کمیونسٹ ممالک اور مشرق بعید سے مشرق وسطیٰ تک انقلابی عوامی سامراج دشمن تحریکوں کا دور دورہ تھا تو دوسری جانب نئی عالمی طاقت امریکہ اور زوال پذیر برطانوی اور دیگر یورپی سامراجی ممالک کا بلاک تھا۔ اس بین الاقوامی تناظر میں انگریز برصغیر کو تقسیم کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ اینگلو امریکی سامراج کی طرف سے کمیونسٹ قوتوں کے گرد حصار قائم کرنے کی حکمت عملی میں متحدہ ہندوستان کے وجود کو برقرار رکھنا زیادہ مؤثر اور مفید گردانا جارہا تھا۔ عالمی جنگ نے انگریزوں کا جس بری طرح معاشی دیوالیہ کیا تھا، اس کے بعد وہ جلد از جلد برصغیر کو چھوڑنا چاہتے تھے۔ برصغیر کے ارد گرد پر تشدد سامراج دشمن لہر کسی بھی وقت برصغیر کے اندر ابھرتی ہوئی طبقاتی کشمکش کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی تھی۔ ان حالات میں انگریز چاہتے تھے کہ وہ یہاں کی اعتدال پسند قیادت کو اقتدار سونپ کر جہاں تک ممکن ہو اپنے مفادات کو محفوظ کر کے یہاں سے رخصت ہو جائیں۔ اس اعتدال پسند قیادت میں گاندھی، نہرو، پٹیل اور جناح جیسے افراد موجود تھے جن کو اپنے اپنے فرقے کی وسیع عوامی حمایت حاصل تھی۔ ادھر برصغیر

میں کارفرما فرقہ وارانہ تضاد کا لاوا پھٹ پڑا تھا جس کی جڑیں صدیوں پرانے ہندو۔ مسلم تضاد میں پیوست تھیں۔ فرقہ وارانہ فسادات، تشدد، بلوے اور قتل وغارت گری کی اس صورت حال میں انگریزوں نے مجبوراً برصغیر کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے اکثریتی یونٹوں میں تقسیم کر کے وہاں کی اعتدال پسند قیادت کو اقتدار منتقل کر دیا اور یوں ہندوستان اور پاکستان دو ملک وجود میں آ گئے۔ ان حالات کا جائزہ پہلی دو جلدوں میں بالتفصیل لیا جا چکا ہے۔

نوزائیدہ پاکستان کو شروع میں ہی بیشتر خارجی و داخلی مسائل کا سامنا تھا۔ ان میں اولین خارجی مسئلہ ہندوستان کے حکمرانوں کی توسیع پسندی اور مسئلہ کشمیر کے نتیجہ میں پاک۔ ہند بین المملکتی تنازعہ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ انڈین نیشنل کانگرس اور برطانوی وائسرائے ماؤنٹ بیٹن نے اپنے اپنے مفادات کی خاطر برصغیر کی تقسیم ملی بھگت کے ساتھ اس انداز سے کرائی تھی کہ ایک کٹا پھٹا ناقابل عمل پاکستان وجود میں آ جائے جسے تھوڑے عرصہ کے اندر ہندوستانی حکمران حیدرآباد، جوناگڑھ اور دوسری ہندوستانی ریاستوں کی طرح ہندوستان کے اندر ضم کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ تیسری جلد میں اس قومی تضاد اور مسئلہ کشمیر کا احاطہ کیا گیا ہے۔

داخلی طور پر پاکستان پہلے ہی روز سے جن تضادات سے دوچار تھا ان میں حکمران عناصر کی باہمی رقابت، بالادست قومیتوں کی باہمی کشمکش اور محکوم قومیتوں کے اپنے حقوق کی خاطر بالادست قومیتوں کے خلاف تضادات شامل تھے۔ گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح اپنے بورژوا پس منظر کی وجہ سے اور وزیراعظم لیاقت علی خان اپنے جاگیردارانہ پس منظر کی بدولت قیام پاکستان سے بھی پہلے سے باہمی مناقشت رکھتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد ان کے باہمی تضاد کے ساتھ ایک اور تضاد جڑ گیا اور وہ تھا اردو بولنے والے مہاجرین اور پنجابی درمیانہ طبقہ کے شاونسٹوں کے مابین تضاد۔ اردو بولنے والے مہاجرین کا درمیانہ اور جاگیردار طبقہ، یو۔ پی سے آ کر بیوروکریسی کے اردو بولنے والے اعلیٰ افسروں مثلاً ہاشم رضا اور احمد علی جیسے عناصر کی مدد سے خود لیاقت علی خان کی زیر سرپرستی ملازمتوں، جائیدادوں اور تجارتی پرمٹوں پر قابض ہو رہا تھا جبکہ دوسری طرف پنجابی درمیانہ طبقہ، بیوروکریسی کے پنجابی افسران اعلیٰ اور وزارتی کابینہ کے پنجابی ارکان یعنی غلام محمد، مشتاق احمد گورمانی، چودھری محمد علی اور پنجابی فوج کے بل بوتے پر تلئیروں کی بڑھتی ہوئی بالادستی کو لگام دینے اور خود اپنی بالادستی قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس پنجابی

درمیانہ طبقہ نے اپنی شاونزم پر پردہ ڈالنے کے لئے قائداعظم جناح اور لیاقت علی خان کے باہمی تضاد کا فائدہ اٹھایا اور اپنی یکجہتی قائداعظم جناح اور بعدازاں مس فاطمہ جناح کے ساتھ استوار کر لی۔ یہ تضادات لیاقت علی خان کے قتل پر منتج ہوئے۔ یہ داستان چوتھی جلد میں قلمبند کر دی گئی ہے۔

پانچویں جلد میں مسلم پنجابی درمیانہ طبقہ کی بے لگام شاونزم کے ارتقا کا جائزہ لیا گیا ہے جو پنجاب پر انگریزوں کے قبضے کے بعد انگریزوں کی طرف سے پنجاب کو فوجی اہمیت کے اعتبار سے نوآباد (Colonize) کرنے کے عمل کے دوران پیدا ہوا لیکن ہندو مسلم مسابقت میں تاریخی وجوہ کی بدولت ہندوؤں سے آگے نہ نکل سکا۔ قیام پاکستان کے بعد وہ ہندوؤں اور انگریزوں کی خالی کردہ تمام پوزیشنوں پر بلاشرکت غیرے قابض ہونا چاہتا تھا جبکہ ادھر اردو بولنے والے مہاجر بھی اسی داؤ میں تھے۔ اس لئے اقتدار کے اعلیٰ ایوانوں سے لے کر چھوٹی ملازمتوں تک اور جائیدادوں کی الاٹ منٹوں اور پرمٹوں کے حصول کی تگ ودو میں یہ دونوں قومیتیں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں لگ گئیں۔ اس نفسانفسی کے عالم میں بنگالیوں، سندھیوں، پٹھانوں اور بلوچوں کو بالکل نظرانداز کر دیا گیا۔ بلکہ ان کے جائز سیاسی، معاشی اور ثقافتی حقوق کو تلف کیا گیا۔ انہوں نے بھی اس تمنا میں تحریک پاکستان میں حصہ لیا تھا کہ ہندوؤں اور انگریزوں کی بالادستی سے چھٹکارا ملنے کے بعد وہ اپنی تقدیر کے مالک خود ہوں گے اور انہیں بھی سیاسی، معاشی اور ثقافتی محرومی سے نجات ملے گی اور نئے ملک میں ترقی کے جتنے مواقع پیدا ہوں گے ان میں انہیں ان کا جائز حصہ ملے گا۔ لیکن ان کی تمام امیدوں پر تلیئر اور پنجابی بالادست قوتوں نے پانی پھیر دیا اور وہ ایک قسم کے آقاؤں کی گرفت سے نکل کر ایک اور قسم کے آقاؤں کی محکومی میں چلے گئے۔ قیام پاکستان کی خاطر بنگالیوں، سندھیوں، پختونوں اور بلوچوں نے کتنا اہم کردار ادا کیا اور بعدازاں ان کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا، اس ظلم وزیادتی کی داستان چھٹی جلد (سندھ)، ساتویں جلد (بلوچستان)، آٹھویں جلد (پختون)، نویں اور دسویں جلد (بنگال) میں بالتفصیل بیان کر دی گئی ہے۔

پاکستان کے حکمرانوں نے مذکورہ بالا خارجی اور داخلی تضادات کو حل کرنے کے لئے ٹھوس اور موثر اقدامات اٹھانے کی بجائے محض کھوکھلے نعروں کا سہارا لیا کیونکہ وہ ان تضادات کو وسیع تر عوام الناس کے حق میں حل کرنا نہیں چاہتے تھے، وہ صرف اپنے مفادات اور لوٹ مار کو

تحفظ دینا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لئے عوام الناس کے مذہبی جذبات سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا گیا اور ''اسلامی نظام''، ''اسلامی اتحاد'' اور ''اسلامی بلاک'' کے قیام کے خواب دکھائے گئے۔ جب عوام الناس اپنے لئے جمہوری حقوق، بنیادی انسانی حقوق، آئینی اور معاشی تحفظ کے مطالبات کرتے تو ان سے کہا جاتا کہ پاکستان اسلامی نظام کی تجربہ گاہ کے طور پر قائم ہوا ہے، ہمارا آئین کوئی معمولی آئین نہیں جو اتنی جلدی تیار ہو جائے، ہمیں دنیا کے سامنے ایک مثالی اسلامی آئین پیش کرنا ہے، اس لئے انتظار کرو۔ جب بنگالی، سندھی، پختون اور بلوچ اپنے سیاسی، معاشی اور ثقافتی حقوق کا مطالبہ کرتے تو ان پر ففتھ کالمنسٹ، کمیونسٹ اور بھارتی ایجنٹ وغیرہ کے الزامات عائد کر دیئے جاتے اور کہا جاتا کہ پاکستان اسلام کے نام پر قائم ہوا ہے جس میں کوئی بنگالی، سندھی، پنجابی، بلوچی اور پٹھان نہیں ہے، بلکہ سب مسلمان ہیں۔ گویا تم چونکہ مسلمان ہو اس لئے ملٹیر اور پنجابی بیوروکریسی اور پنجابی فوج کی غلامی کو اسلام کے نام پر قبول کرو! اپنے لئے فوج اور دوسری ملازمتوں میں حصہ مت مانگو، اپنے لئے جمہوری اداروں میں حصہ اور زراعت، صنعت اور تجارت میں اپنے جائز حصہ کا مطالبہ ہرگز نہ کرو اور نہ اپنی زبان اور ثقافت کی بات کرو۔ یہ سب باتیں غیر اسلامی ہیں۔ اچھے مسلمان بنو، اردو بولو اور ہر قسم کا ظلم و زیادتی برداشت کرو کہ یہی نظریہ پاکستان ہے۔ حکمرانوں کی اس کھوکھلی نعرے بازی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ملاؤں کی مذہبی جماعتوں کی ایک پوری کھیپ بھی میدان میں آ گئی۔ ان میں وہ مذہبی جماعتیں اور ملا بھی شامل تھے جو قیام پاکستان کے شدید مخالفوں میں تھے، پاکستان کو ناپاکستان، قائداعظم کو کافر اعظم اور مسلم لیگ کے کارکنوں اور حامیوں کو اسلام سے بے بہرہ قرار دیا کرتے تھے۔ ملک کے طول و عرض میں ان مذہبی جماعتوں اور حکمرانوں نے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر اسلام اور اسلامی نظام کے نعرے لگائے، مگر اصل مسائل جوں کے توں رہے۔ عوام کو نہ آئین ملا، نہ جمہوری حقوق اور نہ معاشی تحفظ! ابتدائی برسوں تک کی یہ المناک داستان گیارہویں جلد میں بیان کی گئی ہے۔

دوسرا کھوکھلا نعرہ جسے بڑی شدومد کے ساتھ استعمال کیا گیا اور جو کہ زیر نظر جلد کا موضوع ہے وہ ''اتحاد عالم اسلام'' اور ''اسلامی بلاک'' کے قیام کا نعرہ تھا۔ کہا گیا کہ چونکہ پاکستان سب سے بڑا اسلامی ملک ہے اور یہ اسلام کے نام پر قائم ہوا ہے اس لئے یہ ''اسلامی بلاک'' کی

قیادت کرے گا اور جب سارا عالم اسلام پاکستان کی قیادت میں متحد ہو جائے گا تو ہمارے سارے مسائل حل ہو جائیں گے، ہم ایک ایسی طاقت بن جائیں گے جس سے دونوں بڑی عالمی طاقتیں یعنی سوویت یونین اور امریکہ بھی خوف کھائیں گی۔ اس قسم کی خیالی دنیا میں عموماً درمیانہ طبقہ کے پڑھے لکھے افراد شامل تھے۔ جن کے یہ تصورات اسلامی تاریخی ناولوں، اسلامی تاریخی فلموں، جوشیلی نظموں اور مجمع باز مولویوں کی لچھے دار تقریروں پر استوار ہوئے تھے۔ یہ لوگ عالمی حالات، دوسری عالمگیر جنگ کے بعد دنیا میں طاقتوں کے نئے توازن، مسلمان ممالک کے حکمرانوں کی وابستگیوں کے بارے میں یا تو ناواقف تھے اور یا خود کو اور عوام کو دھوکہ دے رہے تھے۔ وہ جب عالم اسلام کے اتحاد اور اس کے ایک تیسری عالمی طاقت کے طور پر ابھرنے کا خواب دیکھتے تھے تو یہ بھول جاتے تھے کہ مندرجہ ذیل تلخ حقیقتوں کی موجودگی میں عالم اسلام کے اتحاد کا خواب محض ایک سہانا سپنا ہے اس کی تعبیر کسی صورت ممکن نہیں:

1۔ کم وبیش تمام مسلمان ممالک کے حکمران یا تو برطانیہ کے طفیلی تھے یا امریکہ کے۔ ان میں سے بیشتر کی حیثیت محض کٹھ پتلی کی تھی۔

2۔ اگرچہ مشرق وسطیٰ پر برطانیہ کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی لیکن وہ اپنا حلقہ اثر برقرار رکھنے کی پوری کوشش کر رہا تھا جبکہ نئی عالمی طاقت امریکہ اس خطے سے برطانیہ کو بے دخل کر کے سارے علاقے پر اپنا غلبہ مسلط کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے مشرق وسطیٰ میں حلقہ اثر کے سوال پر پرانے سامراجی برطانیہ اور نئے سامراجی امریکہ کے مابین تضاد کارفرما تھا جو اس خطے میں برطانیہ کے طفیلی فرمانرواؤں اور امریکہ کے طفیلی فرمانرواؤں کے مابین کشمکش کی شکل میں بھی ظاہر ہوتا رہتا تھا۔

3۔ عرب وعجم کا تاریخی تضاد بھی کارفرما تھا۔ عرب ممالک، غیر عرب ممالک کے ساتھ بلاک بنانے پر آمادہ نہ تھے جبکہ یہی رویہ ترکی اور ایران کا عرب ممالک کے بارے میں تھا۔

4۔ عالم اسلام کی قیادت پر بھی کسی قسم کا اتفاق رائے ممکن نہیں تھا۔ ترکی سمجھتا تھا کہ وہ خلافت عثمانیہ کا وارث ہے اس لئے قیادت کا وہ حقدار ہے۔ ایران کا شہنشاہ خود کو ویسے ہی اس خطہ کا سب سے برتر حکمران سمجھتا تھا اور کسی دوسرے کی قیادت ماننے کو

تیار نہ تھا۔ مصر خود کو عربوں میں سب سے زیادہ مہذب، ترقی یافتہ اور عالم فاضل گردانتا تھا اس لئے عالم اسلام کی قیادت کا خود کو سب سے زیادہ حقدار سمجھتا تھا۔ سعودی عرب کا فرمانروا چونکہ حرمین شریفین کا متولی بھی تھا اس لئے وہ خود کو اسلامی دنیا کی قیادت کا وارث حقیقی سمجھتا تھا، جبکہ والی شرق اردن امیر عبداللہ چونکہ شریف مکہ کی اولاد تھا اور حجاز پر آل سعود کے قبضے کو ناجائز قرار دیتے ہوئے اس پر اپنی بازیابی کا دعویٰ کرتا تھا اس لئے وہ کسی صورت شاہ سعود کو قائد ماننے کو تیار نہیں تھا۔ ان حالات میں نوزائیدہ پاکستان بھی اپنی گردن اونچی کر کے دکھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں مسلم دنیا کا سب سے بڑا ملک ہوں، سب میری قیادت مان لو، مگر کسی نے اسے درخور اعتنا نہ سمجھا۔ عرب عوام الناس میں ویسے بھی عام طور پر یہ تاثر دیا جاتا تھا کہ انگریزوں نے برصغیر کو اپنے مفاد کی خاطر اسی طرح تقسیم کیا ہے جیسے فلسطین کو اسرائیل اور اردن میں اور وادی نیل کو مصر اور سوڈان میں تقسیم کر دیا ہے اور یہ کہ پاکستان کی حیثیت محض ایک برطانوی طفیلی کی سی ہے۔

5۔ بیشتر مسلم ممالک کے فرمانروا شہنشاہ، بادشاہ، امیر یا سلطان تھے اور پاکستان کی طرح ان تمام ملکوں میں قرون وسطیٰ کا پس ماندہ جاگیرداری اور قبائلی معاشی و معاشرتی نظام قائم و دائم تھا اور اسے تبدیل کرنے کی بجائے سارا زور اسے برقرار رکھنے پر لگایا جا رہا تھا۔ گویا ترقی اور تبدیلی کا ہر وہ راستہ بند کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی جو جدید دور کے تقاضوں کی منزل کی طرف جاتا تھا۔

6۔ یہ ایک تاریخی حقیقت تھی کہ اسلامی تاریخ میں صرف ابتدائی چند برس چھوڑ کر چودہ سو برس میں کبھی کوئی دور ایسا نہیں آیا تھا جب سارا عالم اسلام متحد رہا تھا۔ عثمانی ترک خلیفہ سلطان عبدالحمید نے محض ایک سیاسی حربہ کے طور پر کچھ عرصہ کے لئے پان اسلام ازم کے نعرہ کو استعمال کیا تھا مگر پھر اس نعرہ کے حوالہ سے ابھرنے والی شخصیت جمال الدین افغانی کے ساتھ اس کا اختلاف ہو گیا تھا اور اس نے افغانی کو نظر بند کر دیا تھا جہاں نظر بندی کی حالت میں ہی اسے مروا دیا گیا تھا۔

ان حالات میں نہ تو ''عالم اسلام کا اتحاد'' اور نہ ہی ''اسلامی بلاک'' وجود میں آ سکتا تھا

اور نہ ہی وجود میں آیا، لیکن پاکستان کے حکمرانوں نے ان نعروں کی آڑ میں پاکستان کو امریکی سامراج کی جھولی میں ضرور دھکیل دیا تھا۔ اینگلو امریکی سامراج اس وقت سوویت یونین اور کمیونسٹ چین کے گرد حصار قائم کر رہا تھا اور اپنے حامی اور طفیلی ملکوں کو مختلف دفاعی معاہدوں کی زنجیر میں باندھ رہا تھا۔ یہ زنجیر یورپ میں معاہدہ اطلانٹک (نیٹو) سے شروع ہوئی تھی، یونان اور ترکی تک اس میں جکڑے جا چکے تھے، اس کے بعد مشرق وسطیٰ اور جنوبی ایشیا کو اس لڑی میں پرویا جانا تھا جبکہ آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور بحرالکاہل کے دوسرے ممالک کے باہمی دفاعی معاہدے بھی وجود میں آ چکے تھے۔ پاکستان کے حکمرانوں نے ایک بات روز اول سے طے کر دی تھی کہ پاکستان ہر حال میں سوویت یونین کے مخالف کیمپ میں رہے گا حالانکہ اس وقت تک سوویت یونین نے پاکستان یا برصغیر کے مسلمانوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ عالم اسلام کو بھی سوویت یونین کی جانب سے کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا تھا سوائے اس کے کہ وسط ایشیا کی چھوٹی چھوٹی مسلمان ریاستیں جو زار کے زمانے سے روس کے قبضے میں چلی آ رہی تھیں، وہ اس کے زیر تسلط تھیں۔ وہاں قرون وسطیٰ کے بالا دست خان اور ان کے پس ماندہ نظام ختم کر کے ان کی جگہ جدید سوشلسٹ معیشت کی بنیاد پر ترقی کا کام ہو رہا تھا لیکن دوسری جانب انگریزوں اور دوسرے یورپی سامراجیوں نے گزشتہ دو اڑھائی سو سال میں عالم اسلام کو جو نقصانات پہنچائے تھے ان کی فہرست بہت طویل تھی۔ انہوں نے مسلمانوں کی بڑی بڑی سلطنتیں زمین بوس کر ڈالی تھیں، پورے عالم اسلام کو اپنی غلامی کی ایسی زنجیروں میں جکڑا تھا کہ یہ غلامی کئی نسلوں پر پھیلتی چلی گئی تھی، حال میں انہوں نے عالم اسلام کے عین بیچ میں اسرائیل کی یہودی مملکت تشکیل دے دی تھی اور برصغیر کو تقسیم کرتے وقت برطانوی وائسرائے ماؤنٹ بیٹن نے اور بے انصافیوں کے علاوہ کشمیر کے مسلمانوں کو بھارت کی غلامی میں دھکیل دیا تھا۔ مگر پاکستان کے حکمرانوں کا فیصلہ یہ تھا کہ وہ سوویت یونین کے ساتھ بہرصورت دشمنی کا رویہ رکھیں گے اور اینگلو امریکی سامراجیوں سے وفاداری کا دم بھرتے رہیں گے۔ خود قائداعظم جناح نے امریکی اخبار نویس مارگریٹ بورک وائٹ سے انٹرویو کے دوران یہ کہہ دیا تھا کہ ہم روس کی سرحد پر ہیں، امریکہ خود ہی ہماری مالی اور فوجی امداد کرے گا اور پھر وزیراعظم لیاقت علی خان اور اس کی انتظامیہ کے کل پرزے غلام محمد، سر ظفر اللہ خان، اکرام اللہ، چودھری محمد علی، اسکندر مرزا اور محمد ایوب خان اپنے اینگلو امریکی

آقاؤں کے اشاروں پر ناچتے رہے۔ عالمی طاقتوں میں سب سے پہلے سوویت یونین نے لیاقت علی کو اپنے ہاں دورہ کی دعوت دی جبکہ امریکہ نے سب سے پہلے بھارتی وزیر اعظم جواہر لال نہرو کو دعوت دی جو اس نے قبول کی اور وہاں کا دورہ کیا۔ لیاقت علی نے سوویت یونین کی دعوت قبول کرنے اور وہاں دورہ کرنے کے بارے میں ٹال مٹول سے کام لیا اور اپنے اینگلو امریکی آقاؤں کی طرف دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ اسے دورۂ امریکہ کی دعوت مل گئی اور وہ وہاں دورہ کرنے چلا گیا۔ سوویت یونین کا دورہ پھر بھی نہ کیا۔ سوویت یونین نے اپنا تجارتی وفد کراچی بھیجا جو دو تین ماہ تک وہیں بیٹھا رہا لیکن حکومت پاکستان کے کسی ذمہ دار فرد نے اس کے ساتھ بات چیت نہ کی۔ کوریا میں جنگ شروع ہوئی تو بھارت اور بیشتر مسلمان ممالک نے غیر جانبداری کا رویہ اختیار کیا لیکن لیاقت علی خان نے، جو ان دنوں امریکہ میں تھا، اپنی کابینہ اور پارلیمنٹ سے مشورہ کئے بغیر، امریکہ کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ انہی دنوں ایران کے عوام برطانیہ کی اینگلو ایرانین آئل کمپنی سے اپنی تیل کی صنعت وتجارت کو آزاد کرانے کے لئے اور مصری عوام برطانیہ کی نہر سویز کمپنی کے انخلا کے لئے زبردست ایجی ٹیشن کر رہے تھے اور قربانیاں دے رہے تھے۔ لیاقت علی خان یا حکومت پاکستان کے کسی فرد نے ایرانی یا مصری عوام الناس کی برطانوی سامراج کے تسلط سے آزادی کی اس جدوجہد کے حق میں کبھی کلمہ خیر ادا نہ کیا بلکہ لیاقت علی خان سے جب اس بارے میں سوال کیا گیا تو اس نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ یہ ان ملکوں کا اندرونی معاملہ ہے، ہمارا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ تھا اس کا عالم اسلام کے ساتھ اتحاد اور یکجہتی کا مظاہرہ!

درحقیقت ''عالم اسلام کے اتحاد'' اور ''اسلامی بلاک'' کے نعروں کی آڑ میں سوویت مخالف اینگلو امریکی سامراجی دفاعی معاہدوں کی راہ ہموار کی جا رہی تھی۔ بظاہر یہ کہا جا رہا تھا کہ اس کا دونوں بلاکوں یعنی کمیونسٹ بلاک اور مغربی سامراجی ممالک کے بلاک کے ساتھ تعلق نہیں ہوگا لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ حکومت پاکستان کی جانب سے برسر اقتدار مسلم لیگ کے صدر چودھری خلیق الزماں نے بظاہر ''اسلامستان'' کے قیام کی راہ ہموار کرنے کے لئے مشرق وسطیٰ کے ممالک کا دورہ کیا لیکن اس کے اختتام پر لندن پہنچ کر اس نے خود ہی یہ کہہ کر بھانڈا پھوڑ دیا کہ وہ اسلامستان کی سکیم کے لئے برطانیہ کی منظوری لینے آیا ہے۔ ''اسلامستان'' کے برطانوی منصوبے کی ناکامی کے بعد امریکہ نے ایک نئے نام کے ساتھ مشرق وسطیٰ میں جال پھینکا۔ اسے مڈل

ایسٹ ڈیفنس آرگنائزیشن (MEDO) کا نام دیا گیا۔ یہی آگے چل کر معاہدہ بغداد اور سینٹو (CENTO) پر منتج ہوا۔

مشرق وسطیٰ میں حلقہ اثر کے سوال پر برطانیہ اور امریکہ کے مابین چپقلش میں لیاقت علی خان برطانوی وفادار کا کردار ادا کر رہا تھا جبکہ افواج پاکستان کا کمانڈر انچیف محمد ایوب خان دورۂ امریکہ کے دوران وفاداری بدل کر امریکہ کا حاشیہ بردار بن گیا تھا اور اس نے یہ بیان بھی دے دیا تھا کہ اب ہمیں قابل اعتماد دوست مل گیا ہے۔ انہی دنوں مشرق وسطیٰ میں برطانوی۔ امریکی چپقلش کے نتیجہ میں بہت سے سیاسی قتل ہوئے تھے جن میں والیٔ اردن امیر عبداللہ اور مصر کے وزیر اعظم نقراشی پاشا کے قتل اہمیت کے حامل تھے کہ یہ دونوں برطانوی حلقہ اثر کے حامی تھے اور ان کے قتل سے برطانوی حلقہ اثر کو خاصا دھچکا لگا تھا، امریکی حلقہ اثر غالب تر ہوتا جا رہا تھا۔ ان حالات میں ایک اور برطانوی وفادار لیاقت علی خان کا راولپنڈی میں قتل ہوا اور اس کے بعد ہی غلام محمد، اسکندر مرزا اور ایوب خان کا ٹولہ پاکستان کے سیاہ وسفید کا مالک بن گیا جو دراصل اپنی وفاداری بدل کر امریکی وفادار بن چکے تھے اور صحیح معنوں میں پاکستان کو امریکہ کا طفیلی بنانے کے ذمہ دار ہوئے۔

اسکے بعد کم وبیش 35 سے 40 سال تک یعنی سوویت یونین کے زوال تک امریکہ نے مذہب کو سوویت بلاک کے خلاف استعمال کیا۔ پاکستان کے فوجی حکمران ٹولے نے بھی اس صورتحال سے فائدہ اٹھایا اور اپنے اقتدار کو طول دینے کے لئے افغان جہاد کے نام پر افغانستان میں دونوں سپر طاقتوں کی لڑائی میں امریکہ کے لئے خدمات انجام دیں۔ اس کے عوض میں امریکہ نے نہ صرف ان مستبد فوجی حکمرانوں کی سرپرستی کی بلکہ بہت سی مذہبی جماعتوں کو بھی مال و اسباب سے خوب نوازا لیکن 1979ء کے ایران کے انقلاب نے امریکہ کو مذہب کا دوسرا رخ بھی دکھا دیا تھا اس لئے اس نے افغان جہاد اور فوجی حکمرانوں کی اسی وقت تک سرپرستی کی جب تک اس کی ضرورت رہی لیکن جونہی سوویت یونین میں پرسٹرائیکا اور گلاسنوٹ کا عمل شروع ہوا اور تبدیلی کے آثار نمایاں ہوئے تو 1980ء کی دہائی کے اواخر میں امریکہ نے پلٹا کھایا اور اس نے فوجی حکمران ٹولے اور مذہبی جماعتوں کی سرپرستی سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اب اسے یہی ملا بنیاد پرست اور مجاہدین تشدد پسند یعنی (Terrorist) نظر آنے لگے اور مالی امداد بند ہونے کے بعد مذہبی جماعتوں

بالخصوص جماعت اسلامی کے رہنماؤں کو وہی امریکہ اب سامراجی، اسلام دشمن اور صیہونی نظر آنے لگ گیا جس میں اس سے پہلے کوئی عیب نہیں تھا بلکہ اس سے پیشتر امریکہ کے بارے میں ایسی بات کرنے والوں کو وہ کمیونسٹ اور روس کے ایجنٹ قرار دیا کرتے تھے۔

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے!

زیر نظر جلد میں لیاقت علی کے قتل تک کے واقعات کا احاطہ اور تجزیہ شامل کیا گیا ہے۔ گزشتہ جلدوں کی طرح اس جلد کے تحقیقی مواد کے ماخذ بھی زیادہ تر اس زمانے کے اخبارات کی فائلیں ہیں اور بعض حوالوں کے لئے مستند کتب اور ریکارڈز سے بھی رجوع کیا گیا ہے۔ بعض حضرات جو خود اس ڈرامے کے اہم کردار رہے تھے مثلاً سر ظفر اللہ، چودھری محمد علی اور جنرل محمد ایوب خان، ان کی خود نوشت بھی ماخذ کے طور پر استعمال کی گئی ہیں۔ ماخذوں کے حصول میں خصوصاً اخبارات کی فائلوں سے استفادہ کے لئے جن اداروں کا میں اور میرے ساتھی خالد محبوب ممنون ہیں ان میں پاکستان ٹائمز ریفرنس سیکشن لاہور، پنجاب پبلک لائبریری لاہور، نوائے وقت ریکارڈ روم، میوزیم لائبریری لاہور، ریسرچ سوسائٹی پنجاب یونیورسٹی لاہور، قائداعظم لائبریری لاہور، برٹش کونسل لائبریری لاہور، اور امریکن سنٹر لائبریری لاہور شامل ہیں۔

بارہویں جلد کی تکمیل و اشاعت میں بھی گزشتہ گیارہ جلدوں کی طرح میرے ساتھی خالد محبوب نے بڑی محنت اور لگن کے ساتھ کام کیا۔ لائبریریوں سے تحقیقی مواد جمع کرنے سے لے کر پروف ریڈنگ اور اشاریہ بنانے تک یہ جلد بھی ان کی مرہون منت ہے۔ اسی طرح سمیع اللہ ظفر کی اعانت اور مشاورت بھی ہمیشہ کی طرح شامل حال رہی۔ ڈاکٹر مبشر حسن صاحب، دلاور محمود صاحب، محمد صدیق درانی صاحب، شیخ منظور حسین صاحب، محمد اورنگ زیب صاحب، خورشید عالم صاحب، حسین نقی صاحب، مہدی حسن صاحب اور قمر عباس صاحب کی شفقت اور اس تحقیقی منصوبے کے ساتھ کمٹ منٹ کی بدولت ہی دراصل یہ منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچا ہے۔ ان حضرات کے علاوہ ثائر علی صاحب اور ان کے معاون مسعود نقوی صاحب نے اس منصوبہ کو درپیش بعض پیچیدگیوں سے عہدہ برآ ہونے میں قانونی مدد نہ کی ہوتی تو شاید یہ بارہ جلدیں منصۂ شہود پر نہ آسکتیں۔ اس سلسلۂ اشاعت کے ناشر مصطفی وحید صاحب اس دور میں جبکہ علمی و تحقیقی کاوشیں طاق نسیاں کر دی گئی ہیں، انہوں نے ہمت کر کے اس سلسلہ کو پایہ اشاعت تک پہنچایا ہے۔ اس سلسلہ

کی تمام جلدوں کی تزئین کا کام ان کے معاون نعیم احسن نے پورے شوق ولگن کے ساتھ انجام دیا ہے۔ اس طرح یہ تحقیقی منصوبہ ایک ٹیم ورک کے طور پر اپنی تکمیل واشاعت کی تمام منزلیں طے کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔

بارہ جلدوں کے اس سلسلے کی تکمیل کے ساتھ پاکستان کی سیاسی تاریخ کا صرف ایک مرحلہ جو کہ ابتدائی چند برسوں کے تجزیے پر محیط تھا، مکمل ہوا ہے۔ بعد کے برسوں کے لئے تحقیقی مواد جمع کرنے اور اسے سائنسی تجزیے سے ہمکنار کرنے کا کام ابھی باقی ہے۔ قارئین کی جانب سے تحقیق وتالیف کے اس سلسلے کی پذیرائی اور ہمت افزائی اسی طرح جاری رہی جیسی کہ گزشتہ جلدوں کے سلسلے میں رہی ہے تو مجھے اپنے اور اپنی ٹیم کے اوپر بھروسہ اور یقین ہے کہ ہم اس عظیم کام کو حالیہ برسوں کے تجزیے تک پہنچانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

لاہور | حسن جعفر زیدی

دسمبر 1996ء

باب: 1

پاکستان بنتے ہی پاکستانی رہنماؤں کا روس کے خلاف اور اینگلو۔امریکی سامراج کے مفاد میں اسلامی بلاک کی تشکیل کا نعرہ

قیام پاکستان کے وقت عالم اسلام کے اتحاد کا غیر حقیقت پسندانہ خواب دیکھنے اور دکھانے کی وجوہات

نوزائیدہ پاکستان کے حکمرانوں نے ملک کے قومی اور قومیتی تضادات پر قابو پانے کے لئے نہ صرف اندرون ملک تیرہ چودہ سو سال پہلے کے اسلامی اصولوں کے حوالے دے کر اور قائداعظم جناح کی 11راگست 1947ء کی تقریر کے برعکس مذہب کو سیاست سے ملوث کر کے ایک ایسی دقیانوسی ملائیت کو فروغ دیا کہ جس نے قومی تعمیر و ترقی، علم و دانش اور عقل و فکر کے بیشتر دروازے بند کر دیئے بلکہ انہوں نے اینگلو۔امریکی بلاک کی زیر سرپرستی عالم اسلام کے اتحاد کا بڑے زور شور سے ڈھونگ رچایا۔ اگرچہ اس بین الاقوامی اسلامی ناٹک میں ابتدا ہی سے تاریں ہلانے والے انگریزوں و امریکیوں کے ہاتھ صاف دکھائی دیتے تھے، تاہم پاکستان کے درمیانہ طبقہ کے سادہ لوح مسلم عوام کے خاصے بڑے حصہ نے کئی سال تک یہ باور کیا کہ ساری دنیا میں اسلام کا ایک سیاسی و فوجی قوت کی حیثیت سے احیا ہو رہا ہے اور پاکستان ایک مثالی اسلامی مملکت کی حیثیت سے اس بین الاقوامی اسلامی قوت کا سربراہ ہوگا۔ کم فہم اور کم علم مسلم عوام کی جانب سے اس دلکش تصور یا سہانے خواب کو مبنی بر حقیقت اور ممکن العمل سمجھنے کی کئی وجوہ تھیں۔

اول یہ کہ پاکستان کے دونوں حصوں کے مسلم عوام کو فی الحقیقت و بجا طور پر یہ خطرہ محسوس ہوتا تھا کہ ہندوستان کے توسیع پسند عناصر ان کی مملکت خداداد پاکستان کو اس کے ایام طفلی میں ہی ختم کرنے کے درپے ہیں اور اسے بچانے کا سب سے مؤثر طریقہ یہ ہے کہ پاکستان کا سیاسی و فوجی لحاظ سے سارے مسلم ممالک سے رشتہ جوڑ کر اسے اتنی بڑی طاقت بنا دیا جائے کہ ہندوستان اس کی طرف میلی نظر سے دیکھنے کی جرأت نہ کر سکے۔ گویا پاکستان کی بقا و سلامتی کی ضرورت انہیں مجبور کر رہی تھی کہ وہ عالم اسلام کے اتحاد کے خواب کو ایک قابل عمل منصوبہ سمجھیں۔

دوئم یہ کہ درمیانہ طبقہ کے بعض عناصر پاکستان کے خلاف ہندوستانی توسیع پسندوں کے ناپاک عزائم سے اس قدر خوفزدہ تھے کہ جب کبھی ان کی توجہ اس عظیم الشان اسلامی منصوبے کے پس پردہ اینگلو۔امریکی بلاک کی کارفرمائی کی طرف مبذول کرائی جاتی تھی تو یہ کہتے تھے کہ اگر پاکستان کچھ عرصہ کے لئے اینگلو۔امریکی بلاک کی طفیلی ریاست کی حیثیت سے ہی زندہ رہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہوگا کیونکہ بصورت دیگر یہ ہندوستان کے ہاتھوں بالکل نیست و نابود ہو جائے گا۔ پھر پورے برصغیر میں سپین کی تاریخ دہرائی جائے گی اور یہاں اسلام کا نام لیوا کوئی نہیں رہے گا۔ چونکہ برصغیر میں ہندو۔مسلم تضاد کا تاریخی پس منظر بہت ہی تلخ تھا اس لئے ان کا یہ موقف بادی النظر میں سراسر بے بنیاد اور بے وزن نہیں تھا۔ اگرچہ پندرھویں صدی کے سپین کی صورتحال اور بیسویں صدی کے ہندوستان کی صورتحال میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ یہ عناصر اینگلو۔امریکی بلاک سے توقع رکھتے تھے کہ یہ طاقتیں نہ صرف اپنے عالمی مفاد کی خاطر پاکستان کی آزادی و خودمختاری کا تحفظ کریں گی بلکہ یہ ریاست جموں و کشمیر کو بھی آزاد کرانے میں پاکستان کی امداد کریں گی۔

سوئم یہ کہ پاکستان میں بعض عناصر ایسے بھی تھے جو یہ باور کرتے تھے کہ پاکستان کا عالم اسلام کے ساتھ اتحاد مکمل ہو جائے گا تو پھر ہندوستان پر حملہ کر کے پورے برصغیر میں ایک مرتبہ پھر اسلامی حکومت نافذ کی جائے گی۔ پنجاب میں عنایت اللہ مشرقی کی اسلام لیگ کا نصب العین کھلم کھلا یہی تھا اور کراچی میں بھی "ہندوستان ہمارا ہے" کے نام سے ایک تنظیم اسی نصب العین کے تحت وجود میں آئی تھی۔ بہت سے اردو اخبارات میں اس نصب العین کی تبلیغ کے لئے آئے دن مضامین اور بیانات شائع ہوتے رہتے تھے۔ بعض افراد پاکستان، افغانستان، ایران اور ترکی پر

مشتمل کنفیڈریشن کا خواب بھی دیکھتے تھے۔

چہارم یہ کہ بعض عناصر واقعی یہ سمجھتے تھے اور دوسروں کو تحریر و تقریر کے ذریعے سمجھانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے تھے کہ پاکستان کے بطور اسلامی مملکت وجود میں آنے سے ساری غیر اسلامی دنیا پر لرزہ طاری ہو گیا ہے۔ جب پاکستان میں اسلامی نظام حکومت یا اسلامی طرز حیات کا تجربہ کامیاب ہو جائے گا تو ساری غیر مسلم دنیا اپنی نجات کے لئے پاکستان کے نقش قدم پر چلنے پر مجبور ہو گی۔ بالخصوص وسطی ایشیا کے کروڑوں مسلمانوں میں جو اشتراکی روس کے ملحدانہ چنگل میں پھنسے ہوئے ہیں از سر نو اسلامی جذبہ موجزن ہو گا۔ وہ اسلامی انقلاب برپا کر کے دنیا کی ملت مسلمہ کی صفوں میں شامل ہو جائیں گے اور پھر نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاک کاشغر، مسلمانوں میں وحدت و یکجہتی کی فضا پیدا ہو جائے گی اور بعض ''مجاہدین'' ایسے بھی تھے جو سوویت یونین پر حملہ کر کے وسطی ایشیا کو آزاد کرانے کی باتیں کرتے تھے۔

پنجم یہ کہ گزشتہ تقریباً ایک سو سال کے دوران پہلے تو 1870ء سے لے کر 1917ء تک برطانوی سامراج کی طرف سے مسلسل پروپیگنڈے کے ذریعے ہندوستانی مسلمانوں یا مسلم انڈیا کو یہ یقین دلایا گیا تھا کہ روس عالم اسلام کا بدترین دشمن ہے اور سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ اسی طاقت کی سازشوں کے نتیجہ میں ہوا ہے۔ پھر 1917ء میں روس میں اشتراکی انقلاب کے بعد مزید یقین دلایا گیا کہ اشتراکی روس نہ صرف عالم اسلام کا دشمن ہے بلکہ یہ تمام مذاہب کا دشمن ہے کیونکہ اشتراکیت کی بنیاد ملحدانہ نظریہ مادیت پر ہے۔

ششم یہ کہ اگرچہ گزشتہ تقریباً دو سو سال میں مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک عالم اسلام کو سب سے زیادہ نقصان یورپ کی سرمایہ دار طاقتوں نے پہنچایا تھا، پہلی جنگ عظیم میں سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ انہی طاقتوں کے ہاتھوں سے ہوا تھا۔ اس جنگ کے فوراً بعد حکومت برطانیہ نے عربوں کی آزادی کے بارے میں حجاز کے حکمران شریف حسین سے کئے گئے معاہدے کی خلاف ورزی کی اور مشرق وسطیٰ، برطانیہ اور فرانس کے درمیان تقسیم ہو گیا تھا۔ نومبر 1917ء میں انگریزوں نے اعلان بالفور کے ذریعے عالم عرب کے قلب میں صیہونیت کا رسمی طور پر چھرا گھونپ دیا تھا۔ تاہم برصغیر کی تقسیم سے قبل مسلم انڈیا کے زعما مثلاً نواب رامپور، نواب چھتاری، سر شفاعت احمد، سر سکندر حیات خان اور سر خضر حیات وغیرہ صرف سوویت یونین کو ہی عالم اسلام کا

بدترین دشمن قرار دیتے رہے تھے۔ ظفراللہ خان کے بیان کے مطابق 1947ء کے اوائل میں دوسری جنگ عظیم کے بعد عربوں اور یہودیوں کے درمیان فلسطین کے مستقبل کے متعلق بات چیت محض اس لئے ناکام ہوگئی تھی کہ ''جب فریقین تصفیہ کے قریب پہنچے تھے تو امریکی صدر ٹرومین (Truman) نے حکومت برطانیہ کے نام ایک تار بھیجا کہ ایک لاکھ یہودی مہاجرین کو فلسطین میں داخلے کی فوراً اجازت دی جائے۔ اس تار کی عام اشاعت ہوئی۔ اس پر عرب مندوبین برافروختہ ہوگئے اور صیہونی مندوبین کے حوصلے بلند ہوگئے اور باہمی تصفیہ کی امید جاتی رہی۔''[1] اس پر حکومت برطانیہ نے اپریل 1947ء میں فلسطین کا مسئلہ اقوام متحدہ میں پیش کردیا لیکن اس کے باوجود جب اگست 1947ء میں برصغیر مسلم انڈیا اور ہندو انڈیا کی صورت میں تقسیم ہوگیا تو پاکستان کے ارباب اقتدار ہندوستان سے شدید ترین قومی تضاد کے باوجود اور انگریزوں کے ہاتھوں فلسطین اور کشمیر میں زک اٹھانے کے باوجود سوویت یونین کو ہی پاکستان اور اسلام کا دشمن نمبر ایک تصور کرتے رہے۔ ان کے سیاسی تصور میں سوویت یونین کے ساتھ دوستانہ تعلقات کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ پاکستان کی معیشت قرون وسطیٰ کی زرعی معیشت تھی۔ اس معیشت میں جاگیردار حکمران طبقے، ابھرتے ہوئے کاروباری سرمایہ دار طبقے اور انگریزوں کی پروردہ سول وفوجی بیوروکریسی کے مفادات کا تقاضا یہ تھا کہ وہ بہر صورت صرف اینگلو۔امریکی بلاک سے اپنے سیاسی، معاشی اور ثقافتی روابط رکھیں۔

برطانیہ اور امریکہ، پاکستان کی انتہائی پسماندہ زرعی معیشت کو جوں کا توں رکھنے کے حق میں تھے۔ برطانیہ نے ہندوستان اور پاکستان کو آزادی اس لئے نہیں دی تھی کہ ان ممالک کے معیشی ڈھانچے میں تبدیلی آئے اور یہ ممالک صحیح معنوں میں تعمیر وترقی کی راہ اختیار کریں۔ اس نے بہ امر مجبوری آزادی کا ڈھونگ اس لئے رچایا تھا کہ وہ یہاں اپنے مراعات یافتہ پٹھوؤں کے ذریعے اپنے استحصالی کاروبار کو جاری رکھ سکے گا۔ بقول ونسٹن چرچل (Winston Churchil) ''ہم نے سب کی پسند کے مطابق صرف تجارتی لیبل بدلے ہیں۔''[2] ان حالات میں اینگلو۔امریکی بلاک اول تو اپنے پاکستانی پٹھوؤں کو سوویت یونین کے ساتھ دوستانہ مراسم قائم کرنے کی اجازت دے ہی نہیں سکتا تھا اور اگر بالفرض محال وہ اس سلسلے میں کوئی رکاوٹ حائل نہ بھی کرتا تو یہاں کے حکمران طبقے خود بھی سوویت یونین کے ساتھ دوستی

نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اس طرح انہیں اپنے طبقاتی مفادات خطرے میں پڑنے کا اندیشہ تھا۔ وہ اپنے جاگیردارانہ وسرمایہ دارانہ مفادات کے تحفظ کے لئے برصغیر کی تقسیم سے پہلے بھی ملاؤں کی خدمات سے بھرپور فائدہ اٹھاتے رہے تھے اور قیام پاکستان کے بعد بھی انہوں نے اس مقصد کے لئے مذہب کو بطور سیاسی حربہ استعمال کرنے کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔ ملاؤں کی جانب سے جب اشتراکی روس کی مخالفت کی جاتی تھی تو غریب مسلم عوام کو یہ نہیں بتایا جاتا تھا کہ اشتراکی نظریہ جاگیرداری یا زمینداری نظام کی اجازت نہیں دیتا اور نہ ہی وہ دولت اور ذرائع پیداوار کی اس قدر غیر منصفانہ تقسیم کو برداشت کرتا ہے بلکہ انہیں صرف یہ بتایا جاتا تھا کہ جو لوگ اشتراکی نظریے کو مانتے ہیں وہ خدا کو نہیں مانتے، مذہب کو نہیں مانتے اور وہ مادہ پرست، اخلاق باختہ، بے اصول اور بے غیرت ہوتے ہیں۔ چنانچہ 1870ء میں پیرس میں پہلے پرولتاری انقلاب کی ناکامی کے دس بارہ سال بعد پان اسلام ازم کے عظیم علمبردار ملا جمال الدین افغانی کا حیدرآباد (دکن) میں فتویٰ یہ تھا کہ ''سوشلسٹ، کمیونسٹ، نہلسٹ یعنی اجتماعین، اشتراکین اور عدمیین یہ تینوں گروہ اس طریقہ کے پیروکار ہیں کہ اپنے آپ کو فقیر دوست اور مسکین نواز ظاہر کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر گروہ اگرچہ اپنے مقاصد ایک نرالے انداز میں پیش کرتا ہے۔ تاہم ان کا اصل مقصد اور منتہائے نظر یہی ہے کہ امتیازات انسانی کو بالائے طاق رکھ کر مزدک کی طرح سب کو ہر چیز میں شریک گردانا جائے۔ اس مقصد کے پیش نظر انہوں نے خونریزیاں کیں، فسادات برپا کئے اور آبادیوں کی آبادیاں نذر آتش کر دیں...... ان کے خیال میں نیچر کے مقاصد کی نشر واشاعت میں یعنی اباحت اور اشتراک کے بارے میں سب سے زیادہ رکاوٹ مذہب اور سیاست ہیں۔ لہٰذا ان دونوں کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنا چاہیے اور رؤسائے ادیان کو نیست ونابود کر دینا چاہیے...... انہوں نے دو جماعتوں کی تشکیل کی۔ جن میں سے ایک عورتوں پر مشتمل تھی اور دوسری مردوں پر۔ یہ اعلان کیا کہ ہر مرد جس عورت پر چاہے تصرف کر سکتا ہے اور اسی طرح جب کسی عورت سے سوال کیا جائے کہ ''تو کس کی بیوی ہے'' تو وہ کہے گی ''میں جماعت کی بیوی ہوں'' اور اسی طرح ان عورتوں کے کسی بچہ سے دریافت کیا جائے کہ تو کس کا بچہ ہے تو وہ یہ جواب دے گا ''میں جماعت کا بچہ ہوں......'' یہ لوگ امانت میں خیانت کرتے ہیں، افشائے راز کرتے ہیں، اپنے عزیز دوست کو کھوٹے داموں بیچ ڈالتے ہیں، پیٹ کے بندے اور شہوت کے غلام ہیں، اپنی نفسانی خواہشات

کی پیروی میں ادنیٰ سے ادنیٰ اور ذلیل سے ذلیل حرکت کر گزرتے ہیں، ننگ و ناموس کی پرواتک نہیں کرتے، شرف نفس کی ان کو ہوا تک نہیں لگی، اس گروہ کے بیٹے اپنے باپوں سے محفوظ نہیں اور بیٹیاں کسی سے بھی اپنے دامن عصمت کو بچا نہیں سکتیں۔"[3] اسی طرح قیام پاکستان سے پہلے اور اس کے بعد ملا ابوالاعلیٰ مودودی کسی کتاب کا حوالہ دیئے بغیر اشتراکیوں کو اخلاق باختہ قرار دیتا تھا اور سوویت یونین کے انقلاب عظیم کے قائد لینن سے یہ الفاظ منسوب کرتا تھا کہ "ہم ہر اس اخلاق کو رد کرتے ہیں جو عالم بالا کے کسی تصور پر مبنی ہو یا ایسے خیالات سے ماخوذ ہو جو طبقاتی تصورات سے ماوراء ہیں۔ ہمارے نزدیک اخلاق قطعی اور کلی طور پر طبقاتی جنگ کا تابع ہے۔ ہر وہ چیز اخلاقاً بالکل جائز ہے جو پرانے نفع اندوز اجتماعی نظام کو مٹانے کے لئے اور محنت پیشہ طبقوں کو متحد کرنے کے لئے ضروری ہو۔ ہمارا اخلاق پس یہ ہے کہ ہم خوب مضبوط اور منظم ہوں اور نفع گیر طبقوں کے خلاف پورے شعور کے ساتھ جنگ کریں۔ ہم یہ مانتے ہی نہیں کہ اخلاق کے کچھ ازلی و ابدی اصول بھی ہیں۔ ہم اس فریب کا پردہ چاک کر کے رہیں گے۔ اشتراکی اخلاق اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ مزدوروں کی مطلق العنان حکومت کو مضبوطی کے ساتھ قائم کرنے کے لئے جنگ کی جائے...... ناگزیر ہے کہ اس کام میں ہر چال، فریب، غیر قانونی تدبیر، حیلے بہانے اور جھوٹ سے کام لیا جائے۔"[4] ستم ظریفی یہ تھی کہ جب یہ مُلّا، اشتراکی لیڈروں پر اس قسم کے الزامات عائد کرتا تھا اس وقت خود اس موقف کا حامل تھا کہ اسلامی نقطہ نگاہ سے بعض اوقات حسب ضرورت جھوٹ بولنا نہ صرف جائز ہے بلکہ واجب ہے۔

پاکستان بنتے ہی لیڈروں اور ملاؤں کی جانب سے عالم اسلام کے اتحاد کے لئے پروپیگنڈا مہم اور برطانوی حوصلہ افزائی

عالم اسلام کے اتحاد یا متحدہ بلاک یا پان اسلام ازم کے حق میں اور سوویت یونین کی مبینہ اسلام دشمنی کے خلاف پروپیگنڈے کے مذکورہ پس منظر کے ساتھ جب 14 ؍اگست 1947ء کو پاکستان ظہور میں آیا تو اس کے ساتھ ہی بہت سے پاکستانی لیڈروں اور ملاؤں کی طرف سے اخبارات میں ایسے بیانات، مضامین اور خطوں کا ایک سیلاب بھی آیا جن میں زور دیا گیا تھا کہ اب دنیا کے سارے مسلم ممالک کو متحد ہو کر ایک زبردست عالمی قوت بننے میں ذرا بھی تاخیر نہیں

کرنی چاہیے۔ 30راگست 1947ء کو اسلامک ورلڈ ریلیشنز ایسوسی ایشن کے سیکرٹری مولانا سیفی ندوی کا اورینٹ پریس کے ساتھ ایک انٹرویو یہ تھا کہ ''ماضی میں مذہب اسلام نے دنیا کی سیاست اور ثقافت کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے لیکن آج کل یہ محض اس لئے پسماندہ ہے کہ اسلامی ممالک میں ابھی تک پھوٹ پڑی ہوئی ہے۔ اسلام کی شمع کو ازسرنو روشن کرنے کے لئے ایک ایسی مرکزی تنظیم کی اشد ضرورت ہے جو مختلف اقوام میں اتحاد و یکجہتی پیدا کرنے کوشش کرے۔ پاکستان کو ایک ایسی کلید کی ضرورت ہے جو اسلام کے خوشحال مستقبل کا دروازہ کھولے۔ پاکستان کو ایک اسلامی محاذ کے قیام کی غرض سے پہل کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے تاکہ دکھی دنیا کو کوئی آرام و سکون میسر آسکے۔ یہ پاکستان کی خوش نصیبی ہے کہ قائداعظم اس کے سربراہ ہیں اور اس بنا پر اسے اس سلسلے میں زیادہ مواقع حاصل ہیں۔ مجھے امید ہے کہ قائداعظم اسلامی دنیا کی قیادت سنبھالیں گے اور اس حیثیت سے ایک ایسی طاقتور تنظیم کی تشکیل میں مدد دیں گے جو اپنے آپ کو اسلام کی منتشر قوتوں کو متحد کرنے کے کام کے لئے وقف کردے گی۔''[5] سیفی ندوی کے اس بیان کے تین چار دن بعد لاہور کے اخبار پاکستان ٹائمز میں ماڈل ٹاؤن کے ایک شخص محمد داؤد رہبر کا خط شائع ہوا جس میں امید ظاہر کی گئی تھی کہ ''دنیا کے اسلامی ممالک ایک اسلامی فیڈریشن سے متعلقہ پاکستانی مسلمانوں کے خواب کی تعبیر کی کوشش کرنے پر متفق ہو جائیں گے اور اس مجوزہ اسلامی فیڈریشن کے صدر کا انتخاب کر کے خلافت کا عہدہ بحال کریں گے۔ اسلامی آئین کے تحت اس فیڈریشن کے مختلف حصوں کی پالیسی پر اجتماعی مفاد کی خاطر مرکز کا کنٹرول ہوگا۔''[6]

ستمبر 1947ء کے دوسرے ہفتے میں برطانیہ کے ملک معظم کے نمائندہ لارڈ کلیرن (Killearn) نے ان پاکستانی عناصر کی حوصلہ افزائی کی جو پاکستان کے قیام کے بعد ساری دنیا میں اسلام کی عظمت کے احیا کا سہانا خواب دیکھ رہے تھے۔ لارڈ کلیرن نے سنگاپور میں پاکستانی فوج کے افسروں کی ایک دعوت میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''قومی فضیلت کا انحصار قوم کے افراد پر ہوتا ہے اور آپ تو ایسی قوم کے جانشین ہیں جن کے مدبروں، سپاہیوں، حکیموں، خلیفوں اور شاعروں نے تاریخ میں وہ نام پیدا کیا کہ رہتی دنیا تک یاد رہے گا۔ میری دعا ہے کہ آپ کامیاب و کامران ہوں۔ جب 15راگست کو پاکستان کا قیام عمل میں آرہا تھا تو وہ لوگ جنہیں مسلمانوں کے دوش بدوش زندگی کے مختلف شعبوں میں کام کرنے کا موقع ملا ہوا تھا انہیں

کامل یقین ہو گیا تھا کہ پاکستان ایک بہت ہی مستحکم دولت ہو گی۔ آپ اس قوم کے جانشین ہیں جس کے تدبر و ذہانت کا لوہا تمام دنیا نے تسلیم کیا ہے۔"[7] لارڈ کلیرن دوسری جنگ عظیم کے دوران مصر میں برطانیہ کا سفیر رہا تھا اور اس حیثیت سے اس نے مصریوں پر جو مظالم ڈھائے تھے ان کی وجہ سے وہ وہاں بہت بدنام تھا۔ تاہم وہ برطانیہ کے حکمران طبقہ کے ان عناصر میں شامل تھا جن کا خیال تھا کہ مشرق وسطیٰ میں اسلام کے زور پر سوویت یونین کی پیش قدمی کے خطرے کے سدباب کے لئے پاکستان کی خدمات سے بہت فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ تاہم سوویت یونین کے خلاف امریکہ کے فوجی منصوبے میں پاکستان شامل نہیں تھا۔ امریکہ کی کوشش یہ تھی کہ ایران، ترکی اور عرب ممالک پر مشتمل فوجی بلاک کی تشکیل کی جائے۔ اس وقت تک ایران کی پولیس پر امریکہ کا کنٹرول قائم ہو چکا تھا اور وہ اسلحہ اور ڈالر مہیا کر کے ایرانی فوج کو بھی اپنی نگرانی میں لینے کا متمنی تھا۔ اس نے بحیرہ کیسپین (Caspian) کے ساحلی شہروں میں ہوائی اڈوں کی تعمیر شروع کر دی تھی اور آذر بائیجان کے ممنوعہ علاقے میں امریکی گاڑیوں کی آمدورفت پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ چنانچہ ان حقائق کے پیش نظر تہران کے اخبار "مردم" کی رائے یہ تھی کہ "ایران کی داخلی زندگی اور خارجہ پالیسی پر امریکی سامراج کی گرفت مضبوط ہو رہی ہے اور ایرانی حکومت ایران کو امریکہ کا پٹھو ملک بنانے کی کوشش کی کوئی مخالفت نہیں کرتی۔"[8] جبکہ مصر میں مظاہرین کی جانب سے برطانیہ، امریکہ، فرانس اور اقوام متحدہ مردہ باد اور سوویت یونین زندہ باد کے نعرے لگائے جا رہے تھے۔[9]

28 ستمبر کو کراچی میں مولانا شبیر احمد عثمانی کی زیر صدارت ایک آل پاکستان عربک سوسائٹی کی تشکیل عمل میں آئی۔ جس کا ابتدائی مقصد تو یہ تھا کہ پاکستان میں عربی زبان کی تعلیم و ترویج کا بندوبست کیا جائے گا اور آخری نصب العین یہ تھا کہ اس طرح سارے عالم اسلام کو ایک ثقافتی، سیاسی اور مذہبی یونٹ بنایا جائے گا۔ سوسائٹی کا ارادہ یہ تھا کہ نومبر 1948ء میں پہلی سالانہ ورلڈ مسلم کانفرنس کراچی میں منعقد کی جائے گی اور دوسری سالانہ کانفرنس کا انعقاد قاہرہ میں کیا جائے گا۔[10] شبیر احمد عثمانی کی اس سوسائٹی کا قیام غیر متوقع نہیں تھا کیونکہ پاکستان کے اخبارات میں کئی روز سے یہ پروپیگنڈا ہو رہا تھا کہ ملک میں عربی زبان کی تعلیم و ترویج کا وسیع پیمانے پر بندوبست کیا جائے۔ اس سلسلے میں جو لوگ بیانات جاری کرتے تھے یا مضامین لکھتے تھے ان کی رائے یہ تھی کہ عربی زبان عالم اسلام کے اتحاد کا بہت بڑا ذریعہ بنے گی۔ تاہم اس سوسائٹی کی

اہمیت اس لئے زیادہ نمایاں ہوگئی تھی کہ جس دن اس کے قیام کے لئے سندھ مدرسہ کالج کے ہال میں جلسہ ہو رہا تھا اسی دن روزنامہ مارننگ نیوز کے نامہ نگار مقیم قاہرہ کی ارسال کردہ ایک خبر شائع ہوئی تھی جس میں ترکی کے مذہبی لیڈر حمید اللہ صوفی سے یہ بیان منسوب کیا گیا تھا کہ اگر مسلم ممالک نے باہمی یکجہتی پیدا نہ کی اور انہوں نے اینگلوسیکسنز (Anglo Saxons) کے ساتھ مشترکہ محاذ نہ بنایا تو ان میں ایک دن کے لئے بھی اعتماد پیدا نہیں ہو سکے گا۔ حمید اللہ صوفی کا یہ بیان استنبول کے روزنامہ ''وطن'' میں شائع ہوا تھا جس میں مزید کہا گیا تھا کہ ''مسلم ممالک کو روس سے خطرہ ہے۔ اگر عرب ممالک اپنی قبائلی رقابتوں پر قابو پالیں تو یہ سب ترکی کے قلعے کے عقب میں ایک اور قلعہ کی حیثیت اختیار کر سکتے ہیں اور ان کا مستقبل بھی اتنا ہی روشن ہو گا جتنا کہ ان کا ماضی روشن تھا۔'' حمید اللہ صوفی نے گزشتہ ایک سال کے دوران ترکی میں مذہبی احیا کی تحریک بڑی کامیابی سے چلائی تھی جس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ ترکی جمہوریہ کی تاریخ میں پہلی مرتبہ بچوں کو مذہبی تعلیم دینے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور مذہبی شیخوں کو یہ اجازت دے دی گئی تھی کہ برسر عام اپنی مذہبی سرگرمیاں جاری کر لیں۔''[11] گویا ان دونوں خبروں کو ملا کر پڑھنے سے یہ تاثر ملتا تھا کہ عربی زبان یا دینیات کی تعلیم و ترویج اور عالم اسلام کے اتحاد کے منصوبے کا روس کے خلاف اینگلو۔امریکی بلاک کی جنگی حکمت عملی سے تعلق تھا۔

مسئلہ فلسطین پر عربوں کی حمایت مگر اس مسئلہ کے ذمہ دار اینگلو۔امریکی سامراج سے وفاداری

پاکستان کے ارباب اقتدار روس کے خلاف اس حکمت عملی میں اپنا ''اسلامی کردار'' ادا کرنے پر آمادہ تھے باوجود اس کے کہ برطانیہ نے برصغیر کی تقسیم میں پاکستان کے ساتھ بڑی بے انصافی کی تھی اور امریکہ نے اپنی طفیلی ریاستوں پر زبردست دباؤ ڈال کر اقوام متحدہ میں فلسطین کی تقسیم کی قرارداد منظور کروائی تھی۔ اقوام متحدہ میں اس مسئلہ پر بحث کے دوران پاکستانی وفد کے قائد سر ظفر اللہ خان نے عربوں کے موقف کی پرزور تائید کی تھی اور امریکہ سے التجا کی تھی کہ وہ صیہونیوں کی حمایت کر کے عرب ممالک میں اپنے وقار کو تباہ نہ کرے۔ تاہم وہ لکھتا ہے کہ ''طاقت کا گھمنڈ اندھا اور بہرہ کر دیتا ہے۔ ہمارے احتجاج اور ہمارے انتباہ صدا بصحرا ثابت ہوئے۔

مسٹر ٹرومین 1944ء میں نائب صدر ہوئے تھے۔ صدر روز ویلٹ چوتھی بار صدر منتخب ہونے کے بعد اپنی چوتھی میعاد کی ابتدا ہی میں فوت ہو گئے اور مسٹر ٹرومین نے ان کی جگہ صدارت سنبھال لی۔ 1948ء کے نومبر میں پھر انتخاب ہونے والا تھا اور اب کی بار مسٹر ٹرومین صدارت کے امیدوار تھے۔ صدارتی انتخاب سے ایک سال قبل ہی سارے امریکہ میں بحران کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور امیدوار اور ان کے حمایتی اپنی کامیابی کے لئے ہر ہونی اور انہونی کر گزرتے ہیں۔ مسٹر ٹرومین کو یہ خوف بھی لاحق تھا کہ انہیں شاید اپنی پارٹی کی پرجوش تائید حاصل نہ ہو۔ اس لئے وہ ابھی سے سرتوڑ کوشش میں تھے کہ ان کا پلڑا جس قدر بھاری بنایا جا سکے بنایا جائے۔ اس جدوجہد میں انہیں امریکہ کے یہودی عنصر کی تائید کی شدید ضرورت تھی۔ نیویارک میں یہودی عنصر نہایت زبردست ہے اور صدر ٹرومین انہیں خوش کرنے اور خوش رکھنے پر تلے ہوئے تھے۔ اس دھن میں انہوں نے اس واضح حقیقت کو بھی نظر انداز کر دیا کہ روس اور ان کے ہم خیال ممالک بھی تقسیم کی تائید میں ہیں اور اس موقف سے ان کی واحد غرض یہ ہے کہ تقسیم کی تجویز منظور ہو جائے تا کہ عرب ریاستوں کے ساتھ امریکہ کے تعلقات الجھ جائیں...... اقوام متحدہ کی بنیاد انصاف، مساوات اور حق خود اختیاری پر رکھی گئی تھی لیکن فلسطین کے معاملے میں برطانیہ نے جو معاہدات شاہ حسین کے ساتھ کئے تھے ان کی صریح خلاف ورزی کی گئی۔ یہ درست ہے کہ تقسیم کے متعلق رائے شماری میں برطانیہ غیر جانبدار رہا لیکن برطانیہ اعلان بالفور (Balfour Declaration) کے ذریعے اسرائیل کی بنیاد رکھ چکا تھا اور فلسطین کے قضیے کی ابتدا اعلان بالفور سے ہوئی۔ فلسطین میں جو کچھ ہوا اور جو کچھ آئندہ ہونے والا ہے اور فلسطین کی وجہ سے جس طرح دنیا کا امن برباد ہو گا اور نوع انسان کے ایک بڑے طبقے پر جو تباہی اور مصائب وارد ہوں گے ان کی تمام تر ذمہ داری اول برطانیہ اور مسٹر بالفور پر اور ان کے بعد ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور خاص طور پر صدر ٹرومین پر ہو گی۔''[12]

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے امریکی دباؤ کے تحت فلسطین کی تقسیم کا فیصلہ 29/نومبر 1947ء کو کیا۔ جب اس سلسلے میں حکومت پاکستان کو ظفر اللہ خان کی رپورٹ موصول ہوئی تو قائداعظم نے 8/دسمبر 1947ء کو صدر ٹرومین کے نام ایک تار بھیجا جس میں اس سے اپیل کی کہ وہ اس مسئلہ پر امریکہ کی پالیسی پر نظر ثانی کرے۔ قائداعظم کے تار کا مضمون یہ تھا کہ ''ایسے وقت جب کہ ادارہ اقوام متحدہ کے تقسیم فلسطین کے انتہائی افسوسناک فیصلہ سے دنیائے اسلام کو شدید

صدمہ پہنچا ہے، جناب صدر میں آپ سے ذاتی طور پر یہ اپیل کر رہا ہوں کہ یہ فیصلہ اقوام متحدہ کے چارٹر کے منافی اور قانوناً غلط اور ناجائز ہے۔ یہ نہ صرف اخلاقی لحاظ سے نامناسب ہے بلکہ سیاسی، تاریخی، جغرافیائی اور عملی لحاظ سے بھی۔ عربوں کی متحدہ مخالفت کے پیش نظر تقسیم کے اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانا ناممکن ہوگا کیونکہ عربوں کو نہ صرف 33 کروڑ سے زیادہ مسلمانوں بلکہ ان غیر اسلامی ملکوں کی حمایت حاصل ہے جنہوں نے خواہ اس قرارداد کی حمایت کی ہو یا نہ کی ہو۔ بالآخر یہ فیصلہ ناکام رہے گا اور اسے ناکام رہنا چاہیے بھی۔ جن لوگوں کے فائدے کے لئے یہ فیصلہ کیا جا رہا ہے وہ خود یعنی یہودی بھی نازیوں کے شدید مظالم کا شکار رہے ہیں اور میری پرزور رائے ہے کہ اگر یہ غیر منصفانہ راستہ اختیار کیا گیا تو ان کو اور بھی مصائب برداشت کرنا ہوں گے۔ مزید برآں یہ فیصلہ امن عالم کے لئے بھی انتہائی خطرناک ہے۔ لہٰذا میں اس آخری موقع پر آپ سے اور آپ کے ذریعے عظیم اور طاقتور امریکی قوم سے جس نے ہمیشہ انصاف کی حمایت کی ہے، عرب قوم کے حقوق کی حمایت کرنے کی اپیل کرتا ہوں۔ حکومت اور امریکی عوام اب بھی صحیح رہنمائی کر کے اس خطرناک صورتحال اور اس کے شدید ترین نتائج و اثرات کا سدباب کر سکتے ہیں۔"[13] لیکن ٹرومین کے نام قائداعظم کے اس ذاتی پیغام کا کوئی اثر نہ ہونا تھا اور نہ ہوا اور معاملہ یہیں پر ختم ہو گیا کیونکہ فلسطین اور عربوں کے خلاف امریکہ اور برطانیہ کی اس غنڈہ گردی کے باوجود حکومت پاکستان بھی ترکی کے حمید اللہ صوفی کی طرح عالم اسلام کی تقدیر اینگلو۔ امریکی بلاک کے ساتھ ہی وابستہ کرنے کا عزم رکھتی تھی اور اس کی بھی خواہش تھی کہ مذہبی احیا کی تحریک کے ذریعے سارے مسلم ممالک کو امریکہ برطانیہ کی زیر سرپرستی روس کے خلاف متحد و منظم کیا جائے۔ پاکستان کے گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح نے بظاہر اس مقصد کے تحت اکتوبر کے اوائل میں ملک فیروز خان نون کو ہدایت کی تھی کہ وہ حکومت پاکستان کے نمائندہ کی حیثیت سے مسلم ممالک کا دورہ کرے۔

قائداعظم جناح روس کے خلاف پاکستان اور ہندوستان کے مابین مشترکہ دفاعی معاہدہ کے حق میں تھے

اگرچہ قائداعظم جناح کی پالیسی کے مطابق نوابزادہ لیاقت علی خان نے اپریل 1947ء میں ہندوستان کی افواج کی تقسیم کا منصوبہ بنانے کی تجویز پیش کرنے کے بعد ہندوستان

کے کمانڈر انچیف فیلڈ مارشل سر کلاڈ آ کن لیک (Claude Auchinleck) کے اس موقف سے اتفاق نہیں کیا تھا کہ ''ہندوستانی افواج کی فوراً ہی وسیع پیمانے پر تقسیم کردی گئی تو شمال مغربی سرحد پر دفاعی کاروائیوں کے لئے کوئی باصلاحیت مسلح فوج نہیں رہے گی اور اگر ہندوستان کی افواج کو تقسیم کرنا ہی ہے تو یہ عمل کئی مراحل میں اور کئی سال میں پورا ہونا چاہیے۔''[14] لیکن روزنامہ لندن ٹائمز کی 22 رمئی 1947ء کی رپورٹ کے مطابق ''قائداعظم جناح چاہتے تھے کہ پاکستان اور ہندوستان کی تقسیم دوستانہ طریقے سے ہو اور تقسیم کے بعد دونوں کے درمیان دوستانہ تعلقات برقرار رہیں۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستان اور پاکستان باہمی مفاد کی خاطر بیرونی جارحیت کے خلاف دفاعی معاہدہ کر لیں گے۔''[15] بالفاظ دیگر اگرچہ جناح ہندوستان کی جغرافیائی تقسیم کے بعد ہندوستانی افواج کو متحد رکھنے کے خلاف تھے لیکن وہ شمال مغرب کی جانب سے جارحیت کے خلاف برصغیر کے دفاع کے لئے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان مشترکہ انتظام کے خلاف نہیں تھے۔ 21 رمئی 1947ء کو جب انہوں نے لندن ٹائمز کو یہ انٹرویو دیا تھا اس وقت برصغیر کی تقسیم کا منصوبہ تیار ہو چکا تھا اور باوجود اس کے کہ یہ منصوبہ مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان بڑی تلخ فضا میں تیار ہوا تھا، جناح ہندوستان اور پاکستان کے درمیان مخاصمت نہیں چاہتے تھے بلکہ ان کی خواہش تھی کہ دونوں ملکوں کے درمیان معاہدوں کے ذریعے دوستانہ تعلقات قائم ہوں۔

قائداعظم جناح کو امید تھی کہ امریکہ پاکستان کو روس کے خلاف سرمایہ اور اسلحہ دے گا

جناح 1947ء میں بھی اسی خارجہ پالیسی کو صحیح سمجھتے تھے جو انگریز ارباب اقتدار نے ہندوستان کو روس کی دستبرد سے بچانے کے لئے انیسویں صدی کے آخری عشروں میں بنائی تھی۔ سوویت یونین کے خلاف ان کی اس خارجہ پالیسی کی عکاسی قیام پاکستان کے فوراً بعد ہوئی جبکہ انہوں نے ایک امریکی اخبار نویس مارگریٹ بورک وائٹ (Margaret Bourke-White) سے انٹرویو کے دوران کہا تھا کہ ''پاکستان کو امریکہ کی جتنی ضرورت ہے امریکہ کو پاکستان کی اس سے زیادہ ضرورت ہے۔ انہوں نے اس سلسلے میں ایک سوال کا بڑی رازداری کے انداز میں مزید یہ

جواب دیا تھا کہ ''روس زیادہ دور نہیں ہے،......انہوں نے ایک مطمئن مسکراہٹ کے ساتھ یہ کہا تھا کہ ''امریکہ اب بیدار ہو گیا ہے۔ چونکہ اب امریکہ یونان اور ترکی کو سہارا دے رہا ہے، اسے پاکستان کو سرمایہ اور اسلحہ دینے میں بہت زیادہ دلچسپی ہونی چاہیے۔ اگر روس یہاں آ گیا تو ساری دنیا کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔''[16] جناح کے اس انٹرویو کے بعد پاکستان کے سرکاری حلقوں میں یہ تذکرہ عام ہو گیا تھا کہ امریکہ روس کے خلاف پاکستان کو مالی اور فوجی امداد دے گا اور پاکستانی اخبارات میں اس پروپیگنڈے نے زور پکڑ لیا تھا کہ فلسطین کی آزادی اور پاکستان کے تحفظ کے لئے ایک عالمگیر اسلامی محاذ قائم کیا جائے۔

24/اکتوبر کو برطانوی خبر رساں ایجنسی رائٹر کی بغداد سے اطلاع یہ تھی کہ ''عراق کے سیاسی حلقوں میں مشرق وسطیٰ کے تحفظ کے لئے تمام اسلامی ممالک کا ایک مشرقی بلاک بنانے پر غور و خوض کیا جا رہا ہے۔ سیاسی مبصرین کا کہنا ہے کہ مجلس اقوام متحدہ میں روسی نمائندے نے تقسیم فلسطین کی حمایت کر کے مشرق وسطیٰ میں اپنے اثر کو بالکل ختم کر دیا ہے اور اب کسی اسلامی ملک کو روس، امریکہ یا برطانیہ پر کوئی اعتماد نہیں۔ عراقی سینیٹ کے نائب صدر مصطفی العمری کا کہنا یہ تھا کہ امریکہ اور روس میں سے کوئی بھی امن کا محافظ نہیں۔ ہر قوم کو اپنی آزادی اور خود مختاری پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ ہر مسلمان کا مفاد اس میں ہے کہ اسلامی ممالک کا ایک مضبوط مشرقی بلاک بنایا جائے تاکہ مسلمانوں کی آزادی کی حفاظت کی جا سکے۔ امید ہے کہ عرب لیگ ملت اسلامیہ کے مفاد کے لئے اس تجویز کی حمایت کرے گی۔''[17] بغداد میں ان دنوں شاہ فیصل دوئم کی زیر قیادت برطانیہ کی پٹھو حکومت قائم تھی۔ اس مطلق العنان بادشاہت کے سینٹ کے نائب صدر کے انٹرویو میں امریکہ اور برطانیہ پر عدم اعتماد کا اظہار محض برائے بیت کیا گیا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ جنوری 1947ء کے بعد سے پورے عالم عرب میں بالعموم اور مصر میں بالخصوص برطانیہ اور امریکہ کے خلاف زبردست عوامی مظاہرے ہو رہے تھے۔ خیال یہ تھا کہ اگر عرب عوام کی توجہ اسلامی ممالک کے مشرقی بلاک کی تجویز کی طرف مبذول کرائی جائے گی تو کچھ عرصہ بعد اینگلو۔ امریکی بلاک کی عوامی مخالفت کم ہو جائے گی اور پھر برطانیہ اور امریکہ کی زیر سرپرستی روس کے خلاف ''اسلامی محاذ'' بنانے میں آسانی ہو گی۔

عالم اسلام کا متحدہ بلاک بنانے کے لئے پاکستانی رہنماؤں کے بیانات اور اخباری تبصرے

بظاہر پاکستان کے سرکاری حلقے مذکورہ خیال سے متفق تھے۔ چنانچہ جب حکومت پاکستان کا نمائندہ ملک فیروز خان نون 29/اکتوبر کو استنبول پہنچا تو اس نے یہ مژدہ سنایا کہ مستقبل قریب میں مسلم ممالک کے ایک بلاک کا قیام عمل میں آجائے گا اور ترکی اس بلاک کا لیڈر ہوگا۔[18] چونکہ برطانوی خبر رساں ایجنسی رائٹر سے اس انٹرویو سے دو دن پہلے کشمیر پر ہندوستانی فوج کا حملہ ہو چکا تھا اور مہاراجہ کشمیر اپنی ریاست کے ہندوستان کے ساتھ الحاق نامے پر دستخط کر چکا تھا اس لئے پاکستانی عوام کے لئے عالمگیر اسلامی بلاک کی تجویز میں اور بھی دلکشی پیدا ہوگئی تھی۔ یکم نومبر 1947ء کو صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ خان عبدالقیوم خان نے اس تجویز کی دلکشی میں مزید اضافہ کر دیا جبکہ اس نے پشاور میں ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ ''کشمیر پر ہندوستان کے حملے سے اسلام کو جو مشترکہ خطرہ لاحق ہوگیا ہے اس کا مقابلہ کرنے کے لئے عرب لیگ اور معاہدہ سعد آباد پر دستخط کرنے والے مسلم ممالک کو فی الفور ایک پان اسلامک کانفرنس بلانی چاہیے۔'' اس نے کہا کہ ''اسلام زمینی سرحدوں کو تسلیم نہیں کرتا اور پاکستان، کشمیر، افغانستان، ایران، انڈونیشیا اور دنیا کے دوسرے مسلم ممالک کے مسلمانوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ وہ ایک ساتھ ہی جئیں یا مریں۔ انہیں فلسطین میں یہودی خطرے اور جنوبی ایشیا میں ابھرتے ہوئے ہندو سامراج کے خلاف لڑنا ہی پڑے گا۔''[19]

لاہور کے روزنامہ نوائے وقت نے عالم اسلام کے اتحاد کی مختلف تجاویز پر دو تبصرے کئے۔ اس نے اپنے پہلے تبصرے میں فیروز خان نون کی اس رائے کی مخالفت کی کہ ترکی اسلامی محاذ کا لیڈر ہوگا اور لکھا کہ ''یہ بات ہمیں ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے کوئی ہمیں قبر کے اندر سے آواز دے رہا ہو۔ یہ بالکل ظاہر ہے کہ عرب لیگ اور ترکی کے درمیان جو روایتی اختلافات رہے ہیں وہ صرف اسی صورت میں دور کئے جا سکتے ہیں کہ مسلم ممالک کی رہنمائی ایسے ملک کے سپرد کی جائے جہاں عربی اور ترکی دونوں قسم کے تہذیبی و تمدنی اثرات کا تاریخی اتحاد ہوا ہو اور جہاں دونوں گروہوں سے اتحاد اور غیر جانبداری کا جذبہ پایا جاتا ہو۔ ایسا ملک سوائے پاکستان کے اور کون ہو

سکتا ہے۔ پھر فوجی اور معاشی لحاظ سے امریکہ کا دم چھلا بن جانے کے بعد ترکی اپنی وہ آزاد حیثیت کھو بیٹھا ہے جس کے بغیر عالم اسلام کی رہنمائی کا کوئی ملک مستحق نہیں قرار دیا جا سکتا اور پھر امریکہ پسند ترکی کیونکر ان عرب ممالک کی سرداری کر سکتا ہے جو فلسطین کے معاملے پر اس وقت امریکہ کے خلاف بھرے بیٹھے ہیں۔ آبادی، تعلیم اور معاشی دولت کے لحاظ سے بھی پاکستان ترکی سے زیادہ اہم ہے۔ غالباً جناب فیروز خان نون کے ذہن پر ابھی تک ترکی کی گئی گزری شان و عظمت کا بے معنی رعب بیٹھا ہوا ہے۔''[20] اس کا دوسرا تبصرہ خان عبدالقیوم خان کی اس تجویز کی تائید میں تھا کہ معاہدہ سعد آباد پر دستخط کرنے والے ممالک اور عرب لیگ کو جلد از جلد پان اسلامی کانفرنس منعقد کرنی چاہیے لیکن اس کی اس تائید میں بھی اس کی یہ خواہش نمایاں تھی کہ پاکستان کو سارے عالم اسلام کی رہنمائی کرنی چاہیے۔ اس سلسلے میں اس کی رائے یہ تھی کہ ''اب ہم ممالک اسلامیہ کے معاملات میں ایک آزاد قوم کی حیثیت سے حصہ لے سکتے ہیں اور اپنے کامیاب سیاسی تجربات کی بنا پر اپنے روایتی اور نئے دشمنوں کی خفیہ سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے خلاف دنیا کے دوسرے مسلمانوں کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ فلسطین، مصر، ایران اور کشمیر ہمارے لئے ایسے مسائل پیش کرتے ہیں جن کو حل کرنے کے لئے ہمیں متحدہ طور پر قدم اٹھانے کی ضرورت ہے لیکن اس سلسلے میں جو ممکن خطرات ہیں ان سے آگاہی حاصل کرنا بھی ضروری ہے اور وہ یہ کہ پان اسلامی کانفرنس کے ذریعے ممالک اسلامیہ کے اتحاد و تعاون کے لئے جو تنظیم کھڑی کی جائے وہ کسی بیرونی طاقت کے اثر میں نہ ہو بلکہ مکمل طور پر آزاد و خود مختار ہو۔ کسی ایسی ریاست کا اس میں کرتا دھرتا بن بیٹھنا بھی ممالک اسلامیہ کی آزادی کے لئے خطرناک ہوگا جو کسی سامراجی طاقت کے زیر اثر ہو۔ پان اسلامی کانفرنس کا بنیادی مقصد ہونا چاہیے کہ پوری دنیائے اسلام بجائے خود دنیا کی ایک عظیم الشان طاقت ثابت ہو اور اس پر دنیا کی کسی اور سامراجی طاقت کا منحوس سایہ نہ ہو۔''[21]

پنجابی درمیانہ طبقہ کا متحدہ اسلامی بلاک کا خواب غیر حقیقت پسندانہ اسلامی نظموں، اسلامی ناولوں اور فلموں پر مبنی تھا

اگرچہ نوائے وقت کے مذکورہ تبصروں سے ساری دنیا اور عالم اسلام کے سیاسی، معاشی، صنعتی، فوجی اور معاشرتی حالات سے بے خبری کی عکاسی ہوتی تھی اور اگرچہ ان کی بنیاد

پاکستان کی سیاسی اور معاشی صورتحال کے بارے میں غلط فہمی یا خوش فہمی پر تھی تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں اینگلو۔امریکی سامراج کی مخالفت نمایاں تھی۔ یہ تبصرے پنجاب کے درمیانہ طبقہ کے ان عناصر کے جذبات کی ترجمانی کرتے تھے جن کو یہ زعم تھا کہ پنجاب اپنی فوجی طاقت کے باعث عالم اسلام کی قیادت کی اہلیت وصلاحیت رکھتا ہے۔ قیام پاکستان سے کچھ عرصہ قبل لاہور کے روزنامہ ایسٹرن ٹائمز میں اس موضوع پر دو ایک مضامین بھی شائع ہوئے تھے۔ تاہم پنجابی ''بہادروں'' کا یہ زعم غیر حقیقت پسندانہ تھا اور اس کی کوئی ٹھوس بنیاد نہیں تھی۔ پاکستان نومبر 1947ء میں ایک آزاد و خودمختار ملک نہیں تھا۔ اس کی حیثیت ایک برطانوی ڈومینین (Dominion) کی تھی۔ یہ برطانوی دولت مشترکہ کا رکن تھا اور بقول ونسٹن چرچل (Winston Churchill) برطانوی ایمپائر کا ہی دوسرا نام تھا۔ پاکستان کا ماسکو میں کوئی سفیر نہیں تھا اور وہاں برطانوی سفیر ہی پاکستانی مفادات کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ پاکستانی فوج انگریزوں کے اس قدر کنٹرول میں تھی کہ اس کے کمانڈر انچیف جنرل گریسی (Gracy) نے کشمیر میں مداخلت کے بارے میں قائداعظم جناح کا حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ پاکستان کی سول انتظامیہ اور معیشت پر بھی انگریزوں کا ہی غلبہ تھا۔ مزید برآں ''پنجابی زعم'' حکومت پاکستان کے اس اندازفکر سے مختلف تھا کہ امریکہ روس کے خلاف پاکستان کی اسی طرح مالی اور فوجی امداد کرے گا جس طرح کہ وہ ان دنوں یونان اور ترکی کی کر رہا تھا۔ اکتوبر 1947ء میں یہ سرکاری اندازفکر اور بھی پختہ ہو گیا تھا جبکہ وارسا (Warsaw) میں کمیونسٹ ممالک کی کانفرنس میں ایک کمیونسٹ انفرمیشن بیورو قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔

پنجاب کے درمیانہ طبقہ میں یہ زعم ولولہ انگیز ''اسلامی نظموں'' اور ''اسلامی ناولوں'' کی پیداوار تھا۔ اس طبقہ کے بیشتر عناصر اس قدر کم علم اور کم فہم تھے کہ انہیں شعور ہی نہیں تھا کہ بورژوا نیشنلزم کے جدید دور میں محض مذہبی نعروں کے زور پر کوئی ایسی بین الاقوامی تنظیم وجود میں نہیں آ سکتی جو سیاسی، فوجی اور معاشی لحاظ سے مؤثر ہو۔ پاکستان کی معیشت زرعی تھی۔ اس کا طریقہ پیداوار بہت ہی پرانا تھا۔ صنعتی لحاظ سے اس ملک کی حیثیت ایک صحرا کی سی تھی اور مسلم لیگ کے بیشتر قائدین اس ملک کو جدید تعمیر و ترقی کی راہ پر ڈالنے کے عظیم کام کی طرف توجہ کرنے کی بجائے متروکہ جائیدادوں کی لوٹ کھسوٹ میں یا باہمی کشمکش اقتدار میں شب و روز مصروف

تھے۔ مشرق وسطیٰ کے دوسرے اسلامی ممالک کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی صورتحال بھی ایسی ہی تھی اور وہ اپنی روزمرہ کی قومی ضروریات کے لئے بھی اینگلو۔امریکی بلاک کے دست نگر تھے۔ ایسے ممالک کے مؤثر اتحاد اور اس اتحاد کی بنا پر اسلام کی بین الاقوامی عظمت کی بحالی کا خواب صرف وہی عناصر دیکھ سکتے تھے جن کا سرمایۂ علم و دانش صرف ''اسلامی نظموں''، ''اسلامی ناولوں'' اور ''اسلامی فلموں'' تک محدود تھا۔ یہ عناصر جن میں اخبار نویسوں کی بھی اچھی خاصی تعداد تھی، پاکستان کے اور دوسرے ممالک کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام میں کوئی بنیادی تبدیلی لائے بغیر ساری دنیا میں اسلام کی بالادستی قائم کرنے کے متمنی تھے۔ سرسید احمد خان کے بقول ان کو اتنا تو معلوم نہیں تھا کہ جدید توپ کی دم کدھر ہے اور منہ کدھر ہے لیکن یہ جذباتی نعروں کے گھوڑے پر سوار ہو کر ساری دنیا کو فتح کرنے خواب دیکھتے تھے۔ ان عناصر میں ڈاکٹر عمر حیات ملک اور چودھری نذیر احمد خان جیسے متعدد پروفیسر اور ڈاکٹر بھی شامل تھے جن کا انگریزی زبان میں تحریری یا تقریری بحث کا معیار کسی دور افتادہ گاؤں کے ملا کے وعظ کے معیار سے زیادہ بلند نہیں ہوتا تھا۔ یہ ملانٹے اپنی انگریزی دانی سے سادہ لوح مسلم عوام اور بالخصوص مسلم نوجوانوں کو اس غلط فہمی یا خوش فہمی میں مبتلا رکھتے تھے کہ جب عالمگیر اسلامی محاذ قائم ہو جائے گا تو مسلمانوں کے سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔

پنجاب کے ''تعلیم یافتہ'' درمیانہ طبقہ کے ان عناصر میں لاہور کے لا کالج کا پرنسپل حسن بھی شامل تھا۔ اس نے اسی اسلامی جذبے کے تحت پاکستانی نوجوانوں کی ایک تنظیم بنام ''انجمن شبان المسلمین الباکستان'' بنائی جس کا نصب العین اور موٹو یہ تھا کہ اس کے ارکان اللہ کی راہ میں اپنا سب کچھ قربان کرنے پر ہر وقت تیار رہیں گے اور اس کا پروگرام یہ تھا کہ پہلے ایک آل پاکستان مسلم یوتھ کنونشن اور پھر ایک آل مسلم ورلڈ یوتھ کنونشن منعقد کرے گی اور کوشش کرے گی کہ اس کا الحاق قاہرہ میں قائم شدہ مسلم نوجوانوں کی جماعت سے ہو جائے۔ اس تنظیم کے سرپرستوں میں پاکستان دستور ساز اسمبلی کا رکن پروفیسر اشتیاق حسین قریشی بھی شامل تھا۔[22] اسی نام کی ایک انجمن بغداد میں بھی تھی جس کے صدر السید محمد رؤف کا موقف یہ تھا کہ اگر 40 کروڑ مسلمان جو دنیا کے دور دراز حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں متفق ہو جائیں تو ایک ایسی قوت وجود میں آئے گی جس کو کوئی دبا نہیں سکتا اور کوئی استعماری طاقت اس پر غالب نہیں آسکتی اور جس کا لازمی

نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا میں امن وامان قائم ہو جائے گا جس کی بنیاد وحی الٰہی یعنی اسلام ہوگی۔[23] مصر میں اسی قسم کی ایک انجمن بنام اخوان المسلمین قائم تھی۔ یہ مسلم نوجوانوں کی احیائی تنظیم تھی اور اس کا سیاسی پروگرام یہ تھا کہ مصر کو برطانوی سامراج کے چنگل سے آزاد کرایا جائے گا۔ چونکہ یہ تنظیم قربانی کے جذبے سے سرشار تھی اور اس کے ارکان اپنے نصب العین کی تکمیل کے لئے عوامی مظاہروں کے علاوہ مسلح جدوجہد بھی کرتے تھے اس لئے مصر کے غریب اور محب الوطن عوام الناس میں یہ بہت مقبول تھی اور مصری حکومت اس تنظیم کے صدر حسن البنا سے خوفزدہ رہتی تھی۔ چنانچہ حکومت پاکستان کی دعوت پر نومبر کے تیسرے ہفتے میں مصری اخبار نویسوں کا جو وفد پاکستان آیا اس میں اخوان المسلمین کا نائب صدر اور جریدہ اخوان المسلمین کا ایڈیٹر صالح الشماوی بھی شامل تھا۔ یہ شخص اپنے ساتھ مولانا شبیر احمد عثمانی اور وزیر اعظم لیاقت علی خان کے نام حسن البنا کے تحریری پیغامات لایا تھا۔ جن میں یقین دلایا گیا تھا کہ ''پاکستانی مسلم برادران اپنے آپ کو تنہا نہ سمجھیں۔ سارا عالم اسلام اور بالخصوص عرب اقوام ان کی پشت پر ہیں اور وہ اخوان المسلمین کی حمایت پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اللہ کے احکامات پر عمل کریں اور قرآن پاک کے بنائے ہوئے راستے پر چلیں تو ہم سارے مسلم ممالک میں اتحاد پیدا کریں گے''[24] اور یہ کہ ''ہمیں امید ہے کہ اسلامی مملکت پاکستان اسلامی تہذیب کا احیا کرے گی۔ اس مملکت کا کاروبار اسلامی اصولوں پر چلے گا اور اس طرح یہ دنیا کے مسلمانوں کے لئے ایک زندہ مثال قائم کرے گی۔''[25]

جب مصری اخبار نویسوں کا یہ وفد لاہور پہنچا تو نوائے وقت نے ''اسلامی ممالک کی کانفرنس'' کے عنوان سے ایک اور اداریہ لکھا جس کے آخر میں یہ کہا گیا تھا کہ ''مسلم ممالک میں ایک ایسی اسلامی جمہوری معیشت قائم کرنی چاہیے جو ان کی معاشی پست حالی اور قدامت کو دور کر کے اندرونی طور پر غربت، مفلسی، اور ''تفاوت دولت'' سے نجات دلا سکے اور خارجی طور پر وہ امریکہ اور برطانیہ کی سرمایہ دارانہ معیشت کے نتائج اور خطرات سے نجات پا سکیں مثلاً ایران، عراق اور سعودی عرب اپنا تیل خود اپنے کام لائیں۔ مصر اور ترکی امریکہ کے مال کا بازار نہ بن سکیں۔ پاکستان غیر ملکی کروڑ پتیوں کے حرص و آز کا شکار نہ ہو جائے۔ کون اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ اسلامی ممالک باہمی تجارت کو فروغ دے کر سرمایہ دار ملکوں کا بازار ہونے سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ سیاست کے سلسلے میں ہمیں ایک ایسے متحدہ طرز عمل کے احکامات پر غور کرنا ہے کہ ہم دنیا

کی بڑی بڑی طاقتوں کی بیرونی پالیسیوں کا آلہ کار اور وسیلہ نہ بن سکیں جیسے آج ترکی اور ایران بن رہے ہیں۔تمام اسلامی ممالک کی ایک متحدہ اور کامل طور سے آزاد بین الاقوامی حیثیت ہوتا کہ امریکہ اور روس کی طرح دنیا میں ایک تیسرا بڑا طاقتی مرکز بن سکے اور وہ طاقتی مرکز امن عالم کے قیام کی کوششوں میں سب سے اہم اور بڑا عنصر ثابت ہو۔"[26] نوائے وقت کا عالم اسلام کو تیسرا بڑا طاقتی مرکز بنانے کا عزم بہت بلند تھا لیکن اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ اسلامی جمہوری معیشت سے اس کی کیا مراد ہے اور یہ معیشت سرمایہ دارانہ اور سوشلسٹ معیشتوں سے کس طرح مختلف ہوگی اور اس نے یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ ایران، عراق، مصر، سعودی عرب اور متعدد دوسرے مسلم ممالک کے بادشاہوں، شیوخ اور جاگیرداروں کو اس کے عظیم الشان پروگرام کو جامۂ عمل پہنانے پر کس طرح آمادہ کیا جاسکے گا۔اگرچہ 1947ء کے اواخر میں ان ممالک کے عوام الناس میں سامراج دشمنی کا سیلاب آیا ہوا تھا لیکن ان کے حکمرانوں کا پروگرام وہی تھا جو پاکستان کے حکمرانوں کا تھا یعنی یہ کہ ترکی اور یونان کی طرح امریکہ سے مالی اور فوجی امداد حاصل کی جائے گی اور ایک اسلامی بلاک تشکیل کر کے اینگلو۔امریکی طاقتوں کی سرپرستی میں روس کے خلاف مشترکہ محاذ بنایا جائے گا۔

22؍نومبر کو جب مصری اخبار نویس لاہور میں تھے تو مقامی اخبارات کی طرف سے ان کے اعزاز میں دی گئی ایک دعوت میں ایک شخص اقبال شیدائی کی تحریک پر ایک اسلامک ورلڈ ایسوسی ایشن آف پاکستان کا قیام عمل میں آیا جبکہ پنجاب کے وزیراعلیٰ خان افتخار حسین آف ممدوٹ اور مرکزی وزیر بحالیات راجہ غضنفر علی خان بھی موجود تھے۔ پنجاب کے بزرگ اخبار نویس اور سیاسی لیڈر مولانا ظفر علی خان نے اس موقع پر اپنی تقریر میں کہا کہ "دنیا کے مسلمانوں کا مستقبل صرف اسی صورت میں محفوظ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایک اسلامی خاندان کی صورت میں متحد و منظم کریں۔اس نے انقرہ کو اسلام کا بازوئے شمشیرزن، قاہرہ کو اسلام کا دماغ اور کراچی کو اسلام کا قلب قرار دیا اور کہا کہ اسلامک ورلڈ ایسوسی ایشن آف پاکستان، افغانستان، ایران، لبنان، شام اور انڈونیشیا کی حمایت سے عالمی امور میں مسلمانوں کی عظمت بحال کر سکے گی۔" اقبال شیدائی نوائے وقت کا ہیرو تھا۔27؍اکتوبر کو اس نے ایک اخباری انٹرویو میں تجویز پیش کی کہ ایک پاکستانی مسلم ورلڈ ایسوسی ایشن قائم کی جائے تاکہ مشرق وسطیٰ کے ممالک اسلامیہ کو ثقافتی اتحاد کی لڑی میں منسلک کیا جاسکے۔نوائے وقت نے 30؍اکتوبر اور 3؍نومبر کو اپنے دو اداریوں

میں اقبال شیدائی کی اس تجویز کی پرزور تائید کی اور یہ خواہش ظاہر کی کہ پاکستان کو عالم اسلام کی رہنمائی کا حق حاصل ہونا چاہیے۔ 27 نومبر کو نوائے وقت نے اقبال شیدائی کی اسلامک ورلڈ ایسوسی ایشن کے قیام کا خیر مقدم کیا۔ اس کی رائے یہ تھی کہ ''اگر اسلامی ملکوں کا آپس میں رابطہ قائم ہو جائے۔ وہ ایک دوسرے کی امداد کے لئے آمادہ ہو جائیں اور اپنے مسائل کو حل کرنے کے لئے...... جو اس لحاظ سے مشترک ہیں کہ سب ہی اسلامی ممالک غیر ملکی استبداد اور شہنشاہیت کے جارحانہ اقدامات کے خلاف اپنا بچاؤ چاہتے ہیں...... مشترکہ قدم اٹھائیں تو نہ صرف ان کے پیچیدہ مسائل آسانی سے حل ہو جائیں گے، اسلامی ملکوں کو بین الاقوامی سیاسیات میں مؤثر پوزیشن بھی حاصل ہو جائے گی۔ اس وقت بین الاقوامی سیاست کے لحاظ سے دنیا دو کیمپوں میں منقسم ہے...... اینگلو۔ امریکن کیمپ اور روسی کیمپ...... دنیا کے باقی ملکوں کی طرح ہر مسلمان ملک اس وقت یہ سوچ رہا ہے کہ وہ کس بلاک کا ساتھ دے؟ روسی بلاک کا یا اینگلو۔ امریکن بلاک کا؟ کوئی ملک اس قابل نہیں کہ دونوں کیمپوں سے بے تعلق رہے لیکن فرداً فرداً کوئی اسلامک ملک اس قابل نہیں کہ وہ کسی بلاک سے بھی آبرومندانہ سمجھوتہ کر سکے یا اس کے تعاون کی بنیاد ایسی ہو کہ وہ اپنی سیاسی و اقتصادی آزادی کو برقرار رکھ سکے۔ لیکن اگر سب اسلامی ملک مل کر اپنا ایک بلاک قائم کر لیں تو بین الاقوامی سیاسیات میں یہ تیسرا بلاک ہوگا اور مشرق وسطیٰ کے اسلامی ممالک اور افغانستان اور پاکستان کی جغرافیائی اور جنگی اہمیت کے پیش نظر کچھ عجب نہ ہوگا کہ قوت کا توازن اسی بلاک کے ہاتھ میں ہو اور یہ بلاک باقی دونوں بلاکوں میں جس کسی سے بھی تعاون کرے اس سے ہر اسلامی ملک کے حق میں باعزت شرائط منوا سکے۔ اس وقت بھی یو۔ این۔ او میں تو اسلامی ملکوں کو نمائندگی حاصل ہے۔ اگر وہ متحد ہو جائیں تو ان کی آواز کافی مؤثر ثابت ہو سکتی ہے۔ اسلامک ورلڈ ایسوسی ایشن کا قیام اسلامی ممالک کے اتحاد کی طرف پہلا قدم ہے۔ الحمداللہ یہ شرف پاکستان کے حصے میں آیا کہ اس ادارہ کی سب سے پہلی شاخ یہاں قائم ہوئی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ بہت جلد باقی اسلامی ملکوں میں بھی ایسی جماعتیں قائم ہو جائیں گی اور اس کے بعد ایک عالمگیر اسلامی کانفرنس میں ایک عالمگیر اسلامی ادارہ کی بنیاد رکھی جائے گی...... اسلامی ملکوں میں اس وقت سب سے اہم رجحان انہیں اس تحریک کی طرف لے جا رہا ہے جو کہیں نمایاں ہو چکی ہے اور کہیں ابھی منتظر غور ہے اور جس کا نعرہ ''اسلام کی طرف لوٹو'' ہے۔ مشرق وسطیٰ میں اخوان المسلمین کی طاقتور تحریک اسی

رجحان کی پیداوار ہے۔ ایران اور ترکیہ تک میں یہ رجحان روزافزوں ترقی پذیر ہے۔ انڈونیشیا میں بھی سب سے طاقتور اور واحد پارٹی اسلامی جماعت ہے۔ پاکستان میں بھی یہ تحریک ابھر رہی ہے اور خوشی کا مقام ہے کہ نسل نو خاص طور پر اس سے متاثر ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اسلامک ورلڈ ایسوسی ایشن کے قیام سے اس تحریک کو بڑی تقویت پہنچے گی۔"[27]

نوائے وقت کا مذکورہ اداریہ اینگلو۔امریکی سامراج کی خواہش کے عین مطابق تھا۔ کیونکہ اسے ہیئت میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے دلچسپی صرف اصلیت میں تھی۔ قبل ازیں 28 ستمبر کو مولانا شبیر احمد عثمانی اس مقصد کے تحت اپنی آل پاکستان عربک سوسائٹی کے زیر اہتمام سارے مسلم ممالک کی ایک سالانہ کانفرنس بلانے کے ارادے کا اعلان کر چکا تھا۔ 21 اکتوبر کو اسلامک ورلڈ نیشنز آرگنائزیشن و روابط عالم اسلامی کے سیکرٹری مولانا سیفی ندوی کا اعلان یہ تھا کہ 1948ء کے اوائل میں اسلامی ممالک کے ہر مکتب فکر کے قائدین کی ایک کانفرنس منعقد کی جائے گی۔ 24 اکتوبر کو بغداد سے خبر یہ تھی کہ وہاں کے سیاسی حلقے مشرق وسطیٰ کے تحفظ کے لئے تمام اسلامی ممالک کا ایک مشرقی بلاک بنانے پر غور و خوض کر رہے ہیں اور 26 اکتوبر کو بغداد کی جمعیت الشباب العربیہ کے صدر سید محمد رؤف کی یہ اپیل شائع ہوئی تھی کہ ایک عالمگیر اسلامی محاذ بنایا جائے۔ 29 اکتوبر کو حکومت پاکستان کے سرکاری نمائندہ فیروز خان نون نے یہ امید ظاہر کی تھی کہ عنقریب ترکی کی زیر سرکردگی ایک مسلم بلاک کی تشکیل عمل میں آجائے گی۔ یکم نومبر کو صوبہ سرحد کے خان عبدالقیوم خان کا مطالبہ یہ تھا کہ اسلام کو لاحق شدہ خطرے کے مقابلے کے لئے جلد از جلد ایک پان اسلامک کانفرنس بلائی جائے۔ نومبر کے اوائل میں کراچی کے مسلم لیگی لیڈر یوسف ہارون نے لندن کے ڈارچسٹر (Dorchester) ہوٹل میں مصر کے ایک مذہبی لیڈر شیخ مصطفی مومن کو تجویز پیش کی تھی کہ اخوان المسلمین اور مصر کی دوسری جماعتوں کے نمائندوں کا وفد کراچی بھیجا جائے اور قائداعظم سے ایک اسلامی کانفرنس کے انعقاد کے بارے میں بات چیت کی جائے۔ شیخ مومن نے یوسف ہارون کی اس تجویز سے اتفاق کیا تھا اور امید ظاہر کی تھی کہ مشرقی یورپ میں قائم شدہ کمیونسٹ انفرمیشن بیورو کے خطوط پر مسلم ممالک کی یونین سے عالم اسلام مکمل تباہی سے بچ جائے گا۔[28] نومبر کے تیسرے ہفتے میں لاہور کے لاء کالج کے پرنسپل حسن نے ایک انجمن شبان المسلمین الباکستان قائم کر کے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اس انجمن کے زیر اہتمام ایک آل مسلم ورلڈ یوتھ کنونشن قائم کیا

جائے گا۔ 21؍نومبر کو فیروز خان نون مشرق وسطیٰ کے دورے سے واپس کراچی☆ پہنچا تھا اور اس کے دو تین دن بعد قاہرہ سے موصول شدہ یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ ''اسلامی ملکوں کے فرمانرواؤں، قائدین، اور مدبروں میں ایک متحدہ عالمگیر اسلامی بلاک کے قیام کی تجویز پر اس وقت سنجیدگی کے ساتھ غور کیا جا رہا ہے اس تجویز کی کامیابی کے امکانات اس وقت بہت روشن ہیں۔ مشرق وسطیٰ کے مسلمان مدبر اور قائدین اس امر پر غور کر رہے ہیں کہ روس اور اینگلو۔امریکن کشمکش کے پیش نظر مشرق وسطیٰ کے مسلمان ملکوں کو ترکی، ایران، افغانستان اور پاکستان سے گہرا رابطہ اتحاد قائم کرنا چاہیے تاکہ یہ ملک دونوں بلاکوں میں سے کسی ایک کا آلۂ کار بننے کی بجائے ایک تیسرا بلاک قائم کر سکیں جو سیاسیات عالم پر آزادانہ اثر انداز ہو سکے۔ عرب لیگ کو ایک عالمگیر اسلامی لیگ بنانے کی تجویز بھی پیش کی جا چکی ہے اور کوشش یہ ہے کہ ترکیہ، سعودی عرب، مسئلہ فلسطین، روس کے بڑھتے ہوئے خطرے اور کشمیر پر انڈین یونین کی فوجوں کی یلغار نے خاص طور پر مسلمان ملکوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ بین الاقوامی سیاسیات میں اپنا متحدہ محاذ قائم کریں۔''[29]

روسی بلاک اور اینگلو۔امریکی بلاک سے ہٹ کر عالم اسلام کا تیسرا بلاک بنانے کا خواب کیوں پورا نہیں ہو سکتا تھا......؟

برطانیہ اور امریکہ میں ایسے سیاسی مدبرین اور قائدین کی کمی نہیں تھی جن کو ان میں سے کسی تجویز پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ ان کی رائے یہ تھی کہ اگر مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک ''اسلام کی طرف لوٹو'' کے نعرے کے تحت بزعم خویش کسی بھی حیثیت میں متحد ہو جائیں تو انہیں بآسانی روس کی ''استبدادیت'' کے خلاف صف آرا کیا جا سکے گا اور اس طرح سامراجی مفادات کے تحت نہ صرف نہر سویز کا بلکہ ایران، عراق اور سعودی عرب میں تیل کے ذخائر کا بھی تحفظ ہو سکے گا۔ یہ مدبرین، جن میں برطانیہ کا وزیر خارجہ ارنسٹ بیون (Ernest Bevin) اور وزیر امور دولت مشترکہ نوئیل بیکر (Noel Baker) بھی شامل تھے، افغانستان اور پاکستان کو ان کی جغرافیائی اور جنگی اہمیت کے پیش نظر بطور مالی و فوجی امداد مناسب انعام دینے پر بھی آمادہ تھے۔ انہیں یقین تھا کہ عرب ممالک میں برطانیہ اور امریکہ کے خلاف روز افزوں عوامی مظاہروں کے باوجود ان

☆ کراچی اُس زمانے میں پاکستان کا دارالحکومت تھا۔

ممالک کے بادشاہوں، شیوخ اور جاگیرداروں کی حکومتوں کو اینگلو۔امریکی بلاک کے ساتھ نتھی کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ جہاں تک ترکی کا تعلق تھا وہ پہلے ہی اپنی تقدیر امریکہ سے وابستہ کر چکا تھا۔ اُس وقت ایران برطانیہ کا طفیلی ملک تھا اور امریکی ماہرین بھی وہاں مصروف عمل تھے۔ افغانستان کی حیثیت برطانیہ کی زیرسرپرستی ایک نیم آزاد بفرسٹیٹ (Buffer State) کی تھی اس لئے اس کے روس کے ساتھ جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور پاکستان کے ارباب اقتدار امریکہ سے مالی و فوجی امداد لینے کے لئے بیتاب تھے۔ کراچی میں ہر وزیر اور اعلیٰ سرکاری افسر امریکہ سے امداد کی باتیں کرتا تھا۔

لیکن اس سامراجی منصوبے کے راستے میں پہلی رکاوٹ تو یہ تھی کہ تقریباً سارے عرب ممالک میں برطانیہ اور امریکہ کے خلاف بے انتہا برہمی پائی جاتی تھی اور اس بنا پر ان ممالک کا کوئی فرمانروا کھلم کھلا امریکہ اور برطانیہ کی کٹھ پتلی کا کردار ادا کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ عرب عوام کا گزشتہ 30 سال کا تجربہ یہ تھا کہ وہ پہلی جنگ عظیم کے نتیجے میں ترکوں کے استبدادی چنگل سے نجات حاصل کر کے برطانیہ کے سامراجی شکنجے میں جکڑے گئے تھے۔ دوسری رکاوٹ یہ تھی کہ عربوں اور عجمیوں کا تاریخی تضاد بہت شدید تھا لہٰذا ترکی و ایران کو عرب ممالک کے ساتھ کسی بلاک کی صورت میں نتھی کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ چوتھی رکاوٹ یہ تھی کہ فلسطین کے مسئلہ پر اقوام متحدہ میں پاکستانی مندوب کی جانب سے عربوں کے موقف کی پرزور حمایت کے باوجود عرب ممالک میں ایسے بااثر سیاسی عناصر موجود تھے جو پاکستان کے قیام کو برطانوی سامراج کی سازش کا نتیجہ سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ برطانیہ نے اپنے سامراجی مفاد کے تحت جس طرح فلسطین کو تقسیم کروایا تھا اسی طرح اس نے ہندوستان کو تقسیم کر کے مذہب کے نام پر اپنی ایک پٹھو ریاست قائم کی ہے۔ پانچویں رکاوٹ یہ تھی کہ عرب ممالک کے مسلم عوام پر مذہب کی گرفت بہت ہی ڈھیلی تھی۔ ان میں سیکولر عرب نیشنلزم کا بول بالا تھا اور وہ اپنے آپ کو پہلے عرب اور پھر مسلمان تصور کرتے تھے۔ وہ اس تاریخی حقیقت کو فراموش نہیں کر پائے تھے کہ ترکوں نے مذہب کا نام لے کر ان پر تقریباً پانچ سو سال تک اپنا استبدادی اقتدار قائم رکھا تھا۔ انہیں خطرہ تھا کہ برطانیہ اور امریکہ اپنے سامراجی مفادات کے فروغ و تحفظ کے لئے مشرق وسطیٰ پر پھر ترکوں کی بالادستی قائم کر دیں گے۔ چھٹی رکاوٹ یہ تھی کہ خود عرب ممالک میں بھی معاہدہ سعدآباد اور عرب لیگ کے قیام

کے باوجود مکمل اتحاد نہیں تھا مثلاً شرق اردن کا شاہ عبداللہ شام کو اپنے زیر نگیں کرنے کا متمنی تھا اور شام کے ارباب اقتدار کی نظریں اپنے سابق صوبہ لبنان پر لگی ہوئی تھیں۔ ساتویں رکاوٹ یہ تھی کہ تیرہ سو سال کی اسلامی تعلیمات کے باوجود مختلف عرب قبائل کی باہمی رقابتوں اور دشمنیوں میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی مثلاً شرق اردن اور عراق کے ہاشمیوں کے لئے حجاز پر سعودیوں کا تسلط نا قابل برداشت تھا اور آٹھویں اور سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ ہندوستان کے ارباب اقتدار مسلم ممالک کے اس قسم کے گٹھ جوڑ کے خلاف تھے اور برطانیہ و امریکہ میں کوئی شخص بھی ہندوستان کی خفگی مول لے کر اس اسلامی منصوبے پر عمل کرنے کے حق میں نہیں تھا بلکہ دونوں سامراجی ممالک میں ایسے سیاسی مدبرین اور قائدین کی تعداد بہت زیادہ تھی جو یہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کو پورے ایشیا کا لیڈر بنایا جائے اور پھر مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید کے فوجی منصوبوں میں اس سے کلیدی کردار ادا کروایا جائے۔ ان کی رائے میں ایشیا میں امریکہ و برطانیہ کا کوئی بھی فوجی منصوبہ ہندوستان کی شمولیت کے بغیر مؤثر و کارآمد نہیں ہو سکتا تھا۔ اگرچہ ہندوستان کا وزیراعظم جواہر لال نہرو سوشلسٹ ہونے کا دعویدار تھا لیکن دراصل وہ اپنے نائب وزیراعظم سردار پٹیل کی طرح سوشلزم کا بدترین دشمن تھا اور اس وجہ سے وہ مشرق بعید میں کمیونسٹ بغاوتوں کے کچلنے میں برطانیہ سے تعاون کر رہا تھا۔ مزید برآں چین میں کمیونسٹ انقلاب کی متوقع کامیابی کے پیش نظر امریکہ اور برطانیہ کی نظر میں ہندوستان کی اہمیت زیادہ بڑھ چکی تھی اور وہ اتنے بڑے غیر کمیونسٹ ملک کی ناراضگی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

ترکی، مصر اور دوسرے عرب ممالک پاکستان کو اسلامی بلاک کی قیادت دینے پر آمادہ نہ تھے

مذکورہ ساری رکاوٹوں کے باوجود پاکستان کے جو عناصر اپنی سرکردگی میں اسلامی بلاک کے قیام کا خواب دیکھ رہے تھے وہ اس حقیقت کو بھی نظر انداز کر رہے تھے کہ نہ صرف ترکی کے بلکہ مصر کے بہت سے سیاسی مدبرین اور قائدین بھی پاکستان کو اسلامی بلاک کی قیادت سپرد کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ نومبر کے تیسرے ہفتے میں حکومت پاکستان کی دعوت پر مصر کے دو اخبار نویسوں، صالح الشماوی ایڈیٹر اخوان المسلمین اور عبدالقادر حمزہ ایڈیٹر البلاغ پر مشتمل جو وفد

پاکستان آیا تھا ان میں سے کسی نے کسی موقع پر بھی پاکستانیوں کو عالم اسلام کی قیادت کا تحفہ پیش نہیں کیا تھا۔ صالح الشماوی مصر کی احیائی تنظیم اخوان المسلمین کا رکن تھا اور اس نے ہر جگہ لوگوں کو یہ بتایا تھا کہ اس کی جماعت پاکستان میں بھی اپنی شاخیں قائم کرنا چاہتی ہے۔ مصر میں نوجوانوں کی ایک انتہا پسند جماعت بنام ینگ ایجپٹ سوسائٹی (Young Egypt Society) یا جمعیۃ الشباب المصر بھی تھی جس کے سیکرٹری ابراہیم زیدی کا دعویٰ یہ تھا کہ جب مصر کو انگریزوں کے چنگل سے آزادی مل جائے گی تو یہ ملک بحیرہ روم کے علاقے کی عظیم ترین طاقت ہوگا اور اسی حیثیت میں یہ عالم اسلام کا قائد ہوگا۔ اس جماعت کا سربراہ ایک شخص احمد حسین تھا جو اپنی تحریروں اور تقریروں میں تشدد کی تلقین کرتا تھا۔ نتیجتاً اس کے ارکان کی قوم پرستی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی اور یہ آئے دن بموں کے دھماکوں اور قتل کی وارداتوں کا ارتکاب کرتے تھے۔ اس جماعت کا موٹو یا نصب العین یہ تھا کہ مصر کی شان وشوکت کو بحال کیا جائے اور یہ نہر سویز کے علاقے سے برطانوی افواج کے انخلا کے لئے عوامی جدوجہد کی صف اول میں تھی۔ ابراہیم زیدی کے ایسوسی ایٹیڈ پریس آف امریکہ کے ساتھ انٹرویو کے مطابق اس جماعت کا پروگرام یہ تھا کہ

1۔ مصر اور سوڈان کا ادغام کیا جائے گا۔ مصر کی آبادی دو کروڑ اور سوڈان کی آبادی ستر لاکھ ہے۔

2۔ عرب مملکتوں کے ساتھ اتحاد کیا جائے گا۔ سویز کے مشرق میں عرب ممالک کی آبادی تین کروڑ ہے اور نہر سویز کے مغرب میں ان کی آبادی آٹھ کروڑ ہے۔

3۔ عالم اسلام کی قیادت حاصل کی جائے گی۔ یہ قیادت پاکستان کی بجائے مصر کو ملنی چاہیے کیونکہ مصر کو عالم عرب کی حمایت حاصل ہے۔

ابراہیم زیدی نے مزید کہا کہ ''بحر اوقیانوس سے لے کر بحر الکاہل تک پورے ایشیا اور افریقہ میں ایسا کوئی ملک نہیں جو طاقت اور وقار کے لحاظ سے مصر کے برابر ہو۔ اندرون ملک ہم انفرادی آزادی کے جمہوری اصولوں پر اور معاشی سلامتی کے سوشلسٹ اصولوں پر عمل کریں گے۔ جہاں تک خارجہ پالیسی کا تعلق ہے ہم سامراجیت اور جارحیت کے خلاف لڑیں گے اور انصاف پر مبنی امن کا تحفظ کریں گے۔ دنیا کی طاقتی سیاست میں ہمارا ملک مشرق ومغرب کے درمیان ایک بفر کا کردار ادا کرے گا۔''[30] ابراہیم زیدی کا یہ انٹرویو اہم تھا۔ اوّل اس لئے کہ امریکی خبر رساں ایجنسی نے اس کی خوب تشہیر کر کے یہ تاثر دیا تھا کہ امریکہ مصر کے احیائی مسلمان عناصر کے علاوہ

قوم پرست عناصر کی بھی حوصلہ افزائی کر کے نہ صرف ملک میں روس کے اثر ورسوخ کا سد باب کرنا چاہتا تھا بلکہ وہ یہاں سے برطانیہ کے متوقع انخلا کی صورت میں بطور سامراجی طاقت اس کی جگہ لینا چاہتا تھا اور دوئم اس لئے کے مصر میں احیائی تنظیم ''اخوان المسلمین'' کے علاوہ بعض طاقتور قوم پرست عناصر بھی موجود تھے جو نہ صرف مصر کی پرانی شان وشوکت کو بحال کرنا چاہتے تھے بلکہ وہ عالم اسلام کے علاوہ پورے ایشیا اور افریقہ کی قیادت سنبھالنے کا بھی خواب دیکھ رہے تھے۔

ملک فیروز خان نون کو دورۂ مشرق وسطیٰ میں کوئی خاص پذیرائی حاصل نہ ہوئی

28 رنومبر کو مذکورہ انٹرویو کچھ زیادہ ہی اہم دکھائی دینے لگا جب یہ خبر شائع ہوئی کہ ملک فیروز خان نون نے حکومت پاکستان کے نمائندہ کی حیثیت سے تقریباً ایک ماہ تک ترکی، شام، شرق اردن، سعودی عرب، لبنان اور بحرین کا دورہ کیا ہے لیکن وہ اپنے اس دورے میں مصر نہ جا سکا کیونکہ وہاں ہیضہ پھیلا ہوا تھا۔[31] لاہور کے سیاسی حلقوں کی رائے یہ تھی کہ فیروز خان نون کے مصر نہ جانے کی اصل وجہ یہ تھی کہ اسے وہاں اپنی پذیرائی کی توقع نہیں تھی۔ نون برطانوی سامراج کا پشتینی پٹھو تھا اور ان دنوں مصر میں برطانیہ کے خلاف زبردست عوامی مظاہرے ہو رہے تھے۔ ویسے بھی استنبول میں اس کے اس بیان کے بعد کہ ترکی مجوزہ اسلامی بلاک کا لیڈر ہوگا، اس کے دورۂ مصر سے کچھ حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔ فیروز خان نون کے لئے ترکی کے بعد شرق اردن اور سعودی عرب کا دورہ ہی مفید ہوسکتا تھا کیونکہ نوائے وقت کے بقول مشرق وسطیٰ میں شرق اردن انگریزی ملوکیت کا سب سے بڑا مرکز تھا۔[32] اور نیویارک میں سعودی عرب کے سفیر شیخ حافظ وہبہ کو فلسطین کی تقسیم میں صرف روسی سازش دکھائی دیتی تھی۔ اس کی رائے یہ تھی کہ ''روس کی جانب سے تقسیم فلسطین کی حمایت کی وجہ یہ بھی ہے کہ روس فلسطین کو فوجی اڈہ بنا کر بحیرہ روم میں اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتا ہے۔ روس کو یونان میں روک دیا گیا ہے۔ اب وہ فلسطین کا رخ کرے گا۔''[33]

ملک فیروز خان نون نے 19 ردسمبر کو کراچی کے انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل افیئرز میں اپنے دورۂ مشرق وسطیٰ کے تاثرات بیان کئے۔ اس نے بتایا کہ ''مشرق وسطیٰ میں پاکستان کا پروپیگنڈا نہ ہونے کے برابر ہے اور وہاں کے لوگوں کو پاکستان کے بارے میں بہت ہی کم معلومات ہیں۔ ترکی اور عرب ممالک سیاسی راستہ پر ہم سفر نہیں ہیں۔ ترکوں کو شکایت ہے کہ

1918ء کے بعد ان پر جو مصائب نازل ہوئے تھے ان کے ذمہ دار عرب تھے۔ تاہم اب ترکوں میں عربوں کے لئے ہمدردی کے جذبات پائے جاتے ہیں...... ترکی کو روس سے حقیقی خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ ترکوں کا خیال ہے کہ روس کی نظریں درہ دانیال اور باسفورس پر لگی ہوئی ہیں اور وہ بحیرہ روم تک رسائی حاصل کرنا چاہتا ہے۔''[34] فیروز خان نون کی اس تقریر میں مشرق وسطیٰ میں امریکہ و برطانیہ کے عزائم کا کوئی ذکر نہیں تھا البتہ اس نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ''اقوام متحدہ لیگ آف نیشنز کی طرح کسی کی آزادی کا تحفظ نہیں کر سکے گی اور نہ ہی یہ چھوٹی اقوام کو بچا سکے گی۔''

اسلامی بلاک کے قیام میں انگریزوں اور امریکیوں کی دلچسپی

نون کی مذکورہ تقریر سے چند دن قبل کی خبر کے مطابق کراچی میں یوسف اسماعیل کی زیر صدارت اسلامک کونسل آف ورلڈ افیئرز کی برانچ قائم ہو چکی تھی۔ اس سلسلے میں جو جلسہ ہوا تھا اس میں برطانوی پارلیمنٹ کے ایک کنزرویٹو رکن سر ڈیوڈ وی رابرٹس (David V. Roberts) بھی موجود تھا اور پھر 16 ردسمبر کو نیویارک ٹائمز میں ایک کتاب ''ہسٹری آف اسلامک پیپلز'' پر ریویو یہ تھا کہ ''اگرچہ دنیا کے مختلف ممالک میں رہنے والے مسلمان رنگ، نسل اور زبان کے لحاظ سے مختلف ہیں لیکن ان میں مذہب کی وجہ سے جتنی یکجہتی پائی جاتی ہے اتنی کسی اور مذہب کے پیروکاروں میں دکھائی نہیں دیتی۔ مسلمانوں کی اس یکجہتی کی جڑیں اسلامی تاریخ اور روایات میں پھیلی ہوئی ہیں۔'' گویا انگریزوں اور امریکیوں دونوں ہی کو اسلام اور عالم اسلام میں بڑی دلچسپی تھی۔ نیویارک ٹائمز کے بقول اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان دنیا کے جن علاقوں میں آباد تھے ان میں جبرالٹر، درہ دانیال، سویز اور سنگاپور جیسے مقامات بھی تھے جو فوجی نقطہ نگاہ سے بہت اہمیت کے حامل تھے اور ایسے مقامات بھی تھے جو تیل کی دولت سے مالا مال تھے۔ حتیٰ کہ سوویت یونین کے جن علاقوں سے تیل نکلتا تھا وہاں کی آبادی کی بھاری اکثریت بھی مسلمانوں پر مشتمل تھی۔

انگریزی ملوکیت کے سب سے بڑے مرکز شرق اردن اور نوائے وقت کے اسلامی بلاک کے تصور میں یکسانیت

2 رجنوری 1948ء کو شرق اردن کا سفیر برائے افغانستان محمد پاشا الشریقی لاہور سے گزرا تو یہاں اس نے ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ یہ پہلی مرتبہ نہیں ہے کہ

عربوں کو فلسطین سے محروم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ تاہم جس طرح مسلمانوں نے صلیبی جنگوں کو ناکام کرکے فلسطین کا تحفظ کیا تھا وہ اس مرتبہ بھی اسی طرح کامیاب ہوں گے۔ اس نے دنیا کے مسلم ممالک کے ایک بلاک کی تشکیل پر زور دیا اور کہا کہ چونکہ عالم اسلام کے مالی و روحانی روابط کی بحالی کے لئے اتحاد ضروری ہے اس لئے یہ بلاک مشرق اور مغرب کے درمیان طاقتی توازن اور امن کو برقرار رکھنے کے لئے بہت مؤثر ہوگا۔"[35] شرق اردن ایک ایسا ملک تھا جس کے بارے میں نوائے وقت کی رائے یہ تھی کہ "مشرق وسطیٰ میں یہ ملک انگریزی ملوکیت کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ شرق اردن کی آبادی تین لاکھ نفوس پر مشتمل ہے لیکن وہاں ڈیڑھ لاکھ انگریزی فوج رہتی ہے یعنی ہر دو باشندے پر ایک ٹامی اپنے ٹامی گن کے ساتھ۔ پھر بھی شاہ عبداللہ والئی شرق اردن کا کہنا ہے کہ شرق اردن آزاد ہے۔ برطانیہ اور شرق اردن کے درمیان جنگ کے بعد جو معاہدہ ہوا ہے اس کی اصل حقیقت سب کو معلوم ہے۔ عرب اخبارات اور سیاسی جلسوں میں عام طور پر یہ کہا جا رہا ہے کہ "عظیم تر شام" کا منصوبہ برطانیہ ہی کی شہ دینے پر شاہ عبداللہ نے تیار کیا ہے۔"[36]

شرق اردن کے متعلق نوائے وقت کا یہ تجزیہ بالکل صحیح تھا لیکن حیرت کی یہ بات تھی کہ اگرچہ اس اخبار کی رائے میں "عظیم تر شام" کا منصوبہ شاہ عبداللہ نے انگریزوں کی شہ پر تیار کیا تھا لیکن اسے اسلامی بلاک یا اسلامی محاذ کے بارے میں شاہ عبداللہ کے نمائندے کی تجویز سے انگریزوں کا کوئی تعلق دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس مسئلہ پر شرق اردن کے سفیر اور نوائے وقت کے خیالات میں خاصی ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ مثلاً شرق اردن کے سفیر کا کہنا یہ تھا کہ اسلامی بلاک مشرق اور مغرب کے درمیان طاقتی توازن کا کردار ادا کرے گا اور امن کو برقرار رکھے گا۔ اور نوائے وقت کی رائے یہ تھی کہ "جہاں تک بین الاقوامی سیاست کا تعلق ہے اسلامی محاذ نہ تو امریکہ و برطانیہ کے زیر اثر رہے اور نہ روس کے۔ بلکہ وہ مکمل طور سے آزاد و خود مختار حیثیت کا مالک ہوتا کہ اس کرۂ ارض پر تیسرا طاقتی مرکز بن سکے۔ بین الاقوامی سیاست میں اس کا مقصد اسلام کے اعلیٰ نصب العین کے مطابق عالمگیر امن و امان قائم رکھنا اور جنگ زدہ تھکی ہاری دنیا اور اس کے انسانی تمدن کو ایٹم بم کی نذر ہو جانے سے بچانا ہوتا کہ بحیثیت مجموعی انسانی معاشرت و تہذیب کا ارتقا جاری رہے۔ اگر واقعی ہم اس کرۂ ارض پر ایک ایسا اسلامی محاذ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تو آئندہ کا مؤرخ ہمیں انسانی تمدن کا سب سے بڑا محافظ اور معمار قرار دے گا۔ اس لئے کہ

کرۂ ارض پر اسلام کو دوبارہ جگمگانے اور اس کے عظیم الشان پیغام کو پریشان انسانیت تک لے جانے کا یہی راستہ ہے۔ اسی بنا پر ہم کسی ایسے ''اسلامی محاذ'' کے قیام کی رائے نہ دیں گے جو محض بین الاقوامی سیاست کی چالبازیوں اور فریب کاریوں کا آلہ کار ہو۔ ایک بات اور ضروری ہے۔ وہ یہ کہ اس اسلامی محاذ میں دنیا کے تمام مسلم ممالک شامل ہوں قطع نظر اس کے کہ کوئی اسلامی ملک جاگیرداری کا پابند ہے یا سرمایہ داری کا یا جمہوری یا پنچایتی نظام کا۔''[37] اب اسے نوائے وقت کی سادگی کہہ لیجئے یا پرکاری کہ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ جس اسلامی محاذ میں شرق اردن، ترکی، سعودی عرب اور ایران جیسے برطانوی ملوکیت کے طفیلی ملک شامل ہوں گے وہ محاذ آزادو خودمختار کیسے ہوگا؟ اور یہ کہ اگر اسلامی ممالک کا داخلی، معاشی وسیاسی نظام صدیوں پرانا اور ظالمانہ ہوگا تو ان ممالک کے گٹھ جوڑ یا محاذ میں وہ ولولہ وجوش کہاں سے آئے گا جو اس محاذ کو تیسرا طاقتی مرکز بنا سکے گا۔ تیسرا طاقتی مرکز محض کھوکھلے نعروں کے گھوڑے پر سوار ہو کر اور ہوا میں تلواریں لہرانے سے تو قائم نہیں ہوسکتا تھا۔

جن دنوں نوائے وقت نے یہ اداریہ لکھا تھا ان دنوں پاکستانیوں کے بالعموم اور پنجاب کے عوام کے بالخصوص حوصلے بہت پست ہو رہے تھے کیونکہ کشمیر میں ہندوستانی افواج کی پے در پے فتوحات نے نہ صرف پٹھان قبائلیوں کی بہادری کے ڈھول کا پول کھول دیا تھا بلکہ پنجابیوں کی شجاعت کا زعم بھی توڑ دیا تھا۔ چنانچہ نوائے وقت کو پنجابی عوام کا حوصلہ بلند کرنے کے لئے اس مضمون کا چوکھٹا شائع کرنا پڑا تھا کہ ''پاکستان کمزور نہیں۔ ہمارا ملک افغانستان، ایران، ترکی، مصر، فرانس، اٹلی، جرمنی، جاپان، آسٹریلیا سب ملکوں سے بڑا ہے۔ پاکستانی دنیا کے بہترین سپاہی ہیں۔ دو عالمگیر جنگوں کے تجربہ کا نچوڑ یہ ہے کہ دنیا میں بہترین لڑنے والے پاکستانی مسلمان ہیں۔ ماضی میں ہم دوسروں کے لئے لڑتے رہے۔ اگر اپنے خدا، اپنے ملک اور اپنی ملت کے لئے لڑنے کا موقع ملا تو ہمارے جوہر کھلیں گے۔ اسلامی دنیا ہمارے ساتھ ہے۔ انڈونیشیا سے مراکو تک ہماری اسلامی برادری پھیلی ہوئی ہے۔ اقوام اسلام بین الاقوامی سیاسیات میں اپنا جائز مقام حاصل کر کے رہیں گی۔ عالم اسلام میں پاکستان کی پوزیشن قابل رشک ہے۔ پاکستان کو کمزور بنانے والے ففتھ کالم ہیں۔ ففتھ کالم سے خبردار رہیں۔''[38] یہ چوکھٹا اس تلخ حقیقت کی عکاسی کرتا تھا کہ پنجاب کے اسلام پسند نعرہ بازوں کی خود فریبی اور خود پسندی کس قدر غیر حقیقی، کھوکھلی اور بے

بنیاد تھی۔ قطع نظر اس کے کہ عالم اسلام میں پاکستان کی پوزیشن قابل رشک تھی یا نہیں اور قطع نظر اس کے کہ پاکستانی مسلمان دنیا کے بہترین لڑنے والے تھے یا نہیں، ہندوستان نے کشمیر کے بیشتر علاقوں پر بزور قوت قبضہ کرلیا تھا۔ اب اس کے وہاں سے دستبردار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کشمیر پر ہندوستان کے حملے سے قائداعظم جناح کو بہت صدمہ ہوا تھا اور بقول چودھری محمد علی اس بنا پر ان کی صحت بری طرح متاثر ہوئی تھی۔ وہ سخت مایوس تھے اور کہتے تھے کہ پاکستان سے دھوکا کیا گیا ہے اور اسے غلط گاڑی پر سوار کر دیا گیا ہے۔ جب جنوری 1948ء کے اوائل میں شرق اردن کا سفیر لاہور سے گزرا تھا اور اس نے اسلامی بلاک کی باتیں کی تھیں اس وقت ہندوستان تنازعہ کشمیر اقوام متحدہ میں پیش کر چکا تھا اور اس طرح پاکستان کو ایک اور غلط گاڑی میں سوار کر دیا گیا تھا۔

اقوام متحدہ میں کشمیر پر بحث میں کسی اسلامی ملک نے دلچسپی نہ لی

اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں تنازعہ کشمیر پر بحث جنوری 1948ء میں شروع ہوئی جو تقریباً ایک ماہ تک جاری رہی۔ 6رفروری کو سلامتی کونسل کے کینیڈین صدر نے اس مسئلہ پر ایک قرارداد کا مسودہ تیار کیا جس کا لب لباب یہ تھا کہ کشمیر میں مکمل جنگ بندی اور ساری بیرونی افواج کے انخلا کے بعد غیر جانبدار انتظامیہ قائم کی جائے گی اور پھر اقوام متحدہ کی نگرانی میں کشمیری عوام سے استصواب کیا جائے گا۔ چونکہ یہ مسودہ پاکستان کے حق میں تھا اس لئے ہندوستان نے اس مسئلہ پر سلامتی کونسل کی بحث کو ملتوی کروا لیا اور پھر اس نے اپنے گورنر جنرل ماؤنٹ بیٹن کی وساطت سے حکومت برطانیہ پر زبردست دباؤ ڈال کر 21راپریل کو سلامتی کونسل سے ایک بے ضرر سی قرارداد منظور کروالی۔ پہلی قرارداد کا مسودہ برطانیہ کی حکومت کے وزیر خارجہ ارنسٹ بیون اور بعض دوسرے ارکان کی خواہش کے مطابق مرتب کیا گیا تھا جو پاکستان کی وساطت سے مشرق وسطیٰ میں روس کے خلاف ایک اسلامی بلاک بنانے کے حق میں تھے لیکن اس مسودہ کو ترک کر کے دوسری قرارداد برطانیہ کی حکومت کے وزیر خزانہ سٹیفورڈ کرپس (Stafford Cripps) اور بعض دوسرے ارکان کی تجویز کے مطابق منظور کروائی گئی تھی جو عالمی سطح پر سوویت یونین کے خلاف سرد جنگ میں ہندوستان کو استعمال کرنے کا پروگرام رکھتے تھے۔ کرپس اینڈ کمپنی کے

موقف کی کامیابی کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ 25رفروری کو چیکوسلواکیہ میں کمیونسٹ انقلاب کے باعث یورپ میں سرد جنگ کے شعلے بہت بلند ہو گئے تھے اور 28رفروری کو کلکتہ میں ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کی دوسری کانگرس میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ ہندوستان، برما، ملایا اور ایشیا کے دوسرے ممالک میں پرتشدد طبقاتی انقلاب برپا کیا جائے گا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ چین میں کمیونسٹ انقلاب کی کامیابی یقینی نظر آنے لگی تھی اور اس صورتحال میں ہندوستان جیسے غیر کمیونسٹ ملک کے مقامی ارباب اقتدار کو خفا کرنا مناسب نہیں تھا۔ تاہم مصر، شرق اردن، ترکی اور کسی دوسرے اسلامی ملک کو مسئلہ کشمیر میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ انہیں دلچسپی تھی تو صرف اس بات میں تھی کہ کس طرح مشرق وسطیٰ میں سوویت یونین کے اثر ورسوخ کا سدباب کیا جائے۔

ترکی اور عرب ملکوں میں کمیونسٹ خطرہ کا نعرہ اور اس کے مقابلے کے لئے اسلامی بلاک قائم کرنے کے مطالبے

10رمارچ کو قاہرہ سے ایک "مزدور لیڈر" عباس حلیم کا یہ اخباری بیان موصول ہوا کہ عالم عرب زبردست کمیونسٹ خطرے سے دوچار ہے۔ صرف قاہرہ میں کمیونسٹوں کے 43 مراکز قائم ہیں اور 16رمارچ کو افغانستان میں شرق اردن کے سفیر محمد الشریعتی کی لاہور میں تجویز یہ تھی کہ "اقوام متحدہ میں ایک اسلامی بلاک کا قیام عمل میں لایا جائے جو مشرقی و مغربی طاقتوں کے درمیان توازن پیدا کرنے کے کام آئے۔ اس نے کہا کہ اسلامی اخوت کی بنا شناختی موانست اور مشترکہ مذہبی نقطہ پر استوار کرنی چاہیے۔"[39] مارچ کے آخری ہفتے میں ترکی سے رپورٹیں یہ تھیں کہ روس اور ترکی کے تعلقات برابر بگڑتے ہی جارہے تھے اور ان رپورٹوں پر نوائے وقت کا تبصرہ یہ تھا کہ "ماسکو ریڈیو نے ترکیہ کے خلاف مسلسل پروپیگنڈا شروع کر رکھا ہے۔ روس کی یہ "عام خصوصیت" ہے کہ جس ملک میں وہ دست ستم دراز کرنا چاہتا ہے سب سے پہلے ماسکو ریڈیو اس ملک پر نشریاتی حملہ کرتا ہے۔ روسی اخبار بھی جن کی حیثیت نیم سرکاری ہے، ترکیہ کے خلاف پروپیگنڈا میں مصروف ہیں۔ اب انقرہ ریڈیو نے بھی جوابی کاروائی شروع کردی ہے اور اشترا کی روس پر جارحانہ روش اختیار کرنے کا الزام لگایا جارہا ہے۔ ترکیہ کے اخبارات بھی اس جوابی مہم میں اپنے ریڈیو کی پشت پر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ترکی اخبار "الس" کے الفاظ میں دنیا میں پھر

1939ء کے سے حالات پیدا ہو رہے ہیں۔ دنیا دو قوموں میں بٹ چکی ہے۔ ایک طرف اینگلو۔امریکی بلاک ہے اور دوسری طرف اشتراکی روس اور اس کے کٹھ پتلی ممالک۔ دنیا کا کوئی ملک اس وقت غیر جانبدار نہیں رہ سکتا۔ ہر ایک ملک کو ان دونوں بلاکوں میں سے ایک بلاک میں شامل ہونا پڑے گا۔ مشرق وسطیٰ کے اسلامی ممالک بالخصوص ترکیہ کی جغرافیائی پوزیشن اور ان ملکوں کے تیل کے ذخیروں کی وجہ سے دونوں بلاک ان ملکوں کو اپنے ساتھ ملانے کے خواہاں ہیں۔ روس نے اینگلو امریکن بلاک پر الزام لگایا ہے کہ ترکی، مصر، عراق، عرب، ایران اور پاکستان پر مشتمل ایک اسلامی بلاک بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے اور ترک اور عرب، روس پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ ان ملکوں کو مرعوب کر کے اپنے زیر اثر لانا چاہتا ہے۔ ترکیہ کو دھمکیاں اس سلسلہ کی کڑی ہیں۔ عرب لیگ کے لیڈروں نے روس پر یہ الزام بھی عائد کیا ہے کہ ایک روسی فوجی بریگیڈ شمالی فلسطین میں یہودی افواج کی مدد کر رہا ہے۔ اس بریگیڈ میں ایک سو افسر شامل ہیں۔ روس فلسطین کی آڑ لے کر اپنی فوجیں مشرق وسطیٰ میں بھیج کر اسلامی ملکوں میں اپنے قدم جمانا چاہتا ہے۔"[40]

نوائے وقت کا یکم اپریل 1948ء کا یہ اداریہ اس کے 3/نومبر 1947ء کے اس اداریے سے بالکل مختلف تھا جس میں کہا گیا تھا کہ ترکی اسلامی محاذ کی رہنمائی کا مستحق نہیں۔ اول اس لئے کہ عربوں اور ترکی کے درمیان روایتی اختلافات ہیں اور دوئم اس لئے کہ فوجی و معاشی لحاظ سے امریکہ کا دم چھلا بن جانے کے بعد ترکی اپنی وہ آزاد حیثیت کھو بیٹھا ہے جس کے بغیر عالم اسلام کی رہنمائی کا کوئی ملک مستحق قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اور پھر امریکہ پسند ترکی کیونکر ان عرب ممالک کی سرداری کر سکتا ہے جو فلسطین کے معاملے پر اس وقت امریکہ کے خلاف بھرے بیٹھے ہیں۔ لیکن اب نوائے وقت کی رائے میں ترکی فوجی و معاشی لحاظ سے امریکہ کا دم چھلا نہیں تھا بلکہ ایک ایسا مظلوم ملک تھا جس پر روس دست ستم دراز کرنا چاہتا تھا۔ مزید برآں اب امریکہ فلسطین میں یہودیوں کی پشت پناہی نہیں کر رہا تھا بلکہ روس ایک پورے بریگیڈ کے ساتھ ان کی مدد کر رہا تھا کیونکہ وہ فلسطین کی آڑ لے کر اپنی فوجیں مشرق وسطیٰ میں بھیج کر اسلامی ملکوں میں اپنے قدم جمانا چاہتا تھا۔ ترکی کی سیاسی حیثیت اور مسلم ممالک میں سوویت یونین اور اینگلو۔امریکی بلاک کے درمیان رسہ کشی کے بارے میں نوائے وقت کی اس قلابازی کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ چیکوسلواکیہ میں

کمیونسٹ انقلاب اور کلکتہ میں ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کی دوسری کانگرس میں پر تشدد ایشیائی انقلاب کے بارے میں فیصلے کی وجہ سے پوری دنیا میں سرد جنگ اس قدر شدید ہو گئی تھی کہ اب ''آزاد و خود مختار تیسرے اسلامی بلاک'' کے قیام کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔

وزیر خزانہ غلام محمد اور قائداعظم جناح کا اشارہ کہ ہم روس کے خلاف محاذ آرائی میں اینگلو۔امریکی بلاک کا ساتھ دینے پر آمادہ ہیں بشرطیکہ مسئلہ کشمیر میں ہماری مدد کی جائے

نوائے وقت کی مذکورہ قلابازی کی دوسری وجہ یہ تھی کہ پاکستان کے وزیر خزانہ غلام محمد نے 28رفروری 1948ء کو پاکستان کے پہلے مکمل مالی سال کا بجٹ پیش کرتے ہوئے یہ واضح کر دیا تھا کہ کشمیر میں ہندوستان کی جارحیت کے باوجود اور اقوام متحدہ کی جانب سے امریکی دباؤ کے تحت فلسطین کی تقسیم کے فیصلے کے باوجود پاکستان کے حکمران طبقوں کو سب سے زیادہ خطرہ سوویت یونین سے ہی محسوس ہوتا تھا۔ اس کی تقریر یہ تھی کہ ''پاکستان کی شمالی اور مغربی سرحدوں پر عہد ماضی میں ایسی کارروائیاں ہوتی رہی ہیں جو تاریخی نتائج کی حامل تھیں۔ آج کل بھی یہ سرحدیں بہت بڑے مضمرات سے بھرپور ہیں۔ نتیجتاً پاکستان اور اس کی مسلح افواج پر نہ صرف اپنی سرزمین میں امن و امان قائم رکھنے کا فرض عائد ہوتا ہے بلکہ یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ عالمی امن برقرار رکھنے کے کام میں اپنا کردار ادا کریں۔ ہم اتنی اہم ذمہ داری اٹھانے میں فخر محسوس کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی امید کرتے ہیں کہ ہمارے اس کام کی اہمیت کی قدر کی جائے گی۔ پاکستان امن چاہتا ہے۔ ہمارے کوئی جارحانہ عزائم نہیں ہیں اور عام حالات میں ہمیں بہت بڑی افواج کی ضرورت نہیں ہے لیکن ہمارے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم اپنی بری، بحری اور ہوائی فوج کی از سر نو تنظیم کریں تا کہ وہ اپنے سائز میں چھوٹی ہونے کے باوجود ہمارے عوام کے دفاع کے لئے مؤثر حربہ ہوں۔ جیسا کہ قائداعظم نے اگلے دن کہا تھا ہماری مسلح افواج ایسی ہونی چاہئیں جو ہر ممکنہ حملہ آور کے لئے پیدا شدہ تمام ترغیبات کا انسداد کر سکیں۔''[41] غلام محمد کی اس تقریر میں کوئی ابہام نہیں تھا۔ سیاست کے ہر طالب علم نے اس کی اس تقریر سے یہ سمجھ لیا تھا کہ حکومت پاکستان سوویت یونین کے خلاف اینگلو۔امریکی بلاک کے ساتھ نتھی ہونے پر آمادہ ہے بشرطیکہ اسے

مطلوبہ مالی اور فوجی امداد مہیا کی جائے اور ہندوستان کے ساتھ اس کے تنازعہ کشمیر کا خاطر خواہ تصفیہ کروا دیا جائے۔ ان دنوں سلامتی کونسل نے ہندوستان کی خواہش کے مطابق مسئلہ کشمیر پر بحث ملتوی کر رکھی تھی اور پاکستان کا وزیر خارجہ سر محمد ظفر اللہ خان لندن میں برطانوی وزیر اعظم کلیمنٹ ایٹلی کو قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس سلسلے میں کینیڈا کے مندوب نے 6؍فروری 1948ء کو جو قرارداد مرتب کی تھی اس کی منظوری میں کوئی رکاوٹ حائل نہ کی جائے۔

غلام محمد کی اس تقریر کے ہفتہ عشرہ بعد قائداعظم جناح نے بھی اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا۔ انہوں نے سوئٹزرلینڈ کے اخبار ''نیوزیور کرزیتونگ'' (Neue-Zurcher-Zeitung) کے نامہ نگار خصوصی ڈاکٹر ایرک سٹرائف کے اس سوال پر کہ کیا پاکستان اور ہندوستان اپنے اندرونی معاملات میں مل جل کر کام کریں گے؟ نیز کیا وہ زمین پر اور سمندر میں اپنی سرحدوں کی حفاظت کے لئے دست تعاون بڑھائیں گے اور بیرونی حملے کا مل کر مقابلہ کریں گے؟'' یہ جواب دیا کہ ''ذاتی طور پر میرے دل میں ذرا بھی شک وشبہ نہیں کہ ہمارے نہایت اہم مفادات کا تقاضا یہ ہے کہ پاکستان کی ڈومینین اور ہندوستان کی ڈومینین کو ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک عمل کرنا چاہیے تاکہ انہیں بین الاقوامی معاملات میں اور آئندہ رونما ہونے والے واقعات میں پورا پورا دخل حاصل ہو۔ علاوہ ازیں پاکستان اور ہندوستان کے لئے بہ حیثیت دو آزاد وخود مختار مملکتوں کے، یہ بھی اشد ضروری ہے کہ وہ دوستانہ طور پر اور مل جل کر زمین اور سمندر میں اپنی سرحدوں کو دشمن کے حملے سے بچائیں لیکن اس کا انحصار کلیۃً اس بات پر ہے کہ پاکستان اور ہندوستان پہلے خود اپنے اختلافات دور کر سکتے ہیں یا نہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم بین الاقوامی معاملات میں اسی وقت نمایاں حصہ لے سکتے ہیں کہ پہلے اپنے اندرونی معاملات کو سدھاریں۔''[42] جناح نے اپنے اس انٹرویو کے آخر میں ہندوستان اور پاکستان کے اندرونی حالات کو سدھارنے کی شرط محض اس لئے لگائی تھی کہ ہندوستان نے پہلے اکتوبر 1947ء میں کشمیر پر حملہ کر کے اور پھر فروری 1948ء میں سلامتی کونسل میں مسئلہ کشمیر پر بحث ملتوی کروا کر ایک ایسا بین المملکتی تنازعہ کھڑا کر دیا تھا کہ جس کے حل کے بغیر دونوں ملکوں کے درمیان کسی قسم کا اشتراک وتعاون تقریباً ناممکن ہو گیا تھا۔ بظاہر وزیر خزانہ غلام محمد کی تقریر اور قائداعظم جناح کے اس انٹرویو کا رخ برطانیہ کے ان ارباب اقتدار کی جانب تھا جو ہندوستانیوں کے ایشیائی بلاک کو پاکستانیوں کے اسلامی بلاک پر ترجیح دیتے تھے۔

پاکستانی لیڈروں کا مطلب یہ تھا کہ تنازعہ کشمیر پاکستان کے حق میں حل کروادو تو ہم کسی بھی حیثیت میں روس کے خلاف محاذ آرائی میں شامل ہونے کو تیار ہیں۔ کشمیر کے سلسلے میں یہ شرط بہ امر مجبوری لگائی گئی تھی۔ قبل ازیں 20 رمئی 1946ء کو قائداعظم نے لندن ٹائمز کو جو انٹرویو دیا تھا اس میں بیرونی حملہ آور کے خلاف ہندوستان اور پاکستان کے مشترکہ دفاع کی تجویز کے ساتھ کوئی شرط نتھی نہیں کی تھی اور قیام پاکستان کے کچھ ہی عرصہ بعد انہوں نے امریکی اخبار نویس مارگریٹ بورک وائٹ سے انٹرویو میں اس امر پر بخوشی آمادگی ظاہر کی تھی کہ اگر امریکہ پاکستان کی مالی وفوجی امداد کرے تو وہ یونان اور ترکی کی طرح روس کے خلاف اینگلو۔امریکی بلاک کا ساتھ دے گا۔

مگر برطانیہ کے ایوان اقتدار میں پاکستانی لیڈروں کی کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ اول اس لئے کہ اینگلو۔امریکی بلاک کے عالمی مفاد کے نقطہ نگاہ سے پاکستان کے مقابلے میں ہندوستان کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ مارچ 1948ء میں حکومت ہندوستان نے نہ صرف کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا پر پابندی عائد کر کے اندرون ملک کمیونسٹوں کی سرکوبی شروع کر دی تھی بلکہ اس نے برما اور ملایا میں کمیونسٹ بغاوتوں کو کچلنے کے لئے برطانیہ کے ساتھ تعاون بھی شروع کر دیا تھا۔ دوئم اس لئے کہ برطانیہ کے ارباب اقتدار کو یہ یقین تھا کہ پاکستان کے حکمران زبانی کلامی خواہ کچھ کہیں وہ روس کے خلاف اینگلو۔امریکی بلاک سے بہرصورت تعاون کریں گے۔ پاکستان میں سر ظفر اللہ خان، سر اکرام اللہ، اسکندر مرزا، اور بعض دوسرے اعلیٰ حکام انگریزوں کے اتنے وفادار تھے کہ وہ انگریزوں اور امریکیوں کی مخالفت اور روس سے دوستی کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے اور سوئم اس لئے کہ ان دنوں مشرق وسطیٰ کے لئے انگریزوں اور امریکیوں کے زیر غور جو منصوبہ تھا اس میں پاکستان شامل نہیں تھا۔ 30 رمارچ کو استنبول کے اخبار ''التصویر'' میں ایک سیاسی لیڈر کی تجویز یہ تھی کہ بلقان یونین کی طرز پر مشرق وسطیٰ کے اسلامی ممالک کی بھی ایک یونین بنائی جانی چاہیے۔ اس کی رائے یہ تھی کہ مشرق وسطیٰ میں افغانستان، ایران اور ترکی پر روس کی طرف سے جس قسم کا دباؤ ڈالا جارہا ہے اس کی روک تھام کے لئے ایسی صورت ہو سکتی ہے کہ یہ تینوں ممالک برطانیہ اور امریکہ کے ساتھ اپنی ایک یونین بنالیں۔''[43] اور 5 راپریل کو برطانوی نیوز ایجنسی ''سٹار'' کی اطلاع یہ تھی کہ یونان اور ترکی کے وزرائے خارجہ اس کوشش میں ہیں کہ مشرقی بحیرہ روم کا ایک بلاک قائم کیا جائے جس میں عرب لیگ سے متعلقہ ریاستیں شامل ہوں۔ امریکہ اس نظریہ کا مؤید ہے۔''[44]

تاہم روزنامہ انقلاب کے ایک مضمون نگار پروفیسر عباسی کی رائے یہ تھی کہ اسلامی ممالک کو آئندہ جنگ میں برطانیہ کا آلہ کار نہیں بننا چاہیے۔ روس سے ٹکر بالکل غیر فطری اور مضر ہو گی۔ پروفیسر عباسی کا کہنا یہ تھا کہ ''بھوکے اور ننگے انسان زیادہ عرصہ تک مذہب کے آلہ کار نہیں بن سکتے بلکہ ننگوں اور بھوکوں کا اپنے حقوق طلب کرنا عین اسلام ہے اور ان کے مطالبات کو پورا نہ کرنا کفر و الحاد اور شرک و دہریت ہے...... اسلامی ممالک میں یہ اتحاد جو اس وقت کرایا جا رہا ہے یہ محض اس لئے ہے کہ جس وقت کوئی اسلامی ملک خواہ وہ ترکی ہو یا آزاد کشمیر، روس کے خلاف اعلان جنگ کرے تو کشمیر سے لے کر طرابلس اور مراکو تک ایک بجلی کی لہر دوڑ جائے اور سب بھڑوں کے چھتہ کی طرح روس کو چمٹ جائیں۔ اتحاد بین المسلمین بڑی مبارک چیز ہے مگر یہ اتحاد محض روس سے ٹکر لینے کے لئے نہ ہونا چاہیے...... روس سے ٹکر لینے میں نقصان کے سوا کچھ نہ ہوگا بلکہ بعض اسلامی ممالک تو صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں گے جن میں پہلا نمبر ترکی کا ہوگا۔''[45]

اینگلو۔ امریکی سامراج کی دو تجاویز (1) مسلم ممالک کا بلاک (2) مشرقی بلاک جس میں مسلم ممالک کے علاوہ ہندوستان، یونان اور اٹلی بھی شامل ہوں

25/اپریل کو بغداد سے انقلاب کی رپورٹ یہ تھی کہ ''روس کے خلاف اور اینگلو۔ امریکی سامراج کے سائے میں اسلامی ممالک کے متحدہ محاذ کا جو منصوبہ برطانیہ نے بنایا تھا وہ رائے عامہ کی شدید مخالفت کے طفیل خاک میں مل گیا ہے۔ بغداد کے اخبار ''الیقظہ'' نے لکھا ہے کہ اب برطانیہ نے اپنے پرانے مہرے سرنوری سعید پاشا کو پھر اس کام پر لگایا ہے لیکن دنیائے عرب کے اس ''جنرل سمٹس'' کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا...... خواہ برطانیہ اس منصوبہ کے لئے گرجوں میں دعائیں مانگے خواہ مسلح طاقت استعمال کرے ہم پیش گوئی کرتے ہیں کہ اس شخص کی ساری حرکات ناکام رہیں گی۔ عرب ریاستوں، ہندوستان، پاکستان، افغانستان، ایران اور ترکی کی ایک مشرقی تنظیم کی تحریک پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ اخبار لکھتا ہے کہ تجویز یہ ہے کہ عرب ممالک اس تجویز میں پیش پیش ہوں اور ایک ایسا مشرقی بلاک بنائیں جو روسی بلاک اور اینگلو۔ امریکی بلاک کے درمیان رکاوٹ کی حیثیت رکھے۔ معلوم ہوا ہے کہ ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت نہرو نے بھی مشرق بعید کے بعض رہنماؤں سے اس سلسلے میں بات چیت کی ہے...... استنبول کے اخبار

''وطن'' نے اسی تجویز پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جو نظام برطانیہ قائم کرے گا اس سے مشرق وسطیٰ میں ضرور پھوٹ پڑے گی اور اس طرح روسی ڈپلومیسی کو قوت ملے گی۔ بحیرہ روم اور مشرق وسطیٰ کے ممالک کا فرض ہے کہ عالمگیر امن کے لئے براہ راست اور آزادانہ میدان میں آ کر متحد ہو جائیں۔ اس سے برطانیہ کے ذرائع رسل ورسائل محفوظ رہیں گے لیکن بد قسمتی سے فلسطین کا مسئلہ اس کوشش میں سدّ راہ ثابت ہوگا۔ ''وطن'' کی تجویز یہ ہے کہ مشرق وسطیٰ میں قیام امن سے دلچسپی رکھنے والے ممالک استنبول میں ایک کانفرنس منعقد کریں جس میں فلسطینی یہودیوں کو بھی شمولیت کی دعوت دی جائے۔ یہ کانفرنس کسی بڑی طاقت کے دباؤ میں نہ آئے اور اپنے آپ کو ایک ''سلامتی کونسل'' کی حیثیت دے کر یونان اور اٹلی کو بھی شامل کرے۔ ترکی کا ایک اور جریدہ ''بدرتو'' ایک اور تجویز پیش کرتا ہے کہ اسلامک ممالک ایک ہو جائیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی خلیفہ یا امام مقرر کیا جائے۔ دراصل یہ جماعت ایشیا کی قوموں کی جماعت ہو اور اس میں غیر مسلم طاقتیں بھی شامل ہوں۔ لیکن یہ جماعت ایک ایسی دیوار کھڑی کرے جسے سوویت یونین کسی طرح نہ توڑ سکے۔ ایران کے اخبار ''ستارہ'' نے لکھا ہے کہ پہلے ترکی ہی میں اس بات کی پوری تائید کی جاتی تھی کہ برطانیہ اور امریکہ کے زیر سایہ ممالک اسلامیہ کا ایک بلاک بنایا جائے لیکن حیرت کا مقام ہے کہ اب ترکی ہی ان دو بڑی طاقتوں کی مخالفت میں پیش پیش ہے۔''[46]

ایران، پاکستان اور مشرق وسطیٰ میں کمیونزم کے داخلی وخارجی خطرہ کے نام پر روس کے خلاف اسلامی بلاک بنانے کی باتیں

تاہم 25/اپریل کو کراچی میں پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز کانفرنس کی طرف سے ایران کے تین اخبار نویسوں...... محمد علی مسعودی ایڈیٹر اطلاعات، عبدالرحمان فرامرزی ایڈیٹر کیہان اور احمد ملکی ایڈیٹر ستارہ...... کے اعزاز میں دعوت دی گئی تھی تو اس موقع پر روزنامہ ڈان کے ایڈیٹر الطاف حسین نے ایرانی مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ اسلامی ممالک پر مشتمل ایک ''چھٹا بر اعظم'' بنایا جائے اور عبدالرحمان فرامرزی نے اپنی جوابی تقریر میں اس تجویز کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ ''دنیائے اسلام اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ چکی ہے کہ اس کی نجات کا راز اتحاد میں ہے۔''[47] اس تقریب میں اس قسم کی تقریروں کا مطلب یہ تھا کہ

اگرچہ مسئلہ فلسطین کی وجہ سے مشرق وسطیٰ کے بیشتر عرب ممالک کے عوام میں اینگلو۔امریکی بلاک کے خلاف سخت غم وغصہ پایا جاتا تھا، اگرچہ برطانیہ نے 16 رجنوری 1948ء کوعراق کے ساتھ ایک نیا فوجی معاہدہ کر کے اس ملک کو مزید پندرہ سال کے لئے اپنا فوجی اڈہ بنالیا تھا اور عراقی عوام نے اس معاہدے کے خلاف زبردست مظاہرے کئے تھے اور عراقی پارلیمنٹ کے 30 ارکان نے استعفے دے دیئے تھے، اگرچہ جنوری کے آخری ہفتے میں اس معاہدے کے خلاف طلبا کے مظاہرے اس قدر زوردار تھے کہ عراقی حکومت کو مستعفی ہونا پڑا تھا اور پھر 4رفروری کو نئی حکومت نے اس معاہدے کو منسوخ کر دیا تھا، اگرچہ مارچ 1948ء کو برطانیہ نے یمن میں امام یحییٰ کے خلاف خونریز فوجی انقلاب برپا کروا کر اپنے ایک پٹھو امیر سیف الاسلام احمد کو تخت پر بٹھا دیا تھا اور اگرچہ حکومت برطانیہ نے 21راپریل کو سلامتی کونسل سے مسئلہ کشمیر کے بارے میں ایک بے معنی قرارداد منظور کروا کر پاکستان کے ساتھ ایک اور غداری کا ارتکاب کیا تھا تاہم پاکستان کے بااثر حلقے عالم اسلام کی آڑ لے کر اپنے ملک کو اینگلو۔امریکی بلاک کے حلقہ اثر میں ہی رکھنے پر مصر تھے۔

ایرانی اخبار نویسوں کی طرف سے دنیائے اسلام کے اتحاد کی تجویز کے خیر مقدم کا پس منظر یہ تھا کہ 12رمارچ 1947ء کو عالمی انقلاب کے سدباب کے لئے صدر ٹرومین کے منصوبے کے اعلان کے بعد ایران بھی ترکی اور یونان کی طرح عملاً امریکہ کی نوآبادی بن گیا تھا۔ 6راکتوبر 1947ء کو امریکہ نے ایک معاہدے کے تحت ایران میں اپنے فوجی مشن کے تقرر کی منظوری حاصل کر کے ایرانی افواج پر اپنا کنٹرول قائم کرلیا تھا۔ نومبر میں امریکہ نے اپنے طفیلی ملکوں پر غیر معمولی دباؤ ڈال کر نہ صرف اقوام متحدہ سے فلسطین کی تقسیم کا فیصلہ کروالیا تھا بلکہ اس نے ایران کی مجلس (اسمبلی) سے اس معاہدہ کو بھی منسوخ کروالیا تھا جو آذربائیجان میں تیل کی تلاش کے سلسلے میں اپریل 1946ء میں ایران اور سوویت یونین کے درمیان ہوا تھا۔ ایران کی مجلس کی اس کارروائی سے چند دن قبل ایران میں امریکی فوجی مشن نے آذربائیجان کا دورہ کر کے ایران اور سوویت یونین کی سرحد کا معائنہ کیا تھا اور مجلس کی اس کارروائی کے چند دن بعد آذربائیجان میں زبردست ہنگامے ہوئے تھے اور تبریز میں کرفیو لگانا پڑا تھا۔ دسمبر میں امریکہ کے خلاف ایرانی عوام کے جذبات اس قدر مشتعل ہو گئے کہ ایرانی مجلس نے امریکہ نواز وزیراعظم قوام السلطنت

کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد منظور کردی تھی اور اس کی جگہ محمد ابراہیم حکیمی نے وزارت عظمیٰ کا عہدہ سنبھالا تھا۔ 29ر دسمبر کو سوویت ریڈیو کا الزام یہ تھا کہ امریکہ ایران کے داخلی امور میں مداخلت کرتا ہے اور وہ ایران کو ایک آزاد وخود مختار ملک تصور نہیں کرتا۔

2ر جنوری 1948ء کو برطانیہ کا سابق وزیر خارجہ انتھونی ایڈن (Anthony Eden) تہران پہنچا تھا تو ایران کے نیم سرکاری اخبار ''تہران'' کا مطالبہ یہ تھا کہ ایران نے برطانیہ کو تیل نکالنے کے بارے میں جو رعایتیں دے رکھی ہیں ان پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ 5ر جنوری کو عراقی پارلیمنٹ کے 140 ارکان نے ایک ''آئینی محاذ'' بنایا تھا جس کا ایک مقصد یہ تھا کہ عالم عرب میں کمیونزم کا سد باب کیا جائے گا۔ محاذ کی رائے یہ تھی کہ کمیونزم اور صیہونیت کے درمیان اس مقصد کے تحت اشتراک عمل ہے کہ مشرق وسطیٰ میں اثر و رسوخ، تیل اور منڈیاں حاصل کی جائیں۔ 6ر جنوری کو ایرانی مجلس میں ایک رکن عباس اسکندری کی جانب سے اینگلو ایرانین آئل کمپنی کی اعانت پر نظر ثانی کا مطالبہ کیا گیا تھا اور پندرہ دوسرے ارکان کا مطالبہ یہ تھا کہ برطانیہ سے جزیرہ بحرین واپس لیا جائے۔

6ر جنوری کو برطانیہ کے وزیر اعظم ایٹلی کی تقریر یہ تھی کہ برطانیہ مشرق وسطیٰ کے ممالک سے بہتر تعلقات قائم کرنے، اینٹی کمیونسٹ (Anti Communist) اڈے حاصل کرنے اور فوجی اڈے قائم کرنے کے لئے بڑی تیزی سے سرگرم عمل ہے۔ یہ ساری کاروائی اس پیش بینی کی بنیاد پر ہو رہی ہے کہ سوویت یونین ایران پر حملہ کر دے گا اور پھر تیسری عالمی جنگ چھڑ جائے گی۔ 7ر جنوری کو روزنامہ ڈان کی اطلاع یہ تھی کہ برطانیہ عنقریب ہندوستان اور پاکستان سے یہ کہے گا کہ وہ بحر ہند، شمالی کشمیر اور نیپال کی جانب سے کمیونسٹ حملے کے خلاف طاقتور دفاعی مراکز قائم کریں۔ 2ر فروری کو سوویت یونین نے حکومت ایران کے نام ایک ڈپلومیٹک نوٹ میں الزام عائد کیا تھا کہ امریکی فوجی مشن کی سرگرمیوں کی وجہ سے سوویت یونین کی سرحدوں کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے کیونکہ ایرانی فوج کلیتاً امریکیوں کے کنٹرول میں ہے۔ 4ر فروری کو قاہرہ اور برطانیہ میں متعینہ سعودی عرب کے سفیر شیخ حافظ وہبہ کا جریدہ ''المصری'' کے ساتھ انٹرویو یہ تھا کہ سعودی عرب اور برطانیہ کے درمیان فوجی معاہدے کے لئے گفت وشنید ہو رہی ہے۔ 5ر فروری کو لندن کے ہفت روزہ نیو سٹیٹسمین (New Statesman) کی رائے یہ تھی کہ

سوویت یونین نے امریکی فوجی مشن کی سرگرمیوں کے بارے میں جو ڈپلومیٹک نوٹ دیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ روس متوقع عالمی جنگ میں مشرق وسطیٰ میں دوسرا محاذ کھولنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اگر مشرق وسطیٰ میں روس کی فتح ہوگئی اور مغربی طاقتیں تیل سے محروم ہوگئیں تو طاقتی توازن سوویت یونین کے حق میں ہو جائے گا۔ ایسی صورتحال میں برطانوی وزیر خارجہ ارنسٹ بیون کو چاہیے تھا کہ وہ مشرق وسطیٰ میں ''فلاحین'' اور دوسرے غریب عوام کی معاشی ترقی کے پروگرام پر عمل کرے مگر اس نے اس کی بجائے ایسے حکمرانوں سے گٹھ جوڑ کرنے کی پالیسی اپنائی ہے جو ہر سوشل انقلاب سے خوفزدہ ہیں اور ہر اس مغربی شخص سے سودا کریں گے جو ان سے تیل خریدے گا اور انہیں اسلحہ فراہم کرے گا۔

14 رمارچ کو ایرانی مجلس کے کئی ارکان نے شکایت کی کہ ایران کو بیرونی طاقتوں کی شکارگاہ بنا دیا گیا ہے۔ 21 رمارچ کو ایرانی نوروز کے موقع پر شاہی محل میں ''سلام'' کی تقریب ہوئی تو اس میں سوویت یونین کے 24 سفارت کاروں میں سے صرف دس نے شرکت کی۔ 25 رمارچ کو سوویت یونین کے فوجی اخبار ریڈ سٹار نے ایک مضمون میں اینگلو۔امریکی بلاک کی توسیع پسندانہ پالیسی پر نکتہ چینی کرتے ہوئے یہ الزام عائد کیا کہ یہ طاقتیں مشرق وسطیٰ میں تیل کے مراکز اور فوجی اڈے حاصل کر رہی ہیں۔ ریڈ سٹار کے مضمون میں مزید کہا گیا تھا کہ ''اگرچہ برطانیہ مشرق وسطیٰ میں اپنا غلبہ برقرار رکھنے کے لئے بہت ہاتھ پاؤں مار رہا ہے لیکن وہ روز بروز کمزور ہو رہا ہے کیونکہ اس کا طاقتور حلیف امریکہ زیادہ مالی امداد دیتا ہے۔ اینگلو۔امریکی سامراج کا منصوبہ یہ ہے کہ مشرق وسطیٰ میں ایک مسلم لیگ کی تشکیل کی جائے جس میں پاکستان، ایران، ترکی اور عرب لیگ کے رکن ممالک شامل ہوں۔''

اسرائیل کے قیام اور پہلی عرب۔اسرائیل جنگ کے موقع پر پاکستان، ایران اور ترکی نے عربوں سے کسی اسلامی یکجہتی یا اتحاد کا مظاہرہ نہیں کیا

تاہم 14 رمئی 1948ء کو مشرق وسطیٰ کی سیاست کا نقشہ ہی بدل گیا۔ جبکہ اقوام متحدہ کے 29 رنومبر 1947ء کے فیصلے کے مطابق فلسطین پر برطانیہ کا انتدابی اختیار (Mandate) ختم ہو گیا اور اسرائیل کی عبوری حکومت وجود میں آ گئی۔ اس واقعہ کے اگلے دن 15 رمئی کو

اسرائیل کی شرق اردن، مصر، شام، عراق اور سعودی عرب کے ساتھ جنگ چھڑ گئی۔ چونکہ اسرائیل کی پشت پر امریکہ اور برطانیہ کے علاوہ فرانس اور چیکوسلواکیہ بھی تھا اس لئے اس کی جدید افواج نے ہر محاذ پر بڑی سرعت سے پیش قدمی کی اور عرب ممالک کے عوام دشمن فرمانرواؤں کو عبرتناک شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اسرائیل نے چند ہی دنوں میں اپنی مملکت میں عربوں کی سرزمین کا مزید 6700 مربع کلومیٹر رقبہ شامل کر لیا اور تقریباً دس لاکھ فلسطینی عوام کو خانماں برباد کر کے بطور مہاجرین ملحقہ عرب ممالک میں دھکیل دیا۔ 18 رمئی کو سوویت یونین نے اسرائیل کی ریاست کو تسلیم کر لیا اور اس کے بعد تقریباً ایک ماہ میں یہ ساری کاروائی مکمل ہوئی۔ 15 رجون کو سلامتی کونسل نے حکم دیا کہ مشرق وسطیٰ میں بلا تاخیر جنگ بندی کی جائے۔ عربوں کی اس شکست فاش سے پاکستانی عوام کے حوصلوں پر بہت ناموافق اثر پڑا اور انہیں یہ احساس ہوا کہ عصر حاضر میں محض کھوکھلے مذہبی نعروں کے زور سے کوئی کامیابی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ انہیں یہ بھی احساس ہوا کہ بین الاقوامی سطح پر محض اسلامی جذبہ کے تحت مختلف ممالک کے درمیان عملی یکجہتی پیدا نہیں ہو سکتی۔ عربوں کی اس جنگ میں ترکی، ایران، افغانستان، پاکستان اور دوسرے کسی بھی غیر عرب مسلم ملک نے اسرائیل کے خلاف عربوں کی کوئی عملی امداد نہیں کی تھی۔ ترکی، ایران اور پاکستان اینگلو۔امریکی سامراج کے مفاد میں تو روس کے خلاف عالم اسلام کا اتحاد قائم کرنے کے لئے بے تاب تھے لیکن ان میں کسی کی اسلامی رگ اس پہلی عرب۔اسرائیل جنگ میں نہیں پھڑکی تھی۔ یہ جنگ شروع ہونے سے پہلے مولوی سیفی ندوی، مولوی عبدالحامد بدایوانی اور مولوی شبیر احمد عثمانی وغیرہ اپنے لچھے دار بیانات میں اسرائیل کے خلاف عرب بھائیوں کی امداد کرنے کے بہت اعلانات کرتے تھے مگر جب جنگ شروع ہو ہی گئی تو سب پر سکتہ طاری ہو گیا۔ البتہ 20 رمئی کو صوبہ سرحد کے پیر مانکی نے مصر کے فرمانروا شاہ فاروق، شرق اردن کے بادشاہ عبداللہ، عرب لیگ کے سیکرٹری جنرل عزام پاشا، فلسطین کے مفتیٔ اعظم سید امین الحسینی اور مصر کی جامعہ الازہر کے شیخ کے نام ایک تار میں یقین دلایا کہ صوبہ سرحد اور قبائلی علاقے کے پٹھان جہاد فلسطین کے سلسلے میں عرب لیگ کی ہدایت پر ہر قسم کی خدمات سرانجام دینے کے لئے تیار ہیں۔ فلسطین کی آزادی دراصل ساری عرب دنیا کی بالخصوص اور سارے عالم اسلام کی بالعموم آزادی ہے۔ اس کے لئے جو جہاد مصر اور دوسری دولتوں نے جاری کیا ہے اس کے لئے وہ مستحق مبارکباد ہیں۔ اب وہ وقت آ

گیا ہے کہ ساری اسلامی دنیا کو ایک رشتہ اخوت و اتحاد میں منسلک کر لیا جائے۔ اس غرض کے لئے تمام اسلامی ممالک کے نمائندوں کی ایک کانفرنس کراچی میں بہت جلد منعقد کی جائے۔ اس وقت اسلام کو جو خطرے دنیا کے ہر کونے میں درپیش ہیں انہیں دور کرنے کے لئے اس کانفرنس کا فوری انعقاد ضروری ہے۔''[48] مگر اسرائیل کی ہر محاذ پر پے در پے فتوحات کے باوجود نہ تو ''پٹھان مجاہدین'' وہاں گئے نہ ہی ''پنجابی بہادروں'' کے جذبہ اسلامی نے جوش مارا اور نہ ہی اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے اسلامی کانفرنس ہوئی۔ اس طرح پاکستان، ایران اور ترکیہ کے جو عناصر ستمبر 1947ء کے بعد سے اتحاد اسلامی کا جو ڈھول بجا رہے تھے اس کا پول کھل گیا اور ساری دنیا پر یہ واضح ہو گیا کہ مسلم ممالک میں مذہب کے نام پر یکجہتی کے تصور کی کوئی ٹھوس بنیاد نہیں ہے اور ان ممالک میں بھی وطنی قومیت کا مفاد کھوکھلے مذہبی نعروں سے بالاتر ہے۔ 39-1936ء میں سپین کی خانہ جنگی کے دوران یورپ اور امریکہ کے بہت سے جمہوریت پسند رضا کار فاشسٹوں کے خلاف سیکولر جمہوریت کے علمبرداروں کے شانہ بشانہ لڑنے کے لئے وہاں گئے تھے اور اس مقصد کے لئے ہزاروں رضا کاروں نے اپنی جانیں قربان کی تھیں مگر 1948ء میں مسلمانوں کے قبلۂ اوّل پر اسرائیلیوں کے حملہ کے موقع پر غیر عرب مسلم لیگ کا کوئی رضا کار اسلامی جہاد میں حصہ لینے کے لئے فلسطین نہ پہنچا۔ اس کی وجہ پوشیدہ نہیں تھی بلکہ بالکل واضح تھی اور وہ یہ تھی کہ 12/مارچ 1947ء کو امریکہ کے صدر ٹرومین کی جانب سے سوویت یونین کے خلاف عالمی سرد جنگ کے اعلان کے بعد مشرق وسطیٰ میں اسلامی بلاک یا اسلامی محاذ قائم کرنے کی تحریک مہیا کر کے اسے اپنا دم چھلا بنا دیا گیا تھا اور ثانیاً ایک معاہدہ کے تحت ایران میں اپنا فوجی مشن مقرر کر کے اسے اپنا طفیلی ملک بنایا گیا تھا۔ دوسری طرف برطانیہ نے شرق اردن اور عراق کے ساتھ فوجی معاہدے کر کے انہیں اپنے شکنجے میں جکڑنے کی کوشش کی تھی۔ اس سلسلے میں سعودی عرب کی بھی برطانیہ اور امریکہ سے بات چیت ہوئی تھی جبکہ پاکستان کے ارباب اقتدار از خود ہی اینگلو۔ امریکی سامراج کے زیر سایہ رہنے پر مصر تھے۔ ایسی صورتحال میں یہ توقع کیسے کی جا سکتی تھی کہ عربی اور عجمی مسلم ممالک محض اسلامی جذبہ کے تحت متحد ہو کر اسرائیل کے خلاف نبرد آزما ہوں گے۔ نوائے وقت کے دعوے کے مطابق پاکستان یعنی پنجاب کے سپاہی دنیا کے بہترین لڑنے والے تھے۔ ماضی میں انہوں نے برطانوی سامراج کے حکم پر مکہ پر گولی چلانے میں دریغ نہیں کیا تھا لیکن اب

اسلام کی سربلندی کے لئے انہیں فلسطین جانے کی توفیق نہ ہوئی۔ وہ مئی 1948ء کے مہینے میں کسی اعلان کے بغیر کشمیر میں ہندوستان کے خلاف محض دفاعی لڑائی لڑنے میں مصروف ہو گئے تھے۔

جہاں تک ایران کا تعلق تھا۔14 رمئی 1948ء کو جب فلسطین میں اسرائیل کی حکومت وجود میں آئی تھی تو اسی دن ایرانی مجلس کے ایک رکن محمد احمد رضوی کا الزام یہ تھا کہ یہ ساری مجلس حکومت امریکہ کی تنخواہ دار ہے۔ امریکہ کے مشاورتی مشن سے متعلق معاہدے کی وجہ سے ایرانی فوج کی آزادی تباہ ہو گئی ہے۔ امریکی سفیر جارج ایلن ایران کے داخلی امور میں مداخلت کرتا ہے اور امریکی فوجی مشن ایران کی بجائے امریکہ کے مفاد میں کام کر رہا ہے''[49] اور 18 رمئی کو تہران کے اخبار کیہان نے پاکستان کے گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح سے یہ بیان منسوب کیا تھا کہ ''ہندوستان میں چھ کروڑ آبادی کی مملکت وجود میں آ گئی ہے۔ ایرانی نسل اور مذہب کی اس قوم کو غیر ملکی ہاتھوں نے مادر وطن سے الگ کر دیا تھا۔ اب وقت ہے کہ ہم اکٹھے ہو جائیں۔ ہماری آزادی تمہاری آزادی کا حصہ ہے۔ ان دونوں مسلم ممالک کو، جو آزادی کو عزیز رکھتے ہیں اور جن میں ہر چیز مشترک ہے، مسلم دنیا میں ایک طاقتور یونٹ کی تشکیل کرنی چاہیے۔''[50]

مغربی سامراجی طاقتوں کے ایما پر احیائے خلافت کی تحریک

3 رجون کو جبکہ شرق اردن، مصر اور شام میں اسرائیلیوں کی پیش قدمی ابھی جاری تھی، بغداد سے یہ خبر موصول ہوئی کہ پیرس کے جریدہ ''العرب'' نے مصر اور پاپائے روما کے مرکز ''ویٹی کن'' کے درمیان سفارتی تعلقات سے متاثر ہو کر احیائے خلافت کی تجویز پیش کی تھی۔ ''العرب'' کی رائے یہ ہے کہ پاکستان اور جمہوریہ انڈونیشیا کی تخلیق سے دنیائے اسلام کو ایک خلافت کے جھنڈے تلے لانے کا مسئلہ بہت اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ خلافت کے احیا کے لئے فوری قدم اٹھایا جائے۔'' اس خبر پر لاہور کے روزنامہ انقلاب کو اس بنا پر بڑی حیرت ہوئی تھی کہ احیائے خلافت کی آواز انقرہ، قاہرہ، بغداد یا تہران سے نہیں پیرس سے بلند ہوئی ہے۔ اخبار کی رائے یہ تھی کہ ''یہ حب علی نہیں، بغض معاویہ ہے۔ مغربی طاقتوں کی دلی تمنا ہے کہ جس طرح انہوں نے عرب لیگ کو اپنے زیر اثر رکھا ہوا ہے اسی طرح ایک کٹھ پتلی خلافت کھڑی کر کے اسے سوویت یونین کے خلاف برسرپیکار بنایا جائے۔ عرب عوام جانتے ہیں کہ برطانیہ اور فرانس

مسلمانوں کے کتنے خیر خواہ ہیں۔ انہیں اس بات کا پورا احساس ہے کہ جب تک، مصر، عراق، شرق اردن اور پاکستان برطانوی اثر سے، ترکی، ایران، سعودی عرب، امریکی اثر سے اور جمہوریہ انڈونیشیا ڈچ سامراج سے آزاد نہیں ہوتے اس وقت تک احیائے خلافت سے سوائے سامراجی طاقتوں کے اور کسی کو فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔''[51]

سوویت یونین کے خلاف سامراجی طاقتوں کے اس قسم کے عزائم کے بارے میں ''انقلاب'' کی اس رائے کی تائید بالواسطہ طور پر 27/جون کو ہوئی جبکہ نوائے وقت میں ایک برطانوی خبر رساں ایجنسی کی واشنگٹن سے موصول شدہ یہ خبر شائع ہوئی کہ ''روس اور مشرق وسطیٰ کی سرحد پر روسی عجیب وغریب سرگرمیاں دکھا رہے ہیں۔ قبائلیوں کو سرحد سے ہٹایا جاتا ہے اور اس کے بعد اس علاقے سے دھماکوں کی آوازیں آنے لگتی ہیں جو نیویارک ورلڈ ٹیلیگرام کے مدیر فلپ سمس کے خیال کے مطابق توپخانے یا ڈائنامائیٹ یا ایٹم بم کی آواز ہو سکتی ہے۔ مسٹر سمس کی رائے یہ ہے کہ ان تمام پراسرار سرگرمیوں کی تہہ میں روس کی یہ خواہش کام کر رہی ہے کہ بحیرہ فارس سے بحر ہند تک پہنچا جائے۔ 1939ء میں سٹالن اور ہٹلر کے درمیان اسی خواہش کے مطابق ایک معاہدہ ہوا تھا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ سٹالن اپنے مقبوضات یورپ میں بڑھانے کی بجائے ایشیا کے ممالک میں بڑھانا چاہتا ہے۔ مشرق وسطیٰ پر قبضہ کرنے سے نہ صرف بحر ہند کا راستہ روس کے لئے صاف ہو جاتا ہے بلکہ اس طرح روس کے قبضہ میں مشرق وسطیٰ کا پٹرول بھی آجاتا ہے جو موجودہ جنگ کی جان ہے۔ روس کی نظریں درہ دانیال پر بھی جمی ہوئی ہیں اور اس طرح روس کا خیال ہے کہ مشرق وسطیٰ پر قبضہ کرنے کے بعد ہندوستان کے مختصر ترین بحری اور فضائی راستوں پر اقتدار قائم کرے۔ روس کے قبضے میں آبدوز کشتیوں کا زبردست بیڑہ ہے اور اگر اسے بحیرہ فارس سے نکلنے کا راستہ مل جائے تو روس کی طاقت خطرناک حد تک بڑھ جائے گی۔ اس کی ہوس ملک گیری ایران اور ترکی کے امن کے لئے مستقل خطرہ بن جائے گی۔''[52] اس خبر کو پڑھ کر تاریخ کے کسی بھی طالب علم کے لئے اس نتیجہ پر پہنچنا مشکل نہیں ہوگا کہ سوویت یونین کے خلاف یہ کہانی واشنگٹن میں محض اس غرض سے گھڑی گئی تھی کہ مشرق وسطیٰ کے عرب اور عجمی ممالک کے فرمانرواؤں، شیوخ اور جاگیرداروں کو سوویت یونین سے خوفزدہ کر کے پہلے تو ان کی توجہ اسرائیل کی طرف سے ہٹائی جائے اور پھر ان کی توجہ اسلامی بلاک یا احیائے خلافت کی پرانی تجویز کی طرف مبذول کی

جائے۔ جب نوائے وقت میں خبر شائع ہوئی تھی اس وقت عرب ممالک کو اسرائیل کے ہاتھوں قطعی شکست ہو چکی تھی۔ 15/جون کو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل جنگ بندی کا حکم دے چکی تھی۔ 21/جون کو عراق میں سید محمد الصدر کی حکومت مستعفی ہو چکی تھی اور عراق کا ریجنٹ امیر عبداللہ یہ اعلان کر چکا تھا کہ ''عراق نے مختلف ممالک سے جو معاہدات کئے ہیں وہ ان کی پابندی کرے گا اور ترکی، ایران اور افغانستان سے عراق کے تعلقات مستحکم اور دوستانہ رہیں گے۔''

30/جون 1948ء کو اردن اور سعودی عرب اپنی تاریخ میں پہلی بار سفارتی نمائندوں کے تبادلہ پر رضا مند ہو گئے اور اسی دن پاکستان مسلم لیگ کے چیف آرگنائزر چودھری خلیق الزماں کی مسلم یوتھ کانفرنس میں تقریر یہ تھی کہ قرآنی تعلیمات کی روشنی میں اسلامی مملکت کے لئے تمام اسلامی ممالک کے خلیفہ کا وجود ضروری ہے۔'' پاکستان میں اسلامی مملکت کا مطالبہ کرنے سے پہلے تمام اسلامی ممالک کی فیڈریشن کے قیام کا مطالبہ کرنا ضروری ہے۔''[53] یکم جولائی کو ریاض میں اردن کے شاہ عبداللہ اور سعودی عرب کے شاہ ابن سعود کے درمیان 25 سال میں پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی اور 9/جولائی کو کلکتہ کے سابق میئر عبدالرحمان صدیقی نے کراچی میں ٹرکش کلچرل ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''روس، انگلستان اور امریکہ کی تہذیب انسانیت کے لئے ناکام ثابت ہوئی ہے اور ضرورت ہے کہ ہم ایک اپنا علیحدہ اسلامی بلاک بنائیں اور نام نہاد مغربی دنیا کو پھر تہذیب سے آشنا کریں۔'' اس نے کہا کہ ''اب عربوں کو اس بات کا پورا احساس ہے کہ پہلی عالمگیر جنگ میں ترکوں کے خلاف بغاوت کر کے انہوں نے اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی ماری تھی اور اس وقار سے محروم ہو گئے جو انہیں ترکی کے ماتحت حاصل تھا۔''[54]

جولائی کے وسط میں پاکستان کے وزیر امور داخلہ ونشریات خواجہ شہاب الدین نے ''پاکستان اور عرب ممالک'' کے نام سے ایک کتاب شائع کی جس میں اس نے پاکستان اور عرب ممالک کے درمیان مضبوط اور دوستانہ تعلقات کے قیام پر زور دیا۔ اس کی رائے یہ تھی کہ ''اس یگانگت اور دوستی کے بغیر پچھلے کئی سالوں سے پاکستان سے مصر تک کا وسیع خطہ زمین چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹا ہوا ہے۔ ان میں عملی طور پر کچھ تعلق ہی نہ تھا اور یہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اپنے بچاؤ اور امداد کے لئے ہمیشہ غیر ملکیوں کے دست نگر رہے۔ شکر ہے کہ اب یہ چھوٹے چھوٹے

ملک ایک دوسرے کے قریب آرہے ہیں اوران میں زندگی کی رمق پیدا ہورہی ہے۔''[55]

27رجولائی کو پاکستان کے بین الاقوامی امور کے ادارے نے ''پاکستان کا تعارف'' نامی 24 صفحات پر مشتمل ایک پمفلٹ شائع کیا جس میں اس نظریے کا اظہار کیا گیا کہ ''اگر مشرق وسطیٰ کے تحفظ کو کوئی خطرہ ہوگا تو پاکستان کے تحفظ کے لئے بھی خطرہ سمجھا جائے گا اور پاکستان کا مفاد اس میں ہے کہ قوموں کے تعلقات اور مشرق وسطیٰ کے ہر ملک کے حالات میں عام طور پر ایسی حالت پیدا کی جائے جو وہاں کے امن وتحفظ کو یقینی کردے۔''[56]

گویا جون 1948ء میں اسرائیلیوں کے ہاتھوں عرب فرمانرواؤں، شیوخ اور جاگیرداروں کی عبرتناک شکست کے بعد فرانس، امریکہ اور برطانیہ کے علاوہ پاکستان کے ارباب اقتدار کی بھی یہ رائے تھی کہ اب جبکہ عرب حکمرانوں کو اپنی کمزوری وناتوانی کا احساس ہوگیا ہے، مذہب کے نام پر روس کے خلاف مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک کے گٹھ جوڑ کے لئے فضا سازگار ہوگئی ہے اوراب ان ممالک کو اینگلو۔امریکی سامراج کے زیر سایہ احیائے خلافت یا اسلامی فیڈریشن یا اسلامی بلاک یا اسلامی محاذ کے نام پر یکجا کر کے نہ صرف درہ دانیال، آبنائے باسفورس، نہر سویز اور خلیج فارس بلکہ تیل کے ذخائر کا بھی تحفظ کیا جاسکتا ہے۔مگر ان کا یہ خیال خام تھا۔حقیقت یہ تھی کہ اسرائیل کے ہاتھوں عربوں کی قومی شکست، اہانت اور ہتک کے باعث عرب عوام میں نہ صرف اپنے سامراج نواز فرمانرواؤں کے خلاف بے پناہ نفرت وغصہ کے جذبات ابھرے تھے بلکہ سیکولر عرب نیشنلزم نے بے پناہ فروغ پایا تھا۔بمبئی میں مصری قونصل احمد فتحی رادان کے بیان کے مطابق فلسطین میں اسرائیل کے خلاف جو جنگ ہوئی تھی وہ اسلام اور یہودیت کی جنگ نہیں تھی بلکہ یہ عربوں اور صیہونی دہشت پسند گروہوں کے درمیان جنگ تھی۔جن عرب حکومتوں نے ان فوجی سرگرمیوں میں حصہ لیا تھا وہ سب کی سب مسلم حکومتیں نہیں تھیں ان کی آبادی عیسائیوں، یہودیوں اور مسلمانوں پر مشتمل تھی۔اس حقیقت کے باوجود کہ اس کی آبادی کی اکثریت مسیحی ہے لبنان ایک عرب حکومت ہے۔ یہ حکومت فوجی سرگرمیوں میں ایک عرب حکومت کی حیثیت سے شریک تھی۔''[57] عرب عوام الناس کو احمد فتحی کی بیان کردہ اس حقیقت کا اچھی طرح احساس تھا اور انہیں یہ بھی تلخ احساس تھا کہ اس جنگ میں ترکی، ایران، افغانستان اور پاکستان میں سے کوئی غیر عرب مسلم ملک ان کی عملی امداد کے لئے آگے نہیں بڑھا تھا حالانکہ مسلم قومیت، پان اسلام ازم،

اسلامی بلاک، اسلامی محاذ اور اسلامی اتحاد کا سب سے زیادہ شور انہی ممالک سے اٹھتا رہا تھا۔

تاہم پاکستان اور دوسرے ممالک کے حکمران حلقوں کی جانب سے عالم اسلام کے اتحاد کی بدستور تبلیغ ہوتی رہی۔ اب ان کا موقف یہ تھا کہ عرب ممالک نے اسرائیل سے جو مار کھائی ہے اس کے پیش نظر یہ اور بھی ضروری ہو گیا ہے کہ دنیا کے سارے مسلم ممالک فلسطین، کشمیر اور حیدر آباد (دکن) کی آزادی کے لئے متحد ہو جائیں۔ اسی موقف کے تحت 5 راگست کو پاکستان کے 55 علما نے دنیا کے تمام مسلم ممالک سے اپیل کی کہ وہ ''کشمیر اور حیدر آباد دکن کے خلاف ہندوستان کی فاشسٹ، اینٹی اسلامک جارحیت کے خلاف متحدہ محاذ بنائیں۔ تمام مسلم ممالک کو چاہیے کہ وہ ہندوستان سے سفارتی اور تجارتی تعلقات منقطع کر لیں۔ ہندوستان کی فضائی، بحری اور بری ناکہ بندی کریں اور اسے پٹرول، تیل اور دوسری ضروری اشیا کی سپلائی بند کر دیں۔''[58] 6 راگست کو قائد اعظم جناح نے تمام مسلم ممالک کے نام اپنے پیغام عید میں کہا کہ ''فلسطین، کشمیر اور انڈونیشیا میں طاقتی سیاسیات کا جو ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے اس سے ہماری آنکھیں کھل جانی چاہئیں۔ ہماری آواز کی شنوائی صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ ہم متحدہ محاذ قائم کریں۔''[59] اسی دن یعنی 6 راگست کو مصر کے مفتی نے یہ تجویز پیش کی کہ فلسطین، حیدر آباد (دکن) اور انڈونیشیا کے امور پر غور کرنے کے لئے آئندہ حج کے موقع پر دنیا کے مسلم ممالک کی ایک کانفرنس ہونی چاہیے۔ اس کی رائے یہ تھی کہ دنیا کے مسلمانوں کو اپنے مسائل حل کرنے کے لئے متحد ہو کر ایک طاقتور بلاک بنانا چاہیے۔ قاہرہ کے اخبار ''البلاغ'' کی مسلم ممالک سے بالعموم اور عرب ممالک سے بالخصوص اپیل یہ تھی کہ ''نظام اور اس کی سلطنت کو حکومت ہندوستان کے جارحانہ عزائم سے بچائیں۔''[60] 9 راگست کو قاہرہ کے جریدہ اخوان المسلمین کا اداریہ یہ تھا کہ ''مسلم ممالک کو مداخلت کر کے حیدر آباد (دکن) کو ہندوؤں اور یہودیوں سے بچانا چاہیے۔ اگر ہو سکے تو یہ کام پر امن طریقہ سے کرنا چاہیے اور اگر ضرورت پڑے تو اس مقصد کے لئے خون بھی بہانا چاہیے۔''[61]

حیدر آباد (دکن) کے لئے پاکستان کے علما اور مصر کے اخوان المسلمین کی جانب سے پان اسلام ازم کے نعرے کے استعمال کی وجہ یہ تھی کہ حکومت پاکستان ان دنوں حیدر آباد (دکن) کی انجمن اتحاد المسلمین کو خفیہ طور پر ہتھیار سپلائی کر رہی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ نظام حیدر آباد اپنی

سلطنت کے تحفظ کے لئے سرمایہ خرچ کر رہا تھا اور تیسری وجہ یہ تھی کہ برطانیہ میں ونسٹن چرچل اور بعض دوسرے کنزرویٹو عناصر حیدرآباد کو ہندوستان کے چنگل سے بچانا چاہتے تھے جبکہ حکومت ہندوستان کھلم کھلا یہ اعلان کر رہی تھی کہ ''وہ ہندوستان کے قلب میں نظام کی ریاست قائم نہیں رہنے دے گی بالخصوص ایسی حالت میں کہ وہاں کمیونسٹ بغاوت روز بروز زور پکڑ رہی ہے اور کمیونسٹوں نے اتحادالمسلمین سے گٹھ جوڑ کرلیا ہے۔''

14 راگست کو پاکستان کے یوم آزادی کے موقع پر مصر کے ناظم الامور الحسینی الخطیب نے اپنے پیغام میں کہا تھا کہ ''ہماری انتہائی خواہش ہے کہ سارے مسلم ممالک متحد ہوں اور ان قدرتی روابط کو مضبوط کریں جو ایک خاندان کے ارکان کی حیثیت سے انہیں ایک دوسرے سے منسلک کرتے ہیں۔ پاکستان کے قیام کے بعد مسلم دنیا بہت طاقتور ہوگئی ہے اور اب یہ دنیا مسلمانوں کے لئے امیدوں سے بھرپور ہے۔''[62] اسی دن پاکستان کے وزیر تعلیم فضل الرحمان نے کراچی کے ماڈرن عربک کالج میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''عربی زبان ترکی، مصر، شام، لبنان، شرق اردن، پاکستان، سعودی عرب، عراق، ایران، افغانستان، فلسطین اور انڈونیشیا کو ایک مشترکہ برادری کے رشتے میں باندھتی ہے۔ آج کل یہ وسیع اسلامی برادری مشکل حالات سے گزر رہی ہے اور اسے بہت سے خطرات درپیش ہیں۔ ہمیں اتحاد اور چوکسی کی جتنی آج کل ضرورت ہے اتنی پہلے کبھی نہیں تھی۔ اتحاد کے بغیر نہ صرف ہم اپنی آزادی کھو بیٹھیں گے بلکہ ہم بنی نوع انسان کی فلاح اور عالمی امن برقرار رکھنے کے کام میں کوئی کردار ادا نہیں کرسکیں گے...... اگر ہم قائداعظم کی تجویز کے مطابق متحدہ محاذ قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے تو ہمارے درمیان رابطہ کی صرف ایک ہی زبان ہوسکتی ہے اور وہ قرآن مجید کی زبان ہے۔''[63]

18 راگست کو روزنامہ ڈان کے اداریے میں حکومت پاکستان کو مشورہ دیا گیا کہ ''وہ پاکستان کی بری، بحری اور ہوائی فوج کی توسیع کرے...... اس مقصد کے لئے مسلم دنیا سے ایک مربوط پالیسی اور پروگرام کی بنیاد پر اشتراک عمل کیا جاسکتا ہے۔ یہ مسلم دنیا چھٹا براعظم ہے جس کی آبادی تقریباً ساری کی ساری اسلام کے پیروکاروں پر مشتمل ہے...... روحانی طور پر تو مسلم ممالک کے درمیان متحدہ محاذ پہلے ہی سے قائم ہے لیکن یہ کافی نہیں ہے۔ یہ متحدہ محاذ ایسا ہونا چاہیے کہ یہ ممالک فوجی اور معاشی لحاظ سے ایک دوسرے کی ضروریات پوری کریں۔''[64]

لیاقت نے کراچی میں امریکی بحریہ کے جنگی جہازوں کا استقبال کیا تو ظاہر ہو گیا کہ اسلامی ممالک کا بلاک بنانے کی تجویز کس کے حق میں تھی اور کس کے خلاف تھی

پاکستانی لیڈروں، اخبارات اور بعض عرب ممالک کے نمائندوں کی طرف سے یہ تاثر دیا جا رہا تھا کہ اسلامی متحدہ محاذ یا اسلامی اتحاد کی تجویز محض اسلام کی سربلندی کے لئے پیش کی جا رہی ہے مگر 20 راگست کو یہ تاثر بہت حد تک زائل ہو گیا جبکہ وزیر اعظم لیاقت علی خان نے امریکی بحریہ کے افسروں کے اعزاز میں ایک شاندار دعوت دی جس میں مہمانوں کی تعداد تقریباً 400 تھی۔ امریکی بحریہ کے تین جہاز 14 راگست کو خیر سگالی کا مشن لے کر پہلی بار کراچی پہنچے تھے اور ان کی گزشتہ چار پانچ دن سے ہر جگہ بڑی آؤ بھگت ہو رہی تھی۔ جب لیاقت علی خان نے ان امریکی افسروں کے اعزاز میں اتنی شاندار دعوت دی تو کراچی کے غیر سرکاری سیاسی حلقوں میں یہ تاثر پختہ ہو گیا کہ اسلامی متحدہ محاذ کی تجویز دراصل وہی پرانی تجویز ہے جو ستمبر 1947ء کے بعد سے مسلسل پیش کی جا رہی ہے اور جس کا مقصد یہ ہے کہ اینگلو۔ امریکی سامراج کے زیر سایہ روس کے خلاف مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک کا گٹھ جوڑ کیا جائے۔ امریکی بحریہ کے جنگی جہاز پہلی عرب۔ اسرائیل جنگ کے بعد اس علاقے میں محض یہ ظاہر کرنے کے لئے کھڑے تھے کہ امریکہ کو تیل کے ذخائر میں بہت دلچسپی ہے اور وہ سوویت یونین کو اس علاقے میں پیش قدمی کی اجازت نہیں دے گا۔

امریکی بحریہ کے یہ جہاز 23 راگست کو واپس گئے تو اس کے تین چار دن بعد ڈان میں یہ خبر چھپی کہ ”کراچی کے سیاسی حلقے اسلامی ممالک کی ایک لیگ کی تشکیل کی تجویز پر غور کر رہے ہیں۔ اس مقصد کے لئے قاہرہ میں مسلم ممالک کے سفارت خانوں سے رابطہ قائم کیا گیا ہے اور وہاں سے جو جوابات ملے ہیں وہ حوصلہ افزا ہیں...... مقامی سیاسی حلقوں کی رائے یہ ہے کہ مسلم ممالک کی آزادی اور سالمیت کے تحفظ کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ایک ورلڈ اسلامک لیگ کی تشکیل کی جائے۔“[65] 30 راگست کو کراچی میں پاکستان کلچرل ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام ایک جلسہ میں مصر، سعودی عرب، عراق اور شرق اردن کے سفیروں نے اپنی تقریروں میں دنیا کے مسلم ممالک کے متحدہ محاذ کی تجویز کی حمایت کی۔ 31 راگست کو ان تقریروں کی خبر اخبارات میں شائع ہوئی تو

نوائے وقت نے اس پرادارتی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے رائے ظاہر کی کہ اب مصر، ترکی، ایران اور دوسرے ممالک میں مغربی نیشنلزم کا طلسم ٹوٹ گیا ہے اور ایک اسلام لیگ کے قیام کے لئے زمین بالکل تیار ہے۔ ''اگر پاکستان متحدہ اسلامی بلاک کے قیام کے لئے اپیل کرے تو اس کا یہ اقدام اس کے شایان شان ہوگا۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ قائداعظم اسی دسمبر میں یا اس سے ذرا بعد اسلامی ملکوں کے مدبروں اور رہنماؤں کی کراچی میں ایک کانفرنس بلائیں۔ افغانستان، ایران، عراق، عرب، فلسطین، شام، یمن، شرق اردن، لبنان، مصر، ترکی اور انڈونیشیا کے قائدین کو اس کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی جائے اور عالم اسلام کے یہ رہنما ایک متحدہ اسلامی بلاک کی تشکیل کے مسئلہ پر غور کریں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اگر یہ بلاک معرض وجود میں آ گیا تو نہ صرف یو۔ این۔ او میں مسلمان ملکوں کی پوزیشن مستحکم ہو جائے گی بلکہ دنیا کی ہر سیاسی مجلس اور کانفرنس میں ان کی آواز مؤثر ثابت ہوگی۔''[66]

لیکن نوائے وقت کے اس اداریے کے دو دن بعد انقلاب میں ایک امریکی ماہر اقتصادیات کا مضمون شائع ہوا جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ عرب ممالک کے فرمانرواؤں کے مفادات اینگلو۔امریکی بلاک سے اس قدر وابستہ ہیں کہ وہ اس بلاک سے الگ ہو کر دنیا کی سیاست میں کوئی مؤثر کردار ادا نہیں کر سکتے۔ اس مضمون کی ابتدا میں تو یہ کہا گیا تھا کہ تیل کی بھوکی دنیا کو مشرق وسطیٰ میں امن کی ضرورت ہے لیکن اصل بات آخر میں کہی گئی تھی اور یہ تھی کہ ''مغربی اتحادیوں کی مشترکہ پالیسی یہ ہے کہ روس کو ہر ممکن طریقے سے بحیرہ روم اور مشرق وسطیٰ کے تیل کے علاقوں سے دور رکھا جائے۔ اگرچہ روس آذربائیجان سے پیچھے ہٹ گیا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ روس نے اپنی نظریں ایران سے ہٹالی ہیں اور مغربی طاقتیں مستقل طور پر اس بات کی نگرانی کر رہی ہیں کہ روس کو مشرق وسطیٰ کے تیل کے علاقوں میں نہ پہنچنے دیا جائے۔ فلسطین کے اس مسئلہ سے عربوں میں برطانیہ اور امریکہ کا وقار کافی حد تک ختم ہو گیا ہے۔ بارہا عرب فرمانرواؤں کی طرف سے دھمکیاں دی جا رہی ہیں کہ عرب برطانیہ اور امریکہ کی مراعات کو منسوخ کر دیں گے لیکن دھمکیوں کو مبصرین بہت زیادہ اہمیت نہیں دیتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ عربوں کو برطانیہ اور امریکہ کے سرمائے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ تیل کی ترقی کی وجہ سے عرب فرمانرواؤں کو کس قدر روپیہ مل رہا ہے۔ یہ رقم اس سے کہیں زیادہ ہے جتنی کہ برطانیہ کو ان کے

تیل کی ضرورت ہے۔اس کے علاوہ اگر برطانیہ اور امریکہ وہاں سے چلے گئے تو روس قابض ہو جائے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عربوں کے موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ ہو جائے گا اور وہاں مطلق العنان بادشاہ قائم نہ رہیں گے۔اس کے باوجود مشرق وسطیٰ میں طوالت جنگ سے بہت دشواریاں پیدا ہو جائیں گی۔اس لئے مغربی طاقتوں کا فائدہ اسی میں ہے کہ وہاں جلد از جلد امن قائم کریں۔''[67] امریکی ماہر اقتصادیات کا یہ مضمون صحیح تھا۔عرب ممالک کے بادشاہوں،شیوخ اور جاگیرداروں کے ذاتی اور طبقاتی مفادات اینگلو۔امریکی سامراج کے مفادات سے وابستہ تھے۔یہی وجہ تھی کہ ان حکمرانوں نے اسرائیل سے شرمناک شکست کھانے کے باوجود اپنے تیل کے ذخائر پر برطانیہ اور امریکہ کی آئل کمپنیوں کی اجارہ داری کو بدستور قائم رہنے دیا تھا اور انہوں نے اینگلو۔امریکی سامراج سے اپنے سفارتی اور سیاسی روابط بھی منقطع نہیں کئے تھے۔حالانکہ عراق،مصر،شرق اردن اور شام کے عرب عوام الناس ہر روز مظاہرے کر کے برطانیہ اور امریکہ کے خلاف سخت غم وغصہ کا اظہار کرتے تھے۔ایسے فرمانرواؤں،شیوخ اور جاگیرداروں سے یہ توقع،کہ وہ امریکہ وبرطانیہ کے حلقہ اثر سے باہر کسی آزاد وخودمختار اسلامی بلاک کی تشکیل کے کام میں حصہ لیں گے،صرف نوائے وقت کی قسم کے ایسے ہی عناصر کر سکتے تھے جو یا تو عالمی حالات سے بالکل بے خبر تھے یا پھر نہایت بددیانت ومنافق تھے اور اسلامی بلاک کی آڑ میں اینگلو۔امریکی سامراج کی خدمت سرانجام دینا چاہتے تھے۔لندن کے ہفت روزہ ''نیو سٹیٹسمین اینڈ نیشن'' کو تو یہ شعور تھا کہ مشرق وسطیٰ میں فلاحین اور دوسرے غریب عوام کی معاشی آسودگی کا کوئی معقول بندوبست کئے بغیر عرب ممالک کے بادشاہوں سے جو گٹھ جوڑ ہوگا وہ پائیدار نہیں ہوگا اور اس سے کوئی مقصد پورا نہیں ہوگا۔مگر پاکستان کے رجعت پسند عناصر عرب ممالک کے غریب عوام کی معاشی فلاح کے بغیر ہی محض بادشاہوں کی کانفرنس کے ذریعے ایک طاقتور اسلامی بلاک بنانے کا خواب دیکھتے تھے۔امریکی مؤرخ ایف۔ڈی۔فلیمنگ (F.D.Fleming) کے بقول ''یہ پالیسی سوویت یونین کے لئے بہت سودمند تھی کیونکہ اس طرح وہ کوئی خاص کوشش کئے بغیر ہی نہ صرف مسلم ممالک کے بلکہ پورے ایشیا کے غریب ومظلوم عوام کا خیرخواہ تصور کیا جانے لگا تھا اور مغربی طاقتیں غریب ایشیائی عوام کی دشمن سمجھی جانے لگی تھیں۔یہ منطقی نتیجہ تھا امریکہ کے صدر ٹرومین کے 12رمارچ 1947ء کے اس اعلان کا جس کے تحت ساری دنیا میں ہر قسم کے سیاسی،

معاشی معاشرتی اور ثقافتی انقلاب کو ممنوع قرار دے دیا گیا تھا۔"

جب نوائے وقت نے اسلامی بلاک کے بارے میں یہ اداریہ لکھا تھا اس وقت بابائے قوم قائداعظم جناح کوئٹہ کے نزدیک زیارت کے ریسٹ ہاؤس میں بستر مرگ پر پڑے تھے اور وزیراعظم لیاقت علی خان اینگلو۔امریکی سامراج کی پشت پناہی سے پاکستان میں بلاشرکت غیرے اپنا اقتدار قائم کرنے اور عالم اسلام کی قیادت کرنے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ 11 ستمبر 1948ء کی رات کو جب قائداعظم کا کراچی کے گورنر جنرل ہاؤس میں نہایت کسمپرسی کی حالت میں انتقال ہوا تھا تو اس سے چند گھنٹے قبل کراچی کے جہانگیر پارک میں مولانا شبیر احمد عثمانی کی زیرصدارت یوم فلسطین کے سلسلے میں ایک جلسۂ عام ہوا تھا جس میں اہم ترین تقریر وزیراعظم لیاقت علی خان کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ "دنیا کی سب سے بڑی مسلم مملکت کی حیثیت سے پاکستان کی ذمہ داری اس کی اپنی آزادی کے تحفظ کی حد تک ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس کے لئے لازمی ہے کہ یہ چھوٹی مسلم مملکتوں کا بھی تحفظ کرے۔"[68] ایک اور رپورٹ میں اس نے مزید کہا تھا کہ "پاکستان کی آزادی کا مطلب اسلامی دنیا کی آزادی ہے اور اگر ہم مسلم دنیا کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم پاکستان کی آزادی کو برقرار رکھیں۔ یہ بہت بڑا کام ہے۔ یہ دو ایک دن میں نہیں ہوسکتا۔ اس میں وقت لگے گا۔ لیکن اگر ہمارا اللہ تعالیٰ پر بھروسہ ہے تو ہم آزاد رہیں گے اور اسلامی دنیا بھی آزاد رہے گی۔"[69] 12 ستمبر کو قائداعظم جناح کی تدفین ہوئی۔ 14 ستمبر کو خواجہ ناظم الدین نے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالا اور ملک کی عنان اقتدار لیاقت علی خان کے ہاتھ میں آ گئی۔

باب:2

لیاقت علی کا دورہ برطانیہ اور سوویت یونین کے خلاف ہر قسم کے اسلامی و غیر اسلامی بلاک بنانے کے سلسلے میں تعاون کی یقین دہانی

کشمیر اور حیدر آباد (دکن) پر بھارتی جارحیت کے باوجود پاکستان، اینگلو۔ امریکی سامراج کے کمیونسٹ مخالف کیمپ میں بھارت کے ساتھ تعاون پر بھی آمادہ تھا

16 رستمبر 1948ء کو عرب لیگ، اخوان المسلمین اور حکومت پاکستان کی مخالفت کے باوجود ہندوستان نے بزورِ قوت ریاست حیدر آباد (دکن) کو ہڑپ کر لیا تو اس کے چند دن بعد 22 رستمبر کو امریکہ کے ایک سرکاری ترجمان نے بتایا کہ کمیونسٹوں کی جانب سے یورپ کی بحالی کے منصوبے کی جو مخالفت کی جا رہی ہے، جنوب مشرقی ایشیا کی بدامنی کا اس سے براہ راست تعلق ہے۔ اس نے کہا کہ 16 یورپی اقوام میں سے سرکردہ اقوام ان معاشی فوائد پر خاصی حد تک انحصار کرتی ہیں جو انہیں جنوب مشرقی ایشیا سے حاصل ہوتے ہیں لہٰذا یہ شکایت بالکل بجا ہے کہ یورپ اور ایشیا میں کمیونسٹ سرگرمیوں کا ایک دوسرے سے براہ راست تعلق ہے۔''[1]

24 رستمبر کو نوائے وقت نے اس امریکی ترجمان کے انٹرویو کا حوالہ دیئے بغیر اس کی اس رائے سے اتفاق کیا۔ اس نے لکھا کہ ''چین، انڈونیشیا اور برما سے اشتراکیت کا یہ خونیں سیلاب لازمی طور پر ہندوستان کا رخ کرے گا۔ مشرقی پاکستان بھی اس سے محفوظ نہیں، مگر اس

ملک کے مسلمان غربت وافلاس کے باوجود بے حد دیندار اور خدا پرست ہیں اور مذہب پر ان کا غیر متزلزل اعتقاد اشتراکیت کے تحت حملہ کی صورت میں بھی انہیں ڈھال کا کام دے گا۔ مگر مغربی بنگال میں کمیونسٹوں کے قدم کافی مضبوط ہیں اور وہ ایک مدت سے اشتراکی انقلاب کے لئے نہایت خاموشی کے ساتھ زمین ہموار کرنے میں مصروف ہیں...... جہاں تک کمیونسٹ خطرہ کا تعلق ہے، پاکستان اور ہندوستان دونوں ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ ہندوستان کو خطرہ کی نوعیت قدرے شدید ہے کیونکہ کمیونسٹ اس ملک میں کافی منظم ہیں اور عوام پر مذہب کی گرفت زیادہ مضبوط نہیں۔ پاکستان کے عوام کی مذہب سے شیفتگی اور عقیدت اس ملک میں کمیونزم کے فروغ کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے مگر کمیونسٹ اس ملک میں بھی مصروف کار ہیں۔ وہ ملک کی سیاسی جماعتوں میں ہی نہیں گھسے ہوئے بلکہ اس ملک کے سرکاری دفتروں میں بھی کارفرما ہیں...... جنوب مشرقی ایشیا سے ایک سیلاب اُمڈ رہا ہے۔ زود یا بدیر یہ سیلاب پاکستان بھی پہنچے گا۔ اگر یہ ملک چین اور برما کے انجام یعنی خانہ جنگی، تباہی، بربادی اور ایک غیر ملکی آمریت سے بچنا چاہتا ہے تو اسے اپنے دفاعی استحکامات کی ابھی سے فکر کرنی چاہیے۔ اگر اس وقت ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہنے کی پالیسی پر عمل کیا گیا اور کمیونسٹ ایجنٹوں کو اجازت دی گئی کہ وہ اس ملک کی جڑوں کو کھوکھلا کرتے رہیں تو اس سیلاب کے سر پر آپہنچنے کے بعد بچاؤ کے لئے جو تدبیر بھی اختیار کی جائے گی ناکام ثابت ہوگی۔"[2] نوائے وقت کے اس اداریے کا مطلب یہ تھا کہ وہ کمیونزم کے سدباب کے لئے بین الاقوامی سطح پر کسی بھی طاقت یا طاقتوں سے گٹھ جوڑ کے حق میں تھا۔ یہاں تک کہ وہ کشمیر اور حیدرآباد (دکن) پر ہندوستان کی جارحیت کے باوجود اس کے ساتھ بھی کمیونسٹ انقلاب کے خلاف متحدہ محاذ بنانے پر آمادہ تھا۔

بظاہر لیاقت علی خان کی زیر قیادت نئی حکومت پاکستان کو نوائے وقت کی مذکورہ رائے سے اتفاق تھا۔ چنانچہ ستمبر کے آخری ہفتے میں وزیر خارجہ ظفر اللہ خان اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کرنے کی غرض سے پیرس پہنچا تو وہاں اس نے سب سے پہلے جو کام کئے ان میں ایک کام یہ تھا کہ اس نے مصری وزیر خارجہ احمد خشابہ پاشا سے بات چیت کرنے کے بعد اس کے ساتھ یہ طے کیا کہ اقوام متحدہ میں ایک اسلامی بلاک قائم کیا جائے گا۔ اس فیصلے کے بعد ظفر اللہ خان کا انٹرویو یہ تھا کہ چونکہ مسلم ممالک کے مفادات مشترک اور یکساں ہیں اس لئے اس

بلاک کی تشکیل سے مسلم دنیا کو بہت تقویت پہنچے گی۔ اس انٹرویو سے قبل ظفر اللہ خان نے مصری سفارت خانے میں عرب اور مصری لیڈروں کی ایک میٹنگ میں شرکت کی تھی جس میں فلسطین کا مسئلہ اور مسلم ممالک کو درپیش دوسرے مسائل زیر بحث آئے تھے۔ [3]

مشرق قریب اور مشرق وسطیٰ کے ممالک پر مشتمل سوویت مخالف بلاک کی تشکیل کے لئے پاکستانی، یونانی اور مصری وزرائے خارجہ کی کوشش

4/اکتوبر کو پاکستان میں پیرس میں شائع شدہ یہ خبر موصول ہوئی کہ ''پاکستان اور افغانستان اقوام متحدہ میں مشرق قریب اور مشرق وسطیٰ کے وفود کی اس ابتدائی بات چیت میں شریک ہو رہے ہیں جس میں یہ طے کیا جائے گا کہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں کس قسم کی حکمت عملی ہونی چاہیے۔ جو دوسرے وفود اس بات چیت میں حصہ لے رہے ہیں ان کا تعلق سارے عرب ممالک، یونان اور ترکی سے ہے۔ یہ بات چیت مسلم ممالک کی اس خواہش کی بنا پر شروع ہوئی ہے کہ سال رواں کے آخر میں شام کی دستبرداری کے بعد سلامتی کونسل میں جو نشست خالی ہو گی اس کے پر کرنے کے لئے جو ووٹنگ ہو اس کے لئے مشترکہ لائحہ عمل اختیار کیا جائے۔ اس وقت مصر اور ترکی اس نشست کے لئے امیدوار ہیں لیکن ابھی تک یہ فیصلہ نہیں ہوا کہ مشرق وسطیٰ کی حمایت کس امیدوار کو حاصل ہوگی۔ یونان کا وزیر خارجہ اس ابتدائی بات چیت میں اہم کردار ادا کر رہا ہے اور جب یہ بات چیت ختم ہو گی تو متعلقہ وفود اپنی حکومتوں سے ہدایات طلب کریں گے۔ اگر مشترکہ لائحہ عمل کے بارے میں عمومی اتفاق رائے ہو گیا تو اس کا اثر مسئلہ فلسطین کی متوقع بحث پر ہوگا۔ 12 ملکوں کا یہ گروپ جنرل اسمبلی کے ہر فیصلے پر خاصا اثر انداز ہوگا۔ باخبر حلقے اشارۃً یہ بتاتے ہیں کہ موجودہ بات چیت اقوام متحدہ کے امور تک ہی محدود نہیں رہے گی۔ اس امر کا امکان ہے کہ متعلقہ ممالک آپس میں قریبی معاشی روابط قائم کرنے کے لئے کوئی بنیاد رکھ دیں۔ تاہم با اختیار حلقے ان خبروں کو ''قبل از وقت'' بتاتے ہیں کہ اقوام متحدہ میں بلاک کی تشکیل ہو رہی ہے۔ پاکستانی وفد کے قائد چودھری ظفر اللہ خان نے ''سٹار'' کے نامہ نگار کو بتایا کہ اسے ایک ایجنسی کی ایک رپورٹ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کہ روس کے خلاف مشرق قریب اور مشرق وسطیٰ کے ممالک پر مشتمل ایک بلاک بنایا جا رہا ہے جس میں پاکستان بھی شامل ہوگا۔ ایجنسی کی اس رپورٹ

میں کہا گیا تھا کہ ''یونان کے وزیر خارجہ نے مصر کے وزیر خارجہ سے ایک اینٹی سوویت یونین بلاک بنانے کی تجویز کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ اس مجوزہ بلاک میں افغانستان، مصر، حبشہ، یونان، ایران، عراق، ترکی، یمن، لبنان، پاکستان، سعودی عرب اور شام شامل ہوں گے۔ ظفراللہ خان نے کہا کہ یونان کے وزیر خارجہ نے اس سلسلے میں مجھ سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے کہ یہ بلاک بالکل خیالی ہے۔ عراق، شام، لبنان، افغانستان اور یمن کے مندوبین نے بھی اس سلسلے میں لاعلمی کا اظہار کیا۔''[4] اسی دن قاہرہ سے خبر یہ تھی کہ ''مڈل ایسٹرن بلاک بنانے کی بات چیت ابھی ابتدائی مراحل میں ہے۔ پاکستان کا وزیر خارجہ اس سلسلے میں بہت پس و پیش کر رہا ہے۔''[5]

پیرس اور قاہرہ سے موصول شدہ ان خبروں سے واضح تھا کہ مشرق قریب اور مشرق وسطیٰ کے ممالک پر مشتمل بلاک بنانے کے سلسلے میں پہل مصر نے کی تھی۔ اس کی پہلی وجہ تو یہ تھی کہ حکومت مصر کسی نہ کسی طرح سلامتی کونسل کی رکنیت حاصل کرنے کے لئے بے تاب تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ شاہ فاروق کی حکومت سامراج نواز تھی اور اس بنا پر اسے نہ صرف مشرق وسطیٰ کی جانب سے بلکہ مشرقی بحیرہ روم کی جانب سے بھی خطرہ محسوس ہوتا تھا۔ مصری حکومت نے اسی وجہ سے ستمبر کے دوسرے ہفتے میں پاکستان کے وزیر خزانہ غلام محمد کا خیر مقدم کر کے اس کے ساتھ تجارتی معاہدے کی بات چیت کی تھی۔ تاہم وزیر خارجہ ظفراللہ خان کی طرف سے اس تجویز کے بارے میں پس و پیش کی ایک وجہ غالباً یہ تھی کہ اسے مجوزہ بلاک میں یونان اور حبشہ کی شمولیت پر اعتراض تھا اور دوسری وجہ شاید یہ تھی کہ وہ امریکہ اور برطانیہ کی پالیسی کے پیش نظر مصر کو ترکی پر ترجیح نہیں دینا چاہتا تھا۔ تاہم روزنامہ امروز کو ان خبروں سے تشویش لاحق ہوئی۔ چنانچہ اس کا ادارتی تبصرہ یہ تھا کہ ''ہمیں افسوس ہے کہ اب تک ''اتحاد اسلامی'' کے سلسلے میں جو اطلاعیں آئی ہیں ان سے کسی مثبت لائحہ عمل کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلتا اور یہی وجہ ہے کہ ابھی اتحاد کی طرف عملی قدم اٹھانے کی صرف نیت کی گئی ہے اور دنیا کو بدگمانیاں پیدا ہونے لگی ہیں کہ یہ بلاک سوویت روس کی مخالفت اور امریکہ کی حمایت کے لئے قائم کیا جا رہا ہے۔ خصوصاً اسلامی ممالک کو متحد کرنے کے لئے ایک غیر اسلامی ملک یونان کا سرگرم عمل ہونا ان اندیشوں کو اور زیادہ تقویت پہنچاتا ہے اس لئے کہ یونان سوویت یونین کے خلاف امریکہ کا سب سے طاقتور مورچہ ہے جہاں ہزاروں عوام

محض اس لئے انسانیت سوز مظالم کا شکار ہیں کہ وہ سرمایہ داری نظام کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ پھر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مشرق وسطیٰ میں جو نظام حکومت رائج ہے وہ اسلام سے دور اور سرمایہ داری سے قریب ہے۔ امریکی سرمایہ بری طرح مشرق وسطیٰ پر مسلط ہے۔ اس کے تسلط کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ عرب عوام کی غالب اکثریت امریکہ کی یہود نواز حکمت عملی سے اظہار نفرت کر رہی ہے لیکن ابن سعود اور شاہ فاروق نے اسی ملک کو بدستور تیل و پٹرول کی مراعات دے رکھی ہیں۔"[6]

لیکن نوائے وقت روزنامہ امروز کی اس تشویش میں شریک نہیں تھا۔ اس کی ادارتی رائے یہ تھی کہ "اگر صحیح اصولوں پر اس قسم کا کوئی بلاک قائم ہو جائے اور تمام مسلم ممالک ایمانداری اور خلوص کے ساتھ اس کو مضبوط بنانے کی کوشش کریں تو یہ بلاک کمزور اقوام اور امن عالم کے حق میں بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے...... لیکن مسلم ممالک کو واقعی مسلم بلاک بنانے کے لئے یہ قطعاً ضروری ہوگا کہ جو بھی مسلم ملک اس میں شامل ہو وہ خود کسی بیرونی طاقت کے زیر اثر یا زیر اقتدار نہ ہو۔ یہ بھی اسی قدر ضروری ہے کہ تمام مسلم ممالک کا بلاک خود کسی بڑی سامراجی طاقت کا سیاسی آلہ کار نہ بن جائے ورنہ بلاک قائم کرنے کا بنیادی اور اہم مقصد فوت ہو جائے گا۔ فلسطین کے معاملے پر تمام عرب ممالک پہلے ہی سے متحد ہیں۔ پاکستان عربوں کا ساتھ دے رہا ہے۔ پاکستان نے دوسرے غیر عرب مسلم ممالک سے بھی گہرے اور دوستانہ تعلقات قائم کر لئے ہیں مثلاً افغانستان، ایران، انڈونیشیا اور ترکی سے۔ لازماً عرب اور غیر عرب مسلم ممالک کو متحدہ و منظم کرنے کا کام پاکستان کے ذمہ ہوگا۔ پاکستان دنیا کی سب سے بڑی مسلم مملکت ہے۔ اس لئے اسے بہر حال یہ فرض انجام دینا ہے۔"[7] نوائے وقت کے اس اداریے کا آخری حصہ قابل تعریف تھا لیکن اس میں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ عرب اور غیر عرب ممالک میں وہ کونسے ممالک تھے جو سامراجی طاقتوں کے زیر اثر نہیں تھے۔ ترکی، امریکہ کا طفیلی تھا اور شرق اردن برطانیہ کا پٹھو۔ عراق میں برطانیہ کے فوجی اڈے تھے اور مصر میں برطانیہ کی فوجیں موجود تھیں اور وہ یونان اور حبشہ سمیت اینٹی سوویت بلاک بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایران اور سعودی عرب کے تیل پر برطانیہ اور امریکہ کی کمپنیوں کی اجارہ داری تھی۔ ایران کے داخلی امور میں امریکی سفیر کھلم کھلا مداخلت کرتا تھا اور ایرانی فوج امریکیوں کے کنٹرول میں تھی۔ پاکستان برطانوی دولت مشترکہ کا

رکن تھا اور اس کی فوج پر برطانوی افسروں کا غلبہ تھا۔ لہٰذا ان ممالک پر مشتمل کوئی بلاک کیسے طاقتور ہوسکتا تھا اور یہ کیسے ممکن تھا کہ یہ بلاک سامراج کا آلہ کار نہیں بنے گا۔ محض نوائے وقت کی نعرے بازی سے تو کوئی مسلم بلاک آزاد، خودمختار اور طاقتور نہیں بن سکتا تھا۔

9/ اکتوبر 1948ء کو پاکستان کا وزیراعظم لیاقت علی خان برطانوی دولت مشترکہ کانفرنس میں شرکت کرنے کی غرض سے لندن جاتے ہوئے قاہرہ میں دو ایک دن کے لئے ٹھہرا۔ اس نے قاہرہ پہنچتے ہی عرب لیگ کے سیکرٹری جنرل عزام پاشا سے ملاقات کی اور پھر اخبار نویسوں کو بتایا کہ مسلم اقوام کے درمیان اسلام کے رشتے کبھی نہیں ٹوٹیں گے بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ بندھن اور بھی مضبوط ہوں گے۔ اس نے مزید کہا کہ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے ہمیں کوئی کمیونسٹ مسئلہ درپیش نہیں ہے۔[8]

اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی نشست کے انتخاب پر مصر اور ترکی نے ایک دوسرے کا مقابلہ کیا...... اسلامی بلاک میں اتفاق رائے نہ ہوسکا

لیاقت علی ابھی قاہرہ میں ہی تھا کہ پیرس میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں شام کی خالی کردہ نشست کے لئے رائے شماری ہوئی جس کے دوران ''اسلامی اتحاد'' کی قلعی کھل گئی۔ اگرچہ مصر نے گزشتہ ہفتہ عشرہ میں بے انتہا کوشش کی تھی کہ اس کا ترکی کے ساتھ مقابلہ نہ ہو اور اقوام متحدہ میں اسلامی ممالک کا بلاک اسے بلامقابلہ منتخب کرا دے مگر ایسا نہ ہوا۔ ترکی میدان انتخاب میں ڈٹا رہا۔ چنانچہ چار مرتبہ رائے شماری ہوئی اور مصر 19 ووٹوں کے مقابلے میں 38 ووٹوں سے جیت گیا۔ پاکستان نے مصر کے حق میں ووٹ دیا۔ جب اس انتخاب کے نتیجے کا اعلان ہوا تو ترکی کے نمائندہ نے کہا کہ وہ اس مقابلہ میں محض اس وجہ سے جما رہا کہ یہ اصول قائم نہ ہوجائے کہ یہ نشست عرب نمائندوں کا حق ہے اور اس پر پورے مشرق قریب کا حق نہیں ہے۔ ایران نے ترکی کے حق میں ووٹ دیا کیونکہ وہ بھی ترکی کے اس نظریے سے متفق تھا۔ غیر جانبدار نمائندوں نے مشرق قریب کے ملکوں کے درمیان عدم اعتماد کے اس مظاہرہ پر افسوس کا اظہار کیا۔ اس نشست کے لئے ترکی کا دعویٰ مصر کے دعویٰ کے برابر بلکہ زیادہ مضبوط تھا کیونکہ مصر 1946ء میں اس نشست کا حامل رہ چکا تھا لیکن گزشتہ چند دنوں کے واقعات نے واضح طور پر یہ ظاہر کر دیا

تھا کہ مصر اور عرب بلاک عام طور پر اس سوال کو کتنی اہمیت دے رہے تھے۔[9] تاہم محض سلامتی کونسل کی ایک نشست کے سوال پر مشرق وسطیٰ کے عرب اور غیر عرب مسلم ممالک کے درمیان اس مقابلہ آرائی کے باوجود پاکستان مسلم لیگ کا چیف آرگنائزر چودھری خلیق الزماں اسلامی اتحاد کے بارے میں بدستور پر امید تھا۔ اس کا بیان یہ تھا کہ ''جب پاکستان میں مسلم لیگ کے انتخابات ختم ہو جائیں گے تو میں مشرق وسطیٰ کے ملکوں میں دورہ پر جاؤں گا۔ میرے اس دورے کا مقصد یہ ہو گا کہ مشرق وسطیٰ میں رائے عامہ کو ہموار کر کے کل دنیا کی ایک مسلم لیگ بناؤں جو تمام اسلامی ممالک کے نمائندوں پر مشتمل ہو گی...... مشرق وسطیٰ کے ملکوں کا بلاک اس وقت تک کوئی اہمیت نہیں رکھتا جب تک کہ اسے ان ملکوں کے عوام کی حمایت حاصل نہیں ہو جاتی۔''[10]

دولت مشترکہ کانفرنس میں تنازعہ کشمیر کے بجائے کمیونسٹ خطرہ کو اہمیت دی گئی...... پاکستان کے صحافتی اور ادبی حلقوں کا ردعمل

لیاقت علی خان جب اکتوبر کے دوسرے ہفتے میں لندن کے لئے روانہ ہوا تھا تو اس سے قبل اس نے ملک کے کئی علاقوں کا دورہ کر کے پاکستانی عوام کو یہ تاثر دیا تھا کہ اس دولت مشترکہ کانفرنس میں تنازعہ کشمیر کے حل کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ ہو گا۔ مگر جب وہ وہاں پہنچا تو پتہ چلا کہ حکومت برطانیہ کو تنازعہ کشمیر میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اسے اگر دلچسپی تھی تو صرف اس بات میں کہ جنوب مشرقی ایشیا میں کمیونسٹ بغاوتوں کو کچلنے کے لئے ہندوستان، پاکستان اور سیلون (سری لنکا) کے ذرائع کو مشترکہ طور پر بروئے کار لایا جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں نوائے وقت کے 24 ستمبر کے ادارتی تبصرے کی طرح بااثر کنزرویٹو ڈیلی ٹیلیگراف کا تبصرہ یہ تھا کہ ''پورے ایشیا میں کمیونسٹوں کی مداخلت کاری کی وجہ سے ایسی بدامنی پھیلی ہوئی ہے جس سے چین، کوریا، برما، انڈونیشیا اور انڈوچائنا کی حکومتوں کو تباہی کا خطرہ لاحق ہے اور خود ہندوستان کے لئے بھی ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ اگر یہ ممالک الگ الگ رہے تو اس امر کا امکان ہے کہ یہ یکے بعد دیگرے کمیونزم کا شکار ہو جائیں گے۔ اس خطرے سے ہندوستان کے علیحدگی پسند متاثر ہو سکتے ہیں۔ جو یہ سوال کرتے ہیں کہ دولت مشترکہ کا کیا فائدہ ہے؟''[11]

14 اکتوبر کو برطانیہ کے وزیر خارجہ ارنسٹ بیون کی نیشنل مینوفیکچررز یونین کے

ایک اجتماع میں تقریر یہ تھی کہ ’’آئندہ ایک سو سال کے دوران امن کا دارومدار بحر ہند، مشرق وسطیٰ، پاکستان، ہندوستان اور سیلون پر ہے۔‘‘ اس کا خیال تھا کہ ’’اگر ہم مغربی یورپ کو منظم کر کے اس کا براہ راست مشرق وسطیٰ سے رابطہ قائم کر سکیں، اگر ہم اپنی افریقی سلطنت کے وسیع ذرائع استعمال کر سکیں، اگر ہم جنوبی افریقہ کی ڈومینین سے تعاون کا انتظام کر سکیں، اگر ہم پاکستان اور ہندوستان کے معاملات کو صحیح طریقہ سے طے کر سکیں، اگر ہم چین کی اصلاح کے کام میں مناسب کردار ادا کر سکیں تو ہم مشرق اور مغرب کے درمیان طاقتی توازن قائم رکھنے کی پوزیشن کے حامل ہو سکیں گے۔‘‘ اس نے روس پر توسیع پسندی کا الزام عائد کرتے ہوئے کہا کہ ’’اگر وہ ہمیں بے آرام کریں گے تو پھر ہم اپنے دفاع کے لئے جو کچھ کریں گے اسے اس سے خفا نہیں ہونا چاہیے۔‘‘[12]

12 ؍اکتوبر کو لندن کے اجتماع میں ہندوستان کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے برطانیہ کی حکومت اور عوام کی اس بنا پر تعریف کی کہ انہوں نے بڑے نازک وقت میں ہندوستان کا معاملہ طے کرنے میں بڑی ہمت اور دور اندیشی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس نے کہا کہ اس طرح ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ایک طرح کا بندھن قائم ہو گیا ہے جو غالباً جاری رہے گا۔ جواباً برطانیہ کے سابق وزیر ہند لارڈ پیتھک لارنس (Pathick Lawrence) نے کہا کہ نہرو ان عظیم شخصیتوں میں سے ہے جو ان رکاوٹوں کو دور کرتی ہیں جو انسان ایک دوسرے کے درمیان کھڑی کر لیتے ہیں۔ وہ کینہ پرور نہیں ہے۔ اس کے مزاج میں تلخی نہیں ہے۔ وہ ناکامی اور شکست سے حوصلہ نہیں ہارتا اور کامیابی کی وجہ سے وہ کبھی بھی بے جا پھونک نہیں لیتا۔‘‘ برطانوی پارلیمنٹ کے ایک رکن سٹینلے ریڈ (Stanely Reed) نے بھی اپنی تقریر میں نہرو کی بے پناہ تعریف کی اور کہا کہ ’’ہم برطانوی عوام آپ کے عظیم کام میں آپ کی مدد کرنے کے لئے اپنی پوری ہمدردی اور وسائل کے ساتھ آپ کے ساتھ ہیں اور آپ کے ساتھ رہیں گے۔‘‘ اسی طرح لیبر پارٹی کے سابق چیئرمین پروفیسر ہیروڈ لاسکی (Harrod Laski) نے بھی نہرو کو خراج تحسین پیش کیا۔ جب اس جلسے کی کاروائی کی خبر کراچی پہنچی تو روزنامہ ڈان بہت خفا ہوا کیونکہ اس کی ادارتی رائے یہ تھی کہ برطانیہ کی حکومت اور لیبر پارٹی کے لیڈروں نے نہرو پر تحسین و توصیف کے جو پھول نچھاور کئے ہیں پاکستان ان میں دلچسپی لئے بغیر اس لئے نہیں رہ سکتا کیونکہ ہندوستان نے کشمیر میں فوجی

جارحیت کا ارتکاب کیا ہے۔ ڈان کی مزید رائے یہ تھی کہ ’’ہم نے بہت دیر تک برطانیہ کے ساتھ رابطہ کو ایک ’’قدرتی رابطہ‘‘ سمجھا ہے۔ ہم نے بہت ہی بلا سوچے سمجھے برطانیہ کے دوستی یا غیر جانبداری کے دعوؤں کو قبول کیا ہے اور ہم نے بہت ہی خوش اعتمادی کے ساتھ یہ تصور کیا ہے کہ برطانیہ کے ساتھ ہمارے روابط ہمارے لئے سود مند ہیں لیکن اب اس امر کا امکان ہے کہ ہمیں اپنے ان خیالات پر بنیادی طور پر نظر ثانی کرنی پڑے۔ جب ہمارا وزیر اعظم لندن سے واپس آئے گا تو بلا شبہ اس کی عقل و دانش میں اضافہ ہوا ہوگا اور ہمیں خدشہ ہے کہ اسے افسوس بھی ہوگا۔ اگر ہمارا یہ خدشہ صحیح ثابت ہوا تو ایسی صورت میں پاکستان نے جرأت مندی کے ساتھ حقائق کا سامنا نہ کیا تو یہ بات پاکستان کے لئے خودکشی کے مترادف ہوگی۔ اگر برطانیہ ہندوستان کا انتخاب کرتا ہے اور پاکستان سے دغا کرتا ہے تو ہمیں بھی مشرق اور مغرب کے درمیان اپنا انتخاب کرنا چاہیے۔ ہمیں برطانوی پروپیگنڈے کے ذریعے یہ سکھایا گیا ہے کہ ایک مخصوص نظریہ مطعون ہے اور مخصوص لوگوں میں وہ سب برائیاں ہیں جو انسانی زندگی کی خوشیوں کو تباہ برباد کر دیتی ہیں۔ جنگ کے زمانے میں یہ پروپیگنڈا باز ان ہی ’’شیطانوں‘‘ کی کسی اور طرح سے تصویر کشی کرتے تھے۔ ہم وہ سب کچھ بھولے نہیں ہیں۔ ممکن ہے کہ مغرب میں ہر چمکیلی چیز سونا ہے اور مشرق میں جو سنہری چیز ہے وہ ہم سے محض اس لئے چھپی ہوئی ہے کہ ہماری آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔ کچھ بھی ہو ہمارے نزدیک اس سے زیادہ برا کوئی نہیں ہے جو ہمارے خلاف جارحیت کرنے والے کی بالواسطہ یا بلا واسطہ طور پر مدد کرے۔ اگر ہماری اپنی بقا خطرے میں پڑ گئی تو ہمارے کسی نظریے کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ ہم اپنے عوام کو پوری سنجیدگی کے ساتھ اس حقیقت کا احساس کرنے کی اپیل کرتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ہماری قوم کے اہل دانش خواب غفلت سے بیدار ہو جائیں گے اور اپنے آپ کو نظریہ اور پالیسی میں انقلابی تبدیلی کے لئے تیار کریں گے۔ بقا کا سوال اولین ہوتا ہے۔ نظریات کی اہمیت اسی وقت ہوتی ہے جب کوئی قوم ان پر عمل کرنے کے لئے زندہ رہے۔‘‘[13]

لاہور کے دو ادیبوں سعادت حسن منٹو اور محمد حسن عسکری کو ڈان کا یہ مشورہ بالکل بروقت اور درست لگا۔ چنانچہ ان کا 17 / اکتوبر کو مشترکہ بیان یہ تھا کہ ’’سب سے پہلی چیز تو ہماری قوم کی بقا ہے۔ نظریوں کی بحث بعد میں آتی ہے۔ ویسے بھی ہمیں اسلام نے یہ نہیں سکھایا کہ معروضی مطالعے

اور غور وفکر کے بغیر کسی چیز کو مردود قرار دیں۔ ہوسکتا ہے کہ جس چیز کو مغرب اپنے استعمار کے لئے مطعون کرنا چاہتا ہے وہ چند مناسب تبدیلیوں کے بعد انصاف اور مساوات کے اسلامی تصور کے بالکل قریب آ جائے...... چنانچہ ہم مغرب کے کہہ دینے سے کسی نظریے کو ہوّا نہیں بنا سکتے۔ ہم پوری وسعت نظری کے ساتھ ہر نظریے کا مطالعہ کریں گے اور پھر اپنے لئے کوئی راستہ بنائیں گے۔''ڈان'' نے قوم کو ذہنی طور سے انقلابی تبدیلیوں کے لئے تیار رہنے کو کہا ہے۔ اگر ایسی تبدیلیاں واقع ہوئیں تو سب سے پہلے ادیب ان کا استقبال کریں گے اور ان تبدیلیوں سے قوم میں جو نیا عملی جوش پیدا ہوگا اسے جلد از جلد تعمیری کاموں میں لگانے میں حکومت کا ہاتھ بٹائیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ قوم بغیر کسی دقت کے ان تبدیلیوں سے ذہنی ہم آہنگی پیدا کرے گی بلکہ ان سے قوم میں نئی خود اعتمادی اور نئی عملی قوت پیدا ہوگی۔''[14]

لندن میں لیاقت نے دولت مشترکہ اور اسلامی بلاک ہر دو حوالے سے سوویت یونین کی مخالفت کا کھلا اعلان کر دیا

لیکن وزیر اعظم لیاقت علی خان کو ڈان کی رائے اور ان ادیبوں کی رائے سے اتفاق نہیں تھا۔ اسے پاکستان میں اپنے اقتدار کے استحکام کے لئے ہندوستان سمیت برطانوی دولت مشترکہ کے رکن ممالک کی پشت پناہی کی ضرورت تھی۔ لہٰذا اسے نوائے وقت کے 24 ستمبر کی اس ادارتی رائے سے اتفاق تھا کہ ''جنوب مشرقی ایشیا سے کمیونزم کا ایک سیلاب امڈ کر آ رہا ہے زود یا بدیر یہ سیلاب پاکستان بھی پہنچے گا۔ اگر یہ ملک چین اور برما کے انجام یعنی خانہ جنگی، تباہی، بربادی اور ایک غیر ملکی آمریت سے بچنا چاہتا ہے تو اسے اپنے دفاعی استحکامات کی ابھی سے فکر کرنی چاہیے۔'' چنانچہ جب 20 اکتوبر کو پاکستانی اخبارات میں یہ خبر چھپی کہ دولت مشترکہ کانفرنس میں مشرق قریب، مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید میں کمیونزم کے خطرے کے سد باب کے لئے اقدامات پر غور کیا گیا ہے تو اس کے ساتھ ہی وزیر اعظم لیاقت علی خان کا ایک انٹرویو بھی شائع ہوا جو اس نے لندن میں برطانوی خبر رساں ایجنسی ''سٹار'' کو دیا تھا۔ اس انٹرویو میں یہ رائے ظاہر کی گئی تھی کہ ''روس جنگ نہیں کرنا چاہتا۔ روس کی پالیسی بالکل مختلف ہے۔ اس کی پالیسی توسیع پسندانہ ہے۔ وہ بدامنی پیدا کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ انقلاب کو بھی روکتا ہے کیونکہ اشتراکیت افراتفری

کی حالت میں کامیاب ہوتی ہے۔ یہ پالیسی رسمی اعلان جنگ کی طرح کی نہیں ہے مثلاً آج ڈاؤ ننگ سٹریٹ میں ہم یعنی دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم پھر دفاع پر بحث کریں گے اور اس سوال پر بھی تبادلۂ خیالات کریں گے کہ دولت مشترکہ کے ممالک پوری دولت مشترکہ کے لئے کیا کر سکتے ہیں ظاہر ہے کہ مغرب اور دوسری طاقتوں کو جارحیت کا مقابلہ کرنا ہی ہوگا۔ اگر مغربی طاقتوں نے برلن کے مسئلہ پر مضبوط موقف اختیار نہ کیا ہوتا تو روس کی پوزیشن وہ نہ ہوتی جو آج ہے۔ روس کو اب یہ احساس ہونے لگا ہے کہ جمہوریت پسند ممالک سنجیدہ ہیں۔ پاکستان دفاع کے معاملے میں اور بالخصوص مسلم دنیا سے متعلقہ خارجہ پالیسی کے معاملے میں بہت اہم کردار ادا کرے گا۔ پاکستان دنیا کا سب سے بڑا مسلم ملک ہے اور اس حیثیت سے یہ یقیناً بہت اہم کردار ادا کرے گا۔ اس کی رائے میں ناگزیر طور پر بہت وزن ہوگا۔ پاکستان کے پاس خام مال اور بالخصوص پٹ سن ہے۔ اس لئے یہ لازمی طور پر بڑا کردار ادا کرے گا۔ میری تجویز یہ ہے کہ دولت مشترکہ ممالک کو ایک ایسی مشینری قائم کرنی چاہیے کہ جس کے ذریعے دولت مشترکہ ممالک کے درمیان قریبی رابطہ رہ سکے اور ہر ملک عالمی امن کے لئے بہتر کردار ادا کر سکے۔ فی الحال یہ مشینری لندن میں قائم ہوسکتی ہے لیکن بعد میں کسی دوسرے دولت مشترکہ ملک کے دارالحکومت میں بھی ہوسکتی ہے۔"[15]

21/اکتوبر 1948ء کو لیاقت علی خان نے لندن میں رائل انڈو۔ پاکستان سوسائٹی کے ایک اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "اگر دولت مشترکہ دنیا کے امن وامان کے لئے کچھ کرنا چاہتی ہے تو اس کے تمام ارکان پر لازم ہے کہ وہ ایک کنبہ کے افراد کی طرح مل کر کام کریں۔ دولت مشترکہ کی مثال ایسے خاندان کی ہے جس کے تمام افراد کا عقیدہ ایک ہی قسم کے جمہوری اصولوں پر ہے اور جن کے یہاں پارلیمانی طرز حکومت رائج ہے۔ پاکستان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ سب سے کم عمر مملکت ہے۔ یہ بات ہے تو بالکل ٹھیک مگر اس کے ساتھ یہ بات بھی ہے کہ پاکستان سب سے بڑی اسلامی ریاست ہے اور دنیا میں پانچواں بڑا ملک ہے۔"[16]

قائداعظم جناح کے انتقال کے تقریباً ایک ماہ بعد لیاقت علی خان کا یہ انٹرویو بہت اہم تھا اور اس کی یہ تقریر بھی اہمیت سے خالی نہیں تھی کیونکہ اس نے اس انٹرویو اور اس تقریر میں اپنی خارجہ پالیسی بالکل واضح کر دی تھی۔ اگرچہ اس کی یہ پالیسی اس خارجہ پالیسی کے مطابق تھی جس

کی وضاحت قائداعظم نے 21 رمئی 1947ء کو لندن ٹائمز سے انٹرویو کے دوران اور قیام پاکستان کے تھوڑے ہی عرصے بعد امریکی اخبار نویس مارگریٹ بورک وائٹ سے ملاقات میں کی تھی۔ لیکن یہ پالیسی اس خارجہ پالیسی سے مختلف تھی جس کی وضاحت قائداعظم جناح نے مارچ 1948ء میں روزنامہ نیو زورکر زیتونگ کے نامہ نگار خصوصی ڈاکٹر ایرک سٹرائف سے انٹرویو میں کی تھی۔ اس انٹرویو میں جناح نے واضح کر دیا تھا کہ ''ہندوستان اور پاکستان کے درمیان مشترکہ دفاع کا انحصار کلیتہً اس بات پر ہے کہ پاکستان اور ہندوستان پہلے اپنے اختلافات دور کر سکتے ہیں یا نہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم بین الاقوامی معاملات میں اسی وقت نمایاں حصہ لے سکتے ہیں کہ پہلے اپنے اندرونی معاملات کو سدھار لیں۔'' لیکن اب لیاقت علی خان ہندوستان سے پاکستان کے اختلافات دور کئے بغیر ہی اس سے مل کر اینٹی سوویت محاذ بنانے پر آمادہ تھا۔ وہ نہ صرف برطانیہ کی زیر سرپرستی ہندوستان اور سیلون کے ساتھ مل کر برما، ملایا اور جنوب مشرقی ایشیا کے دوسرے ممالک میں کمیونسٹ انقلاب کے کچلنے کی کارروائی میں اہم کردار ادا کرنے کو تیار تھا بلکہ وہ دنیا میں سب سے بڑے اسلامی ملک پاکستان کی اینگلو۔امریکی سامراج کے زیر سایہ مشرق وسطیٰ کے مجوزہ اینٹی سوویت بلاک میں شرکت پر تیار تھا۔ وہ کشمیر اور فلسطین میں برطانیہ وامریکہ کی دغابازی کے باوجود انہیں ناقابل اعتماد نہیں سمجھتا تھا۔ ان کے مقابلے میں وہ روس کو نہایت خطرناک سمجھتا تھا حالانکہ اس وقت تک روس نے کسی بھی سطح پر پاکستان کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا اور عراق، شرق اردن، مصر اور دوسرے عرب ممالک کے عوام الناس میں روس کے خلاف اتنی نفرت نہیں تھی جتنی کہ برطانیہ اور امریکہ کے خلاف تھی۔ مصر میں ''سوویت یونین زندہ باد'' کے نعرے لگتے تھے۔ اسے روزنامہ ڈان کا یہ مشورہ پسند نہیں تھا کہ ملک کی خارجہ پالیسی میں بنیادی اور انقلابی تبدیلیاں کی جائیں اور انگریزوں کو چھوڑ کر ایسے دوست ڈھونڈے جائیں جو برے وقت میں دھوکا نہ دیں بلکہ ہمارے کام آئیں۔ اسے سعادت حسن منٹو اور حسن عسکری کی اس رائے سے بھی اتفاق نہیں تھا کہ ''ہم مغرب کے کہہ دینے سے کسی نظریے کو ہوّا نہیں بنا سکتے۔ ہم وسعت نظری کے ساتھ ہر نظریے کا مطالعہ کریں گے اور پھر اپنے لئے کوئی راستہ بنائیں گے۔''

لیاقت علی خان کی بیگم اس سلسلے میں اپنے شوہر سے بھی دو قدم آگے تھی۔ اس نے

کمیونزم کے بارے میں 26 ر اکتوبر کو لندن میں ایک انٹرویو دیا جو اس کا پہلا سیاسی انٹرویو تھا۔ اس نے کہا کہ ''پاکستان کمیونزم کے خلاف عظیم ترین قلعہ ہوگا۔ پاکستان میں کمیونزم کا کوئی ہوّا نہیں ہے۔ پاکستان میں صرف ایک مذہب ہے (بظاہر وہ مشرقی پاکستان کے ڈیڑھ کروڑ ہندوؤں کو پاکستانی ہی نہیں سمجھتی تھی) اور ہندوستان کے مقابلے میں ہمارے ہاں سرمایہ داروں کی تعداد بہت تھوڑی ہے اس لئے ہمارے ملک میں کمیونزم کے جڑیں پکڑنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ ہم ہندوستان میں غلام رہے ہیں۔ پاکستان دوبارہ غلام نہیں ہونا چاہے گا۔ پاکستان سارے مسلم ممالک سے انتہائی دوستانہ تعلقات قائم کرنا چاہتا ہے اور ہم مسلم ممالک کے بارے میں زیادہ سے زیادہ واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔''[17] بیگم لیاقت علی خان کے اس انٹرویو کا مطلب بھی وہی تھا جو اس کے شوہر کا تھا یعنی یہ کہ انگریز بدستور ہمارا ''مائی باپ'' ہے۔ ہم بلا چون وچرا اس کی فرمانبرداری کرتے رہیں گے۔ جنوب مشرقی ایشیا میں بھی اور مشرق وسطیٰ میں بھی۔

27 ر اکتوبر 1948ء کو وزیر اعظم لیاقت علی خان نے بی بی سی سے ایک نشری تقریر میں انگریز ''مائی باپ'' کو اعلانیہ یقین دلایا کہ دنیا میں امن و امان قائم رکھنے کے لئے پاکستان زیادہ سے زیادہ کوشش کرے گا اور ہر اس ملک اور قوم کے ساتھ مل کر کام کرنے کے لئے ہمہ تن تیار ہے جو تخریبی قوتوں کا قلع قمع کرنے کے لئے عملاً تیار ہو۔ دولت مشترکہ کے تمام ارکان ایک مشترکہ رشتہ میں منسلک ہیں اور جب سے پاکستان، ہندوستان اور لنکا اس برادری میں شامل ہو گئے ہیں اس کی نوعیت میں تبدیلی ہو گئی ہے کیونکہ پہلے کی طرح اب اس میں وہ نسلی اور تمدنی ہم آہنگی نہیں رہی۔ مگر مشترک بات یہ ہے کہ وہ جمہوری طرز زندگی کے قائل ہیں اور آزاد ملکوں کی ایک ایسی انجمن ہے جس کی مثال موجود نہیں ہے اور یہ انجمن امن کا ایک بڑا ذریعہ بن سکتی ہے۔''[18] اگرچہ لیاقت علی خان کی اس نشری تقریر میں بھی اس کے سابقہ بیانات کی طرح خاص ابہام نہ تھا۔ تاہم برطانوی خبر رساں ایجنسی سٹار نے 28 ر اکتوبر کو پاکستان کے وزیر اعظم کے افکار و خیالات و نظریات کی مزید وضاحت کے لئے ایک خبر جاری کی جس میں وہ سب کچھ بے نقاب کر دیا گیا جس پر لیاقت علی خان اس وقت تک الفاظ کے ہیر پھیر کا کچھ پردہ ڈال رہا تھا۔ اس خبر میں کہا گیا تھا کہ ''پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خان کی عرب لیڈروں سے مجوزہ ملاقات کے متعلق یورپ کے اشتراکی حلقوں میں جو قیاس آرائی کی جارہی ہے خیال یہ ہے کہ اس

کی پشت پر روس کے یہ اندیشے کارفرما ہیں کہ روس اپنے توسیع پسند عزائم کی راہ میں اسلام کو زبردست رکاوٹ سمجھتا تھا۔ ان حلقوں کا کہنا ہے کہ مسٹر لیاقت علی خان اور عرب لیگ قطعی طور پر روس کے خلاف ایک عربی۔ پاکستانی محاذ قائم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ بات معلوم ہے کہ گزشتہ چند ہفتوں میں اسلامی لیڈروں نے روس کی مخالفت میں جو اعلانات کئے ہیں ان پر ماسکو میں بہت توجہ دی جارہی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ روس کے زیر اثر علاقوں میں مسلم اقلیتوں سے روس کی نمائشی خیرسگالی کی قدر و قیمت بھی فلسطین میں صیہونی جارحانہ پیش قدمیوں میں روسی حمایت کی وجہ سے ختم ہوگئی۔ اس وقت فلسطین کے اشتراکی عناصر جو جدوجہد کر رہے ہیں اس میں اسلام سے اپیل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی جارہی ہے اور روسی پروپیگنڈا بازوں کو اشتراکیت اور اسلام کے اصولوں میں یکسانیت سے فائدہ اٹھانے میں بڑی دشواری پیش آرہی ہے۔ جس جوش وخروش کے ساتھ اس سال حج ادا کیا گیا وہ بھی اشتراکیوں کے لئے قابل توجہ بات ہے۔ اس وقت لیاقت علی کے دورۂ قاہرہ کے متعلق لندن میں نسبتاً کم قیاس آرائی کی جارہی ہے۔ پھر بھی یہ خیال ہے کہ فوری سیاسی مسائل کے قطع نظر ان مذاکرات پر لادینیت اور نظریاتی جارحانہ پیش قدمی کے اصولوں کے خلاف اسلامی وحدت کا اثر پڑے گا۔''[19] ظاہر ہے کہ سٹار کی اس خبر میں پہلے تو اس مقصد اور اس لائحہ عمل پر روشنی ڈالی گئی تھی جس کی خاطر لیاقت علی خان کو لندن سے واپسی پر قاہرہ میں ٹھہرنا تھا اور پھر اس میں یہ تجویز کیا گیا تھا کہ سوویت یونین کے اشتراکی نظریے کے سدباب کے لئے مذہب کا حربہ استعمال کیا جائے کیونکہ سیکولر میدان میں سرمایہ دارانہ جمہوری نظریے سے یا جاگیردارانہ روائتی نظریہ سے غریبوں کے اشتراکی نظریے کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔

مصر کی اخوان المسلمین نے لیاقت کی سامراج نوازی اور یہود نوازی پر تنقید کی

یکم نومبر کو مصر کی انجمن اخوان المسلمین کی طرف سے لندن میں ایک بیان کے ذریعے لیاقت علی خان کی سامراج نوازی اور یہود نوازی پر نکتہ چینی کی گئی اور مطالبہ کیا گیا کہ عالم اسلام کی ایک کانفرنس بلاتاخیر کراچی میں طلب کر کے یہ فیصلہ کیا جائے کہ موجودہ حالات میں مسلم ممالک کو کونسا لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیے اور انہیں مشرقی اور مغربی بلاکوں میں سے کس بلاک کو پسند کرنا چاہیے۔ اس بیان میں پاکستان سے استفسار کیا گیا کہ ''کیا پاکستان اس دولت مشترکہ کی برادری

میں رہنے کا خواہشمند ہے جس کا کرتا دھرتا برطانیہ ہے جو مسلمانوں اور عربوں کی تمام تباہیوں اور موجودہ مشکلات کا بانی مبانی ہے۔ کیا پاکستان اس دولت مشترکہ کا رکن رہنا چاہتا ہے جس کے ایک رکن آسٹریلیا نے اپنے ملک میں پاکستانیوں کو صرف اس لئے شہری حقوق سے محروم کیا ہے کہ وہ ان کی طرح سفید فام نہیں اور کیا پاکستان اس دولت مشترکہ کی برادری کا دلدادہ ہے جس کے دوسرے رکن جنوبی افریقہ نے سب سے پہلے اسرائیلی حکومت کو تسلیم کیا تھا اور کیا پاکستان اس دولت مشترکہ کی دوستی کا متمنی ہے جس کے ارکان میں کینیڈا جیسا یہود نواز ملک بھی شامل ہے۔ بیان کے آخر میں مغربی ممالک کو متنبہ کیا گیا کہ جب تک مسلمانوں کو سامراجی ملکوں کی غلامی سے نجات نہیں ملتی کوئی اسلامی ملک مغربی جمہوریت کے قریب نہیں آئے گا اور امریکی سامراجی بلاک میں شامل نہیں ہوگا۔''[20]

انجمن اخوان المسلمین مصر کے مسلم نوجوانوں کی احیائی تنظیم تھی۔ اس کا کوئی واضح سیاسی، معاشی، معاشرتی پروگرام نہیں تھا اور یہ جو ''اسلامی'' نعرے لگاتی تھی ان سے رجعت پسندیت اور قدامت پرستی ٹپکتی تھی۔ تاہم مصر اور دوسرے عرب ممالک کے عوام الناس میں امریکہ، برطانیہ اور صیہونیت کے خلاف نفرت و برہمی اتنی زیادہ تھی کہ اس تنظیم کے لئے اپنی مقبولیت کو برقرار رکھنے اور اسے فروغ دینے کے لئے ضروری تھا کہ یہ اینگلو۔امریکی سامراج اور صیہونیت کے خلاف عرب عوام کی ہمنوائی کرے۔ اس کی اسی ضرورت نے اسے مجبور کیا تھا کہ وہ لیاقت علی خان کی برطانوی دولت مشترکہ سے وابستگی کی مذمت کرے اور مشرق وسطیٰ کے لئے امریکہ سامراجی بلاک کی تجویز کی مخالفت کرے۔

دورہ قاہرہ کے دوران مصری رائے عامہ کے دباؤ کے تحت لیاقت علی کی قلابازی

لیاقت علی خان نومبر 1948ء کو اپنی حکومت کے سیکرٹری جنرل چودھری محمد علی کے ہمراہ قاہرہ پہنچا اور وہاں اس نے عرب لیگ کے سیکرٹری جنرل کی دعوت پر تین دن قیام کیا۔ اس عرصہ میں اس نے شاہ فاروق، وزیر اعظم نقراشی پاشا اور دوسرے مصری لیڈروں سے ملاقاتیں کیں۔ 3 رنومبر کو اس نے پونے دو گھنٹے نقراشی پاشا سے ملاقات کے بعد اخبار نویسوں کو بتایا کہ ''نقراشی

پاشا سے میری ملاقات بہت خوشگوار اور دلچسپ رہی۔ ہم نے بین الاقوامی صورتحال اور بالخصوص عالم اسلام کے بارے میں بات چیت کی ہے۔"[21] 4رنومبر کو اس نے قاہرہ میں ایک پریس کانفرنس میں "اسلامی بلاک" کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ میں بین الاقوامیت میں ایمان رکھتا ہوں۔ دنیا کا مستقبل مختلف بلاک قائم کرنے کی صورت میں محفوظ نہیں ہو سکتا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ بین الاقوامی مراسم زیادہ سے زیادہ مضبوط ہو جائیں۔ اس نے لندن کی دولت مشترکہ کانفرنس کے بارے میں بتایا کہ "کانفرنس میں مشترکہ مفاد کے مسائل پر تبادلہ خیالات ہوا، مغربی یورپ، امدادی سکیموں، برلن کے تنازعہ اور بین الاقوامی صورتحال پر غور وخوض ہوا۔"[22] "اسلامی بلاک" کے بارے میں لیاقت علی خان کے اس جواب کا مطلب یہ تھا کہ مصری حکومت اپنے ملک کی رائے عامہ کے پیش نظر فی الحال اپنے آپ کو کھلم کھلا امریکی بلاک سے وابستہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی حالانکہ اسی حکومت کا وزیر خارجہ محض سلامتی کونسل کی نشست حاصل کرنے کے لئے اکتوبر کے اوائل میں اقوام متحدہ میں اینٹی سوویت بلاک بنانے پر آمادہ تھا۔

تاہم نوائے وقت کو لیاقت علی کی یہ بات بہت مہمل نظر آئی تھی۔ اس کا تبصرہ یہ تھا "ہمیں قطعاً یقین نہیں کہ مسٹر لیاقت علی خان نے ایسا انٹرویو دیا ہو۔ پاکستان دنیا کی سب سے بڑی مسلمان سلطنت ہے اور مسٹر لیاقت علی بارہا اس پر فخر کا اظہار کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ پاکستان کی رائے عامہ اس کی مؤید ہی نہیں بے تابی کے ساتھ اس کی منتظر ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان ملک ایک متحدہ بلاک بنا کر اپنے مشترکہ مسائل کو حل کریں۔ یوں بھی ایک اسلامی بلاک کو بین الاقوامیت کے منافی سمجھنا یا قرار دینا حیرت انگیز ہے۔ جب پاکستان کی دولت مشترکہ میں شرکت بین الاقوامیت کے منافی نہیں تو مسلمان ملکوں کے بلاک میں پاکستان کا شامل ہونا کیوں کر بین الاقوامیت کے خلاف قرار دیا جا سکتا ہے؟"[23] نوائے وقت نے جب یہ تبصرہ کیا تھا تو اسے پاکستان کی رائے عامہ یعنی پنجاب کے درمیانہ طبقہ کی رائے عامہ کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اسے یہ دکھائی نہیں دیتا تھا کہ عالم عرب کی رائے عامہ اسلامی بلاک یا اینگلو۔ امریکی بلاک کی تجویز کے اس قدر خلاف تھی کہ اخوان المسلمین جیسی رجعت پسند وقدامت پرست تنظیم بھی اس کی مخالفت کئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔

تاہم 5رنومبر کو لیاقت علی خان نے قاہرہ سے روانگی سے قبل وہاں اپنی ایک نشری

تقریر میں مصر اور پاکستان کے عوام کے درمیان تاریخی، مذہبی اور ثقافتی رشتوں کا ذکر کیا اور کہا کہ ''آج مسلم دنیا نہایت نازک دور سے گزر رہی ہے۔ مشرق وسطیٰ میں، جو مشرق اور مغرب کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتا ہے، اس نازک صورتحال کی علامتیں بہت نمایاں ہیں۔ عالمی امن کے لئے مشرق وسطیٰ کے اتحاد اور اس کے معاشی حالات کی بہتری کی ضرورت ہے۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم اپنے پیش نظر اسلامی اصولوں کو رکھیں اور اس کے ساتھ ہی عصر جدید کی ان سب چیزوں کو اپنائیں جو قابل قدر ہیں۔ مصر ایک ترقی پسند ملک بننا چاہتا ہے۔ میں نے اس ملک کے ممتاز مدبرین سے باتیں کی ہیں اور میں بنیادی مسائل کے بارے میں ان کے فہم وادراک سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ پاکستان کے عوام مصری عوام کے ساتھ ہر شعبۂ زندگی میں قریب ترین تعلقات قائم کرنا چاہتے ہیں۔''[24]

لیاقت علی خان 6/نومبر کو واپس کراچی پہنچا تو اس نے 8/نومبر کو کراچی ریڈیو سے جو نشری تقریر کی وہ قاہرہ ریڈیو کی نشری تقریر سے کچھ زیادہ ''اسلامی'' تھی۔ اس نے اپنی اس تقریر میں پاکستانی عوام کو بتایا کہ ''مشرق وسطیٰ کے مسلمان پاکستان کے ساتھ برادرانہ شفقت کے جذبات کے حامل ہیں اور وہ اس ڈومینین کی بہت عزت کرتے ہیں...... آج کل مسلم دنیا کو جو مشکلات درپیش ہیں ان کا واحد حل یہ ہے کہ مسلم ملکوں کے درمیان فکری اور عملی اتحاد ہو۔'' اس نے دولت مشترکہ کانفرنس کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ''اگر اس تنظیم کے ارکان کے درمیان کوئی اختلافات ہوں تو ان کا منصفانہ تصفیہ غیر ممکن نہیں ہونا چاہیے اور ان اختلافات سے دولت مشترکہ کے اتحاد کو نقصان نہیں پہنچنے دینا چاہیے۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ اگلی دولت مشترکہ کانفرنس کی نوعیت محض مشاورتی نہیں ہوگی۔''[25]

انگریز رہنماؤں اور صحافیوں کی جانب سے اسلامی احیا پسندی کی حمایت اور پاکستان کے روس کا مقابلہ کرنے کے جذبہ کی تعریف

11/نومبر کو برطانوی پارلیمنٹ کے رکن مارگن فلپس پرائس (Phillips Price Morgan) نے ''مانچسٹر گارڈین'' میں تنازعہ کشمیر کے بارے میں پاکستان کے موقف کی حمایت کرتے ہوئے لکھا کہ ''چونکہ پورے مشرق وسطیٰ میں مذہب کا احیا ہو

رہا ہے اس لئے اگر کشمیریوں کو آزادانہ طور پر فیصلہ کرنے دیا جائے تو وہ اپنے ہم مذہبوں کا ساتھ دیں گے۔'' [26] اسی دن لندن کے اخبار ڈیلی ٹیلیگراف میں مولین ایمرے کا بھی ایک مضمون چھپا جس میں اس نے بتایا کہ ''ترکی میں مذہب کا بتدریج احیا ہو رہا ہے۔ کچھ سالوں سے حکومت ترکی اس کی غیر سرکاری طور پر ہمت افزائی کر رہی ہے اور اب انقلاب کے بعد پہلی مرتبہ استنبول میں ایک نئی مسجد بنائی جا رہی ہے۔'' [27] لندن کے اخبارات میں ممتاز انگریز لیڈروں کے ان دونوں مضامین کا مطلب یہ تھا کہ ترکی سمیت مشرق وسطیٰ کے ممالک میں مذہب کے احیا کی تحریک میں کوئی برائی نہیں بلکہ یہ اچھی چیز ہے کیونکہ صرف اسی طرح اینٹی سوویت بلاک بنایا جا سکتا ہے۔ پاکستان میں بھی ان دنوں مختلف النوع ملاؤں نے نظام شریعت کے فوری نفاذ کی تحریک شروع کر رکھی تھی اور انگریزوں کو اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اولاً اس لئے کہ پاکستانی ملاؤں کی یہ تحریک مشرق وسطیٰ کی اخوان المسلمین کی تحریک کی طرح سامراج دشمن نہیں تھی اور ثانیاً اس لئے کہ بقول لیاقت علی خان ''پاکستان کو کمیونزم کا کوئی مسئلہ درپیش نہیں ہے'' اور بقول بیگم لیاقت علی خان'' پاکستان کمیونزم کے خلاف عظیم ترین قلعہ ہے۔ پاکستان میں کمیونزم کا کوئی ہوّا نہیں ہے۔''

لندن کے اخبار ''آبزرور'' کے نامہ نگار خصوصی نے بظاہر اسی تاثر کے تحت نومبر میں پاکستان کا دورہ کرنے کے بعد ایک طویل مضمون لکھا جس میں اس نے رائے ظاہر کی کہ ''چترال پاکستان آنے کے لئے روس کا صدر دروازہ ہے۔ اشتراکی ایشیا سے اس نوزائیدہ اسلامی مملکت کو صرف ایک نقرئی چشمہ جدا کرتا ہے۔ چشمہ کے اس پار روسی محافظ متعین ہیں جو سرحد اور پاکستانیوں کا جائزہ لیتے رہتے ہیں اور سرحد کے اس پار پاکستانی سپاہی روسیوں کو دیکھتے رہتے ہیں لیکن ان دونوں حریف محافظ دستوں میں نامہ و پیام کبھی نہیں ہوتا اور نہ ان میں کسی قسم کی راہ و رسم قائم ہے۔ اپنی شمالی سرحدوں کی آپ حفاظت کر کے پاکستان دولت مشترکہ کی حفاظت کے لئے ایک قابل قدر فوجی خدمت ادا کر رہا ہے۔ اپنی دفاعی ذمہ داریوں سے یکا و تنہا عہدہ برآ ہو کر پاکستان دولت مشترکہ کی ایک بہت اہم ذمہ داری سے سبکدوش ہو رہا ہے اور جیسا کہ پاکستان کے وزیر اعظم مسٹر لیاقت علی خان لندن میں فرما چکے ہیں پاکستان نے یہ ذمہ داری برضا و رغبت قبول کی ہے۔ اس کے صلے میں مملکت پاکستان دولت مشترکہ سے توقع رکھتی ہے کہ وہ بھی پاکستان سے متعلق اپنی ذمہ داریوں کو دیانت داری سے نبھائے گی۔ کراچی کے سیاسی حلقے

اعتراف کرتے ہیں کہ دولت مشترکہ کی بیش از بیش دفاعی مقتضیات اس امر کی طالب ہیں کہ ہندوستان اور پاکستان کے دفاعی عمل مشترک اور یکساں ہوں لیکن ابھی تک اس کی تعبیر کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک کشمیر جیسے بین الاقوامی اہمیت کے حامل خطہ میں امن بحال نہیں ہو جاتا، ہندوستان اور پاکستان دونوں دفاعی نقطہ نگاہ سے غیر محفوظ رہیں گے۔ ہندوستان سے موجودہ ناخوشگوار تعلقات کے پیش نظر پاکستان کی ذمہ داریاں بھی اور مادی ضروریات بھی مقابلتاً بہت بڑھ گئی ہیں...... پاکستان ایک کٹر اسلامک ملک نہیں۔ وہ اتنا ہی اسلامی ہے جتنا ہم فرانس کو عیسائی کہہ سکتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ پاکستان کے لئے آئین کی اساس اسلامی اصولوں پر ہوگی لیکن ان اصولوں کے ارفع و اعلیٰ ہونے سے کوئی انکار نہیں کر سکتا اور مغرب تو ان اصولوں سے اچھی طرح واقف ہے۔ اگر پاکستان اپنی قومی تعمیر میں کامیابی سے ان اصولوں کو نافذ کر سکتا ہے تو دنیا کو کوئی اعتراض کرنے کا موقع ہاتھ نہیں آئے گا۔ سوائے ایک محدود طبقہ کے پاکستان مذہبی تعصب اور دیوانگی کا نام نہیں۔ ارباب حکومت اس تعصب سے یقیناً بالاتر ہیں اور اسی طرح جہاں تک میرا تجربہ ہے اس سب سے بڑی اسلامی مملکت کے بازار اور مساجد تعصب اور تنگ نظری سے پاک اور منزہ ہیں اور میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ پاکستان کی عنان حکومت ترقی پسند، دوربین، حقیقت شناس، آزاد خیال اور روادار اشخاص کے ہاتھوں میں ہے۔''[28] ظاہر ہے کہ یہ مضمون حکومت پاکستان کے محکمہ اطلاعات کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ یہ پہلے نومبر کے دوسرے ہفتے میں ''آبزرور'' میں چھپا پھر یہ کراچی کے روزنامہ ''ڈان'' میں چھپا اور پھر اس کا ترجمہ لاہور کے روزنامہ نوائے وقت میں شائع ہوا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ نہ صرف پاکستان کے اندر بلکہ مغربی سامراج کے حلقوں میں بھی لیاقت علی خان کی حکومت کی اینٹی سوویت پالیسی کو اجاگر کیا جائے اور پھر دولت مشترکہ سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ وہ اس پالیسی کے صلہ کے طور پر نہ صرف مالی و فوجی امداد دے بلکہ تنازعہ کشمیر کا بھی تصفیہ کرائے۔ پاکستان میں لیاقت علی خان کا اقتدار صرف اسی صورت میں مستحکم ہو سکتا تھا۔ اس نے اسی مقصد کے تحت لندن میں دولت مشترکہ کانفرنس کے دوران اپنی تقریروں اور بیانات میں اس تنظیم سے غیر مشروط وابستگی و وفاداری کے اعلانات کئے اور مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید میں ہر قسم کی خدمات سرانجام دینے کے وعدے کئے تھے۔

اسلامی بلاک بنانے کے بارے میں پاکستانی رہنماؤں کے بیانات اور پنجابی شاونسٹ اخبار نوائے وقت کی قلابازیاں

مشرق وسطیٰ میں اسلامی اتحاد کے بارے میں نعرہ بازی پاکستان کے سیاسی لیڈروں کا روزمرہ کا معمول بن گیا تھا۔ چنانچہ پنجاب کے ایک بیان باز لیڈر چودھری نذیر احمد خان کی لندن میں دولت مشترکہ پارلیمانی کانفرنس سے واپسی پر تجویز یہ تھی کہ ''دنیا کے سارے مسلم ممالک کی ایک کامن ویلتھ بنائی جائے جو پان اسلام ازم کے تصور سے مختلف ہو۔''[29] کشمیری لیڈر سردار ابراہیم خان کی کراچی میں تقریر یہ تھی کہ ''مشرق وسطیٰ کے تمام اسلامی ممالک کو ایک وفاق قائم کر لینا چاہیے اور ان کی خارجہ حکمت عملی ایک ہی ہونی چاہیے۔ اس وقت تمام اسلامی ممالک لاتعداد خطرات اور مصائب میں گرفتار ہیں اور اسلامی ممالک کا باہمی تعاون ہی انہیں ان خطرات سے نجات دلا سکتا ہے۔ مسلمانوں کو اقوام متحدہ سے کسی قسم کی توقعات نہیں رکھنی چاہئیں اور صرف اپنی قوت بازو اور نظم و اتحاد پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔''[30] 29/نومبر کو پاکستان کے سفیر برائے ایران و عراق راجہ غضنفر علی خان نے بغداد میں کہا کہ ''میں ان لوگوں میں سے ہوں جن کا اس بات پر ایمان ہے کہ مسلمان ملکوں کے درمیان مصنوعی رکاوٹیں نہیں ہونی چاہئیں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ ہم لوگوں کو اپنے اپنے علاقوں میں آزاد و خود مختار ہونے کے باوجود کیوں ایک قوم نہ سمجھا جائے۔ ایک ایسی عظیم الشان قوم جس کی یکجہتی کا انحصار یکساں نظریوں اور زندگی کے یکساں اصولوں پر ہو۔''[31]

نوائے وقت نے راجہ غضنفر علی خان کی اس تقریر کا خیر مقدم کیا اور لکھا کہ ''چند ہی روز ہوئے سعودی عرب کے متعلق یہ رپورٹ موصول ہوئی تھی کہ اس کے قائدین کی یہ خواہش ہے کہ پاکستان عالم اسلام کے اتحاد کی تجویز کو عملی جامہ پہنانے میں سبقت کرے۔ اور حقیقت بھی ہے کہ اس معاملے میں پاکستان ہی پہل کر سکتا ہے۔ وہ آبادی اور ذرائع کے اعتبار سے دنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس کے علاوہ تعلیم اور سیاسی شعور کے لحاظ سے بھی وہ دوسرے مسلمان ملکوں کے مقابلہ پر زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ اگر پاکستان کے قائدین اس معاملہ میں دلچسپی لیں تو اس تجویز کو کامیاب بنایا جا سکتا ہے اور امید ہے کہ ترکیہ بھی، جو اب تک دوسرے مسلمان ملکوں سے الگ تھلگ ہے اس اتحاد میں شامل ہو جائے گا مگر دوسروں کو دعوت دینے سے پہلے خود قائدین پاکستان

کے ذہن میں یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ پچھلے دنوں مسٹر لیاقت علی خان نے لندن میں جو بیان دیا تھا وہ راجہ غضنفر علی خان کی تقریر سے مختلف تھا۔ مگر اپنے اس بیان کو چھوڑ کر مسٹر لیاقت علی بھی ہمیشہ اتحاد اسلامی کی تجویز کی تائید ہی کرتے رہے ہیں بلکہ ایک زمانہ میں تو یہ چرچا بھی سننے میں آیا کہ اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے کراچی میں زعمائے اسلام کی ایک کانفرنس بلائی جارہی ہے۔ ہماری رائے میں اس کانفرنس کا انعقاد ضروری ہے اور بہت مفید ثابت ہوگا۔ لیکن کانفرنس کے لئے دعوت نامے جاری کرنے سے پہلے پاکستان کو اپنی پوزیشن پر پورے غوروخوض کے بعد یہ فیصلہ کر لینا چاہیے کہ وہ دوسروں کے سامنے کیا تجویز رکھنا چاہتا ہے۔''[32]

نوائے وقت کی جانب سے پاکستان کے ارباب اقتدار کو یہ مشورہ غیر مناسب نہیں تھا۔ اگرچہ خود اس اخبار نے بھی یہ وضاحت نہیں کی تھی کہ سیاسی، معاشی، صنعتی، تعلیمی، معاشرتی اور ثقافتی طور پر انتہائی پسماندہ مسلمان ممالک کے فرمانرواؤں، شیوخ اور جاگیرداروں کے گٹھ جوڑ سے اسلام اور عالم اسلام کا کونسا مقصد پورا ہوگا۔ بین السطور میں اس اخبار کا مقصد یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس طرح پاکستانی یعنی پنجاب کے ''تعلیم یافتہ اور ترقی یافتہ'' عناصر کی زیر قیادت ایک اینٹی سوویت اسلامی بلاک وجود میں آجائے گا جو بالآخر پنجابی سلطنت کی صورت اختیار کر لے گا۔ لیکن عرب ممالک کے عوام الناس اور بیشتر اخبارات کچھ اور ہی سوچتے تھے۔ اخوان المسلمین کی رائے یہ تھی کہ اینگلو۔امریکی سامراج مذہب کے نام پر مشرق وسطیٰ میں سوویت یونین کے خلاف ایک بلاک بنا کر نہر سویز اور تیل کے ذخائر پر اپنی اجارہ داری برقرار رکھنا چاہتا ہے اور پاکستان ایک سامراجی پٹھو کی حیثیت سے اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ بایں ہمہ 9ر دسمبر کو کراچی میں سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر اے۔ بی۔ اے۔ حلیم کے مکان پر آل پاکستان جمعیت الاسلامیہ کی سب کمیٹی کی میٹنگ ہوئی جس میں فیصلہ کیا گیا کہ یکم جنوری 1949ء کو کراچی میں ایک ورلڈ کانفرنس منعقد کی جائے گی اور 10ر دسمبر کو مصر کے وزیر اعظم نقراشی پاشا نے یہ اعلان کیا کہ اخوان المسلمین اور اس کی تمام شاخیں توڑنے کے لئے فوجی احکامات جاری کر دیئے گئے ہیں۔

اخوان المسلمین کے خلاف مصری حکومت کے اس حکم کا فوری پس منظر یہ تھا کہ اینگلو۔امریکی بلاک کی سکیم کے مطابق دریائے اردن کے مغربی کنارے کا فلسطینی علاقہ شرق اردن کے شاہ عبداللہ کے حوالے کر دیا گیا تھا اور اس کارروائی سے مصر اور دوسرے عرب ممالک

کے عوام میں سامراج دشمنی اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ چنانچہ چند دن بعد جب اقوام متحدہ میں مسئلہ فلسطین پر بحث ہوئی تھی تو بیشتر عرب مندوبین نے سوویت مندوب کی اس رائے سے اتفاق کیا تھا کہ امریکہ اور برطانیہ نے اپنے فوجی مقاصد پورے کرنے کے لئے یہ علاقہ اپنے پٹھو شاہ عبداللہ کی تحویل میں دے دیا ہے۔ پاکستان اور افغانستان نے اس مسئلہ پر رائے شماری میں حصہ نہیں لیا تھا۔ جبکہ یونائیٹڈ پریس آف امریکہ کی اطلاع کے مطابق برطانیہ کے محکمہ خارجہ کو مشرق وسطیٰ میں سوویت اثر بڑھنے کے امکان پر تشویش لاحق ہوگئی تھی۔

اس صورتحال میں 12 ردسمبر کو قادیانی فرقہ کے سربراہ مرزا بشیر الدین محمود نے لاہور میں عالم اسلام کے مستقبل کے موضوع پر ایک لیکچر دیا۔ جس میں اس نے عرب عوام کی امریکہ اور برطانیہ کے خلاف اس برہمی کا کوئی ذکر نہ کیا۔ البتہ اس نے کہا کہ "اگرچہ مسلم ممالک الگ الگ ایسے علاقائی نیشنل یونٹوں کی نمائندگی کرتے ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن یورپین مصنفین اور مفکرین انہیں ایک ہی نظریاتی بلاک تصور کرتے ہیں۔ ان یورپینوں کا خیال ہے کہ ترکوں، فلسطینیوں، شامیوں، مصریوں، افغانوں، ایرانیوں اور پاکستانیوں میں ایک ایسا نظریہ موجزن ہے جو ایک طرف تو امپیریلزم اور کیپٹلزم اور دوسری طرف کمیونزم سے مختلف ہے۔ اگرچہ پان اسلام ازم کا تصور ابتداً یورپی مصنفوں اور مفکروں کی بدنیتی کی پیداوار تھا لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ مسلم ممالک کے درمیان ثقافتی اور تجارتی تعلقات قائم کر کے اس تصور کو ٹھوس حقیقت بنایا جائے۔"[33]

14 ردسمبر کو پاکستان کے گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین نے عرب کلچرل ایسوسی ایشن کے ایک اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "پاکستان ایک علیحدہ مسلم قومیت کے تصور کی بنیاد پر قائم ہوا ہے۔ اس لئے یہ قدرتی بات ہے کہ پاکستان اسلامی اتحاد کے لئے عملی اقدام کرے۔"[34]

لیکن اب نوائے وقت کی "اتحاد اسلامی" کے بارے میں رائے اس کی 3 ردسمبر 1948ء کی رائے سے مختلف تھی۔ 3 ردسمبر کو اس کی رائے یہ تھی کہ اگر پاکستان کے قائدین دلچسپی لیں تو اس اتحاد اسلامی کی تجویز کو جامہ عمل پہنایا جا سکتا ہے۔ لیکن اب اس کی رائے یہ تھی کہ اگر تمام مسلم ممالک "اپنی خیریت چاہتے ہیں تو سیاسی بلاک بازیوں سے علیحدہ رہنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ کسی بلاک میں سیاسی وفوجی اعتبار سے شرکت کرنے میں ہم قربانی کا بکرا بن جائیں گے۔ ہمارے ذرائع خود ہماری معاشی بہبودی میں صرف ہونے کی بجائے کسی بڑی طاقت کے وجود کو

خواہ مخواہ برقرار رکھنے میں برباد ہو جائیں گے اور ہمیں ذرہ برابر بھی فائدہ نہ ہوگا۔ ملاشور بازار کا یہ مشورہ درست اور قابل قدر ہے کہ مسلم ممالک کو دوسرے بلاکوں میں شامل ہونے کی بجائے خود اپنا بلاک بنانا چاہیے۔ لیکن ہمارے خیال میں اس سے پہلے ضروری ہے کہ ہر مسلم ملک، بڑی طاقت کی گرفت سے آزاد ہو جائے ورنہ مسلم ممالک کے درمیان اتحاد و یکجہتی پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ مثلاً ایران اور ترکی آج امریکہ کے زیر اقتدار ہیں۔ اس لئے وہ مملکت اسرائیل کے خلاف ایک لفظ بھی اپنے منہ سے نہیں نکال سکے ہیں۔ شرق اردن برطانیہ کے قبضہ میں ہے اس لئے وہ نجد و حجاز سے دوستی نہیں کر سکتا جو امریکہ کے زیر اثر ہے۔ انڈونیشیا ڈچ سامراج سے نجات حاصل کئے بغیر مسلم ممالک سے رشتہ اتحاد مضبوط نہیں کر سکتا۔ مسلم ممالک جب بڑی طاقتوں کی گرفت سے آزاد ہو جائیں گے تب ہی وہ کسی مسلم بلاک کی تعمیر کر سکتے ہیں۔ اس سے پہلے جو بھی بلاک بنے گا وہ بجائے خود کسی دوسرے بڑے بلاک کا آلہ کار بن کر رہ جائے گا۔''[35] نوائے وقت کی اس رائے میں اس بنیادی تبدیلی کی ایک وجہ بظاہر یہ تھی کہ یہ اخبار نظریاتی طور پر اخوان المسلمین سے ہمدردی رکھتا تھا۔ چونکہ یکم دسمبر 1948ء کو اس تنظیم پر پابندی لگنے کے بعد پورے عالم عرب کے فرمانرواؤں سے اس کی محاذ آرائی شروع ہو گئی تھی اس لئے نوائے وقت کو بھی کم از کم وقتی طور پر یہ احساس ہو گیا تھا کہ امریکہ اور برطانیہ کے طفیلی ممالک کے حکمرانوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے اس کے تصور کا اسلامی اتحاد قائم نہیں ہو سکتا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ دسمبر کے وسط میں پنجاب میں دولتانہ دھڑے اور ممدوٹ دھڑے کے درمیان اقتدار کی جنگ پھر انتہائی شدت اختیار کر گئی تھی۔ چونکہ لیاقت علی خان اس جنگ اقتدار میں دولتانہ دھڑے کا ساتھ دے رہا تھا اس لئے نوائے وقت اس کے سر پر ''اتحاد اسلامی'' کا سہرا باندھ کر اس کی سیاسی عزت افزائی نہیں کر سکتا تھا۔

امریکی نائب وزیر خارجہ کا مشرق وسطیٰ کی اقتصادی بہبود کے لئے اشتراک عمل کا اعلان اور ملاشور بازار کی ہمنوائی

تاہم نوائے وقت نے چند ہی دن بعد امریکہ کی وزارت خارجہ کے امور عامہ کے اسسٹنٹ سیکرٹری جارج ایلن کے ایک انٹرویو کا مکمل متن شائع کر کے یہ تاثر دیا کہ وہ امریکہ کے اتنا خلاف نہیں تھا جتنا کہ اس کے 18 دسمبر کے اداریے سے ظاہر ہوا تھا۔ یہ خبر امریکی سفارت

خانے کی انفرمیشن سروس کی طرف سے بھیجی گئی تھی اورنوائے وقت نے اس میں ذراسی بھی قطع و برید نہیں کی تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ ”جارج ایلن نے اخباری نمائندوں سے ملاقات میں مشرق وسطیٰ کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ مشرق وسطیٰ کیلئے کسی مارشل پلان کے امکانات کے متعلق جب ان سے سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ سرکاری طور پر تو کسی پلان کے قرائن نہیں ہیں لیکن امریکہ کی غیر سرکاری تجارتی کمپنیاں اس بات کی کوشش کر رہی ہیں کہ آپس میں مل کر مشرق وسطیٰ کی اقتصادی بہبود کے لئے کوئی پروگرام تیار کریں۔ ایلن نے یہ خیال ظاہر کیا کہ مشرق وسطیٰ کو تیل کے ذخیروں کی وجہ سے اتنی اہمیت حاصل ہوگئی ہے کہ وہ مستقبل میں دنیا کی سیاست میں ایک نمایاں پارٹ ادا کرے گا۔ اس نے مشرق وسطیٰ کی معدنیاتی ترقی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اب وہ زمانہ نہیں کہ دنیا کا یہ خطہ اپنے آپ کو دنیا سے کنارہ کش رکھ کر محفوظ سمجھے۔ جب تک اس خطے کے لوگ دنیا کے دوسرے ممالک کی رفتار کے ساتھ قدم نہ بڑھائیں گے تو نہ صرف یہ کہ مشرق وسطیٰ غیر ترقی یافتہ رہے گا بلکہ دنیا کی عام اقتصادی ترقی کو بھی اس سے نقصان پہنچے کا اندیشہ ہے۔ جب اس سے یہ سوال کیا گیا کہ دنیا کے دوسرے ممالک اس بات پر رضامند ہیں کہ مشرق وسطیٰ کے ساتھ ہر ممکن اشتراک کریں تو اس نے کہا کہ میں اس میں کوئی نقصان نہیں سمجھتا ہوں۔ امریکہ اور دنیا کے دوسرے ممالک ہر ممکن مدد کو بالکل تیار ہیں کیونکہ ہماری زندگیاں تنگ خلیج سے نکل کر ایک بحر بیکراں میں داخل ہوگئی ہیں۔ جب ایلن سے یہ پوچھا گیا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ غیر ملکی سرمائے کے متعلق جو عام شبہات ہیں انہیں دور کیا جائے تو اس نے کہا کہ یہ محض ایک نفسیاتی نکتہ ہے اور جو لوگ ایک اصلاحی مشن لے کر اٹھتے ہیں وہ ان دشواریوں سے چنداں ہراساں نہیں ہوتے۔ آنحضرت صلعم، حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ نے انسانیت کی ترقی کے لئے جب قدم اٹھایا تو وہ ان شبہات و خدشات سے بالاتر تھے۔ اگر وہ ان چیزوں کا خیال کرتے تو دنیا ان تین بڑے مذاہب کی روشنی سے محروم رہ جاتی۔ اس نے مزید کہا کہ مجھے امید ہے کہ اقوام متحدہ کا سماجی اور ثقافتی ادارہ سیاسی پیچیدگیوں سے کنارہ کش ہو کر دنیا کی عام انسانی ترقی کے لئے کوشش کرے گا۔“[36] جارج ایلن امریکہ کے بدنام ترین وزیر خارجہ جان فاسٹر ڈلس (Foster Dulles) کا بھائی تھا اور یہ کچھ عرصہ بعد امریکہ کے بین الاقوامی جاسوسی کے ادارے سی۔ آئی۔ اے کا پہلا ڈائریکٹر بنا تھا۔ لیکن اس انٹرویو کے مطابق یہ مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کے پیغمبروں کے

نقش قدم پر چل کر انسانی فلاح و بہبود کے لئے مشنری کام کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

اسی دن نوائے وقت ایک برطانوی خبر رساں ایجنسی سٹار کی طرف سے ارسال کردہ افغانستان کے ملاشور بازار کا بھی، جو کئی دن سے پاکستان کا دورہ کر رہا تھا، ایک انٹرویو شائع کیا جس میں اس نے کہا تھا کہ ''انفرادیت، قومیت، فرقہ واریت، جغرافیائی حد بندی، رنگ و نسل، قوم اور ثقافت کے امتیاز کا اسلام سے دور کا بھی رشتہ نہیں، یہ چیزیں ایک گروہ کو دوسرے گروہ سے ممتاز کرنے کے لئے ہیں۔ صرف ایک مقدس کلمہ تمام مسلمانوں کو ایک ہی لڑی میں پروتا ہے۔ یورپی سیاست خدا کی وحدانیت اور پیغمبروں کی رسالت کی قائل نہیں ہے لیکن مسلم ملت کے لئے خالق حقیقی کے عطا کئے ہوئے رشتہ سے بہتر کوئی رشتہ نہیں اور وہ رشتہ قرآن اور ایمان کا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر مسلمان اتحاد و اصول پر قائم رہیں تو خدا کی رحمتیں ہمیشہ ان کے ساتھ رہیں گی اور اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک بار پھر انسانیت کی خدمت کریں گے۔''[37] ظاہر ہے کہ برطانوی خبر رساں ایجنسی نے ملاشور بازار کے اس انٹرویو کے ذریعہ سارے مسلم ممالک کے مسلمانوں کو مذہب کے نام پر متحد ہو جانے کا پیغام دیا تھا جبکہ امریکی نائب وزیر خارجہ جارج ایلن پیغمبروں کے نقش قدم پر چل کر مشرق وسطیٰ میں اصلاحی کام کرنے کا پروگرام بنا رہا تھا۔

پاکستان کے رہنماؤں کا اسلامی بلاک کا نعرہ سوویت مخالف تھا جبکہ عالم عرب میں اسلامی بلاک کا تصور مغربی سامراج کے خلاف تھا

24 دسمبر کو پاکستان کے وزیر خزانہ غلام محمد نے کراچی کے بینکاروں، صنعتکاروں اور درآمدی و برآمدی تاجروں کے نمائندوں سے خطاب کرتے ہوئے انہیں بتایا کہ دنیا کے مختلف مسلم ممالک کے درمیان قریبی معاشی و صنعتی روابط قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح مسلم ممالک کو علاقائی بنیاد پر اپنے وسائل کو ترقی دینے میں مدد ملے گی اور مسلم بلاک امن یا جنگ کے زمانے میں خود کفیل ہوگا۔ غلام محمد کی اس تقریر کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ 1949ء کے اوائل میں ایک پان اسلامک کمرشل اینڈ انڈسٹریل کانفرنس منعقد کی جائے گی۔ یوسف عبداللہ ہارون کو اس کام کا انچارج مقرر کیا گیا۔[38] وزیر خزانہ غلام محمد چند ماہ قبل تک سیکولر سیاست کا عظیم علمبردار تھا۔ اس نے مارچ 1948ء میں مرکزی اسمبلی میں پاکستان کا پہلا بجٹ پیش کرتے ہوئے

شمال سے خطرے کا جو ذکر کیا تھا اس میں اسلام کا کوئی حوالہ نہیں تھا۔ لیکن اب وہ لندن میں سٹرلنگ کانفرنس میں شرکت کرنے کے بعد مذہب کے نام پر مسلم ممالک کے اتحاد کی تجویز کا حامی بن گیا تھا اور اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے سرکاری طور پر پہل اس نے کی تھی۔ اگرچہ عالم عرب کی عوامی فضا اس کی مجوزہ کمرشل اینڈ انڈسٹریل کانفرنس کے لئے سازگار نہیں تھی۔

عالم عرب میں جو لوگ اسلامی اتحاد کی باتیں کرتے بھی تھے وہ اس مجوزہ اتحاد کو اینٹی سوویت اتحاد نہیں کہتے تھے بلکہ وہ کہتے تھے کہ یہ اتحاد مغربی سامراج کے خلاف ہوگا۔ چنانچہ افغانستان میں مصری سفیر عبدالحمید نے 29 دسمبر 1948ء کو لاہور میں ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''سامراجی طاقتوں کی سازشوں کو ناکام بنانے کے لئے تمام اسلامی ممالک کا اتحاد ضروری ہے۔ اس نے کہا کہ مشرق بعید کے ممالک میں برطانوی شہنشاہیت کے خاتمہ کے بعد حکومت برطانیہ نے افریقہ میں لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کر دیا ہے۔ شرق اردن کے شاہ عبداللہ کی غداری کا ذکر کرتے ہوئے اس نے کہا کہ شاہ عبداللہ نے صحیح معنوں میں اپنے آپ کو برطانیہ کا پٹھو ثابت کر دیا ہے۔ اس شخص نے اپنی فوج کے لئے برطانیہ سے مالی امداد لینا ترک نہیں کیا۔ حالانکہ عرب لیگ نے اسے یقین دلایا تھا کہ اگر وہ برطانیہ کی امداد قبول نہ کرے تو عرب لیگ کی طرف سے اس کی امداد کی جائے گی۔ اس نے مزید کہا کہ ''شاہ عبداللہ کی فوج کا کمانڈر انچیف گلب پاشا حیفہ میں اعراب کی شکست کا باعث ہوا ہے بایں ہمہ اعراب پست ہمت نہیں ہوئے اور وہ ارض مقدسہ کو یہودی چنگل سے آزاد کرانے کے لئے اپنی جدوجہد بدستور جاری رکھیں گے۔''[39]

یکم جنوری 1949ء کو مفتی اعظم فلسطین کے ذاتی نمائندے شیخ عبداللہ غوشیہ نے لاہور میں ایک استقبالیہ تقریب میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''فلسطین میں عربوں اور یہودیوں کی جنگ کا ناٹک پچھلے تیس سال سے کھیلا جا رہا ہے۔ مگر اب یہودیوں نے انتہائی قدم اٹھایا ہے اور بیت المقدس پر غاصبانہ قبضہ کرنے کے لئے جارحانہ جنگ شروع کر رکھی ہے۔ یہ ایک ایسا فعل ہے جس سے ساری دنیا کے مسلمانوں کی آنکھیں کھل گئی ہیں۔ اس وقت تمام اسلامی ملکوں میں اتحاد کا رشتہ اور بھی مضبوط ہونے کی ضرورت ہے۔ یہی وہ چیز ہے کہ جس کی بدولت اسلام نہایت تیزی کے ساتھ ساری دنیا میں پھیل گیا تھا...... اب فلسطین کے مسئلے نے دوبارہ اتحاد کی اہمیت واضح کر

دی ہے۔ اس لئے مجھے امید ہے کہ عنقریب مسلمان اپنے آباواجداد کی شاندار روایات کو پھر سے زندہ کر دیں گے اور مسلمان دنیا میں ایک بہت بڑی قوت بن جائے گا۔"[40] 3رجنوری کو پاکستان میں سعودی عرب کے وزیر مختار سید عبدالحمید الخطیب نے کراچی میں اخباری نمائندوں کو خطاب کرتے ہوئے مسلم ممالک کے بلاک کی تجویز کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ "جن نکات پر تمام اسلامی ممالک متحد ہو سکتے ہیں وہ تمام قرآن کریم میں خدائے دو جہاں نے ہمارے سامنے رکھ دیئے ہیں۔"[41] 6رجنوری کو لاہور میں مفتیٔ اعظم فلسطین کے نمائندہ شیخ عبداللہ الغوشیہ نے مسلم طلبا کے اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "تمام اسلامی ممالک میں مکمل اتحاد نہ ہونے کی وجہ سے مسلمانان عالم کو بہت نقصان پہنچا ہے۔ فلسطین جیسے نہایت اہم مقام پر یہودیوں نے قبضہ کر لیا ہے۔ ارض مقدس کو آزاد کرانے اور مسلمانان عالم کے تحفظ کے لئے تمام اسلامی ممالک کا اتحاد ضروری ہے اس سلسلے میں مزید تاخیر حد درجہ نقصان دہ ہوگی کیونکہ اسلام کے دشمن ہر قسم کی سازشوں میں مصروف ہیں۔"[42] اگرچہ مصر، سعودی عرب اور فلسطین کے نمائندوں کی ان تقریروں اور بیانات میں سامراج دشمنی کا پہلو نمایاں تھا لیکن امریکہ اور برطانیہ کو اس سے کوئی خاص تشویش نہیں تھی کیونکہ ان کا بجاطور پر خیال تھا کہ عرب ممالک کے حکمران خواہ کسی بھی نعرے کے تحت متحد ہوں وہ مغربی طاقتوں کے حلقہ اثر سے باہر نہیں جا سکتے۔ اوّل اس لئے کہ ان حکمرانوں کا ذاتی وطبقاتی مفاد مغربی طاقتوں کے ساتھ وابستہ تھا اور دوئم اس لئے کہ عرب ممالک میں مغربی آئل کمپنیاں ان ممالک کے فرمانرواؤں کی داخلی اور خارجی پالیسی پر اثر انداز ہوتی تھیں۔ بعض عرب لیڈر اتحاد اسلامی کے نعرے محض اس لئے لگاتے تھے کہ اسرائیل کے ہاتھوں اپنی شرمناک شکست پر پردہ ڈالا جائے۔

باب: 3

ورلڈ اسلامک کانفرنس اور سوویت مخالف مغرب نواز اسلامی بلاک کی تشکیل کے لئے سرگرمیاں

وزیر داخلہ خواجہ شہاب الدین کی جانب سے آل ورلڈ انٹر اسلامک کانفرنس کے انعقاد اور کراچی کے سرمایہ داروں کی طرف سے پان اسلامک کمرشل اینڈ انڈسٹریل کانفرنس کے انعقاد کے فیصلے

وزیر اعظم لیاقت علی خان اکتوبر 1948ء میں منعقدہ دولت مشترکہ کانفرنس سے یہ نقطہ نگاہ لے کر آیا تھا کہ عرب ممالک کے حکمران اپنے ذاتی وطبقاتی مفادات اور مغربی آئل کمپنیوں کے زیر اثر ہونے کی وجہ سے مغربی طاقتوں کے حلقہ اثر سے باہر نہیں جا سکتے، اس لئے حکومت پاکستان غیر موافق حالات کے باوجود مشرق وسطیٰ میں اتحاد اسلامی کی تجویز کو عملی جامہ پہنانے میں کوشاں رہی۔ چنانچہ 6 رجنوری 1949ء کو وزیر داخلہ خواجہ شہاب الدین کی قائم کردہ جماعت الاخوۃ الاسلامیہ نے فیصلہ کیا کہ ”18 اور 19 رفروری کو کراچی میں ایک آل ورلڈ انٹر اسلامک کانفرنس منعقد کی جائے گی۔ گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین اس کانفرنس کا افتتاح کریں گے اور مس فاطمہ جناح صدارت کریں گی۔“[1] جماعت الاخوۃ الاسلامیہ کا یہ فیصلہ اتنا زیادہ بے وقت نہیں تھا کیونکہ اسی دن بغداد سے یہ خبر آئی تھی کہ وہاں کی سرکاری فضا اتحاد اسلامی کے لئے ہموار ہو گئی ہے کیونکہ جنرل نوری السعید پاشا نے مزاحم امین البشاشی کی جگہ وزارت عظمیٰ کا عہدہ سنبھال لیا ہے۔ نوری سعید انگریزوں کا بہت پرانا وفادار پٹھو تھا۔ وہ دوسری جنگ عظیم کے دوران دسمبر 1938ء سے لے کر فروری 1948ء تک عراق کا وزیر اعظم رہا تھا اور اس حیثیت سے اس

نے انگریزوں کی گرانقدر خدمات سرانجام دی تھیں۔اب اس سے یہ امید کی جاتی تھی کہ وہ برطانیہ کی تجویز کے مطابق مشرق وسطیٰ میں سوویت یونین مخالف بلاک بنانے میں مددگار ثابت ہوگا۔وہ شاہ عبداللہ کے عظیم تر شام کے منصوبے کا بھی حامی تھا۔اس کے پیش رو مزاحم امین البشاشی نے وزارت عظمیٰ سے اس لئے استعفیٰ دیا تھا کہ عراق کے وزیر جنگ نے عراق کی فوج کو مصری افواج کے ساتھ مل کر اسرائیل کے خلاف جنگ کرنے کا حکم دینے سے انکار کر دیا تھا۔[2] 7رجنوری کو کراچی سے یہ خبر ملی کہ ''حجاز کے ممتاز علما اور عوامی نمائندوں کا ایک وفد، المعصومی کی زیر قیادت فروری کے وسط میں کراچی آئے گا۔یہ وفد ورلڈ مسلم برادر ہوڈ کانفرنس میں شرکت کرے گا جو 18 اور 19رفروری کو کراچی میں جماعت الاخوۃ الاسلامیہ کے زیر اہتمام منعقد ہوگی۔''[3]

10رجنوری کو پان اسلامک کمرشل اینڈ انڈسٹریل کانفرنس کی مجلس استقبالیہ کے صدر یوسف ہاورن نے 25ارکان پر مشتمل ایک ایڈہاک کمیٹی مقرر کی جس کے ذمے یہ کام کیا گیا کہ وہ مجلس استقبالیہ کے ارکان بھرتی کرنے کے علاوہ ابتدائی انتظامات کرے گی۔اس کمیٹی میں سیٹھ ولی محمد قاسم دادا، سیٹھ آدم حاجی پیر محمد، سیٹھ حبیب حاجی پیر محمد، سیٹھ ذکریا آدم جی، حاجی داؤد، سیٹھ محمود علی حبیب، سیٹھ احمد اصفہانی، سید امجد علی، وزیر علی، سیٹھ فخر الدین ولی بھائی، سیٹھ حاتم اے علوی، جی الانہ اور سیٹھ عبداللطیف ابراہیم بھائی وغیرہ شامل تھے۔اے۔خالق کو پلاننگ کمیٹی کا سیکرٹری مقرر کیا گیا۔''[4] 12رجنوری کو ڈان نے ایک ادارتی مقالہ میں اس مجوزہ کانفرنس کی پرزور حمایت کی اور یہ رائے ظاہر کی کہ ''اگر مسلم ممالک باہمی تجارت کو فروغ دے کر معاشی ترقی کرنا چاہتے ہیں تو کانفرنس کو یوسف ہارون کی اس تجویز پر سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا کہ ایک مستقل پان اسلامک ٹریڈ آرگنائزیشن قائم کی جائے۔''[5]

یوسف ہارون کی یہ تجویز اور ڈان کی تائید حکومت پاکستان کے لائحہ عمل کے مطابق تھی اور وہ لائحہ عمل یہ تھا کہ مشرق وسطیٰ میں سوویت یونین مخالف سیاسی وفوجی بلاک بنانے سے پہلے مسلم ممالک کا ایک تجارتی بلاک بنایا جائے۔ان دنوں یورپ میں بحر اوقیانوس کے ممالک کے درمیان فوجی معاہدہ کی تجویز آخری مراحل میں تھی اور لندن کے سنڈے ٹائمز کی رائے یہ تھی کہ ''یورپ کی معاشی اور فوجی بحالی کے بعد بحر الکاہل، بحر ہند اور مشرقی بحیرہ روم کے علاقوں میں ایسے ہی معاہدوں کی ضرورت ہے۔اگر 1949ء میں اس قسم کے معاہدے ہوجائیں تو یہ سال

بنی نوع انسان کی سلامتی اور امن عالم کی جانب فیصلہ کن پیش قدمی کا سال ہوگا۔"[6] اور قاہرہ کے روز نامہ المصور کی اطلاع یہ تھی کہ "برطانیہ اور امریکہ مشرق قریب کا ایک بلاک بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس بلاک میں ترکی اور دیگر عرب ممالک شامل ہوں گے۔ اس ضمن میں کچھ کام تو کر بھی لیا گیا ہے۔ برطانیہ اور امریکہ کے فوجی ماہرین ترکی کو صف اول کی جمہوریت قرار دینے پر متفق ہو گئے ہیں اور ترکی بذات خود اپنے پڑوسیوں میں سے اپنے حامی اور مددگار ممالک تلاش کر رہا ہے۔ خاص طور پر مصر اور عرب ممالک میں سے اس بنا پر اقوام متحدہ کے مصالحتی کمیشن میں ترکی کو شامل کیا گیا ہے۔ تاکہ وہ عرب مفاد کی حفاظت کر سکے۔ تمام عرب سیاست دانوں میں سب سے زیادہ نوری السعید پاشا اس پالیسی کا حامی ہے کہ عرب لیگ اور ترکی کے درمیان تعلقات استوار ہو جائیں اور اس کے برسر اقتدار آ جانے سے اسے یہ موقع مل گیا ہے کہ وہ اس سکیم کو عملی جامہ پہنائے۔ ترکی اور مصر کے تعلقات دن بدن بہتر ہوتے جا رہے ہیں۔"[7] 15 رجنوری کو واشنگٹن میں اس تجویز پر عملدرآمد کے لئے ایک اہم قدم اٹھایا گیا جبکہ وہاں سات مسلم ممالک کے نمائندوں نے بڑے تزک و احتشام سے میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جلسہ کیا اور ایک مسجد کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس سلسلے میں جو اخباری اطلاع آئی اس میں بتایا گیا تھا کہ "واشنگٹن میں یہ پہلی مسجد ہے۔ یہ شہر کے اس حصے میں بنائی جا رہی ہے جہاں متعدد گرجا گھر اور سفارتخانے ہیں۔ اس مسجد کی تعمیر مسلم ممالک کے سفارتی مشنوں کے زیر اہتمام ہوگی۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلامی کلچر اور اسلامی روایات کی تبلیغ کے لئے ایک ادارہ بھی قائم کیا جا رہا ہے۔ اس موقع پر مصر کے سفیر عبدالرحیم نے کہا "واشنگٹن میں مسجد اور اسلامی ادارہ کی تعمیر مسلمانوں کے لئے ایک خوش آئند نشان ہے۔ ہمارا ارادہ ہے کہ ہم اس کو نہ صرف اسلامی اخوت کا مرکز بنائیں بلکہ اس کو ایک ایسے ادارے میں تبدیل کر دیں جس سے تمام اقوام عالم فیض حاصل کر سکیں۔" اس تقریب میں پاکستان کے سفیر مسٹر اصفہانی کے علاوہ ایران، شام، عراق اور لبنان کے سفراء بھی موجود تھے۔"[8]

پاکستان کے ارباب اقتدار کی جانب سے مشرق وسطیٰ میں سوویت یونین کے خلاف اینگلو امریکی سامراج کے اس خطرناک کھیل میں شریک ہونے کی سب سے بڑی وجہ تو یہ تھی کہ وزیر اعظم لیاقت علی خان، وزیر خارجہ ظفر اللہ خان اور وزیر خزانہ غلام محمد وغیرہ کا ذاتی و طبقاتی مفاد امریکہ اور برطانیہ کے عالمی مفادات سے وابستہ تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اگرچہ ملک کے درمیانہ

طبقہ کے تعلیم یافتہ عناصر تنازعہ کشمیر کے سلسلے میں برطانیہ کی دغابازی اور یکم جنوری 1949ء سے کشمیر میں جنگ بندی کے باعث برطانوی سامراج سے بہت برہم تھے اور روزانہ یہ مطالبہ کرتے تھے کہ پاکستان کو برطانوی دولت مشترکہ سے الگ ہو جانا چاہیے، تاہم ان کی نظر میں ہندوستان اور پاکستان کا قومی تضاد ان سارے تضادات پر حاوی تھا۔ وہ پاکستانی عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے تھے کہ اگر عالم اسلام کا اتحاد ہو جائے اور پاکستان کو کسی نہ کسی طرح امریکہ اور برطانیہ کی حمایت حاصل ہو جائے تو نہ صرف تنازعہ کشمیر کا تصفیہ پرامن طریقے سے پاکستان کے حق میں ہو جائے گا اور نہ صرف پاکستان ہندوستان کی توسیع پسندی سے محفوظ ہو جائے گا بلکہ پاکستان کو ایشیا میں ہندوستان سے برتر مقام مل جائے گا۔ اسی خوش فہمی یا غلط فہمی یا کم فہمی کی بنا پر ان عناصر کو برطانوی خبر رساں ایجنسی کی اس قسم کی خبر پر بھی کوئی خاص اعتراض نہیں تھا کہ ''برطانوی دولت مشترکہ کی اقوام کا ایک عالمی معاہدہ سلامتی زیر غور ہے۔ امید ہے کہ اس سلسلے میں چند ماہ میں اعلان کر دیا جائے گا...... اس معاہدہ کا فیصلہ اکتوبر 1948ء میں دولت مشترکہ کانفرنس کے دوران ہوا تھا۔ اس میں جنوبی افریقہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، پاکستان، لنکا اور غالباً ہندوستان شامل ہوں گے۔ ہندوستان کی شمولیت اس لئے غیر یقینی ہے کہ وہ ایک ایشیائی معاہدے پر زور دے رہا ہے۔''[9]

نہرو کی دعوت پر دہلی میں مغرب نواز ایشیائی ممالک کی کانفرنس

مذکورہ عناصر کو ہندوستان کی جانب سے ایشیائی معاہدے یا ایشیائی بلاک کی تشکیل سے متعلقہ خبر اس لئے صحیح لگتی تھی کہ 18 دسمبر 1948ء کو انڈونیشیا پر ہالینڈ کے حملے کے بعد ہندوستانی وزیراعظم جواہر لال نہرو نے ایک ایشیائی ریلیشنز کانفرنس (Asian Relations Conference) بلانے کا اعلان کر رکھا تھا اور مغرب کے متعدد سیاسی لیڈر اور اخبارات اعلانیہ یہ توقع کرتے رہے تھے کہ نہرو کی زیر قیادت ایشیا میں ایک ایسا بلاک وجود میں آ جائے گا جو نہ صرف سوویت یونین مخالف ہوگا اور نہ صرف چین کے کمیونسٹ سیلاب کا سدباب کرے گا بلکہ برما، ملایا اور دوسرے ایشیائی ممالک میں کمیونسٹ بغاوتوں کو کچلنے میں فیصلہ کن کردار ادا کرے گا۔ 10 جنوری 1949ء کو امریکہ کے مشہور کالم نویس والٹر لپ مین (Walter Lippman) کی انٹرنیشنل ہیرلڈ ٹریبون میں رائے یہ

تھی کہ ''اب جبکہ یہ ظاہر ہو گیا ہے کہ قوم پرست چین، نیدر لینڈ اور فرانس ایشیا میں وہ کردار نہیں ادا کر سکتے جس کی ان سے توقع کی گئی تھی اس لئے امریکہ کو چاہیے کہ وہ نہرو سے، جو یقیناً ایشیا کی عظیم ترین شخصیت ہے، بہت گہرائی کے ساتھ صلاح مشورہ کرے۔''[10]

دہلی میں یہ کانفرنس 20 جنوری 1949ء کو ہوئی۔ اس میں سوویت یونین کی ایشیائی جمہوریتوں، اور ویت نام میں ہوچی منہہ (Hochi Minh) کی حکومت کے نمائندوں کو شرکت کی دعوت نہیں دی گئی تھی بلکہ اس میں افغانستان، برما، آسٹریلیا، ایران، لنکا، پاکستان، فلپائن، نیوزی لینڈ، چین (قوم پرست)، مصر، شام، حبشہ، سعودی عرب، یمن، عراق، لبنان، نیپال اور سیام جیسے مغرب نواز ممالک کے نمائندوں کو بلایا گیا تھا۔ نہرو نے اس کانفرنس کی افتتاحی تقریر میں یہ تجویز پیش کی کہ ایک ایسی مشینری کی تشکیل ہونی چاہیے کہ جس کے ذریعے اس کانفرنس میں شامل ہونے والے ممالک آپس میں رابطہ قائم رکھ سکیں۔ اس نے علاقائی اتحاد یا ادغام پر بھی زور دیا۔ اس کی اس تجویز کی شام، یمن اور فلپائن کے نمائندوں نے تائید کی۔ فلپائن کا صدر جنرل رمولو اس تجویز کی منظوری پر بہت مصر تھا۔ اس سلسلے میں اس کی مزید تجویز یہ تھی کہ نئی دہلی میں مستقل سیکرٹریٹ قائم کرنا چاہیے مگر پاکستان، لنکا، برما، نیپال اور سیام جیسے چھوٹے ممالک کی مخالفت کی وجہ سے یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عرب ممالک مجوزہ ایشیائی بلاک کو اسرائیل کے خلاف ایک محاذ کی صورت دینا چاہتے تھے اور نہرو ایسا کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

اس کانفرنس کے 23 جنوری کو خاتمہ سے دو ایک دن پہلے آسٹریلیا کے سڈنی سنڈے ہیرلڈ کی رپورٹ یہ تھی کہ ''اس امر کا امکان ہے کہ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ بہت جلد ہندوستان، پاکستان اور لنکا کے ساتھ مل کر مشرق بعید میں ایک علاقائی دفاعی کونسل کی تشکیل کریں گے۔ یہ کونسل جس میں ملایا کی نمائندگی کا بھی امکان ہے، بحرالکاہل اور بحر ہند کے علاقوں کے دولت مشترکہ ممالک کو ممکنہ خطرے کے مقابلے کے لئے مشترکہ دفاعی اقدامات تجویز کرے گی۔ چین میں کمیونسٹوں کی کامیابیوں کے پیش نظر اور ان شواہد کے پیش نظر کہ روس ایشیا پر اپنی نظریں ڈال رہا ہے ان منصوبوں کی تشکیل کی رفتار تیز ہو گئی ہے کہ دولت مشترکہ کی پانچوں ڈومینینوں کے درمیان مشترکہ دفاع کے لئے مشورہ ہونا چاہیے۔''[11] کانفرنس کے چند دن بعد نیویارک ٹائمز کا

تبصرہ یہ تھا کہ ''جواہرلال نہرو اور جنرل رمولو پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ ایشیا میں نسلی اور جغرافیائی مخاصمتوں کو فروغ حاصل نہیں ہونے دیں گے۔'' اور کچھ عرصہ کے بعد ماسکو کے اخبار پراودا کا تبصرہ یہ تھا کہ ''نہرو سوویت دشمن ہے اور اس نے یہ کانفرنس سوویت مخالف بلاک بنانے کے لئے منعقد کی ہے۔''[12]

کراچی میں عالم اسلام کے اتحاد کے سلسلہ میں سرگرمیوں میں اضافہ، عرب ملکوں کی عدم دلچسپی اور برطانیہ کی دلچسپی

پاکستان کے درمیانہ طبقہ کے تعلیم یافتہ عناصر کو نہرو کی اس ایشیائی کانفرنس سے بڑی تشویش اور مایوسی لاحق تھی۔ تشویش اس لئے کہ اس کانفرنس کے نتیجے میں یہ امکان تھا کہ ہندوستان سارے ایشیائی ممالک کا مسلمہ قائد بن جائے گا اور مایوسی اس لئے کہ عرب ممالک وزیراعظم لیاقت علی خان کی اسلامیت کی بجائے جواہرلال نہرو کی لادینیت کی طرف زیادہ مائل تھے۔ چنانچہ 16 رجنوری 1949ء کو سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر اے۔ بی۔ اے۔ حلیم کا بیان یہ تھا کہ ''آج کل مسلمانوں میں تنگ نظر فرقہ پرستی، نسل پرستی اور قوم پرستی کی وجہ سے پھوٹ پڑی ہوئی ہے۔ نسل پرستی اور قوم پرستی دراصل قدیم قبیلہ پرستی کی ہی ایک نئی شکل ہے۔ جب تک مسلمان اس قسم کی تنگ نظری سے بالاتر نہیں ہوں گے، اس وقت تک ساری دنیا میں مسلمانوں کے درمیان اتحاد اور اخوت کی حیثیت محض ایک نعرے سے زیادہ نہیں ہوگی۔''[13] اے۔ بی۔ اے حلیم کا یہ بیان بہت مایوس کن تھا اور اس سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ اینگلو۔ امریکی سامراج نے عالم اسلام کے اتحاد کا جو غبارہ اڑایا تھا اس میں سے گیس نکل گئی ہے۔ لیکن 22 رجنوری کو، جبکہ نئی دہلی میں ایشیائی کانفرنس جاری تھی اس غبارے میں گیس پھر بھر گئی جبکہ مؤتمر عالم اسلامیہ کے مصری نمائندہ سید عبدالقادر الحسینی نے کراچی میں نماز کے بعد ''اتحاد اسلامی'' کے موضوع پر ایک پرجوش تقریر کر کے اس غبارے کو پھر اڑانے کی کوشش کی۔ اس نے کہا کہ ''اس وقت عالم اسلامیہ کے خلاف ساری دنیا متحد ہو چکی ہے۔ روس اور امریکہ جو نظریاتی طور پر ایک دوسرے کی ضد ہیں فلسطین کے معاملے میں متحد ہو چکے ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام کے خلاف دنیا کا ہر ملک متحد ہو جاتا ہے۔'' حیدرآباد (دکن) کا ذکر کرتے ہوئے اس نے کہا کہ ''عام طور پر ہر جگہ

مسلمانوں پر مظالم توڑے جا رہے ہیں۔ انڈونیشیا میں بھی مسلمان کشمکش میں مبتلا ہیں۔ اسی طرح ساری دنیا کے مسلمان ایک نازک دور سے گزر رہے ہیں۔ اس کشمکش سے کامیاب طور پر نکلنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اپنے کو مصری، پاکستانی، ایرانی کہلانا چھوڑ دیں۔ ہمارے لئے صرف مسلمان کہلانا کافی ہے۔ دنیا کے ہر حصے کا مسلمان ایک دوسرے کا بھائی ہے۔" اس نے کہا کہ "ضرورت ہے کہ مسلمان ایک متحدہ محاذ بنائیں اور اپنے مسائل کو متحدہ طور پر سوچنا شروع کر دیں۔ صرف اسلامی اتحاد ہی مسلمانوں کو موجودہ نازک دور سے کامیاب طور سے نکال سکتا ہے۔"[14]

23 رجنوری کو اتحاد اسلامی کی تجویز کو آگے بڑھانے کے لئے یہ اقدام کیا گیا کہ وزیر خزانہ غلام محمد کی تجویز کردہ پان اسلامک کمرشل اینڈ انڈسٹریل کانفرنس کی ایڈہاک کمیٹی نے ایک چھوٹی سی کمیٹی مقرر کر کے اس کے ذمے یہ کام کیا کہ وہ مشرق وسطیٰ کے ممالک میں اور انڈونیشیا جیسے مسلم اکثریتی ممالک میں خیرسگالی وفد بھیج کر مجوزہ کانفرنس کے لئے حمایت حاصل کرے۔[15] ایڈہاک کمیٹی کے اس اقدام کا مطلب بالکل واضح تھا یعنی یہ کہ مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک میں اس کانفرنس کی تجویز کا خیر مقدم نہیں کیا گیا تھا کیونکہ عام تاثر یہ تھا کہ اینگلو امریکی سامراج جن مختلف طریقوں سے مشرق وسطیٰ میں سوویت مخالف بلاک بنانے کی کوشش کر رہا ہے، یہ مجوزہ کمرشل کانفرنس بھی ان ہی طریقوں کا ایک حصہ ہے۔ چنانچہ 27 رجنوری کو کانفرنس کی ایڈہاک کمیٹی کے ایک ترجمان نے ایک پریس کانفرنس میں اس تاثر کا ازالہ کرنے کی کوشش کی۔ اس نے یقین دلایا کہ "مجوزہ پان اسلامک کانفرنس کا سیاسی مسائل سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ اس کا مقصد محض یہ ہوگا کہ دنیا کے مختلف ممالک کے درمیان تجارتی تعلقات کو فروغ دیا جائے۔"[16]

ایڈہاک کمیٹی کے ترجمان کو مذکورہ وضاحت کرنے کی اس لئے بھی ضرورت محسوس ہوئی تھی کہ ایک دن پہلے برطانیہ کے وزیر خارجہ ارنسٹ بیون نے برطانوی پارلیمنٹ میں مسئلہ فلسطین پر بحث کے دوران تقریر کرتے ہوئے پاکستان کا جس طریقے سے ذکر کیا تھا اس سے یہ تاثر پختہ ہو گیا تھا کہ یہ ملک مشرق وسطیٰ میں برطانوی سامراج کے پٹھو کا کردار ادا کرے گا۔ ارنسٹ بیون کے الفاظ یہ تھے کہ "آگے چل کر پاکستان کو مشرق وسطیٰ کی سیاسیات اور واقعات میں جو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہو گی اسے نظرانداز کرنا انتہائی حماقت ہے۔ اب مشرق وسطیٰ کے علاقے میں افغانستان بھی شامل ہے اور یہ منطقہ پاکستان کی سرحدوں تک پھیلا ہوا ہے۔ پاکستان نے ایک عظیم

مسلم طاقت کی حیثیت سے مکمل آزادی حاصل کی ہے۔ مشرق وسطیٰ میں جو واقعات پیش آ رہے ہیں پاکستان ان میں گہری دلچسپی لے رہا ہے۔"[17] اسی دن نوائے وقت میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ "پاکستان کا محکمہ خارجہ غیر ملکی اثرات اور یہودی کنٹرول میں ہے۔ ایک یہودی افسر پاکستان کی خارجہ پالیسی کی تشکیل کرتا ہے اور ایک انگریز افسر پاکستانی سفارت خانوں کی نگرانی کرتا ہے۔"[18]

تاہم پاکستان کے قول و فعل کے بارے میں مشرق وسطیٰ کے عرب ممالک میں شکوک وشبہات کے باوجود وزیر داخلہ خواجہ شہاب الدین کی جماعت اخوت اسلامیہ نے 18رفروری کو ورلڈ مسلم کانفرنس منعقد کرنے کی تیاری جاری رکھی۔ 30رجنوری کو کراچی کے سیٹھ عبداللطیف ابراہیم بوانی نے جمعیت اخوت اسلامیہ کی ورکنگ کمیٹی اور مؤتمر عالم اسلامیہ کے کارکنوں کے اعزاز میں چائے کی دعوت دی۔ اس موقع پر پاکستان میں عراق کے وزیر مختار السید عبدالحمید الخطیب نے عالم اسلام کے اتحاد پر زور دیتے ہوئے امید ظاہر کی کہ اس کانفرنس سے عالم اسلام کو بڑی تقویت ملے گی۔ مصر کے نمائندے سید رمضان سعید نے دنیا کے تمام مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ متحد ہو جائیں تاکہ اگر کسی وقت بھی کسی اسلامی ملک کے خلاف جارحانہ سرگرمی کی جائے تو اس کا مقابلہ کر سکیں۔ اس نے مزید کہا کہ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ "اسلام کے دشمنوں نے باہمی نزاع کے باوجود اسلام کے خلاف ہمیشہ متحدہ کوشش کی ہے۔ یہ بات مسئلہ فلسطین سے بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ یہ بات خوشی کی ہے کہ اب عالم اسلام بیدار ہونے لگا ہے اور ایک منصوبہ کے مطابق کام کرنے لگا ہے۔"[19]

31رجنوری 1949ء کو رمضان سعید نے ایک بیان میں "اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ 18-1914ء کی پہلی جنگ عظیم کے بعد سے مسلمانان عالم اپنی تمام تر مساعی اپنی مادر وطن کی تنگ دلانہ محبت پر مرتکز کرتے رہے ہیں۔ ان میں قوم پرستی ایک رواج بن گیا تھا۔ ہمیں یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ ساری دنیا کے عظیم تر مفادات ہمارے پیش نظر نہیں تھے۔ ہمیں یہ بھی اعتراف کرنا چاہیے کہ ہمیں ان ساری تحریکوں اور انقلابات سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ البتہ ان سے ہمارا اتحاد پارا پارا ہو گیا۔ ہم میں پھوٹ پڑ گئی۔ ہم چھوٹے چھوٹے کمزور یونٹوں میں منقسم ہو گئے اور اس وجہ سے ہر معاملے میں ہمیں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ جب ہم عملاً ایک قوم تھے تو ہم نے نہ صرف اپنے آپ کی بلکہ ساری دنیا کی خدمت کی تھی۔ جب ہم نے اس دنیا کی خدمت کا سلسلہ

بند کیا تو اس میں وہ ساری برائیاں پیدا ہو گئیں جو آج اسے لاحق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر بیس سال کے بعد عالمی جنگ ہو جاتی ہے۔ جب سے ہم نے اپنے مقدس فرض کو فراموش کیا ہے اور اپنی قیادت کو ترک کیا ہے اس وقت سے بنی نوع انسان کو بہت مصائب کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ قرآنی حکم کے مطابق ہم مسلمانوں پر بنی نوع انسان کی خوشی اور اس دنیا سے برائی کی بیخ کنی کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم پھر یہ ذمہ داری قبول کر لیں۔ اگر 40 کروڑ مسلمان کوئی فیصلہ کر کے محنت کے ساتھ اس پر عمل کریں تو وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ ساری دنیا کے مسلمانو، اللہ کی خاطر، بنی نوع انسان کی خاطر اور اپنے مخصوص مفادات کی خاطر متحد ہو جاؤ۔''[20]

رمضان سعید کے یہ اعلانات، افکار و خیالات پاکستان کے اندر اور باہر متعدد مسلمان لیڈروں کی اس سیاسی تدبیر کے عین مطابق تھے کہ جب وہ اتحاد اسلامی کا ذکر کرتے تھے تو نہ صرف امریکہ، برطانیہ اور سوویت یونین کا ایک ہی سانس میں ذکر کرتے تھے بلکہ یہ بھی دعویٰ کرتے تھے کہ ان کا نصب العین یہ ہے کہ اتحاد اسلامی سے ساری بنی نوع انسان کی فلاح کا بندوبست ہو۔ لیکن ان کا مقصد دراصل سوویت یونین کی مخالفت ہوتا تھا کیونکہ امریکہ اور برطانیہ ہر قسم کے اتحاد اسلامی کے حق میں تھے اور مسلم مملکتوں کے فرمانرواؤں کا کسی بھی قسم کا اتحاد اسلامی، امریکہ اور برطانیہ کے حلقہ اثر سے باہر نہیں ہو سکتا تھا۔ سوویت یونین کے حکمرانوں کو اس سامراجی منصوبے یا سازش کا علم تھا، اس لئے وہ آئے دن اس کی مخالفت کرتے رہتے تھے اور عرب ممالک کے بیشتر قوم پرست اخبارات اور سیاسی عناصر اس کی مخالفت میں آواز اٹھاتے رہتے تھے۔ چنانچہ جب 5 رفروری کو رمضان سعید کو کانفرنس کی ''تیاری کمیٹی'' کا سیکرٹری منتخب کیا گیا تو اس نے اس موقع پر اخبار نویسوں سے بات چیت کے دوران زوردار الفاظ میں اعلان کیا کہ یہ کانفرنس اس لئے نہیں بلائی جا رہی ہے کہ اس کے بعد کسی غیر مسلم ملک کے خلاف بلاک بنایا جائے گا بلکہ اس کا مقصد محض یہ ہے کہ دنیا کے مسلمانوں میں صحیح اسلامی تعلیمات کی تبلیغ کر کے ان کی نشاۃ ثانیہ کا بندوبست کیا جائے۔ اس نے کہا کہ ہمارا بڑا مقصد ساری دنیا کی خدمت کرنا ہے اور ہم ایسا صرف اسی صورت میں کر سکتے ہیں کہ ہم دنیا کے مسلمانوں میں یکجہتی پیدا کریں۔ کانفرنس ایک خالصتاً غیر سیاسی اجتماع ہو گا اور اس کا کسی خاص شخص، پارٹی یا ملک کے مفاد کے حصول سے کوئی تعلق نہیں ہو گا۔ اس نے کہا کہ اس وقت دنیا کی سب سے بڑی برائی تنگ نظر قوم

پرستی ہے جس نے دنیا اور بنی نوع انسان کو برباد کر دیا ہے۔ انسان کے مصائب میں کمی کرنے کے لئے اس قوم پرستی کا انسداد ہونا چاہیے اور یہی ہمارا نصب العین ہے۔ [21]

9رفروری 1949 کو پاکستان مسلم لیگ کے چیف آرگنائزر چودھری خلیق الزماں کا ایک مضمون شائع ہوا جس کا عنوان یہ تھا ''قرآنی یا اسلامی مملکت کے متعلق میرا تصور۔'' اس مضمون میں خلیق الزماں نے یہ رائے ظاہر کی کہ ''عرب لیگ کے ناکام ہونے کی وجہ یہ ہے کہ نہ صرف مسلم ذہن اس کے نظریے سے بالکل ناواقف تھا بلکہ اس میں مرکزی اتھارٹی کا کوئی نام ونشان ہی نہیں تھا۔ چنانچہ عرب لیگ کی ناکامی کے قدرتی ردعمل کے طور پر عرب ممالک کے مسلمانوں کی توجہ مسلم ممالک کے لئے مرکزی اتھارٹی کی تخلیق کی جانب مبذول ہونی چاہیے کیونکہ صرف اسی طرح ہی وہ دوسرے طاقتور ممالک کی مزید سیاسی ومعاشی مداخلت سے محفوظ ہوسکتے ہیں۔ یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہوگا کہ 1864ء کے بعد عالم عرب کے بعض ممتاز مسلمانوں نے علاقائی قوم پرستی کو جوفروغ دیا ہے اور پھر بیسویں صدی کے اوائل میں ترکی میں جوابی نیشنلزم کے طور پر ''یونین اینڈ پروگریسو پارٹی'' کی وجہ سے اس نیشنلزم کو جو ہوا ملی ہے اسے مشرق وسطیٰ کی مسلم رائے عامہ کی زبردست تائید وحمایت حاصل نہیں ہے۔ لیکن یہ خیال کرنا بھی غلط ہوگا کہ عالم عرب کے مسلمان اب مملکت کے اسلامی تصور کی طرف واپس جانے کی تمنا نہیں رکھتے۔ مصر میں اخوان المسلمین کی تحریک اگرچہ معاشرتی اور مذہبی نوعیت کی ہے لیکن اس میں بہت بڑی سیاسی تحریک بننے کا امکان موجود ہے۔ یہ بات عجیب وغریب لگتی ہے کہ جب عالم عرب اور ترکی کے ارکان اپنے مسائل قوم پرستی کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کر رہے تھے، ہندوستان کے مسلمان اپنی غلامی کے باوجود، اسلامی مملکت کے علاقائیت سے بالاتر نظریے سے ثابت قدمی کے ساتھ وابستہ رہے۔'' [22]

چودھری خلیق الزماں پرانا خلافتی تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد جب کانگرسی رہنما موہن داس کرم چند گاندھی کی قیادت میں تحریک تحفظ خلافت چلائی گئی تو یہ بتایا گیا تھا کہ اس کا بنیادی مقصد برطانوی سامراج کی مخالفت تھا۔ اب خلیق الزماں اسی خلافتی تصور کو برطانوی سامراج کے مفاد میں فروغ دینا چاہتا تھا۔ اتحاد اسلامی یا ترکی کے خلافتی نظام کے احیا کا نعرہ 12رمارچ 1947ء کو امریکہ کے صدر ٹرومین کی جانب سے سوویت یونین کے خلاف سرد جنگ کے اعلان کے فوراً ہی بعد شروع ہو گیا تھا۔ پھر اکتوبر 1948ء میں دولت مشترکہ کانفرنس کے دوران اس نعرہ

میں زور پیدا کیا گیا اور یہ کہا جانے لگا کہ عربوں کو اسرائیلیوں کے ہاتھوں شکست محض اس لئے ہوئی ہے کہ عالم اسلام میں اتحاد نہیں تھا اور دوسرے ممالک کے مسلمان بھی اسی لئے مختلف مصائب میں مبتلا ہیں کہ ان میں اتحاد اسلامی کا فقدان ہے۔ اس نعرے کا مقصد یہ تھا کہ مشرق وسطیٰ میں امریکہ اور برطانیہ کے مفادات کے تحفظ و فروغ کے لئے اس خطہ میں ایک سوویت مخالف بلاک بنایا جائے۔ چودھری خلیق الزماں نے اسی مقصد کی تکمیل کے لئے یہ مضمون ایسے موقع پر لکھا تھا جبکہ کراچی میں مختلف مسلم ممالک کی غیر سرکاری نمائندوں کی ایک مسلم کانفرنس منعقد ہونے والی تھی۔

مصری وزیراعظم نقراشی پاشا کا اخوان المسلمین کے ہاتھوں قتل اور مصری حکومت کے ایما پر اخوان رہنما حسن البنا کا قتل

خلیق الزماں کے مذکورہ مضمون کی اشاعت سے تقریباً دو ہفتے قبل 28 دسمبر 1948ء کو مصر کا وزیراعظم نقراشی پاشا اخوان المسلمین کے ایک دہشت پسند کے ہاتھوں مارا گیا تھا اور چند دن قبل اخوان المسلمین کے صدر حسن البنا نے قاہرہ کے ایک اخبار ''الزمان'' میں اس خبر کی تردید کی تھی کہ ''اخوان المسلمین'' نے قاہرہ پر چڑھائی کر کے شیخ البنا کو مصر کا خلیفہ مقرر کرنے کا خفیہ منصوبہ تیار کیا تھا۔ حسن البنا نے اس خبر کی بھی تردید کی کہ ''اخوان المسلمین آئندہ اکتوبر کے مہینہ میں قاہرہ پر اسی انداز میں چڑھائی کرے گی جس انداز میں مسولینی نے روم پر چڑھائی کی تھی۔'' [23]

حسن البنا کے بارے میں یہ خبر دراصل اس کی موت کے حکمنانہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ چند دن بعد 12 فروری 1949ء کو مصری حکومت کے ایما پر کسی نامعلوم شخص نے بین الاقوامی اسلامیت کے اس تشدد پسند علمبردار کو قتل کر دیا۔ اس واقعہ سے حکومت پاکستان خاصی پریشان ہوئی کیونکہ مصر اور بعض دوسرے عرب ممالک کے سرکاری حلقوں میں یہ تاثر پایا جاتا تھا کہ پاکستان کے وزیر داخلہ خواجہ شہاب الدین کی قائم کردہ جماعت الاسلامیہ یا جماعت الاخوۃ الاسلامیہ کی طرف سے 18 اور 19 فروری کی جو ورلڈ مسلم کانفرنس بلائی جا رہی ہے اسے حکومت پاکستان کی سرپرستی اور حمایت حاصل ہے۔ چونکہ اس کانفرنس میں اخوان المسلمین کے نمائندوں کو دعوت دی گئی تھی اس لئے عالم عرب کے بعض سرکاری حلقوں میں یہ اندیشہ بھی تھا کہ یہ کانفرنس احیائے اسلام کی پرتشدد بین الاقوامی تحریک کا موجب بن جائے گی۔ چنانچہ اس غلط فہمی کے ازالہ

کے لئے 15رفروری کوحکومت پاکستان کی طرف سے ایک بیان شائع ہوا جس میں یقین دلایا گیا تھا کہ ''ورلڈ مسلم کانفرنس ایک غیر سرکاری تنظیم کی طرف سے بلائی گئی ہے۔اس کا حکومت پاکستان سے کوئی تعلق نہیں۔'' لیکن 17رفروری کوحکومت پاکستان کے اس بیان کی عملاً تردید ہوگئی جبکہ گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین نے شرق اردن کے وزیر مختار کی ایک دعوت میں تقریر کرتے ہوئے عالم عرب کے ان مندوبین کوخوش آمدید کہا جو ورلڈ مسلم کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے کراچی پہنچ چکے تھے۔اس نے کہا کہ ''پاکستان دنیا کی ساری امن پسند اقوام کے ساتھ اور خاص طور پر مشرق وسطیٰ کے ہمسایہ ممالک کے ساتھ ہم آہنگی کے ساتھ رہنا اور کام کرنا چاہتا ہے۔''[24]

ورلڈ اسلامک کانفرنس کی کاروائی......عالم اسلام کے اتحاد پر زور

18رفروری کومولانا شبیر احمد عثمانی کی زیر صدارت ورلڈ مسلم کانفرنس کا پہلا اجلاس ہوا جس میں مصر، سعودی عرب، عراق، افغانستان، ایران، انڈونیشیا، تیونس، یمن، فلسطین، لبنان، لیبیا، شام، لنکا اور ملایا کے مندوبین نے شرکت کی اور سردار عبدالرب نشتر، مولانا شبیر احمد عثمانی، ٹی۔بی۔ جایہ، السیدی عبدالحمید الخطیب، نواب معین نواز جنگ، شیخ عبداللہ الغوشیہ، رمضان سعید اور فضل الرحمان نے تقریریں کیں۔سردار عبدالرب نشتر کی تقریر کا لب لباب یہ تھا کہ ''جغرافیائی قوم پرستی نے دنیا میں بڑی گڑبڑ مچائی ہے۔بنی نوع انسان کی نجات صرف اسلامی طرز زندگی میں ہے۔ پاکستان کا فرض ہے کہ وہ دنیا کے سامنے اس طرز زندگی کا مظاہرہ کرے۔'' استقبالیہ کمیٹی کے صدر پروفیسر حلیم کی تقریر یہ تھی کہ ''اب مسلم ممالک میں یہ احساس بیدار ہوگیا ہے کہ انہوں نے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اسلامی اصولوں کی پابندی نہیں کی اور یہ کہ اب اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے مشترکہ کوشش کی ضرورت ہے۔'' مولانا شبیر احمد عثمانی کا کہنا یہ تھا کہ ''وقت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس ورلڈ مسلم کانفرنس کو مستقل حیثیت دیں۔'' اور فضل الرحمان کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ قرآن وحدیث میں بہت سی جگہوں پر یہ لکھا ہے کہ اسلام خون کے رشتوں، رنگ ونسل کے امتیازات یا جغرافیائی سرحدوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتا بلکہ وہ روحانی روابط کو معاشرے کے ڈھانچے کی بنیاد قرار دیتا ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان تنگدلانہ فرقہ پرستی اور قوم پرستی میں مبتلا ہوگئے ہیں۔فرقہ پرستی ایک ایسی لعنت ہے جو صدیوں سے ہمارے ساتھ چمٹی ہوئی ہے لیکن نسل

پرستی اور قوم پرستی کی لعنتیں مقابلتاً جدید ہیں اور یہ مغرب سے آئی ہیں۔ اسلام نے 1300 سال قبل دنیا کو امن، انصاف اور عالمگیر اخوت کا پیغام دیا تھا اور اس نے ان اصولوں کی بنیاد پر ایک ایسے معاشرتی ڈھانچے کی تعمیر کی تھی جو دنیا کے حالات میں استحکام پیدا کرنے کا باعث بنا تھا۔ دنیا نے اس پیغام کو فراموش کر کے اپنے آپ کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ اب اس دنیا کو خوف اور غیر یقینی کی حالت سے باہر نکالنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اس کی اسلام کے بنیادی اصولوں پر عمل کرنے کے کام میں مدد کی جائے۔ پاکستان ایک نوزائیدہ مملکت ہے یہاں مسلمانوں کی آبادی بہت زیادہ ہے۔ اس لئے اس ملک کی ایک غیر سرکاری تنظیم نے مسلم ممالک کے ممتاز نمائندوں کو ایک جگہ جمع کیا ہے۔[25]

ان تقریروں پر ایک نظر ڈالنے سے صاف دکھائی دیتا ہے کہ پاکستان کے سرکاری لیڈروں کا ایک مقصد یہ تھا کہ اس غیر سرکاری ورلڈ مسلم کانفرنس کے ذریعے رنگ و نسل اور جغرافیائی قوم پرستی سے بالاتر اتحاد اسلامی یا اسلامی بلاک کی تشکیل کے لئے فضا ہموار کی جائے۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے وزیر اعظم نے جنوری 1949ء میں ایشیائی کانفرنس منعقد کر کے عالمی سیاسیات میں اپنے ملک کا مقام و وقار بلند کرنے کی جو کوشش کی تھی اس کا توڑ کیا جائے۔ تیسرا مقصد یہ تھا کہ یکم جنوری 1949ء کو کشمیر میں جنگ بندی کے باعث پاکستان کے عوام میں بالعموم اور پنجاب کے عوام میں بالخصوص جو بددلی، پست حوصلگی اور مایوسی پھیل گئی تھی اس کا ازالہ یہ امید دلا کر کیا جائے کہ عالم اسلام متحد ہو گا تو اس تنازعہ کا تصفیہ بآسانی پاکستان کے حق میں ہو جائے گا اور چوتھا مقصد یہ تھا کہ پاکستان کے اندر بنگالیوں، بلوچوں، سندھیوں اور پٹھانوں کی جانب سے قومیتی حقوق کی جو چھوٹی بڑی تحریکیں چل رہی تھیں انہیں اسلامی اخوت کے نعرے کے زور سے کچلا جائے۔

19رفروری کو کانفرنس کا دوسرا اجلاس ہوا تو اس میں بھی لنکا اور دوسرے ممالک کے مندوبین نے اسی قسم کی تقریریں کیں اور آخر میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں مطالبہ کیا گیا کہ ایک ورلڈ مسلم آرگنائزیشن قائم کی جائے اور عربی زبان کو سارے مسلم ممالک کی مشترکہ زبان بنایا جائے۔

20رفروری کو مس فاطمہ جناح نے اس کانفرنس کے عورتوں کے سیشن کی صدارت کی۔ ان کی تقریر یہ تھی کہ ''آج کل کے حالات کا تقاضا یہ ہے کہ سارے مسلم ممالک ہر شعبہ زندگی میں

ایک دوسرے سے اشتراک عمل کریں۔ مسلمانان عالم کے درمیان مذہب، تہذیب اور معاشرت کے مشترکہ رشتے موجود ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان رشتوں کو مضبوط کریں تاکہ نہ صرف اپنے وجود کو قائم رکھ سکیں بلکہ مساوات، سچائی اور انصاف کے اسلامی پیغام کو پھیلا سکیں۔"[26] مس فاطمہ جناح کی یہ تقریر دوسرے پاکستانی لیڈروں کی تقریروں کے مطابق ہی تھی۔ بظاہر وہ اس کانفرنس میں شریک ہونے پر اس لئے آمادہ ہوگئی تھیں کہ اس میں وزیراعظم لیاقت علی خان، بیگم لیاقت علی خان اور چودھری خلیق الزماں وغیرہ پیش پیش نہیں تھے۔ لیاقت علی خان کی اس کانفرنس میں عدم دلچسپی کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس غیر سرکاری کانفرنس کو اپنی موجودگی سے سرکاری درجہ دے کر عالم عرب میں اپنے بارے میں مزید شکوک وشبہات پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا اور چودھری خلیق الزماں کی عدم موجودگی کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ 20رفروری کو پاکستان مسلم لیگ کونسل کا انتخابی اجلاس ہونے والا تھا اور وہ لیگ کی صدارت کا امیدوار ہونے کی حیثیت سے شب وروز کنویسنگ میں مصروف تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اگر اسے اس کانفرنس میں شرکت کا موقع دیا جاتا تو پھر مس فاطمہ جناح کے اس میں شریک ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پاکستان کے ہر شخص کو معلوم تھا کہ مس فاطمہ جناح، لیاقت علی خان اور خلیق الزماں سے سخت نفرت کرتی ہیں۔ تاہم خلیق الزماں سے یہ نہ ہوسکا کہ وہ اس کانفرنس میں بالکل کسی دلچسپی کا اظہار نہ کرے۔ وہ پاکستان میں پان اسلام ازم، یا اتحاد اسلامی یا بین الاقوامی خلافتی نظام کا سب سے بڑا علمبردار تھا۔ وہ پیشہ ور سیاسی لیڈر تھا اور نہایت موقع شناس یا موقع پرست بھی تھا لہٰذا یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ وہ ایسے موقع پر کسی نہ کسی طرح اپنی اہمیت کا اظہار نہ کرے۔ اس نے اس وجہ سے 9رفروری کو ڈان میں ایک مضمون شائع کروایا تھا جس میں اس نے عالم اسلام کی ایک مرکزی اتھارٹی کی ضرورت پر زور دیا تھا اور 18رفروری کو اس نے ایک پریس انٹرویو میں اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ سارے عالم اسلام کے دانشوروں میں بہت نظریاتی الجھن پائی جاتی ہے۔ اس نے کہا کہ "یہ ضروری ہے کہ اس نظریاتی الجھن کو دور کیا جائے اور مسلم دانشوروں کے ذہنوں میں اس نصب العین کو جاگزیں کیا جائے جو قائداعظم، علامہ اقبال، مولانا محمد علی، جمال الدین افغانی اور دوسرے مسلم مفکرین نے زوردار طریقے سے متعین کیا ہے۔ اس نصب العین کی تکمیل کے لئے یہ ضروری ہے کہ مسلم ممالک کے عوام کے درمیان برضا ورغبت سرگرم اور دانشمندانہ تعاون ہو۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ایک ایسا

مشترکہ ادارہ قائم کیا جائے جو مسلم ممالک کے عوام کے درمیان قریبی اور مسلسل روابط کے مواقع مہیا کرے اور اس نصب العین کے حصول کے لئے مقصدی اتحاد پیدا کرے۔''[27]

مسلم لیگ کے صدر چودھری خلیق الزماں نے تمام مسلم ممالک کو مدغم کر کے ایک ملک اسلامستان بنانے کا منصوبہ پیش کر دیا

20 رفروری کو چودھری خلیق الزماں پاکستان مسلم لیگ کا صدر منتخب ہوا تو اس کے دو دن بعد جب کراچی کے پارلیمنٹری کلب کی جانب سے ورلڈ مسلم کانفرنس کے مندوبین کے اعزاز میں دعوت دی گئی تو اس نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور پاکستان کی برسر اقتدار پارٹی کے سربراہ کی حیثیت سے اتحاد اسلامی کے حق میں زوردار تقریر کرتے ہوئے یہ عظیم الشان تجویز پیش کی کہ ''دنیا کے سارے مسلم ممالک کو مدغم کر کے ایک اسلامی مملکت یا اسلامستان کا قیام عمل میں لایا جائے۔ اس نے کہا کہ اسلامی قوانین کا اطلاق ساری مسلم دنیا پر ہوتا ہے لہٰذا آج کل کی نیشنلسٹ مسلم مملکتیں صحیح معنوں میں قرآنی یا اسلامی مملکتیں نہیں بن سکتیں۔ اسلامی جمہوریت کا تقاضا یہ ہے کہ ساری ملت اسلامیہ کا ایک اسلامی معاشرہ ہو۔ قرآنی قوانین سارے عالم اسلام پر مشتمل ایک اسلامی مملکت میں ہی رائج ہو سکتے ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ اس قسم کی مملکت مستقبل قریب میں قائم ہو جائے گی۔ اسلام کا مملکتی تصور افلاطون وغیرہ کے مملکتی تصور کے منافی ہے۔ اسلامی مملکت میں ساری مسلم قوم شامل ہوتی ہے۔ اسلامستان قائم کرنے کے لئے ہمیں بہت جدوجہد کرنی پڑے گی۔ لیکن اس میں کوئی تعجب نہیں کہ ایسی مملکت عنقریب معرض وجود میں آ جائے گی۔ میری تجویز یہ ہے کہ ایک اسلامستان لیگ قائم کی جائے۔ اس لیگ کی رکنیت سازی کی جائے اور ورلڈ اسلامک سٹیٹ کے لئے آئین مرتب کیا جائے۔'' چودھری خلیق الزماں کی اس تقریر سے قبل شریف الدین احمد نے امید ظاہر کی تھی کہ چودھری صاحب نے 9 رفروری کے ڈان میں جس اسلامستان کی تبلیغ کی ہے وہ سرمایہ داریت اور اشتراکیت کے درمیان طاقتی توازن مہیا کرے گا اور اس تقریر کے بعد سعودی سفیر السید الخطیب نے کہا کہ اسلامی مملکت کے بارے میں چودھری صاحب کا تصور صحیح ہے اور یہ کہ صرف مسلمانوں کا اتحاد ہی ان کی نجات کا باعث بن سکتا ہے۔[28]

چودھری خلیق الزماں کی یہ تقریر اس لحاظ سے اہم تھی کہ اس نے پاکستان مسلم لیگ کا

صدر منتخب ہونے کے بعد اسلامی مملکت کے لئے اپنے 9 رفروری کے تصور کی مزید وضاحت کرتے ہوئے اسلامستان کی بلی تھیلے سے باہر نکالی تھی۔ وہ مولانا شبیر احمد عثمانی کی تجویز کے مطابق اخوان المسلمین کی جگہ، جس پر 8 ردسمبر 1948ء میں پابندی عائد کر دی گئی تھی اور جس کے ایک دہشت پسند نے 28 ردسمبر 1948ء کو مصر کے وزیر اعظم نقراشی پاشا کو قتل کر دیا تھا اور جس کا سربراہ حسن البنا فروری کے دوسرے ہفتے میں مصری حکومت کے ایما پر قتل ہوا تھا، ایک ورلڈ مسلم آرگنائزیشن قائم کرنے کا بھی عزم رکھتا تھا اور کہتا تھا کہ عالمی تنظیم اس کے مجوزہ ورلڈ اسلامک سٹیٹ کا پیش خیمہ ہو گی۔ 24 رفروری کو اس نے ایک پریس انٹرویو میں اپنے اس منصوبہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ''میں فی الحال مسلم ممالک کی حکومتوں کو اپنے اس منصوبے میں ملوث کرنا نہیں چاہتا۔ میں ایسا اس وقت کروں گا جب مجھے یہ پتہ چلے گا کہ ان ممالک کے عوام میرے اس تصور کو کافی حد تک پسند کرتے ہیں۔ فی الحال میرا مقصد یہ ہے کہ میں ذاتی روابط اور کانفرنسوں کے ذریعے اور اگر ان ممالک کے عوام پسند کریں تو کسی نہ کسی طرح کی سیاسی تنظیم کے ذریعے اس تصور کی تبلیغ کروں۔ اگر مجھے پتہ چلا کہ مسلم ممالک میں ایک پولیٹیکل مسلم ورلڈ آرگنائزیشن کے لئے بہت جذبہ موجود ہے تو پھر میں اپنا یہ تصور پاکستان مسلم لیگ کے روبرو پیش کروں گا۔ کچھ بھی ہو میں کسی ورلڈ مسلم آرگنائزیشن میں تشدد کی اجازت نہیں دوں گا۔ ہماری جدوجہد پاکستان کے دوران تشدد کا کوئی ایک واقعہ بھی نہیں ہوا تھا۔ ہم نے اپنے نصب العین کی سچائی اور عوام کی ذہانت اور شعور پر انحصار کیا تھا۔ ہم ورلڈ آرگنائزیشن کے قیام کے لئے بھی ان ہی باتوں پر انحصار کریں گے۔ اس نے انکشاف کیا کہ میں پرانے دوستوں سے رابطے کے لئے مئی کے مہینے میں لندن جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔''[29]

اسلامستان کا منصوبہ اینگلو۔امریکی سامراج کی طرف سے مشرق وسطیٰ میں سوویت مخالف بلاک کی تشکیل کے سلسلے کی کڑی تھا

چودھری خلیق الزماں نے اپنے اسلامستان اور اپنی ورلڈ مسلم آرگنائزیشن کی جو خوبصورت بلی تھیلے سے نکالی تھی وہ محض اس لئے اہم نہیں تھی کہ اسے چودھری خلیق الزماں نے اپنے تھیلے سے باہر نکالا تھا بلکہ یہ اس لئے اہم تھی کہ وزیر اعظم لیاقت علی خان کی اکتوبر 1948ء میں منعقدہ دولت مشترکہ کانفرنس سے واپسی کے بعد عالم اسلام کے اتحاد کی تجویز کا پروپیگنڈا تیز

ہو گیا تھا اور برطانوی لیڈروں اور اخبارات پر مشرق وسطیٰ کے حوالے سے پاکستان کی اہمیت یکا یک اجاگر ہو گئی تھی۔ برطانوی پارلیمنٹ کے رکن مارگن فلپس پرائس نے نومبر 1948ء میں پاکستان کا دورہ کرنے کے بعد مانچسٹر گارڈین میں دو مضامین لکھے تھے۔ جن میں اس نے رائے ظاہر کی تھی کہ ''ظہور پاکستان سے برصغیر کی شمال مغربی سرحد کا دفاع مضبوط ہو گیا ہے۔ اب ماضی کی طرح ہندوستان اور درہ خیبر اور بلوچستان کے ذریعے کوئی حملہ نہیں ہوسکتا۔ اگر شمال کے دشمن کو حملہ کرنا ہی ہوگا تو وہ کوہ ہندوکش کے اوپر سے دریائے سندھ کی وادی میں اپنی چھاتہ فوج اتارے گا۔ اس طرح شمال مغربی سرحد کے دفاعی انتظامات کو ان کے مراکز سے الگ کر دے گا اور اگر اسے اس وادی میں نہ روکا گیا تو وہ کراچی اور ایران کے دہانے پر پہنچ جائے گا۔ پھر دشمن کے لئے یہ ممکن ہوگا کہ وہ بحر ہند کے ساحل سے خلیج فارس پر حملہ کر کے امریکہ اور برطانیہ کے تیل کے ذخائر کو خطرہ لاحق کرے۔ بلاشبہ بڑے بڑے سٹریٹیجک مسائل پاکستان کے ارباب اختیار اور ان کے برطانوی فوجی مشیروں کے پیش نظر ہیں۔ برصغیر کے دفاع کے سارے مسئلہ میں انقلابی تبدیلی پیدا کرنا ضروری ہے۔''[30] اسی مہینے میں لندن آبزرور کے ایک نامہ نگار خصوصی نے بھی پاکستان کے شمال مغربی سرحدی علاقے کا دورہ کرنے کے بعد جو طویل رپورٹ لکھی تھی اس میں سوویت یونین کے خلاف پاکستان کی اہمیت پر بہت زور دیا گیا تھا اور فلپس پرائس کے مضامین کی طرح پاکستان میں اس رپورٹ کی خوب تشہیر کی گئی تھی۔ 23 دسمبر 1948ء کو امریکہ کی وزارت خارجہ کے اسسٹنٹ سیکرٹری جارج ایلن نے ایک انٹرویو میں اعلان کیا تھا کہ مشرق وسطیٰ کو تیل کے ذخیروں کی وجہ سے بہت اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ 24 دسمبر کو پاکستان کے وزیر خزانہ غلام محمد نے پان اسلامک کمرشل اینڈ انڈسٹریل کانفرنس منعقد کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ 6 جنوری 1949ء کو وزیر داخلہ خواجہ شہاب الدین کی جماعت اخوت الاسلامیہ کی جانب سے 18 اور 19 فروری کو ورلڈ مسلم کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ جبکہ اسی دن عراق میں انگریزوں کے پرانے پٹھو نوری السعید پاشا کی حکومت قائم ہوئی تھی۔ 17 جنوری کو قاہرہ کے اخبار المصور کی اطلاع یہ تھی کہ امریکہ نوری سعید کی امداد سے مشرق وسطیٰ میں ایک بلاک بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ 26 جنوری کو برطانیہ کے وزیر خارجہ ارنسٹ بیون نے دارالعوام میں مسئلہ فلسطین پر بحث کے دوران ایوان کو بتایا تھا کہ آئندہ مشرق وسطیٰ کی سیاست میں پاکستان کو جو پوزیشن حاصل ہوگی اگر اسے نظر انداز کیا

گیا تو یہ بات انتہائی احمقانہ ہوگی۔

فروری کے اوائل میں لندن کے اخبار ڈیلی ٹیلیگراف نے یورپ کے لئے مشرق وسطیٰ کے تیل کی اہمیت پر ایک مضمون لکھا تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ ''اس علاقے کا تیل دنیا کے لئے سب سے بڑا اسٹریٹیجک عنصر بن گیا ہے۔ اس تیل کی حیثیت ایسے زندگی بخش خون کی ہے جس کے بغیر پورے یورپ کی معیشت تباہ و برباد ہو جائے گی۔ دس برس پہلے یورپ مشرق وسطیٰ سے تیل کی 25 فیصد ضرورت پوری کرتا تھا۔ آج کل یورپ کی تیل کی 40 فیصدی ضرورت یہاں سے پوری ہوتی ہے اور 1951ء میں یورپ کے لئے مطلوبہ تیل کا 80 فیصد حصہ مشرق وسطیٰ سے آئے گا...... اگر مشرق وسطیٰ کے تیل کے چشموں کی جغرافیائی صورتحال پر روس کے حوالے سے نظر ڈالی جائے تو سٹریٹیجک مسئلہ کا پتہ چل جاتا ہے جو مغربی طاقتوں کو اس لئے درپیش ہے کہ وہ مشرق وسطیٰ کے تیل پر انحصار کرتے ہیں...... 1946ء میں امریکہ اور برطانیہ کے دباؤ کے تحت اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے روس کو آذربائیجان سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کے بعد اس نے وہاں ایک کٹھ پتلی حکومت بنانے کی کوشش کی مگر اسے ناکامی ہوئی۔ 1947ء میں ایرانی مجلس نے روس کو آذربائیجان میں تیل کی تلاش کی مراعات دینے سے انکار کر دیا تھا۔ روس کی تیل کی کھپت بڑھ رہی ہے جبکہ اس کی اپنی پیداوار کم ہو رہی ہے۔ جنگ سے پہلے روس روزانہ 30 ملین ٹن تیل پیدا کرتا تھا جو کہ جنگ کے دوران کم ہو کر 18 ملین ٹن رہ گیا تھا اور آج کل 27 ملین ٹن ہے۔ لہٰذا اس امر کی علامتیں موجود ہیں کہ روس ایران میں اپنا اثر و رسوخ بحال کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ حال ہی میں تہران کے کمیونسٹ اخبار نے مزدوروں کو اکسایا ہے کہ وہ حب الوطنی کے جذبے کے تحت غیر ملکی تیل کمپنیوں میں سست رفتاری سے کام کریں اور سبوتاژ کریں...... جنگ کے بعد یورپ میں تیل صاف کرنے کے کارخانوں میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ برطانیہ میں آج کل 5.3 ملین ٹن تیل صاف ہوتا ہے۔ 53-1952ء تک یہاں 20 ملین ٹن صاف ہوگا۔ اس توسیعی منصوبے پر 125 ملین پونڈ خرچ ہوں گے...... مشرق وسطیٰ میں موجود تیل کے بے پناہ ذخائر کے مناسب استعمال کے لئے یہاں امن، استحکام اور سلامتی ضروری ہے۔ اس طرح دنیا کی معیشت بھی بحال ہوگی اور مقامی آبادی کی بھی صنعتی اور معاشرتی ترقی ہوگی۔''[31]

23رفروری کو مصر کے وزیر خارجہ ابراہیم پاشا نے کہا تھا کہ معاہدہ بحیرہ روم کی تجویز غور و خوض اور مطالعہ کی مستحق ہے۔ یہ تجویز یونان کے وزیر خارجہ نے تیار کی تھی اور اس نے اس کی تفصیل کا اعلان 21رفروری کو برطانیہ کے وزیر خارجہ ارنسٹ بیون سے ملاقات کے بعد کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کا مجوزہ معاہدۂ بحیرہ روم، مجوزہ معاہدۂ بحیرہ اوقیانوس کی طرح کا ہوگا۔ مصر کے وزیر خارجہ کا کہنا یہ تھا کہ ''مصر ایسا ملک نہیں ہے جو دوستی کے ہاتھ کو جھٹک دے۔ اس لئے وہ ہر اس تجویز کا خیر مقدم کرے گا جو اس کے مفاد کے لئے ضرر رساں نہیں ہوگی۔''[32]

مشرق وسطیٰ کی صورتحال کے اس پس منظر میں 4رمارچ 1949ء کو چودھری خلیق الزماں کا یہ عظیم الشان اسلامی منصوبہ اور بھی عظیم الشان دکھائی دینے لگا جبکہ ورلڈ مسلم کانفرنس کی استقبالیہ کمیٹی کے صدر پروفیسر اے۔ بی۔ اے۔ حلیم نے مؤتمر عالم اسلامی کے نام سے ایک مستقل ورلڈ مسلم آرگنائزیشن کے قیام کے فیصلے کا اعلان کیا اور بتایا کہ ''اس تنظیم کی کلی شاخیں سارے مسلم ممالک میں ہوں گی۔ یہ تنظیم اسلامی اخوت کا نصب العین پورا کرنے کے لئے مسلم ممالک کے درمیان اساتذہ و طلبا کا تبادلہ کرے گی، ثقافتی، معاشرتی اور تعلیمی وفود کا تبادلہ کرے گی، مطالعاتی حلقے اور لائبریریاں قائم کرے گی اور عربی زبان اور دوسری زبانوں میں جرائد شائع کرے گی۔ اس نے کراچی کے سیٹھ عبداللطیف ابراہیم بوانی اور کراچی کے کاروباری طبقہ کے دوسرے ارکان کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے فراخدلی کے ساتھ ورلڈ مسلم کانفرنس کے مندوبین کا خیر مقدم کرنے کے علاوہ ان کے لئے رہائش کا بندوبست کیا تھا۔''[33] اس نے مزید کہا کہ ''ورلڈ مسلم کانفرنس توقع سے زیادہ کامیاب رہی ہے۔ مندوبین بڑے جوش و جذبے کے ساتھ واپس چلے گئے ہیں اور انہوں نے اپنے ممالک میں مؤتمر عالم اسلامی کی برانچیں قائم کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ ان سب کو ورلڈ مسلم آرگنائزیشن کے قیام کی ضرورت کا شدت سے احساس تھا۔ مسلم ممالک کے جن عناصر نے اس کانفرنس میں بہت دلچسپی لی ہے ان میں شاہ ابن سعود اور شاہ ایران بھی شامل ہیں۔''[34]

کراچی میں مؤتمر عالم اسلامی یا ورلڈ مسلم آرگنائزیشن کے قیام کا اعلان

ورلڈ مسلم آرگنائزیشن یا مؤتمر عالم اسلامی کا وجود ترکی میں خلافتی نظام کے خاتمہ کے

تقریباً دو سال بعد جون 1926ء میں عمل میں آیا تھا جبکہ حجاز کے نئے بادشاہ عبدالعزیز ابن سعود نے اپنی سلطنت، جس کی عمر چھ ماہ تھی، کے استحکام کے لئے مکہ میں ایک اسلامک ورلڈ کانفرنس بلائی تھی۔ ہندوستان کی خلافت کمیٹی کی طرف سے مولانا محمد علی جوہر نے اس میں شرکت کی تھی۔ انہوں نے اس اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی تھی کہ مکہ اور مدینہ کے شہروں کو بین الاقوامی علاقے قرار دے کر یہ اعلان کیا جائے کہ یہ دونوں مقدس شہر ساری دنیا کے مسلمانوں کے روحانی مراکز ہوں گے۔ مگر ابن سعود نے یہ تجویز منظور نہ کی اور مولانا محمد علی بہت مایوس ہو کر ہندوستان واپس لوٹے تھے۔ پھر کئی سال تک مؤتمر عالم اسلامی کا نام سنائی نہ دیا تا آنکہ 1931ء میں اس کی دوسری کانفرنس بیت المقدس میں ہوئی جس میں ہندوستانی مسلمانوں کی نمائندگی علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال نے کی تھی مگر اس میں بھی کوئی قابل ذکر فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد تقریباً 18 سال تک کسی نے کبھی نہ تو اس تنظیم کی کوئی ضرورت محسوس کی تھی اور نہ ہی اس کا کبھی نام لیا تھا۔ لیکن جنوری 1949ء میں پاکستان کے ارباب اقتدار نے اپنی داخلی اور خارجی سیاست کے تقاضے پورے کرنے کے لئے یکا یک اس میں جان ڈالنے کا ''غیر سرکاری سطح'' پر فیصلہ کیا اور جب فروری 1949ء میں کراچی میں ورلڈ مسلم کانفرنس نے اس فیصلے کی تائید کر دی تو پاکستانی عوام کو زوردار پروپیگنڈے کے ذریعے یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ ساری دنیا کے مسلمانوں کی ایک بالکل نئی اور عظیم الشان جماعت وجود میں آ گئی ہے اور مسلم ممالک کے درمیان جغرافیائی سرحدیں نہیں رہیں گی۔

6/ مارچ کو محکمہ عسکریہ فلسطین کے سابق رئیس اور قاہرہ کے مشہور ایڈووکیٹ سید سعید رمضان، شام ولبنان کی انجمن اخوان المسلمین کے سیکرٹری اور اسلامک انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر سید عمر اور پروفیسر محمود ابوسعید استاد اقتصادیات وسیاسیات کابل یونیورسٹی کے اعزاز میں جمعیۃ اسلامیہ لاہور کے دارالاقامہ میں عصرانہ دیا گیا۔ اس موقع پر سید سعید رمضان کا پیغام صرف یہ تھا کہ ''قوم پرستی کے بت کو توڑ دو۔ جو حدود رنگ ونسل اور زبان وغیرہ کے اختلافات کی صورت میں بھائی بھائی کو بانٹ رہا ہے۔ ہمارا وطن اسلام ہے اور روئے زمین کے سارے مسلمان بھائی بھائی ہیں۔''[35]

لیاقت نے ورلڈ مسلم کانفرنس کی ''کامیابی'' سے داخلی سیاست میں فائدہ اٹھاتے ہوئے آئین کی بجائے قرارداد مقاصد پیش کر دی

چونکہ 1926ء کی مکہ کانفرنس اور 1931ء کی بیت المقدس کانفرنس ''کامیاب'' نہیں رہی تھیں اور چونکہ پاکستان اور مغربی ممالک کے ذرائع ابلاغ کے مطابق کراچی کی تیسری کانفرنس ''بڑی کامیاب'' رہی تھی اس لئے اس نے وزیراعظم لیاقت علی خان کے لئے اندرون ملک سیاسی صورتحال خاصی سازگار کر دی تھی اور مغربی دنیا میں بھی یہ تاثر پیدا ہو گیا تھا کہ جہاں تک مشرق وسطیٰ کا تعلق ہے پاکستان اس کی قیادت میں واقعی اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ چنانچہ لیاقت علی خان نے اس داخلی اور خارجی صورتحال میں 7/مارچ 1949ء کو پاکستان کی مرکزی اسمبلی میں مشہور و معروف قرارداد مقاصد پیش کر دی جس میں اعلان کیا گیا تھا کہ پاکستان میں اختیار حکمرانی اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہ کر استعمال کیا جائے گا۔☆ اس نے اس قرارداد کی تائید میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے وجود کے بارے میں صرف انسانی شعور ہی بنی نوع انسان کو سائنسی ایجادات کی تباہ کاریوں سے بچا سکتا ہے۔ 9/مارچ کو مولانا شبیر احمد عثمانی نے اس قرارداد کی حمایت کی۔ اس نے کہا ''پاکستان چاہتا ہے کہ وہ ساری دنیا کو مادہ پرستی اور الحاد کی تاریکی سے نکال کر امن اور شان و شوکت کی راہ پر ڈالے۔'' اس نے یقین ظاہر کیا کہ ''پاکستان کی یہ دعوت دنیا کے دوسرے مسلم ممالک قبول کریں گے اور سب مل کر ایک ایسا بلاک بنائیں گے جو سرمایہ دار اور کمیونسٹ بلاکوں سے مختلف ہو گا۔''[36] سردار عبدالرب نشتر نے کہا کہ ''پاکستان کے سامنے ایک مشن ہے۔ آج کل دنیا میں کیپٹلزم اور کمیونزم کے درمیان نظریاتی جنگ جاری ہے۔ ہمیں دنیا کے سامنے ان دونوں نظریوں کے متبادل نظریہ پیش کرنا ہو گا۔ تم محض دونوں کو برا قرار دے کر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھ سکتے۔ ہم مسلمانوں کا ایمان ہے کہ کمیونزم کا مقابلہ امریکی ڈالروں اور ایٹم بم سے نہیں کیا جا سکتا۔ اگر تم واقعی سنجیدہ ہو تو تمہیں دنیا کے سامنے متبادل معاشرتی نظام پیش کرنا ہو گا۔ ایک ایسا معاشرتی نظام جس کی بنیاد آزادی، مساوات، معاشرتی انصاف اور انسانی عظمت پر ہے، ہم کوشش کرتے ہیں۔ ممکن ہے یہ کامیاب ہو جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کامیاب نہ ہو۔''[37]

☆ تفصیلات کے لئے دیکھئے: پاکستان کی سیاسی تاریخ جلد 4۔ جناح لیاقت تضاد و پنجابی مہاجر تضاد ایڈیشن دوم۔ 2013ء ۔ ادارہ مطالعہ تاریخ۔ لاہور

اینگلوامریکی سامراج کی طرف سے معاہدہ اوقیانوس کی طرز پر مشرق وسطیٰ کے ممالک پر مشتمل معاہدہ بحیرہ روم وضع کرنے کی کوشش

پاکستان کی مرکزی اسمبلی کی اس ''اسلامی کاروائی'' سے قبل مصر میں خشابہ پاشا پھر وزارت خارجہ کے عہدے پر فائز ہوگیا تھا۔ لندن ٹائمز کو اس تقرر پر اطمینان ہوا تھا اور اس کا خیال تھا کہ ''اب مصر میں پھر یہ احساس ہورہا ہے کہ مصر کی سلامتی کے لئے مشرق وسطیٰ میں برطانیہ کے اثر ورسوخ کی کیا قدر وقیمت ہے اور اس وجہ سے شاید حکومت مصر کم از کم معاشی میدان میں برطانیہ کے ساتھ مل کر کام کرنے پر پہلے سے زیادہ آمادہ ہے۔ خشابہ پاشا گزشتہ سال وزیر خارجہ تھا تو برطانیہ اور مصر کے درمیان سوڈان کے مسئلے پر سمجھوتہ تقریباً ہو ہی گیا تھا۔''[38] اکتوبر 1948ء میں پیرس میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس کے دوران اس شخص نے یونان، ترکی اور عرب ممالک پر مشتمل ایک سوویت مخالف بلاک بنانے کی یونان کے وزیر خارجہ کی تجویز کی تائید کی تھی۔ اب 12 ر مارچ 1949ء کو اس کی رائے یہ تھی کہ ''مفادات کے تحفظ کے لئے برطانیہ اور مصر کے درمیان قریبی روابط کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔'' تاہم وہ ''قبل از وقت یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ مصر معاہدہ بحیرہ روم میں شامل ہوگا یا نہیں کیونکہ اس وقت تک اس معاہدے کی حیثیت محض ایک مفروضے کی تھی۔''[39] اس کے اس بیان سے ایک دن پہلے 11 ر مارچ کو شرق اردن اور اسرائیل کے درمیان جنگ بندی کے رسمی سمجھوتے پر دستخط ہوگئے تھے۔

17 ر مارچ کو لندن ٹائمز کے نامہ نگار مقیم قاہرہ کی رپورٹ یہ تھی کہ ''اگرچہ عربوں کی اکثریت نے ابھی تک عرب لیگ کے نظریۂ اتحاد کو ترک نہیں کیا لیکن یہ محسوس کیا جارہا ہے کہ اس کے منشور اور آئین میں حقیقت پسندانہ تبدیلیاں کئے بغیر یہ تنظیم زیادہ عرصہ تک زندہ نہیں رہ سکتی۔ نامہ نگار کی رائے یہ تھی کہ عرب لیگ کمیونزم کے خلاف کامیابی کے ساتھ جدوجہد منظم نہیں کرسکی۔''[40] تاہم 18 ر مارچ کو ترکی کے وزیر خارجہ نعیم الدین صادق کا قومی اسمبلی میں بیان یہ تھا کہ ''ترکی مشرق وسطیٰ میں امن کے تحفظ کے لئے برضا ورغبت معاہدۂ بحیرہ روم میں شامل ہوگا۔''[41] واشنگٹن سے اطلاع یہ تھی کہ ''اگر ترکی وزیر خارجہ واشنگٹن آیا تو حکومت امریکہ اس سے مجوزہ معاہدہ بحیرہ روم کے بارے میں بخوشی بات چیت کرے گی۔''[42] وہیں

سے مزید خبر یہ تھی کہ ''مغربی طاقتوں نے 20 سالہ معاہدہ اوقیانوس کا متن جاری کر دیا ہے جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ یورپ اور شمالی امریکہ، جارحیت کا مقابلہ متحدہ فوجی اقدام سے کریں گے۔[43] اور لندن کی ایک رپورٹ میں یہ کہا گیا تھا کہ ''برطانوی وزیر خارجہ ارنسٹ بیون نے دارالعوام میں یونان، ترکی اور ایران کی آزادی اور سالمیت کے بارے میں اپنے ملک کی دلچسپی کا جو پالیسی اعلان کیا ہے اس سے سفارتی حلقوں میں یہ تاثر پیدا ہوا ہے کہ برطانیہ معاہدہ بحیرہ روم کی تشکیل میں مثبت طریقے سے مدد دے گا۔''[44]

19 رمارچ کو برطانوی وزارت خارجہ کے ترجمان کا اعلان یہ تھا کہ ''برطانیہ اور شرق اردن کے معاہدے کے مطابق برطانوی فوجیں شرق اردن میں موجود ہیں اور یہ اس وقت تک وہیں مقیم رہیں گی جب تک وہاں خطرہ موجود ہے۔''[45] 27 رمارچ کو امریکہ کے وزیر خارجہ ڈین ایچی سن (Dean Acheson) نے یہ اعلان کیا کہ ''امریکہ کو یونان، ترکی اور ایران کی سلامتی اور آزادی میں گہری دلچسپی ہے۔''[46] اور پھر یکم اپریل کو قاہرہ میں پاکستانی سفارت خانے کے ایک ترجمان نے یہ انکشاف کیا کہ ''عرب ممالک اور دوسرے مسلم ممالک میں متعینہ پاکستانی سفیروں کی ایک میٹنگ ماہ رواں کے اواخر میں تہران میں ہوگی جس میں یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ آئندہ عرب ممالک اور پاکستان کی پالیسی ایک جیسی ہوگی۔''[47]

برطانوی خبر رساں ایجنسی ''سٹار'' کا اسلام کے حوالے سے سوویت یونین اور کمیونزم کے خلاف پروپیگنڈا

معاہدہ بحیرہ روم کے بارے میں خبروں کے اس سیلاب کے دوران پاکستان کی مرکزی اسمبلی نے قرارداد مقاصد منظور کی اور برطانوی خبر رساں ایجنسی ''سٹار'' نے کئی خبروں میں یہ پروپیگنڈا کیا کہ سوویت یونین اور اس کے یورپی اتحادی اسلام کے خلاف ہیں۔ اب وہاں کوئی خدا نہیں ہے اور سوویت یونین کے وسطی ایشیا کے علاقے میں مسلمان کمیونسٹوں کے خلاف گوریلا جنگ لڑ رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ''سٹار'' نے پولینڈ کے ایک جلاوطن ''امیرالمومنین'' کے ''انٹرویو'' کی بھی تشہیر کی جس میں اس نے بتایا تھا کہ ''چونکہ کمیونزم خدا کے وجود سے انکار کرتا ہے اس لئے مسلمانوں کے ساتھ کمیونسٹوں کا کوئی اشتراک ہو ہی نہیں سکتا بلکہ درحقیقت یہ ناممکن

ہے۔ کمیونسٹ یہ جانتے ہیں اور اس پر ان کی پالیسی کا دارومدار ہے...... اسلام اور روس کے بُعد کا اظہار اس سے ہوسکتا ہے کہ روس نے 1946ء میں ان روسی جمہوریتوں کو ختم کر دیا تھا جن میں مسلمانوں کی آبادی تھی یہی وجہ ہے کہ آج کل وسطی ایشیا میں مسلمان کمیونسٹوں کے خلاف نبرد آزما ہیں...... روس اور اسلام کا اشتراک 12ویں صدی میں عمل میں آیا تھا۔ روسی مسلمانوں کی بڑی اکثریت تاتاریوں کی اولاد پر مشتمل ہے جنھوں نے 13ویں صدی میں روس فتح کیا تھا۔ روس کے زیر تسلط دو کروڑ سے زیادہ مسلمانوں میں 80، 90 فیصدی آبادی ترکی قبائل سے گہری مشابہت رکھتی ہے۔''[48]

برطانیہ کی مذکورہ خبر رساں ایجنسی سوویت یونین کے خلاف اس قسم کا معاندانہ پروپیگنڈا کرنے کے لئے ہی قائم کی گئی تھی۔ اس کی بیشتر خبریں مذہب کے حوالے سے جاری ہوتی تھیں اور ان میں اسلام سے بڑی شیفتگی کا اظہار کر کے یہ تاثر دیا جاتا تھا کہ کمیونزم کوئی بڑی ڈراؤنی چیز ہے۔ جس علاقے پر اس کا غلبہ ہو جاتا ہے وہاں خدا، مذہب، پیغمبر، تہذیب، ثقافت اور شائستگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس کی خبروں میں یہ بھی تاثر دیا جاتا تھا کہ کمیونسٹ اخلاق باختہ ہوتے ہیں اور وہ تخریب کاری، دہشت گردی اور سازشوں کے ذریعے غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جب برسر اقتدار آ جاتے ہیں تو اپنے زیر تسلط علاقے میں مروجہ معاشرتی و اخلاقی ڈھانچے کو تہس نہس کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اسی پروپیگنڈا پالیسی کے تحت قاہرہ کے اخبار ''المصری'' کے حوالے سے یہ خبر دی گئی کہ ''مشرق وسطیٰ میں کمیونزم کا، جس نے اپنا دائرۂ عمل وسیع کر دیا ہے، مقابلہ کرنے کے لئے عرب ممالک وسیع پیمانے پر ایک اسکیم بنا رہے ہیں۔ روسی سفارت خانے کے افراد اب اس معاہدے کی طرف سے بے اعتنائی نہیں برت رہے ہیں جس کی انقرہ، بغداد اور دمشق کے درمیان تجویز ہو رہی ہے۔ گزشتہ دو ہفتوں میں روسیوں نے عراق و شام کی شمال مشرقی سرحد اور بیروت میں اپنی سرگرمیوں میں اضافہ کر دیا ہے۔ روسی، غیر مطمئن جماعتوں اور طبقوں میں بے چینی پھیلا کر اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس طرح عراق میں کمیونسٹوں پر مقدمہ چلانے پر لبنان کی کمیونسٹ پارٹی نے زبردست احتجاج کیا ہے اور شام کے کمیونسٹوں نے بھی عراقی وزیر سے احتجاج کیا ہے۔ مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید میں کمیونسٹوں کی آئندہ سرگرمیوں کی یہ ایک علامت ہے۔ کمیونسٹ

شورش پسندوں کی طرف سے عرب ممالک میں بے چینی اور ایجی ٹیشن کا ڈر ہے جس کا اثر ترکی پر بھی پڑے گا۔ کمیونسٹوں کی سرگرمیوں کا مرکز شام میں ایک نازک مقام پر ہے یعنی ضلع جزیرہ میں۔ یہ علاقہ بڑا زرخیز ہے اور عراق اور ترکی کی سرحد پر ہے۔ یہاں کمیونسٹ تحریک میں عورتیں ایک اہم کردار ادا کر رہی ہیں ایک سو عورتوں نے ایک انجمن بنا ڈالی ہے جو انجمن آزادی کہلاتی ہے اور جو مارکسزم کا پروپیگنڈا کر رہی ہیں۔ انہوں نے دمشق میں دوسری کمیونسٹ خواتین کے ساتھ رابطہ پیدا کر لیا ہے۔''[49]

23/ مارچ کو اسی خبر رساں ایجنسی کی طرف بغداد سے بھیجی ہوئی خبر یہ تھی کہ ''پولیس ہیڈ کوارٹر نے 676 صفحات پر مشتمل عراق میں کمیونسٹ سرگرمیوں کی رپورٹ تیار کر کے شائع کی ہے۔ اس رپورٹ میں عراقی کمیونسٹوں کے اعترافات بھی درج ہیں کہ ان کی پارٹی روس سے مالی امداد لیتی ہے۔ رپورٹ میں دستاویزیں، فوٹوگراف اور اعترافات درج ہیں اور گواہوں کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ عراقی کمیونسٹ اس سے کہیں زیادہ منظم اور زیادہ سرگرم کار ہیں جتنا کہ ان کے متعلق پہلے خیال تھا اور ان کا (Comin Form) کامن فارم سے براہ راست تعلق ہے۔ عراقی کمیونسٹ پارٹی کے تین حصے ہیں، عرب، کرد اور آرمینی۔ ہر حصہ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے سامنے جوابدہ ہے جس کا سیکرٹری یوسف سلیمان تھا، جو ''مہد'' کے نام سے مشہور تھا جسے گزشتہ سال پارٹی کے تین اعلیٰ ممبروں کے ساتھ موت کی سزا دی گئی تھی۔ رپورٹ میں انکشاف کیا گیا ہے کہ سلیمان کے ماسکو، فرانس، شام اور لبنان کے کمیونسٹوں سے قریبی تعلقات قائم تھے۔''[50]

نوائے وقت کی رائے میں برطانیہ کمیونزم کا خطرہ اچھال کر مصر سے اپنی شرائط منوانا چاہتا تھا

مذکورہ خبریں مشرق وسطیٰ میں سوویت یونین مخالف بلاک کے بارے میں رائے عامہ ہموار کرنے کی غرض سے گھڑی گئی تھیں اور ان خبروں کے ساتھ ہی یہ خبر بھی دی گئی تھی کہ اینگلو۔مصری معاہدہ 1936ء پر نظرثانی کی بات چیت دوبارہ شروع ہونے والی ہے۔ نوائے وقت کا اس خبر پر تبصرہ یہ تھا کہ ''یہ حقیقت ساری دنیا کو معلوم ہو چکی ہے کہ 1936ء کا معاہدہ جس کی رو سے مصر کو آزادی عطا کی گئی تھی دراصل مصر کی آزادی اور وقار کے سراسر منافی ہے۔ مصر کی عوامی

سیاست تین سال سے اس غلامانہ معاہدے کی تنسیخ کے لئے جدوجہد کر رہی ہے لیکن کامیابی کے آثار نظر نہیں آئے۔ برطانیہ ایسی شرائط پر مصر ہے جن سے ایک نئی شکل میں برطانوی اقتدار قائم رہے گا۔ حسن البنا مصر کے عوامی لیڈر کو ایک خطرناک سازش کے ذریعہ قتل کرا دیا گیا ہے اور فلسطین میں یہودی حکومت کو تسلیم کر لینے پر مصر کے حکمران طبقے کو آمادہ کر لیا گیا ہے۔ اب برطانیہ کے لئے راستہ صاف ہے۔ وہ کمیونزم کا خطرہ اچھال کر مصر سے جو شرائط چاہے منوائے گا۔''[51] نوائے وقت کا یہ اداریہ اس کے 24 ستمبر 1948ء کے اس اداریے سے مختلف تھا جس میں اس نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ''پوری دنیا سے اور بالخصوص جنوب مشرقی ایشیا سے کمیونزم کا جو سیلاب امڈ کر آ رہا ہے وہ زود یا بدیر پاکستان بھی پہنچے گا۔ اگر یہ ملک چین اور برما کے انجام یعنی خانہ جنگی، تباہی، بربادی اور ایک غیر ملکی آمریت کی غلامی سے بچنا چاہتا ہے تو اسے اپنے دفاعی استحکامات کی ابھی فکر کرنی چاہیے۔'' یعنی ستمبر 1948ء میں نوائے وقت کی رائے میں کمیونزم کے سیلاب کا خطرہ حقیقی تھا جبکہ اب اس کی رائے یہ تھی کہ برطانیہ مصر میں اپنا سامراجی مقصد پورا کرنے کے لئے اس خطرے کو اچھال رہا ہے۔

نوائے وقت کی رائے میں اس تبدیلی کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ مارچ 1949ء میں پنجابی شاونسٹوں اور وزیر اعظم لیاقت علی خان کی حکومت کے درمیان تضاد روز بروز شدت اختیار کر رہا تھا اور نوائے وقت نے ان پنجابی شاونسٹوں کے ترجمان کی حیثیت سے لیاقت علی خان کی اندرونی اور بیرونی پالیسی کی حمایت ترک کر دی تھی بلکہ وہ پنجاب کے حقوق کی تلفی کے حوالے دے کر لیاقت علی خان کی شدید مخالفت کرنے لگا تھا☆ دوسری وجہ یہ تھی کہ کشمیر میں یکم جنوری 1949ء کو جنگ بندی کے بعد پنجاب میں برطانیہ اور اس کی دولت مشترکہ کے خلاف سخت برہمی پائی جاتی تھی۔ عام تاثر یہ تھا کہ لیاقت علی نے برطانیہ کے دباؤ کے تحت جنگ بندی کی تجویز منظور کر کے پاکستان سے غداری کی ہے۔

برطانیہ اور اس کی دولت مشترکہ سے بیزاری کا جذبہ صرف پنجاب تک محدود نہیں تھا بلکہ پورے پاکستان میں برطانوی سامراج کے خلاف سخت نفرت پائی جاتی تھی۔ چنانچہ

☆ تفصیل کے لئے دیکھئے: پاکستان کی سیاسی تاریخ جلد 11 نفاذ اسلام کے نام پر مُلّائیت اور فرقہ واریت کا آغاز۔ ایڈیشن دوم۔ 2014ء۔ ادارہ مطالعہ تاریخ۔ لاہور۔ ص 259

21 مارچ کو ڈھاکہ میں پاکستان۔عرب کلچرل ایسوسی ایشن کے زیراہتمام ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے عبدالرحمٰن صدیقی نے اسلامی ممالک کی تخریب کے اسباب اور برطانیہ اور امریکہ کی ریشہ دوانیوں پر نکتہ چینی کی اور مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ تنگ نظر ملک پرستی کے جذبے کو چھوڑ کر اور لسانی اور جغرافیائی حدود کو نظرانداز کر کے اپنے آپ کو صرف ''ملت واحدہ'' کا فرد تصور کریں۔ اس نے کہا کہ اسلامی ثقافت کو وحدانیت، یعنی ایک خدا و پیغمبر اور قرآن کا تصور دوسرے کلچروں سے علیحدہ کرتا ہے اور خواہ مسلمان چینی ہو یا عرب وہ بحیثیت مسلمان ایک ہی ملت کا فرد ہے۔ اپنے حالیہ دورہ ترکی کے متعلق صدیقی نے کہا ''ترک اخبار اور ترک اپنی اس بات پر بڑے خوش تھے کہ انہوں نے امریکہ کی اعانت روس کے مقابلے میں حاصل کر لی۔ لیکن میں نے ان سے کہا کہ آپ لوگوں کی مدد سے اگر امریکہ دستکش ہو جائے اور روس کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر اس سے صلح کر لے تو استنبول پر دو دن میں روس کا جھنڈا لہرا جائے گا۔ یہی حال مصر کا ہے جہاں نقراشی پاشا مرحوم سویز اور سوڈان کے مسئلوں پر انگریزوں کا دست نگر رہا۔'' ابن سعود سے اپنی ملاقات کا حال بتاتے ہوئے صدیقی نے کہا ''والئی عرب نے فلسطین کے بارے میں کہا کہ میری پوری پوری ہمدردی فلسطین کے ساتھ ہے اور میرا دل مسجد اقصیٰ کے لئے روتا ہے لیکن برطانیہ نے میرے ملک کی مدد کی ہے اور اس امر کے پیش نظر میں برطانیہ کے ایما کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ اسی طرح چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے فرمانروا، جن میں ہز رائل ہائی نس اور ہز میجسٹی بھی شامل ہیں، لندن میں برطانیہ کے اشاروں پر ناچتے ہیں اور خود برطانیہ امریکہ کے سامنے دوزانو ہے جہاں یہودی اثر اور دماغ حکومت کے پیچھے کام کر رہے ہیں۔ فلسطین میں لارنس کا پس خوردہ کھانے والا نوری السعید پاشا عراق کا وزیراعظم ہے اور عبداللہ کا پشت پناہ ہے اور گلب پاشا، عبداللہ والئی شرق اردن کو اپنا مہرہ بنائے ہوئے ہے...... برطانیہ دنیائے اسلام کا سب سے بڑا دشمن رہا ہے اور آج بھی ہے۔ اس لئے آئندہ نسلوں کو برطانوی اثرات ختم کرنے کا بیڑا اٹھانا چاہیے۔ برطانیہ دوست بن کر مارتا ہے اور ایسی دوستی سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔''[52] گویا نوائے وقت اور عبدالرحمان صدیقی دونوں ہی کی رائے میں کیونزم یا سوویت یونین اسلام کا دشمن نہیں تھا بلکہ برطانیہ اسلام کا سب سے بڑا دشمن تھا اور اس کی دوستی سے پرہیز ضروری تھا۔

برطانوی وزیروں اور سرکاری نمائندوں کے پاکستان میں دورے اور جنوبی ایشیا میں کمیونزم کی لہر کو دبانے کے لئے پاکستان کا تعاون

لیکن کراچی میں وزیر اعظم لیاقت علی خان اور اس کے رفقا کی مذکورہ رائے نہیں تھی۔ وہ سوویت یونین اور اس کے کمیونزم کو ہی پاکستان اور اسلام کا سب سے بڑا دشمن تصور کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے مارچ 1949ء میں قرارداد مقاصد کی منظوری سے پہلے اور اس کے بعد تین انگریز لیڈروں کی پذیرائی کی۔ جو انگریز پہلے کراچی پہنچا وہ برطانیہ کا وزیر برائے بیرونی تجارت آرتھر باٹملے (Arthur Bottomley) تھا۔ وہ دہلی سے کراچی پہنچا تھا جہاں فروری کے آخری ہفتے میں برما میں کمیونسٹوں کی بغاوت کے بارے میں ایک غیر رسمی کانفرنس ہو چکی تھی۔ اس ''غیر رسمی'' کانفرنس میں ہندوستان، برطانیہ، آسٹریلیا اور لنکا کے نمائندوں نے شرکت کی تھی۔ پاکستان کو اس کانفرنس میں بلایا گیا تھا مگر وزارت خارجہ کے ایک ترجمان کے مطابق ''پاکستان کے کسی وزیر کے لئے اس میں شامل ہونا اس لئے ممکن نہیں تھا کہ ان دنوں مرکزی اسمبلی کا بجٹ سیشن ہو رہا تھا اور اس لئے بھی کہ یہ کانفرنس محض غیر رسمی و ابتدائی تھی۔ اس مسئلے پر رسمی بحث ہونے ہی والی تھی اور پاکستان اس میں شامل ہونے کا ارادہ رکھتا تھا۔''[53]

9 مارچ کو باٹملے نے دہلی سے کراچی پہنچ کر وزیر اعظم لیاقت علی خان اور وزیر خارجہ چودھری ظفر اللہ خان سے ملاقات کی اور پھر اس نے ایک انٹرویو میں کہا ''یہ پہلی مرتبہ ہے کہ آزاد ڈومینین جنوب مشرقی ایشیا میں ایک مشترکہ مسئلہ کا مقابلہ کرنے کے لئے جمع ہوئی ہیں۔ برما کی صورت حال پر دہلی کی کانفرنس میں مکمل باہمی اعتماد اور مفاہمت کا مظاہرہ ہوا ہے اور یہ بات جنوب مشرقی ایشیا کے مستقبل کی خوشحالی کے لئے بہت اچھی ہے۔''[54] اسی دن پاکستان کی وزارت خارجہ کا پریس نوٹ یہ تھا کہ نئی دہلی کے ایک حالیہ اعلان سے یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے کہ دولت مشترکہ کے بعض ممالک نے برما میں امن و امان بحال کرنے کے لئے بیچ بچاؤ کرانے کی پیشکش کی ہے۔ حکومت پاکستان یہ سمجھتی ہے کہ اس پیشکش کا مطلب یہ نہیں ہے کہ برما میں جو قوتیں بدامنی اور لاقانونیت پھیلا رہی ہیں انہیں تسلیم کر کے وہ پوزیشن دے دی جائے گی جو حکومت برما کو حاصل ہے۔ حکومت پاکستان کی رائے یہ ہے کہ برما کی حکومت قانونی طور پر قائم

شدہ آئینی اتھارٹی ہے اور ملک میں امن و امان بحال کرنے کی ذمہ داری صرف اسی کی ہے۔
حکومت پاکستان کا نقطہ نگاہ ہمیشہ یہی رہا ہے کہ اگر کسی ملک میں کوئی پارٹی یا گروپ حکومت کی پالیسیوں کے بارے میں غیر مطمئن ہو یا اپنی جائز شکایات کا ازالہ چاہتا ہو یا کوئی جائز نصب العین پورا کرنا چاہتا ہو تو اسے آئینی ذرائع اختیار کرنے چاہئیں۔ غیر آئینی ذرائع کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوت استعمال ہوتی ہے جس سے عوام کا بہت نقصان ہوتا ہے اور انہیں بڑی مصیبتیں درپیش ہوتی ہیں۔ لہٰذا ان کی مذمت ضروری ہے۔ حکومت پاکستان کی پالیسی یہ رہی ہے کہ وہ حکومت برما کی مکمل حمایت کرتی ہے اور اس کے ساتھ پوری طرح ہمدردی رکھتی ہے۔ جن عناصر نے حکومت کی اتھارٹی کے خلاف ہتھیار اٹھائے ہیں اگر وہ اپنی جائز شکایات کا ازالہ چاہتے ہیں یا کوئی جائز نصب العین پورا کرنا چاہتے ہیں تو وہ یہ سب کچھ آئینی اور پرامن ذرائع سے کر سکتے ہیں۔ حکومت پاکستان یہ سمجھتی ہے کہ بیچ بچاؤ کرانے کی جو پیشکش کی گئی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھائے ہیں انہیں ترغیب دی جائے گی کہ وہ گفت وشنید اور مصالحت کی راہ اختیار کریں۔ اس پیشکش کا مطلب حکومت برما کی اتھارٹی کی بیخ کنی نہیں ہے۔''[55]
وزیر خارجہ ظفر اللہ خان کی آرتھر باٹملے سے ملاقات کے بعد وزارت خارجہ کے اس پریس نوٹ کا مطلب یہ تھا کہ حکومت برطانیہ کو حکومت ہندوستان کی اس رائے سے اتفاق نہیں تھا کہ برما کی کمیونسٹ بغاوت کو پرامن طریقے سے فرو کیا جا سکتا ہے اور اس نے یہ بات خود کہنے کی بجائے پاکستان سے کہلوائی تھی۔ برطانیہ کا منصوبہ یہ تھا کہ چین، ملایا اور برما میں کمیونسٹ سیلاب کے سدباب کے لئے ایک ایشیائی علاقائی بلاک کی تشکیل کی جائے گی جو پاکستان، برما، لنکا، ہندوستان، انڈونیشیا، ملایا، فلپائن اور آسٹریلیا پر مشتمل ہوگا۔ اس وقت یہ منصوبہ ممکن العمل نظر آتا تھا کیونکہ حکومت ہندوستان کو اندرون ملک کمیونسٹوں کی بدامنی کا مسئلہ درپیش تھا اور روس کے کمیونسٹ ذرائع ابلاغ وزیر اعظم جواہر لال نہرو کو سامراجی پٹھو قرار دے کر یہ الزام عائد کرتے تھے کہ وہ ایشیا میں سوویت مخالف بلاک بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔
لاہور کے روزنامہ ''امروز'' کا اس صورتحال پر تبصرہ یہ تھا کہ ''آج انسانیت اور جمہوریت کے نعرے، فسطائیت کو دنیا کے سر پر ایک دفعہ پھر مسلط کرنے یعنی تیسری جنگ عالمگیر کے بیج بونے کے لئے لگائے جا رہے ہیں۔ ہندوستان اس جنگجو گروہ کی ہمنوائی کا ثبوت دے چکا

ہے۔ بعید از قیاس نہیں کہ پاکستان سے سعادت مندی کا ثبوت دینے کا مطالبہ کیا جائے۔ اگر ہم اس دام فریب میں آ گئے تو سب سے پہلے ہندوستان کے معاشی بحران اور اقتصادی بے چینی کو حل کرنے کے لئے پاکستان کو اپنے خام ذخائر پنڈت نہرو کی حکومت اور ہندوستانی سرمایہ داروں کی نذر کرنے ہوں گے۔ محاصل کے خاتمہ اور آزاد تجارت کی بحالی کی باتیں ابھی سے ہونے لگی ہیں۔ کوئی تعجب نہیں کہ مشرقی بنگال میں ہندوستانی فوجی چھاؤنی کا قیام اور کشمیر کی تقسیم اس سمت میں دوسرا قدم ہو۔ ہندوستانی پریس میں اسی نوعیت کے اشارے کنائے بہت پہلے ہو چکے ہیں۔ ہندوستان کے کمانڈر انچیف جنرل کریاپا مشرقی بنگال کی ''حفاظت'' کے لئے ہندوستانی فوجی امداد کی پیشکش کر چکے ہیں۔ ہندوستان کے وزیر تجارت اقتصادی اعتبار سے منقسم ہندوستان کو پھر متحد کرنے کی فکر میں ہیں۔ اہل پاکستان ایک نہایت ہی دشوار اور صبر آزما امتحان سے دوچار ہیں۔ ہم متنبہ کرتے ہیں کہ لاکھوں انسانوں نے اپنی جان، عزت اور آبرو قربان کر کے جو آزادی جیتی ہے حکومت کی ذرا سی لغزش اور عوام کی معمولی بے پرواہی اسے ہمیشہ کے لئے خطرہ میں ڈال سکتی ہے۔ اگر وزیر داخلہ کا یہ بیان صحیح ہے کہ پاکستان میں کمیونزم کا کوئی ''خطرہ'' نہیں ہے۔ اگر وزیراعظم کا یہ اعلان نیک نیتی اور دیانت پر مبنی ہے کہ پاکستان میں طبقاتی لوٹ کھسوٹ ختم کی جائے گی۔ اگر ہم حتیٰ الوسع اشتمالیت اور سرمایہ داری کے مابین اعتدال کا راستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں تو پاکستان کا مغربی یورپ کی جنگی تیاریوں، فاشی اور نیم فاشی نظریوں سے کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہندوستان، برطانیہ و دولت مشترکہ کی خارجہ پالیسی کی پابندی ضروری ہے۔ جو ملک جمہوری بنیادوں پر اپنی تعمیر کرے، جس کا اقتصادی نظام انصاف اور مساوات پر مبنی ہو وہاں خانہ جنگی، بدامنی یا انقلاب کا کوئی امکان پیدا نہیں ہوتا۔ علم بغاوت ان ممالک میں بلند ہوتا ہے جہاں احتجاج کے دستوری راستے محدود کر دیئے جائیں اور حاکم طبقہ کسی اصلاح و تبدیلی کی بجائے بیرونی امداد و مداخلت کے سہارے اپنے فرسودہ نظام کو برقرار رکھنے کی کوشش کرے۔ یہ تاریخی حقیقت ہے اور کوئی معاشرہ اس سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا جا سکتا۔'' [56]

امروز کے اس تبصرے کا پس منظر یہ تھا کہ حکومت ہندوستان نے فروری 1949ء میں ہندوستانی کمیونسٹوں کی گرفتاریوں کے لئے ملک گیر مہم شروع کر دی تھی۔ 20/فروری کی ایک اطلاع کے مطابق حکومت ہندوستان کی جانب سے اس کارروائی کی ایک وجہ یہ تھی کہ نئی دہلی میں

متعدد غیر ملکی سفارت خانوں نے ایشیائی ممالک میں کمیونسٹ صورتحال پر تشویش کا اظہار کیا تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ حکومت ہندوستان کی بار بار کی دعوت کے باوجود غیر ملکی سرمایہ کاری نہیں ہو رہی تھی کیونکہ خدشہ تھا کہ کمیونسٹوں کی ایجی ٹیشن کی وجہ سے ملک خلفشار کا شکار ہو جائے گا اور اس امر کا بھی امکان تھا کہ اگر حکومت ہندوستان نے کمیونسٹوں کے خلاف کوئی مؤثر کاروائی کر کے افراتفری اور خلفشار کے سدباب کی ضمانت نہ دی تو ورلڈ بینک بھی اطمینان کے ساتھ قرضہ نہیں دے سکے گا۔"[57] اسی دن ہندوستان کے سوشلسٹ لیڈر جے پرکاش نارائن کا دیناپور میں آل انڈیا ریلوے مینز (Railwaymens) فیڈریشن کی جنرل کونسل کے اجلاس میں الزام یہ تھا کہ "کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا صنعت اور حکومت میں انتشار پیدا کرنے لئے سرتوڑ کوشش کر رہی ہے۔ اس نے کہا کہ ایشیا میں کمیونسٹ پارٹیوں کی عمومی پالیسی یہ ہے کہ ہر شعبۂ زندگی میں افراتفری اور خلفشار پیدا کیا جائے۔ ہندوستان میں کمیونسٹوں کی جدوجہد کا مقصد یہ نہیں ہے کہ یہاں کمیونسٹ سٹیٹ قائم کی جائے بلکہ یہ جدوجہد محض اس لئے ہے کہ ہندوستان نے روس کی گود میں جانے سے انکار کر دیا ہے۔"[58] اور پھر 21 رفروری کی خبر یہ تھی کہ پولیس نے کلکتہ، احمد آباد، کالی کٹ، مدورا، لکھنؤ، مدراس اور حیدر آباد (دکن) میں سینکڑوں کمیونسٹوں کو گرفتار کر لیا ہے۔ ان میں سے بیشتر پر الزام یہ تھا کہ وہ 9 رمارچ کو ریلوے اور محکمہ ڈاک و تار میں ہڑتال کرانے کی کوشش کر رہے تھے۔

22 رفروری کو بمبئی اور کلکتہ میں مزید گرفتاریاں ہوئیں اور وزیر داخلہ سردار پٹیل کے بیان کے مطابق صرف تین دن میں گرفتار شدگان کی تعداد 600 تک پہنچ گئی تھی۔ 24 رفروری کو خبر یہ تھی کہ حیدر آباد (دکن) کے شمال مغرب میں نال گونڈا کے ضلع میں ایک ہزار کمیونسٹوں کو پکڑا گیا ہے اور وارنگل ضلع میں کمیونسٹوں اور ان کے ہمدردوں کا صفایا کر دیا گیا ہے۔ 26 رفروری تک ریاست حیدر آباد (دکن) کے علاقے سے گرفتار شدہ کمیونسٹوں کی تعداد 3932 تک پہنچ گئی تھی جبکہ کلکتہ اور اس کے گردونواح میں کمیونسٹ گوریلوں کی سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں۔ انہوں نے ڈم ڈم ہوائی اڈے، ڈم ڈم اسلحہ ساز فیکٹری، ایک برطانوی انجینئرنگ ورکشاپ اور دو پولیس تھانوں پر کامیاب حملے کئے تھے۔ ان دنوں ہندوستان بھر میں کمیونسٹ کارکنوں کی تعداد 50 ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔ تاہم ان کا کلکتہ، بمبئی، مدراس، احمد آباد، لکھنؤ اور بعض دوسرے بڑے شہروں

کے مزدوروں میں اور ریاست حیدر آباد (دکن) کے غریب کسانوں میں اچھا خاصا اثر تھا اور اس بنا پر وہ ہندوستان کے صنعتی اور زرعی شعبوں میں خاصی گڑبڑ پیدا کرنے کی پوزیشن میں تھے۔ ہندوستان کی وزارت داخلہ کا اندازہ یہ تھا کہ کمیونسٹوں کی اس گڑبڑ پر قابو پانے میں زیادہ سے زیادہ ایک سال کا عرصہ لگے گا۔ روزنامہ ڈان کے نامہ نگار خصوصی مائیکل ڈیوڈسن کی ایک رپورٹ کے مطابق "ہندوستان کی وزارت داخلہ کو یہ خدشہ نہیں تھا کہ چین کے کمیونسٹ اپنے انقلاب کی کامیابی کے بعد ہندوستان کے کمیونسٹوں کی امداد کریں گے۔ اسے خدشہ تھا تو صرف یہ تھا کہ ہندوستانی کمیونسٹ چین کے انقلاب کی کامیابی سے حوصلہ پا کر ازخود اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں گے لیکن حکومت کے لئے ان کی سرکوبی کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔"

ہندوستان کے اس سیاسی پس منظر میں جس دن برطانیہ کا وزیر برائے بیرونی تجارت آرتھر باٹملے دہلی سے کراچی پہنچا تھا اسی دن برطانیہ کے محکمہ دولت مشترکہ کا انڈر سیکرٹری پیٹرک گارڈن واکر (Patrick Gordon Walker) بھی لندن سے کراچی پہنچا تھا اور اس نے یہاں تقریباً ایک ہفتہ تک قیام کے دوران پاکستان کے ارباب اقتدار سے مختلف مسائل پر مفصل صلاح مشورہ کیا۔ 16/مارچ کو وہ نئی دہلی چلا گیا جہاں وہ تقریباً دو ہفتے ٹھہرنے کے بعد 2/اپریل کو پھر واپس کراچی آ گیا۔ جبکہ اس عرصے میں مزید دو برطانوی نمائندوں نے بھی دولت مشترکہ کے بعض دوسرے ممالک کا دورہ کیا۔ اگرچہ گارڈن واکر کا 16/مارچ کو کراچی میں بیان یہ تھا کہ برطانوی نمائندوں کا دولت مشترکہ کے ممالک میں ان غیر معمولی دوروں کا ایشیا میں کمیونزم کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن دراصل ان دوروں اور مشوروں کا واحد مقصد یہی تھا کہ اس خطرناک سیلاب کا کسی نہ کسی طرح سدباب کیا جائے۔ چنانچہ 17/مارچ کو امریکہ کے اخبار کرسچین سائنس مانیٹر کا اداریہ یہ تھا کہ "برطانیہ جنوب مشرقی ایشیا میں کمیونسٹ مخالف بلاک بنانے اور بحر ہند و بحر الکاہل کے علاقے میں دولت مشترکہ کے روابط کو مضبوط بنانے کا خواہاں ہے۔ اگر ہندوستان نے اس سلسلے میں امداد کی تو اس سے اس کو فائدہ پہنچے گا۔ اگرچہ اس امر کا امکان ہے کہ یہ منصوبہ صرف دولت مشترکہ کے ممالک تک ہی محدود نہیں رہے گا بلکہ امریکہ اس کا اہم ترین ستون ہوگا۔ تاہم اس کی بنیاد ایشیائی عوام کے باہمی تعاون سے ہی مہیا ہو سکتی ہے۔ وہ دور گزر چکا ہے جب برطانیہ، ہالینڈ اور فرانس مل جل کر اور امریکہ کی پشت پناہی سے ایشیا کے کسی

بڑے علاقے میں کوئی دفاعی نظام نافذ کر سکتے ہیں۔''[59] 23/مارچ کو ایک ممتاز پاکستانی لیڈر حسین شہید سہروردی کا کراچی میں انٹرویو یہ تھا کہ ''اگر ہندوستان اور پاکستان بین الاقوامی تصادم کے بھنور میں نہیں پھنسنا چاہتے جیسا کہ ان دونوں ملکوں کے زعما بار ہا اعلان کر چکے ہیں تو ان کے لئے واحد راستہ یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ قریبی تعاون کے ساتھ زندہ رہیں اور کام کریں۔ برصغیر کے دفاع کے لئے ایک مشترکہ دفاعی منصوبہ تیار کریں اور ایک دوسرے پر شک وشبہ ترک کر دیں۔'' [60]

مارچ کے آخری ہفتے میں برطانیہ کا سابق وزیر خارجہ انھونی ایڈن (Anthony Eden) نیوزی لینڈ، آسٹریلیا اور ہندوستان سے واپس انگلستان جاتے ہوئے تین چار دن کے لئے پاکستان میں بھی ٹھہرا۔ یہاں اس نے درہ خیبر دیکھا اور 26/مارچ کو کراچی واپسی پر اس نے ایک انٹرویو میں اس خبر کی تردید کی کہ اس کے دورۂ پاک و ہند کا مشرق میں کمیونسٹ مخالف محاذ بنانے سے کوئی تعلق ہے۔ اس نے یہ تردید کراچی میں پاکستان ٹائمز کے نامہ نگار خصوصی سے انٹرویو کے دوران کی تھی۔ اس نامہ نگار نے یہ سوال پوچھا تھا کہ کیا آپ کا مشن یہ ہے کہ اینگلو۔امریکی بلاک کے لئے حمایت حاصل کی جائے اور اس طرح کمیونسٹ مخالف محاذ قائم کیا جائے؟ وہ اس سوال پر کچھ گھبرا سا گیا۔ تاہم اس نے مسکراتے ہوئے نامہ نگار کو ٹال دیا اور کندھے جھٹکتے ہوئے کہا کہ ''میرے اس دورے کے بارے میں بہت سی افواہیں ہیں لیکن ان کی صداقت مشکوک ہے۔ میرا مشن یہ ہے کہ میں آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے دورے کے بعد واپس گھر جا رہا ہوں۔''[61] انھونی ایڈن برطانیہ کی کنزرویٹو پارٹی کا نہایت ممتاز اور بااثر لیڈر تھا۔ وہ دوسری جنگ عظیم کے دوران وزیراعظم چرچل کا وزیر خارجہ تھا اور آئندہ وزارت عظمیٰ کا امیدوار تھا۔ اس نے شمال مغربی صوبہ سرحد اور درہ خیبر کا دورہ محض سیر وتفریح کی غرض سے نہیں کیا تھا۔ اس کی پاکستان میں آمد سے تقریباً ایک ہفتہ قبل خبر یہ تھی کہ ''ایران میں کمیونسٹ ایجنٹوں کی سرگرمیوں اور روس کے ریڈیو پروپیگنڈا کی وجہ سے لندن میں بڑی تشویش پیدا ہو گئی ہے کیونکہ ایران میں کمیونسٹ گورنمنٹ کے قیام کا یا صرف تیل کے علاقوں کی علیحدگی کا مطلب یہ ہوگا کہ مغرب کو تیل کی سپلائی بند ہو جائے گی۔ تیل برطانیہ کے لئے ڈالر کمانے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔''[62]

ان دنوں پاکستان اور افغانستان کے تعلقات بھی بہت خراب تھے۔ اس کی فوری وجہ

یہ تھی کہ پاکستان کی ہوائی فوج نے 5 اور 6 / مارچ کو تقریباً 500 باغی قبائلیوں کو منتشر کرنے کے لئے وزیرستان کے ایک علاقے میں بمباری کی تھی جس کے بعد کابل ریڈیو سے پاکستان کے خلاف نہایت معاندانہ پروپیگنڈے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور اس بنا پر مارچ کے تیسرے ہفتے میں حکومت پاکستان نے حکومت افغانستان سے احتجاج کرتے ہوئے اس امر کی نشاندہی کی تھی کہ حکومت افغانستان کا ڈیورنڈ لائن کی دونوں اطراف کے قبائلیوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔[63]

25 / مارچ کو سوویت یونین کی افواج کے اخبار ریڈ سٹار میں شائع شدہ ایک مضمون کا خلاصہ یہ تھا کہ عراقی حکومت پر برطانیہ کے غلبہ کے باعث بھوک اور افلاس، اس ملک کی چالیس لاکھ آبادی کا مقدر بن گئے ہیں۔ تاہم وہاں جدوجہد آزادی تیز ہو رہی ہے۔ اس وقت 30 ہزار سے زائد افراد جیلوں یا بیگار کیمپوں میں ہیں اور کمیونسٹ لیڈروں کو گولی ماردی گئی ہے۔[64]

برطانوی راہنماؤں کے دوروں پر پاکستان کے صحافتی حلقوں کا ردعمل اور سوویت یونین کا اظہار تشویش

28 / مارچ کو انتھونی ایڈن پاکستان کے ارباب اقتدار سے تبادلہ خیالات مکمل کرنے کے بعد لندن روانہ ہو گیا تو اسی دن پاکستان ٹائمز نے ایشیا میں برطانوی سیاسی لیڈروں کی سرگرمیوں پر ایک اداریہ لکھا جس میں اس امر پر تشویش کا اظہار کیا گیا کہ ”معاہدہ اوقیانوس کی تفصیلات کے اعلان کے بعد برطانوی لیڈر ایشیا میں بھی اسی قسم کی بلاک سازی کے متمنی ہیں۔ یہ کہا جا رہا ہے کہ ہندوستان ایشیا کی قیادت کرے گا اور معاہدہ اوقیانوس کی طرح کے بحرالکاہل کے بلاک کی سربراہی کرے گا۔ ہندوستان دولت مشترکہ کے ذریعے بحیرہ اوقیانوس اور بحرالکاہل کے درمیان رابطہ قائم کرے گا۔ پنڈت نہرو نے اس خیال کی کوئی خاص مخالفت نہیں کی اور اب خاص فارمولا تیار ہو رہا ہے جس کے تحت ”ری پبلیکن انڈیا“ کو برطانوی دولت مشترکہ کے اندر یا کم از کم اس کے ساتھ رکھا جا سکے گا۔ غالباً اسی وجہ سے ایشیائی کانفرنس کو سامراجیت اور جارحیت کے خلاف ایشیائی عوام کی مخالفت کا مؤثر ہتھیار نہیں بنایا گیا تھا۔ پاکستان کسی صورت میں بھی ایسا منصوبہ منظور نہیں کرے گا جس کا مقصد یہ ہو گا کہ مشرق وسطیٰ اور جنوب مشرقی ایشیا میں حالات کو جوں کا توں رکھا جائے اور ایسی پالیسیوں کو فروغ دیا جائے جن کے تحت کروڑوں عوام آزادی سے

محروم رہیں۔ پاکستان کے قومی زعما اس پالیسی کا اعلان کر چکے ہیں اور عوام الناس اس کی پوری تائید کرتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ پاکستان کے وزیر اعظم مستقبل قریب میں ہونے والی دولت مشترکہ کانفرنس میں اپنے ملک کی اس پوزیشن کی وضاحت کر دیں گے اور ہمیں یہ بھی امید ہے کہ اس کانفرنس کے مقاصد اور نتائج پر مبہم اعلانات کے ذریعے پردہ نہیں ڈالا جائے گا جیسا کہ گزشتہ کانفرنس کے موقع پر کیا گیا تھا۔'' [65]

مارچ کے آخری ہفتے میں ماسکو کے ہفت روزہ ''نیو ٹائمز'' نے بھی پاکستان میں برطانوی لیڈروں کی سرگرمیوں کا نوٹس لیا اور الزام عائد کیا کہ برطانیہ پاکستان میں افغان سرحد کے قریب فوجی اڈے تعمیر کر رہا ہے اور امریکہ افغانستان میں ہوائی اڈوں کی تعمیر اور وہاں کی سیاسی واقتصادی زندگی پر غلبہ پانے کے لئے سخت بے تاب ہے۔ یکم اپریل کو کراچی کے آزاد پاکستانی حلقوں نے نیو ٹائمز کے اس الزام کی تردید کی اور کہا کہ ''ان شر انگیز خبروں میں صداقت کا شمہ بھر بھی موجود نہیں۔ کراچی کے امریکی حلقوں نے بھی روسی جریدے کی اس خبر کو غلط بتایا۔ ان حلقوں کا بیان یہ تھا کہ ''یہ محض پروپیگنڈا اسٹنٹ ہے۔ ہم افغانستان میں کسی نوعیت کی عسکری کاروائی کے خواہاں نہیں۔ افغانستان میں چند پرائیوٹ امریکن فرمیں تعمیر کا کام کر رہی ہیں۔ جن میں سے صرف ایک کو بڑی فرم کا نام دیا جا سکتا ہے۔'' [66] کراچی کے ذمہ دار پاکستانی اور امریکی حلقوں کے یہ تردیدی بیان نوائے وقت کے 3/اپریل کے شمارے میں شائع ہوئے لیکن اس کے ساتھ ہی ایک ادارتی تبصرہ شائع ہوا جس کے آخر میں کہا گیا تھا کہ ''برطانوی حکومت کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ انگریزوں نے جس بدنصیب ملک کی سرزمین کو اپنے فوجی اڈے بنانے کے لئے منتخب کیا وہ ہمیشہ کے لئے پیر تسمہ پا بن کر اس کی گردن پر سوار ہو گئے۔ شرق اردن، مصر اور ایران کی مثالیں تو بالکل ہمارے سامنے ہیں اور زیادہ پرانی بھی نہیں۔'' [67] نوائے وقت کا یہ اداریہ بالکل صحیح تھا، اگرچہ اس میں عراق، شام اور ترکی کے نام نہیں لئے گئے تھے۔ جنوری 1949ء میں نوری السعید پاشا کی حکومت کے قیام کے بعد وہاں برطانیہ کا مکمل غلبہ قائم ہو گیا تھا۔ شام میں 30/مارچ کو ایک فوجی انقلاب کے ذریعے ایک آمرانہ حکومت قائم ہو گئی تھی جو امریکہ اور برطانیہ کی پٹھو تھی اور ترکی نے معاہدہ اوقیانوس پر دستخط کرنے سے تین دن قبل اسرائیل کی حکومت کو تسلیم کر لیا تھا۔

نوائے وقت کے اس صحیح اداریے کا پس منظر یہ تھا کہ تنازعہ کشمیر کے بارے میں

حکومت برطانیہ کی ہندوستان کے حق میں پالیسی کے باعث پنجاب میں برطانیہ اوراس کی دولت مشترکہ کے خلاف جذبات بہت برہم تھے۔ پنجاب کا تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ برطانوی لیڈروں کی ان کوششوں پر بھی بہت ناراض تھا جو وہ ہندوستان کو ایشیا کا لیڈر بنانے کے سلسلے میں کر رہے تھے۔ مزید برآں پنجابی شاونسٹوں میں لیاقت علی خان کے ہاتھوں ''پنجاب کی تذلیل'' پر بھی بہت غصہ تھا۔ لہٰذا وہ لیاقت علی خان کی ہر داخلی اور خارجی پالیسی کی مخالفت کرتے تھے۔

تاہم روزنامہ ڈان نے اس موضوع پر جو اداریہ لکھا اس میں برطانیہ کے خلاف کچھ نہیں کہا گیا تھا اور یہ رائے ظاہر کی گئی تھی کہ نیو ٹائمز کا یہ الزام محض عالمی سرد جنگ کی تلخی کی پیداوار ہے۔ ''چونکہ کچھ عرصہ سے ایسی باتیں اور سرگرمیاں جاری ہیں کہ مشرق کو روسی اثر یا کمیونسٹ مداخلت یا کھلی جارحیت سے بچانے کے لئے ایشیا میں معاہدہ اوقیانوس کی قسم کا کوئی بلاک بنایا جائے گا اور چونکہ اس سلسلے میں معاہدہ بحرالکاہل یا علاقائی دفاع کے بارے میں بھی کچھ نیم پختہ خیالات کا اظہار کیا گیا ہے اور یہ امید ظاہر کی گئی ہے کہ ہندوستان اور پاکستان اس میں کوئی کردار ادا کریں گے اس لئے نیو ٹائمز نے چوزے گننے شروع کر دیئے ہیں حالانکہ مرغی نے ابھی انڈے دینے پر بھی آمادگی کا کوئی اظہار نہیں کیا ہے۔''[68]

باب: 4

لیاقت کا دورۂ برطانیہ و مشرق وسطیٰ، اینگلو۔امریکی سامراج کے حق میں اسلامی بلاک وضع کرنے کی ابتدائی کوشش

معاہدہ بحر اوقیانوس پر مغربی طاقتوں کے دستخط اور پاکستان میں اسلام کے حوالے سے سوویت یونین کے خلاف پروپیگنڈا

4/اپریل 1949ء کو واشنگٹن میں برطانیہ، فرانس، بلجیئم، نیدرلینڈز، اٹلی، پرتگال، ڈنمارک، ناروے، امریکہ اور کینیڈا کے وزرائے خارجہ نے معاہدہ اوقیانوس پر دستخط کئے تو عالمی سرد جنگ کی شدت میں مزید اضافہ ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی پاکستان کے قوم پرست حلقوں میں یہ خدشہ پیدا ہوگیا کہ لیاقت علی خان کی سامراج نواز حکومت پاکستان کو اس سرد جنگ کی لپیٹ سے محفوظ نہیں رکھ سکے گی۔ لیاقت علی خان اپنی خارجہ پالیسی کی تشکیل کے سلسلے میں وزیر خارجہ چودھری ظفر اللہ خان، سیکرٹری محکمہ خارجہ سر اکرام اللہ، وزیر خزانہ غلام محمد اور محکمہ دفاع کے سیکرٹری اسکندر مرزا وغیرہ کے مشوروں پر انحصار کرتا تھا اور انگریزوں کے پروردہ، اعلیٰ سرکاری افسر سوویت یونین کے ساتھ دوستی کو گناہ کبیرہ تصور کرتے تھے۔ چنانچہ حکومت پاکستان کی جانب سے معاہدہ اوقیانوس پر کوئی تبصرہ نہ کیا گیا اور اس طرح بالواسطہ طور پر اس معاہدے کی تائید کی گئی جبکہ ہندوستان کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو کو بھی اس معاہدہ پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ 5/اپریل کو پارلیمنٹ میں اس کا اس مسئلے پر بیان یہ تھا کہ "ہندوستان بحر اوقیانوس کے علاقے سے بہت دور ہے اور حکومت ہندوستان معاہدہ اوقیانوس سے متاثر نہیں ہوگی۔"[1]

7/اپریل کو نوائے وقت نے بھی سوویت یونین کے خلاف مغربی طاقتوں کے اس فوجی گٹھ جوڑ کی بالواسطہ طور پر تائید کی۔ اس نے برطانوی خبر رساں ایجنسی "سٹار" کی یہ خبر شائع کی کہ "پس آہن کے 20 مسلمان جو اس وقت برطانیہ میں جلاوطن ہیں اپنا زیادہ سے زیادہ وقت روس میں اپنے ہم مذہبوں کی کیفیت اور ان کی جائے رہائش کا پتہ چلانے میں صرف کیا کریں گے۔ شمالی قفقاز اور کریمیا کے 20 لاکھ مسلمانوں کے متعلق جو معمولی سی اطلاع ہے وہ قطعی غیر تسلی بخش ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی ایک بڑی تعداد کو یا تو کنسنٹریشن کیمپوں میں رکھا گیا ہے یا غلاموں کے کارخانوں میں بھیج دیا گیا ہے کیونکہ وہ مارکسزم کی بجائے قرآن پاک کو ترجیح دیتے ہیں۔"[2] اس خبر کا مطلب بالکل واضح تھا۔ یعنی یہ کہ سوویت یونین کو اسلام کا دشمن ظاہر کر کے پاکستانی مسلمانوں کی نظر میں نہ صرف معاہدہ اوقیانوس کو جائز ثابت کیا جائے بلکہ مشرق وسطیٰ اور جنوب مشرقی ایشیا میں اسی قسم کے معاہدوں کے لئے رائے عامہ ہموار کی جائے۔ اس خبر کی ضرورت اس لئے بھی محسوس کی گئی تھی کہ جس دن واشنگٹن میں معاہدہ اوقیانوس پر دستخط ہوئے تھے اسی دن پیرس میں دنیا کے روس نواز دانشوروں کی منعقدہ کانفرنس کا ایک منشور شائع ہوا تھا جس میں دنیا بھر کے عوام سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ ان سامراجیوں کی ریشہ دوانیوں سے ہوشیار اور چوکس رہیں۔ اس منشور میں مزید کہا گیا تھا کہ "جنگ کے کالے بادل نہایت تیزی سے ہمارے سروں پر چھا رہے ہیں۔ بہت سے ممالک میں وہاں کے سیاست دان، اخبارات اور ریڈیو کے ذریعے نفرت و دشمنی کا پرچار کر رہے ہیں اور نئی جنگ شروع کرنے کی شہ دے رہے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد ہر ایک ملک کا فرض تھا کہ وہ اپنی مسلح فوجوں اور ہتھیاروں میں تخفیف کرتا لیکن سامراجی ممالک اندھادھند اسلحہ بندی کر رہے ہیں اور اپنے جارحانہ منصوبوں کی تکمیل کے لئے فوجی بلاک بنا رہے ہیں۔ دنیا کے مختلف حصوں میں غیر ملکی حکومتوں اور ان کی مسلح فوجوں کی براہ راست مداخلت کی وجہ سے خانہ جنگی کی آگ بھڑک اٹھی ہے۔" اس منشور کے آخر میں اعلان کیا گیا تھا کہ "ماہ رواں میں امن کے حامیوں کی ایک عالمگیر کانگرس منعقد کی جائے گی۔ اس کانگرس میں شرکت کے لئے مزدور سبھاؤں، خواتین وطلبا کی انجمنوں، کسان سبھاؤں، دانشوروں، سائنس دانوں، ادیبوں، صحافیوں اور فنکاروں کی جماعتوں کے نمائندوں کو دعوت دی گئی ہے۔ اس کانگرس میں دنیا کے کروڑوں لوگوں کی اس خواہش کا بھرپور اظہار کیا جائے گا کہ وہ جنگ نہیں چاہتے۔"[3]

سرحد کے سابق انگریز گورنر سر اولف کیرو کی تجویز کہ اوقیانوس طاقتوں کے مفاد کی خاطر استنبول سے کراچی تک نئی گروہ بندی کی ضرورت ہے...... نوائے وقت کی تائید

8 اپریل کو پاکستانی اخبارات میں صوبہ سرحد کے سابق گورنر سر اولف کیر (Olaf Caroe) کی ایک تقریر شائع ہوئی جو اس نے دو ایک دن قبل لندن میں کی تھی۔ اس تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ ''ہندوستان کے تحفظ کا انحصار خوفناک حد تک پاکستان کے استحکام پر ہے۔ اب پاکستان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ ان سارے دفاعی مسائل کی پہلی ضرب برداشت کرے جو پرانے ہندوستان کو شمال مغربی علاقے میں درپیش ہوا کرتے تھے۔ اب پاکستان کے لئے لازمی ہے کہ وہ تن تنہا یا دوسروں کے ساتھ مل کر بحر ہند کے تھیٹر کے دونوں دروازوں کی چوکیداری کرے۔ پہلا دروازہ ایران اور خلیج فارس کی طرف کھلتا ہے اور اس میں بحری اور بری داخلہ کراچی اور کوئٹہ کے ذریعہ ہوتا ہے۔ دوسرا دروازہ پشاور اور کابل کی جانب کھلتا ہے۔ اس امر کا امکان ہے کہ ان بری راستوں کی وجہ سے پاکستان کے لئے جلدی ہی مشکلات پیدا ہو جائیں۔ پٹھان کافی عرصہ سے کوئی اپیل نہیں سنتے اور ان کی لاقانونیت روس کے لئے مواقع مہیا کرتی ہے اگر پٹھانوں کو ہوشیاری کے ساتھ گمراہ کیا جائے تو وہ پاکستان اور اس کے عقبی علاقوں کو بہت نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ افغانستان اور ایران دونوں ہی کی سرحدوں پر سوویت یونین کی ''ثقافتی'' جمہوریتیں موجود ہیں۔ ان جمہوریتوں کے لوگ اسی نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس نسل سے کہ افغانستان اور ایران کے سرحدی لوگوں کا تعلق ہے۔ سوویت یونین کی ثقافتی انضمام کی پالیسی دراصل ففتھ کالم پیدا کرنے کی پالیسی ہے۔ خلیج فارس کی حیثیت سارے ایشیا اور ساری مسلم ورلڈ کے سٹریٹیجک سنٹر کی ہے۔ اس علاقے کا تحفظ نہ صرف پاکستان اور ہندوستان کے لئے بلکہ مہذب دنیا کے لئے ضروری ہے۔ شمال مغرب میں خلیج فارس اور بین المملکتی سرحد خطرات کے مقامات ہیں اور مشرق میں برما اور ملایا میں خطرہ ہے۔ خطرہ کے یہ مقامات اس علاقے کے گردونواح میں ہیں۔ اگر طاقت کا علاقہ خود مضبوط اور مستحکم ہو تو علاقائی گروپنگ کے ذریعے گردونواح کو قابو میں رکھا جا سکتا ہے۔ اس گروپنگ کا مرکز دہلی میں ہو سکتا ہے جیسا کہ برطانوی عہد میں ہوا کرتا تھا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ استنبول

سے کراچی تک اوراس سے آگے کے علاقے میں، جسے مشرق وسطیٰ کہتے ہیں، استحکام برقرار رکھنے کے لئے ایک نئی گروہ بندی کرنا پڑے۔ مسلم ممالک کے درمیان معاہدہ سعدآباد اور عرب لیگ بے سود ثابت ہوئے ہیں۔ چونکہ اس علاقے میں تیل اور مواصلات کی وجہ سے اوقیانوس طاقتوں کے مفادات بہت زیادہ ہیں اس لئے ان کا فرض ہے کہ وہ اس قسم کی گروپنگ کو مؤثر بنانے کے لئے اس کی پشت پناہی کریں۔ علاقائی طاقتوں کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ وہ مؤثر دفاع میں اپنا کردار ادا کرنے کے لئے فوجی اڈے مہیا کریں۔"[4]

ظاہر ہے کہ سر اولف کیرو کی اس تقریر میں تجویز یہ تھی کہ دریائے نیل سے لے کر دریائے میکانگ تک کے ایشیائی علاقے کو کمیونزم سے محفوظ رکھنے کے لئے اور اس علاقے میں مغربی مفادات کے تحفظ کے لئے دہلی کو مرکز بنا کر ایک یا ایک سے زیادہ فوجی بلاک بنائے جائیں۔ پاکستان کے ان دنوں کے حالات میں یہ توقع بے جا نہیں تھی کہ چونکہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان قومی تضاد اتنا شدید ہے کہ بیشتر پاکستانی عوام ہندوستان کو اپنا سب سے بڑا قومی دشمن سمجھتے ہیں، چونکہ اینگلو امریکی بلاک نے کشمیر اور فلسطین کے بارے میں عالم اسلام سے دغابازی کی ہے اور چونکہ برطانیہ اور امریکہ نے ترکی، ایران، شرق اردن، مصر، عراق اور دوسرے مسلم ممالک کو اپنا طفیلی بنا رکھا ہے اس لئے نوائے وقت جیسا "مسلم حریت پسند" اخبار سر اولف کیرو کی اس سامراجی تجویز کی تائید نہیں کرے گا۔ ماضی میں یہ اخبار کم علم و کم فہم مسلم شاؤنسٹوں کی ترجمانی کرتے ہوئے اینگلو۔ امریکی بلاک اور سوویت بلاک سے الگ ایک آزاد و خودمختار تیسرا اسلامی بلاک بنانے کے حق میں تھا اور یہ خواب دیکھتا تھا کہ دنیا کا طاقتی توازن تیسرے اسلامی بلاک کے پاس ہوگا۔ لیکن اب معاہدہ اوقیانوس کی تکمیل کے بعد عالمی سرد جنگ بہت شدید ہوگئی اور مغربی طاقتوں نے اسی قسم کے سوویت مخالف گٹھ جوڑ کے لئے ایشیا کی طرف توجہ کی تو نوائے وقت کی "مسلم حریت پسندی" کا جنازہ نکل گیا۔ چنانچہ سر اولف کیرو کی تقریر پر اس اخبار کا ادارتی تبصرہ یہ تھا کہ "سر اولف کیرو کی عمر کا بڑا حصہ ہندوستان میں گزرا ہے۔ وہ برسوں گورنمنٹ آف انڈیا کے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ میں رہے ہیں، سرحد کا گورنر مقرر ہونے سے پہلے آپ بلوچستان میں چیف کمشنر تھے۔ آپ حکومت ہند میں محکمہ خارجہ کے سیکرٹری بھی رہے۔ اپنی ان حیثیتوں میں انہیں نیم براعظم ہندوپاک کے دفاعی مسائل کا گہرا مطالعہ کرنے کا موقع ملتا رہا

ہے اور ان کا یہ تجزیہ غلط نہیں کہ ہندو پاکستان کے دفاع کے نقطہ نظر سے پاکستان کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ شمال مغرب میں تو دفاع کی پوری ذمہ داری پاکستان پر ہے اور سر اولف کیرو نے بالکل درست کہا ہے کہ مسئلہ محض وزیرستان کا نہیں پورے مشرق وسطیٰ کے دفاع کا ہے اور اس کو کامیابی سے حل کرنے کے لئے جو منصوبہ بھی بنایا جائے اس میں سب سے زیادہ اہمیت پاکستان کو ہی حاصل ہوگی۔ ادھر مشرق میں بھی چین کے بعد برما سے کمیونزم کا جو سیلاب آرہا ہے اس کو روکنے کے لئے مشرقی پاکستان کا استحکام بے حد ضروری ہے۔ اولف کیرو نے اپنی تقریر میں خاص طور پر امریکہ اور برطانیہ کو ان کی ذمہ داریاں یاد دلانے کی کوشش کی ہے۔ دیکھیں اس یاددہانی کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ اس وقت تک تو صورتحال یہ ہے کہ معاملہ خواہ کشمیر کا ہو یا سامان حرب کا، برطانوی حکمت عملی پاکستان کو مضبوط بنانے کی بجائے اسے کمزور کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ سر اولف کیرو کا انتباہ کس حد تک مؤثر ثابت ہوتا ہے۔"[5]

گویا اب نوائے وقت اینگلو۔ امریکی سامراج کے زیر سایہ سوویت مخالف گٹھ جوڑ پر آمادہ تھا۔ اس کی شرط صرف یہ تھی کہ امریکہ اور برطانیہ پاکستان کی اہمیت کا احساس کر کے اس کے بارے میں اپنی ذمہ داریاں پوری کریں۔ "پاکستان کی اہمیت" سے اس اخبار کی مراد کیا تھی؟ اس کی وضاحت اس نے 14 راپریل کو اپنے ایک اداریے میں کی جس میں اس نے امریکی سینیٹ کے ایک ممبر ہربرٹ ہمفری پر نکتہ چینی کی کیونکہ اس نے سینیٹ میں تقریر کرتے ہوئے اس امر پر زور دیا تھا کہ جس طرح امریکہ یورپ کے ملکوں کو امداد دے رہا ہے اسی طرح ہندوستان کو بھی امداد دی جائے۔ نوائے وقت نے لکھا کہ "مسٹر ہمفری کا استدلال یہ ہے کہ کمیونزم کے خطرے کو روکنے کے لئے ہندوستان کی حیثیت و اہمیت فرنٹ لائن کی سی ہے۔ ہندوستان ایک بڑا ملک ہے اور اس کے لیڈر ہمارے دور کے سب سے عظیم اور عقلمند آدمی ہیں۔ ہندوستان جنوب مشرقی ایشیا کے آزاد علاقوں کی نمائندگی کرتا ہے اور ایشیا کے تحفظ کی خاطر اس کا استحکام ضروری ہے...... مسٹر ہمفری نے صاف لفظوں میں چین کا ذکر کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ چین اب ایک معمہ ہے اور اس کے مستقبل کے بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں جا سکتی۔ ہندوستان کے حالات چین سے بالکل مختلف ہیں اور اسے جو امداد دی جائے گی وہ ضائع نہیں جائے گی۔ ہندوستان دوسری جنگ عظیم میں جمہوریتوں کے دوش بدوش لڑا۔ اس لئے اب ہم امن عالم کے لئے جو جمہوری کونسل بنا رہے ہیں ہندوستان کو بھی

اس کا ممبر بنانا چاہیے...... ہم یہ بات اتنی مرتبہ لکھ چکے ہیں کہ اب اس کا دہرانا محض تضیع اوقات معلوم ہوتا ہے کہ چین میں چیانگ کائی شیک کے زوال کے بعد برطانیہ وامریکہ کے خداوندان قضا وقدر کا ایشیا اور ہندوستان کے متعلق نظریہ بدل گیا ہے اور اب ان کی کوشش یہ ہے کہ ہندوستان کو سیاسی، مالی اور فوجی مدد دے کر ایشیا کا لیڈر بنا دیا جائے۔ ہندوستان کی اس نئی اہمیت کے احساس نے اینگلو۔امریکن سیاست دانوں کو اس قدر مرعوب کر رکھا ہے کہ وہ ہندوستان کے ہمسایہ ملک پاکستان کی اہمیت کو بالکل نظر انداز کر گئے ہیں۔کیا حکومت پاکستان ایسے ذرائع اختیار کرے گی جو امریکہ اور برطانیہ پر یہ واضح کر سکیں کہ ہندوستان جنوب مشرقی ایشیا کے آزاد لوگوں کا نمائندہ یا لیڈر نہیں اور دوسری جنگ عظیم میں صرف ہندوستان ہی جمہوریتوں کے دوش بدوش نہیں لڑا تھا بلکہ سب سے زیادہ قربانی پاکستان کے جوانوں نے ہی دی تھی اور تیسری جنگ عظیم کی صورت میں بھی مشرق ومغرب دونوں جانب سے برصغیر ہندو پاکستان کے دفاع کی اصل اور ابتدائی ذمہ داری پاکستان پر ہی ہے۔ برطانیہ اور امریکہ ہندوستان کو جو امداد چاہیں دیں لیکن اگر یہ امداد پاکستان کے لئے خطرے کا موجب بننے والی ہو تو پاکستان کو اینگلو۔امریکن۔انڈین دوستی کا یہ ڈرامہ چپ چاپ نہیں دیکھتے رہنا چاہیے۔"[6]

اسی اداریے سے یہ بات واضح تھی کہ نوائے وقت نے یہ یقین تو کر لیا تھا کہ سوویت یونین پاکستان کا دشمن ہے لہٰذا تیسری عالمگیر جنگ میں پاکستان اینگلو۔امریکی بلاک کا ساتھ دے گا۔لیکن وہ اس کی قیمت مانگتا تھا اور مطلوبہ قیمت یہ تھی کہ پاکستان کو عالم اسلام کا لیڈر مانا جائے اور اس کو ہندوستان کے مساوی درجہ دے کر اس کو اتنی ہی امداد دی جائے جتنی کہ ہندوستان کو دی جانے والی ہے۔لیکن پاکستان میں اس مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے عناصر کی بدقسمتی یہ تھی کہ اس وقت تک برطانیہ اور امریکہ مشرق وسطیٰ کے لئے جس دفاعی منصوبہ پر غور کر رہے تھے اس میں یونان، ترکی، اور عرب ممالک تو شامل تھے لیکن پاکستان شامل نہیں تھا۔ پاکستان کو وہ ہندوستان کی زیر قیادت مجوزہ سوویت مخالف ایشیائی بلاک کے ساتھ نتھی کرتے تھے۔

یہ پاکستانی عناصر امید لگائے ہوئے تھے کہ اب جبکہ جون 1947ء کے مارشل پلان کے تحت یورپ کی معاشی بحالی ہو گئی ہے اور یورپ کے دفاع کے لئے فوجی گٹھ جوڑ بھی کر لیا گیا ہے تو امریکہ ایشیا میں بھی اسی طرح کے معاشی اور فوجی منصوبوں پر عمل کرے گا۔ وہ مشرق وسطیٰ کے

لئے جو منصوبے بنائے گا ان میں پاکستان کو کلیدی پوزیشن حاصل ہوگی اور اس بنا پر اسے بہت مالی امداد ملے گی۔ مگر ایسا نہ ہونا تھا اور نہ ہوا۔ اینگلو۔ امریکی بلاک پاکستان کو ہندوستان کے مساوی درجہ نہ دے سکتا تھا اور نہ اس نے دیا۔

دولت مشترکہ کانفرنس میں ہندوستان کو زیادہ اور پاکستان کو کم اہمیت دی گئی......مگر لیاقت برطانوی سرپرستی میں اسلامی بلاک وضع کرنے کی پالیسی پر گامزن رہا

اس تلخ حقیقت کا مظاہرہ اپریل کے آخری ہفتے میں لندن میں ہوا جبکہ دولت مشترکہ کانفرنس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ اگرچہ ہندوستان اپنے نئے آئین کے تحت جمہوریہ بن گیا ہے تاہم وہ دولت مشترکہ میں شامل رہے گا۔ کانفرنس کا مزید یہ فیصلہ تھا کہ دولت مشترکہ کے رکن ممالک برما کو کمیونسٹوں کے خلاف مالی اور فوجی امداد دیں گے۔ اس مقصد کے لئے ایک امدادی کمیٹی بنائی جائے گی جو رنگون میں متعینہ ہندوستان، پاکستان، لنکا اور برطانیہ کے سفیروں پر مشتمل ہوگی۔ کانفرنس کے فیصلوں میں تنازعہ کشمیر کے تصفیہ کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں تھا اور نہ ہی اس قسم کا کوئی فیصلہ تھا کہ مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک کا ایک بلاک بنایا جائے گا جس کا لیڈر پاکستان ہوگا۔ پاکستان کے وزیراعظم لیاقت علی خان کو حکومت برطانیہ کے اس رویے سے بظاہر بہت مایوسی ہوئی۔ چنانچہ اس نے 29 را پریل کو لندن میں ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ برطانیہ میں پاکستان کو گھڑے کی مچھلی تصور کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ اگر برطانیہ اور دولت مشترکہ کا کوئی دوسرا ملک ایسا ہی کرتا رہا تو یہ بہت بڑی غلطی ہوگی۔ پاکستان دولت مشترکہ کے نصب العین کی تکمیل کے لئے اپنا کردار ادا کرنے کو تیار ہے لیکن خیمہ بردار کی حیثیت سے نہیں۔ پاکستان کے عوام مٹی کے مادھو نہیں ہیں۔ پاکستان کے آٹھ کروڑ عوام گوشت اور ہڈیوں کے بنے ہوئے ہیں اور ان کی رگوں میں بڑا طاقتور خون ہے۔ اس نے کہا کہ پاکستان کے سارے مسلم ممالک کے ساتھ بڑے قریبی تعلقات ہیں لیکن ان کے ساتھ اس کا کوئی خفیہ معاہدہ نہیں ہے۔ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے اس نے مزید کہا کہ پاکستان میں کمیونزم کا کوئی وجود نہیں۔ لیکن پاکستان کی جغرافیائی پوزیشن ایسی ہے کہ جب ہمسایہ ممالک میں کمیونسٹوں کے خلاف کوئی کاروائی

ہوتی ہے تو وہ مشرقی پاکستان میں گھس آتے ہیں۔ میرا ایمان ہے کہ کوئی مسلم ملک کمیونزم کے لئے زرخیز نہیں ہوسکتا بشرطیکہ اس ملک میں معاشرتی انصاف کے پروگرام پر عمل ہوتا ہو۔ کسی مملکت کی پالیسی کی روحانی بنیاد ہونا ضروری ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں کمیونزم کا مسئلہ درپیش نہیں ہے اور امید ہے کہ پاکستان آئندہ بھی اس قسم کے اثرات سے مبرا رہے گا۔''[7] 3رمئی کو اس نے لندن کی اسلامک کلچرل سنٹر کی استقبالیہ تقریب میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''پاکستان نہ تو سرمایہ دارانہ ریاست ہوگی اور نہ ہی کمیونسٹ ریاست ہوگی۔ اس کی بنیاد اسلامی معاشرتی انصاف کے اصولوں پر ہوگی جن کے تحت نجی سرمایہ کاری، نجی حقوق اور انفرادی آزادی کی اجازت ہے لیکن سرمایہ دارانہ استحصال کی اجازت نہیں ہے۔''[8]

6رمئی کو لیاقت علی خان لندن سے قاہرہ روانہ ہوا تو ہوائی اڈے پر اس نے ڈان سے انٹرویو کے دوران کہا کہ ''میں پاکستان کے عوام کی نیک خواہشات لے کر قاہرہ، بغداد اور تہران جا رہا ہوں۔ میں جب بھی مشرق وسطیٰ کے ممالک کے مسلمان بھائیوں سے ملتا ہوں تو مجھے خوشی ہوتی ہے۔ جب دولت مشترکہ کانفرنس کے بارے میں اس سے پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ آج دراصل جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ اکٹھے ہوں اور اکٹھے کام کریں۔''[9]

پاکستان کے عوامی وصحافتی حلقوں کی جانب سے برطانیہ سے بدظنی اور روس کی طرف جھکاؤ کا اظہار

لیاقت علی خان کے اس قسم کے بیانات پاکستانی عوام کے لئے اطمینان بخش نہیں تھے وہ برطانیہ اور اس کی دولت مشترکہ سے پہلے ہی مایوس و بیزار تھے اور اب جبکہ دولت مشترکہ کانفرنس میں ہندوستان کو بہت اہمیت دی گئی اور پاکستان سے ایسا سلوک کیا گیا کہ وہ گھڑے کی مچھلی اور حاشیہ بردار ہے تو پاکستانیوں میں برطانیہ اور دولت مشترکہ کے بارے میں جو مایوسی پائی جاتی تھی اس میں بہت اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ جب 7رمئی 1949ء کو ہندوستان کے وزیراعظم جواہر لال نہرو نے بمبئی میں انکشاف کیا کہ اس نے اکتوبر کے مہینے میں امریکہ کا دورہ کرنے کی دعوت قبول کر لی ہے تو روزنامہ ''ڈان'' کا ادارتی مطالبہ یہ تھا ''پاکستان کی سول انتظامیہ میں سے برطانوی عناصر کو نکالا جائے اور مسلح افواج میں سے بھی ایسے انگریزوں کی چھٹی کی جائے جن کی

جگہ پاکستانی کام کر سکتے ہیں۔ جن عہدوں پر غیر ملکیوں کا تقرر اس لئے ضروری ہے کہ موزوں پاکستانی عملہ نہیں ملتا ان کے لئے بھی برطانوی جزائر سے باہر تلاش کی جائے۔''[10] اور اس سے اگلے دن اس اخبار کے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ ''ہماری حکومت کے لئے ضروری ہے کہ وہ ساری عالمی قوتوں کو پیش نظر رکھے اور کسی جھوٹی دوستی کو ملحوظ خاطر رکھے بغیر اپنی خارجہ پالیسی کی وضاحت کرے۔''[11] برطانیہ اور اس کی دولت مشترکہ کے بارے میں اکتوبر 1948ء کی کانفرنس کے بعد بھی روزنامہ ''ڈان'' اور پاکستانی دانشوروں نے اسی قسم کے ردعمل کا اظہار کیا تھا۔ انہوں نے مطالبہ کیا تھا کہ حکومت پاکستان کو اپنے ملک کے سچے دوستوں کی تلاش کرنی چاہیے مگر اس وقت لیاقت علی خان نے اس مطالبہ کو درخور اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ اس کے برعکس اس نے اس مرتبہ اپنی لندن کی پریس کانفرنس میں یہ تاثر دیا تھا کہ وہ بھی پاکستانی عوام کی طرح برطانیہ اور اس کی دولت مشترکہ سے بیزار ہو گیا ہے اس لئے شاید وہ اپنی خارجہ پالیسی میں تبدیلی کرے۔ لیکن جب وہ لندن سے قاہرہ پہنچا اور وہاں اس نے اپنے چند روز قیام کے دوران جو کچھ کہا اس سے یہ تاثر ملیامیٹ ہو گیا اور پاکستان کے باشعور سیاسی حلقوں کو یقین ہو گیا کہ لیاقت حکومت سے پاکستان کی خارجہ پالیسی میں کسی اہم تبدیلی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ مشرق وسطیٰ میں اس کے مشن کا مقصد وہی پرانا تھا یعنی یہ کہ اس علاقے کے مسلم ممالک کو اکٹھا کر کے ایک سوویت مخالف بلاک بنایا جائے۔ وہ مغربی سامراجیوں کا یہ مقصد پورا کرنے کے لئے کوشاں تھا حالانکہ امریکہ نے اس وقت تک اس علاقے کے لئے فوجی گٹھ جوڑ کا جو منصوبہ بنایا تھا اس میں پاکستان کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔

یہ صورتحال نوائے وقت کے لئے بھی جو پاکستان میں سوویت دشمنی اور ''اسلام دوستی'' کا عظیم ترین علمبردار تھا، قابل برداشت نہیں تھی۔ برطانوی ارباب اقتدار نے جمہوریہ ہندوستان کو دولت مشترکہ میں شامل کئے رکھنے کا فیصلہ کر کے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ ایشیا میں ہندوستان کو بلند ترین مقام دیتے ہیں۔ امریکی صدر نے جواہر لال نہرو کو دعوت دے کر یہ واضح کر دیا تھا کہ حکومت امریکہ بھی پاکستان کے مقابلے میں ہندوستان کو بہت اہمیت دیتی ہے۔ نوائے وقت نے 10رمئی کو اس صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ ''حال ہی میں لندن میں جو کامن ویلتھ کانفرنس ختم ہوئی ہے اس کی کاروائی نے پاکستان کے اہل فکر اور سنجیدہ حلقوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ ہماری خارجہ پالیسی جب تک برطانیہ کی مصلحتوں کی تابع رہے گی تب تک ہم برطانیہ

کے دوستوں کو اپنے دوست اور برطانیہ کے دشمنوں کو اپنے دشمن سمجھتے رہیں گے...... جہاں تک روس سے اجنبیت کا تعلق ہے تو اس کی ذمہ داری پاکستان پر نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ برطانوی سیاست کا تقاضا یہی تھا کہ پاکستان روس سے دور رہے مگر روس نے بھی پاکستان سے اچھا سلوک نہیں کیا بلکہ ابتدا میں بہت برا سلوک کیا۔ قیام پاکستان پر دنیا کے سبھی ملکوں نے قائداعظم کی خدمت میں مبارک باد کے پیغامات بھیجے۔ صرف روس ہی ایک ایسا ملک تھا جس نے رسمی پیغام تہنیت بھی نہ بھیجا۔ جب یو۔ این۔ او میں پاکستان کی رکنیت کا مسئلہ پیش ہوا تو دنیا کے سبھی ممالک کے نمائندوں نے اپنی تقاریر میں پاکستان کا خیر مقدم کیا مگر روسی نمائندہ بالکل خاموش بیٹھا رہا۔ اختتام اجلاس پر "نوائے وقت" کے نامہ نگار نے روسی نمائندہ موسیو گرومیکو نائب وزیر خارجہ روس سے اس خاموشی کا گلہ کیا تو انہوں نے کہا کہ میں اہل پاکستان کی کامیابی کے لئے دعا کرتا ہوں۔ پاکستان کے متعلق روس کی طرف سے یہ پہلا اظہار خیال تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک مدت تک روس پاکستان کو برطانیہ کی تخلیق سمجھتا رہا اور جہاں اس نے ہندوستان سے تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کی وہاں پاکستان سے جان بوجھ کر بے اعتنائی کا سلوک کیا۔ مگر اب حالات میں ایک گونہ تبدیلی پیدا ہو چکی ہے۔ ہندوستان اینگلو۔ امریکن بلاک کا چہیتا آلہ کار بن چکا ہے اور برطانیہ و امریکہ نہرو کے انڈیا کو چیانگ کائی شیک کے چین کی جگہ ایشیا کا لیڈر بنانے کے درپے ہیں۔ ان بدلے ہوئے حالات میں روس کو پاکستان کے متعلق اپنی روش بدلنے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔ پاکستان کی جغرافیائی پوزیشن کی وجہ سے اسے ایک خاص سیاسی اور فوجی اہمیت حاصل ہے اور روس کو ایک ایسے ملک سے تعلقات خوشگوار کرنے میں کوئی عذر نہ ہوگا۔ دوسری طرف اب پاکستان بھی برطانیہ سے بدظن اور بددل ہو چکا ہے۔ حکومت کی پالیسی تو وزیراعظم کی لندن سے واپسی پر ہی کوئی واضح شکل اختیار کرے گی مگر جہاں تک رائے عامہ کا تعلق ہے وہ انگریزوں سے مایوس ہو چکی ہے، اخبارات بھی اپنی حکومت کو یہی مشورہ دے رہے ہیں کہ پاکستان کو محض انگریزوں کی خاطر برطانیہ کے مخالف بلاک سے خدا واسطے کی دشمنی مول نہیں لینی چاہیے بلکہ یہ کوشش کرنی چاہیے کہ اس بلاک سے اچھے تعلقات قائم کئے جائیں۔ برطانیہ اور امریکہ کو بھی پاکستان کی قدر و قیمت کا احساس صرف اسی طرح دلایا جا سکتا ہے۔ پاکستان سے روس وفد بھیجنے کی تجویز اس سلسلہ میں ایک مفید اقدام ہے۔"[12]

لیاقت نے دورۂ مشرق وسطیٰ میں کمیونزم کے خلاف اسلام کے حوالے سے بیانات دیئے اور مسلم ممالک کے مغربی طاقتوں کے ساتھ اتحاد کی تجویز دی

لیاقت علی خان لندن سے براستہ روم، 9 رمئی کو قاہرہ پہنچا تو وہاں اس نے امریکہ اور برطانیہ کے بارے میں پاکستان کے اخباری و سیاسی حلقوں کی بدظنی و بددلی پر کوئی تبصرہ نہ کیا۔ البتہ اس کے ایک ترجمان نے کہا کہ ''پاکستان مسلم ممالک کی قیادت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کر رہا۔ تاہم وہ ان کے درمیان زیادہ یکجہتی کا خیر مقدم کرے گا۔''[13] 10 رمئی کو لیاقت علی خان نے قاہرہ میں ایک پریس کانفرنس کو خطاب کیا مگر اس میں بھی اس نے اینگلو۔امریکی بلاک کے خلاف پاکستانی عوام کی برہمی کا کوئی ذکر نہ کیا۔ اس نے بتایا کہ پاکستان معاشی اور روحانی ترقی کی بنیاد پر بہت بڑا سوشلسٹ تجربہ کر رہا ہے۔ اس تجربہ سے جنوب مشرقی ایشیا میں کمیونسٹوں کی مداخلت کاری کا سدباب ہو سکے گا۔ اس نے کہا کہ دولت مشترکہ کانفرنس نے جو فیصلے کئے ہیں میں ان سے مطمئن ہوں اور مجھے امید ہے کہ ان فیصلوں کے نتائج بھی اطمینان بخش ہوں گے۔'' اس نے مزید بتایا کہ ''میں نے مصر، عراق اور ایران کی حکومتوں کی دعوت پر قاہرہ، بغداد اور تہران کا دورہ کرنے کا جو پروگرام بنایا ہے اس کی کوئی سیاسی اہمیت نہیں ہے اگرچہ اس کا یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ مشرق وسطیٰ کے ان ممالک کے درمیان اخوت کا رشتہ مزید مضبوط ہو جائے۔''[14]

نوائے وقت میں لیاقت علی خان کی اس پریس کانفرنس کی رپورٹ چھپی تو اس کے ساتھ یہ مختصر اداریہ بھی شائع ہوا کہ مصر میں ''سید حسن البنا کی شہادت کے بعد اخوان المسلمین پر تشدد اور ظلم کی مہم نے بہت زیادہ شدت اختیار کر لی ہے اس وقت ہزاروں اخوان مقدمہ چلائے بغیر جیلوں میں بند کر دیئے گئے ہیں اور ہزاروں جھوٹے الزامات کی بنا پر مقدموں میں ماخوذ ہیں۔ صالحین کی اس جماعت کا مقصد صرف یہی ہے کہ وہ مصر میں اسلام کے احیا کی علمبردار اور مصر کو برطانوی اثر و اقتدار سے بالکل آزاد دیکھنے کی متمنی ہے۔ اس جماعت کو بدنام کرنے کے لئے اس پر فسطائیت اور تشدد پسندی کے الزامات عائد کئے گئے اور قائد جماعت شیخ حسن البنا کی شہادت کے بعد تو اخوان کو اس طرح ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے کہ نازیوں کی ''یہود شکاری'' کی داستانیں بھی اس کے سامنے ماند پڑ گئی ہیں۔ واضح رہے کہ مصر کی آزادی کے

باوجود ابھی تک انگریز کو اس ملک میں بڑا اقتدار حاصل ہے اور یہ شبہ بے بنیاد نہیں کہ اخوان المسلمین پر اس ظلم کی تہہ میں انگریز کا ہاتھ کارفرما ہے۔"[15]

12 مئی کو لیاقت نے قاہرہ ریڈیو سے ایک نشری تقریر میں مصری عوام کو یقین دلایا کہ "ہم کسی ازم کو نہیں مانتے لیکن ہم نے تہیہ کیا ہوا ہے کہ ہم ہر پاکستانی کے لئے خوراک، لباس، مکان، تعلیم اور صحت کا بندوبست کریں گے۔" تاہم اس نے اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ "اسلامی نقطہ نگاہ سے قوم کی محض مادی ترقی ہی کافی نہیں۔ بنی نوع انسان کو واقعات کے ذریعے مسلسل یاددہانی کرائی جارہی ہے کہ وہ صرف روٹی پر زندہ نہیں ہے۔ پاکستان کے عوام کو یقین ہے کہ وہ دنیا میں ایک ایسا مثالی معاشرہ تشکیل کرلیں گے جو مادی ترقی اور روحانی ترقی کے درمیان توازن پیدا کرے گا۔"[16] اسی دن اس نے لندن ٹائمز کے نامہ نگار مقیم قاہرہ سے انٹرویو کے دوران وہ بات ذرا کھول کر کہہ دی جس پر وہ اب تک ذومعنی الفاظ کا پردہ ڈال رہا تھا۔ اس نے اس انٹرویو میں کمیونسٹ اور غیر کمیونسٹ ممالک کے درمیان پیدا شدہ خلیج میں مسلم دنیا کے کردار پر زور دیا اور کہا کہ "کوئی پسند کرے یا نہ کرے اس وقت دنیا کے ممالک دو گروہوں میں منقسم ہوگئے ہیں۔ ایک گروہ ان ممالک کا ہے جو کمیونزم کی حمایت کرتے ہیں اور دوسرا گروہ ان ممالک کا ہے جو کمیونزم کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس صورتحال میں قاہرہ اور کراچی کے درمیانی علاقے کے مسلم ممالک کا کردار بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ آج کل مشرق قریب میں ترکی سب سے زیادہ طاقتور ہے اور اس کے عقب میں عرب ممالک ہیں جن کا سربراہ مصر ہے۔ مصر کے سوا یہ سارے عرب ممالک اقتصادی لحاظ سے کمزور ہیں۔ لہٰذا خود ان کے مفاد اور عالمی امن کا تقاضا یہ ہے کہ یہ طاقتور اور خوشحال ہوں۔ مصر عالم عرب کی کلید ہے۔ پاکستان، جس میں 8 کروڑ مسلمان آباد ہیں، مشرق وسطیٰ کے اسلامی ممالک کے ساتھ ہے۔ عظیم مغربی طاقتوں کا فرض ہے کہ وہ مشرق وسطیٰ کے ممالک کو مضبوط بنائیں۔ جواباً ان ممالک کی سمجھ میں یہ بات آجائے گی کہ آج کل کوئی ملک الگ تھلگ نہیں رہ سکتا اور جو کمزور ہیں وہ طاقتوروں کی امداد کو مسترد نہیں کرسکتے۔ بڑی طاقتوں اور چھوٹی طاقتوں کے درمیان تعاون کا مطلب غلبہ یا استحصال نہیں ہے۔ پاکستان، ہندوستان اور سیلون کی آزادی کی مثال کے باوجود شاید مشرق وسطیٰ میں اس امر کا پوری طرح احساس نہیں ہے کہ برطانیہ استحصال اور غلبہ کی پالیسی سے آگے بڑھ چکا ہے اور اب اس کی پالیسی کی بنیاد ترقی اور

تعاون پر ہے۔ مشرق وسطیٰ میں برطانیہ کے بارے میں جو شکوک باقی رہ گئے ہیں یا جن شکوک کو برقرار رکھا جا رہا ہے انہیں ایسے اقدامات سے دور کیا جا سکتا ہے جو صرف بڑی طاقت ہی اٹھا سکتی ہے۔''[17] لیاقت علی خان کے اس انٹرویو کا مطلب یہ تھا کہ اگر مغربی ممالک مشرق وسطیٰ میں مارشل پلان کی طرح کے کسی معاشی منصوبے پر عمل کریں تو اس علاقے کے مسلم ممالک سوویت مخالف بلاک میں شامل ہو جائیں گے۔ اس کے اس انٹرویو پر عرب ممالک میں بہت مخالفانہ ردعمل ہوا جس کی ایک فوری وجہ یہ تھی کہ صرف دو دن قبل 11 رمئی 1949ء کو اسرائیل اینگلو۔ امریکی بلاک کی حمایت سے اقوام متحدہ کا باقاعدہ رکن بنا تھا۔

پاکستان میں بھی اس انٹرویو پر خفگی کا اظہار کیا گیا چنانچہ نوائے وقت کا تبصرہ یہ تھا کہ ''وہ انٹرویو جو لندن ٹائمز کے نامہ نگار مقیم قاہرہ نے مسٹر لیاقت علی خان سے منسوب کیا ہے ہمارے لئے اور ہماری طرح کروڑوں پاکستانیوں کے لئے تکلیف دہ حیرت کا باعث ثابت ہوا ہے۔ نامہ نگار نے وزیر اعظم سے یہ ارشادات منسوب کئے ہیں کہ دنیا کے سب ممالک دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ ایک کمیونزم کا حامی دوسرا کمیونزم کا مخالف...... میں دولت مشترکہ کانفرنس کے نتائج سے مطمئن ہوں...... مشرق وسطیٰ کے ملکوں میں برطانیہ کے متعلق ابھی تک غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ انگریز اب اقتدار کا خواہاں نہیں۔ وہ تعاون کی پالیسی پر گامزن ہے...... اگر یہ ارشادات واقعی وزیر اعظم کے ہیں تو ہم بڑے ادب کے ساتھ یہ عرض کریں گے کہ یہ بے محل ہے۔ وزیر اعظم کو صبر سے کام لینا چاہیے تھا اور پاکستان پہنچ کر اپنی حکومت سے مشورہ اور اپنی قوم کے جذبات کا جائزہ لینے کے بعد اپنی پالیسی کا اعلان کرنا چاہیے تھا۔ لندن میں ''مٹی کے مادھو' والی تلخ نوائی کے فوراً بعد قاہرہ میں ان کی طرف سے انگریزوں کو یہ سرٹیفکیٹ حیرت انگیز ہے...... یہ حقیقت ہے کہ دنیا کمیونزم کے حامی اور کمیونزم کے مخالف گروہوں میں بٹ گئی ہے مگر پاکستان آنکھیں بند کر کے ان دونوں گروہوں میں سے کسی ایک کا ساتھ کیوں دے؟ اگر تعلقات کی بنیاد محض نظریات پر ہی ہو تو ہمارے سب نظریے انگریزوں کے نظریوں سے ملتے جلتے نہیں ہیں۔ بہت سی باتوں میں ہم روس کے نزدیک تر ہیں۔ ٹھوس واقفیت اور حقیقت پسندی کی بنا پر اپنے ملک کی بہتری اور استحکام کی خاطر دونوں بلاکوں میں سے کسی ایک بلاک سے وابستگی تو سمجھ میں آ سکتی ہے۔ مگر محض نظریات کی فرضی ہم آہنگی کی بنا پر (فرضی اس لئے کہ دونوں بلاکوں میں سے کسی ایک کا نظریہ بھی ہمارا نظریہ

نہیں) ہم اپنے ملک کی خارجی سیاست کو ایک بلاک سے کیوں وابستہ کر دیں؟ پاکستان ایک نیا ملک ہے اسے کوئی ایسا اقدام نہیں اٹھانا چاہیے جو اس کی آزادی کو خطرہ میں ڈالے۔ پاکستان ایک نیا ملک ہے اسے کسی دوسرے ملک یا طاقت یا بلاک کی خاطر جنگ میں کود پڑنے کی ذمہ داری نہیں لینی چاہیے۔ پاکستان ایک نیا ملک ہے، اسے اپنی ترقی و استحکام کے لئے روپے، اسلحہ، مشینری اور ٹیکنیکل ماہرین کی امداد کے علاوہ اخلاقی مدد کی ضرورت ہے۔ اس لئے پاکستان کو اپنے دوستوں کا دائرہ بلا وجہ محدود نہیں کر لینا چاہیے۔"[18]

اسرائیل کے قیام کے نتیجہ میں عرب عوام میں اینگلو۔امریکی سامراج کے خلاف شدید نفرت، لیاقت کی مغرب نواز اسلامی بلاک کی تجویز پذیرائی حاصل نہ کر سکی

لیاقت علی خان اپنے مطلب کی بات بالکل کھل کر اور غیر مبہم الفاظ میں اس لئے نہیں کہتا تھا کہ عالم عرب کے قلب میں ایک یہودی مملکت وجود میں آنے کے باعث عرب عوام اینگلو۔امریکی بلاک کو اپنا سب سے بڑا دشمن تصور کرتے تھے۔ چنانچہ اس کے قاہرہ میں قیام کے دوران عربوں کے بہت سے اخباری و سیاسی حلقوں کا تبصرہ یہ تھا کہ یہ شخص پاکستان کی زیر قیادت ایک سوویت مخالف مسلم بلاک بنانے کی فکر میں ہے۔ عرب عوام میں اس تاثر کے بڑی گہرائی کے ساتھ جاگزیں ہونے کی وجہ یہ تھی کہ جب سے پاکستان بنا تھا اس کے لیڈروں اور اخبارات نے اس قسم کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ اول یہ کہ پاکستان عالم اسلام میں سب سے بڑا مسلم ملک ہے۔ یہ سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ یہ سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ہے۔ اس کے وسائل سب سے زیادہ ہیں اور اس کی افرادی قوت میں بے پناہ مہارت ہے۔ دوئم یہ کہ سارے مسلم ممالک کو پاکستان کی زیر قیادت یکجا ہو کر ایک واحد اسلامی مملکت یا اسلامی فیڈریشن یا اسلامی خلافت یا اسلامی بلاک کی تشکیل کرنی چاہیے۔ چونکہ امریکہ اور برطانیہ کے اخباری و سیاسی حلقے پاکستان کے اس پان اسلام ازم کی مخالفت نہیں کرتے تھے بلکہ وہ کسی نہ کسی طرح اس کی حمایت ہی کرتے تھے اور چونکہ عرب ممالک کے رجعت پسند و سامراج نواز فرمانروا، شیوخ اور جاگیردار بھی اس سلسلے میں پاکستانی لیڈروں کی مخالفت کرنے کی بجائے کسی نہ کسی طور پر اس کی حمایت

کرتے تھے اس لئے عرب قوم پرستوں کو یقین تھا کہ اتحاد اسلامی کا منصوبہ سامراجیوں کی پیداوار ہے اور پاکستان سامراجی پٹھو کی حیثیت سے اس منصوبے کو جامۂ عمل پہنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیاقت علی خان پہلے نومبر 1948ء میں اور پھر اب مئی 1949ء میں اپنے قیام قاہرہ کے دوران عرب قوم پرستوں کے اس تاثر کو رفع کرنے میں ناکام رہا تھا بلکہ اس نے اپنی تقریروں اور بیانات کے ذریعے اس تاثر کو کچھ پختہ ہی کیا تھا۔

قاہرہ سے لیاقت علی خان 13 رمئی کو بغداد پہنچا تو یہاں اس نے کوئی زیادہ بیان بازی نہ کی۔ البتہ اتنا کہا کہ ''میں دولت مشترکہ کانفرنس سے مطمئن ہو کر واپس جا رہا ہوں اور مجھے امید ہے کہ آئندہ اس کانفرنس کے جو نتائج نکلیں گے وہ بھی اطمینان بخش ہوں گے۔''[19] بغداد میں ارباب اقتدار سے خفیہ بات چیت کرنے کے بعد وہ 15 رمئی کو تہران پہنچا تو اس کے ساتھ لندن سے یہ خبر بھی پہنچی کہ ''شرق اردن کا بادشاہ عبداللہ عرب فیڈریشن سے متعلقہ اپنے منصوبہ کے حق میں ترکی کی حمایت حاصل کرنے کی غرض سے انقرہ جانے کے انتظامات کر رہا ہے جبکہ برطانیہ نے اس سلسلے میں مکمل منصوبہ بنالیا ہے۔ اس منصوبہ کے بارے میں گزشتہ ہفتے شرق اردن کے انگریز کمانڈر انچیف گلب پاشا سے لندن میں تبادلۂ خیالات ہوا تھا۔''[20] اس خبر سے ایک دن قبل پاکستان کی نام نہاد ورلڈ مسلم ایسوسی ایشن کے سیکرٹری جنرل اقبال شیدائی کا اخباری بیان یہ تھا کہ ''اگر مشرق وسطیٰ کے عرب ممالک یہودی سامراج کے خطرے کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں تو انہیں ''فیڈریشن'' قائم کرنے کے لئے فوری اقدامات کرنے چاہئیں۔''[21]

15 رمئی کو لیاقت علی خان نے تہران میں ایرانی وزرا اور مختلف ممالک کے سفیروں کو رات کے کھانے کی دعوت دی جس میں سوویت یونین کے ناظم الامور نے بھی شرکت کی اور لیاقت علی خان نے اس سے ایک ترجمان کی وساطت سے گفتگو کی۔ اس سے قبل لیاقت علی خان شاہ ایران سے دنیا کے مختلف مسائل کے بارے میں اور مسلم ممالک کے بارے میں بات چیت کر چکا تھا۔[22] 18 رمئی کو لیاقت علی خان نے تہران میں ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ ''دنیا کے سارے مسلم ممالک مضبوط رشتوں میں منسلک ہیں۔ یہ رشتے ان رشتوں سے زیادہ مضبوط ہیں جو کسی قسم کے بلاکوں سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ میں مسلم ممالک کے درمیان ایسے تعاون اور اشتراک عمل کا قائل ہوں جو، میں امید کرتا ہوں، دنیا کی

ترقی وامن اور بنی نوع انسان کی آزادی کے لئے ہوگا۔"[23] اسی دن اس نے ایران کے وزیر جنگ کی طرف سے دی گئی دعوت میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "پاکستان اور ایران کے دفاعی مسائل کئی لحاظ سے یکساں ہیں اس لئے یہ اچھی بات ہوگی کہ ایران کی بری فوج پاکستان کے دفاعی مسائل کا مطالعہ کرنے کے لئے اپنے نمائندے بھیجے۔ یہ نمائندے یہ بھی دیکھیں گے کہ کس طرح پاکستان نے بہت مشکلات کے باوجود ایک عمدہ دفاعی فوج تیار کی ہے۔"[24] ایرانی فوج کو اس کی اس پیشکش سے ایک دن قبل راولپنڈی سے یہ اعلان ہوا تھا کہ "برطانیہ کے چار فوجی افسر اعلیٰ فوجی تربیت کے لئے کوئٹہ سٹاف کالج میں داخل ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک افسر یونان سے اور ایک مصر سے آیا ہے۔"[25] 19 رمئی کو اس نے تہران کی مسجد سپہ سالار میں ایران کے علما سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "علما مختلف مسلم ممالک میں یکجہتی پیدا کرنے اور اسلام کے وقار اور شان وشوکت کو بحال کرنے کے کام میں بہت اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔"[26]

سیکولر عرب قوم پرستی کی لہر، عرب وعجم کا تضاد اور ایران وترکی میں عرب مخالف رجحانات کی وجہ سے اسلامی بلاک کی بیل منڈھے نہ چڑھ سکتی تھی

لیاقت علی خان کی جانب سے تہران کی پریس کانفرنس میں اسلامی بلاک کی تجویز کو زیادہ اہمیت نہ دیئے جانے کا مطلب یہ تھا کہ اگر چہ اس نے اس سلسلے میں مصر، عراق اور ایران کے سامراج نواز سربراہان حکومت سے کامیاب بات چیت کی تھی۔ تاہم اسے پتہ چل گیا تھا کہ امریکہ اور برطانیہ اس علاقے میں جس قسم کا سوویت مخالف گٹھ جوڑ چاہتے ہیں وہ قائم نہیں ہو سکے گا۔ اول اس لئے کہ عرب رائے عامہ امریکہ اور برطانیہ کے سخت خلاف تھی۔ اتنی خلاف کہ عرب فرمانروا اسے نظر انداز کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ اسی مہینے میں اسرائیل کی اقوام متحدہ میں شمولیت کے ذریعے اسے باقاعدہ مملکت کا درجہ ملا تھا اور عرب عوام اس قومی تذلیل پر بے انتہا شرمندہ اور برہم تھے۔ دوئم اس لئے کہ عربوں اور عجمیوں کے درمیان تضاد اس قدر شدید تھا کہ اس پر کسی طرح بھی قابو نہیں پایا جا سکتا تھا۔ اسلام کا نعرہ نہ تو عرب ممالک میں کارگر تھا اور نہ ہی ترکی اور ایران میں۔ عرب نیشنلزم سیکولر تھا اور عرب قوم پرست یہ سمجھتے تھے کہ پان اسلام ازم کا نعرہ ان پر پھر عجمیوں کا غلبہ قائم کرنے کے لئے لگایا جا رہا ہے۔ شاہ ایران

اسلام کی بجائے اپنی آریائی نسل پر فخر کرتا تھا اور ترکی میں قوم پرستی کا جذبہ اس قدر شدید تھا اور عربوں سے بیزاری یا نفرت کا یہ عالم تھا کہ 5/مارچ 1949ء کو انقرہ سے ڈان کی ایک اطلاع کے مطابق ''ترکی کی پارلیمنٹ میں جس وقت مباحثہ ہو رہا تھا دو شخص جو کسی خفیہ جماعت کے ممبر تھے اٹھ کھڑے ہوئے اور اذان اصل عربی زبان میں دینے لگے۔ چونکہ عربی زبان میں اذان دینا اب تک جرم ہے اس لئے فوراً گرفتار کر لئے گئے اور تین تین مہینے کے لئے جیل بھیج دیئے گئے...... پارلیمنٹ میں محکمہ امور مذہبی کا بجٹ جس وقت پیش ہو رہا تھا اس وقت بھی بڑی گڑ بڑ مچ گئی۔ جب ایک ممبر نے کھڑے ہو کر کہا کہ ترکیہ میں ہم مسلمانوں کی آبادی 95 فیصدی ہے۔ آخر کب تک ہم قرآن کو ایک اجنبی زبان عربی میں پڑھے جائیں گے۔ یہ محتاجی کب تک قائم رہے گی۔''[27] ترکی کی پارلیمنٹ میں اس بحث سے قبل اس کی حکومت اسرائیل کی مملکت کو باقاعدہ تسلیم کر چکی تھی۔

19/مئی کو لیاقت علی خان واپس کراچی پہنچا تو اس کے ساتھ یہ خبر بھی آئی کہ شامی حکومت نے اپنے علاقے میں سے پائپ لائن لے جانے کے متعلق امریکہ کی تیل کمپنیوں کے ساتھ ایک معاہدہ منظور کر لیا ہے۔ یہ معاہدہ سابقہ شامی حکومت اور امریکی تیل کمپنیوں کے درمیان اس لئے نہیں طے پا سکا تھا کہ شام کے عوام کا غیض و غضب اس کے راستے میں حائل تھا۔[28] شام کی یہ نئی حکومت 30/مارچ 1949ء کو وجود میں آئی تھی۔ اس پر چیکوسلواکیہ کے اخبارات کا تبصرہ یہ تھا کہ ''شام کا یہ فوجی انقلاب یا تو امریکہ کی تحریک پر برپا کیا گیا ہے یا کم از کم انقلابیوں کو یہ پتہ تھا کہ امریکہ ان کی حمایت کرے گا۔ ایک اخبار نے لکھا کہ شام میں ایک فوجی ڈکٹیٹر شپ سے ملک میں امریکہ کا پورا پورا کنٹرول قائم ہو جائے گا۔ اسے تیل کی مراعات مل جائیں گی۔ شام اور ترکی میں رابطہ قائم ہو سکے گا اور وہ مشرق وسطیٰ کے ممالک کو ایک لڑی میں پرو کر روس کے خلاف محاذ قائم کر سکے گا۔ امریکہ بد دیانت شامی حکومت کو اپنے زیر اثر لانے کی برطانوی مساعی اور برطانیہ کی شہ پر تیار کردہ ''عظیم تر شام'' کے پلان کے نتیجے کا نہایت بے صبری سے انتظار کر رہا تھا۔ ایک اور اخبار نے لکھا تھا کہ ''یہ بات قابل غور ہے کہ یہ انقلاب تیل کے متعلق امریکہ اور شام کے معاہدے پر دستخط ہونے سے چند دن قبل رونما ہوا ہے۔ شامی عوام اس معاہدے کے خلاف تھے اور پرانی حکومت عوام کو خاموش نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ حکومت کی

چھٹی کرنا پڑی۔''[29] لیاقت علی خان کے ہمراہ ایک اور خبر تہران سے بھی آئی اور وہ یہ تھی کہ حکومت ایران نے سرکاری طور پر اعلان کیا ہے کہ کورٹ مارشل کے ذریعہ تودہ پارٹی کے 8 رہنماؤں کو موت کی سزا دی گئی ہے اور 9 دیگر رہنماؤں کو 5، 6، 8 اور 10 سال تک کے لئے قید تنہائی کی سزا سنائی گئی ہے۔ تودہ پارٹی کے یہ سارے لیڈر روپوش ہیں اور یہ سزائیں ان کی غیر حاضری میں سنائی گئی ہیں۔[30] قدرتی طور پر برطانیہ اور امریکہ کے سرکاری حلقوں کے لئے شام اور ایران کی یہ خبریں خوشخبریوں کی حیثیت رکھتی تھیں کیونکہ ان سے اس حقیقت کا مزید ثبوت ملا تھا کہ عرب۔ اسرائیل تنازعہ کے باوجود مشرق وسطیٰ کے تمام مسلم ممالک کے ایوان ہائے اقتدار کی فضا اینگلو۔ امریکی بلاک کے حق میں تھی۔

مغربی ذرائع ابلاغ کی طرف سے لیاقت کے دورۂ مشرق وسطیٰ کی تعریف وستائش

اس صورتحال میں پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خان کے مصر، عراق اور ایران کے دورہ سے امریکہ اور برطانیہ کو خاصا فائدہ ہوا تھا۔ اگرچہ اس سے سوویت مخالف اسلامی بلاک کی تشکیل کی جانب متوقع پیش قدمی نہیں ہوسکی تھی۔ برطانوی خبر رساں ایجنسی سٹار کا تبصرہ یہ تھا کہ ''اگرچہ لیاقت علی خان کا یہ دورہ سیاسی اہمیت کا حامل نہیں تھا تاہم اس سے عرب ممالک میں پاکستان کے لئے خیر سگالی کے جذبات پیدا ہوئے ہیں۔ جیسا کہ وزیر اعظم نے خود کہا ہے کہ اس کے اس دورے کا اس کے سوا کوئی سیاسی مقصد نہیں تھا کہ مشرق وسطیٰ میں پاکستان کے بارے میں معلومات بڑھائی جائیں۔ لیکن عرب بدنیتی کا سراغ لگانے میں بہت ماہر ہیں۔ چنانچہ قاہرہ میں بار ہا یہ کہا گیا کہ لیاقت علی خان پاکستان کی زیر قیادت مسلم بلاک بنانے کا خواہاں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ قاہرہ اور بغداد میں اعلیٰ پالیسی کا مسئلہ مثلاً جارحیت کے خلاف ایشیا کے دفاع کا مسئلہ، زیر بحث آیا تھا لیکن اس تبادلہ خیالات کا دائرہ بہت وسیع تھا اور اس کی نوعیت عمومی تھی۔ وزیر اعظم کا اصلی مقصد یہ تھا کہ پاکستان، مصر عراق اور ایران کے درمیان قریبی تعلقات کو فروغ دیا جائے۔ جب لیاقت علی خان سے ایک پریس کانفرنس میں یہ پوچھا گیا تھا کہ آیا وہ اسلامی بلاک کے قیام کے لئے کام کر رہا ہے تو اس نے اس سوال کو بڑے

سرسری طریقے سے نپٹا دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ایشیا کے دفاع کے لئے دوستی کی بجائے بین الاقوامی بلاکوں پر بہت زور دیا جارہا ہے۔ مشرق وسطیٰ کے کامیاب دفاع کے لئے ضروری ہے کہ مسلم ممالک کے درمیان زیادہ یکجہتی ہو، ہر قوم کی سرحدوں کے اندر اتحاد کا زیادہ احساس ہو اور اس کے ساتھ اس کی معیشت بھی ترقی یافتہ ہو۔ پاکستان کے وزیراعظم نے قوموں کے درمیان محض دوستی پر اس قدر زور دیا کہ اس کی رائے نے تقریباً ایک سیاسی نظریے کی حیثیت اختیار کرلی۔ یہ بات واضح تھی کہ اس نے اپنا یہ خیال محض ایک پاکیزہ تجویز کے طور پر پیش نہیں کیا تھا بلکہ اس کی حیثیت ایک قابل عمل اور مدبرانہ انتظام کی تھی جو فوجی معاہدوں سے زیادہ وزنی ہو گا۔ یورپ میں اکثر و بیشتر اس قسم کی سیاست کو سادہ لوحی تصور کیا جاتا ہے لیکن مشرق وسطیٰ میں جہاں اسلام ابھی تک بڑی قوت کا حامل ہے اسی سیاست کا بے پناہ اثر ہوتا ہے۔ عربوں کی جانب سے بین الاقوامی اعتماد و مفاہمت کے لئے جو مسلسل جدوجہد کی جارہی ہے وہ ایک ایسے سیاسی پروگرام کی متقاضی ہے جس کی بنیاد مذہبی لبرل ازم پر ہو۔ اگر ایسا پروگرام نہیں بنتا تو اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ کسی کی نیت میں فتور ہوتا ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ حالات موافق نہیں ہوتے۔ لیاقت علی خان کے مخلصانہ خیالات نے اچھے اثرات پیدا کئے ہیں۔ آج کل مشرق وسطیٰ کا ماحول سازشوں، جوابی سازشوں، رقابتوں اور غلط فہمیوں سے بھرپور ہے۔ ایسے ماحول میں یوں لگا کہ لیاقت علی خان راست بازی اور سادگی کا پیغمبر ہے۔ سات کروڑ کی عظیم پاکستانی قوم کے، جو اپنے امور واقعی اسلامی بنیاد پر چلا رہی ہے، اس خیال نے عربوں کی فکر کو بیدار کیا ہے اور ان میں بہت سے ایسے ہیں جو اب بھی سیاست میں مذہبی جذبہ شامل کرنے کے خواہاں ہیں۔"[31] لیاقت علی خان کو سٹار نیوز ایجنسی کا یہ تعریفی سرٹیفکیٹ دراصل برطانیہ کے محکمہ خارجہ کا سرٹیفکیٹ تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ لیاقت علی خان نے اپنے دورۂ مشرق وسطیٰ کے دوران مذہب کے نام پر مسلم ممالک کے درمیان سیاسی یکجہتی و دوستی کی فضا پیدا کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ قابل ستائش ہے۔ وہ اگر اسلامی بلاک کی طرف کوئی پیش قدمی نہیں کرسکا تو اس میں اس کا کوئی قصور نہیں بلکہ اس میں اس فضا کا قصور ہے جو سازشی عرب قوم پرستوں نے اس قسم کے بلاک کے خلاف پیدا کر رکھی ہے۔ تاہم اس سلسلہ میں عرب ممالک کے ان عناصر پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے جو اسلام کے نام پر اپنی سیاسی دکان چلانا چاہتے ہیں۔

اینگلو امریکی سامراج کا ہندوستان کی قیادت میں سوویت مخالف بلاک بنانے کا فیصلہ جبکہ پاکستانی حکمران اسلامی بلاک کے نام پر سامراجی پٹھو کا کردار ادا کرنے میں پیش پیش رہے

23 رمئی کو پاکستان کے وزیر خزانہ غلام محمد نے بی بی سی کے نامہ نگار سے ایک ملاقات کے دوران کہا کہ ''کمیونزم کا مقابلہ کرنے کے لئے مغربی ممالک اور امریکہ کو پاکستان کی ہر ممکن مدد کرنی چاہیے اور پاکستان کو صنعت میں ترقی یافتہ ملک بنانا چاہیے۔ عوام کا معیار زندگی بلند کرنے ہی سے ملک میں کمیونزم کے سیلاب کو روکا جا سکتا ہے اور ایشیا کو کمیونزم کے اثر سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ ایشیائی ممالک اقتصادی وثقافتی لحاظ سے بہت پست ہیں اور ان ملکوں میں بہت جلد کمیونسٹ عناصر فروغ پا سکتے ہیں۔ اس سے قبل کہ کمیونزم ایشیا کے بڑے حصے پر غالب ہو مغربی ممالک اور امریکہ کو چاہیے کہ وہ ایشیا کی اقتصادی ترقی کی طرف توجہ دیں اور عوام کا معیار زندگی بلند کریں۔ پاکستان میں غیر ملکی سرمایہ کا خیر مقدم کیا جائے گا لیکن صرف اسی قدر کہ ملک کی آزادی پر اس کا برا اثر نہ پڑے۔ جو ممالک پاکستان میں اپنا سرمایہ لگائیں گے ان کو بھی یقیناً اس طرح فائدہ حاصل ہوگا۔ غیر ملکی سرمایہ کی مدد سے پاکستان کو بہت جلد صنعتی میدان میں ترقی دی جا سکتی ہے اور اس طرح عوام کا معیار زندگی بلند کر کے کمیونزم کے اثر کو ناکام کیا جا سکتا ہے۔''[32] 24 رمئی کو پاکستان میں ایران کے سفیر علی نصر نے اپنے پہلے انٹرویو میں لیاقت علی خان کے اس ''سیاسی نظریے'' کی تائید کی کہ فوجی معاہدے کے بغیر مسلم ممالک کے درمیان دوستی و یکجہتی کے قریبی رشتے قائم ہونے چاہئیں۔ اس نے کہا کہ ''مسلم ممالک کے درمیان اتحاد کی تحریک کوئی نئی تحریک نہیں ہے۔ دو عالمی جنگوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ قوموں کے درمیان اتحاد واشتراک عمل ضروری ہے۔ اقوام متحدہ کا قیام اس کا ایک ثبوت ہے۔ مسلم ممالک مذہبی نقطہ نگاہ سے ایک ہیں۔ ہم ایک دوسرے کی مشکلات کو اپنی مشکلات سمجھتے ہیں۔ ہمیں غیر جانبدار رہنا چاہیے اور اندریں اثنا اپنے آپ کو طاقتور اور مضبوط بنانے کے لئے کام کرنا چاہیے۔ طاقت و مضبوطی سے میرا مطلب یہ ہے کہ ہمیں ذہنی، تعلیمی، معاشی اور معاشرتی لحاظ سے طاقتور ہونا چاہیے اور ہم میں کسی بیرونی تنظیم کے خلاف اپنا دفاع کرنے کی اہلیت ہونی چاہیے۔''[33]

24 رمئی کو لیاقت علی خان نے لندن کے اخبار ڈیلی میل کو انٹرویو دیا جس میں اس نے پیش بینی کی کہ پاکستان کا مستقبل مصر، عراق اور ایران کے مستقبل کے ساتھ وابستہ ہوگا۔

سوال: پاکستان ان تینوں ممالک سے بڑا ہے۔ کیا آپ کا نصب العین یہ ہے کہ پاکستان کو مسلم ایسٹ بلاک کا لیڈر بنایا جائے؟

جواب: ہمیں کسی بلاک کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہم پہلے ہی مشترکہ مذہب کے مضبوط روابط کی وجہ سے متحد ہیں۔ ہمیں باہمی یکجہتی کے لئے کسی معاہدے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہماری قومی خصوصیتیں یکساں ہیں اور ہم ایک ہی طرح سوچتے ہیں۔ ہمارے ممالک انتہائی اہم سٹرٹیجک پوزیشن کے حامل ہیں۔ عالمی امن کے مفاد کا تقاضا یہ ہے کہ ہماری اس پوزیشن کو ہر ممکن طریقے سے مضبوط کیا جائے۔ میں نے مشرق وسطیٰ کے جن دارالحکومتوں کا دورہ کیا ہے۔ وہاں میرے اس نظریے سے پورا اتفاق پایا جاتا ہے۔"[34]

25 رمئی کو لیاقت علی خان نے پاکستان ریڈیو سے ایک نشری تقریر میں پاکستانی عوام کو بتایا کہ "مسلم ممالک نے پاکستان سے بہت سی امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں کیونکہ ہمارا یہ ملک دنیا میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم پاکستانی مسلم ممالک کی ان توقعات کو پورا کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کریں گے۔"[35] 26 رمئی کو اس نے بی بی سی کے ایک نامہ نگار کو انٹرویو میں کہا کہ "دولت مشترکہ میں پاکستان سب سے بڑی اور سب سے زیادہ اہم سٹرٹیجک سرحدیں رکھتا ہے۔ اس کے باوجود پاکستان کو برطانیہ سے کافی مقدار میں مالی امداد نہیں ملی ہے اور نہ ہی مل رہی ہے۔ اس نے کہا کہ مسلم دنیا کے ممالک میں قدرتی طور پر یہ خواہش پائی جاتی ہے کہ مشترکہ مفاد کی خاطر انہیں ایک دوسرے سے قریبی روابط قائم کرنے چاہئیں۔ مسلم اقوام مشترکہ مذہب کے رشتے میں بندھی ہوئی ہیں۔ انہیں ایک دوسرے کی امداد کے لئے رسمی معاہدوں کی ضرورت نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلم ممالک اپنے عوام کا معیار زندگی زیادہ سے زیادہ بلند کریں۔ انہیں اندرونی طور پر سیاسی اور معاشی دونوں ہی نقطہ نگاہ سے مضبوط ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔" اس نے کہا کہ "میں ان یورپی ممالک کا خیر مقدم کرتا ہوں جو ہماری نوزائیدہ اور سب سے بڑی مسلم مملکت میں سرمایہ کاری کر رہے ہیں۔ مجھے اس امر کا احساس ہے کہ ہمارے ملک میں ایک باآواز برطانیہ مخالف اقلیت ہے۔ لیکن میری اور میری کابینہ کی رائے میں ان کا

اثر ورسوخ زیادہ نہیں ہے۔ اور یہ لوگ پالیسی امور سے متعلقہ فیصلوں پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ حکومت کی پالیسی ہمیشہ اس اصول کی تابع رہے گی کہ پاکستان کے مفاد میں کیا ہے۔"[36]

پاکستان میں اسلامی بلاک کے بارے میں اور برطانیہ اور پاکستان کے درمیان روابط کے بارے میں یہ بحث جاری تھی کہ 26 رمئی کو رائیٹر کے ذریعے ماسکو سے یہ اطلاع موصول ہوئی کہ "سوویت یونین کے ہفت روزہ "نیوٹائمز" نے ہندوستان کو ہدف تنقید بنایا ہے کیونکہ اس کی رائے میں ہندوستان کو جنوب مشرقی ایشیا میں سب سے بڑے اینگلو۔امریکی ایجنٹ کا کردار سپرد کیا گیا ہے۔ نیوٹائمز نے لکھا کہ حال ہی میں جو دولت مشترکہ کانفرنس ہوئی ہے اس میں خفیہ گفت وشنید کے بعد ہندوستان، پاکستان اور لنکا پر مشتمل ایک اینٹی ڈیموکریٹک بلاک بنایا گیا ہے۔ برطانیہ اور امریکہ کی زیر سرپرستی اس گٹھ جوڑ کا مقصد یہ ہے کہ جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک میں جمہوری تحریک کو دبایا جائے۔ یہ بلاک برما کے عوام کے خلاف ہے جو اپنے ملک کی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں۔ نیوٹائمز نے مجوزہ ساؤتھ ایسٹ ایشین ڈیفنس کانفرنس کا ذکر کرتے ہوئے مزید لکھا کہ اس کانفرنس کا مقصد یہ ہے کہ ایک بحرالکاہل معاہدہ کیا جائے۔ ان واقعات کے پیش نظر ہندوستان کے ان بیانات کو کوئی اہمیت نہیں دی جاسکتی کہ وہ "آزاد پالیسی" پر عمل پیرا ہے۔"[37]

27 رمئی کو لاہور کے روزنامہ امروز نے بظاہر نیوٹائمز کے اس تبصرے سے متاثر ہو کر دولت مشترکہ کانفرنس کے سلسلے میں لیاقت علی خان کے بیانات صفائی پر تبصرہ کیا۔ اس نے لکھا کہ "ہمارے وزیر اعظم نے پہلے تو لندن میں پاکستان کے ساتھ اہانت آمیز سلوک کے خلاف تند و تیز لہجہ میں احتجاج کیا۔ پھر یہ شکایت منظر عام پر آئی کہ برطانیہ ہندوستان کو اسلحہ دے رہا ہے اور پاکستان کو نظرانداز کر رہا ہے۔ یہ شکوہ بھی کیا گیا کہ برطانیہ پاکستان کا قرضہ دبائے بیٹھا ہے اور ادا کرنے میں لیت ولعل کر رہا ہے۔ لیکن چند ہی دن بعد یہ انکشاف ہوا کہ ان گلے شکوؤں کے باوجود ہمارے وزیر اعظم برما کی دیوالیہ حکومت کو قرضہ اور اسلحہ دینے پر رضامند ہو گئے۔ اس لئے کہ برطانیہ اور ہندوستان کی خواہش یہ تھی اور دولت مشترکہ کانفرنس نے یہی فیصلہ کیا تھا۔ یہ رضامندی کسی مجبوری یا دباؤ کا نتیجہ نہیں تھی۔ وزیر اعظم صاحب نے قاہرہ میں خود ہی اعلان کیا کہ "میں لندن کانفرنس کے فیصلوں سے مطمئن ہوں۔" رائے عامہ حیران ہے کہ پہلے بے اطمینانی کا اظہار، پھر ایک غیر ملک میں برطانیہ اور ہندوستان کے استعماری مفاد کی حفاظت کے لئے مداخلت کا فیصلہ

اوران تمام حرکتوں پر آخر میں اظہار اطمینان۔ آخر یہ معمہ کیا ہے؟ لیاقت علی خان پر یہ واجب تھا کہ وہ اس حیرانی کو دور کرتے۔ سب سے پہلے واضح کرتے کہ برطانیہ اور پاکستان کے مابین اشتراک وتعاون کی بنیاد کیا ہے۔ ایک ایسی طاقت جو صدیوں سے مسلمانوں کا خون چوس رہی ہو۔ جس نے ارض مقدس کو تقسیم کرایا اور سارے عالم اسلام کو پامال کیا۔ کیا پاکستان کی اس سے دوستی ممکن ہے؟ اگر ہے تو وہ کیونکر؟...... ہمارے وزیراعظم صاحب بتائیں کہ انہوں نے مسٹر بیون اور پنڈت نہرو کے فیصلے پر کیوں انگوٹھا لگا دیا؟ پاکستانی روپیہ اور اسلحہ برما میں جھونک دینے پر کیوں رضامند ہو گئے؟ کیا ہماری غیر جانبداری کی حکمت عملی ختم ہو گئی اور ہم بھی ہندوستان کی طرح اینگلو۔ امریکن بلاک کا دم چھلا ہو گئے؟ ہم یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ کامن ویلتھ کانفرنس میں صرف ہندوستان کے ''آئینی موقف'' پر غور ہوا۔ بلکہ قرائن سے یہ بھی ثابت ہے کہ کانفرنس میں مغربی یورپ کے فوجی گٹھ جوڑ اور مشرق وسطیٰ ومشرق بعید میں اسی نوعیت کی فوجی گروپ بندیوں کی تجاویز پر بھی غور ہوا۔ وزیراعظم صاحب کو وضاحت کرنی ہوگی کہ کیا دولت مشترکہ کی وساطت سے پاکستان بھی ان بلاکوں میں شامل سمجھا جا رہا ہے۔''؟[38] لیکن امروز کے یہ سوالات اور شکوک وشبہات بے سود تھے۔ وزیراعظم لیاقت علی خان نے ان میں سے کسی سوال کا وضاحتی جواب نہ دیا اور نہ ہی شک وشبہ کو دور کرنے کی کوئی کوشش کی۔ اس لئے کہ وزیراعظم نے اپریل کے اواخر میں لندن کی پریس کانفرنس میں برطانیہ اور دولت مشترکہ کے بارے میں جو تلخ نوائی کی تھی وہ وقتی طور پر اس کی ذاتی برہمی کی وجہ سے تھی کیونکہ اس دولت مشترکہ کانفرنس کا دولہا ہندوستان کا وزیراعظم پنڈت نہرو تھا اور برطانیہ کے سرکاری وغیر سرکاری حلقوں میں بھی اس کی بہت پذیرائی ہوئی تھی جبکہ بے چارے لیاقت علی خان کو کسی نے گھاس نہیں ڈالی تھی۔ اس پریس کانفرنس کے بعد جب چودھری ظفر اللہ خان اور سر اکرام اللہ وغیرہ نے اسے سمجھایا تو وہ فوراً ''راہ راست'' پر آگیا اور پھر اس نے وہی کچھ کیا اور کہا جو برطانیہ بہادر چاہتا تھا۔

پاکستان کی جانب سے سرکاری سطح پر اسلامی کانفرنس کی دعوت اور مسلم ممالک کے ساتھ دوستی کے معاہدوں کا اعلان

30رمئی کو لیاقت علی خان کے دورۂ مشرق وسطیٰ کے اصلی مقصد کی نقاب کشائی ہوگئی

جبکہ ایسوسی ایٹیڈ پریس آف پاکستان نے کراچی کے باخبر حلقوں کے حوالے سے یہ خبر دی کہ ''آئندہ چند ماہ میں پاکستان اور دوسرے مسلم ممالک کے درمیان دوستی کے رسمی معاہدوں پر دستخط ہو جائیں گے۔ پاکستان نے عرب لیگ کے اندر اور باہر کے تمام مسلم ملکوں کو آئندہ موسم سرما میں منعقد ہونے والی سرکاری سطح کی کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی ہے۔ عراق نے پہلے ہی دعوت قبول کر لی ہے۔ کراچی کے باخبر حلقوں کے مطابق یمن کی عرب بادشاہت کے ساتھ دوستی کے معاہدے کے ایک مسودے کو آخری شکل دی جا چکی ہے۔ معاہدے پر باقاعدہ دستخط جو عنقریب ہونے والے تھے کسی فنی رکاوٹ کی وجہ سے تاخیر میں پڑ گئے ہیں لیکن اس مشکل کو جلد حل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ بھی بتایا گیا کہ پاکستان، ڈاکٹر بی۔ اے۔ قریشی کی تعیناتی کے بعد ازخود شام اور لبنان کے ساتھ دوستی کے معاہدے کی بات چیت کا آغاز کرے گا۔ ڈاکٹر بی۔ اے۔ قریشی کی تعیناتی کا اعلان حال ہی میں ہوا ہے۔ پاکستان کے ترکی میں سفیر میاں بشیر کے ترکی کے دارالحکومت میں پہنچ جانے کے بعد ترکی کے ساتھ بھی اسی قسم کا معاہدہ کرنے کے لئے متعلقہ ارباب اختیار سے رابطہ پیدا کیا جائے گا۔ مصر، عراق اور ایران کے ساتھ دوستی کے معاہدوں کے بارے میں ابتدائی مذاکرات پہلے ہی ہو چکے ہیں۔ یہ مذاکرات وزیراعظم کے ان ممالک کے حالیہ دورے کے دوران کئے گئے۔ جب ان ملکوں کے اعلیٰ رہنما مستقبل قریب میں پاکستان کا دورہ کریں گے تو اس سلسلہ میں مزید زمین ہموار ہو جائے گی۔ یاد رہے کہ وزیراعظم پاکستان نے مصر، ایران اور عراق کے وزرائے اعظم کو اپنی پہلی فرصت میں پاکستان کا دورہ کرنے کی دعوت دی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ مصر، ایران اور عراق کے علاوہ دوسرے مسلم ممالک کے ساتھ بھی اسی نوعیت کے معاہدوں کے بارے میں مذاکرات کے سوال کو فوقیت دی جا رہی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ مسلم ممالک کے علاوہ دوسرے ممالک کے اسلامی امور پر غیر ملکی ماہرین کو بھی مجوزہ کانفرنس میں شرکت کے لئے دعوت دی گئی ہے۔ کانفرنس کے دائرہ کار کا بھی ابھی تک تعین نہیں ہوا ہے۔ اس امر پر بھی زور دیا گیا کہ پاکستان کے مسلم ممالک کے ساتھ پہلے ہی بے حد اچھے تعلقات ہیں اور یہ کہ عالمی تبدیلیاں اس بات کا تقاضا کر رہی ہیں کہ مزید قریبی اور مزید رسمی اتحاد ہونا چاہیے۔ اس کا حصول ان معاہدوں کے ذریعہ ممکن ہو جائے گا جو کہ ابھی مذاکرات کے ابتدائی مرحلے میں ہیں۔[39]

ایسوسی ایٹیڈ پریس آف پاکستان کی یہ خبر کسی تعبیر وتشریح کی محتاج نہیں تھی۔ یہ خبر پاکستان کے محکمہ خارجہ نے دی تھی اور اس سے یہ بتانا مقصود تھا کہ ''انگریز بہادر'' نے پاکستان کے وزیراعظم کو مشرق وسطیٰ میں پان اسلام ازم کے نام پر سوویت یونین مخالف بلاک بنانے کا جو کام سپرد کیا تھا اس حد تک پورا ہوا ہے کہ پاکستان اور متعدد دوسرے مسلم ممالک کے درمیان دوستی کے دوطرفہ معاہدے ہونے کا امکان پیدا ہو گیا ہے اور اس سلسلے میں مزید کام کے لئے سرکاری سطح کی مجوزہ اسلامی کانفرنس میں زمین ہموار کی جائے گی۔ پاکستان کے محکمہ خارجہ کی اس خبر کی تصدیق اسی دن بغداد میں مقیم رائٹر کے نمائندے کی وہاں کے سرکاری حلقوں کے حوالے سے دی گئی اس اطلاع سے ہوئی کہ ''آئندہ چند ماہ کے دوران پاکستان اور عراق کے درمیان اتحاد و دوستی کے معاہدے پر دونوں ملکوں کے مابین دستخط ہو جائیں گے۔''[40] یکم جون کو سٹار نیوز ایجنسی کی وساطت سے لندن سے ایک خبر آئی جس سے ظاہر ہوا کہ ''انگریز بہادر'' اپنے سامراجی مفاد کی خاطر پان اسلام ازم کو فروغ دینے کے معاملے میں واقعی بہت سنجیدگی سے کوشاں ہے۔ سٹار نیوز ایجنسی کی طرف سے برطانیہ کے محکمہ خارجہ کی خبر یہ تھی کہ ''مسلم یونین کے چیئرمین نے ایک عالمی مسلم کانفرنس طلب کی ہے جو نور الاسلام مسجد کارڈف میں 12 رجون کو منعقد ہوگی۔ اس کی صدارت برطانیہ میں مسلم کمیونٹی کے سربراہ شیخ علی الحکیم کریں گے۔ پانچ سو مندوبین کے قیام کا بندوبست کیا گیا ہے جو مصر، شمالی افریقہ، عرب ریاستوں، صومالیہ، پاکستان، بھارت، ترکی اور چین سے آئیں گے۔ مسلم یونین کا مقصد مختلف ملکوں کے مسلمانوں کو ایک دوسرے سے متعارف کرانا ہے تا کہ وہ اسلامی منصوبوں میں تعاون کر سکیں۔ یونین کے منتظمین نے اس امر پر زور دیا ہے کہ اس کی پالیسی کسی حکومت یا کسی نقطہ نظر کے خلاف نہیں ہے اور اس کا نصب العین صرف اسلامی مقاصد کا حصول ہے تا کہ اسلام کو ان خطوط پر متحد کیا جا سکے جن کی تبلیغ 19 ویں صدی میں سید جمال الدین افغانی نے کی تھی۔'' انگریزوں نے ماضی میں بھی جب کبھی انہیں اپنے عالمی مفاد کی خاطر ضرورت پڑی تھی پان اسلام ازم کی حوصلہ افزائی کی تھی اور اب پھر وہ زور شور سے یہی کر رہے تھے کیونکہ دوسری جنگ عظیم کے دوران سوویت یونین اور اس کے اشتراکی نظریے کے عالمی وقار میں اتنا اضافہ ہو گیا تھا کہ ایشیا میں اس کے سدباب کے لئے مذہب کا حربہ ضروری ہو گیا تھا۔

سامراجی طاقتوں کی جانب سے اسلامی کانفرنس کی پشت پناہی پر پاکستان کے اخبارات کا شدید ردعمل

چونکہ لاہور کے روزنامہ پاکستان ٹائمز کی پالیسی سوویت یونین اور اس کے اشتراکی نظریے کے بارے میں ہمدردانہ تھی اس لئے اس اخبار نے سرکاری سطح کی مجوزہ اسلامی کانفرنس اور پاکستان اور دوسرے مسلم ممالک کے درمیان روس کے خلاف متوقع دوطرفہ معاہدوں کی اطلاع پر سخت نکتہ چینی کرتے ہوئے بجا طور پر یہ الزام عائد کیا کہ پان اسلام ازم کا یہ ڈھونگ انگریزوں کے اشارے پر رچایا جا رہا ہے۔ اخباری اداریہ یہ تھا کہ ''آج کی عالمی سیاست بڑی کشمکش کا شکار ہے۔ اگر اس کے پیرائے میں رکھ کر دیکھا جائے تو اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مجوزہ سیاسی اقدامات میں پاکستان کی جانب سے چند اہم عہد و پیمان کئے جا چکے ہیں۔ چنانچہ حکومت پاکستان کے ایما پر منعقد ہونے والی اسلامی کانفرنس کے اغراض و مقاصد کی کڑی چھان بین کرنا ضروری ہے...... جن رپورٹوں کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے ان سے پتہ چلتا ہے کہ معاہدوں کے لئے ابتدائی بات چیت کا موقع لیاقت علی خان کے حالیہ دورۂ مصر، عراق اور ایران نے مہیا کیا ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر کہ اس سلسلہ میں مناسب معلومات مہیا نہیں کی گئیں بعض حلقوں میں یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ وزیر اعظم لیاقت علی خان کے دورہ لندن کا تعلق پاکستان کی جانب سے مبینہ طور پر مسلمان ممالک کے ساتھ معاہدے کئے جانے کا اعلان کے ساتھ ہے۔ جب تک ان معاملات کی وضاحت نہیں ہو جاتی اس مسئلہ کے اس پہلو کا ذکر بے سود ہوگا۔ لیکن یہ حقیقت کہ برطانیہ مسلم اتحاد کے بارے میں پوری ڈھٹائی کے ساتھ پیش پیش ہے تا کہ حالات کو اس کے مفاد میں جوں کا توں رکھا جا سکے، مسلم ذہن میں شکوک وشبہات ابھارنے کے لئے کافی ہے اور ایسے منصوبوں کے بارے میں محتاط رویہ اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہے جن میں برطانوی مفادات ملوث ہیں۔ اس سلسلے میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ مشرق وسطی کے ممالک کے بعض سیاستدانوں کی یہ کوشش کہ اپنے ہم وطنوں کے ذہنوں کو برطانیہ کے بارے میں تبدیل کر دیا جائے، محض اس لئے ناکام ہوگئی ہے کہ برطانیہ کی پالیسی میں کوئی حقیقی تبدیلی رونما نہیں ہوئی ہے۔ چنانچہ مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہو سکے ہیں۔ یہ مسئلہ محض مسلمانوں میں سامراج کے خلاف تعصب

برقرار رکھنے کا نہیں ہے کہ سامراج تو اپنی موت آپ مر رہا ہے۔ اصل بات برطانیہ کا وہ کردار ہے جو وہ آج بھی دنیا کے بہت سے مسلمان ملکوں کے معاملات کے اندر ادا کر رہا ہے۔ مثلاً جیسا کہ لیبیا اور سوڈان میں بلاواسطہ طور پر اور چند دوسرے ملکوں میں بالواسطہ طور پر اس کا کردار قابل توجہ ہے۔ فلسطین ایک ایسا ملک ہے کہ جہاں برطانوی پالیسیاں کم وبیش تیس سال تک کھل کھیلتی رہی ہیں۔ اس کے نتائج سب کے سامنے ہیں۔ اردن کے علاوہ دوسرے تمام ممالک میں عوام کی سماجی وسیاسی آزادی کی خواہش کو بیرونی غلبہ اور سامراجی عزائم کی قربان گاہ پر قربان کیا جا رہا ہے۔ اردن میں بھی برطانوی ترجمان اپنے دوغلے کردار کے بارے میں کوئی ڈھکی چھپی نہیں رکھتے ہیں۔ جنگ کے بعد کے دور میں پہلا مسئلہ جس نے عرب عوام میں اپنے حقیقی مقام اور حیثیت کا احساس بیدار کیا وہ برطانیہ کے 1936ء کے برطانوی مصری معاہدے پر نظر ثانی سے انکار کی وجہ سے پیدا ہوا ہے جبکہ مصر بار ہا اپنے اس موقف کا اعادہ کر چکا ہے کہ یہ معاہدہ مساوی بنیادوں پر وجود میں نہیں آیا تھا زبردستی کروایا گیا تھا۔ 1931ء کے عراقی۔ برطانوی معاہدہ پر نظر ثانی کی عراقی کوشش کی ناکامی حالیہ مثال ہے جو برطانیہ کے اس ڈھونگ کا پردہ چاک کرتی ہے جو اس نے اپنے غلبہ کے زمانہ سے رچا رکھا تھا کہ وہ مسلمان قوموں کا حقیقی دوست ہے اور ان کے ساتھ مساوات اور بھائی چارہ کی بنیاد پر تعاون کرتا ہے۔ پھر ایک اور اہم مسئلہ افریقی عربوں کی آزادی کا ہے جن میں الجیریا، مراکش اور تیونس شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انڈونیشیا کے مسلمان ہیں۔ ان ممالک میں مغربی یونین کے دوشر کا راج کر رہے ہیں۔ اس کے باوجود کہ وہاں کے عوام کی طرف سے شدید مزاحمت جاری ہے۔ یہ ہیں دنیا کے مسلمانوں کے حقیقی مسائل جن کو حل کر کے ہی وہ باعزت طور پر زندہ رہ سکتے ہیں کیا مجوزہ کانفرنس جس میں ''اسلامک سٹڈیز'' کے ماہر یورپی اور امریکی سکالر بھی شریک ہوں گے، ان مسائل کا بے دھڑک ہو کر سامنا کر سکے گی؟ اس سوال کا درست جواب حاصل کرنے کے لئے ان حکومتوں کی نوعیت کو پیش نظر رکھنا ہوگا جو اس میں شریک ہو رہی ہیں۔ ان ملکوں کے کروڑوں پس ماندہ عوام معاشرتی انصاف، جمہوریت اور غیر ملکی سیاسی بالادستی اور سازشوں کے خاتمے کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ ان کی متعلقہ حکومتیں ان کے ان مطالبات کو یا تو ماننے سے قاصر ہیں یا ماننا نہیں چاہتیں۔ ابھی تو یہ دیکھنا ہے کہ آیا ان ملکوں کے نو آبادیاتی جاگیردارانہ نظام میں رہتے ہوئے یہاں کے حکمران اپنے بڑھتے ہوئے مسائل سے

نپٹنے کے قابل ہیں۔ مشترکہ فلاح کو فروغ دینے کی اہلیت تو بڑی دور کی بات ہے، پاکستان کے عوام یہ جاننے میں دلچسپی رکھتے ہیں کہ ان بھاری ذمہ داریوں کو قبول کرنا پاکستان کے لئے کس حد تک بہتر ہے جن سے کوئی فائدہ ہونا تو دور کی بات ہے لیکن جن سے ہونے والا شدید نقصان ایک معمولی فہم رکھنے والے آدمی کو بھی نظر آتا ہے۔ اس حقیقت کے علاوہ کہ اس قسم کے بالائی سطح پر ہونے والے اتحاد کو بے اصول عناصر اپنے اپنے ملکوں میں چلنے والی جمہوری تحریکوں کو کچلنے کے لئے استعمال کریں گے، انفرادی اور اجتماعی طور پر بین الاقوامی کشمکش میں ملوث ہونے کا خطرہ بھی بڑھ جائے گا اور آج کی نسبت کہیں زیادہ حقیقی نوعیت اختیار کر جائے گا۔ مجوزہ معاہدوں کی بنیادی نوعیت کے بارے میں ابھی تک کچھ زیادہ علم نہیں ہو سکا اور شاید ان کو آخری شکل دیئے جانے تک ان کے بارے میں کچھ زیادہ علم ہو ہی نہ سکے لیکن ملک کا روشن خیال طبقہ کسی ایک طرف جھکاؤ پیدا کرنے سے پیشتر وسیع اور بھاری مسائل پر وضاحت طلب کرنے میں حق بجانب ہے۔"[41]

روزنامہ امروز نے بھی ''اسلامی ملکوں سے معاہدے'' کے زیر عنوان اتحاد اسلامی یا اسلامی بلاک کے بارے میں برطانوی تجویز پر اظہار تشویش کیا اور یہ رائے ظاہر کی کہ اگر اینگلو۔ امریکی بلاک کی زیر سرپرستی اس تجویز پر عمل ہوا تو پاکستان اور دوسرے مسلم ممالک محض مغربی سامراج کے مفاد کی خاطر گٹھ جوڑ میں پھنس جائیں گے۔ اخبار کا مزید ادارتی تبصرہ یہ تھا کہ ''اس وقت جن برسر اقتدار حکومتوں سے معاہدے کرنا مقصود ہے، ہمیں دیکھنا ہوگا کہ کیا فی الواقع ان معاہدوں سے صحیح معنوں میں مسلمانوں کا اتحاد ہو جائے گا۔ شرق اردن کے شاہ عبداللہ اور مصر کے شاہ فاروق برطانیہ سے ایسے معاہدے کر چکے ہیں جن کی وجہ سے وہ سو فیصدی برطانوی محکمہ خارجہ کے پابند ہو گئے ہیں۔ 36ء کے معاہدہ کے بموجب مصر میں گورا فوج موجود ہے اور مصر کے دفاع کی ذمہ داری گوروں نے لے رکھی ہے۔ شاہ عبداللہ نے ابھی حال ہی میں جو معاہدہ کیا ہے تمام عرب ممالک نے اس کے خلاف احتجاج کیا ہے لیکن اس نے اس احتجاج کی پرواہ نہیں کی اور عقبہ میں دن دونی رات چوگنی رفتار سے گورا فوج بڑھ رہی ہے۔ اسی طرح عراق اور برطانیہ کے معاہدہ 1931ء پر نظر ثانی کے مطالبات کے باوجود انگریزوں نے اس ملک کو بھی جکڑ رکھا ہے۔ سعودی عرب سیاسی اور معاشی اعتبار سے عملاً امریکہ کی نوآبادی ہے اور ایران نے بھی حال ہی میں امریکہ سے اڑھائی ارب ڈالر قرض لیا ہے جو اس شرط پر دیا گیا ہے کہ اس رقم کو امریکہ کے فوجی

اور غیر فوجی ماہرین کے مشورے سے خرچ کیا جائے گا۔ ترکی نے گزشتہ چند سال کے دوران میں کسی مسئلے پر بھی اسلامی ممالک کے ساتھ تعاون نہیں کیا حتیٰ کہ اسرائیل تک کو تسلیم کر کے عالم اسلام سے بے تعلقی کا مظاہرہ کیا۔ ترکی کو چھوڑ کر سارے مشرق وسطیٰ میں کم و بیش قرون وسطیٰ کا طرز حکومت ہے۔ مطلق العنان بادشاہ عوام کی خواہشات سے بے پرواہ بیرونی طاقتوں کے اشارے پر حکومت کرتے ہیں۔ کیا ان حکومتوں سے معاہدہ کر کے ہم دعویٰ کر سکتے ہیں کہ دنیا کے مسلمانوں کا اتحاد قائم ہو گیا؟ یہ امر بھی معنی خیز ہے کہ ان معاہدوں کو وضع کرنے کے لئے اینگلو۔امریکن ماہرین کی خدمات حاصل کرنا بھی ضروری سمجھا گیا۔ برطانوی وزیر خارجہ نے بارہا کہا ہے کہ جس طرح مغربی یورپ میں ایک فوجی گٹھ جوڑ قائم کیا گیا ہے اسی طرح مشرق وسطیٰ کے بلاک میں بھی معاہدے ہونے چاہئیں اور پھر اس بلاک کو مغربی یورپ کے بلاک سے منسلک ہو جانا چاہیے۔ یونان کے وزیر خارجہ نے گزشتہ ماہ صاف صاف اعلان کیا تھا کہ یونان اور ترکی سے لے کر پاکستان تک کے تمام ممالک کے مابین فوجی اتحاد ضروری ہے۔ آسٹریلیا کے وزیر اعظم نے انکشاف کیا ہے کہ کامن ویلتھ کانفرنس میں اطلانتک پیکٹ کی طرح بحر الکاہل کے ممالک کا بھی ایک فوجی اتحاد قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ہمارے وزیر اعظم صاحب بھی کانفرنس میں شریک تھے اور وہاں سے واپسی کے دوران میں اور واپسی کے بعد ان کی جو مصروفیات رہی ہیں مندرجہ بالا پس منظر میں اسلامی ملکوں کے معاہدے کے متعلق حالیہ تجویز بہت زیادہ معنی خیز ہو جاتی ہے۔ بے ساختہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مشرق وسطیٰ کا بلاک بنانے کی تجویز بھی لندن کے صلاح مشوروں کا نتیجہ ہے؟ وزیر اعظم صاحب کو واضح کرنا چاہیے کہ ان معاہدوں کی نوعیت کیا ہو گی۔ جو اتحاد قائم ہو رہا ہے وہ جمال الدین افغانی اور علامہ اقبال کے خوابوں کی تعبیر ہے یا برطانیہ کے مسٹر بیون اور یونان کے ڈاکٹر تالداس کا تجویز کردہ فوجی گٹھ جوڑ ہے...... مسٹر بیون کی تجویز کے مطابق جو بلاک قائم ہو گا وہ اینگلو۔امریکن بلاک کا دم چھلا ہو گا اور مشرق وسطیٰ میں مقیم اڑھائی لاکھ گورا فوج اس کی حاکم مطلق ہو گی۔ کوشش کی جائے گی کہ مسلمان عوام امریکی اور برطانوی تاجروں کی بھڑکائی ہوئی جنگ کا ایندھن بنیں۔ پاکستان کی حکومت بارہا اعلان کر چکی ہے کہ وہ کسی بلاک میں شامل نہیں ہو گی۔ وقت آ گیا ہے کہ وہ اپنی پالیسی کی تفصیل سے وضاحت کرے۔ موجودہ حکومت کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ عوام سے استصواب کئے بغیر ملک کو برطانوی محکمہ خارجہ کی

مصلحتوں کا پابند کردے۔ہمیں شرق اردن اور افغانستان کے سلسلے میں جو تجربہ ہو چکا ہے ان ممالک کی غیر ذمہ دار حکومتوں کو بیرونی طاقتیں جب چاہتی ہیں مسلمانوں کے خلاف استعمال کرتی ہیں۔لہٰذا اب نیم آزاد اور قرون وسطیٰ کا نظم ونسق رکھنے والی حکومتوں کے بارے میں حکمت عملی متعین کرتے وقت ہمیں محتاط رہنا چاہیے۔''[42]

روزنامہ ''نوائے وقت'' پاکستان کی زیر قیادت اتحاد اسلامی کا زبردست مبلغ تھا۔لیکن دولت مشترکہ کانفرنس میں خفیہ صلاح مشورے کے بعد حکومت پاکستان کی طرف سے پیش کردہ اسلامی اتحاد کی تجویز کی یہ اخبار بھی کھل کر حمایت نہ کر سکا۔وجہ یہ تھی کہ برطانیہ کے وزیر خارجہ بیون اور دوسرے ارباب اقتدار اس تجویز کی برملا تائید کرتے تھے جبکہ پاکستان میں بوجوہ برطانیہ کے خلاف بے حد نفرت پائی جاتی تھی۔اس اخبار کی ادارتی رائے یہ تھی کہ ''جذبات کو افراد کی طرح قوموں کی زندگی میں بھی بڑا دخل ہوتا ہے مگر ایسے عظیم الشان مسائل محض جذبات سے حل نہیں کئے جا سکتے۔ان پر غور کرتے وقت حقائق کو بھی ہمیشہ سامنے رکھنا چاہیے۔یہ ایک تلخ و ناگوار حقیقت ہے کہ اس وقت مسلمان ملکوں کی حالت قابل رحم حد تک افسوسناک ہے۔ترکی سب سے زیادہ مضبوط ملک ہے مگر اس کی پالیسی اس وقت امریکہ کے ہاتھ میں ہے۔ترکی کو مسلمان ملکوں سے بہت کم دلچسپی ہے اور عربوں سے تو بالکل نہیں۔ترکی پہلا مسلمان ملک ہے جس نے اسرائیل کی یہودی مملکت کو تسلیم کیا ہے۔عرب ملکوں میں مصر مضبوط ترین ملک ہے مگر اس کی بھی نہایت کلیدی اہم اسامیاں انگریزوں کے قبضہ میں ہیں اور ''اخوان المسلمین'' کو مصری پولیس کا انگریز کمشنر رسل ہی کچل رہا ہے۔''اخوان المسلمین'' ایک ایسی جماعت ہے جو مشرق وسطیٰ میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور اسلامی اصولوں پر مسلمانوں کے اقتدار کی علمبردار ہے۔انگریزوں کے حکم سے مصر میں اس جماعت پر جو ظلم ڈھائے جا رہے ہیں وہ اس قدر زیادہ ہیں کہ یہودیوں پر نازی ظلم کو بھی لوگ بھول گئے ہیں۔مصر کی 90 فیصد آبادی انگریزوں کی سخت دشمن ہے مگر آزادی کے باوجود اس ملک میں انگریزوں کے قدم اس قدر مستحکم ہیں کہ خود شاہ فاروق کو انگریزی سفیر کے حکم پر اپنا معتمد علیہ وزیر اعظم برخاست کرنا پڑا۔شرق اردن تو انگریزوں کا پٹھو ہے ہی، عراق پر اصل اقتدار انگریزوں کا ہے۔واضح رہے کہ عراق اور شرق اردن دونوں ایک ہی خاندان کے زیر نگیں ہیں۔شام میں حسنی الزعیم نے حال ہی میں انقلاب برپا کیا ہے۔زعیم پر بھی امریکیوں کا اثر ہے۔یہی

حالت سعودی عرب کی ہے۔ رہا فلسطین تو وہ مٹ چکا ہے بلکہ فلسطین میں عربوں کی شکست نے سارے عرب ملکوں کا بھرم کھول دیا ہے اور ان کی آبرو مٹی میں ملا دی ہے۔ ایران پاکستان کا بہت زیادہ دوست اور ہمدرد ہے مگر بے حد کمزور۔ ایک طرف اینگلو۔ امریکن اسے دباتے ہیں، دوسری طرف روسی تلوار اس کے سر پر لٹک رہی ہے۔ افغانستان کی حالت سب سے بدتر ہے۔ وہ کمزور اور پسماندہ بھی ہے اور بدقسمتی سے پاکستان کے متعلق اس کے جذبات بھی دوستانہ نہیں۔ اندریں حالات ان ملکوں کے اتحاد کی کیا اہمیت ہے؟ متاع امید صرف پاکستان ہے۔ پاکستان سب سے بڑا اسلامی ملک ہے...... ہر لحاظ سے سب سے بڑا اسلامی ملک...... آبادی اس کی زیادہ ہے۔ خوراک کی اس کے پاس فراوانی ہے۔ دولت اس کے پاس زیادہ ہے اور فوج بھی اس کی مضبوط ترین ہے (سوائے ترکی کے)۔ پاکستان اسلامی ملکوں کا قدرتی لیڈر ہے اور اگر پاکستان ان ملکوں کو متحد و منظم کر سکے (اور یہ اتحاد واقعی آزاد و خودمختار ملکوں کا اتحاد ہے) تو لاہور سے انقرہ تک پھیلا ہوا یہ مسلم بلاک واقعی دنیا کی تیسری طاقت بن سکتا ہے کیونکہ اس بلاک کی جغرافیائی اور جنگی پوزیشن اور اہمیت کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا مگر شرط یہی ہے کہ یہ اتحاد آزاد و خودمختار ملکوں کا "ہمہ گیر اتحاد" ہو۔ سعد آباد پیکٹ کی طرح محض رسمی اور نمائشی معاہدہ بے سود ہے۔ اسی طرح ایسے ملکوں کا نمائشی اتحاد بے معنی ہے جن کی خارجہ پالیسی برطانیہ یا امریکہ کے ہاتھ میں ہے اور جن کے اندرونی نظام پر بھی انگریز یا امریکن قابض ہیں یا دخیل ہیں۔ ایسے کمزور ملکوں کا کمزور بلاک دراصل اینگلو۔ امریکن بلاک کا ایک بے اثر ضمیمہ یا دم چھلا سمجھا جائے گا۔ ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو عالم اسلام کی قیادت کا ایک سنہری موقع عطا فرمایا ہے۔ پاکستان کو یہ موقع رائیگاں نہیں گنوانا چاہیے۔ اگر اسلام کو سیاسی لحاظ سے بھی ایک زندہ عالمی قوت بنانا مقصود ہے تو پاکستان کو دوسرے مسلمان ملکوں کی رہنمائی کرنی چاہیے۔ مگر قیادت کی ابتدائی شرائط یہ ہیں کہ سب سے پہلے خود پاکستان اسلام کو صرف زبان سے نہیں دل سے قبول کر لے اور پاکستان پہلے خود انگریزوں کے اثر سے آزاد ہو اور اس کے بعد دوسرے مسلمانوں کو اس منحوس اثر سے آزاد کرائے۔ اس کے بعد جو بلاک معرض وجود میں آئے گا وہ واقعی آزاد اور مؤثر ہو گا اور پھر کوئی مسلمان ملک اس پر مجبور نہیں ہو گا کہ وہ اپنی مرضی اور مفاد کے خلاف دوسروں کی خاطر کسی جنگ میں شریک ہو۔ بلکہ اینگلو۔ امریکن اور روسی دونوں بلاک اس تیسرے اسلامی بلاک کے احترام پر

مجبور ہوں گے۔ اس مسئلہ پر غور کرتے وقت اس حقیقت کو نہیں بھولنا چاہیے کہ پاکستان کا انگریزوں کے زیر اثر رہنا صرف پاکستان کا ہی نہیں پوری دنیائے اسلام کا نقصان ہے۔"[43]

قرون وسطیٰ کی استبدادی مطلق العنانیت اور جاگیرداریت کو برقرار رکھتے ہوئے مسلم بلاک کا آزاد وخود مختار بلاک وجود میں نہیں آسکتا تھا

نوائے وقت کا مذکورہ اداریہ اس حد تک تو صحیح تھا کہ جو مسلم ممالک سیاسی اور معاشی لحاظ سے امریکہ و برطانیہ کے زیر اثر یا زیر نگیں یا زیر اقتدار تھے ان کے اتحاد کو اسلامی اتحاد نہیں کہا جا سکتا تھا اور اس سے مسلمانان عالم کو کوئی فائدہ پہنچنے کی امید نہیں کی جاسکتی تھی۔ لیکن اس کا یہ موقف غیر حقیقت پسندانہ تھا کہ پاکستان اسلامی ملکوں کا قدرتی لیڈر ہے اور اس کی زیر قیادت لاہور سے انقرہ تک کے مسلم ملکوں کا ایک ایسا آزاد وخود مختار مسلم بلاک قائم ہونا چاہیے جو واقعی دنیا کی تیسری بڑی طاقت ہو۔ یہ اخبار جب محض دلکش الفاظ آرائی کے ذریعے اس قسم کی باتیں لکھتا تھا تو یہ تاثر ملتا تھا کہ اسے اس وقت کی دنیا کے ٹھوس حالات کا کچھ علم نہیں تھا اور نہ ہی اسے یہ علم تھا کہ پاکستان اور دنیا کا کوئی دوسرا مسلم ملک اس وقت تک حقیقی معنوں میں آزاد وخود مختار نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ اس کا وہ سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام برقرار تھا جو قرون وسطیٰ میں نافذ کیا گیا تھا۔ انقرہ سے لاہور تک کسی ایک مسلم ملک کی صنعتی، سائنسی اور تکنیکی ترقی کی راہ سے ذرا سی بھی واقفیت نہیں تھی اور ان میں سے کسی ملک میں بھی جدید اسلحہ سازی کی صنعت کا نام ونشان نہیں تھا۔ ان ممالک میں قرون وسطیٰ کی استبدادی مطلق العنانیت اور جاگیرداریت کا دور دورہ تھا اور ان کے حکمرانوں کو اپنے عوام کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی ترقی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ انہیں دلچسپی تھی تو صرف یہ تھی کہ اپنے زیر نگیں علاقوں میں حالات کو جوں کا توں رکھا جائے۔ اگر اس مقصد کے لئے اسلام کا نعرہ کارگر ہو سکتا ہے تو یہ نعرہ لگانے میں پورا زور لگایا جائے اور اگر اس مقصد کے لئے اینگلو۔ امریکی بلاک کی سرپرستی ضروری ہو تو اسے قبول کرنے میں ذرا بھی تامل نہ کیا جائے۔ لیکن یہ اخبار ان مسلم ممالک کے ظالمانہ سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام میں بنیادی یا انقلابی تبدیلی کی ضرورت کے بارے میں کوئی لفظ نہیں لکھتا تھا البتہ اس ضرورت پر اپنا زور قلم صرف کرتا تھا کہ ان ممالک کو اینگلو۔ امریکی بلاک اور روسی بلاک دونوں ہی سے الگ رہ کر پاکستان کی زیر قیادت

ایک صحیح معنوں میں آزاد و خود مختار تیسرا بلاک بنانا چاہیے۔ یہ بات خواہش کی حد تک تو اچھی تھی لیکن یہ خواہش سارے مسلم ممالک کی دقیانوسی معیشت اور معاشرت میں انقلابی تبدیلی کے بغیر پوری نہیں ہوسکتی تھی۔ پاکستان سمیت کسی بھی مسلم ملک میں معاشی، معاشرتی، ثقافتی، صنعتی، سائنسی اور تکنیکی تبدیلی محض دلکش الفاظ پر مشتمل اداریوں کے زور پر راتوں رات نہیں ہوسکتی تھی۔

امریکی صدر ٹرومین نے 12/مارچ 1947ء کو اپنے سرد جنگ کے اعلان کے ذریعے ساری دنیا میں اس قسم کی تبدیلی یا انقلاب کی ممانعت کردی تھی اور یہ فتویٰ صادر کیا تھا کہ جو لوگ کسی بھی ملک میں اس قسم کی تبدیلی چاہتے ہیں یا اس قسم کی تبدیلی کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں وہ سوویت یونین کے ایجنٹ اور تخریب کار ہیں لہٰذا انہیں سختی سے کچل دیا جائے گا۔ ٹرومین کے اس اعلان کے بعد دنیا واقعی دو دھڑوں میں بٹ گئی تھی۔ ایک اینگلو۔امریکی بلاک کا حامی اور دوسرا سوویت یونین کا حامی۔ پھر 4/اپریل 1949ء میں اطلانتک پیکٹ کی تکمیل کے بعد اس عالمی دھڑے بندی میں مزید شدت پیدا ہوگئی تھی اور کسی مسلم ملک کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنے نظام حیات میں ہمہ گیر تبدیلی لائے بغیر اس دھڑے بندی میں ملوث نہ ہو۔ خود پاکستان کی حالت یہ تھی کہ اس نوزائیدہ ملک کی خارجہ پالیسی کی باگ ڈور چودھری ظفر اللہ خان، سر اکرام اللہ، غلام محمد، اسکندر مرزا اور چودھری محمد علی وغیرہ کے ہاتھوں میں تھی جو انگریزوں سے بھی زیادہ برطانیہ کے ''ملک معظم'' کے وفادار تھے۔ ان سامراجی پٹھوؤں کا خیال تھا کہ اب جبکہ مارشل پلان کے تحت مغربی یورپ کی معاشی بحالی ہوگئی اور مغربی یورپ میں فوجی گٹھ جوڑ بھی مکمل ہوگیا ہے تو امریکہ اور برطانیہ پاکستان اور مشرق وسطیٰ کے دوسرے مسلم ممالک کی معاشی ترقی کا بندوبست کریں گے اور مطلوبہ اسلحہ بھی فراہم کریں گے کیونکہ خود ان کا عالمی مفاد اسی میں مضمر ہے۔ لیکن یہ ان کی خام خیالی تھی۔ امریکہ اور برطانیہ نے دوسری جنگ عظیم کے بعد اپنی سابقہ نوآبادیوں میں اپنے پٹھوؤں کی وساطت سے جو جدید نوآبادیاتی نظام رائج کرنے کا سلسلہ شروع کیا تھا اس میں کسی پسماندہ مسلم ملک یا ایشیائی ملک کے لئے کوئی گنجائش نہیں تھی کہ وہ اپنے ہاں پرامن طریقے سے بورژوا جمہوری انقلاب برپا کرکے صحیح معنوں میں سیاسی، معاشی اور معاشرتی ترقی کی راہ پر گامزن ہوسکے۔ پاکستان کا وزیراعظم لیاقت علی خان جاگیردار طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس لئے وہ اپنے ملک میں جاگیرداری نظام کو ختم کرنا نہیں چاہتا تھا۔ البتہ یہ چاہتا تھا کہ امریکہ و برطانیہ

پاکستان کی سٹرٹیجک پوزیشن کے پیش نظر اس کی مالی و فوجی امداد کر کے اسے اتنا طاقتور بنائیں کہ یہ مشرق وسطیٰ میں پان اسلام ازم اور اندرونی طور پر اسلامی طرز حیات کے نعرے لگا کر سوویت مخالف اسلامی بلاک کا سربراہ بن جائے۔ نوائے وقت بھی یہی چاہتا تھا۔ یہ اخبار پاکستان کے اندر ہر اس شخص کو ملحد، اشتراکی اور غدار قرار دیتا تھا جو وطن عزیز کے فرسودہ معاشی و معاشرتی ڈھانچے میں تبدیلی کا مطالبہ کرتا تھا اور امریکہ اور برطانیہ سے یہ کہتا تھا (9/اپریل 1947ء) کہ پاکستان کی دفاعی اہمیت کا احساس کرو اور اس کی ہر طرح سے امداد کر کے اسے مستحکم بناؤ۔ لیکن جب سامراجی ایوان ہائے اقتدار میں اس کی شنوائی نہیں ہوتی تھی تو یہ محض بین الاقوامی بلیک میلنگ کی غرض سے اور پنجابی شاونزم کے نقطہ نگاہ سے وزیر اعظم لیاقت علی خان کی مخالفت کی غرض سے یہ تجویز پیش کرتا تھا کہ پاکستان اور دوسرے مسلم ممالک کو اینگلو۔ امریکی بلاک اور روسی بلاک دونوں ہی سے الگ رہ کر تیسرا عالمی بلاک بنانا چاہیے۔ یہ اخبار ایٹمی عہد میں محض مذہبی نعروں اور انشا پردازی کے زور سے ان مفلوک الحال اور پسماندہ مسلم ممالک کا ''آزاد و خود مختار'' تیسرا عالمی بلاک بنانے کا متمنی تھا جن میں جدید فولاد سازی، مشین سازی اور اسلحہ سازی کی صنعت کا دور دور تک کوئی نشان نہیں ملتا تھا، جن میں جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم و تربیت کے لئے کوئی ابتدائی منصوبہ بھی نہیں تھا اور جن کا برسر اقتدار جاگیردار طبقہ، بورژوا صنعتی انقلاب کا بدترین دشمن تھا اور چاہتا تھا کہ اینگلو امریکی سامراج کا جدید نو آبادیاتی نظام اس پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سایہ فگن رہے۔

پاکستان کا وزیر خارجہ چودھری محمد ظفر اللہ خان برطانوی سامراج کا بڑا ہی وفادار جانور تھا اور وہ پاکستان کے جاگیردار طبقے کا بھی بہترین وکیل تھا۔ چنانچہ اس نے 2/جون کو ایک اخباری انٹرویو کے دوران ایسوسی ایٹیڈ پریس کی 30/مئی کی مذکورہ خبر کی وکیلانہ انداز میں تصدیق کر دی کہ حکومت پاکستان نے مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک کو اسلامی کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی ہے اور یہ کہ پاکستان متعدد مسلم ممالک کے ساتھ دوستی کے دوطرفہ معاہدے کرے گا۔ اس نے یہ تصدیق اس طرح کی کہ پہلے تو اس نے نامہ نگار کے اس سوال کا جواب دینے سے انکار کر دیا کہ آیا وقت آ گیا ہے کہ اسلامی بلاک کچھ زیادہ عملی صورت میں قائم ہو جائے اور پھر اس نے پاکستان اور مشرق وسطیٰ کے درمیان دوستی کے مجوزہ معاہدوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ''پاکستان

اور اسلامی مما لک کے درمیان تعلقات پہلے ہی بہت دوستانہ ہیں۔ تاہم اگر ضرورت ہوئی تو ایسے معاہدے کئے جائیں گے۔''[44]

پاکستان اسلامی بلاک کے نام پر جبکہ ترکی معاہدۂ بحیرہ روم کے نام پر مشرق وسطیٰ میں سامراجی دفاعی بلاک وضع کرنے کے لئے کام کر رہا تھا

ظفر اللہ خان جن اسلامی مما لک کا بلاک بنانا چاہتا تھا اور جن اسلامی مما لک کے ساتھ دوستی کے معاہدے کرنا چاہتا تھا ان میں ترکی بھی شامل تھا۔ ترکی وہ ملک تھا جس کی چابی...... بقول نوائے وقت...... امریکہ کے ہاتھ میں تھی۔ جس کو مسلمان مما لک سے بہت کم دلچسپی تھی، جس کو عربوں سے بالکل دلچسپی نہیں تھی اور جس نے اسرائیل کی یہودی مملکت کو تسلیم کر لیا ہوا تھا۔ اس ملک کا ایک پارلیمانی وفد جون کے اوائل میں لندن میں تھا۔ اس وفد کے ایک رکن کا لندن میں مطالبہ یہ تھا کہ ''مشرق بعید کے معاہدہ'' کو مکمل کیا جائے اور اس کے بعد ایک ''معاہدہ بحیرہ روم'' (Mediternean Pact) معرض وجود میں لایا جائے۔ اس قسم کے معاہدے میں ترکیہ، ترکیہ کے جنوب میں واقع سارے عرب مما لک، ایران، اسرائیل اور مصر ہونے چاہئیں۔ ایسا معاہدہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ سب سے پہلے مشرق وسطیٰ میں امن قائم ہو، اس سے پہلے ہم ایسے معاہدہ پر بات چیت نہیں کر سکتے۔ میں چاہتا ہوں کہ مجوزہ گروپ میں اسرائیل کو بھی شامل کر لیا جائے۔ مشرق وسطیٰ کے مما لک کے درمیان کوئی امتیاز نہیں ہونا چاہیے۔''[45]

معاہدہ بحیرہ روم کی تجویز سب سے پہلے اکتوبر 1948ء میں پیرس میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس کے دوران زیر غور آئی تھی۔ ترکی کے لئے یہ تجویز ابتدا ہی سے قابل قبول تھی۔ چنانچہ 4 اپریل 1949ء کو معاہدہ اطلانتک پر دستخط ہونے کے تقریباً ایک ہفتہ بعد 12 اپریل کو ترک وزیر خارجہ اس سلسلے میں امریکی وزیر خارجہ سے مفصل بات چیت کرنے کے لئے واشنگٹن گیا تھا۔ اس تجویز میں پاکستان شامل نہیں تھا۔ حالانکہ وزیر خارجہ ارنسٹ بیون، مشرق بعید کو ہندوستان کی زیر سرکردگی اور مشرق وسطیٰ کو پاکستان کی زیر قیادت ''متحد'' دیکھنا چاہتا تھا۔ معاہدہ مشرق بعید کی تجویز اپریل 1949ء میں دولت مشترکہ کانفرنس کے دوران زیر غور آئی تھی اور معاہدہ کی جانب سے پہلے قدم کے طور پر کمیونسٹوں کے خلاف حکومت برما کی مالی، فوجی امداد

کے لئے ایک امدادی کمیٹی بنائی گئی تھی۔ اس معاہدہ کی تجویز پر رسمی طور پر اس حقیقت کے پیش نظر غور کیا گیا تھا کہ چین میں کمیونسٹوں کی پے در پے فتوحات کے پیش نظر جنوب مشرقی ایشیا کی صورتحال روز بروز خطرناک ہوتی جا رہی تھی تاہم برطانیہ کو امید تھی کہ چونکہ ہندوستان، مغربی طاقتوں سے دوستی کا عزم صمیم رکھتا ہے اس لئے اس کی امداد سے اس علاقہ میں امن و استحکام پیدا کیا جا سکے گا۔

باب:5

لیاقت نے دورہ سوویت یونین کی دعوت قبول کرنے کا ڈھونگ، محض اینگلو۔امریکی سامراج کی زیادہ توجہ لینے کی خاطر رچایا

لیاقت کو دورہ سوویت یونین کی دعوت اور

سوویت یونین کا گزشتہ دو سال کا غیر جانبدارانہ پس منظر

اسلامی کانفرنس کے بارے میں لیاقت علی خان کے انٹرویو کے پانچ چھ دن کے بعد 8رجون 1949ء کو وزیر خارجہ چودھری ظفر اللہ خان نے ایک پریس کانفرنس میں بتایا کہ وزیراعظم لیاقت علی خان اور بیگم لیاقت علی خان کو سوویت یونین کا دورہ کرنے کی دعوت دی گئی ہے اور یہ دعوت قبول کر لی گئی ہے۔ ظفراللہ خان کا یہ انکشاف پاکستانی عوام کے لئے خاصا جذبات انگیز تھا۔ پاکستان کے سارے باشعور حلقوں میں پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ اول اس لئے کہ پاکستانی عوام کو یہ توقع نہیں تھی کہ حکومت پاکستان اینگلو۔امریکی سامراج کے حلقہ اثر سے باہر ہو کر آزاد خارجہ پالیسی اپنائے گی۔ دوئم اس لئے کہ پاکستانی عوام ہندوستان کے بعد برطانیہ کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے تھے اور اس کے دشمن کو یعنی سوویت یونین کو اپنا دوست سمجھتے تھے۔ سوئم اس لئے کہ دوسری جنگ عظیم کے دوران سوویت یونین کے عالمی وقار میں بے پناہ اضافہ ہوا تھا اور یہ ملک نظریاتی لحاظ سے غریب اقوام وعوام کا ہمدرد تصور کیا جاتا تھا اور چہارم اس لئے کہ 7رمئی 1949ء کو امریکہ کے صدر ٹرومین کی طرف سے ہندوستان کے وزیراعظم جواہر لال نہرو کو دورۂ امریکہ کی دعوت سے پاکستان کی جو سبکی ہوئی تھی اب اس کا ازالہ ہو گیا تھا۔

سوویت یونین کی جانب سے پاکستان کے وزیراعظم لیاقت علی خان کے نام اس دعوت نامے کا پس منظر یہ تھا کہ اگرچہ ماسکو کے ہفت روزہ نیوٹائمز کے 4رجولائی 1947ء کے شمارے کے تبصرے کے مطابق سوویت حکومت کی رائے یہ تھی کہ ''برطانیہ نے برصغیر ہندوستان کو تقسیم کرنے کا جو فیصلہ کیا ہے وہ ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی برطانوی حکمت عملی کا نیا مظاہرہ ہے۔ برطانیہ کا خیال ہے کہ اس طرح قومی عناد بڑھے گا...... اور ایسی صورتحال پیدا ہوگی جو ہندوستان کے اندرونی معاملات میں برطانوی مداخلت کے لئے سازگار رہوگی۔''[1] تاہم جب ستمبر 1947ء میں پاکستان کی اقوام متحدہ میں شمولیت کا سوال اٹھایا گیا تو سوویت یونین نے اس تجویز کی مخالفت نہیں کی تھی حالانکہ وہ لنکا کی اس عالمی ادارے میں شمولیت کی مخالفت کر چکا تھا۔ پھر جب جنوری 1948ء میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں تنازعہ کشمیر پیش ہوا تو سوویت یونین نے غیر جانبدارانہ رویہ اپنایا۔ فروری 1948ء میں جب سلامتی کونسل کے کینیڈین صدر نے اس تنازعہ کے بارے میں قرارداد کا ایسا مسودہ تیار کیا جو پاکستان کے حق میں تھا تو سوویت یونین نے اس کی کوئی مخالفت نہ کی۔ اپریل 1948ء میں حکومت برطانیہ کی تحریک پر ایسی قرارداد مرتب ہوئی جو ہندوستان کے حق میں تھی تو سوویت نمائندے نے پھر بھی بے اعتنائی کا مظاہرہ کیا۔ اس صورتحال میں پاکستان کے وزیر خارجہ چودھری ظفر اللہ خان نے 13راپریل 1948ء کو سوویت یونین کے نائب وزیر خارجہ آندرے گرومیکو کے نام نیویارک میں ایک چٹھی لکھی جس میں تجویز پیش کی گئی تھی کہ پاکستان اور سوویت یونین کے درمیان سفارتی تعلقات قائم کئے جائیں۔ گرومیکو نے یہ تجویز فوراً منظور کر لی۔ اگرچہ ظفر اللہ خان نے اس سلسلے میں جو پہل کی تھی اس میں سنجیدگی کا عنصر شامل نہیں تھا۔ ظفر اللہ خان کا مقصد محض یہ تھا کہ برطانیہ کو یہ دھمکی دے کر کہ پاکستان روس سے دوستانہ تعلقات قائم کر سکے گا، سلامتی کونسل میں تنازعہ کشمیر کے بارے میں وہ قرارداد منظور کرائی جائے جس کا مسودہ کینیڈا کے مندوب نے فروری میں تیار کیا تھا۔ لیکن برطانیہ نے اس کی اس دھمکی کی کوئی پرواہ نہ کی کیونکہ اس نے پاکستانی لیڈروں کے بازو آزمائے ہوئے تھے۔ چنانچہ 21راپریل 1948ء رکو سلامتی کونسل نے جو قرارداد منظور کی وہ اس لحاظ سے ہندوستان کے حق میں تھی کہ اس سے مسئلہ کشمیر کھٹائی میں پڑ گیا تھا۔

اس قرارداد کی منظوری کے تقریباً دو ہفتے بعد 2رمئی 1948ء کو ماسکو اور کراچی سے

بیک وقت اعلان ہوا کہ پاکستان اور سوویت یونین سفارتی تعلقات قائم کرنے پر رضا مند ہو گئے ہیں۔ 4رمئی کو ڈان کی اطلاع یہ تھی کہ ''لندن میں بہت سے لوگوں نے اس خبر پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ پاکستان اور سوویت یونین سفارتی تعلقات قائم کرنے پر متفق ہو گئے ہیں۔ اس خبر سے اور پاکستان کی جانب سے سوویت یونین کے پاس کپاس کی حالیہ فروخت سے پاکستانی عوام کا یہ مطالبہ نمایاں طور پر سامنے آ گیا ہے کہ پاکستان کو بین الاقوامی امور میں غیر ملکی طاقتی بلاکوں سے الگ رہ کر از خود پہل کرنی چاہیے۔''[2] تاہم اس سلسلے میں مزید کوئی کاروائی نہ ہوئی۔ چودھری ظفر اللہ خان اور چودھری محمد علی سوویت یونین کے ساتھ کئے گئے اس فیصلے کو فراموش کر کے جولائی 1948ء کے بعد کشمیر سے متعلقہ اقوام متحدہ کے کمیشن سے مصروف گفت وشنید رہے اور وزیر اعظم لیاقت علی خان نے اکتوبر 1948ء کی دولت مشترکہ کانفرنس میں یہ ذمہ داری قبول کر لی کہ وہ مشرق وسطیٰ اور ایشیا کے دوسرے علاقوں میں سوویت مخالف بلاک بنانے میں امریکہ و برطانیہ کی امداد کرے گا لیکن جب یکم جنوری 1949ء کو کشمیر میں جنگ بندی کے بعد پاکستان میں برطانیہ کے خلاف عوام الناس کے جذبات بھڑک گئے، جب فروری 1949ء میں مغرب کے ذرائع ابلاغ نے ہندوستان کے وزیر اعظم نہرو کی ایشیائی کانفرنس کی تائید کرتے ہوئے اسے ایشیا کا لیڈر بنانے کے سامراجی ارادے کا اعلان کیا، جب 15رمارچ 1949ء کو برطانوی کنزرویٹو لیڈر انتھونی ایڈن نے نئی دہلی کی ایک خفیہ میٹنگ میں، جس میں امریکہ کے محکمہ خارجہ کے شعبہ ایشیائی امور کا سربراہ بھی شامل تھا، کمیونزم کے خلاف اینگلو۔امریکی بلاک کی پروپیگنڈا سرگرمیوں کے بارے میں غور وخوض کیا اور پھر اس نے پاکستان آ کر اس ملک کی شمال مغربی سرحد کے حالات کا جائزہ لیا، جب اسی مہینے میں برطانیہ کے محکمہ دولت مشترکہ کے انڈر سیکرٹری گارڈن واکر نے کراچی اور دہلی میں طویل قیام کر کے ایشیا میں کمیونزم کے خلاف دفاعی انتظامات کے بارے میں تبادلہ خیالات کیا، جب اپریل 1949ء میں دولت مشترکہ کانفرنس میں ہندوستانی وزیر اعظم جواہر لال نہرو کی غیر معمولی پذیرائی ہوئی اور پاکستانی وزیر اعظم لیاقت علی خان سے اہانت آمیز سلوک کیا گیا، جب 7رمئی کو یہ اعلان ہوا کہ امریکہ کے صدر ٹرومین نے ہندوستانی وزیر اعظم نہرو کو امریکہ کے دورے کی دعوت دی ہے اور پھر جب ان سارے واقعات کی وجہ سے پاکستان میں رائے عامہ برطانیہ اور امریکہ کے خلاف بے انتہا برہم ہو گئی تو 15رمئی 1949ء کو تہران میں

لیاقت علی خان کی جانب سے ایرانی کابینہ کے ارکان، مسلم ممالک، سوویت یونین، برطانیہ، امریکہ اور ہندوستان کے سفارتی نمائندوں کے لئے دیئے گئے عشائیہ میں سوویت ناظم الامور نے بیگم لیاقت علی خان سے استفسار کیا کہ آیا وہ اور اس کے شوہر سوویت یونین کا دورہ کرنا پسند کریں گے تو بیگم لیاقت علی خان نے اس سوال کا اثبات میں جواب دیا تو پھر اسی تقریب میں سوویت ناظم الامور اور لیاقت علی خان کے درمیان طویل گفتگو ہوئی۔ اس واقعہ کے تقریباً دو ہفتے بعد 2/جون کو سوویت یونین نے تہران میں متعین پاکستانی سفیر راجہ غضنفر علی کی وساطت سے لیاقت علی خان اور اس کی بیگم کے نام دعوت نامہ بھیج دیا۔ لیاقت نے 7/جون کو دعوت نامہ منظور کر لیا تو 8/جون کو پاکستان کے وزیر خارجہ چودھری ظفر اللہ خان نے ایک پریس کانفرنس میں اس کا اعلان کر دیا۔

لیاقت نے سوویت یونین کی دعوت آزاد خارجہ پالیسی کے تحت قبول نہیں کی، وہ صرف برطانیہ اور امریکہ کی زیادہ توجہ کا طلب گار تھا

چودھری ظفر اللہ خان نے پریس کانفرنس میں یہ اعلان اس حقیقت کے باوجود کیا کہ اسے وزیر اعظم لیاقت علی خان کا یہ فیصلہ پسند نہیں تھا۔ اس نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار اشارۃً اسی پریس کانفرنس میں کر دیا جبکہ اس سے پوچھا گیا کہ آیا وزیر اعظم کے دورہ ماسکو کے نتیجے میں روس اور پاکستان کے درمیان سفارتی تعلقات قائم ہو جائیں گے۔ اس کا جواب یہ تھا کہ ''دونوں ممالک پہلے ہی سفارتی نمائندوں کے تبادلہ پر اتفاق کر چکے ہیں۔ لیکن اب تک یہ تبادلہ اس لئے نہیں ہو سکا کہ پاکستان میں عملہ کی کمی ہے۔''[3] جی۔ ڈبلیو۔ چودھری جسے ایوب خان کے عہد میں پاکستان کے محکمہ خارجہ کی خفیہ دستاویزات تک رسائی حاصل تھی، لکھتا ہے کہ ''چودھری ظفر اللہ خان حکومت پاکستان کے سوویت مخالف ٹولے سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ ٹولہ ظفر اللہ خان کے علاوہ وزیر خزانہ غلام محمد، محکمہ خارجہ کے سیکرٹری اکرام اللہ، محکمہ دفاع کے سیکرٹری اسکندر مرزا اور بعض دوسرے اعلیٰ حکام پر مشتمل تھا۔ پاکستان کے بیرونی تعلقات کے بارے میں یہی ٹولہ فیصلے کیا کرتا تھا۔ اس ٹولے کے ارکان بے انتہا مغرب نواز تھے اور وہ یہ تصور بھی نہیں کرتے تھے کہ کمیونسٹ روس میں کوئی قابل تعریف بات ہو سکتی ہے یا اس سے قریبی ربط قائم ہو سکتا ہے۔ چونکہ انہیں کریملن کے عزائم کے بارے میں خدشہ رہتا تھا اس لئے وہ ماسکو کی جانب ہر تحریک کو سبوتاژ کیا

کرتے تھے۔ انہیں افسوس رہتا تھا کہ برصغیر کی تقسیم کی وجہ سے پاکستان سوویت توجہ کا مرکز بن گیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ روس کی اس وقت کی پالیسی اور خلیج فارس کے علاقے میں اس کی روایتی دلچسپی کے درمیان واضح تعلق ہے۔ مزید برآں وہ اپنی مغرب نوازی کے حق میں یہ دلیل دیا کرتے تھے کہ پاکستان کو مالی وفوجی امداد کی ضرورت ہے اور سوویت یونین سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی ہے کہ وہ اس ضرورت کو پورا کر سکے گا۔''[4]

لندن کا روزنامہ ڈیلی ٹیلیگراف بھی قدرتی طور پر 8 رجون کے اس اعلان سے ناخوش تھا۔ چنانچہ اس کا تبصرہ یہ تھا کہ ''پاکستانی وزیراعظم دولت مشترکہ کے کسی رکن ملک کا پہلا سربراہ حکومت ہوگا جو روس کا دورہ کرے گا۔ یہ دورہ اکتوبر میں ہوگا جبکہ ہندوستان کا وزیراعظم پنڈت نہرو امریکہ کا دورہ کرے گا۔'' تاہم لیاقت نے اپنے اس فیصلے کا یہ جواز پیش کیا کہ ''برطانیہ پاکستان سے سوتیلی ماں کا سا سلوک کرتا ہے۔ پاکستان انتظار نہیں کرسکتا۔ اس کے لئے لازمی ہے کہ جہاں کہیں بھی اسے اپنے دوست ملیں وہ انہیں اپنائے۔''[5] لیاقت علی خان کے اس انٹرویو کا مطلب یہ تھا کہ اگر برطانیہ پاکستان سے سوتیلی ماں کا سا سلوک کرنا ترک کردے تو پھر پاکستان کسی اور جگہ اپنے دوستوں کی تلاش نہیں کرے گا۔ بالفاظ دیگر اس نے ماسکو جانے کا فیصلہ اس لئے نہیں کیا تھا کہ وہ واقعی آزاد خارجہ پالیسی اپنانے کا کوئی ارادہ رکھتا تھا بلکہ اس لئے کیا تھا کہ اس طرح وہ امریکہ اور برطانیہ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کی امید کرتا تھا۔ امریکی صدر ٹرومین کی جانب سے ہندوستانی وزیراعظم پنڈت نہرو کو دورۂ امریکہ کی دعوت سے لیاقت کی بڑی سبکی ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے دورہ ماسکو کے اعلان سے پاکستان کے اندر اور باہر اس کا وقار بحال ہوجائے گا۔

لیاقت علی خان کا یہ خیال بے وزن اور بے بنیاد نہیں تھا۔ پاکستانی عوام نے 8 رجون کے اعلان کا بے ساختہ اور پرجوش خیر مقدم کیا کیونکہ قیام پاکستان کے بعد انہیں پہلی مرتبہ یہ تاثر ملا تھا کہ ان کا ملک واقعی آزادی وخود مختاری کی راہ پر چل پڑا ہے۔ روزنامہ امروز اور روزنامہ پاکستان ٹائمز نے اپنے اداریوں میں لیاقت علی خان کو اس کے اس فیصلے پر مبارکباد دی اور اسے یہ مشورہ دیا کہ دولت مشترکہ کے گٹھ جوڑ کو خیرباد کہو اور غیر جانبداری کی پالیسی پر عمل کرو۔ لیکن نوائے وقت نے اس سلسلے میں عوام الناس کی پوری طرح ہمنوائی نہ کی بلکہ الفاظ کے ہیر پھیر سے ظفراللہ

خان اینڈ کمپنی کی مغرب نواز پالیسی کی تائید کی۔ اس اخبار کا اداریہ یہ تھا کہ ''پونے دو سال کے تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ برطانیہ کے نزدیک پاکستان کی اہمیت ثانوی ہے۔ اس لئے پاکستان کی دوستی بھی برطانیہ کے لئے ایک ثانوی چیز ہے۔ انگریزوں کے نزدیک اولین اہمیت ہندوستان کو حاصل ہے اس لئے ہندوستان کی دوستی بھی پاکستان سے دوستی پر فوقیت رکھتی ہے برطانیہ کا رویہ اس قدر افسوسناک تھا کہ مسٹر لیاقت علی خان کو بھی لندن میں اس کی شکایت کرنی پڑی اور یہ شکایت کافی سخت الفاظ میں تھی۔ یو۔ این۔ او میں بھی پاکستان نے پچھلے دنوں جو طرز عمل اختیار کیا وہ ایک آزاد ملک کے شایان شان تھا۔ فلسطین کے معاملہ میں، انڈونیشیا کے معاملہ میں اور لیبیا کے معاملہ میں پاکستان نے برطانیہ کا ساتھ نہیں دیا۔ بالخصوص لیبیا کے معاملے میں پاکستان نے بیون۔ سفوزا پیکٹ کی مخالفت کرتے ہوئے جس طرح برطانیہ کو شکست دی اس سے بہت سے لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ ان دو اہم تغیرات کے علاوہ تیسری نہایت اہم تبدیلی پاکستان کے عوام کے رجحان کی تبدیلی تھی۔ گزشتہ تین ماہ میں عوام کے خیالات و رجحانات میں ایک حیرت انگیز تبدیلی واقع ہوگئی ہے۔ پاکستان کا سوچنے سمجھنے والا اور سیاسی شعور سے بہرہ ور حلقہ ہی نہیں، عوام بھی اب کھلم کھلا یہ کہہ رہے ہیں کہ ہمیں اپنی قسمت اندھا دھند کسی ایک بلاک سے وابستہ نہیں کر دینی چاہیے۔ ہم کسی آئندہ جنگ میں کسی بلاک کے خیمہ برداروں کی حیثیت سے کیوں شامل ہوں؟ عوام نے اپنے خیالات کا اظہار بڑے واضح اور غیر مبہم الفاظ میں کیا ہے۔ حکومت اپنی خارجہ پالیسی مرتب کرتے وقت عوام کے ان خیالات کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔ پرانی پالیسی کے متعلق سب کو اتفاق ہے کہ یہ نظر ثانی کی محتاج ہے۔ نئی پالیسی مرتب کرتے وقت ملک کی ضرورتوں، عوام کے رجحانات اور برطانیہ کے رویہ کے علاوہ پاکستان کے متعلق روس کے خیالات اور عزائم کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔ ہمیں یقین ہے کہ حکومت پاکستان کے ارباب اختیار ملک کی ضرورتوں سے بے خبر نہیں۔ اب عوام کے رجحانات سے بھی بے خبر نہیں ہوں گے۔ وزیر اعظم حال ہی میں لندن سے واپس آئے ہیں۔ انہیں برطانیہ کے رویہ سے پوری آگاہی ہو چکی ہو گی۔ ان کے روس کے سفر سے اس امر کا پتہ چل جائے گا کہ روس کس نہج پر پاکستان سے تعلقات استوار کرنا چاہتا ہے؟ اور یہ دوستی کس حد تک پاکستان کے لئے مفید ہوگی۔ کیونکہ ہماری خارجہ پالیسی کا بنیادی نکتہ اب یہی ہونا چاہیے کہ امن عالم کے اعلیٰ مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے پاکستان کا اپنا فائدہ غیر جانبدار رہنے میں

ہے یا کسی بلاک سے وابستگی میں اور اگر کسی بلاک سے وابستگی ناگزیر ہے تو کون سے بلاک سے تعلقات پاکستان کے لئے مفید ہوں گے۔"[6] اس اداریے سے ظاہر ہے کہ نوائے وقت کو بھی ظفر اللہ خان اینڈ کمپنی کی طرح روس کے خیالات وعزائم کے بارے میں خدشہ لاحق تھا۔ وہ اس رائے کا بھی حامل تھا کہ روس پاکستان کی ضرورتیں پوری نہیں کر سکے گا اور یہ کہ پاکستان کے لئے غیر جانبداری کی پالیسی ضروری نہیں بلکہ اسے ایسی پالیسی اپنانی چاہیے جس میں اس کا اپنا فائدہ ہو۔ خواہ وہ پالیسی کسی بلاک کے ساتھ وابستگی کی ہی ہو۔ نوائے وقت کے اس اداریے سے یہ بھی ظاہر ہے کہ اسے شکایت تو صرف یہ تھی کہ برطانیہ کے نزدیک پاکستان کی اہمیت ثانوی ہے اور وہ ہر معاملے میں ہندوستان کو فوقیت دیتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اگر اس کی شکایت کا کسی نہ کسی طرح ازالہ ہو جائے تو اینگلو۔ امریکی بلاک کے ساتھ وابستگی سے پاکستان کا فائدہ ہوگا۔ اس طرح اس کی مالی وفوجی ضرورتیں پوری ہوں گی اور خلیج فارس کا علاقہ روسیوں کی دستبرد سے بچا رہے گا۔ اسے اس علاقے کے تیل کے ذخائر پر اینگلو۔ امریکی بلاک کی اجارہ داری پر کوئی اعتراض نہیں تھا البتہ اسے یہ اعتراض تھا کہ ان ذخائر کے تحفظ کے لئے پاکستان کو جو جغرافیائی اور جنگی اہمیت حاصل ہے یہ بلاک اس کا احساس نہیں کرتا۔ اسے اس علاقے میں امریکہ کی استحصالی پالیسی پر بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اسے صرف برطانیہ سے شکوہ تھا اور وہ امید کرتا تھا کہ امریکہ کی توجہ سے یہ شکوہ رفع ہو جائے گا۔

پاکستان بدستور، سوویت مخالف اسلامی بلاک کی تشکیل کے سامراجی منصوبہ پر عمل پیرا رہا

نوائے وقت کے مذکورہ اداریے سے مزید ظاہر ہے کہ یہ اخبار پنجاب میں صرف درمیانہ طبقہ کے مقامی شاونسٹوں کی ہی ترجمانی نہیں کرتا تھا بلکہ وہ مرکزی حکومت میں اس ٹولے کی بھی ترجمانی کرتا تھا جو اندرخانے لیاقت علی خان کے اقتدار کی بیخ کنی میں مصروف رہتا تھا۔ اس ٹولے کا سرغنہ وزیر خزانہ غلام محمد تھا اور "بازوئے شمشیر زن" محکمہ دفاع کا سیکرٹری اسکندر مرزا تھا۔ چونکہ اس ٹولے کو سوویت یونین سے آنے والے دعوت نامے کا علم تھا اس لئے اس نے 31 مئی کو اسلامی کانفرنس کے بارے میں خبر چھپوا کر پاکستان کے اندر اور باہر پہلے ہی سے یہ تاثر پیدا کر دیا

تھا کہ لیاقت کو دورۂ روس کی دعوت کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ اینگلو۔امریکی بلاک کی زیر پرستی سوویت مخالف اسلامی گٹھ جوڑ کا منصوبہ ترک کر دیا جائے گا۔ بظاہر اس تاثر کو مزید پختہ کرنے کے لئے 8 ؍جون کو جب چودھری ظفر اللہ خان نے لیاقت علی کے نام روس کے دعوت نامے کا اعلان کیا تو اس سے ایک دن پہلے پاکستان مسلم لیگ کے صدر چودھری خلیق الزماں نے ایک بیان میں پاکستان اور مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک کے درمیان اتحاد کی اہمیت پر زور دیا تھا۔ اس نے کہا تھا ''قطع نظر اس کے کہ مسلم ممالک کے نمائندوں کی کانفرنس کے بارے میں جو حال ہی میں رپورٹ شائع ہوئی ہے اس کی کوئی بنیاد ہے یا نہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان سمیت مشرق وسطیٰ کے ممالک کے سیاسی حلقوں میں یہ خواہش زور پکڑ رہی ہے کہ معاشی اور سیاسی شعبوں میں ان کے درمیان قریب تر تعاون ہونا چاہیے اور اس امر کا امکان ہے کہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے جلد ہی کوئی مثبت اقدامات کئے جائیں گے۔ اگر سب کی مرضی سے مشترکہ معاشی و سیاسی مقاصد پورے کرنے کے لئے ایک مستحکم اور پائیدار بنیاد استوار ہو سکے تو اس علاقائی گروپنگ سے رکن ممالک کو ایک دوسرے سے بے پناہ فوائد حاصل ہوں گے۔ لیکن بلا لحاظ اس کے کہ ان ممالک کی ایسوسی ایشن کی ہیئت کیا ہوگی یہ ظاہر ہے کہ عوامی تنظیم کے بغیر یہ ایسوسی ایشن نہ تو مضبوط ہوگی اور نہ ہی اس کے اتحاد کا نصب العین میں کوئی وزن ہوگا اور کشیدگی اور تصادم کے دور میں اس کی کامیابی کی کوئی امید نہیں ہوگی۔ تجربہ سے ظاہر ہوا ہے کہ اتاترک غازی مصطفیٰ کمال پاشا نے جو سعد آباد پیکٹ کروایا تھا، دوسری جنگ عظیم میں اس کے پرخچے اڑ گئے تھے اور اس معاہدے کے رکن ممالک عوامی حمایت کی عدم موجودگی کے باعث اپنی اپنی راہ پر چل نکلے تھے۔ حال ہی میں عرب لیگ کو عرب ممالک کو متحد رکھنے میں جو ناکامی ہوئی ہے وہ اس حقیقت کی واضح علامت ہے کہ عوامی تنظیم کے بغیر مشرق وسطیٰ کے ممالک کی از سر نو گروپنگ کی کوئی تحریک کامیاب نہیں ہو سکی۔ لہٰذا مشرق وسطیٰ کی رائے عامہ کے لیڈروں کے درمیان اس سوال پر تبادلہ خیالات بہت ضروری ہے کہ سارے مشرق وسطیٰ میں عوامی تنظیم کے قیام کے لئے یہ وقت کس حد تک موزوں ہے۔''[7]

چودھری خلیق الزماں کے اس بیان کا مطلب یہ تھا کہ مشرق وسطیٰ میں مسلم ممالک کے سوویت مخالف گٹھ جوڑ کے لئے سیکولر عرب لیگ کی جگہ ایک بین الاسلامی مسلم لیگ یا اسلام لیگ قائم کی جائے اور مجھے اس عظیم تنظیم کا سربراہ بنایا جائے۔ چنانچہ 9 ؍جون کو لیاقت علی خان کے نام سوویت

یونین کے دعوت نامے کی خبر چھپی تو اس کے ساتھ یہ خبر بھی چھپی کہ ''پاکستان مسلم لیگ کا صدر چودھری خلیق الزماں مستقبل قریب میں مسلم ممالک کے دورے پر جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس کا مشن یہ ہوگا کہ ایک بین الاسلامی عوامی تنظیم کے قیام کے لئے زمین ہموار کی جائے۔ یہ تنظیم اس امر کو یقینی بنائے گی کہ مختلف مسلم ممالک کے درمیان پائیدار بنیادوں پر تجارتی و ثقافتی رشتے قائم ہوں۔ پاکستان اور دوسرے مسلم ممالک کے درمیان معاہداتی رشتے استوار کرنے کی تحریک پہلے ہی ہو چکی ہے۔ چودھری خلیق الزماں اپنے دورے کے دوران کنفیڈرل اسلامی مملکت سے متعلقہ اپنے نصب العین کے لئے رائے عامہ کے لیڈروں اور پالیسی سازوں کی حمایت حاصل کرے گا۔ اس سلسلے میں اس کا تصور یہ ہے کہ ایک اسلامی مملکت اپنی نوعیت کے لحاظ سے غیر علاقائی ہونی چاہیے اور قرآن پاک کے احکامات کے مطابق اس میں ساری ملت اسلامیہ شامل ہونی چاہیے۔''[8]

چودھری خلیق الزماں کے اس بیان اور اس کے مجوزہ دورہ مشرق وسطیٰ کی اس رپورٹ کا اس کے سوا کوئی اور مطلب نہیں ہو سکتا تھا کہ اندرون ملک اور بیرون ملک متعلقہ حلقوں کو یقین دلایا جائے کہ لیاقت علی خان کے دورہ سوویت یونین سے اتحاد اسلامی کے منصوبے پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ اور یہ کہ پاکستان بدستور اینگلو۔امریکی بلاک سے وابستہ رہے گا۔ 10 رجون کو اس سلسلے میں مزید یقین دہانی کرائی گئی جبکہ واشنگٹن سے یہ خبر دی گئی کہ پاکستان کے محکمہ دفاع کا سیکرٹری اسکندر مرزا امریکہ پہنچ رہا ہے جہاں وہ وہاں کے فوجی نظام کا معائنہ کرے گا۔[9] اسی دن کراچی سے یہ خبر بھی جاری ہوئی کہ ''پاکستان میں بین الاقوامی اسلامک اکنامک کانفرنس کے انعقاد کے لئے 22 مسلم ممالک کو دعوت نامے بھیج دیئے گئے ہیں۔ ان ممالک میں ترکی، مصر، سعودی عرب، عراق، ایران، شام، لبنان، افغانستان، انڈونیشیا، لیبیا، ہسپانوی مراکش، ملایا، شرق اردن اور یمن شامل ہیں۔ یہ کانفرنس کراچی میں نومبر کے مہینے میں ہوگی اور اس میں عالم اسلام کی معیشت کو ترقی دینے کے طریقوں پر غور کیا جائے گا۔ اس کانفرنس کی آرگنائزنگ کمیٹی ایک مستقل تنظیم قائم کرنے کا ارادہ رکھتی ہے جو سارے مسلم ممالک اور مسلم اکثریتی ممالک کے تجارتی و صنعتی اعداد و شمار جمع کر کے ان کے بارے میں متعلقہ ممالک کو باخبر رکھے گی۔''[10] 18 رجون کو خبر یہ تھی کہ مجوزہ اسلامک اکنامک کانفرنس میں جو تجاویز زیر غور آئیں گی ان میں ایک تجویز پان اسلامک ریلوے کی تعمیر کے بارے میں بھی ہوگی۔ اس تجویز کے مطابق ''کراچی شہر میں اس بین الاقوامی

ریلوے کا مرکز ہوگا اور جہاں سے ریلوے لائن بغداد اور قسطنطنیہ سے ہوتی ہوئی پیرس اور لندن تک پہنچے گی۔ کراچی کا ایران کے شہر زاہدان کے ساتھ ریلوے رابطہ پہلے ہی سے موجود ہے۔ اگر زاہدان کا بصرہ یا بغداد کے ساتھ ریلوے رابطہ ہو جائے اور یہ نئی ریلوے بصرہ اور قسطنطنیہ کے درمیان کی ریلوے سے منسلک ہو جائے تو پھر بذریعہ اوریئنٹ ایکسپریس پیرس اور لندن سے رابطہ ہو جائے گا۔ یہ گاڑی بلقان اور اٹلی سے گزر کر پیرس اور لندن پہنچتی ہے۔ کراچی اور بغداد کے درمیان خلیج فارس کے ساتھ ساتھ ریلوے لائن کا تصور کوئی نیا نہیں ہے۔ تقریباً 50 سال قبل 1900ء میں کراچی کے اخبار ڈیلی گزٹ کے مالک مونٹیگو۔ڈی۔ پومی رے۔ ویب (Montague de Pomeray Web) نے یہ تجویز پیش کی تھی۔"[11]

کراچی کی یہ خبریں لندن اور واشنگٹن کے سیاسی اور اخباری حلقوں کے لئے خاصی اطمینان بخش تھیں کیونکہ ان خبروں کے ذریعے یقین دلایا گیا تھا کہ وزیر اعظم لیاقت علی خان کے مجوزہ دورہ ماسکو سے پاکستان کی مغرب نواز خارجہ پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ چنانچہ 20 رجون کو امریکہ کے سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ بلیٹن میں یہ رپورٹ شائع ہوئی کہ پاکستان مشرق وسطیٰ کے اسلامی ممالک کی یونین بنانے کی جو کوشش کر رہا ہے وہ واشنگٹن کے پالیسی سازوں کو معقول دکھائی دیتی ہے اور یہ کہ امریکہ مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید میں دفاعی انتظامات کے مسئلہ پر پہلے ہی غور کر رہا ہے۔ 23 رجون کو لندن ٹائمز کے سفارتی نامہ نگار کا لیاقت علی خان کے دورہ ماسکو پر تبصرہ تھا کہ "توقع اس کی ہے کہ وزیر اعظم پاکستان لیاقت علی خان ستمبر میں ماسکو جائے گا۔ اسی زمانے میں وزیر اعظم ہندوستان پنڈت نہرو واشنگٹن جائے گا۔ لیاقت علی خان کے سفر ماسکو کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ پاکستان میں جو لوگ حکومت پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ پاکستان برطانیہ اور امریکہ کا غلام ہے ان کو غلط ثابت کیا جائے۔ یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ حکومت پاکستان کو اقوام متحدہ کے کمیشن کے بارے میں یہ شکایت ہے کہ وہ ہندوستان کی طرف داری کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ 1948ء کے موسم بہار میں حکومت پاکستان نے سلامتی کونسل کی قرارداد کشمیر پر اظہار ناراضگی کیا تھا اور روس سے سفارتی تعلقات قائم کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود پاکستان کی خارجہ پالیسی میں کسی قسم کا فرق نہ آیا۔ اسی طرح وزیر اعظم پاکستان کے سفر ماسکو کا مطلب یہ ہے کہ مغربی طاقتیں پاکستان کو اپنا دائمی شریک نہ سمجھیں۔ لیکن توقع یہی ہے کہ اس سفر

کے باوجود پاکستان کی خارجہ پالیسی میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔''[12] اور پھر چند دن بعد برطانیہ کے لبرل اخبار مانچسٹر گارڈین کی ادارتی رائے یہ تھی کہ'' پاکستان کے وزیراعظم لیاقت علی خان کے مجوزہ دورہ ماسکو کو برطانیہ کے ساتھ پاکستان کی بے اطمینانی کے پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔ لیاقت علی خان نے حال ہی میں شکایت کی ہے کہ پاکستان کو اس کے دفاع کی تنظیم کے لئے برطانیہ نے کافی سامان مہیا نہیں کیا اور برطانوی تاجر پاکستان میں اپنا روپیہ لگانے سے احتراز کرتے ہیں۔اس نے اس پر مایوسی کا اظہار کیا ہے کہ دولت مشترکہ نے کشمیر کی بابت پاکستان اور ہندوستان کے جھگڑے کو نہ چکایا۔'' اخبار نے آخر میں لکھا کہ اگر پاکستانیوں کی نظریں سوویت روس کی طرف اٹھ رہی ہیں تو اس کی سب سے بڑی وجہ ہندوستان اور افغانستان کی طرف سے خدشات ہیں لیکن اگر ہندوستان پاکستان کے ساتھ تصفیہ کر لے تو ہندوستان کمیونسٹ خطرے کا سدباب کر سکتا ہے۔''

برطانیہ کے سرکاری حلقوں کی رائے بھی، اس یقین دہانی کے باوجود کہ لیاقت علی خان کے سفر ماسکو سے پاکستان کی خارجہ پالیسی میں تبدیلی نہیں آئے گی، مانچسٹر گارڈین کی رائے سے ملتی جلتی تھی۔ یہ حلقے بظاہر پاکستان کے بارے میں قدرے فکر مند رہے جس کی پہلی وجہ یہ تھی کہ اقوام متحدہ کے کمیشن کی وساطت سے تنازعہ کشمیر کے تصفیہ کے لئے جو بات چیت ہو رہی تھی اس میں تعطل پیدا ہو گیا تھا جو پاکستان اور ہندوستان کے درمیان از سر نو جنگ کا باعث بن سکتا تھا۔ ماسکو کے ہفت روزہ نیوٹائمز کا الزام یہ تھا کہ'' امریکہ اور برطانیہ کشمیر کو پاکستان کی تحویل میں دینا چاہتے ہیں کیونکہ وہ وہاں سوویت یونین کے خلاف اپنا فوجی اڈہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔''[13] دوسری وجہ یہ تھی کہ 12 رجون کو پاکستان کی جانب سے افغانستان کے ایک سرحدی گاؤں پر بمباری کی وجہ سے دونوں ملکوں کے درمیان سخت کشیدگی پیدا ہو گئی تھی اور اندیشہ تھا کہ سوویت یونین اس کشیدگی سے فائدہ اٹھائے گا۔ جبکہ ماسکو کا الزام یہ تھا کہ امریکی اجارہ دار اور برطانوی استحصالی سوویت سرحد کے نزدیک اپنے جارحانہ جنگی مقاصد کے لئے دونوں ممالک کے درمیان تصادم کرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔''[14]

20 رجون کو برطانیہ میں افغان سفیر سردار فیض محمد ذکریا نے برطانیہ کے محکمہ خارجہ کے ڈپٹی انڈر سیکرٹری سے ملاقات کر کے اپنی حکومت کے اس موقف کو دہرایا کہ پاکستان اور

افغانستان کے درمیان کا قبائلی علاقہ پاکستان کے کنٹرول میں نہیں دینا چاہیے اور افغان۔ پاکستان سرحد کو ڈیورنڈ لائن سے ہٹا کر دریائے سندھ تک لے جایا جانا چاہیے۔[15] 28 رجون کو لندن میں پاکستانی ہائی کمشنر حبیب ابراہیم رحمت اللہ نے برطانوی وزیر خارجہ سے ملاقات کی جس کے نتیجے میں 30 رجون کو برطانیہ کے وزیر دولت مشترکہ نوئیل بیکر (Noel Baker) نے دارالعوام میں اعلان کیا کہ برطانیہ ڈیورنڈ لائن کو پاکستان اور افغانستان کے درمیان بین الاقوامی سرحد تسلیم کرتا ہے۔ اس اعلان کا مطلب یہ تھا کہ جہاں تک پاکستان اور افغانستان کے درمیان سرحدی تنازعے کا تعلق تھا برطانیہ کھلم کھلا پاکستان کے ساتھ تھا۔ درآں حالیکہ وہ تنازعہ کشمیر کے بارے میں ہندوستان کے خلاف پاکستان کی برملا حمایت کرنے سے گریزاں تھا۔ اس کے اس دوغلے رویے کی وجہ وزیر خزانہ سر سٹیفورڈ کرپس کے اس بیان میں مضمر تھی کہ ’’ایشیائی دنیا میں استحکام کا زیادہ تر انحصار ہندوستان کی قیادت پر ہے۔‘‘

جون کے مہینے میں جبکہ کراچی کا مغرب نواز ٹولہ پے در پے ’’اسلامی خبروں‘‘ کے ذریعے یہ یقین دلا رہا تھا، حکومت برطانیہ کے محکمہ خارجہ کا مستقل انڈر سیکرٹری سر ولیم سٹرینگ (Strang) مشرق وسطیٰ میں دورہ کر رہا تھا۔ روسی افواج کے اخبار ریڈ سٹار نے اس کے اس پراسرار دورے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ سر ولیم کا مشن یہ ہے کہ عراق، شام، لبنان، عرب، فلسطین اور شرق اردن پر مشتمل عظیم تر شام کے منصوبے کو کامیاب بنایا جائے۔ ریڈ سٹار کا کہنا یہ تھا کہ امریکہ تک کو برطانوی نائب وزیر خارجہ کی یہ سرگرمیاں ناپسند گزریں اور امریکن وزیر خارجہ نے اپنے ڈپٹی ڈائریکٹر مسٹر سیموئل کوپ کو فوراً مشرق وسطیٰ بھیج دیا تا کہ وہ سر ولیم کی چال کو ناکام بنائے۔‘‘ کراچی کے روزنامہ ڈان کی رائے بھی یہ تھی کہ ’’مشرق وسطیٰ میں سر ولیم سٹرینگ کی سرگرمیاں بڑی پراسرار رہیں...... عربوں کا موجودہ اتحاد انگریز کو ناگوار ہے اور وہ ان میں افتراق وانتشار پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔[16]

سر ولیم سٹرینگ ابھی تک مشرق وسطیٰ میں تھا کہ شام کے وزیر اعظم کرنل حسنی الزعیم نے، جو 30 رمارچ 1949ء کو امریکہ کی امداد سے فوجی انقلاب برپا کر کے برسر اقتدار آیا تھا، برطانوی خبر رساں ایجنسی سٹار کے نامہ نگار خصوصی سے ایک انٹرویو میں کہا کہ ’’ہم اس امر کا کئی بار اعلان کر چکے ہیں کہ ہم اینگلو۔ امریکن گروپ کا ساتھ دینا چاہتے ہیں۔ ہم خاص طور پر برطانیہ

سے دوستی کرنا چاہتے ہیں۔شامی فوج کو طاقتور بنانے کی وجہ یہ ہے کہ وہ حملے کی صورت میں ایران اور ترکی کی مدد کر سکے۔اس نے کہا کہ عظیم تر شام کی سکیم دو وجوہ سے پرانی ہو چکی ہے۔پہلی تو یہ کہ شام کے صنعتی و زرعی احیا کی وجہ سے شام اور ہاشمی حکومتوں میں بڑی خلیج پیدا ہو جائے گی۔دوسری وجہ یہ ہے کہ میں نے مصری اور سعودی عرب گروپ میں شریک ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے کیونکہ دونوں ممالک بہت زیادہ معاون ثابت ہوئے ہیں اور انہوں نے نئے شام کے ساتھ نیک جذبات کا اظہار کیا ہے۔شام، مصر اور سعودی عرب کے درمیان مضبوط اتحاد عظیم تر شام کی تحریک کا مستحکم جواب ہوگا۔میں کئی بار اعلان کر چکا ہوں کہ میرے ملک کی پالیسی اینگلو۔امریکی گروپ کے ساتھ جانبداری کی ہے اور خصوصاً برطانیہ کے ساتھ۔لیکن ہم برطانیہ کے ساتھ جو رشتہ استوار کرنا چاہتے ہیں وہ مضبوط اور صاف گوئی کی بنیادوں پر ہونا چاہیے جو اپنے استحکام اور دیرپا ہونے کی ضمانت ہوگا۔"[17]

انہی دنوں نوائے وقت کو بذریعہ ڈاک یہ خبر ملی کہ "پچھلے ہفتے برطانیہ میں ایک بے نظیر اسلامی تقریب منعقد ہوئی۔یہ پہلا موقع تھا کہ مسلم یونین نے ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی اور کارڈف میں دنیائے اسلام کے تمام خطوں سے نمائندگان جمع ہوئے جو زبان اور لباس کا ایک عجیب و غریب اور بین تفاوت پیش کرنے کے باوجود اسلامی اخوت اور محبت کے رشتہ سے باہم منسلک تھے۔ویلز کے بلدۂ اول نے اپنی تاریخ میں ایسا پر تنوع منظر پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔کارڈف کی گھاٹ پر جامع نورالاسلام اس تقریب کا مرکز بنی جس میں پاکستان، ہندوستان، نائیجیریا، شمالی اور مغربی افریقہ اور خود برطانیہ کے مختلف حصوں کے مسلمان شریک ہوئے۔کارڈف کے 800 مسلمان اس پر مستزاد تھے۔اللہ ایک ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے رسول ہیں، لکھا ہوا تھا اور اسلام کے عالمگیر پیغام توحید و مساوات کا اعلان کر رہا تھا۔12 سے زیادہ اسلامی ممالک سے کم و بیش 400 مسلمانوں نے جو اس تقریب پر جمع ہوئے تھے، امام شیخ عبداللہ الحکیمی کے ماتحت ایک مسلم یونین قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔اس یونین کا مقصد یہ ہے کہ دنیا کے کسی حصہ میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مابین اگر کوئی وجہ نزاع پیدا ہو تو اپنا مصالحانہ اثر ڈال کر اس نزاع کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے۔اس مقصد کے لئے شیخ حکیمی کی صدارت میں ایک مصالحتی کمیٹی قائم کی جارہی ہے۔[18] اس خبر کی تعبیر یہ تھی کہ برطانوی سامراج نے پاکستانی وزیر اعظم لیاقت علی

کے دورۂ ماسکو کے اعلان کے باوجود، پان اسلام ازم کے بارے میں اپنے منصوبہ کو ترک نہیں کیا تھا اور وہ اتحاد اسلامی کے اس منصوبے کو پورا کرنے کے لئے ہر سطح پر کوشش کر رہا تھا۔

پنجابی درمیانہ طبقہ کی مصنوعی اور خیالی دنیا کا ''اسلامی بلاک''

پاکستان بالخصوص پنجاب کے درمیانہ طبقہ کے بعض عناصر شعوری طور پر اس سلسلے میں برطانوی عزائم کی تکمیل میں مدد کرتے تھے۔ وہ اتحاد اسلامی کے بارے میں اپنے سہانے خواب کی اس قدر عظیم الشان تعبیر کرتے تھے کہ نیم تعلیم یافتہ پاکستانی عوام اسے سن کر یا پڑھ کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ ایسے عناصر میں ایک شخص ھ۔ ع۔ ر۔ خالد تھا۔ اس نے جون کے آخری ہفتے میں تین قسطوں میں ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا ''اسلامی ممالک کا متحدہ محاذ''۔ اس نے مضمون کی دوسری قسط میں اتحاد اسلامی کے بارے میں اپنے منصوبے کی جو تفصیل لکھی وہ الفاظ کی حد تک بڑی دلکش اور شاندار تھی۔ اس تفصیل کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ان دنوں پاکستانی اور بالخصوص پنجابیوں کے ایک بڑے ''تعلیم یافتہ'' حلقہ نے مذہبی جذبات سے مغلوب ہو کر اپنی ایک مصنوعی دنیا بنائی ہوئی تھی اور وہ دنیا کے ٹھوس حقائق سے بالکل بے خبر و بے تعلق تھے۔ اس کے اسلامی بلاک کی تفصیل یہ تھی کہ ''دنیا کے نقشے پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام اسلامی ممالک میں جغرافیائی وحدت قائم ہے۔ مغربی پاکستان، افغانستان، ایران، عرب، شرق اردن، شام، لبنان، ترکی، مصر سب ایک جگہ پر سلسلے وار ایک دوسرے سے کندھے ملا کر کھڑے ہیں۔ اسلامی دولت مشترکہ کا ایک بلاک تو ان ممالک پر مشتمل ہوگا۔ مشرق میں یہ ہندوستان، مغرب میں افریقہ اور شمال میں یورپ اور روس کی حدود سے ملتا ہے جنوب میں سمندر ہے۔ اس بلاک میں ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک ریلوے لائن اور سڑکیں تعمیر کی جاسکتی ہیں۔ اس تمام بلاک کو ہم مغربی بلاک کا نام دے سکتے ہیں۔ دفاعی نقطہ نظر سے ایسا ایک بلاک قائم ہونے پر تمام اسلامی ممالک کا بہت سا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ جو افواج اپنی سرحدوں پر رکھنی پڑتی ہیں وہ دشمن کی سرحدوں پر بٹھائی جاسکتی ہیں اور اپنی مشترکہ سرحدات کا انتظام بذریعہ پولیس کیا جاسکتا ہے۔ مغربی بلاک فوجی لحاظ سے دنیا کا مضبوط ترین ملک بن سکتا ہے۔ بوقت ضرورت مغربی بلاک کی تمام افواج ایک ہی کمانڈر کے زیر اثر لڑ سکتی ہیں۔ روس کو ہمارے ساتھ ٹکرانے سے پیشتر یہ احساس کرنا ہوگا کہ اسلامی دولت

مشترکہ کے تمام ممالک سے اس کی سرحدات ملتی ہیں۔ایک کے خلاف جارحانہ اقدام سب سے جنگ مول لینے کا باعث ہوگا۔ایسے حالات میں روس یقیناً ہمارے نظام پر چھا جانے یا ہمارے امن میں آسانی سے خلل ڈالنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔کیونکہ یہ خود اس کے امن کو تباہ کر دے گا۔ یورپ والے ہمیں چھیڑنے سے پیشتر یہ سوچیں گے کہ ان کی تمام تر تجارتی منڈیاں بھی یہیں واقع ہیں۔ہمارے ساتھ ٹکرانے سے ان کی تمام تر تجارت تباہ و برباد ہوجائے گی۔اسی طرح ہمارا مشرقی بلاک مشرقی پاکستان اور انڈونیشیا پر مشتمل ہوگا۔اس بلاک کی بدولت بحرالکاہل اور خلیج بنگالہ میں بھی ہمیں دخل ہوگا جو امریکہ کی تجارت وسیاست کو بوقت ضرورت ضرب لگا سکتا ہے...... تجارتی اور اقتصادی نقطہ نظر سے ہماری حیثیت مضبوط ہوگی۔ہماری آپس کی تجارت اور اقتصادی یکجہتی دنیا کی حریص طاقتوں کو ہمارے ساتھ آبرومندانہ تجارتی و اقتصادی تعلقات قائم کرنے پر مجبور کر دے گی۔ہمارے تمام تر تجارتی معاہدات ہمارے لئے بھی منافع بخش ثابت ہوں گے اور ہم اپنے مطالبات منوانے کی حیثیت بھی رکھیں گے۔'' اس نے اپنے اس سہانے خواب کو ٹھوس شکل دینے کے لئے اپنے مضمون کی تیسری قسط میں ابتداً پانچ بین الاسلامی ادارے قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔(1) بین الاسلامی بینک۔(2) بین الاسلامی اقتصادی مجلس۔(3) بین الاسلامی مجلس زراعت۔(4) بین الاسلامی تبادلہ طلبا اور (5) بین الاسلامی مجلس محققین۔''[19]

پنجاب کے ایسے عناصر سے کوئی بحث نہیں ہوسکتی تھی۔انہیں یہ نہیں سمجھایا جاسکتا تھا کہ وہ خواب وخیال کی دنیا میں رہتے ہیں اور یہ کہ دنیا کے حالات اور بالخصوص پاکستان سمیت مسلم ممالک کے حالات اس قسم کے آزاد وخودمختار اور طاقتور اسلامی بلاکوں کے لئے سازگار نہیں تھے۔ ان کا اس قسم کا دلفریب پروپیگنڈا صرف اینگلو امریکی بلاک کے لئے ہی فائدہ مند ہوسکتا تھا۔اسی لئے ان ممالک کے ذرائع ابلاغ اور سیاسی زعما آئے دن پان اسلام ازم یا اتحاد اسلامی یا اسلامی بلاک یا اسلامی دولت مشترکہ کی تحریک کی کسی نہ کسی طرح حوصلہ افزائی کرتے رہتے تھے۔ امریکہ کا وزیر خارجہ ڈین ایچی سن اور برطانیہ کا وزیر خارجہ دونوں ہی اس اسلامی تحریک کے زبردست حامی تھے۔جبکہ سوویت یونین کا الزام یہ تھا کہ ''پاکستان اتحاد اسلامی کے لئے جو کوشش رہا ہے اس کا مقصد مسلم ملٹری اور پولیٹیکل بلاک بنانا ہے...... یہ مشرق وسطیٰ کے ممالک کے اینٹی سوویت بلاک کی نئی قسم ہے۔''[20]

چودھری خلیق الزماں کا ''اسلامستان''......مغربی طاقتوں کے تعاون سے کمیونسٹوں کے خلاف متحدہ محاذ

پاکستان میں ایسے کوتاہ اندیش عناصر کا ایک سرغنہ پاکستان مسلم لیگ کا صدر چودھری خلیق الزماں تھا جو پورے شعور، پوری بددیانتی اور پوری ڈھٹائی کے ساتھ اینگلو۔امریکی بلاک کے مفاد میں اتحاد اسلامی کا گمراہ کن پروپیگنڈا کرتا تھا۔ یکم جولائی کو اس نے ایسوسی ایٹیڈ پریس آف پاکستان کے نامہ نگار کے ساتھ ایک انٹرویو میں کہا ''اسلامستان قائم کرنے کے لئے اسلامی ممالک کو متحد کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ اسلامستان قائم کرنے کے لئے مشرق وسطیٰ اور پاکستان کے عوام کو ایک تنظیم کی صورت میں متحد ہو جانا چاہیے۔ اس سلسلے میں عنقریب ایک کانفرنس کے انعقاد کا امکان ہے۔ اگر مشرق وسطیٰ کے عوام نے اس امر پر زور دیا کہ اس کانفرنس کی تنظیم عوام کی طرف سے ہونی چاہیے نہ کہ حکومتوں کی طرف سے تو اس صورت میں ابتداً اس میں ایسے نمائندے ہوں گے جو اپنے متعلقہ ملک میں باعزت حیثیت کے مالک ہوں گے اور یہ فیصلہ کرنا حکومتوں کا کام ہو گا کہ وہ اس کانفرنس کے فیصلوں کو کس حد تک تسلیم کر سکیں گی۔ میں اگست کے تیسرے ہفتے میں مشرق وسطیٰ کے دورہ پر روانہ ہونے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میں ایران، عراق، شام، لبنان، ترکی، مصر، سعودی عرب اور یمن کا دورہ کروں گا۔ اس کے بعد میں لندن جانے کا بھی ارادہ رکھتا ہوں۔ جہاں تک مغربی علاقوں کا تعلق ہے مجھے یقین ہے کہ وہ مشرق وسطیٰ کے ممالک کی ترقی میں مدد دیں گے تاکہ وہ کمیونسٹوں کے خلاف متحدہ محاذ بنا سکیں۔ جب برطانوی سیاستدانوں نے عرب لیگ کے قیام کا خیر مقدم کیا تھا تو وہ علاقہ وار گروہ بندی میں مدد کیوں نہیں کریں گے جو کہ ان کے لئے بہت زیادہ مفید ثابت ہو گی۔ اس طرح انہیں بہت سی تجارتی پریشانیوں سے بھی نجات مل جائے گی۔ عرب لیگ اس لئے ناکام ہوئی کہ کوئی ملک، تنظیم، فیڈریشن یا گروہ بندی کے امتحان کے موقعوں پر اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک عوام اپنے مشترکہ مقاصد کے تحت متحد نہ ہو جائیں۔ عرب لیگ عوامی جماعت نہیں ہے بلکہ حکومتوں کی لیگ ہے۔''[21] اس بیان سے بالکل واضح تھا کہ یہ شخص اپنے اینگلو۔امریکی آقاؤں کی خواہش کے مطابق مذہب کے نام پر مشرق وسطیٰ میں سوویت مخالف بلاک بنانے کا ارادہ رکھتا تھا یہ اپنے ''اسلامستان'' میں ترکی، لبنان، شام اور ایران کو بھی شامل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا حالانکہ ترکی

میں سیاسی مقصد کے لئے مذہب کے استعمال کی قانوناً ممانعت تھی۔لبنان کی تقریباً50 فیصد آبادی عیسائیوں کی تھی۔شام میں حسنی الزعیم نے امریکہ کی امداد سے برسر اقتدار آنے کے بعد سارے شرعی قوانین منسوخ کردیئے تھے اور ایران میں دو ہزار سے زائد ملاؤں کا فیصلہ یہ تھا کہ مذہب کو سیاست سے الگ رکھا جائے گا اور کوئی ملا کسی سیاسی جماعت کا رکن نہیں ہوگا۔[22]

چودھری خلیق الزماں کے اس بیان کے دو ایک دن بعد خان آف قلات میر احمد یار خان نے بھی، جسے لیاقت علی خان نے محض تالیف قلب کے لئے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں پاکستانی مندوب کی حیثیت سے بھیجا تھا، انقرہ میں بتایا کہ پاکستان کا سب بڑا نصب العین یہ ہے کہ دنیا کی ساری مسلم اقوام متحد ہو جائیں۔اس کی رائے یہ تھی کہ ''اگر ایسا ہو جائے تو ترکی اور مشرق وسطیٰ کے دوسرے مسلم ممالک کو کمیونسٹ خطرے کے خلاف بڑی تقویت ملے گی۔'' اس کے اس بیان پر ترکی کے ایک اخبار کا تبصرہ یہ تھا کہ ''اتحاد اسلامی یا ورلڈ مسلم لیگ کے قیام کی باتیں خواب و خیال کی باتیں ہیں۔اگر پاکستان اس قسم کی لیگ قائم کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو ہمیں بلا تاخیر یہ اعلان کر دینا چاہیے کہ یہ محض خیالی پلاؤ ہے اور یہ بالکل نا قابل عمل ہے۔اس کے برعکس مسلم اقوام علاقائی معاہدوں کی تجویز پر غور کر سکتی ہیں۔یعنی وہ ایک سسٹم کے تحت ایک دوسرے سے تعاون کر سکتی ہیں۔اگرچہ اس تجویز کے راستے میں بہت سی مشکلات حائل ہیں تاہم یہ ناممکن العمل نہیں ہے۔اس تجویز پر سب اقوام کو غور کر کے متحدہ طور پر کوششیں کرنی چاہئیں۔اس قسم کا سسٹم کمیونزم کے خلاف بھی دفاع کی ضمانت فراہم کرے گا۔''[23] اس تبصرے کا مطلب یہ تھا کہ ترکی مذہب کے نام پر مسلم ممالک کے کسی گٹھ جوڑ میں شامل ہونے پر آمادہ نہیں تھا۔البتہ ایک ممتاز ترکی لیڈر حسین یاسین کے بقول ترکی کے ارباب اقتدار اسرائیل سمیت مشرق وسطیٰ کے ممالک پر مشتمل سوویت مخالف بلاک بنانے کے حق میں تھے۔

وزیر خزانہ غلام محمد کے دورۂ لندن کے دوران مشرق وسطیٰ میں دفاعی معاہدوں کی برطانوی پالیسی اور اس میں پاکستان کے کردار پر غور وخوض

15رجولائی کو لندن میں دولت مشترکہ کے ممالک کے وزرائے خزانہ کی کانفرنس ہوئی تو پہلے ہی سیشن کے بعد پاکستان کے وزیر خزانہ غلام محمد نے برطانیہ کے وزیر خارجہ ارنسٹ بیون

سے ملاقات کی ''جس میں مشرق بعید میں دولت مشترکہ کی پالیسی پر غور کیا گیا اور یہ مسئلہ بھی زیر غور آیا کہ اگر ہندوستان کی حوصلہ افزائی کر کے جسے ظہور پذیر کمیونسٹ چین کے مدمقابل کھڑا کرنا مقصود ہو تو کامن ویلتھ میں ڈالروں کی تقسیم کس طرح ہونی چاہیے۔''[24] اس ملاقات سے چند ماہ قبل آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ یہ تجویز پیش کر چکے تھے کہ ایشیا میں کمیونزم کے سدباب کے لئے اطلانتک پیکٹ کی طرح کا ایک بحر الکاہل پیکٹ کیا جائے اور تین چار دن قبل 11 رجولائی 1949ء کو نیشنلسٹ چین کے صدر چیانگ کائی شیک اور فلپائن کے صدر کورنیو نے منیلا میں ملاقات کر کے یہ اعلان کیا تھا کہ چین، جنوبی کوریا اور فلپائن نے فار ایسٹ اینٹی کمیونسٹ پیکٹ میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا ہے اور اس مقصد کے لئے عنقریب مشرق بعید کے غیر کمیونسٹ ممالک کی ایک کانفرنس بلائی جائے گی۔ غلام محمد کی بیون سے اس ملاقات کے موقع پر برطانوی محکمہ خارجہ کا مستقل انڈر سیکرٹری سر ولیم سٹرینگ مشرق وسطیٰ کے ''پراسرار'' دورہ کے بعد لندن واپس پہنچ چکا تھا اور حکومت برطانیہ مشرق وسطیٰ میں اپنی پالیسی پر نظر ثانی کرنے میں مصروف تھی اس لئے یہ امر بعید از قیاس نہیں کہ اس ملاقات میں مشرق وسطیٰ کے دفاع کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا ہوگا۔

حکومت برطانیہ کو مشرق وسطیٰ کے بارے میں اپنی پالیسی میں تبدیلی کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی تھی کہ شام میں امریکی امداد سے حسنی الزعیم کے فوجی انقلاب کے بعد اس منصوبے کی کامیابی کا امکان نہیں رہا تھا۔ شام کے وزیر اعظم محسن ابرازی کا بیان یہ تھا کہ ''ہر شخص یہ جان لے کہ شام اس قسم کی تمام اسکیموں کا مخالف ہے جو کبھی ''زرخیز ہلال'' اور کبھی ''شام عظمیٰ'' کہلاتی ہیں کیونکہ شام اپنی آزادی و خود مختاری کو قائم رکھنے کا بڑا خواہشمند ہے۔''[25] دوسری وجہ یہ تھی کہ عرب عوام، انگریزوں کی زیر سرپرستی عرب ممالک کے گٹھ جوڑ کے اس قدر خلاف تھے کہ کوئی عرب حکمران اپنی رائے عامہ کو نظر انداز کر کے برسر اقتدار نہیں رہ سکتا تھا چنانچہ جولائی کے آخری ہفتے میں، جبکہ غلام محمد ابھی لندن میں ہی تھا، برطانوی محکمہ خارجہ نے مشرق وسطیٰ میں متعین برطانوی سفیروں اور مشرق وسطیٰ کے امور کے ماہر برطانوی سول اور فوجی افسروں کی ایک کانفرنس بلائی جس میں پہلا سوال تو یہ زیر بحث آیا کہ اٹلی سے لے کر ایران تک فوجی حکمت عملی کیا ہونی چاہیے اور دوسرا سوال یہ تھا کہ مشرق وسطیٰ میں از سر نو صف بندی کس طرح کی جائے۔ ان سوالات پر بحث کے دوران یہ تسلیم کیا گیا کہ فوجی اور سیاسی لحاظ سے پاکستان کی بہت اہمیت ہے۔ بحری اور

ہوائی فوج کے مشیروں کو بھی کانفرنس میں بلایا گیا تھا۔ ماہرین کا نقطہ نگاہ یہ تھا کہ جدید جنگ کے حالات میں مشرق بحیرہ روم کا راستہ بحری جہازوں کے لئے محفوظ نہیں ہو گا لہٰذا مصر اور نہر سویز کو اپنے قبضے میں رکھ کر ہندوستان کا راستہ کھلا رکھنے کا پرانا طریقہ اپنا بڑا مقصد کھو چکا ہے۔ فوجی افسروں کا سیاسی لیڈروں کو مشورہ یہ تھا کہ وہ دو مقاصد کو پیش نظر رکھیں اول یہ کہ جنگ کے موقع پر یہ انتظام کیا جائے کہ شمالی افریقہ پر چھاتہ بردار فوج کے ذریعے حملہ نہ ہونے پائے اور دوئم یہ کہ جن ممالک سے بحیرۂ روم کے لئے تیل کی پائپ لائنیں گزرتی ہیں ان میں زمانہ امن کے دوران ایسا سیاسی ڈھانچہ تعمیر کیا جائے جو اندرونی بدامنی کا سدباب کر سکے۔ جنگ کی صورت میں عراق اور شام کی پائپ لائنیں خطرے میں ہوں گی اس لئے خلیج فارس سے بحری جہازوں کے ذریعے تیل کی مہنگی نقل وحمل ضروری ہو گی۔ اس موقع پر فوجی عوامل کا جائزہ لیتے ہوئے پاکستان کی دفاعی افواج کو بہت اہمیت دی گئی۔ اس مسئلہ پر لندن کے ہفت روزہ اکونومسٹ کا تبصرہ یہ تھا کہ ''ہندوستانی فوج سویز سے لے کر ہانگ کانگ تک کے سارے علاقے پر کئی عشروں تک غالب رہی ہے۔ اس کے باوجود ہندوستان اور پاکستان کی افواج کی بجائے، جو تل ابیب سے سنگاپور تک سب سے مؤثر افواج ہیں، عرب افواج پر زیادہ توجہ دی جا رہی ہے۔ اکونومسٹ کی رائے یہ تھی کہ اب مشرق وسطیٰ میں فوجی حکمت عملی کا مرکزی مقام قاہرہ نہیں ہے بلکہ آبادان ہے۔ اب ایران گراں قدر ہے، مصر نہیں۔ اس لئے مصر اور فلسطین کے فوجی اڈوں کی بجائے پاکستان میں فوجی اڈوں کو زیادہ اہمیت دینی چاہیے تھی۔ ایران کی روس کے ساتھ کی سرحد کا دفاع، نہر سویز کے علاقے کی بجائے کوئٹہ سے بہتر ہو سکتا ہے۔''[26]

برطانوی محکمہ خارجہ کی اس کانفرنس کے دوران نیویارک ٹائمز نے یہ رپورٹ چھاپی تھی کہ ''حکومت پاکستان کے محکمہ دفاع کا سیکرٹری اسکندر مرزا اسلحہ کے حصول کے لئے ایک فوجی مشن لے کر امریکہ گیا تھا لیکن ٹرومین انتظامیہ نے اس کی یہ درخواست منظور نہیں کی۔ امریکہ یہ کوشش کرتا رہا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے تنازعات کا تصفیہ ہو جائے لیکن جب تک یہ تنازعات حل نہیں ہوتے امریکہ کا محکمہ خارجہ اسلحہ کی سپلائی جیسے معاملات میں ''مکمل غیر جانبداری'' اختیار کئے رکھنے کا خواہاں ہے۔''[27] امریکہ کی اس ''مکمل غیر جانبداری'' کا سب سے بڑا پس منظر یہ تھا کہ 7 رمئی 1948ء کو دورہ امریکہ کی دعوت قبول کرنے کے ایک ماہ بعد 7 رجون کو ہندوستان کے

وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے ہمالیائی ریاست سکم کا نظم ونسق اپنی حکومت کی تحویل میں لے لیا تھا۔
8/جولائی کو امریکہ، برطانیہ اور ہندوستان کی شہ پر تبت کی حکومت نے کومن تانگ کے مشن کو لہاسہ سے نکال دیا تھا'' کیونکہ اس مشن کے بہت سے ارکان کمیونسٹ تھے اور وہ حکومت کے خلاف سازشیں کرتے تھے۔'' تبت کی حکومت کی اس کاروائی کے بعد کمیونسٹوں کی جانب سے تبت پر پرامن قبضہ کا امکان ختم ہو گیا تھا اور یہ امکان پیدا ہو گیا تھا کہ تبت پر کنٹرول کے مسئلہ پر چین میں ماوزے تنگ کی متوقع حکومت اور ہندوستان میں جواہر لال نہرو کی حکومت کے درمیان تصادم ہو جائے گا۔ امریکہ اس قسم کے تصادم کا زبردست خواہاں تھا۔ ایشیا میں اس کے سامراجی مفادات کا تقاضا یہ تھا کہ اشتراکی چین اور بورژوا ہندوستان میں کسی نہ کسی طرح ٹھن جائے تا کہ جنوب مشرقی ایشیا میں کمیونزم کے خلاف ہندوستان کی زیر قیادت کوئی نہ کوئی فوجی گٹھ جوڑ قائم ہو جائے۔

پاکستان میں مجوزہ اسلامک اکنامک کانفرنس...... مغربی ذرائع ابلاغ نے عالم اسلام کا ''ہمدرد'' بن کر مجوزہ کانفرنس کی بہت تعریف کی

تاہم اس بنا پر پاکستان کو اسلحہ کی سپلائی کے معاملے میں امریکہ کی ''مکمل غیر جانبداری'' یا ہندوستان نوازی کے باوجود پاکستان کے وزیر خزانہ غلام محمد کی ہمت شکنی نہ ہوئی۔ برطانیہ کے محکمہ خارجہ کی کانفرنس کی مذکورہ کاروائی اس کے لئے بہت حوصلہ افزا تھی۔ چنانچہ 31/جولائی کو اس نے رائٹر کے نامہ نگار سے انٹرویو کے دوران امید ظاہر کی کہ'' کراچی میں نومبر میں جو اسلامک اکنامک کانفرنس ہو رہی ہے اس کے نتیجہ میں مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک کے درمیان اقتصادی تعاون میں اضافہ ہو گا۔ ماضی میں اس خواہش کا اظہار ہوتا رہا ہے اور یہ کوشش ہوتی رہی ہے کہ مسلم ممالک کے درمیان سیاسی وفوجی یونین قائم ہوں۔ مگر پھر یہ سب کچھ ترک کیا جاتا رہا ہے۔ اب آئندہ جس کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ نہ صرف مسلم علاقوں کی حکومتوں کے درمیان بلکہ ان علاقوں کے عوام الناس کے درمیان اقتصادی تعاون اور مفاہمت ہو۔ اسلامک اکنامک کانفرنس نومبر کے آخری پندرھواڑے میں ہو گی اور سات مسلم ممالک پہلے ہی اس میں اپنے وفود بھیجنے پر رضامندی ظاہر کر چکے ہیں۔ یہ سات ممالک افغانستان، مصر، ایران، عراق، انڈونیشیا، شرق اردن، ترکی اور شام ہیں۔ کانفرنس میں تقریباً 300 مسلم مندوبین، ٹیکنیکل

ماہرین، معاشیات کے ماہرین، صنعتکار اور مبصرین شرکت کریں گے۔ اس کانفرنس کے موقع پر ایک انٹرنیشنل تجارتی اور صنعتی نمائش بھی ہوگی۔''[28]

لاہور کے اخبار پاکستان ٹائمز میں جس دن غلام محمد کا یہ انٹرویو شائع ہوا اسی دن کراچی سے موصول شدہ یہ خبر شائع ہوئی کہ ''25/نومبر کو جو انٹرنیشنل اسلامک اکنامک کانفرنس ہو رہی ہے اس میں جو تجاویز زیر غور آئیں گی ان میں ایک تجویز یہ ہوگی کہ ایک آل ورلڈ اسلامک نیوز ایجنسی قائم کی جائے جس کی شاخیں دنیا کے سارے دارالحکومتوں میں ہوں گی اور جو مسلمانوں کے سیاسی اور دوسرے مفادات کا تحفظ کرے گی۔ ایک اور تجویز یہ ہوگی کہ ایک مسلم ورلڈ فیڈریشن آف دی چیمبرز آف کامرس کا قیام عمل میں لایا جائے۔ اس فیڈریشن کے نمائندے ہر سال میٹنگ کر کے ساری دنیا کے مسلم ممالک کی صنعتی ترقی کا جائزہ بھی لیا کریں گے اور تیسری تجویز یہ ہوگی کہ ہر مسلم ملک کے دارالحکومت میں ایک ورلڈ مسلم میوزیم قائم کیا جائے گا۔''[29] گویا کاغذی منصوبے اس قدر عظیم الشان تھے کہ جنہیں پڑھ کر یہ تاثر ملتا تھا کہ ان منصوبوں کی وجہ سے عالم اسلام عنقریب اپنی طاقت و جبروت، شان و شوکت اور آسودگی و خوشحالی کے لحاظ سے اوج ثریا تک پہنچ جائے گا۔

لندن کا اخبار ''ٹائمز'' بھی پاکستانی ارباب اختیار کے ان عظیم الشان منصوبوں کے حق میں تھا اور اسے امید تھی کہ کراچی کی اسلامک اکنامک کانفرنس مسلم ممالک کے پسماندہ اور مفلوک الحال عوام کا معیار زندگی بلند کرنے میں محد و معاون ثابت ہوگی۔ ایسوسی ایٹیڈ پریس آف پاکستان کی کراچی سے اطلاع کے مطابق اس اخبار کا غلام محمد کے انٹرویو پر ادارتی تبصرہ یہ تھا کہ اس کانفرنس والوں کا مدعا یہ ہے کہ اقوام متحدہ کے مختلف اقتصادی اداروں نے جو سفارشات کر رکھی ہیں ان کے مطابق مسلم ممالک میں رہنے سہنے کا معیار بلند کیا جائے۔ پاکستان چھ مہینوں سے اس کوشش میں لگا ہے کہ مغرب میں اپنے مسلم ہمسایوں سے تعلقات کو مضبوط بنایا جائے۔ حال ہی میں پاکستان کا مصر سے جو تجارتی معاہدہ ہوا ہے اس پر یہ کانفرنس اور نمائش گویا مستزاد ہیں۔ ان لوگوں کے سامنے ایک واضح مقصد ہے اور وہ یہ ہے کہ اقوام متحدہ کے اقتصادی اداروں کی سفارشات کی روشنی میں مسلم ممالک کے عوام کا عام معیار زندگی بلند کیا جائے اور اپنے اس عقیدے کو نہیں چھپاتے کہ اس معاملہ میں برطانیہ اور امریکہ کی مثالیں قابل تقلید ہیں۔ پاکستان کے منصوبہ گروں نے اسلامی ملکوں کی دکھتی رگ کو پکڑ لیا ہے۔ ان ملکوں میں اگر عام آدمی غریب و

مفلس ہے تو اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ پیداوار کا معیار بہت پست ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جو کچھ بھی دولت ہے وہ چند گنے چنے آدمیوں میں محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ مفلسی بہت سے ممالک کے استحکام کے لئے ایک اچھا خاصا خطرہ ہے۔ گویا کمیونزم کے لئے زمین تیار ہوتی ہے۔ بعض ممالک کو اس بات کا احساس ہے اور انہیں یہ بھی احساس ہے کہ مغربی ممالک کی اقتصادی اور ٹیکنیکل امداد کئے بغیر زیادہ ترقی نہیں کی جا سکتی۔ لیکن انہیں مغرب سے امداد لینے میں پس و پیش ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ امداد صرف ایسی شرائط پر ملے گی جو ان کی سیاسی و تہذیبی خودمختاری کو ٹھیس پہنچائے گی۔ پاکستان ضرور ایسی قوت ہے۔ جس کی امداد پر یہ ممالک شک و شبہ کا اظہار نہیں کریں گے پھر وہ اس کی سیاسی و اقتصادی ترقی سے متاثر بھی ہیں۔ پاکستان کے کس بل کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ اس کے وسائل وسیع ہیں۔ اگرچہ ان کا اظہار بھی اس کے مختلف کاموں میں ہوتا ہے بلکہ اس کا یہ عزم قابل قدر ہے کہ یہ اپنے اقتصادی ڈھانچے کو مغربی طرز پر ڈھالنا چاہتا ہے اور پھر وہ اپنے تہذیبی اور مذہبی ورثہ کو بھی محفوظ رکھنے کا عزم رکھتا ہے۔"[30] پاکستان میں لندن ٹائمز کے اس "اسلامی اداریے" کی تشہیر سے قبل برطانیہ کے سیاسی مبصرین کی اس رائے کی بھی خوب تشہیر ہوئی تھی کہ "کراچی میں اسلامی کانفرنس طلب کر کے پاکستان نے دنیا کے وسیع خطہ کی جو بحیرہ روم سے خلیج فارس تک پھیلا ہوا ہے معاشرتی اور زرعی ترقی کے سلسلے میں دلیرانہ اقدام کیا ہے۔ اس اقدام سے لیڈر شپ کے لئے پاکستان کی اہلیت بڑھ گئی ہے اور لندن ٹائمز نے اپنے اداریے میں پاکستان کی لیڈر شپ کے خصوصی امکانات پر بہت زور دیا ہے۔"[31]

کراچی کے روزنامہ ڈان کا لندن ٹائمز کے اس اداریے پر اداریہ یہ تھا کہ "پاکستان جب سے وجود میں آیا ہے اس نے اپنے آپ کو ہمیشہ مشرق وسطیٰ کا جزو تصور کیا ہے پاکستان کے مشرق وسطیٰ کے ساتھ ملحق ہونے کی وجہ صرف جغرافیائی روابط میں مضمر نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ مذہبی، ثقافتی اور تاریخی روابط میں بھی پنہاں ہے اور یہی روابط ہم خیالی کے لئے لازمی ہوتے ہیں۔ قائداعظم مشرق وسطیٰ کے سیاستدانوں میں پہلے سیاست دان تھے جنہوں نے پاکستان کے قیام کے فوراً ہی بعد مسلم ممالک سے زوردار اپیل کی تھی کہ وہ باہم مفاہمت اور اشتراک عمل کریں۔ پاکستان نے اقوام متحدہ میں اسرائیل کے خلاف عرب اور مسلم ورلڈ کے ساتھ مل کر جو متحدہ محاذ بنا رکھا ہے اس سے ان ممالک کے باہمی تعلقات پر روشنی پڑتی ہے جنہیں توڑا نہیں جا

سکتا۔اس متحدہ محاذ کی وجہ سے ان ممالک کے درمیان زیادہ قریبی تعاون کے لئے ابتدائی زمین ہموار ہوچکی ہے۔ترقی یافتہ ممالک سے ٹیکنیکل اور اقتصادی امداد کے بغیر گزارا نہیں۔اگر چہ ان ممالک کے نمائندے دنیا کو یہ باور کروانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کے پاس فالتو سرمایہ نہیں ہے۔حقیقت یہ ہے کہ سرمایہ کاری کے بارے میں ان کی ضرورت اتنی ہی شدید ہے جتنی کہ پسماندہ ممالک کی یہ ضرورت ہے کہ ان کی امداد کی جائے۔سرمایہ لگانے والے ممالک کا مفاد اسی میں ہے کہ وہ پسماندہ ممالک میں سرمایہ لگانے کے لئے کوئی سیاسی شرائط عائد نہ کریں۔ مشرق وسطیٰ کے ممالک کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ وہ بے انتہا مفلس ہیں۔ان کا کوئی معیار زندگی نہیں۔ان کے ہاں تعلیم کا کوئی انتظام نہیں اور کوئی ہیلتھ سروس نہیں۔ساری دنیا مشرق وسطیٰ کے تیل پر جو انحصار کرتی ہے اس میں اضافہ ہو رہا ہے۔جو علاقہ امیروں کی امارت میں اضافہ کرتا ہے وہ بہتر سلوک کا مستحق ہے۔جو ممالک کوئی امداد یا مشورہ دے سکتے ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ ان ممالک کو بچائیں جن کو ان کی امداد مطلوب ہے۔''[32] گویا ڈان کو امید تھی کہ برطانیہ اور دوسرے مغربی ممالک اپنے عالمی مفاد اور جذبہ انصاف کے تحت پسماندہ اور مفلوک الحال مسلم ممالک کی بے لوث امداد کریں گے۔اس کی اس امید کی بنیاد اس کی سادہ لوحی پر تھی یا بددیانتی پر؟اس سوال کا جواب لاہور کے روزنامہ امروز کے اداریے میں موجود تھا۔امروز کا الزام یہ تھا کہ ''مشرق وسطیٰ کے ممالک کی غربت، جہالت اور پسماندگی کی ذمہ داری برطانیہ کی سامراجیت پر عائد ہوتی ہے۔ان ممالک کی مفلوک الحالی پر لندن ٹائمز کا واویلا ایسے ہی ہے جیسے کوئی رہزن کسی قافلے کو لوٹ کر قافلے والوں سے اظہار ہمدردی کرے یا کوئی مجرم کسی مکان کو پھونک کر ٹسوے بہائے کہ ہائے فلاناگھرانہ اجڑ گیا! ہم عالم اسلام کے اس نئے ''ہمدرد'' کی خدمت میں عرض کریں گے کہ یہ بہروپیا پن چھوڑیئے۔آج کے عوام بیدار ہیں۔وہ جانتے ہیں کہ یہ سب آپ ہی کے آقاؤں کے کرشمے ہیں۔اے بادصبا ایں ہمہ آوردۂ تست۔کوئی استعماری ملک کسی پسماندہ ملک کے عوام کی کبھی امداد نہیں کرسکتا۔البتہ چند مقامی منافع خوروں کی تجوریاں ضرور بھر سکتا ہے۔مغربی ممالک کی امداد کی جو تجویز اس اخبار نے پیش کی ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ مشرق وسطیٰ استعماری طاقتوں کے شکنجے سے نکلنے کے لئے خود استعماری طاقتوں کی امداد طلب کرے۔اگر کراچی کانفرنس نے اس مشورے پر عمل کیا تو وہ مشرق وسطیٰ کو موجودہ پستی سے

نکالنے میں قیامت تک کامیاب نہیں ہوسکتی...... عالم اسلام جب تک ان ملکوں کے استعماری بندھن نہیں توڑے گا، جب تک وہ اپنے پیروں پر آپ کھڑا ہونے کی کوشش نہیں کرے گا یعنی جب تک ''مغربی رہنمائی'' پر تکیہ کرے گا، غربت بڑھے گی، افلاس میں اضافہ ہوگا اور وباؤں کا دور دورہ ہوگا۔''[33]

8 ر اگست کو امروز کا تبصرہ یہ تھا کہ ''اسلامک اکنامک کانفرنس کو بین الاقوامی معاشی حالات کے پس منظر سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ اس پس منظر میں جو چیز سب سے نمایاں ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ امریکہ اور برطانیہ کے مابین نہایت ہی شدید قسم کی مسابقت شروع ہو چکی ہے۔ یہ صورت حال موجودہ سال کی ابتدا سے پیدا ہوئی ہے۔ امریکہ نے برطانوی اشیاء کی درآمد گھٹا دی ہے اور وہ بڑھ بڑھ کر برطانیہ کی منڈیوں پر حملے کر رہا ہے۔ وہ پونڈ کی قیمت میں تخفیف اور شاہی ترجیحات کو ختم کر دینے کا مطالبہ کر رہا ہے اور اسٹرلنگ حلقے میں اپنی برآمد بڑھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ برطانیہ بھی جواب دینے پر اتر آیا ہے۔ اس نے اپنے سکے کی قیمت گھٹانے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ اسٹرلنگ حلقے میں امریکی اشیاء کی فروخت گھٹا کر اسے اپنی منڈی کے طور پر محفوظ کر لینا چاہتا ہے۔ وہ خود امریکہ سے اشیاء کی خرید کم کر رہا ہے اور شاہی ترجیحات کے اصول کو قائم رکھنے کا اعلان کر چکا ہے۔ کامن ویلتھ سے باہر کے ملکوں میں امریکہ برطانوی مال کا بائیکاٹ کر رہا ہے اور کامن ویلتھ کے اندر برطانیہ امریکی اشیاء کی درآمد گھٹانے کی کوشش کر رہا ہے۔ مشرقی ایشیا کے سیاسی انقلابات نے وہاں دونوں کی تجارت کو دھکا پہنچایا ہے۔ باقی رہ گیا مشرق وسطیٰ تو امریکہ اور برطانیہ کے درمیان شدید مقابلہ جاری ہے۔ افغانستان، ایران، ترکی، شام، اسرائیل اور سعودی عرب امریکہ کے زیر اثر ہیں، تو سوڈان، مصر، شرق اردن اور عراق برطانیہ کے۔ امریکہ اور برطانیہ پورے مشرق وسطیٰ کی منڈی پر قبضہ کرنے کے لئے آپس میں جدوجہد کر رہے ہیں۔ کامن ویلتھ میں برطانیہ کی سب سے اہم منڈی پاکستان ہے جو اسے سستی قیمت پر خام اشیاء مہیا کرتا ہے اور گراں قیمت پر اس کی مصنوعات خریدتا ہے۔ چنانچہ پاکستان کے بعض دوربین حلقے یہ اندازہ لگا رہے ہیں کہ پاکستان کی رہنمائی میں ممالک اسلامیہ کی معاشیاتی کانفرنس منعقد کرنے کی تجویز کو برطانوی خواہشات اور ارادوں سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔''[34]

واشنگٹن میں پاکستان کے محکمہ دفاع کے سیکرٹری اسکندر مرزا کی ''ناکامی'' اور لندن

میں وزیر خزانہ غلام محمد کی ''کامیابی'' کے پیش نظر پاکستان کے دور بین حلقوں کا یہ اندازہ غلط نہیں تھا۔ برطانیہ فی الواقع پاکستان کی امداد سے مشرق وسطیٰ کے زیادہ سے زیادہ علاقے کو اپنے زیر اثر رکھنے کے لئے کوشاں تھا اور حکومت پاکستان میں انگریز نواز ٹولے کے رکن کی حیثیت سے غلام محمد کو امید تھی کہ اس طرح وہ برطانیہ سے پاکستان کے لئے کچھ سیاسی و مالی اور فوجی رعایات حاصل کر سکے گا۔

مشرق وسطیٰ میں امریکہ اور برطانیہ کے مفادات میں تضاد، اپنا اپنا حلقہ اثر بڑھانے کے لئے کشمکش......فوجی بغاوتیں اور قتل

اگست کے مہینے میں مشرق وسطیٰ میں چند ایک واقعات ہوئے جن سے اس سیاسی تجزیے کو مزید تقویت ملی کہ برطانیہ کی تحریک پر یہ ڈرامہ رچایا جا رہا ہے کیونکہ مشرق وسطیٰ میں برطانیہ اور امریکہ کے درمیان سامراجی رقابت روز بروز شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی تھی۔ مثلاً برطانیہ کے طفیلی ملک شرق اردن کا شاہ عبداللہ 9/اگست کو ایران کا سرکاری دورہ کرنے کے بعد واپس عمان پہنچا۔ اس کے ایران میں قیام کے دوران شرق اردن اور ایران کے درمیان دوستی کا معاہدہ ہوا تھا جس کی ایک شق یہ تھی کہ دونوں ممالک اسلامی ممالک کے درمیان اختلافات کو پرامن طریقے سے دور کرنے کی کوشش کریں گے اور اگر اسلامی ممالک متفقہ طور پر کوئی تجویز منظور کریں گے تو اسے مسترد نہیں کیا جائے گا۔[35] اس معاہدے کا مطلب یہ تھا کہ برطانیہ نے شرق اردن کی وساطت سے یہ کوشش کی تھی کہ جس قدر ممکن ہو سکے ایران کو امریکہ کی دستبرد سے بچایا جائے۔ چنانچہ جب یہ خبر واشنگٹن پہنچی تو اسی دن یونائیٹڈ پریس آف امریکہ نے یہ خبر جاری کر دی کہ شاہ ایران کے دورہ امریکہ کے بارے میں وائٹ ہاؤس سے عنقریب اعلان کر دیا جائے گا۔ یہ دورہ نومبر میں ہوگا۔ شاہ ایران نے صدر ٹرومین کی دعوت قبول کر لی ہے۔[36] اس خبر کا مطلب یہ تھا کہ امریکہ ایران کو اپنی گرفت سے نکلنے کی اجازت دینے پر آمادہ نہیں تھا اور وہ ایرانی تیل پر برطانیہ کی اجارہ داری کو کلی طور پر توڑنے کا تہیہ کئے ہوا تھا۔ تاہم لندن ٹائمز کا تبصرہ یہ تھا کہ ''شرق اردن اور ایران کے درمیان نئے معاہدے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مشرق وسطیٰ کے ممالک علاقائی تعاون بڑھانے کے لئے از سر نو کوششیں کر رہے ہیں۔ اس معاہدہ کا نہ صرف شام اور مصر کے

درمیان حالیہ معاہدے سے تعلق ہے بلکہ اس کا پاکستان اور دوسرے اسلامی ممالک کے درمیان روز افزوں تعلقات سے بھی تعلق ہے۔ اگر کسی حکومت کے استحکام کے لئے معیار زندگی بلند کرنا ہے تو مشرق وسطیٰ کے ممالک کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک ایسی مشینری وجود میں لائیں جو مشترکہ وسائل کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرے اور مغربی ممالک سے جو امداد مل سکتی ہے وہ حاصل کرے۔ یہ صرف حکومت کا ہی کام نہیں ہے بلکہ یہ کام صنعتکاروں، تاجروں، زرعی ماہرین اور انجینئروں کا بھی ہے۔ کراچی میں جو اسلامک اکنامک کانفرنس ہو رہی ہے اس میں آٹھ ممالک کے صنعتکاروں کے علاوہ انجینئرز بھی حصہ لیں گے۔ پاکستان کے وزیر خزانہ غلام محمد نے اس سلسلے میں پہل کر کے صحیح قدم اٹھایا ہے۔''[37]

تاہم 9/ اگست کو دو مزید خبریں موصول ہوئیں جو اس حقیقت کی مظہر تھیں کہ برطانیہ اپنے بڑھاپے اور ناتوانی کے باوجود مشرق وسطیٰ میں امریکہ سے آخری دم تک مقابلہ کرنے کا عزم رکھتا تھا۔ ایک خبر برطانوی نیوز ایجنسی سٹار کے عراق کے وزیر خزانہ سے بغداد میں انٹرویو کی صورت میں تھی۔ انٹرویو یہ تھا کہ ''عراق کراچی میں ہونے والی اسلامی ممالک کی اقتصادی کانفرنس کا خیر مقدم کرتا ہے اور امید کرتا ہے کہ یہ کانفرنس اسلامی ممالک میں اقتصادی تعلقات کو مزید استوار بنانے میں مدد دے گی۔'' دوسری خبر لندن سے یہ تھی کہ ''عراق کے وزیر اعظم نوری السعید پاشا اور وزیر خارجہ ڈاکٹر فدا الجمالی مشرق وسطیٰ کے علاقائی بلاک کا منصوبہ تیار کر رہے ہیں۔ فدا الجمالی کے قاہرہ میں ایک بیان کے مطابق ایک فوجی معاہدہ کیا جائے گا جو مصر سے لے کر کراچی تک کے علاقہ پر حاوی ہو گا۔ اس مجوزہ معاہدے کی غایت یہ ہے کہ کمیونسٹ خطرہ کا مقابلہ کیا جائے۔''[38] بغداد اور لندن کی ان دونوں خبروں کا مطلب یہ تھا کہ برطانیہ اپنے طفیلی ملک عراق کی امداد سے مصر سے لے کر کراچی تک حاوی رہنا چاہتا تھا۔

14/ اگست کو ایک تیسری خبر دمشق سے ملی جس میں بتایا گیا کہ شام کے صدر حسنی الزعیم اور وزیر اعظم محسن برازی کو قتل کر دیا گیا ہے۔ نئی فوجی حکومت کا سربراہ کرنل سمیع حناوی ہو گا اور وزیر اعظم کے عہدے پر عطاسی پاشا فائز ہو گا۔ اس خبر کا مطلب یہ تھا کہ امریکہ نے چند ماہ قبل فوجی انقلاب کے ذریعے شام میں جو اپنی پٹھو حکومت قائم کی تھی، اب برطانیہ نے ایک اور فوجی انقلاب کے ذریعہ اس کا تختہ الٹ کر وہاں اپنی پٹھو حکومت قائم کر لی ہے۔ چنانچہ

17 راگست کوسٹار نیوز ایجنسی کی لندن سے خبر یہ تھی کہ اگر چہ ابھی تک شام کی صورت حال واضح نہیں ہوئی تاہم مشرق وسطیٰ کے سیاسی حلقے اس واقعہ کو امید افزا قرار دے رہے ہیں کہ کرنل حسنی الزعیم اور اس کے وزیر اعظم کے قتل کے واقعہ کے 24 گھنٹے کے بعد نئی وزارت قائم ہوگئی ہے۔ ڈیلی ٹیلیگراف کے نامہ نگار خصوصی نے قاہرہ سے اطلاع دی ہے کہ سارا مشرق وسطیٰ نئے وزیر اعظم عطاسی کو ایک دیانتدار اور وطن پرست قرار دے رہا ہے۔ لیکن ابھی تک یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ اس کے پیچھے ایسی طاقت موجود ہے یا نہیں جو اس کے پروگرام کی تکمیل کرا سکے۔ اگر چہ اس وقت ملک میں امن ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ دوسری عرب مملکتوں بالخصوص عراق میں نئے انقلاب کا کیا ردعمل ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ممالک عربیہ میں شام کی پوزیشن کا دارومدار اس امر پر ہے کہ عراق اور شرق اردن اس کے بارے میں کیا طرز عمل اختیار کرتے ہیں۔ قاہرہ کے سیاسی مبصر صاف طور پر کہہ رہے ہیں کہ شام کی فوج ناقابل اعتماد ہے۔ وہ گزشتہ چار پانچ مہینوں میں دومرتبہ انقلاب برپا کر چکی ہے۔ یہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ اب شام ''وسیع شام'' کی اسکیم کی طرف زیادہ مائل نظر آنے لگے گا۔ لندن ٹائمز کے نامہ نگار خصوصی نے استنبول سے اطلاع دی ہے کہ شام کے واقعات ترکیہ میں بہت سی غلط فہمیوں کا موجب بن رہے ہیں۔ جب شام میں کرنل حسنی الزعیم نے انقلاب برپا کیا تھا اس وقت بھی ترکیہ اس کی حکومت کو آسانی سے تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوا تھا۔''[39]

لندن کی اس خبر کی تعبیر کوئی مشکل نہیں تھی اور وہ یہ تھی کہ شام میں نئے فوجی انقلاب سے مشرق وسطیٰ میں امریکی مفاد پر زد پڑی تھی۔ جبکہ لندن میں اس امید کو تقویت ملی تھی کہ برطانیہ نے عراق کے وزیر اعظم نوری السعید کی امداد سے مصر سے لے کر کراچی تک اپنی زیر سرپرستی مسلم بلاک بنانے کا جو منصوبہ تیار کر رکھا ہے اب اس کی تکمیل ہو سکے گی۔ اس منصوبے کے تین مراحل تھے۔ اول یہ کہ عراق، شرق اردن اور شام کو مدغم کر کے ''عظیم تر شام'' کے نام سے ایک نئی طفیلی مملکت وجود میں لائی جائے۔ اور دوئم یہ کہ خلیج فارس کی متعدد عرب امارات کو یکجا کر کے ان کی ایک فیڈریشن قائم کی جائے اور سوئم یہ کہ ان دونوں مراحل کے طے ہو جانے کے بعد مصر سے لے کر کراچی تک ایک ایسا مسلم بلاک بنایا جائے جو نہ صرف سوویت مخالف ہو بلکہ وہ امریکہ کی دستبرد سے بھی محفوظ ہو۔

برطانیہ کا مشرق وسطیٰ میں اپنے حلقہ اثر کی خاطر پاکستان کو استعمال کرنے کا فیصلہ۔ پاکستان کو بڑھا چڑھا کر عالم اسلام کا رہنما ثابت کیا گیا

چونکہ برطانیہ کے وزیر خارجہ ارنسٹ بیون اور بعض دوسرے سیاسی مبصرین کی رائے یہ تھی کہ اس منصوبے کے آخری مرحلہ میں پاکستان اہم کردار ادا کرے گا۔ اس لئے لندن ٹائمز اور دوسرے برطانوی ذرائع ابلاغ نے نوائے وقت اور بعض دوسرے پاکستانی عناصر کی اس شکایت کے ازالہ کے لئے یہ اعتراف کرنا شروع کر دیا تھا کہ پاکستان مشرق وسطیٰ میں بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔ 17/ اگست کو جبکہ شام کے فوجی انقلاب کی اہمیت کے بارے میں لندن سے خبر جاری کی گئی تھی تو سٹار کے نامہ نگار خصوصی مقیم قاہرہ کی اطلاع یہ تھی کہ ”مشرق وسطیٰ کے امور میں پاکستان کا بحیثیت ایک طاقت کے نمودار ہونا بلاشبہ اس سال کے سب سے عظیم واقعات میں سے ایک ہے۔ لیکن عرب اخبارات میں نسبتاً اس پر بہت کم تبصرہ ہوا ہے...... مشرق وسطیٰ کی زندگی میں پاکستان کی جگہ سیاسی میدان میں اتنی نہیں ہے جتنی تجارت اور اقتصادیات میں اور سب سے عظیم اسلامی مملکت ہونے کی وجہ سے مذہبی میدان میں ہے۔ جب پاکستان کے وزیر اعظم مسٹر لیاقت علی خان اس سال کے شروع میں مصر اور عراق تشریف لے گئے تھے تو یہاں مبصرین اس بات سے بہت متاثر ہوئے تھے کہ ان کے سیاسی عقائد میں اسلام ایک نمایاں حصہ لے گا۔ پاکستان دفاع اور جنگی اہمیت کے نقطہ نگاہ سے بھی مشرق وسطیٰ سے دلچسپی رکھتا ہے وہ دوسری ایشیائی عوام کی مانند سوویت روس کی قربت اور اس اہمیت سے جو آئندہ جنگ میں مغربی ایشیا کو حاصل ہوگی پوری طرح باخبر ہے لیکن فی الحال پاکستان کا فوری تعلق عرب دنیا سے اپنے تجارتی و معاشی تعلقات مستحکم کرنا ہے...... ایک مستحکم اور نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ اسلامی اور ایشیائی مملکت ہونے کی وجہ سے پاکستان کو مشرق وسطیٰ میں بہت سے مواقع حاصل ہیں۔ عربوں کے ساتھ تجارت جو آج خشکی کے ذریعے نقل و حمل کی دشواریوں کی وجہ سے رکی ہوئی ہے اس کی صنعتوں کی ترقی کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہی جائے گی۔ عالمگیر اہمیت حاصل کرنے والے سات کروڑ افراد کی ایک اسلامی ریاست ہونے کی وجہ سے پاکستان کا اثر لاثانی ہے۔ اس صورت میں پاکستان ان عظیم طاقتوں میں جو مشرق وسطیٰ سے دلچسپی رکھتی ہیں اپنی مثال آپ ہے کیونکہ یہ ملک عربوں کے مذہب اور ان کے

تمدن کا حصہ دار ہے۔''[40]

سوویت یونین کے حکمران برطانوی سامراجیوں کے اس ''اسلامی منصوبے'' اور اس کے مقاصد سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ چنانچہ 19/اگست کو ماسکو سے رائٹر نیوز ایجنسی کی اطلاع یہ تھی کہ ''سوویت فوج کے اخبار ''ریڈ سٹار'' نے ایک مقالہ افتتاحیہ میں لکھا ہے کہ مشرق وسطیٰ کے تیل پر قبضہ جمانے کے لئے امریکہ جو چالیں چل رہا ہے ان کا مقابلہ کرنے کی غرض سے برطانیہ مصر سے پاکستان تک ایک مسلم فیڈریشن قائم کرنا چاہتا ہے۔ شام میں برطانوی اور امریکی سامراجیوں کے درمیان ٹھنی ہوئی ہے۔ وہاں دونوں ملکوں کے ایجنٹوں نے یکے بعد دیگرے ملک کی حکومت پر قبضہ کیا ہے۔ برطانیہ مشرق وسطیٰ میں امریکہ کا مقابلہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس مقابلہ کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ مقامی لوگوں کی قیمت پر امریکہ سے زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کی جائیں۔ برطانوی تاجر اور اجارہ دار اس پر امید لگائے بیٹھے ہیں کہ ایران کے تاجروں میں جو ان کے حامی ہیں، وہ امریکہ سے ان کے لئے مراعات حاصل کر سکیں گے۔''[41]

باب:6

خلیق الزماں کا دورہ مشرق وسطیٰ برائے ''اسلامستان''

برطانوی سازش کا بھانڈا جو لندن کے چوراہے میں پھوٹا

عرب ملکوں میں ناموافق فضا کے باوجود خلیق الزماں کا ''اسلامستان'' کے سامراجی منصوبے کے لئے مشرق وسطیٰ کے دورہ کا اعلان

پاکستانی لیڈروں کی طرف سے پان اسلام ازم، اتحاد اسلامی، اسلامی بلاک، مسلم فیڈریشن اور اسلامستان وغیرہ کا بڑی ڈھٹائی کے ساتھ پروپیگنڈا جاری رہا۔ 18 / اگست کو ڈان کی خبر یہ تھی کہ ''پاکستان مسلم لیگ کا صدر چودھری خلیق الزماں ستمبر کے وسط میں مشرق وسطیٰ کے دورے پر جا رہا ہے اس کا مشن یہ ہوگا کہ اسلامی ممالک کے سرکاری اور غیر سرکاری لیڈروں سے رابطہ پیدا کر کے ایک پان اسلامک پیپلز پولیٹیکل پارٹی کے قیام کے لئے زمین ہموار کی جائے۔ اس تنظیم کا نصب العین یہ ہوگا کہ مختلف مسلم ممالک کے درمیان پہلے سے زیادہ اتحاد اور پہلے سے زیادہ قریبی سیاسی تعلقات قائم کئے جائیں۔''[1] لیکن اسی دن قاہرہ سے ڈان کے نامہ نگار کی اطلاع یہ تھی کہ ''مصر کے سیاسی لیڈر اور دانشور اسلامستان (ورلڈ مسلم سٹیٹ) کے بارے میں چودھری خلیق الزماں کی اپیل کا عمومی طور پر خیر مقدم کرتے ہیں کیونکہ اس طرح ان لوگوں کے درمیان بہتر مفاہمت پیدا ہوگی جو اگرچہ جغرافیائی لحاظ سے الگ الگ ہونے کے باوجود ایک ہی قسم کے مقاصد کے حامل ہیں۔ لیکن سب کو اس رائے سے اتفاق ہے کہ چونکہ مشرق وسطیٰ کی صورتحال میں استحکام نہیں ہے اس لئے اس مرحلہ پر اسلامستان کے قیام کے لئے کانفرنس بلانا مناسب نہیں ہوگا۔''[2] لیکن چودھری خلیق الزماں نے قاہرہ کی اس خبر پر کان نہ دھرا اور

19 راگست کواس نے ایسوسی ایٹیڈ پریس کوایک انٹرویو میں بتایا کہ ''میں مشرق وسطیٰ کا چھ سات ہفتے کا دورہ کروں گا۔جن ممالک میں جاؤں گا ان میں ایران بھی شامل ہوگا۔میرے اس دورے کا مقصد مشرق وسطیٰ کی رائے عامہ کے لیڈروں سے اس امکان پر تبادلہ خیالات کرنا ہے کہ عوام الناس کی ایک تنظیم بنائی جائے جو مشترکہ مقصد کے تحت مسلم ممالک کی علاقائی گروہ بندی کا پیش خیمہ ہوگی۔اگر ایسی تنظیم وجود میں آ گئی تو وہ سفارش کرے گی کہ مسلم ممالک کی گروپنگ کس بنیاد پر ہو۔ویسے بھی عوامی تنظیم پاکستان سمیت مشرق وسطیٰ کے سارے ممالک کے وزن اور طاقت میں عمومی طور پر اضافہ کرنے میں مدد کرے گی۔ان ممالک کو اپنے تاریخی پس منظر اور جغرافیائی صورتحال کی وجہ سے بہت وزن دار اور طاقتور ہونا چاہیے۔اب تک ہم مغرب یا مشرق کی طرف دیکھتے رہے ہیں۔لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنی طرف دیکھیں۔یہ کام بہت بڑا ہے لیکن اسے کرنا بھی ضروری ہے۔اگر یہودی اپنی مملکت کو اسرائیل کہنے پر فخر کرتے ہیں تو ہم اپنی مملکت کو اسلامستان کہنے پر کیوں ہچکچاہٹ محسوس کریں۔''[3]

بیشتر مسلم ممالک پاکستان کو عالم اسلام کا لیڈر بنانے پر تیار نہ تھے......

پاکستان کے برخود غلط عناصر کی مایوسی

چودھری خلیق الزماں کے اس بیان پر ایران کے وزیر خارجہ آقائے علی حکمت نے فوراً ہی غیر موافق ردعمل کا اظہار کیا۔اس نے کہا کہ ''مجھے تشکیل اسلامستان کی تجویز کے متعلق کوئی علم نہیں۔دوسرے ایرانی حکام نے اس تجویز کی تصدیق وتائید سے انکار کیا مگر انہوں نے غیر سرکاری حیثیت میں کہا کہ ایران اس امر پر رضامند نہیں ہوگا کہ کوئی اور ملک اسلامی ممالک کا لیڈر بن جائے۔نیم سرکاری حلقوں نے رائٹر کو بتایا کہ عرب لیگ کا آئندہ اجلاس مسلم یونین کا لیڈر نامزد کرے گا۔''[4]

ایرانی وزیر خارجہ اور ایرانی حکام کے اس بیان پر پاکستان کے ان برخود غلط عناصر کو بہت صدمہ ہوا جو یہ سمجھتے تھے کہ پاکستان کے سوا کوئی دوسرا ملک عالم اسلام کی لیڈری کا دعویدار نہیں ہوسکتا۔نوائے وقت ان عناصر میں شامل تھا اور یہ اخبار 3 رنومبر 1947ء کو اور اس کے بعد سے بڑے دھڑلے کے ساتھ یہ اعلان کر چکا تھا کہ پاکستان اپنے وسائل، اپنی معیشت اور اپنی

افرادی قوت کے لحاظ سے عالم اسلام کا قدرتی لیڈر ہے اور کسی دوسرے مسلم ملک کا اس پوزیشن کے حامل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔لیکن اب نوائے وقت کا موقف قدرے مختلف تھا۔ اب اس کا تبصرہ یہ تھا کہ ''پاکستان کے بعض اکابر کو یہ شوق ہے کہ وہ اپنی تقریروں اور بیانات میں پاکستان کو اسلامی دنیا کا لیڈر ظاہر کریں۔ ہمیں یہ اندیشہ تھا کہ بعض مسلمان ملکوں میں اس سے خواہ مخواہ غلط فہمیاں پیدا ہوں گی اور افسوس ہے کہ یہ اندیشہ غلط نہیں ثابت ہوا۔ مصر میں بعض حلقوں نے ان بیانات کو پسند نہیں کیا اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ خود مصر کم از کم مشرق وسطیٰ کے ملکوں کی قیادت کا خواہش مند ہے۔ ترک بیس پچیّس برس اسلامی ملکوں سے بالکل الگ تھلگ رہے ہیں مگر وہ خود بھی علیحدگی کی اس پالیسی کو ترک کر رہے ہیں اور امریکہ کی بین الاقوامی سیاسی مصلحتوں کا تقاضا بھی یہی ہے کہ وہ اپنی پرانی روش کو چھوڑ کر دوسرے مسلمان ملکوں سے ربط وضبط پیدا کریں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ خلافت عثمانی کے خاتمہ کے باوجود ترک کسی دوسرے مسلمان ملک کی قیادت تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں۔ ادھر عرب ملکوں کی اپنی رقابتیں ہیں، ہاشمیوں کو ''شام عظمیٰ'' کا خواب پریشان کر رہا ہے مگر سلطان ابن سعود، شاہ عبداللہ کو منہ لگانے کے لئے تیار نہیں۔ افغانستان الگ اپنی ڈفلی بجا رہا ہے اور پاکستان سے اس کے تعلقات کسی طرح بھی پسندیدہ نہیں قرار دیئے جا سکتے۔ ایران ایک مسلمان ملک ہے جس سے پاکستان کے تعلقات بے حد خوشگوار ہیں مگر ایران کے وزیر خارجہ نے بھی آج اپنے ایک بیان میں چودھری خلیق الزماں کی تجویز اسلامستان کا ذکر کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ ایران کسی دوسرے ملک کو اپنا لیڈر نہیں مانے گا۔ لیڈری اس طرح اعلان کرنے اور بیان دینے سے نہیں حاصل کی جا سکتی۔ بالخصوص ملکوں اور قوموں کی لیڈری کے ڈھنگ افراد کی لیڈری سے بالکل نرالے ہیں۔ پاکستان کی لیڈری کی ضمانت اس کی ترقی اور اس کی قوت ہے۔ اگر ایشیا کے کسی ملک کو پاکستان کی قوت سے فائدہ پہنچنے کی امید ہوئی تو وہ خود بخود پاکستان کی قیادت کو قبول کرے گا۔ اس لئے لیڈری کے دعاوی پر مبنی بیانوں سے خواہ مخواہ دوسروں کو چڑانے کی کیا ضرورت ہے؟ واضح رہے کہ یہ پروپیگنڈا کہ پاکستان اسلامی دنیا کا لیڈر ہے سب سے پہلے انگریزی اخبارات نے شروع کیا تھا اور ہم ہرگز یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ اس کی بنیاد پاکستان کی خیر خواہی پر تھی بلکہ ہمیں شبہ ہے کہ پاکستان کے ان گندم نما جو فروش دوستوں کا مقصد ہی یہ تھا کہ مسلمان ملکوں میں اس وقت جو انتشار پایا جاتا ہے اسے

بڑھایا جائے اور پاکستان کے متعلق بھی دوسرے ملکوں میں غلط فہمیاں پیدا کر دی جائیں۔''[5]

پاکستان کے اسلامی دنیا کے لیڈر ہونے کا پروپیگنڈا سب سے پہلے انگریزی اخبارات نے شروع نہیں کیا تھا بلکہ اس پروپیگنڈے کی ابتدا 3رنومبر 1947ء کو نوائے وقت نے کی تھی اور پھر یہ اخبار مسلسل یہ شکایت کرتا رہا تھا کہ برطانیہ پاکستان کی سیاسی، جغرافیائی اور جنگی اہمیت کا احساس نہیں کرتا بلکہ وہ کمیونزم کے سدباب کے لئے ہندوستان کو پاکستان پر ترجیح دیتا ہے۔ لیکن اب اس اخبار کو برطانوی اخبارات کے اس پروپیگنڈے میں پاکستان اور عالم اسلام کیخلاف سازش دکھائی دیتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اگست 1949ء میں پنجابی شاونزم کا لیاقت علی خان کی حکومت کے خلاف تضاد اپنی انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔☆ اگرچہ لیاقت علی خان نے جولائی 1949ء میں پنجاب کے انگریز گورنر سر فرانسس موڈی کا استعفیٰ منظور کر لیا تھا۔ تاہم پنجاب میں اس کی داخلی اور خارجی پالیسی کے خلاف معاندانہ نکتہ چینی ختم نہیں ہوئی تھی۔ ویسے بھی مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ جب کوئی مسلم ملک پاکستان کی لیڈری تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھا تو پاکستان کی لیڈری کے دعاوی پر مبنی اداریہ لکھنے کی بجائے یہی کہنا بہتر تھا کہ انگور کھٹے ہیں۔

پاکستانی اخبارات کا انکشاف کہ عالم اسلام کے اتحاد کا منصوبہ ہزاروں میل دور کسی طاقت کے محکمہ خارجہ کا تیار کردہ ہے، اس کا لیڈر ہونا عزت نہیں توہین ہے

23راگست کو روزنامہ ڈان نے بھی اپنے ادارتی کالموں میں اس موضوع پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ'' آج مشرق وسطیٰ میں تین طاقتیں مختلف مقاصد کے تحت سفارتی استحصال کے میدان میں سرگرم عمل ہیں۔ مغربی طاقتوں کے درمیان جنگی اہمیت کے مشرق وسطیٰ میں تیل اور سیاسی حلقہ ہائے اثر کے لئے جو رقابتیں پائی جاتی ہیں وہ بڑی تیزی کے ساتھ اندرونی پھوٹ کی صورت اختیار کر رہی ہیں۔ یہ صورت حال ان کے اس محاذ کے لئے خوشگوار نہیں جو انہوں نے بڑی محنت سے بنایا ہوا ہے۔ ان کی یہ رقابتیں عربوں اور مسلم ورلڈ کے لئے بہت زیادہ خطرات کی حامل ہیں...... تربیت یافتہ غیر ملکی ایجنٹ بھی جو کمزور مما لک میں

☆ تفصیلات کے لئے دیکھئے: پاکستان کی سیاسی تاریخ جلد 4۔ جناح لیاقت تضاد و پنجابی مہاجر تضاد ایڈیشن دوم۔ 2013ء ۔ ادارہ مطالعہ تاریخ۔ لاہور

خلفشار پیدا کرنے کا تجربہ رکھتے ہیں سرگرم عمل ہیں......شرق اردن کی سلطنت بڑی خاموشی کے ساتھ اب محض اردن کی سلطنت بن گئی ہے اور وہ برطانوی وزیر خارجہ بیون کی جانب سے پیش کردہ نوالے پر منہ مار رہی ہے۔ عرب ممالک کے اتحاد کا نیا نعرہ پھر لگایا جا رہا ہے۔ اس نعرے کا مقصد ''زرخیز ہلال کے منصوبے'' کی تکمیل کرنا ہے۔ یہ وہ منصوبہ ہے جو عربوں کے لئے بہت بدبودار ہے۔ مقام افسوس ہے کہ عراق کا وزیر اعظم نوری السعید پاشا اردن کے شاہ عبداللہ کے ساتھ مل کر اس منصوبے کو جامہ عمل پہنانے کی کوشش کر رہا ہے......عرب عوام کی قیمت پر غیر ملکی سازشوں اور طاقتی سیاسیات نے مشرق وسطیٰ میں ایک نیا چکر چلا دیا ہے لہٰذا پاکستانی عوام کے لئے یہ بے حد ضروری ہے کہ وہ ہر تحریک پر نظر رکھیں اور پہلے سے متنبہ رہیں۔ ہمارا لیگی صدر چودھری خلیق الزماں کچھ عرصہ سے اسلامستان کا نظریہ پیش کر رہا ہے...... یہ ایک ایسا نظریہ ہے جس کا مقصد دنیا کے سارے مسلم عوام کو یکجا کرنا ہے۔ ہمارے سرکردہ کاروباری افراد نے حکومت کی پشت پناہی سے ایک پان اسلامک اکنامک کانفرنس بلائی ہے۔ نظریاتی طور پر چودھری خلیق الزماں کی تجویز بہت اچھی ہے اور مسلم ممالک کے درمیان معاشی اور ثقافتی اشتراک عمل بہت سودمند ہو سکتا ہے۔ لیکن کیا ان خطوط پر سوچنا، باتیں کرنا اور منصوبہ بندی غیر حقیقی نہیں ہے۔ درآں حالیکہ مسلم دنیا بڑی طاقتوں کی دخل اندازیوں کی وجہ سے انتشار وافتراق کا شکار ہو رہی ہے۔ جب تک کوئی مسلم ملک دوسرے مسلم ممالک کے ساتھ اشتراک عمل کے ذریعے مشترکہ پالیسی کی بنیاد پر، مشترکہ مقاصد کے حصول کے لئے، صحیح معنوں میں آزاد نہیں ہے تو محض افکار ونظریات کے اظہار سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ جب ان ممالک کے، جنہوں نے عربوں کے خلاف یہودیوں کو مسلح کر کے عالم عرب کے قلب میں صیہونیت کا کانٹا چبھو دیا ہے، ذرائع ابلاغ نے یکایک عربوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ''گرینڈ مسلم الائنس'' کی باتیں شروع کر دی ہیں تو دنیا کے مبصرین کے شکوک وشبہات میں اضافہ ہونا ناگزیر ہے۔ اگر یہ لوگ کسی ملک کو اس ''الائینس'' کا لیڈر کہیں تو یہ اس ملک کی توہین ہے عزت افزائی نہیں ہے۔ سارے مسلمان یہ خواب دیکھتے ہیں کہ اس قسم کا اتحاد اسلامی حقیقت کا جامہ پہن لے لیکن اگر اس قسم کا اتحاد قائم ہونا ہے تو یہ رضاکارانہ ہونا چاہیے نہ کہ کسی کی تحریک پر۔ جس اتحاد کی تشکیل ہزاروں میل دور کسی محکمہ خارجہ میں ہوگی اس سے دنیا کی مسلم اقوام کی غلامی میں اضافہ ہوگا وہ آزاد نہیں ہوں گی۔''[6] بلاشبہ ڈان کا یہ

اداریہ مشرق وسطیٰ اور دنیا کے معروضی حالات پر مبنی تھا اور اس میں اس ناگوار حقیقت پر سے پردہ اٹھایا گیا تھا کہ پان اسلام ازم، عظیم مسلم اتحاد، اسلامی بلاک وغیرہ کی اسکیم دراصل برطانیہ کے محکمہ خارجہ کی پیداوار ہے اور اس اسکیم پر عمل کرنے سے عالم اسلام کو فائدہ کی بجائے نقصان ہوگا۔

اسی روز امروز نے بھی اس موضوع پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ ''پاکستان مسلم لیگ کے صدر چودھری خلیق الزماں اسلامستان کے نام سے ایک نئی تحریک لے کر اٹھے ہیں اور اس سلسلے میں مشرق وسطیٰ کے اسلامی ملکوں کا دورہ بھی کرنا چاہتے ہیں۔ اس تحریک کا مقصد یہ ہے کہ اسلامی ملکوں کا علیحدہ بلاک بنایا جائے۔ یہ واضح ہے کہ چودھری صاحب نے جب کبھی اسلامی ممالک کی اصطلاح استعمال کی ہے، ان کی نگاہیں بے اختیار مشرق وسطیٰ کی طرف اٹھ گئی ہیں۔ گویا چودھری صاحب کا منشا یہ ہے کہ عرب ممالک اور پاکستان کو ملا کے ایک علیحدہ بلاک بنایا جائے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ عرب ممالک کی سیاست پر امریکہ اور برطانیہ مسلط ہیں۔ عراق سے برطانیہ کا تعلق واضح ہے۔ شرق اردن برطانوی سیاست کی مخلوق ہے۔ مملکت نجد و حجاز کے فرمانروا سلطان ابن سعود امریکہ کے زیر اثر ہیں۔ مصر نے اگرچہ اس پھندے سے نکلنے کی بڑی کوشش کی ہے لیکن ابھی تک اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ برطانیہ نے سوڈان کی تحریک خودمختاری کی حمایت کر کے اتحاد وادیٔ نیل کی مقبول عام تحریک کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ شام سے بھی زیادہ امید نہیں رکھنی چاہیے۔ مرحوم کرنل حسنی الزعیم امریکہ سے متاثر تھے۔ ان کے جانشین سامی حناوی برطانیہ کے زیر اثر معلوم ہوتے ہیں۔ اس شبہ کو اس لئے تقویت ہوتی ہے کہ شام میں پچھلے دنوں جو انقلاب ہوا ہے حناوی نے برطانیہ کے سوا اور کسی کو اس کی اطلاع دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ان حالات میں اول تو چودھری خلیق الزماں کی کوششوں کے بارآور ہونے کی کوئی امید نظر نہیں آتی اور اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے یعنی اسلامستان کے نام سے اسلامی ممالک کا کوئی بلاک بن بھی گیا تو یہ بلاک اینگلو۔امریکن بلاک کے دائرے کے اندر ہوگا اور اسے کوئی آزاد حیثیت حاصل نہیں ہو سکے گی۔''[7]

پاکستان کی مرکزی حکومت پر برطانیہ نواز ٹولہ کا غلبہ تھا، جو ہر داخلی و خارجی پالیسی انگریز آقاؤں کی مرضی سے بناتا تھا

نوائے وقت، ڈان اور امروز کے مذکورہ تبصروں میں مشرق وسطیٰ کے مختلف مسلم ممالک

کے امریکہ یا برطانیہ کے زیر اثر یا زیر نگیں یا زیر اقتدار ہونے کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا وہ صحیح تھا کہ ان ممالک کو کسی بھی تاویل و تعبیر کے ذریعے مکمل طور پر آزاد و خود مختار نہیں کہا جا سکتا تھا کیونکہ ان کی داخلی اور خارجی پالیسیوں کی تشکیل لندن یا واشنگٹن میں ہوتی تھی۔ لیکن ان تبصروں میں جس بات کا ذکر نہیں تھا وہ یہ تھا کہ خود پاکستان برائے نام بھی آزاد و خود مختار نہیں تھا۔ اس کا گورنر جنرل برطانیہ کے ملک معظم کی وفاداری کا حلف بردار تھا۔ اس کا کاروبار حکومت انگریزوں کے وضع کردہ قانون آزادئ ہند کے تحت چل رہا تھا۔ اس کی سول اور فوجی انتظامیہ پر انگریزوں یا انگریز نواز افسروں کا غلبہ تھا۔ اس کی مرکزی حکومت پر ظفر اللہ خان، غلام محمد، اکرام اللہ، چودھری محمد علی اور اسکندر مرزا وغیرہ پر مشتمل ایک ایسے ٹولے کا تسلط تھا کہ جو اپنے انگریز آقاؤں کی مرضی کے بغیر داخلی یا خارجی پالیسی کی تشکیل کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا اور اس کی پٹ سن، کپاس اور دوسری خام اشیاء کی بیرونی تجارت پر برطانوی کمپنیوں کی مکمل اجارہ داری تھی۔ یہ سب کچھ اس حقیقت کے باوجود تھا کہ برطانیہ نے عالم عرب کے قلب میں اسرائیل کی مملکت قائم کر کے اور مسلم ممالک کے وسائل پر اجارہ داری قائم کر کے نہ صرف عالم اسلام کو بے پناہ نقصان پہنچایا تھا بلکہ اس نے غیر منصفانہ ریڈکلف ایوارڈ کے ذریعے اور تنازعہ کشمیر کھڑا کر کے پاکستان پر ایک ایسی کاری ضرب لگائی تھی کہ پاکستانی عوام بلبلا اٹھے تھے اور وہ نسلوں تک اس چوٹ کو فراموش نہیں کر سکتے تھے۔ پاکستان کے بارے میں ان حقائق کے پیش نظر، عرب ممالک کے قوم پرست حلقے اس ملک کو برطانوی سامراج کی مخلوق تصور کرتے تھے اور انہیں اس ملک کی جانب سے ہر تحریک کے پیچھے برطانوی سامراج کا ہاتھ دکھائی دیتا تھا۔ عرب عوام کی آخر الذکر رائے بے بنیاد نہیں تھی۔ گزشتہ دو سال کے تجربے سے یہ ثابت ہوا تھا کہ کراچی کے ارباب اقتدار کوئی کام بھی انگریز مائی باپ سے پوچھے بغیر نہیں کرتے تھے۔ ان سامراجی پٹھوؤں کے نزدیک سوویت یونین یا کسی اور اشتراکی ملک سے دوستی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ حالانکہ اگست 1947ء کے بعد سوویت یونین یا کسی اور اشتراکی ملک نے کسی بھی سطح پر کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی جو پاکستان کے لئے نقصان دہ ہو سکتی تھی یا جس سے پاکستان کو کوئی شکایت ہو سکتی تھی۔ پاکستان کے وزیر خارجہ ظفر اللہ خان نے اپریل 1948ء میں محض مسئلہ کشمیر کے بارے میں انگریزوں کو بلیک میل کرنے کی نیت سے سوویت یونین سے سفارتی تعلقات قائم کرنے کے سلسلے میں تحریری طور پر پہل کی تھی مگر بعد

میں اس فیصلے پر عملدرآمد نہ کیا کیونکہ یہ بات انگریز مائی باپ کو پسند نہیں آئی تھی۔ پھر 7/جون 1949ء کو وزیراعظم لیاقت علی خان نے دورۂ روس کی دعوت محض اس لئے قبول کر لی تھی کہ اپریل 1949ء کی دولت مشترکہ کانفرنس میں انگریزوں نے اسے بالکل نظرانداز کیا تھا اور ہندوستانی وزیراعظم جواہرلال نہرو کی بڑی عزت افزائی کی تھی۔ مزید برآں 7/مئی کو ٹرومین کی جانب سے نہرو کو دورۂ امریکہ کی دعوت سے اس کی بڑی سبکی ہوئی تھی۔ تاہم اگست کے اواخر تک 7/جون کے اعلان پر عملدرآمد کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی تھی بلکہ ایسی علامتیں نظر آتی تھیں جن سے یہ تاثر ملتا تھا کہ اس اعلان پر عمل نہیں ہوگا۔ مثلاً گزشتہ ایک ماہ سے سوویت یونین کا ایک تجارتی وفد کراچی آیا ہوا تھا مگر حکومت پاکستان کے متعلقہ حکام کو اس وفد سے نتیجہ خیز بات چیت کرنے کی کوئی فرصت نہیں ملی تھی۔ البتہ 27/اگست کو حکومت پاکستان کے سیکرٹری جنرل چودھری محمد علی نے سوویت تجارتی وفد کے قائد آئی۔ اے۔ ایرامن (I.A.Eramin) سے محض رسمی ملاقات کی تھی۔

برطانوی اور پاکستانی خبررساں ایجنسیوں کا جھوٹا پروپیگنڈا کہ عرب ملکوں میں اسلامی بلاک کا نظریہ مقبول ہو رہا ہے، حقیقتاً عربوں میں عرب قوم پرستی کی تحریک زوروں پر تھی

پاکستان کے ارباب اقتدار کی اس قسم کی انگریز نوازی اور سوویت دشمنی کے پیش نظر ہی برطانوی خبررساں ایجنسی سٹار نے نوائے وقت، ڈان اور پاکستان ٹائمز اور متعدد دوسرے پاکستانی اخبارات کی مخالفت کے باوجود اسلامی بلاک کے حق میں پروپیگنڈا جاری رکھا۔ 26/اگست کو اس نے ایران کے ایک سابق وزیراعظم الحسن السعدی الاشراق کا ایک انٹرویو جاری کیا جو اس نے بغداد کے ایک اخبار ''الزمان'' کو دیا تھا۔ اس انٹرویو میں الاشراق نے کہا تھا کہ ''اسلامی بلاک قائم کرنے سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچے گا اور عالمگیر جدوجہد میں ان کی پوزیشن مضبوط ہو جائے گی۔''[8]

29/اگست کو ایسوسی ایٹیڈ پریس آف پاکستان کی یہ خبر چھپی کہ ''مشرق وسطیٰ کے ممالک میں اسلامی مشرقی بلاک قائم کرنے کی تحریک کو کافی حمایت حاصل ہو رہی ہے۔ اب عرب

ممالک اس کے قیام پر سنجیدگی سے غور کر رہے ہیں۔ عراق کے وزیر خارجہ کا بیان یہ ہے کہ اس نے متعدد لیڈروں سے مشرقی بلاک کے متعلق تبادلہ خیالات کیا ہے اور ہر ایک کی یہی متفقہ رائے ہے کہ مشرق وسطیٰ کے ممالک کو ایک جگہ مل کر متحدہ محاذ بنانا چاہیے۔ ایران کے ایک سابق وزیر اعظم محسن صدر کی رائے یہ ہے کہ اسلامی بلاک کی تشکیل اسلامی ممالک کے لئے فائدہ مند ثابت ہوگی۔ اسی طرح لبنانی وزیر اعظم نے بھی اس خیال کی حمایت کی ہے، شرق اردن کے شاہ عبداللہ نے بھی اس خیال کی تائید کرتے ہوئے کہا ہے کہ تمام اسلامی ممالک کی بشمول پاکستان اور ایران، ایک لیگ کے قیام سے ہی وہ تمام مسائل حل ہو سکتے ہیں جو اس وقت اسلامی دنیا کو درپیش ہیں۔"[9]

ظاہر ہے ایسوسی ایٹیڈ پریس کی اس خبر سے چودھری خلیق الزماں کی خاصی حوصلہ افزائی ہوئی۔ چنانچہ اس نے یکم ستمبر کو ایک انٹرویو میں مسلم ممالک کی ایک عوامی تنظیم کی تشکیل پر زور دیا۔ اس نے کہا کہ مشرق وسطیٰ کی عوامی تنظیم کا نقشہ میرے ذہن میں ہے۔ اس کے مطابق اس تنظیم پر کسی ایک ملک کا غلبہ نہیں ہو سکے گا۔ یہ تنظیم اپنے نمائندوں کا خود انتخاب کرے گی اور اس کی رکنیت کے دروازے سارے مسلم ممالک کے عوام کے لئے کھلے ہوں گے۔ اس لئے کسی ایک ملک کی دوسرے ملک پر لیڈری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مجھے یقین ہے کہ پاکستان کے مسلمان اسلامستان کے قیام کے لئے وفاداری کے ساتھ خدمت گزاری کریں گے اور انہیں لیڈری کی کوئی تمنا نہیں ہوگی۔ اس سلسلے میں کسی کو کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔ آج کل پاکستان سمیت مشرق وسطیٰ کے ممالک کی بلاک سازی کے سلسلے میں اگر کوئی تحریک ہو رہی ہے تو میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ میری پختہ رائے ہے کہ جب تک کسی بلاک کی پشت پر عوامی تنظیم نہیں ہوگی تو مشکلات کے زمانہ میں ہر ملک اپنا الگ لائحہ عمل اختیار کرے گا اور یہ عارضی اتحاد ختم ہو جائے گا۔ سعد آباد پیکٹ کا یہی حشر ہوا تھا۔ عرب لیگ کی حالیہ تاریخ نے بھی اس کے بارے میں شکوک وشبہات کے کافی اسباب مہیا کر دیئے ہیں۔ میری رائے میں عوامی تنظیم کے بغیر علاقائی گروہ بندی نہیں ہو سکتی۔"[10] چودھری خلیق الزماں کے اس انٹرویو کا مطلب یہ تھا کہ وہ پہلے تو سیکولر عرب لیگ کی جگہ مذہبی بنیاد پر عالمی اسلامی لیگ یا عالمی مسلم لیگ کے قیام کا خواہاں تھا۔ گویا وہ اپنی پاکستانی مسلم لیگ کا دائرہ وسیع کر کے اسے سارے مسلم ممالک تک پھیلانا چاہتا تھا اور پھر وہ مذہب کی بنیاد پر سوویت مخالف اسلامستان یا اسلامی بلاک بنانے کا متمنی تھا۔ کیونکہ

پاکستان میں عام تاثر یہ تھا کہ عالم عرب میں سیکولر عرب نیشنلزم کا تجربہ ناکام ہو چکا ہے اور برطانوی سامراج مصر، اردن، عراق اور شام پر مشتمل عرب یونین بنانے کی جو کوشش کر رہا ہے وہ کامیاب نہیں ہوگی۔ دراصل برطانیہ اپنی زیر سرپرستی مشرق وسطیٰ کے ممالک کے گٹھ جوڑ کے لئے ہر حربہ استعمال کر رہا تھا۔ وہ سیکولر عرب نیشنلزم کے زور پر عرب یونین کے قیام کے لئے بھی کوشاں تھا اور پان اسلام ازم کے زور پر اسلامی بلاک بنانے کی بھی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مشرق وسطیٰ کے ممالک جیسے بھی ہوں اس کی سرپرستی میں یکجا ہو جائیں کیونکہ اس طرح مشرق وسطیٰ میں نہ صرف روس کی اشتراکیت کا سدباب ہو سکے گا بلکہ اس علاقے کے وسائل کو امریکہ کی روز افزوں دست درازیوں سے بھی بچایا جا سکے گا۔ امریکہ عراق و ایران کے تیل کے ذخائر پر قبضہ کرنے کے لئے بیتاب تھا اور برطانیہ ان ذخائر کو بچانے کے لئے ہر جانب ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اس سامراجی کھیل میں پاکستان یا چودھری خلیق الزماں کی حیثیت ایک برطانوی مہرے کی تھی۔

4ستمبر 1949ء کو ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان کے نامہ نگار مقیم قاہرہ نے یہ خوشخبری دی کہ وہاں ایک شخص نے چودھری خلیق الزماں کی اسلامی تحریک کی تائید کی ہے اور وہ شخص عراق کا ناظم الامور عبدالحمید الخنق ہے۔ اس کا ایسوسی ایٹڈ پریس سے انٹرویو کے دوران چودھری خلیق الزماں کے متذکرہ بیان پر تبصرہ یہ تھا کہ ''ہم اس دن کا انتظار کر رہے ہیں جبکہ پاکستان مسلم دنیا بلکہ پورے ایشیا کی قیادت کرے گا۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ دن دور نہیں ہے۔ اس نے کہا کہ ہماری بقا کے لئے مسلم ممالک کا بلاک ضروری ہے۔ عصر حاضر میں صرف طاقتور اقوام ہی باعزت طریقے سے رہ سکتی ہیں اور اگر ہم متحد نہ ہوئے تو ہمارا کوئی مستقبل نہیں ہوگا۔ اس نے گزشتہ دو سال میں پاکستان کی قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں ترقی کی بہت تعریف کی اور امید ظاہر کی کہ عنقریب پاکستان کا شمار دنیا کی بڑی طاقتوں میں ہونے لگے گا۔''[11] اتحاد اسلامی یا مسلم بلاک کے بارے میں عراق کے ناظم الامور کا یہ بیان مصر کے وزیراعظم کے چند روز پیشتر بیان سے بالکل مختلف تھا۔ مصر کے وزیراعظم کا 25اگست کو اسکندریہ میں بیان یہ تھا کہ ''میں نے وزیراعظم عراق سے دو دن تک جو مذاکرہ کیا ہے اس کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ دونوں حکومتیں اتحاد عربیہ یا عرب ملکوں کی آزادی کے تحفظ کے اصولوں پر متفق ہو گئی ہیں۔ مذاکرات میں ممالک عربیہ کے

تمام امور پر غور ہوا۔ امید ہے کہ ان کے نتیجے میں عربوں کا ایک ایسا بلاک بن جائے گا جو یک دل ہو کر تمام حالات کا مقابلہ کر سکے گا۔"[12] اس کے دو دن بعد عراق کی انڈیپنڈنٹ پارٹی کے صدر نے مصر کے وزیر اعظم کے اس موقف کی تائید کی۔ اس نے کہا کہ ایک اسلامی بلاک یا مشرقی بلاک کی تشکیل سے زیادہ ضروری عرب لیگ کے اندر رہ کر عرب اتحاد پیدا کرنا ہے۔ اگر کسی عرب ریاست نے کسی اسلامی بلاک میں شرکت کر لی تو یہ اس کے اپنے مفاد کے لئے نقصان رساں ہو گی اور عرب لیگ میں اس کی پوزیشن کمزور ہو جائے گی۔ اگر عرب ممالک واقعی اشتراک کے خواہاں ہیں تو وہ پہلے آپس میں ایک دوسرے سے اشتراک کریں۔ اگر عرب ممالک عرب لیگ فی الحقیقت ایک بلاک بنا لیں تو وہ اتنے مضبوط ہو جائیں گے کہ ان میں سے کسی بھی ملک پر حملہ ہوا تو وہ اس کا جواب دے سکیں گے۔"[13] تاہم عراق کے ناظم الامور کے متذکرہ انٹرویو کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اس طرح اس نے اپنی حکومت کی خارجہ پالیسی کی خلاف ورزی کی تھی۔ اس نے ایسا نہیں کیا تھا کیونکہ عراق کی خارجہ پالیسی دراصل برطانیہ کے محکمہ خارجہ کی تشکیل کردہ تھی اور وہ پالیسی یہ تھی کہ جیسے بھی ہو مشرق وسطیٰ کے ممالک کا گٹھ جوڑ کیا جائے خواہ وہ عرب نیشنلزم کے نام پر ہو یا پان اسلام ازم کے نام پر۔

لیکن اس سلسلے میں ستم ظریفی کی بات یہ تھی کہ اگرچہ پہلی جنگ عظیم میں ترکوں کی خلافت عثمانیہ کے زوال کے بعد پان اسلام ازم کی ازسر نو تحریک نجد و حجاز کے نئے فرمانروا سلطان ابن سعود نے کی تھی لیکن اب اس ملک میں پان اسلام ازم کی تحریک کے بارے میں کوئی گرمجوشی نہیں پائی جاتی تھی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ سعودی عرب امریکہ کے زیر اثر تھا۔ اس کے تیل کے ذخائر پر امریکی کمپنیوں کا قبضہ تھا اس لئے وہ برطانیہ کی جاری کردہ پان اسلام ازم کی تحریک کی حمایت نہیں کر سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستان میں مصر کے سفیر علوبہ پاشا سے 8 ستمبر کو جب چودھری خلیق الزماں کی اسلامستان کی اسکیم کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے سوال کا گول مول جواب دیا تھا۔ اس نے کہا کہ "مجھے اس اسکیم کی تفصیلات کا علم نہیں۔ تاہم میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مسلم ممالک جو ایک دوسرے کے ہمسایہ ہیں اور جن کے بہت سے مفادات مشترک ہیں اپنی انفرادیت کو ہاتھ سے دیئے بغیر بھی ایک دوسرے کے مددگار بن سکتے ہیں۔" اس نے کہا کہ "ایک دوسرے کی مدد کا جذبہ پیدا کرنے کی ضرورت اولین ہے۔ اگر یہ جذبہ پیدا نہیں ہوتا تو صرف

معاہدوں سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہوگا۔ مسلم ممالک کی داخلی اور خارجی پالیسی کا گُر یہ ہے کہ وہ طاقتور بنیں اور انسانی بھلائی کے لئے کام کریں۔ ہم کو طاقتور بننے کی کوشش کرنی چاہیے۔"[14]

12 ستمبر کو کراچی کی ایک "عوامی انجمن" نے چودھری خلیق الزماں کے اعزاز میں دعوت دی تو اس نے اس موقع پر اپنے اسلامی ممالک کے مجوزہ دورہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ "اسلامی ممالک میں آج قدرتی طور پر یہ خواہش پائی جاتی ہے کہ اسلامی ممالک میں باہمی ربط زیادہ گہرا ہونا چاہیے اور اس طرح گویا اسلامستان کے تصور کو اصولی طور پر قبول بھی کیا جا چکا ہے۔ اس نے کہا کہ جب تک اسلامستان کی تحریک کو مختلف ملکوں کے عوام کی واقعی پشت پناہی حاصل نہ ہوگی اس کی کامیابی کے امکانات بہت خفیف رہیں گے۔ عوام کی حمایت اسلامستان کو حقیقت بنا سکتی ہے۔"[15] خلیق الزماں کے اعزاز میں یہ دعوت دراصل الوداعی دعوت تھی۔ چنانچہ 13 ستمبر کو وہ اپنے عظیم الشان مشن کی تکمیل کے لئے مشرق وسطیٰ کے دورے پر روانہ ہوگیا۔ وہ تجربہ کار خلافتی لیڈر تھا اور پروپیگنڈے کی اہمیت سے اچھی طرح واقف تھا اس لئے روزنامہ ڈان کے ایک نامہ نگار کو اپنے ساتھ لے گیا۔

خلیق الزماں نے بغداد اور تہران کے دورے کی رپورٹ میں یہ تاثر دیا کہ اسلامستان کے قیام کے لئے برطانوی منظوری درکار ہوگی اور یہ معاہدہ اطلانتک کی طرز اختیار کرے گا

خلیق الزماں سب سے پہلے بغداد پہنچا جہاں اس نے اپنے پانچ چھ روزہ قیام کے دوران وزیراعظم نوری السعید پاشا کے علاوہ سرکاری اور غیر سرکاری زعما سے ملاقاتیں کیں اور یہ تاثر حاصل کیا کہ "عراق کے لوگ عمومی طور پر اسلامستان کے نظریہ سے ہمدردی رکھتے ہیں لیکن قدرتی طور پر اس کے حصول میں وقت لگے گا۔" وہاں جو شخص نظریے کا پرجوش حامی تھا وہ فلسطین بچاؤ سوسائٹی کا سیکرٹری سید محمود ساہمی درویش تھا۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ "مسلمانوں کی بیداری کا وقت آ گیا ہے۔ مسلم اقوام اپنی ناگزیر منزل یعنی لیگ آف مسلمز (Muslims) کی منزل کی طرف چل پڑی ہیں۔ یہ تنظیم اسلام کے اس ابتدائی اصول کا تحفظ کرے گی کہ سارے مسلمان رشتۂ اخوت میں منسلک ہیں۔ ایسے وقت میں پاکستان نے اسلامستان کے قیام کے لئے رہنمایانہ

کردار ادا کرنا شروع کیا ہے۔ پاکستان نے اس کردار کی ادائیگی صرف اس لئے نہیں شروع کی کہ یہ مسلم دنیا کی لیڈر شپ کی پوزیشن کا حامل ہے بلکہ اس لئے بھی کہ یہ اسلامی روایات کی برتری اور آزادی، مساوات اور انصاف کے اسلامی اصول کے نفاذ میں غیر متزلزل ایمان رکھتا ہے۔ ہمارے دل میں پاکستان کے عظیم لیڈر اور سرگرم مسلم اور مجاہد کے لئے محبت اور احترام کے جذبات ہیں۔''[16]

بغداد میں چودھری خلیق الزماں کے قیام کے دوران کراچی میں قائم شدہ مؤتمر عالم اسلامی کا سیکرٹری جنرل حسن الاعظمی یہی مشن لے کر مصر کا دورہ کر رہا تھا۔ قاہرہ میں سٹار نیوز ایجنسی سے اس کا انٹرویو یہ تھا کہ ''ہم ایک مشرقی بلاک نہیں چاہتے۔ ہم ایک اسلامی بلاک چاہتے ہیں۔ جس میں نہ صرف مشرق کے ممالک شامل ہوں گے بلکہ مغرب کے ممالک بھی شامل ہوں گے۔ اس کے علاوہ ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ یہ تحریک عوام کی طرف سے ہو۔ حکومتوں کی طرف سے نہ ہو۔''[17]

19 ستمبر کو خلیق الزماں بغداد سے تہران پہنچا۔ وہ ہوائی اڈے سے سیدھا ایران کے وزیر اعظم سعید کے دفتر میں گیا اور وہاں اس نے وزیر اعظم سے تقریباً 45 منٹ تک بات چیت کی۔ 23 ستمبر کو چودھری خلیق الزماں نے شیعہ علما اور مجتہدین کے ایک بڑے نمائندہ اجتماع کو خطاب کیا اور بعد میں اس نے ایران کے وزیر خارجہ کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھایا۔ 24 ستمبر کو ڈان کی اطلاع کے مطابق اس موقع پر ایرانی وزیر خارجہ نے چودھری خلیق الزماں کے افکار و نظریات سے اتفاق کیا اور اپنے ملک کے تعاون کا یقین دلایا۔ 25 ستمبر کو ڈان کے نامہ نگار خصوصی، جو چودھری خلیق الزماں کے ساتھ ہی سفر کر رہا تھا، کی رپورٹ یہ تھی کہ ''اگر اسلامستان کے نظریے کے بارے میں بغداد اور تہران کے ردعمل کو پیش نظر رکھا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ مسلم ممالک کی گروہ بندی توقع سے پہلے ہی عمل میں آجائے گی۔ جب خلیق الزماں، مسلم ممالک کے دورے کے لئے کراچی سے روانہ ہوا تھا تو اس کے پاس اسلامستان کے بارے میں کوئی واضح منصوبہ نہیں تھا لیکن اب باخبر حلقوں کی اطلاع یہ ہے کہ اس کا یہ خیال ٹھوس شکل اختیار کر رہا ہے۔ پاکستان مسلم لیگ کے صدر کی بغداد میں اپنا ابتدائی پروگرام یکا یک تبدیل کر کے تہران میں آمد اس جانب ایک اہم قدم کی حیثیت رکھتی ہے۔ سیاسی حلقوں کا خیال ہے کہ اگرچہ کچھ عرصہ سے اسلامی اتحاد کا خیال لیڈروں کی توجہ کا مرکز بنا رہا ہے لیکن مشرق وسطیٰ کی صورتحال اس خیال کی راہ میں حائل رہی ہے۔ مشرق وسطیٰ کے اکثر ممالک میں کوئی سیاسی تنظیم نہیں ہے اور کچھ ممالک میں اندرونی اختلافات بہت شدید ہیں۔

مزید برآں عرب عصبیت موجود ہے جو سیاسی لیڈروں کے الزام کے مطابق برطانیہ کی پیدا کردہ ہے۔عراق میں برطانیہ پر بہت الزامات لگائے جاتے ہیں۔مشرق وسطیٰ کی ساری سیاسی برائیوں کی، بالخصوص عربوں کے باہمی اختلافات کی، ذمہ داری برطانیہ پر عائد کی جاتی ہے۔لوگ دیانتداری سے یہ باور کرتے ہیں کہ اگر مسلم دنیا کی بہتری کی کوئی اسکیم برطانیہ کے مفادات کے خلاف ہوگی یا اسے برطانیہ کی اشیر باد حاصل نہیں ہوگی تو وہ لازمی طور پر ناکام ہوگی۔یہ تاثر اس قدر گہرا ہے کہ بااثر سیاسی لیڈروں نے بھی چودھری خلیق الزماں سے استفسار کیا ہے کہ آیا حکومت برطانیہ اسلامی بلاک کی تشکیل کی اجازت دے گی۔تاہم اس صورتحال میں ایک حوصلہ افزا عنصر یہ ہے کہ عوام اسلامی اتحاد میں رکاوٹ ڈالنے کی ہر کوشش کی مزاحمت کرنے کا عزم رکھتے ہیں اور سرکاری حلقوں میں یہ احساس پایا جاتا ہے کہ متصادم سیاسی نظریات کی بنا پر منقسم شدہ دنیا میں مسلم ممالک کی بقا کے لئے مسلم ممالک کی کسی نہ کسی طرح کی علاقائی گروپنگ بہت ہی ضروری ہے۔بعض ذمہ دار افراد نے یہ بھی تجویز پیش کی ہے کہ اسلامستان کی تشکیل ویسٹرن یونین کے خطوط پر عمل میں لائی جائے۔"[18] ڈان کی یہ رپورٹ اس لحاظ سے اہم تھی کہ چودھری خلیق الزماں نے اس کے ذریعے یہ جواز پیدا کرنے کی کوشش کی تھی کہ جب وہ مشرق وسطیٰ کے دورے کے بعد اپنے اسلامستان کے بارے میں حکومت برطانیہ کی رضامندی حاصل کرنے کی کوشش کرے گا تو اس میں کوئی حرج نہیں ہوگا بلکہ یہ بات مسلم دنیا کے مفاد میں ہوگی۔علاوہ ازیں اس نے اس رپورٹ میں مشرق وسطیٰ میں اطلانتک پیکٹ کی طرح کے فوجی گٹھ جوڑ کے لئے بھی زمین ہموار کرنے کی کوشش کی تھی۔

اصفہانی کا لیاقت کے نام خط اور ظفر اللہ۔اکرام اللہ ٹولے کی جانب سے لیاقت کا دورۂ سوویت یونین منسوخ کرانے کے لئے سرگرمیاں

جب چودھری خلیق الزماں نے مسلم ممالک کا یہ دورہ شروع کیا تھا تو اس سے چند دن قبل واشنگٹن میں مقیم سفیر ایم۔اے۔ایچ۔اصفہانی کی جانب سے وزیر اعظم لیاقت علی خان کے نام ایک خط موصول ہوا تھا جس کے پیش نظر اسے اصولی طور پر یہ دورہ کرنے کی اجازت نہیں دینی چاہیے تھی۔کیونکہ سوویت یونین کا الزام یہ تھا کہ اس کی اسلامستان کی تحریک دراصل مشرق وسطیٰ کے بارے میں برطانیہ کے سامراجی منصوبے کا حصہ ہے۔اصفہانی کا خط یہ تھا کہ "آپ کی جانب

سے دورۂ ماسکو کی دعوت کی قبولیت حکمت عملی کا شاہکار تھی۔'' آگے چل کر اصفہانی کے خط میں لکھا گیا تھا کہ ''چند ماہ قبل تک ہمیں یہاں کے محکمہ خارجہ کے درمیانے درجہ کے افسروں کی چند میٹھی باتوں کے سوا کچھ نہیں ملتا تھا۔ ہمیں محض اچھے لڑکے سمجھا جاتا تھا۔ ایسے لڑکے جو کمیونزم کے ساتھ نہیں کھیلیں گے اور نہ ہی بائیں بازو والوں کے ساتھ خوش گپیاں کریں گے۔ ایسے لڑکے جو بھوکے مر جائیں گے لیکن کمیونسٹوں سے بات نہیں کریں گے...... ہمیں ایک ایسا ملک تصور کیا جاتا تھا جس کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ اس کے برعکس حکومت امریکہ ہندوستان کی طرف بہت توجہ کرتی تھی جس کا مقصد ہندوستان کی خوشنودی حاصل کرنا اور اس سے لاڈ پیار کرنا ہوتا تھا...... لیکن اب راتوں رات حکومت امریکہ پاکستان کی طرف بہت توجہ دینے لگی ہے...... ہمارا یہ احساس دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے کہ امریکہ ہندوستان کا طرفدار ہے...... اب یہ کوشش ہو رہی ہے کہ ہمارے شکوک دور ہو جائیں اور ہمیں یہ یقین ہو جائے کہ ہمارے ساتھ منصفانہ سلوک کیا جائے گا اور ہماری طرف اتنی ہی توجہ کی جائے گی جتنی توجہ کے ہم مستحق ہیں۔''[19] اصفہانی کے اس خط کا مطلب یہ تھا کہ دورۂ ماسکو کی دعوت کی قبولیت سے پاکستان کا بین الاقوامی وقار بڑھا ہے۔ لہٰذا اس وقار کو برقرار رکھنے کے لئے اس دعوت پر عمل ہونا چاہیے۔

لیکن وزیر خارجہ چودھری ظفر اللہ خان اینڈ کمپنی کا کچھ اور ہی خیال تھا۔ وہ پاکستان اور سوویت یونین کے درمیان کوئی رابطہ قائم نہیں کرنا چاہتے تھے۔ روس کا تجارتی وفد جو 25 رجولائی 1949ء کو پاکستان پہنچا تھا، ابھی تک کراچی میں بیٹھا تھا۔ حکومت پاکستان میں کسی کو روس کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ وزیر اعظم لیاقت علی خان کے دورۂ ماسکو کو منسوخ کرانے کا تہیہ کئے ہوئے تھے۔ چنانچہ جب انہیں اصفہانی کے خط کا پتہ چلا تو انہوں نے فوراً حکومت برطانیہ سے رابطہ پیدا کیا اور وہاں سے بڑی مکاری کے ساتھ پاکستان پر دباؤ ڈالا گیا۔ 28 رستمبر کو لندن میں مقیم پاکستانی ہائی کمشنر حبیب رحمت اللہ نے لیاقت علی خان کو لکھا کہ ''کامن ویلتھ امور کے نائب وزیر خارجہ لارڈ ایڈی سن (Edison) نے مجھے ان چیزوں کی لمبی فہرست دی ہے جو برطانیہ نے پاکستان کے لئے کی ہیں اور پوچھا ہے کہ پاکستان کو برطانیہ کے خلاف کیا شکایت ہے۔''[20] لارڈ ایڈی سن کی حبیب رحمت اللہ سے یہ گفتگو دراصل وزیر اعظم لیاقت علی خان کو انتباہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر پاکستان نے ماسکو کی جانب

کوئی قدم اٹھایا تو اس کے لندن کے ساتھ روابط پر برے اثرات پڑیں گے۔

پھر تقریباً ایک ماہ بعد 27/اکتوبر کو پاکستان میں مقیم برطانوی ہائی کمشنر کی طرف سے وزیراعظم لیاقت علی خان پر دباؤ ایک خط کی صورت میں ڈالا گیا۔ اس خط میں ماسکو میں برطانوی سفیر کا یہ پیغام درج تھا کہ ''اس امر کا امکان ہے کہ وہ وزیراعظم لیاقت علی خان کے دورۂ ماسکو کے موقع پر ان سفارتی آداب کا مظاہرہ نہیں کر سکے گا جن کا کہ وزیراعظم مستحق ہے۔'' ان دنوں برطانوی سفیر ماسکو میں پاکستان کی نمائندگی کرتا تھا۔ اس کی جانب سے یہ پیغام رسانی اس لئے کر دی گئی تھی کہ اصفہانی کی طرح ایران میں مقیم پاکستانی سفیر راجہ غضنفر علی خان یہ سمجھتا تھا کہ پاکستان کے بین الاقوامی مفاد کا تقاضا یہ ہے کہ پاکستان سوویت یونین کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرے۔ چنانچہ اس نے پاکستان کے محکمہ خارجہ کو اپنے ایک مراسلے میں روسیوں کے ساتھ اپنے خوشگوار تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''وہی روسی جنہوں نے 1948ء کے یوم آزادی کے موقع پر ہماری تقریبات میں شرکت نہیں کی تھی اور جنہوں نے قائداعظم کی وفات پر تعزیت نہیں کی تھی اب ہمارے ہاتھوں سے چھین کر کھاتے ہیں۔'' اس پر ظفراللہ خان کا جواب یہ تھا کہ ''ہاتھ سے چھین کر کھانے والوں پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے اگر میں سفیر ہوتا تو میں احتیاط کرتا۔'' اسی طرح محکمہ خارجہ کے سیکرٹری اکرام اللہ نے غضنفر علی خان کو لکھا کہ اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو میں روسیوں کے ساتھ برتاؤ کرنے میں انتہائی محتاط ہوتا۔ اسی پر غضنفر نے یہ جواب دیا کہ ''روس کا خطرہ ابھی تک محض ایک ہوّا ہے جبکہ دوسروں نے (مغربی طاقتوں نے) ہم سے اتنی مرتبہ دھوکہ کیا ہے۔'' راجہ غضنفر علی خان نے یہ خط جل بھن کر ایسے موقع پر لکھا تھا کہ جبکہ وزیر خارجہ ظفراللہ خان سوویت یونین کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کرنے سے مسلسل انکار کئے جا رہا تھا۔ ابتداً لیاقت علی خان کے دورۂ ماسکو کی تاریخ 20/اگست مقرر ہوئی تھی مگر سوویت یونین کی تجویز پر دورہ 7/نومبر تک ملتوی کر دیا گیا تھا کیونکہ روسیوں کی خواہش یہ تھی کہ لیاقت کے دورہ سے قبل دونوں ملکوں کے درمیان سفارتی تعلقات قائم ہو جائیں مگر ظفراللہ خان ایسا کرنا ضروری نہیں سمجھتا تھا۔[21] چونکہ روسی اپنے اس مطالبہ پر مصر تھے اور ظفراللہ خان اس کی تکمیل پر کسی صورت آمادہ نہیں ہوتا تھا اس لئے لیاقت علی خان کا دورۂ ماسکو کھٹائی میں پڑا رہا۔

چین کے کمیونسٹ انقلاب کی کامیابی اور سوویت یونین کے کامیاب ایٹمی دھماکہ سے عالمی طاقت کا توازن الٹ گیا...... بھارت کی اہمیت میں اضافہ

چودھری خلیق الزماں کے اس دورے کے دوران عالمی سطح پر دو واقعات ایسے ہوئے جن سے عالمی طاقت کے توازن میں بنیادی تبدیلی واقع ہوگئی۔ ان واقعات کی وجہ سے ایک طرف تو امریکہ اور برطانیہ کی نظر میں مشرق وسطیٰ کے دفاع کی اہمیت میں اور بھی اضافہ ہوگیا اور دوسری طرف ان میں یہ احساس بڑھ گیا کہ مشرق بعید میں کمیونزم کے سدباب کے لئے ہندوستان کی زیر قیادت فوجی گٹھ جوڑ میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔ عالمی سطح پر ان دونوں واقعات میں سے پہلا واقعہ یہ تھا کہ پورے چین میں کمیونسٹ انقلاب کامیاب ہوگیا تھا اور سان فرانسسکو کی 21 ستمبر کی خبر یہ تھی کہ چین کی کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر ماؤزے تنگ نے عوامی جمہوریہ چین کا اعلان کر دیا ہے دوسرا واقعہ یہ تھا کہ ماؤزے تنگ کے اس اعلان کے دو دن بعد 23 ستمبر کو امریکہ کے صدر ٹرومین کا اعلان یہ تھا کہ سوویت یونین نے کامیاب ایٹمی دھماکہ کیا ہے۔ یہ دھماکہ اگست کے آخری ہفتے میں ہوا تھا اور امریکیوں کو اس کا پتہ 3 ستمبر کو چلا تھا۔ تقریباً دو ہفتے تک امریکہ، برطانیہ اور کینیڈا کے ماہرین اس دھماکہ خیز اطلاع پر غور و خوض کرتے رہے اور بالآخر 23 ستمبر کو اعلانیہ طور پر یہ تسلیم کرلیا گیا کہ ایٹم بم پر امریکہ کی اجارہ داری ختم ہوگئی ہے۔ چین کے انقلاب کی کامیابی سے اور سوویت یونین کے ایٹمی دھماکے سے ساری دنیا میں تہلکہ مچ گیا اور سیاسی مبصرین کی رائے یہ تھی کہ اب امریکہ اور برطانیہ نہ صرف یورپ میں مغربی طاقتوں کی فوجی قوت میں اضافہ کریں گے بلکہ وہ ایشیا کے دفاع کے لئے بھی اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں گے۔

پاکستان کے ارباب اقتدار کو اندیشہ تھا کہ ان دونوں عالمی واقعات کے بعد اینگلو۔امریکی بلاک کی نظر میں ہندوستان کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ جائے گی اور وہ ہندوستان کی زیر قیادت ایک ایشیائی بلاک بنانے کی کوشش کریں گے۔ فلپائن کا جنرل رمولو 2 ستمبر کو نیویارک میں ایک تقریر کے دوران ایشیائی یونین کی تجویز پیش کرتے ہوئے ہندوستان کو ایشیا کی قیادت کے اعزاز کی پیشکش کر چکا تھا کیونکہ اس کی رائے یہ تھی کہ ہندوستان ایشیا میں سب سے زیادہ طاقتور اور سب سے زیادہ روشن خیال ہے۔ جنرل رمولو کی اس تقریر کے پیش نظر سب کو یقین تھا کہ

ہندوستانی وزیراعظم جواہرلال نہرو کی، جو اکتوبر کے اوائل میں صدر ٹرومین کی دعوت پر امریکہ جانے والا تھا، امریکہ میں خوب پذیرائی ہوگی۔ امریکہ کے صدر ٹرومین اور برطانیہ کے وزیراعظم ایٹلی نے ایشیا میں ہندوستان کی قیادت کے لئے راہ ہموار کرنے کی خاطر ستمبر کے اوائل میں ہندوستان اور پاکستان سے اپیل کی تھی کہ وہ اقوام متحدہ کے کمیشن کی تجاویز کے مطابق تنازعہ کشمیر کا پرامن تصفیہ کریں مگر نہرو نے یہ اپیل یہ الزام لگا کر مسترد کر دی تھی کہ پاکستان نے کشمیر میں جارحیت کا ارتکاب کیا ہے۔

ستمبر کے تیسرے ہفتے میں پاکستان کا وزیر خزانہ غلام محمد امریکہ گیا تو وہاں اس نے ایک پریس کانفرنس میں ہندوستان اور جواہرلال نہرو کی روزافزوں اہمیت پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''ایشیا اور بالخصوص مشرق وسطیٰ کی قوموں میں پاکستان کو اہم مقام حاصل ہے۔ اس لئے اگر ایشیا پر کسی ایک ملک یا فرد کی قیادت مسلط کرنے کی کوشش کی گئی تو پاکستان اور اس کے ہمسایہ ممالک میں اس کے خلاف ناخوشگوار قسم کا ردعمل پھیلے گا۔'' اس نے کہا کہ ''اگر براعظم ہند، ایشیا میں پائیداری اور استحکام پیدا کرنے والی قوت کی شکل اختیار کرنا چاہتا ہے تو پھر پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات خوشگوار ہونے چاہئیں۔'' اس نے کہا کہ ''اقوام متحدہ کے رکن کی حیثیت سے پاکستان اس بات پر تو ہمیشہ آمادہ رہا ہے کہ جمہوری طرز زندگی کو فروغ دینے کی خاطر جو بھی منصوبہ بنایا جائے گا اس میں وہ پورا پورا تعاون کرے گا۔ لیکن پاکستان کسی بیرونی حکمرانی یا دخل اندازی کو برداشت نہیں کر سکتا اور وہ خود بھی ایسا نہیں کرنا چاہتا۔'' اس نے کہا کہ ''پاکستان اپنی ایک اہمیت رکھتا ہے۔ شمال اور مشرق میں وہ ان سرحدوں کا محافظ ہے جو برما سے ملی ہوئی ہیں اور چین کے قریب ہیں۔ لہٰذا اس پر (چین کے انقلاب کی وجہ سے) بہت بڑی ذمہ داری آپڑی ہے۔''[22] غلام محمد کے اس بیان کا مطلب یہ تھا کہ خدارا پاکستان کو ہندوستان کا طفیلی ملک نہ بنایئے۔ اگر تنازعہ کشمیر کا تصفیہ کروا دیا جائے اور پاکستان کو ہندوستان کے مساوی درجہ دیا جائے تو وہ سوویت یونین اور چین کے خلاف ہر منصوبے سے مکمل تعاون کرنے پر آمادہ ہے۔

دراصل وزیر خزانہ غلام محمد کی یہ اگر مگر بالکل بے سود تھی۔ امریکہ اور برطانیہ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ پاکستان ان کی جیب میں ہے اور ان کی جیب میں ہی رہے گا۔ کیونکہ کراچی میں جن افراد کے ہاتھ میں پاکستان کی خارجہ پالیسی کی باگ ڈور ہے وہ بہرصورت اپنے ملک کو مغربی

طاقتوں کے حلقہ غلامی میں ہی رکھیں گے حالانکہ پورے پاکستان میں آزاد خارجہ پالیسی کا مطالبہ کیا جا رہا تھا۔ چودھری خلیق الزماں ان ہی افراد کی تحریک پر مشرق وسطیٰ میں اسلامستان کا ڈھنڈورا پیٹ رہا تھا۔

سعودی عرب کے فرمانروا نے خلیق الزماں اور پاکستان کے اعلیٰ وفد کو صرف دس منٹ دیئے اور اسلامستان کی تجویز میں کوئی دلچسپی نہ لی

ڈان کی رپورٹوں کے مطابق بغداد اور تہران میں خلیق الزماں کا مشن کامیاب رہا تھا۔ اور اب اکتوبر کے دوسرے ہفتے میں حج کے موقع پر وہ یہی مشن پورا کرنے کے لئے سعودی عرب میں تھا۔ چنانچہ عرفات کے میدان اور منیٰ سے ڈان کے خصوصی نامہ نگار کی رپورٹ یہ تھی کہ ''آج یہاں زبردست سیاسی سرگرمیاں جاری ہیں۔ مفتیٔ اعظم الحاج امین الحسینی اور چودھری خلیق الزماں کے خیمے ان سرگرمیوں کے مرکز بن گئے ہیں۔ چار بجے سہ پہر چودھری خلیق الزماں مفتیٔ اعظم کے خیمے میں گیا اور وہاں دونوں رہنماؤں کے درمیان تقریباً دو گھنٹے تک بات چیت ہوئی۔ جب یہ کانفرنس ختم ہوئی تو مفتی اعظم نے ڈان کو بتایا کہ اس نے اسلامستان کی تجویز کی مکمل حمایت کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ جب مفتی نے یہ اعلان کیا تو اس کے خیمے میں موجود بہت سے لوگوں نے بے ساختہ تالیاں بجائیں۔ منیٰ کے ہر خیمے میں گزشتہ دو دن سے مختلف ممالک کے مسلمانوں کے درمیان اسلامستان کے موضوع پر بحث ہو رہی ہے اور چودھری خلیق الزماں اس سلسلے میں مختلف خیموں میں خود جا کر اپنی تجویز کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کرتا رہا ہے۔ منیٰ میں دوسرے دن سلطان ابن سعود نے اپنے خیمے میں چودھری خلیق الزماں، پاکستان کے خیرسگالی وفد اور پاکستانی سفارت خانہ کے ارکان سے ملاقات کی۔ سلطان نے پاکستانی خیرسگالی مشن کے قائد خواجہ شہاب الدین سے دس منٹ کی بات چیت کے دوران پاکستان کو مکمل اور دوستانہ تعاون کا یقین دلایا۔''[23] اس خبر کے آخری حصے کا مطلب یہ تھا کہ سلطان ابن سعود نے اسلامستان کی تجویز کی حمایت نہیں کی تھی اور اس نے صرف دس منٹ میں پاکستان کے اعلیٰ سطح کے وفد کو ٹرخا دیا تھا۔ قبل ازیں پاکستان میں سعودی سفیر علوبہ پاشا نے بھی 8 ستمبر کو کوئٹہ میں اس تجویز کی تائید کرنے سے گریز کیا تھا۔ سعودیوں کے اس رویے کی وجہ یہ تھی کہ ان کی سلطنت امریکیوں کے زیر اثر تھی اور

اسلامستان یا اسلامی بلاک کی تجویز انگریزوں کی مخلوق تھی۔ امریکہ اور برطانیہ سوویت یونین اور چین کے خلاف تو اتحادی تھے لیکن جہاں تک مشرق وسطیٰ اور ایشیا کے دوسرے ممالک کے استحصال کا تعلق تھا ان کے درمیان سخت سامراجی رقابت پائی جاتی تھی۔

برطانوی حلقہ اثر کے عرب ممالک اور امریکی حلقہ اثر کے عرب ممالک کے مابین کشمکش، خلیق الزماں کے اسلامستان کی کوئی گنجائش نہ نکل سکی

سعودی عرب سے چودھری خلیق الزماں شرق اردن پہنچا تو اس نے 13 را کتوبر کو شاہ عبداللہ سے اسلامستان کے موضوع پر تبادلہ خیالات کیا اور شاہ عبداللہ کو یہ بتایا کہ اس کے اسلامستان کا مطلب یہ ہے کہ مختلف مسلمان ممالک کے عوام کی تنظیم قائم کی جائے گی اور یہ سرکاری سطح کی تنظیم سے مختلف ہوگی۔ خلیق الزماں کی جانب سے اس وضاحت کی وجہ یہ تھی کہ مصر میں آصف علی، عراق میں علی ظہیر اور مشرق وسطیٰ کے دوسرے ممالک میں ہندوستانی سفراء مذہب کی بنیاد پر بلاک سازی کی پاکستانی تجویز کے خلاف یکا یک غیر معمولی طور پر سرگرم عمل ہو گئے تھے۔ قاہرہ میں آصف علی کا موقف یہ تھا کہ ''ہندوستان مجوزہ اسلامی بلاک کے خلاف نہیں ہے لیکن میری رائے میں ایسا بلاک قائم نہیں ہوسکتا ہے اور اگر قائم ہو جائے تو کامیاب نہیں ہوسکتا ہے۔''[24] بغداد میں علی ظہیر کی رائے یہ تھی کہ ''اگر اسلامی ممالک کوئی بلاک بنانے کی خواہش رکھتے ہیں تو میرے خیال میں اس میں اتنی وسعت پیدا کی جائے کہ اس میں مشرقی ممالک بھی شامل ہو جائیں جن کا ایک مشترکہ اور متحدہ مقصد ہے یعنی اشتراکیت کا مقابلہ کرنا جو مشرق کے لئے خطرے کا باعث بنا ہوا ہے۔''[25]

مزید برآں جہاں تک شرق اردن کا تعلق تھا، مشرق وسطیٰ میں بلاک سازی کے برطانوی ماہرین کا منصوبہ وقتی طور پر کچھ اور تھا۔ اس سلسلے میں ڈیلی ٹیلیگراف کے نامہ نگار خصوصی متعین قاہرہ کی اطلاع یہ تھی کہ ''قاہرہ کے بعض سیاسی حلقے یہ کہہ رہے ہیں کہ شام، عراق اور شرق اردن کی ایک فیڈریشن قائم ہوجانی چاہیے۔ ان حلقوں کی رائے یہ ہے کہ خوش قسمتی سے شام کی کابینہ میں ملک کے فراخدل سیاستدان موجود ہیں۔ شام کے عوام کی اکثریت خارجی عداوتوں سے تنگ آ چکی ہے۔ وہ عراق اور شرق اردن سے کوئی مفاہمت کرنا چاہتے ہیں۔ عراق اور شرق

اردن خونی رشتے کی وجہ سے ایک دوسرے کے اتنے قریب ہیں کہ کسی دوسری عرب حکومت کی مثال نہیں پیش کی جاسکتی۔ اس کے ساتھ ہی جہاں تک صحرائی علاقوں کی آبپاشی اور تیل کی سکیموں کا تعلق ہے، شام اور عراق کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ عراق سے آنے والی پائپ لائنوں، تیل صاف کرنے والے کارخانوں اور بندرگاہوں کی حفاظت شام ہی اچھی طرح کرسکتا ہے اور شام کو دریائے فرات سے زیادہ سے زیادہ استفادہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ وہ عراق سے کوئی مفاہمت کرے۔ خیال ہے کہ اقوام متحدہ کا اقتصادی سروے مشن اس قسم کی سفارش کرے گا۔ ان دونوں میں سے کوئی حکومت الگ تھلگ رہ کر ترقی نہیں کرسکتی۔ دونوں کے پاس بہت سے قدرتی ذرائع موجود ہیں لیکن دونوں حکومتیں غیر ملکی سروے اور ٹیکنیکل امداد کے بغیر ان ذرائع سے کام نہیں لے سکتیں۔ نامہ نگار کی مزید خبر یہ تھی کہ مشرق وسطیٰ کے ملکوں میں مغربی اثر ورسوخ بڑھتا جا رہا ہے۔ مصر اور برطانیہ کے تعلقات روز بروز اصلاح پذیر ہو رہے ہیں اور امریکہ کی امداد کی وجہ سے سعودی عرب کے حالات روز بروز بہتر ہو رہے ہیں۔ اسی طرح سرے نیکا (لبیا) میں برطانیہ کے زیر اہتمام امیر سینوسی کی نئی حکومت قائم ہو چکی ہے اور ان حالات وکوائف سے واضح ہے کہ ممالک عربیہ کے لئے ترقی کے بڑے مواقع ملنے والے ہیں۔"[26]

17 ر اکتوبر کو ایسوسی ایٹیڈ پریس آف پاکستان کے نامہ نگار خصوصی متعین قاہرہ کا بیان یہ تھا کہ "شام اور عراق کا الحاق نظریہ اسلامستان کو بڑی تقویت پہنچا سکتا ہے کیونکہ یہ اتحاد آخرالامر ممالک عربیہ کی فیڈریشن کے قیام پر منتج ہوگا جس میں شرق اردن، عراق، شام لبنان کے مسلم علاقے اور فلسطین کے عرب حصے شامل ہوں گے۔ قاہرہ کے سیاسی حلقے کہہ رہے ہیں کہ یہ اتحاد توقع سے بہت پہلے ہو جائے گا اور ممالک عربیہ کا نقشہ ایک دفعہ پھر تبدیل ہو جائے گا۔"[27] تاہم 20 ر اکتوبر کو قاہرہ میں عرب لیگ کی پولیٹیکل کمیٹی کے اجلاس میں شام اور عراق کے اتحاد کی تجویز مسترد کر دی گئی۔ امریکہ کے طفیلی عرب ممالک یعنی سعودی عرب، لبنان اور یمن نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی تھی۔ لبنان کے وزیر اعظم کی جوابی تجویز یہ تھی کہ "سارے عرب ممالک کا سیاسی، معاشی، ثقافتی اور فوجی اتحاد ہونا چاہیے۔"[28] مصر کی جانب سے اس تجویز کی مخالفت کی ایک وجہ مصری سیاستدانوں کے اس اندیشے میں پنہاں تھی کہ اگر ممالک عربیہ کی فیڈریشن قائم ہوگئی تو اس سے مصر کی اہمیت باقی نہیں رہے گی نہ اس کا وقار رہے گا جو اس وقت اسے حاصل ہے۔ اس وقت

مصر عربوں میں سب سے بڑا ملک ہے اور سارے ممالک عربیہ اس لحاظ سے اس کی عزت کرتے ہیں بلکہ اسے اپنا لیڈر تصور کرتے ہیں لیکن اگر اردن، عراق اور شام کی فیڈریشن قائم ہو گئی تو اس صورت میں وہ مصر سے بڑی حکومت متصور ہو گی اور اسے جنگی لحاظ سے بھی زیادہ اہمیت حاصل ہو گی۔[29] دوسری وجہ یہ تھی کہ مصری عوام برطانیہ کا نام سنتے ہی بھڑک اٹھتے تھے۔ چونکہ عرب فیڈریشن کی تجویز برطانیہ کی تھی۔ اس لئے وہ مصری عوام کے لئے کسی صورت میں قابل قبول نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ حکومت مصر کی تجویز یہ تھی کہ اسرائیل کی توسیع پسندی کے رجحان کے پیش نظر ممالک عربیہ کو ''اجتماعی تحفظ'' کا کوئی بندوبست کرنا چاہیے اور ان کی افواج ایک ہی کمان کے تحت ہونی چاہئیں۔

جن دنوں حکومت مصر نے یہ تجویز پیش کی تھی اسلامستان کا علمبردار چودھری خلیق الزماں قاہرہ میں تھا۔ 27 اکتوبر کو ایک تقریب میں اس کی تقریر یہ تھی کہ ''میں نے ساری دنیا کے مسلمانوں میں یہ رجحان دیکھا ہے کہ وہ اسلام اور انسانیت کی خدمت کے نصب العین کے تحت متحد ہونا چاہتے ہیں۔ مصر میں بھی میری امیدیں اور میرے خواب پورے ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں یہاں ایسے لوگ موجود ہیں جو ''متحدہ اسلامستان'' کی طرف مائل ہیں۔ سارے مسلم ممالک کی جغرافیائی اور سیاسی پوزیشن اس مقصد کے لئے موافق ہے۔ آج کل کے زمانے میں مختلف ممالک دفاعی مقاصد کے تحت علاقائی گروپنگ اس حقیقت کی بنا پر کرتے ہیں کہ انہیں یہ پتہ چل گیا ہے کہ دفاع کا کام صرف فوجیں ہی نہیں کرتیں بلکہ ساری آبادی لڑائی میں حصہ لیتی ہے لہٰذا عوام کو ایک نیا درجہ مل گیا ہے اور ان کی اجتماعیت بڑی وزن دار ہوتی ہے۔ اس نے کہا کہ پاکستان سیاسی مقاصد کے تحت نہیں بنایا گیا تھا بلکہ خدا کی مدد سے یہ ملک اس لئے وجود میں آیا تھا کہ اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کی جائے۔ ہم مشکلات کے باوجود اپنے مشترکہ نصب العین کی یعنی اسلامستان کی تشکیل کی خاطر جدوجہد کرتے رہیں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہمارا اولین فرض ہے۔''[30]

29 اکتوبر کو چودھری خلیق الزماں نے سات ممالک عربیہ کے معاہدۂ اجتماعی تحفظ کی مصری تجویز پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی کہ اس تجویز سے زیادہ بڑی علاقائی گروہ بندی کے لئے راہ ہموار ہو جائے گی۔ اس بڑی گروہ بندی میں ترکی اور پاکستان بھی شامل ہوں گے۔ اس نے اپنی اسکیم کو ایک بڑی عرب لیگ قرار دیا اور امید ظاہر کی کہ اس طرح غیر مسلم عرب ممالک

بھی جنگی اہمیت کے اس علاقے کے مشترکہ دفاع میں شامل ہوسکیں گے۔ اس نے عراق کے وزیراعظم نوری السعید پاشا کی عرب فیڈریشن کی تجویز کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ "حکومتوں اور عوام کا قدرتی رجحان بالآخر ہمیں اسلامستان کی منزل تک پہنچادے گا۔ میں نے یہ نظریہ پیش کردیا ہے اب یہ متعلقہ حکومتوں کا کام ہے کہ وہ اس پر عملدرآمد کے طریقے تلاش کریں۔"[31] لاہور کے روزنامہ نوائے وقت کو چودھری خلیق الزماں کی اس رائے سے اتفاق تھا۔ چنانچہ اس کا اجتماعی تحفظ کی مصری تجویز پر تبصرہ یہ تھا کہ "اسلامی ممالک میں باہمی اتحاد کا جوجذبہ پیدا ہو چلا ہے اگرچہ یہ مشترکہ دشمن (اسرائیل) کے مشترکہ خطرے کے تحت ہے۔ پھر بھی ہم اسے نیک فال سمجھتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ کل یہی اتحاد "اسلامستان" کی تمہید ثابت ہو اور اس طرح اقبال کی یہ تمنا پوری ہو جائے کہ "ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے۔"[32]

نوائے وقت کا یہ تبصرہ دراصل اس کی خوش فہمی یا غلط فہمی یا بے خبری پر مبنی تھا۔ دراصل مصر کی اجتماعی تحفظ کی سکیم کا اسلامی اتحاد کے جذبہ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ اسکیم خالصتاً سیکولر عرب نیشنلزم کی بنیاد پر پیش کی گئی تھی اور اس کا بڑا مقصد انگریزوں کی "عرب فیڈریشن" یا "عظیم تر شام" یا "زرخیز ہلال" کی اسکیم کو ناکام کرنا تھا۔ مصر کی اس سکیم کو امریکہ کی تائید حاصل تھی۔ چنانچہ مصر میں امریکہ کے سفیر جیفرسن کیفری (Jaffarson Caffory) کا 30 / اکتوبر کو بیان یہ تھا کہ "امریکہ اس معاہدہ کی پیشگی تائید کرتا ہے جس کا مقصد مشرق وسطیٰ میں امن و استحکام پیدا کرنا ہو۔" اس نے کہا کہ "میری حکومت نے مجھے ہدایت کی ہے کہ میں مشرق وسطیٰ کے حالات کا پوری طرح جائزہ لوں جہاں اجتماعی تحفظ کا ایک معاہدہ تجویز کیا گیا ہے جس میں سات عرب ممالک شامل ہوں گے۔"[33] امریکی سفیر کا یہ بیان مشرق وسطیٰ میں امریکہ اور برطانیہ کے درمیان سامراجی تضاد کا مظہر تھا۔ اسی تضاد کا ایک اور اظہار اسی دن قاہرہ سے رائٹر کی اس خبر کی صورت میں ہوا کہ صدر پاکستان مسلم لیگ چودھری خلیق الزماں عرب ممالک کا دورہ ختم کر کے اور ان ملکوں کے سیاسی اور مذہبی رہنماؤں سے مصر سے پاکستان تک اسلامی بلاک کے متعلق اپنے منصوبہ پر گفت و شنید کر کے آج لندن روانہ ہوئے۔ چودھری صاحب لندن میں ذمہ دار برطانوی افسروں سے "اسلامستان" کے قیام کے متعلق گفت و شنید کریں گے۔"[34] امروز نے اس مختصر خبر پر "......وہی منصف ٹھہرے" کی سرخی لگائی تھی۔

خلیق الزماں نے لندن میں یہ بھانڈا پھوڑ دیا کہ اسلامستان کا مقصد دراصل مشرق وسطیٰ میں معاہدہ اطلانٹک کی طرح کا سوویت مخالف فوجی معاہدہ وضع کرنا ہے

31 اکتوبر کو چودھری خلیق الزماں لندن پہنچا تو اس نے وہاں ایک انٹرویو میں بتایا کہ مجھے اپنے مشرق وسطیٰ کے دورے کے دوران یہ پتہ چلا ہے کہ وہاں عمومی طور پر یہ تلاش جاری ہے کہ مسلم ممالک میں کس طرح استحکام پیدا کیا جائے اور انہیں کس طرح مضبوط بنایا جائے۔ میں وہاں متعدد بادشاہوں، صدور، وزرائے اعظم، ممتاز لیڈروں اور صنعت کاروں سے ملا ہوں۔ ان میں سے بہت سوں نے مشرق وسطیٰ کے ممالک کی گروہ بندی پر ''اتفاق'' کیا ہے۔ کسی نے اس خیال کی مخالفت نہیں کی ہے۔''[35] 3 نومبر کو چودھری خلیق الزماں نے ایک اور انٹرویو میں بتایا کہ ''میں پروپیگنڈسٹ کے طور پر یہاں نہیں آیا ہوں۔ میں تو محض گفت وشنید کی غرض سے آیا ہوں تاکہ مشرق وسطیٰ کے ممالک کی گروپ بندی کے بارے میں برطانوی حکومت کا ردعمل معلوم کر سکوں۔'' اس نے کہا کہ ''عراق، ایران، سعودی عرب اور مصر کے عوام نے اہل پاکستان سے گہری محبت وعقیدت کا اظہار کیا ہے۔ اسلامستان قائم ہو کر رہے گا۔ اس اسکیم کا مقصد مشرق وسطیٰ کے ممالک میں سیاسی واقتصادی تعاون ہے تاکہ یہ ممالک کسی غیر ملک کی طرف سے جارحانہ کاروائی کی صورت میں متحدہ محاذ قائم کر سکیں۔'' ایک سوال کے جواب میں اس نے کہا کہ ''اسلامستان کی قیادت کا حق عرب لیگ کو ہے۔'' چودھری خلیق الزماں اس انٹرویو سے قبل برطانیہ کے محکمہ دولت مشترکہ کے نائب وزیر گارڈن واکر سے ملاقات کر چکا تھا اور اسے امید تھی کہ اس کی وزیر خارجہ بیون سے بھی ملاقات ہوگی۔[36] ڈان کی رپورٹ کے مطابق خلیق الزماں نے اس انٹرویو میں مزید کہا کہ میرے خیال میں مشرق وسطیٰ کی گروپنگ میں عرب ممالک، مصر، ترکی ایران اور پاکستان شامل ہوں گے اور افغانستان کے بغیر یہ گروپنگ مکمل تصور نہیں ہوگی۔ یہ گروپنگ ضرور ہوگی۔ صرف وقت کا سوال ہے۔ گروپنگ کے اصول کی بنیاد مشترکہ سلامتی اور اقتصادی تعاون پر ہوگی۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ مجوزہ گروپ کس سے تحفظ کا خواہاں ہوگا تو اس نے کہا کہ ''کسی بھی طاقت کے جارحانہ عزائم کے خلاف۔ کون جانتا ہے کہ اسرائیل کی مملکت کی پیدائش کے بعد کیا واقعات رونما

ہوں گے۔اس سے مزید پوچھا گیا کہ مشرق وسطیٰ کے ممالک کی کسی بھی گروپنگ میں رہنمائی کون کرے گا تو اس نے زور دے کر کہا کہ اس سلسلے میں عرب لیگ کو رہنمائی کرنی چاہیے۔"[37]

چودھری خلیق الزماں کے اس انٹرویو کے باوجود برطانوی وزیر خارجہ ارنسٹ بیون نے اسے شرف ملاقات نہ بخشا۔البتہ 14رنومبر کو برطانوی محکمہ خارجہ کے ایسٹرن ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ برنارڈ بروز (Bernard Burrows) سے ملاقات ہوئی جو تقریباً ایک گھنٹہ تک جاری رہی اور پھر 6رنومبر کو اس نے ڈیلی ٹیلیگراف کو بتایا کہ "مشرق وسطیٰ کے ممالک میں اسلامستان کے خیال کی عمومی طور پر قدر کی جا رہی ہے۔البتہ اس سلسلے میں مختلف نظریات پائے جاتے ہیں کہ اسلامستان قائم کرنے کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔مشرق وسطیٰ کے عوام نے اسلامستان کے بارے میں سنجیدگی سے بحث شروع کر دی ہے اور میرا تاثر یہ ہے کہ مشرق وسطیٰ کے ممالک کی گروپنگ کے بارے میں عمومی خواہش پائی جاتی ہے۔"[38]

7رنومبر کو روزنامہ ڈان کے ایڈیٹر الطاف حسین نے جو ان دنوں ایک ہفتہ کے پرائیوٹ دورے پر لندن گیا ہوا تھا چودھری خلیق الزماں سے ملاقات کی اور اسی رات چودھری نے کنگزوے ہال میں تقریباً دو ہزار پاکستانیوں کے اجتماع کو خطاب کیا۔اس جلسے کا اہتمام لندن مسلم لیگ، مسلم سوسائٹی اور آزاد کشمیر مسلم لیگ نے مشترکہ طور پر کیا تھا اور برطانوی پارلیمنٹ کے رکن ہیکٹر ہیوز (Hector Hughes) نے اس کی صدارت کی تھی۔خلیق الزماں نے اپنی تقریر میں کہا کہ "برطانیہ کو مشرق وسطیٰ میں اپنی غلطیوں کا اعادہ نہیں کرنا چاہیے۔اب برطانیہ کو مشرق وسطیٰ میں طاقتی سیاسیات سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔پاکستان دولت مشترکہ کا رکن ہے۔برطانیہ کو اس پر اور مشرق وسطیٰ کے دوسرے ممالک پر بھروسہ کرنا چاہیے اور اسلامستان کے بارے میں ہمدردانہ رویہ اختیار کرنا چاہیے۔" اس نے کہا کہ "پاکستان کو اسلامستان کے قیام کے لئے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔یہ ہماری زندگی کا جزو ہے مشرق وسطیٰ کا علاقہ امن عالم کے لئے نہایت اہم ہے اور دفاعی مقاصد کے لئے اس علاقے کے ممالک کی گروپنگ کے بارے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہونا چاہیے۔اسلامستان کا مطلب یہ نہیں کہ اس گروپ بندی کی بنیاد کسی طاقت سے دشمنی پر ہوگی۔ماضی میں دنیا کی صورت حال قومی اور جغرافیائی نوعیت کی تھی لیکن اب دنیا کے رجحانات ہمیں بین الاقوامی میدان کی طرف لئے جا رہے ہیں۔معاہدہ اطلانٹک پر تین بڑی طاقتوں......امریکہ،

برطانیہ اور فرانس...... کے درمیان قریب ترین تعاون کے باوجود دستخط کیے گئے ہیں۔ اگرچہ یہ تینوں طاقتیں قریب ترین ہم آہنگی کے ساتھ کام کر رہی تھیں تاہم انہوں نے علاقائی گروپنگ کو ضروری سمجھا۔ حال ہی میں عرب لیگ نے فیصلہ کیا ہے کہ معاہدہ اطلانٹک کے خطوط پر مشترکہ تحفظ کے لئے اقدامات کئے جائیں گے۔ مشرق وسطیٰ میں اس سے زیادہ بڑے بلاک سے تحفظ کی زیادہ ضمانت ملے گی اور یہ بڑا بلاک اسلامستان ہی ہوسکتا ہے۔ اس نے کہا ''اسلامستان دراصل پہلے ہی موجود ہے۔ اب سوال صرف یہ ہے کہ اسے منظم کیسے کیا جائے تاکہ بلاک کے ارکان کی ذمہ داریاں مشترک ہوں۔ اسلامستان میں کوئی مذہبی طرفداری نہیں ہوگی اور نہ ہی اس کی کوئی مذہبی اہمیت ہو گی۔ یہ تحریک کسی قوم کے خلاف نہیں ہے۔ یہ صرف دفاعی نظریہ ہے۔ اسلامستان کے ممالک کس پر حملہ کر سکتے ہیں؟ قدرتی طور پر اسلامستان کے قیام میں وقت لگے گا۔ لیکن عالمی قوتیں عالمی طاقتوں کو مجبور کر دیں گی کہ وہ اس خیال کو ٹھوس اور وزن دار سمجھیں اور اس پر اتفاق کریں۔''[39]

چودھری خلیق الزماں کی یہ تقریر کسی تعبیر وتشریح کی محتاج نہیں تھی۔ 13ر ستمبر کو کراچی سے مشرق وسطیٰ کے دورے پر روانہ ہونے سے پہلے اس کا بیان یہ تھا کہ ''میرا کوئی سیاسی مقصد نہیں ہے۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ مسلم ممالک کے عوام الناس کی ایک عالمی تنظیم کے بارے میں مشرق وسطیٰ کے عوامی لیڈروں سے تبادلہ خیالات کیا جائے۔'' لیکن اب وہ لندن میں یہ کہہ رہا تھا کہ مشرق وسطیٰ میں اطلانٹک معاہدہ کی طرح کا ایک فوجی معاہدہ کیا جائے اور سوویت یونین کے خلاف اس مجوزہ فوجی گٹھ جوڑ کو وہ اسلامستان کہتا تھا۔

9ر نومبر کو ڈان کے نامہ نگار نے خلیق الزماں سے اس کی اسکیم کی مزید وضاحت چاہی تو اس نے مشرق وسطیٰ میں اپنے کارناموں کی اہمیت پر زور دیا۔ لیکن اس نے افسوس ظاہر کیا کہ ''مشرق وسطیٰ میں حکومت برطانیہ کا رویہ غیر ہمدردانہ ہے۔ برطانیہ کا محکمہ خارجہ یونائیٹڈ مسلم ورلڈ کی مخالفت کرتا ہے۔'' اس نے عرب لیگ کے تاریخی پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ''اگر عرب لیگ کی بنیاد عرب عوام کی مرضی پر ہوتی اور برطانیہ نے اسے بعجلت قائم نہ کیا ہوتا تو یہ طوفانوں کا زیادہ مضبوطی سے مقابلہ کرتی۔'' اس نے اپنے اسلامستان کی صحیح آئینی نوعیت کی کوئی وضاحت نہ کی اور صرف اتنا کہا کہ ''ہم اسلام کے پیروکار پہلے ہی متحد ہیں۔'' اس نے کہا کہ ''اسلامستان کے تصور کا پہلا ٹھوس نتیجہ یہ ہوگا کہ پاکستان سے لے کر ترکی تک مسلم ممالک کے

درمیان دفاعی معاہدہ ہوگا۔ معاہدہ اطلانتک نے ہماری اسکیم کو آگے بڑھایا ہے۔ اس نے اس رائے سے اتفاق کیا کہ اگرچہ برطانیہ کا محکمہ خارجہ، عرب لیگ کی حوصلہ افزائی کرتا ہے لیکن وہ سفارتی سطح پر مشرق وسطیٰ میں علاقائی اتحاد کی مخالفت کرتا ہے۔ اس نے کہا کہ برطانیہ کو اب ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی پرانی پالیسی ترک کر دینی چاہیے۔ برطانیہ کو اسلامی دفاعی اتحاد سے کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس میں اس کا فائدہ ہی فائدہ ہے۔''[40]

ڈان، امروز اور پاکستان ٹائمز کا خلیق الزماں کے خلاف شدید ردعمل اور اسلامستان کو دفن کرنے کا مشورہ

خلیق الزماں کی یہ بیان بازی ڈان کے ایڈیٹر کے لئے خاصی اشتعال انگیز تھی۔ اس کا اخبار ماضی میں اسلامستان اور چھٹے اسلامی براعظم کا زبردست مبلغ رہا تھا۔ لیکن اس اسلامستان کا بھانڈا الندن کے چوراہے میں پھوٹ گیا تھا اور ساری دنیا کو، بالخصوص عرب ممالک کے سامراج دشمن عوام کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ پاکستان کے پان اسلام ازم، اتحاد اسلامی یا اسلامستان کی جو آوازیں اٹھتی رہی ہیں اور اب اٹھ رہی ہیں ان کا مقصد مغربی سامراج کی خدمت گزاری کے سوا اور کچھ نہیں۔ کراچی میں وزیر خزانہ غلام محمد کی اسلامک اکنامک کانفرنس ہونے والی تھی۔ خلیق الزماں کی سیاسی بے تدبیری، حماقت اور موقع پرستی نے اس کے فریب کا پردہ چاک کر دیا تھا اور مشرق وسطیٰ کے عوام کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ ڈھونگ بھی برطانوی سامراج کے مفاد میں رچایا جا رہا ہے۔ چنانچہ ڈان کے ایڈیٹر نے بذریعہ تار ایک اداریہ اپنے اخبار کو بھیجا جس میں خلیق الزماں کو یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ اب اسلامستان کے خیال کو دفن کر دے۔ اس اداریے کا خلاصہ یہ تھا کہ چودھری خلیق الزماں نے اسلامستان کا مسئلہ جس لفظ سے شروع کیا تھا اس سے وہ آگے نکل گیا ہے۔ اس کی کوشش تو یہ ہونی چاہیے تھی کہ عوام سے عوام کو خطاب ہو۔ لیکن اس کے دورے کے کچھ ہی دن بعد ایسا معلوم ہونے لگا کہ جن ممالک میں وہ گیا وہاں اس کی توجہ ان ممالک کی حکومتوں کی طرف ہوگئی۔ وہ چلا تو اس لئے تھا کہ یہ خیال صرف مسلمانوں کے ہاتھ ''فروخت کرے''، لیکن ہم غلط نہیں سمجھ رہے تو وہ لندن اس لئے گیا کہ برطانوی حکومت کے تعلقات دولت مشترکہ کے محکمہ اور وزارت خارجہ کے دفتر سے اس موضوع پر گفت وشنید کرے۔ ''ہم یہ بھی کہہ دینا چاہتے ہیں اور

ایسا کہنے کی واقعی وجوہ ہیں کہ اس نے اسلامستان کے لئے دورہ کیسی ہی نیک نیتی سے کیا ہو اس سے پاکستان کو اتنا فائدہ نہیں پہنچا جتنا نقصان ہوا ہے۔ اسلامستان پر گفتگو کے سلسلہ میں جس طرح معاہدۂ تحفظ کا ذکر ہوا ہے اس سے قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حفاظتی تدابیر کس کے مقابلے میں درکار ہیں خصوصاً جبکہ اس معاہدے کی تائید کی توقع بعض دوسری سمتوں سے بھی ہو۔ جب حکومت پاکستان کی پالیسی یہ ہے کہ اس کی حمایت میں تمام باشندے ہیں کہ تمام ممالک سے بہترین دوستی کے تعلقات رکھے جائیں تو پھر اس قسم کے شکوک وشبہات پیدا کرنے سے پاکستان کے مفاد کو نقصان پہنچا ہے۔ اسلامستان کا پروپیگنڈا جس طرح ہوا ہے اس سے ایسے شبہات پیدا ہو سکتے ہیں اور ہمارے علم میں یہ ہے کہ پیدا بھی ہو چکے ہیں۔ لہٰذا ہم چودھری خلیق الزماں سے بھی مؤدبانہ عرض کرتے ہیں کہ اس کے اسلامستان کا مدعا کچھ بھی ہو اسے چاہیے کہ اب اسے دفن کردے۔ وہ اپنی کوشش کر چکا ہے اور بس۔ معاملہ یہیں ختم ہونا چاہیے۔"[41]

روزنامہ امروز کا ڈان کے اس اداتی تبصرہ پر تبصرہ یہ تھا کہ "جب چودھری خلیق الزماں اسلامستان کا تصور لے کر کراچی سے چلا تھا تو اس کا عندیہ یہ تھا کہ اسلامی ملکوں کے عوام کو ایک دوسرے سے قریب لایا جائے اور ان میں جو مذہبی اور کلچرل یگانگت پہلے سے موجود ہے اسے زیادہ استوار کیا جائے لیکن مشرق وسطیٰ میں پہنچ کر اس نے عوام سے قریب آنے کی بجائے وہاں کی حکومتوں سے مشورے شروع کر دیئے۔ شروع میں اس نے جس مقصد کا اظہار کیا تھا یہ اقدام قطعاً اس کی ترجمانی نہیں کرتا تھا۔ اس نے اسلامستان کا جو تصور ابتدا میں پیش کیا تھا، ظاہر ہے کہ وہ مسلمانوں سے متعلق تھا۔ اس میں کسی غیر اسلامی سلطنت کو دخل نہیں تھا لیکن تعجب ہے کہ اس نے اسلامستان کے تصور کو شرمندہ تعبیر کرنے کے لئے ایک غیر اسلامی سلطنت کے دامن میں پناہ لی۔ یہ اقدام تعجب خیز ہی نہیں بلکہ مضحکہ خیز بھی تھا اور ہم نے اس ڈپلومیسی کی سخت مخالفت بھی کی تھی۔ اسلامستان کے سلسلے میں چودھری خلیق الزماں نے اپنے ابتدائی خیالات میں جو تبدیلیاں کی ہیں ان میں یہ بھی قابل ذکر ہے کہ اب وہ عرب لیگ کے سیکورٹی پیکٹ کے مانند اسلامی ملکوں کے درمیان سیکورٹی پیکٹ کو عملی جامہ پہنانے کی فکر میں ہے۔ اس سے قطع نظر کہ بین الاقوامی سیاست میں اس قسم کا معاہدہ کس نظر سے دیکھا جائے گا۔ یہاں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ آیا اسے عملی جامہ پہنایا بھی جا سکتا ہے یا نہیں۔ چودھری خلیق الزماں کو خود اس بات کا احساس ہو گا کہ ایسے

معاہدوں کا ذکر کرنے کے بعد برطانوی وزارت خارجہ سے ملنا اور تبادلہ خیالات کرنا پاکستان کے حق میں کس قدر مضر ثابت ہوسکتا ہے۔ ایڈیٹر ڈان کا کہنا ہے کہ خلیق الزماں کی سرگرمیوں سے پاکستان کو محض نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہی نہیں بلکہ اب تک اس کے مفاد پر کافی زد پڑ بھی چکی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب مشرق وسطیٰ کے اسلامی ملکوں کے دفاع کے سلسلے میں برطانوی حکومت سے بات چیت ہوگی تو بعض دوسری بیرونی طاقتیں اس قسم کے مجوزہ معاہدے کو کس نظر سے دیکھیں گی اور وہ اسے کسی حکومت کے خلاف ایک متحدہ محاذ تعبیر کریں گی۔"[42] پاکستان ٹائمز نے بھی ڈان کے اداریے پر اس قسم کا تبصرہ کرتے ہوئے استفسار کیا کہ "چودھری خلیق الزماں کس کا مختار نامہ لے کر اور کس کے خرچ پر اسلامستان کا مشن لے کر مشرق وسطیٰ کے دورے پر گیا تھا؟ بدقسمتی سے چودھری آل پاکستان مسلم لیگ کا صدر ہے جو اس ملک کی حکمران جماعت ہے۔ چنانچہ بیرونی ملکوں میں یہ خیال پیدا ہونا ناگزیر ہے کہ وہ اسلامستان کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کرتا ہے انہیں نہ صرف پاکستان مسلم لیگ کی حمایت حاصل ہے بلکہ بالواسطہ یہ خیالات حکومت پاکستان کے طرز عمل کی بھی عکاسی کرتے ہیں۔" اخبار نے چودھری خلیق الزماں کے ماضی کے گھناؤنے سیاسی کردار پر نکتہ چینی کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی کہ "اگر پاکستان میں چند اور خلیق الزماں نمودار ہو گئے تو یہ ملک اضحوکہ عالم بن جائے گا۔"[43]

ڈان، امروز اور پاکستان ٹائمز کی جانب سے چودھری خلیق الزماں کی اس شرمناک کارگزاری پر تلملانے کا پس منظر یہ تھا کہ دنیا کے بیشتر ممالک میں یہ تاثر پایا جاتا تھا کہ پاکستان اینگلو۔امریکی بلاک کا ایک طفیلی ملک ہے اور اس کی خارجہ پالیسی بالعموم برطانوی مفادات کی تابع ہوتی ہے۔ خلیق الزماں نے اپنے اسلامستان کے بارے میں برطانیہ کے محکمہ خارجہ کی منظوری حاصل کرنے کی کوشش کر کے پاکستان کے بارے میں اس بین الاقوامی تاثر کو بہت پختہ کر دیا تھا۔

سوویت یونین میں پاکستان کے سفیر کا تقرر لیکن لیاقت کا دورہ ماسکو بدستور التوا میں رہا، کراچی میں روسی تجارتی وفد سے بھی کوئی نہ ملا

مذکورہ صورتحال اس لئے بھی زیادہ پریشان کن تھی کہ حکومت پاکستان نے 30 اکتوبر کو، جبکہ امریکہ میں ہندوستانی وزیراعظم نہرو کا والہانہ استقبال ہو رہا تھا، ماسکو میں پہلے پاکستانی

سفیر کے تقرر کا اعلان کر کے دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ پاکستان واقعی ایک آزاد و خودمختار ملک ہے۔ یہ نامزد سفیر شعیب قریشی تھا۔ لیکن وہ اپنے تقرر کے اعلان کے فوراً بعد ماسکو نہیں گیا تھا حالانکہ اخباری قیاس آرائیاں یہ تھیں کہ ماسکو میں پاکستانی سفیر پہنچے گا تو وزیراعظم لیاقت علی خان 7 ر نومبر کو سوویت یونین کے یوم انقلاب کے موقع پر ماسکو جائے گا۔ تاہم امروز کا اس اعلان پر تبصرہ یہ تھا کہ ''اگر سوویت یونین سے دوستانہ معاہدہ ہو جائے تو اول تو ایک ہمسایہ طاقت سے پرامن تعلقات بذات خود ضروری ہیں دوسرے پاکستان ان طاقتوں کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ امریکیوں نے شور مچایا کہ تہران میں روسی ٹینک پہنچ گئے اور خود ایران میں ڈیرے ڈال دیئے۔ ترکی کے متعلق بھی واویلا مچا کہ روس کے حملے کا خطرہ ہے اور وہاں بھی اپنی چھاؤنیاں قائم کر دیں۔ اب امریکی محکمہ خارجہ صاف صاف کہہ رہا ہے کہ وسط ایشیا میں کشمیر اور قبائلی علاقہ کو بڑی اہمیت ہے اور امریکہ ان علاقوں کو دفاعی اغراض کے لئے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ ان منصوبوں کا مقابلہ سوویت یونین سے دوستانہ معاہدے ہی کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے۔''[44]

نوائے وقت کا اس اعلان پر تبصرہ یہ تھا کہ وزیراعظم پاکستان کے دورۂ روس کے متعلق بعض حلقوں میں یہ غلط فہمی پھیل رہی تھی کہ شاید یہ دورہ منسوخ ہو گیا ہے۔ اس کی بنا غالباً یہ تھی کہ پہلے یہ خبر چھپ گئی تھی کہ وزیراعظم 7 ر نومبر کو روس جانے والے ہیں۔ چونکہ 7 ر نومبر کو آنریبل وزیراعظم اس اہم سفر پر روانہ نہیں ہوئے اس لئے بعض حلقوں نے یہ فرض کر لیا کہ یہ سفر ہی منسوخ ہو گیا ہے اور اس کے بعد اس مضمون کی قیاس آرائیاں شروع ہو گئیں کہ پاکستان اینگلو۔ امریکی بلاک کی طرف جھک گیا ہے۔ یہ اندازے اور قیاس آرائیاں غلط فہمی پر مبنی تھیں۔ حکومت پاکستان کے ایک سرکاری اعلان میں بتایا گیا ہے کہ 7 ر نومبر کی تاریخ سرکاری طور پر کبھی مقرر نہیں کی گئی تھی۔ اس لئے اس تاریخ پر وزیراعظم کے روس روانہ نہ ہونے کی وجہ سے جو نتائج اخذ کئے جا رہے ہیں وہ خود بخود غلط ثابت ہو گئے۔ رہی یہ قیاس آرائی کہ پاکستان پھر اینگلو۔ امریکی بلاک کی طرف جھک گیا ہے تو یہ ایک مضحکہ خیز بات ہے۔ پاکستان نے اینگلو۔ امریکن بلاک سے قطع تعلق ہی کب کیا تھا جو پھر اس طرف جھکنے کا سوال پیدا ہو۔ ہماری رائے میں التوائے سفر کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ابھی تک روس میں پاکستان کا کوئی سفیر مقرر نہیں کیا گیا تھا اور یہ بات عجیب سی تھی کہ کسی ملک میں ہمارا سفیر نہ ہو اور وہاں ہمارے وزیراعظم صاحب

سرکاری مہمان کی حیثیت سے تشریف لے جائیں۔ ہفتہ عشرہ پہلے روس میں پاکستانی سفیر مسٹر شعیب قریشی کے تقرر کا اعلان ہو چکا ہے اور وہ عنقریب ماسکو جانے والے ہیں۔ سرکاری اعلان میں یہ بتایا گیا ہے کہ وزیراعظم بھی نومبر کے آخر یا دسمبر کے شروع میں روس تشریف لے جائیں گے۔ جب کہ ہم پہلے بھی کئی مرتبہ لکھ چکے ہیں کہ پاکستان کی خارجہ پالیسی ابھی تک غیر معین سی ہے۔ اکثر و بیشتر معاملات میں پاکستان برطانیہ کی متابعت کرتا ہے۔ اس روش پر نظر ثانی کی ضرورت ہے اور پاکستان کو اپنی خارجہ پالیسی کی بنیاد اس اصول پر رکھنی چاہیے کہ امن عالم کے اعلیٰ مقصد کو نظرانداز نہ کرتے ہوئے پاکستان کا اپنا مفاد کس بات میں ہے۔ ضروری نہیں کہ ہم ہر اس اقدام کی تقلید کریں جو برطانیہ کے نزدیک پسندیدہ ہو۔ لیکن اسی طرح یہ امر بھی قرین دانش نہ ہوگا کہ پاکستان حالات کا صحیح جائزہ لئے بغیر اشتراکی بلاک میں شامل ہو جائے۔ ابھی تک تو ہمیں اتنا بھی معلوم نہیں کہ روس کے ارباب اختیار کی پاکستان کے متعلق رائے ہی کیا ہے؟ پاکستان کو روس سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے مگر اس طرح نہیں کہ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا والی ضرب المثل درست ثابت ہو اور پاکستان انگریزوں کا دم چھلا بننے سے بچنے کی کوشش میں روس کا دم چھلا بن جائے۔''[45]

حسب معمول نوائے وقت کا یہ اداریہ کچھ غلط فہمی اور کچھ غلط بیانی پر مشتمل تھا۔ جی۔ ڈبلیو۔ چودھری نے اس سلسلے میں پاکستان کے محکمہ خارجہ کی سرکاری دستاویزات کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ سوویت یونین نے لیاقت علی خان کے دورۂ ماسکو کے لئے واقعی 7/نومبر کی تاریخ مقرر کی تھی مگر ظفر اللہ اینڈ کمپنی نے ماسکو میں پاکستانی سفیر مقرر کرنے کے معاملے میں بہت لیت و لعل کر کے اور پھر برطانیہ سے لیاقت علی خان پر دباؤ ڈلوا کر اس پروگرام پر عمل نہیں ہونے دیا تھا۔ 30/اکتوبر کو جب اس عہدے کے لئے شعیب قریشی کی نامزدگی ہوئی تھی اس وقت دورہ عملاً منسوخ کیا جا چکا تھا۔ اس وقت تک روس کو پتہ چل گیا تھا کہ کراچی میں جو لوگ پاکستان کی خارجہ پالیسی چلا رہے ہیں وہ برطانیہ اور امریکہ کی فرمانبرداری کسی صورت بھی ترک نہیں کریں گے۔ اس کی ایک مثال یہ تھی کہ سوویت یونین کا تجارتی وفد 25/جولائی کو پاکستان آیا تھا لیکن تقریباً تین ماہ تک کراچی میں قیام کرنے کے بعد وہ 20/اکتوبر کو بے نیل و مرام واپس ماسکو چلا گیا تھا۔ کیونکہ پاکستان کے کسی عہدیدار کو روس کے ساتھ تجارت

میں دلچسپی نہیں تھی۔ پاکستان سے روانگی سے چند ہفتے قبل اس روسی وفد کے قائد کی سندھ مسلم کالج میں تقریر یہ تھی کہ آج کل دنیا کی بعض طاقتیں ایک اور جنگ کی تیاریاں کر رہی ہیں۔ تاہم ہمیں یقین ہے کہ دنیا کی امن پسند قوتیں ان سے زیادہ طاقتور ثابت ہوں گی۔ سوویت یونین امن کا علمبردار ہے اور امن پسند قوتوں کی رہنمائی کر رہا ہے۔ پاکستان کا ذکر کرتے ہوئے روسی وفد کے قائد نے کہا کہ ''کراچی ہمیں بے حد پسند آیا ہے۔ یہاں کے عوام نے ہمارے ساتھ جس محبت اور خلوص کا مظاہرہ کیا ہے وہ ہمارے لئے باعث طمانیت ہے۔ ہماری خواہش کہ پاکستان کا مستقبل شاندار اور درخشاں ہو۔[46]

وزیر اعظم لیاقت علی خان نے جون 1949ء میں دورۂ ماسکو کی دعوت ایسی صورتحال میں قبول کی تھی کہ برطانیہ اور امریکہ میں ہندوستان کا ڈنکا بج رہا تھا اور ہندوستانی وزیر اعظم نہرو کے سر پر ایشیا کی قیادت کا تاج پہنایا جا رہا تھا۔ لیاقت علی خان کی جانب سے اس دعوت کی قبولیت کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ واقعی سوویت یونین سے دوستی کا خواہاں تھا اور آزاد خارجہ پالیسی اپنانا چاہتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پاکستان اور سوویت یونین کے درمیان دوستی کے امکان کو بطور لیور استعمال کر کے برطانیہ اور امریکہ کو پاکستان کی اہمیت کا احساس دلایا جائے اور اس طرح ان سے مالی اور فوجی امداد حاصل کی جائے۔ مزید برآں وہ سوویت یونین کے ساتھ دوستی کا جھنڈا لہرا کر ان پاکستانی عناصر کو مطمئن کرنا چاہتا تھا جو انگریزوں کی دغابازیوں سے انتہائی برہم تھے اور برطانیہ اور اس کی دولت مشترکہ کا نام سنتے ہی بھڑک اٹھتے تھے۔ لیکن ظفر اللہ خان اینڈ کمپنی نے لیاقت علی خان کی اس ڈپلومیسی کو سبوتاژ کیا اور وزیر اعظم پاکستان کے دورۂ ماسکو کی بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ لیاقت علی خان اپنی حکومت کے بیوروکریٹس کی سازشوں اور برطانیہ کے ارباب اقتدار کے دباؤ کے سامنے قدم نہ جما سکا۔ دھمکی سے مر گیا جو نہ باب نبرد تھا۔

سوویت یونین کی پاکستان کے بارے میں تبدیلی کی ایک وجہ یہ تھی کہ اگرچہ امریکیوں نے اکتوبر میں جواہر لال نہرو کے دورہ کے دوران اس کی بے انتہا چاپلوسی و خوشامد کی تھی لیکن وہ ایشیا میں سوویت مخالف دفاعی معاہدہ پر آمادہ نہیں ہوا تھا۔ اس کا اعلان یہ تھا کہ ہم عالمی سرد جنگ میں ملوث نہیں ہونا چاہتے اور چاہتے ہیں کہ ہم کسی بھی فریق کے ساتھ وابستہ نہ ہوں۔ اس کے برعکس چودھری خلیق الزماں وغیرہ اسی عرصے میں پان اسلام ازم یا اتحاد اسلامی یا اسلامستان کے

نعرے لگا کر ترکی سے لے کر پاکستان تک معاہدہ اطلانتک کی طرح کے سوویت مخالف دفاعی معاہدہ کی کھلم کھلا تبلیغ کرتے تھے۔ سوویت یونین کے رویے میں تبدیلی کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ اقوام متحدہ کے کمیشن نے تنازعہ کشمیر کے تصفیہ کے لئے جو تجاویز پیش کی تھیں اگر ان پر عمل ہوتا تو اس امر کا امکان تھا کہ وادئ کشمیر اور لداخ کا علاقہ پاکستان کی تحویل میں چلا جاتا۔ ایسی صورت میں روسیوں کو بجا طور پر اندیشہ تھا کہ پاکستانی ارباب اختیار امریکیوں کو کشمیر کے اس علاقے میں سوویت یونین کے خلاف فوجی اڈے بنانے کی سہولت دے دیں گے۔ امریکہ کے محکمہ خارجہ نے کشمیر اور پاکستان کے قبائلی علاقے کی جنگی اہمیت کا کھلم کھلا ذکر شروع کر دیا تھا۔

پاکستان میں اشتراکی نظریہ مقبول ہو رہا تھا اور یہ صورتحال رجعت پسندوں اور حکومت پاکستان کے لئے تشویشناک تھی

نوائے وقت کی جانب سے آزاد خارجہ پالیسی کی حمایت کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں پنجاب کی مخلوق خدا کی آواز یہی تھی اور اس اخبار کی لیاقت مخالف مہم کا تقاضا بھی یہی تھا۔ یہ اخبار ماضی میں برطانیہ اور امریکہ سے بار بار یہ استدعا کر چکا تھا کہ پاکستان کی سیاسی و جنگی اہمیت کا احساس کرو۔ لیکن جب چین میں اشتراکی انقلاب کی کامیابی کے پیش نظر لندن اور واشنگٹن میں ہندوستان کی وقعت و اہمیت کو چار چاند لگ گئے اور پاکستان کی حیثیت دو کوڑی کی ہو گئی تو اس اخبار اور بعض دوسرے عناصر نے آزاد خارجہ پالیسی کی وکالت شروع کر دی۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ اینگلو۔ امریکی بلاک کو سوویت دوستی کا ہوا دکھا کر انہیں اپنی اہمیت کا احساس دلایا جائے۔ تاہم نوائے وقت کو یہ اندیشہ لاحق رہا کہ کہیں پاکستان انگریزوں کا دم چھلا بننے سے بچنے کی کوشش میں روس کا دم چھلا نہ بن جائے۔ اس کے اس اندیشے کی بنیاد یہ تھی کہ جون 1949ء میں لیاقت علی خان کی جانب سے دورہ ماسکو کی قبولیت کے بعد پاکستان میں روسی لٹریچر کی مانگ بہت بڑھ گئی تھی اور کراچی میں پاکستان۔ سوویت فرینڈ شپ سوسائٹی بن گئی تھی اور پھر ستمبر میں سوویت یونین کے ایٹمی دھماکے اور چین کے انقلاب کی کامیابی سے پاکستان کے عوام کی نظر میں اشتراکی نظام کا وقار بہت بڑھ گیا تھا اور بہت سے نوجوانوں نے پاکستان کمیونسٹ پارٹی کے دفاتر میں چکر لگانے شروع کر دیئے تھے۔

قدرتی طور پر اس صورتحال سے پاکستان کے کمیونسٹ لیڈروں کی خاصی حوصلہ افزائی ہوئی۔ چنانچہ 6/نومبر کو انقلاب روس کی 32 ویں سالگرہ کے موقع پر پاکستان کمیونسٹ پارٹی کا بیان یہ تھا کہ ''جاگیرداری اور سرمایہ داری کی طاقتوں کے مقابلے میں جمہوریت واشتراکیت کے خواہاں عوام کی قوت کا پلہ بھاری ہو گیا ہے۔ سرمایہ دار دنیا کے روز افزوں معاشی بحران کے باعث وہاں طبقاتی جدوجہد تیز ہو گئی ہے اور محکوم و نیم محکوم ملکوں میں سامراجی اور سرمایہ دارانہ دست برد کے خلاف آزادی کی جدوجہد تیز ہوتی جا رہی ہے...... ایک سال کے اندر مغربی پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن میں مزید 70 ہزار مزدور شامل ہوئے ہیں اور انہوں نے ان کوششوں کو بڑی حد تک ناکام بنا دیا ہے جو ان کے اتحاد کو توڑنے کی غرض سے کی گئی تھیں۔ جبر و تشدد اور استحصال کے اقدامات کے باوجود پاکستان میں سرمایہ دارانہ طاقتیں زوال پذیر ہیں اور عوام و درمیانہ طبقہ کی تحریکیں زور پکڑ رہی ہیں۔'' اسی دن پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کی جانب سے روسی انقلاب کی سالگرہ منانے کے لئے ایک جلسہ عام ہوا جس میں ایک قرارداد میں حکومت پاکستان سے مطالبہ کیا گیا کہ اینگلو۔ امریکی سامراجی جنگ پسندوں سے مکمل طور پر ناتا توڑ لیا جائے اور چین کی جمہوری حکومت کو تسلیم کر کے اس کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کئے جائیں۔ اس جلسہ سے مرزا ابراہیم نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''پاکستان کے ارباب اقتدار آج اسلام کا ڈھونگ رچاتے ہیں اور اجتماعیت کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن ان کی یہ اجتماعیت صرف مسجدوں تک ہی محدود ہے اور صرف نماز ہی میں محمود و ایاز کو ایک صف میں کھڑا کرنے کے قائل ہیں اور مزدوروں، کسانوں اور محنت کشوں کی گاڑھے پسینے کی کمائی سے وہ جو دولت حاصل کرتے ہیں اس میں محمود اور ایاز کو برابر کا شریک بنانے کے لئے تیار نہیں ہیں۔''[47] ظاہر ہے کہ نوائے وقت کے لئے پاکستان کمیونسٹ پارٹی کی اس قسم کی سرگرمیاں، اس کے اس قسم کے بیانات اور اشتراکی نظریے کی روز افزوں مقبولیت تشویش کا باعث تھی اور اسے اندیشہ لاحق تھا کہ کہیں پاکستان روس کا دم چھلا نہ بن جائے۔ وہ برطانیہ سے بیزاری کا اظہار اس لئے نہیں کرتا تھا کہ اسے اس کی سامراجی سیاست، معیشت اور معاشرت کے بارے میں کوئی نظریاتی اختلاف تھا بلکہ اس کی خفگی کا باعث یہ تھا کہ برطانیہ پاکستان کی سیاسی و جنگی اہمیت کا احساس نہیں کرتا تھا اور وہ پاکستان کے مقابلے میں ہندوستان کو ترجیح دیتا تھا۔ وزیر اعظم لیاقت علی خان کو بھی یہی شکایت تھی۔

نہرو کے اینگلو امریکی بلاک کا دم چھلا بننے سے انکار کے بعد اینگلو۔امریکی سامراج نے پاکستان کو زیادہ توجہ دینا شروع کر دی...... لیاقت کو دورۂ امریکہ کی دعوت

چنانچہ جب اکتوبر میں دورۂ امریکہ کے دوران جواہرلال نہرو نے اپنی اشتراکیت دشمنی کے باوجود، ہندوستان کو اینگلو۔امریکی بلاک کا دم چھلا بنانے سے انکار کر دیا تو برطانیہ اور امریکہ میں یکا یک کئی اخبارات اور سیاسی لیڈروں اور مفکروں کو پاکستان کی اہمیت کا احساس ہونے لگا۔نومبر کے اوائل میں مانچسٹر گارڈین میں رچرڈز سمنڈز (Richards Symonds) کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں برطانیہ کی لیبر حکومت کو مشورہ دیا گیا تھا کہ ''وہ پاکستان کے بارے میں ہمدردانہ رویہ اختیار کرے کیونکہ اگر پاکستان طاقتور ہوگا تو برصغیر کے شمال مغربی اور شمالی علاقوں میں کمیونسٹوں کی اندرونی یا بیرونی جارحیت ممکن نہیں ہوگی۔ پاکستان کو غیر ملکی سرمایہ کاری، غیر ملکی ٹیکنیشنز اور غیر ملکی اساتذہ کی ضرورت ہے۔ باوجودیکہ پاکستان کو برطانیہ سے شکایات ہیں وہ اس مقصد کے لئے برطانیہ کی طرف ہی رخ کرتا ہے۔اگر اس کی یہ ضرورت یہاں سے پوری نہ ہو سکی تو وہ کہیں اور چلا جائے گا یا ایسی روایات قائم کر دے گا جو ان روایات سے مختلف ہوں گی جو برطانیہ کے لبرل عناصر نے ماضی میں طویل عرصہ کے دوران اپنے لئے بڑی احتیاط سے قائم کر رکھی ہیں۔''[48] 6رنومبر کو ڈان میں ڈگلس براؤن (Douglas Brown) کی ایک تقریر مضمون کی صورت میں شائع ہوئی جو اس نے چند دن قبل بی بی سی سے نشر کی تھی۔ اس مضمون کا خلاصہ یہ تھا کہ پاکستان ایک ایسا ملک ہے جسے مغرب نظرانداز نہیں کر سکتا۔اس ملک کی معاشی حالت اچھی ہے۔یہ فالتو اناج پیدا کرتا ہے۔اس کا تجارتی توازن اس کے حق میں ہے اور اس کی ایسی فوج ہے جو نظم وضبط کی پابند ہے۔ اور اس کے شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقے کمیونزم کے خلاف نہایت جنگی اہمیت کے حامل ہیں۔[49] 9رنومبر کے ڈان میں آسٹریلیا کے میجر جنرل ازبورن (Major General Osborne) کی ایک تقریر شائع کی جس میں اس نے حکومت آسٹریلیا کو مشورہ دیا تھا کہ وہ پاکستان کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار کرے۔ایسا کرنا اس لئے ضروری ہے کہ آسٹریلیا کے پاکستان کے ساتھ تجارتی روابط ہیں، پاکستان

سٹریٹیجک پوزیشن رکھتا ہے۔ دولت مشترکہ کے دفاع کا تقاضا ہے اور پاکستان کی فوج کی روایات بڑی شاندار ہیں۔[50]

12 رنومبر کو امریکی سینیٹ کے چار ارکان کراچی پہنچے اور انہوں نے یہاں تین دن قیام کیا۔ اس عرصے میں امریکی سفارت خانے نے ان کے اعزاز میں جو دعوت دی اس میں پاکستان کے سینئر وزراء اور اعلیٰ حکام کے علاوہ وزیر اعظم لیاقت علی خان نے بھی شرکت کی۔[51] یہ سینیٹرز ابھی کراچی ہی میں تھے کہ امریکی صدر ٹرومین نے ایک پریس کانفرنس میں بتایا کہ ''پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خان کو دورۂ امریکہ کی دعوت دینے کی تجویز پر غور ہو رہا ہے۔'' ٹرومین کے اس بیان کا مطلب یہ تھا کہ حکومت امریکہ نے ہندوستان کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو سے جو توقعات وابستہ کی تھیں وہ پوری نہیں ہوئی تھیں۔ اس لئے اب حکومت امریکہ نے بھی پاکستان کو اہمیت دینا ضروری سمجھا تھا۔

لیکن نوائے وقت ٹرومین کے اس بیان سے مطمئن نہیں تھا اور اس کی رائے یہ تھی کہ امریکی صدر نے جس طریقے سے پاکستان کے وزیر اعظم کو امریکہ بلانے کا ذکر کیا ہے وہ اہانت آمیز ہے۔ اس اخبار کا تبصرہ یہ تھا ''امریکہ کے صدر محترم نے پنڈت جواہر لال نہرو کو امریکہ آنے کی دعوت دی جو پنڈت جی نے منظور فرمالی۔ امریکہ میں پنڈت نہرو کا شاہانہ خیر مقدم ہوا۔ ہمیں اس پر کوئی اعتراض ہے نہ تعجب۔ اپنی ذاتی حیثیت میں پنڈت نہرو دنیا کے ایک بہت بڑے آدمی ہیں۔ اگر وہ ہندوستان کے وزیر اعظم نہ ہوتے تو بھی اپنی ذاتی عظمت کے پیش نظر اس اقدام کے مستحق تھے اور اب وہ ایک بہت بڑے ملک کے وزیر اعظم ہیں جسے امریکہ بین الاقوامی سیاست میں چین کی جگہ دینا چاہتا ہے۔ اس لئے پنڈت نہرو کی آؤ بھگت میں جو اہتمام بھی کیا گیا کم تھا۔ سوال یہ ہے کہ آنریبل مسٹر لیاقت علی کو امریکہ تشریف لانے کی دعوت اب محض وزن بیت ہے یا اس میں کوئی سیاسی مصلحت بھی کارفرما ہے؟ مثلاً یہی کہ پاکستان کو روس سے گہرے مراسم قائم کرنے سے روکا جائے؟ امریکہ سے ہماری دشمنی نہیں ہے نہ ہم امریکہ سے خواہ مخواہ تعلقات بگاڑنے کے حق میں ہیں۔ بلکہ ہماری خواہش تو یہ ہے کہ امریکہ اور پاکستان کے تعلقات زیادہ سے زیادہ دوستانہ ہوں۔ بالفاظ آنریبل مسٹر غلام محمد، ہمیں امریکہ سے بہت کچھ حاصل کرنا ہے لیکن ہمیں اس صاف بیانی پر معاف فرمایا جائے کہ جن حالات میں مسٹر لیاقت علی خان کو امریکہ آنے

کی دعوت ملنے والی ہے اور جن الفاظ میں اس کا اعلان کیا گیا ہے وہ توہین آمیز ہے۔ اس نازک مسئلہ پر اس سے زیادہ کہنا مناسب نہیں ہوگا۔ اگر یہ قیاس راست ہے کہ برطانیہ اور امریکہ میں بعض حلقے اب یہ سوچ رہے ہیں کہ اینگلو۔امریکن بلاک نے پاکستان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تو ہم اس احساس کو فریقین کے لئے نیک فال سمجھتے ہیں۔ شاید یہ احساس آئندہ چل کر تلافی مافات کی کوئی عملی صورت بھی اختیار کرے۔ لیکن اگر کوشش صرف اسی حد تک موجود ہے کہ پاکستان اور روس کے مابین تعلقات قائم نہ ہو پائیں تو پاکستان کو اسی مرحلہ پر یہ بات واضح کر دینی چاہیے کہ وہ ایسی کوششوں کو سخت ناپسند کرتا ہے۔''[52]

جب نوائے وقت نے یہ اداریہ لکھا تھا بظاہر اس وقت اسے معلوم نہیں تھا کہ لیاقت علی خان کے دورہ ماسکو کا پروگرام ماسکو اور کراچی دونوں ہی جانب سے ختم کیا جا چکا تھا۔ ماسکو نے اس سلسلے میں سرد مہری کا مظاہرہ اس لئے کرنا شروع کر دیا تھا کہ گزشتہ پانچ ماہ کے تجربہ سے یہ ثابت ہوا تھا کہ حکومت پاکستان سے آزاد خارجہ پالیسی اپنانے کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی اور کراچی نے یہ پروگرام اس لئے منسوخ کر دیا تھا کہ حکومت پاکستان میں مغرب نواز عناصر کا اور برطانیہ کی حکومت کا دباؤ بہت زیادہ تھا۔ کراچی میں مقیم برطانوی ہائی کمشنر کے 27/اکتوبر 1949ء کے متذکرہ خط کے بعد لیاقت علی خان کے ماسکو جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ نوائے وقت کے برعکس امریکی صدر ٹرومین کو ان حقائق کا علم تھا۔ اس لئے یہ تجویز اس کے زیر غور آئی کہ لیاقت علی خان کو بھی امریکہ بلا لیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہوگا۔ اس طرح اس سبکی کا بھی ازالہ ہو سکتا تھا جو لیاقت علی خان نے جواہر لال نہرو کو دورۂ امریکہ کی دعوت ملنے پر محسوس کی تھی اور یہ امید بھی کی جا سکتی تھی کہ پاکستانی عوام کی اینگلو۔امریکی بلاک کے خلاف برہمی میں کمی ہو جائے گی۔

پنجاب میں نوائے وقت کی قسم کے عناصر کا مطالبہ صرف یہ تھا کہ برطانیہ اور امریکہ نے ماضی میں پاکستان سے جو برا سلوک کیا ہے اس کی تلافی کی جائے۔ یعنی پاکستان کی سیاسی و جنگی اہمیت کا احساس کر کے اس کی مناسب مالی اور فوجی امداد کی جائے۔ پنجاب کے ان عناصر کا یہ موقف پاکستانی عوام، بالخصوص پنجابی عوام میں بہت مقبول تھا کیونکہ اس کی بنیاد ہندوستان اور پاکستان کے درمیان لاینحل قومی تضاد پر تھی۔ پاکستانی عوام کے لئے یہ بات کسی صورت قابل قبول نہیں ہو سکتی تھی کہ دنیا کی کوئی طاقت پاکستان کے مقابلے میں ہندوستان کو ترجیح دے۔ ہندوستان

بوجوہ ان کا قومی دشمن تھا۔ لہٰذا اس قومی دشمن کا دوست ان کا دوست نہیں ہوسکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب لیاقت علی خان نے دورہ ماسکو کی دعوت قبول کی تھی تو اس کے اس فیصلے کو عوام کی بے پناہ حمایت حاصل ہوئی تھی۔ ان دنوں ماسکو کے ذرائع ابلاغ جواہر لال نہرو کو سامراجی پٹھو اور ایشیا کا دوسرا چیانگ کائی شیک قرار دیتے تھے۔ ٹرومین نے لیاقت علی خان کو بلانے کا عندیہ اس لئے بھی دیا تھا کہ امریکہ اور برطانیہ کے بعض حلقے واقعی یہ سوچنے لگے تھے کہ پاکستان سے اچھا سلوک نہیں کیا گیا حالانکہ اس ملک کے حکمران طبقے کی مغرب نوازی غیر متزلزل ہے۔ یہ جغرافیائی لحاظ سے سٹریٹیجک پوزیشن رکھتا ہے اور یہ اسلام کا نام لے کر مشرق وسطیٰ میں اہم کردار ادا کرسکتا تھا۔ 14 رنومبر کو اٹاوہ میں ہندوستان کے سابق وائسرائے لارڈ ویول (Wavel) نے بھی اپنی ایک تقریر میں مغربی دنیا کے عوام پر زور دیا تھا کہ اس طرف زیادہ توجہ کریں۔ اس کی رائے یہ تھی کہ ''شاید ہندوستان کو نمایاں پوزیشن اس لئے دی جاتی ہے کہ بیرونی ممالک میں اس کی نمائندگی بہتر ہے۔ لیکن لوگوں کو چاہیے کہ وہ پاکستان کو نظر انداز نہ کریں۔ پاکستان بہت اہم ڈومینین ہے اور وہ اپنے معاملات اچھے طریقے سے نبٹاتا ہے۔'' اس نے مزید کہا کہ ''ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ تیسری عالمی جنگ کی صورت میں پاکستان بے پناہ سٹریٹیجک اہمیت کا حامل ہوگا۔''[53] لارڈ ویول 1943ء میں ہندوستان کا وائسرائے مقرر ہونے سے پہلے مشرق وسطیٰ میں برطانوی افواج کا کمانڈر انچیف تھا اور اس بنا پر پاکستان کی جنگی اہمیت کے بارے میں اس کی رائے کی بڑی وقعت تھی۔ وہ برطانیہ کے حکمران طبقے کے اس مکتب فکر سے تعلق رکھتا تھا جس کی رائے یہ تھی کہ مشرق وسطیٰ میں مغربی مفادات کے تحفظ کے لئے پاکستان کی خدمات سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

جب امریکی صدر ٹرومین نے پریس کانفرنس میں یہ بتایا تھا کہ وزیراعظم پاکستان لیاقت علی خان کو بھی امریکہ آنے کی دعوت دینے کے مسئلے پر غور ہو رہا ہے، اس وقت شاہ ایران کے دورہ امریکہ کا فیصلہ ہو چکا تھا اور اس فیصلے کے مطابق 12 رنومبر کو صدر ٹرومین کا ذاتی ہوائی جہاز انڈی پنڈنس (Independence) شاہ کو لانے کے لئے تہران بھیجا گیا تھا۔ شاہ ایران اس ہوائی جہاز میں نومبر کو واشنگٹن پہنچا اور وہاں اس نے اخبار نویسوں کو بتایا کہ میں امریکہ سے مزید فوجی امداد مانگوں گا۔ نومبر کو شاہ ایران نے صدر ٹرومین سے ملاقات کرنے کے بعد ایک پریس کانفرنس میں یہ رائے ظاہر کی کہ مشرق وسطیٰ میں معاہدہ اطلانتک کی طرح کے دفاعی معاہدے کی

تجویز قبل از وقت ہے۔ میری رائے میں ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم پہلے اپنی معیشت کو مضبوط کریں اور پھر دفاعی منصوبہ پر عمل کریں۔ شاہ ایران کے اس بیان کا مطلب یہ تھا کہ امریکہ ابھی یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ عرب لیگ کی پولیٹیکل کمیٹی اجتماعی تحفظ کی جس تجویز پر غور کر رہی ہے اس کی حمایت کرنی چاہیے یا نہیں۔ بعض اخباری اطلاعات کے مطابق مصر کی جانب سے تجویز اجتماعی تحفظ کے اس معاہدے کی تفصیلات کے بارے میں عرب ممالک میں اختلاف رائے پایا جاتا تھا۔ عراق کا مطالبہ یہ تھا کہ اس مجوزہ معاہدے میں صیہونیت کے ساتھ کمیونزم کو بھی عربوں کا دشمن قرار دیا جائے لیکن مصر کا موقف یہ تھا کہ معاہدے کے مسودے میں کسی دشمن کا نام نہ لیا جائے بلکہ یہ کہا جائے کہ جارحیت خواہ کسی جانب سے ہو اسے سارے عالم عرب کے خلاف تصور کیا جائے گا۔ برطانیہ کے اخبار مانچسٹر گارڈین کی اطلاع یہ تھی کہ واشنگٹن میں عرب سفیروں نے امریکہ کے قائم مقام وزیر خارجہ جیمز ویب کو یقین دلایا کہ عرب ممالک مشرق وسطیٰ میں کمیونسٹ مخالف بلاک کی تشکیل کے سلسلے میں تعاون کریں گے بشرطیکہ امریکہ ان دعاوی کی مخالفت کرے جو اسرائیل کی جانب سے تقسیم فلسطین سے متعلقہ اقوام متحدہ کی قرارداد سے بڑھ کر کئے جا رہے ہیں۔ بالفاظ دیگر عرب سفیروں کی پیشکش یہ تھی کہ اسرائیل نے 1948ء کی جنگ میں فلسطین کے جس مزید تقریباً چھ ہزار مربع میل کے علاقے پر قبضہ کیا ہے اگر وہ اس سے دستبردار ہو جائے تو سارے عرب ممالک سوویت مخالف بلاک میں شامل ہو جائیں گے۔ حکومت برطانیہ کی رائے یہ تھی کہ عرب حکمرانوں کی یہ پیشکش قبول کرنی چاہیے کیونکہ دنیا کی موجودہ سیاسی صورتحال میں مشرق وسطیٰ کا مفاد اسی میں ہے۔ مگر حکومت امریکہ کو اس پیشکش کے قبول کرنے میں تامل تھا کیونکہ امریکہ نے ایک سوچے منصوبے کے بعد عالم عرب کے قلب میں اسرائیل کی مملکت قائم کروائی تھی اور اسی منصوبہ کا تقاضا یہ تھا کہ 1948ء میں اس مملکت کی سرحدوں میں جو توسیع ہوئی ہے وہ قائم رہے۔ لیکن پاکستان مسلم لیگ کے صدر چودھری خلیق الزماں کو بظاہر عرب ممالک کے فرمانرواؤں کے ان مسائل میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہ لندن سے واپسی پر تقریباً ایک ہفتے کے لئے ترکی میں ٹھہرا تھا اور وہاں اس نے متعدد سرکاری اور غیر سرکاری زعما سے ملاقات کے بعد یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ''یہ مناسب وقت ہے کہ مشرق قریب اور مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک کے درمیان قریبی اور دوستانہ روابط قائم کئے جائیں۔''[54]

باب: 7

اسلام کے نام پر سوویت مخالف، سامراج نواز محاذ کے قیام کا منصوبہ، عرب و عجم میں اثر پذیر نہ ہوسکا

اسلامک اکنامک کانفرنس کے ذریعہ مسلم بلاک وضع کرنے کی کوشش کو خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی

25 نومبر کو کراچی میں انٹرنیشنل اسلامک اکنامک کانفرنس ہوئی جس میں 16 مسلم ممالک یعنی، ترکی، مصر، ایران، عراق، سعودی عرب، انڈونیشیا، مسقط، اومان، افغانستان، شام، الجیریا، لیبیا، تیونس، مالدیپ اور آزاد کشمیر کے مندوبین نے شرکت کی۔ وزیر اعظم لیاقت علی خان نے اس کانفرنس کا افتتاح کیا اور اس نے اس موقع پر اپنی مختصر تقریر میں امید ظاہر کی کہ ''یہ کانفرنس ایسا لائحہ عمل مرتب کرے گی جس سے مسلم ممالک کو فائدہ پہنچے گا اور ان ممالک کے درمیان اخوت کے رشتے مزید مضبوط ہوں گے۔'' وزیر خزانہ غلام محمد کی صدارتی تقریر یہ تھی کہ ''مسلم ممالک کو معاشی تعاون سے آگے بڑھنا چاہیے اور ایسے جسد کی صورت اختیار کرنی چاہیے جو اپنے اجزا کو تقویت دے اور جسے اپنے اجزا سے تقویت ملے۔'' اس نے مزید کہا کہ ''یہ زمانہ بڑی گروہ بندی کا ہے اور دوسرے گروہوں کی جانب سے ہم پر دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔ آیئے ہم اس دباؤ کا مقابلہ کرنے کے لئے طاقتور بنیں اور اجتماعی سوداکاری و اجتماعی تحفظ کا سسٹم وضع کریں۔''[1]

یہ کانفرنس جاری تھی کہ لندن کے ہفت روزہ اکونومسٹ کا تبصرہ یہ تھا کہ ''کراچی کے اس اجتماع کے پس پردہ یہ سوال موجود ہے کہ آیا پاکستان دور دراز علاقوں میں رہنے والے ان لوگوں کی قیادت سنبھال سکے گا جن میں بہت سی باتیں مشترک ہونے کے باوجود ابھی تک کسی بھی

بات پر اتفاق رائے نہیں ہو سکا اور جن کے درمیان کبھی کوئی نتیجہ خیز تعاون بھی نہیں ہوا؟ بلاشبہ پاکستان اس قسم کی قیادت کی تمنا رکھتا ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو اس طرح نہ صرف ہندوستان کے زیر سایہ پاکستان کا خطرناک احساس تنہائی ختم ہو جائے گا بلکہ اس سے مشرق وسطیٰ میں بہت اچھے نتائج برآمد ہوں گے۔ تاہم خطرہ یہ ہے کہ اگر مغرب نے غیر مخلصانہ اور لاپرواہی کا رویہ اختیار کیا تو یہ گروپ اس کے بارے میں معاندانہ روش اختیار کر لے گا۔ مسلم دنیا میں اس تجربہ کا لندن اور واشنگٹن سے غور و تدبر کے ساتھ مطالعہ ہونا چاہیے۔''[2] ماسکو کے ہفت روزہ نیو ٹائمز کی رائے یہ تھی کہ یہ کانفرنس منعقد کرنے کا مقصد یہ ہے کہ سوویت یونین کے خلاف مسلم ممالک کا ایک فوجی اور سیاسی بلاک بنایا جائے۔''[3]

26 نومبر کو کانفرنس کے دوسرے سیشن میں فیصلہ کیا گیا کہ کانفرنس کے مقاصد کو جامہ عمل پہنانے کے لئے ایک مستقل سیکرٹریٹ قائم کیا جائے۔ مصر کے مندوب ذکی سعید کو سٹینڈنگ کمیٹی کا صدر مقرر کیا گیا اور اس سٹینڈنگ کمیٹی نے 11 سبجیکٹس کمیٹیاں مقرر کیں۔ اس کے سیشن کے بعد ذکی سعید نے ڈان سے ایک انٹرویو میں کہا کہ اسلامی ممالک کے عوام قومیت کے نقطہ نگاہ سے سوچیں تو یہ بات بہت نقصان دہ ہوگی۔ اس نے اسلامی ممالک کے ایک مشترکہ ٹیکنیکل کالج کے قیام کی حمایت کی۔[4] اسی دن ڈان نے اپنے اداریے میں کانفرنس کے مندوبین پر واضح کیا کہ ''ہوسکتا ہے کہ بعض ممالک اسلام کو نسل اور جغرافیہ کے حوالے سے ''قومی'' مذہب تصور کرتے ہیں لیکن پاکستان کی اسلام سے وابستگی اس سے بالکل مختلف ہے۔ پاکستان کی اسلام کے ساتھ وفاداری شعوری طور پر روحانی ہے اور اظہاری طور پر بین الاقوامی ہے۔ ''انڈین اسلام'' کے بارے میں یہ اکثر کہا جاتا رہا ہے کہ یہ علاقائیت سے بیگانہ اور قومیت کا دشمن ہے۔ اس طرح عالمی قوت کی حیثیت سے اسلام کے کردار کو بالاصرار غلط رنگ میں پیش کیا جاتا رہا اور یہی بات پاکستان کی تحریک کی زبردست طاقت کو بروئے کار لائی۔ ممکن ہے اس تحریک سے وہ لوگ حیران ہوئے ہوں جو ایسی باتوں کو اپنی قوم پرستی کے منافی تصور کرتے ہیں لیکن یہی صحیح اسلامی پوزیشن ہے جو تنگ نظر قوم پرستی سے متصادم ہے۔''[5] ڈان کے اس اداریے کا مقصد یہ تھا کہ اسلام کو علاقائی قوم پرستی سے بالاتر قرار دے کر وزیر خزانہ غلام محمد کے تجویز کردہ اجتماعی تحفظ کے سسٹم کے لئے راہ ہموار کی جائے۔ لیکن اس سلسلے میں دلچسپی اور حیرت کی بات یہ تھی کہ غلام محمد ماضی میں سیکولر نظام

حکومت کی کھلم کھلا علمبرداری کرتا رہا تھا لیکن اب وہ مسلم قومیت کے نام پر مشرق وسطیٰ میں سوویت مخالف بلاک بنانے کے لئے کوشاں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ لندن کا ہفت روزہ اکونومسٹ اسے نوزائیدہ پاکستان کی طاقتورترین شخصیتوں میں شمار کرتا تھا اور ویٹی کن سٹی (Vatican City) کی ایک تبلیغی سوسائٹی کی تجویز یہ تھی کہ ''عیسائیوں اور مسلمانوں کو کمیونزم کے خلاف ''خدا کے تحفظ کے لئے مشترکہ محاذ'' بنانا چاہیے...... بہت سے نیک مسلمانوں کو پتہ ہے کہ آج کل مذہب کو کمیونزم سے کس قدر خطرہ لاحق ہے۔ آج کل دنیا میں اسلامی ممالک کا مقام انتہائی سٹریٹیجک ہے اور جدید افکار و نظریات کی نمود کی وجہ سے اسلام اپنا نئے سرے سے جائزہ لے رہا ہے۔''[6]

ڈان کے مذکورہ بالا اداریے کی اشاعت کے اگلے دن 27 رنومبر کو چودھری خلیق الزماں واپس کراچی پہنچا تو اس نے اسلامستان کے بارے میں اپنے موقف کا اعادہ کیا اور ڈان کی 10 رنومبر کی اطلاع کی تردید کی کہ برطانیہ مسلمانان عالم کی بین الاقوامی تنظیم کے خلاف ہے۔ اس نے کہا کہ ''میں نے کسی اخبار کے نمائندے سے یہ نہیں کہا کہ برطانیہ مسلم عوام کی تنظیم کے مخالف ہے بلکہ میں نے تو یہ کہا تھا کہ برطانیہ اس قسم کی تنظیم کے حق میں ہے۔''[7]

یکم دسمبر کو اسلامک اکنامک کانفرنس کے تیسرے سیشن میں متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ ایک انٹرنیشنل فیڈریشن آف اسلامک چیمبرز آف کامرس اینڈ انڈسٹری کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔ اس فیڈریشن کا ہیڈکوارٹر کراچی میں ہوگا۔ مزید برآں متصلہ مسلم ممالک میں نقل وحمل کے سسٹم۔ بشمول ریلوے سسٹم۔ کو فی الفور بہتر بنایا جائے گا اور کاشتکاروں سے منصفانہ برتاؤ کی خاطر وسیع پیمانے پر اور ریڈیکل زرعی اصلاحات کی جائیں گی۔ لیکن اس سیشن میں نہ تو وزیر خزانہ غلام محمد کی جانب سے پیش کردہ اجتماعی سوداکاری اور اجتماعی تحفظ کی تجویز زیر غور آئی اور نہ ہی اس سلسلہ میں کوئی فیصلہ ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بیشتر ممالک اس تجویز کے حق میں نہیں تھے۔ کانفرنس میں ایرانی وفد کے قائد آقائی نوری اسفندیاری کا 2 ردسمبر کو پریس کانفرنس میں بیان یہ تھا کہ ''شاہ ایران امریکہ سے جو اسلحہ مانگ رہا ہے وہ بشرط ضرورت ایران کے تخریبی عناصر کے خلاف استعمال کیا جائے گا۔ اگر کبھی سوویت یونین اور ویسٹرن بلاک کے درمیان جنگ ہوئی تو ایران جنگ میں غیر جانبدار رہے گا۔ اگر روس ہمارے داخلی معاملات میں مداخلت نہ کرے تو میں اسے ایران کا دشمن تصور نہیں کروں گا۔ روس ایک اشتراکی ملک ہے۔ ہم اشتراکیت کو پسند نہیں کرتے۔

ہم روس کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتے اور مجھے امید ہے کہ روس بھی ہمارے معاملات میں مداخلت نہیں کرے گا۔"[8] اور اسی دن عرب لیگ کے مندوب جلال حسین نے کراچی کے اخبار نویسوں کو غیر مبہم الفاظ میں بتایا کہ فی الحال چودھری خلیق الزماں کا اسلامستان قابل عمل نہیں ہے۔ اس نے کہا کہ "عرب لیگ کی طرف سے غیر عرب مسلم ممالک کا اس وقت تک خیر مقدم نہیں کیا جائے گا جب تک کہ عرب ممالک کا باہمی تعاون واقعی مؤثر نہ بن جائے۔"[9]

5 دسمبر کو انٹرنیشنل اسلامک کانفرنس کے پانچویں سیشن میں انٹرنیشنل اسلامک اکنامک آرگنائزیشن کے نام سے ایک مستقل تنظیم قائم کرنے کا فیصلہ ہوا اور پاکستان کے وزیر خزانہ غلام محمد کو متفقہ طور پر اس تنظیم کا پہلا صدر منتخب کیا گیا۔ غلام محمد نے اس موقع پر اپنی تقریر میں کہا کہ کانفرنس نے جو فیصلے کئے ہیں ہمیں پوری سنجیدگی سے ان پر عمل کر کے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے نئے دور کا آغاز کرنا چاہیے۔ اس نے کہا کہ اس کانفرنس سے قائداعظم مرحوم اور جمال الدین افغانی کے خوابوں کی تکمیل ہوگئی ہے۔[10]

روزنامہ نوائے وقت کو غلام محمد کی اس رائے سے اتفاق تھا اور وہ بھی کانفرنس کی کاروائی سے بہت مطمئن تھا۔ اس کی رائے یہ تھی کہ "یہ کانفرنس توقع سے زیادہ کامیاب رہی۔ اس کانفرنس کا سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہوا کہ تقریباً تمام اسلامی ممالک جن کی اقتصادی حالت تقریباً یکساں ہے اور جنہوں نے ایک سے مسائل حل کرنے ہیں، پہلی دفعہ ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ ویسے تو اخوت اسلامی کا جذبہ مسلمانان عالم کی شیرازہ بندی کے لئے کافی تھا لیکن استعمار پسند ممالک کی سیاست کاری نے ان کے اتحاد کا شیرازہ بکھیر دیا تھا۔ آج جذبہ اسلامی کے تحت نہیں تو کم از کم مشترکہ خطرات، مشترکہ تکالیف اور مشترکہ مسائل نے انہیں اکٹھا کر دیا ہے اور جب اسلامی ممالک اس طرح یکجا ہو جائیں تو پھر اخوت اسلامی کے تحت ان کا متحد ہو جانا لازمی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کانفرنس ایک نیک فال ہے جو ممالک اسلامیہ کے درخشندہ مستقبل کا پتہ دیتی ہے۔"[11] تاہم دہلی کے روزنامہ تیج کا اس کانفرنس پر اداریہ یہ تھا کہ "ممکن ہے کچھ حلقے ابھی تک حیران ہوں کہ پاکستان نے یہ کانفرنس بلانے کے لئے اتنا اہتمام کیوں کیا؟ لیکن پاکستان کے قیام کا پس منظر اور اس کے بعد کے واقعات جاننے والے اس سے ناواقف نہیں ہو سکتے۔ برطانیہ، امریکہ اور روس تینوں مڈل ایسٹ میں اپنا اقتدار قائم کرنے کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔

برطانیہ اور امریکہ روس کا اثر و رسوخ روکنا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف برطانیہ اور امریکہ کے اپنے مفاد ایک دوسرے سے متصادم ہو رہے ہیں۔ اگر پاکستان کسی طرح یہ ثبوت دے دے کہ اسلامی ملک اس کے ساتھ ہیں تو پاکستان، امریکہ، برطانیہ اور روس تینوں سے قیمت وصول کر سکتا ہے۔ مسٹر لیاقت علی ابھی تک روس یا امریکہ نہیں گئے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ کہیں جانے سے پہلے وہ سیاسی بلیک میلنگ کے لئے اسلامی محاذ کا ایک سٹنٹ کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔''[12]

خلیق الزماں کی جانب سے ''اسلامستان'' کے پس پشت برطانیہ کے کردار کا اقرار اور مختلف جواز

کانفرنس کے آخری سیشن سے چودھری خلیق الزماں نے بھی خطاب کیا۔ اس نے کہا کہ ''جو دولت گردش میں نہیں ہے اور تجوریوں میں پڑی ہے اسے کھلی مارکیٹ میں لا کر اس کی منصفانہ تقسیم یا تو اصلاحات کے ذریعے ہو سکتی ہے یا طبقاتی انقلاب کے ذریعے۔ چونکہ طبقاتی انقلاب سے روحانی روایات تباہ ہو جاتی ہیں اور معاشرتی انتشار پھیلتا ہے اس لئے اسلام نہ صرف اصلاحات کی حمایت کرتا ہے بلکہ بڑے زور سے اصلاحات کا حکم دیتا ہے۔''[13] اسی دن خلیق الزماں نے ایک اخباری انٹرویو میں اپنے اس موقف کا اعادہ کیا کہ اسلامستان لازماً وجود میں آئے گا۔ اگرچہ ہو سکتا ہے کہ اس کے قائم ہونے میں اسے پندرہ سال لگ جائیں۔ اس نے کہا کہ ابھی چند سال پہلے تک پاکستان کی حیثیت محض ایک تصور کی تھی لیکن اب اس نے ایک حقیقت کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اس کی رائے یہ تھی کہ ''اسی طرح اسلامستان بھی ظہور میں آ جائے گا۔ واقعات کے رخ سے ظاہر ہو جائے گا کہ مسلم ممالک کے مسائل کا حل طاقتور اسلامستان کے قیام میں مضمر ہے۔ اسلامستان دراصل اسلام کے ابتدائی ایام میں ہی قائم تھا لیکن بعض عناصر کی حماقتوں کی وجہ سے اس کے روابط ٹوٹ گئے اور یہ منہدم ہو گیا۔'' اس نے اپنے دورۂ لندن کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ''میرا وہاں جانے کا مقصد یہ تھا کہ میں حکومت برطانیہ سے یہ کہوں کہ وہ مشرق وسطیٰ میں کوئی دست اندازی نہ کرے۔ میں اس حقیقت سے آنکھیں بند نہیں کرنا چاہتا تھا کہ برطانیہ مشرق وسطیٰ میں بڑی اہم پوزیشن کا حامل ہے اور وہ مختلف مسلم ممالک پر اپنا غلبہ قائم رکھنے کے لئے ان میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ تاہم مجھے افسوس ہے کہ لندن میں میری

بات چیت امید افزا اور اطمینان بخش نہیں رہی۔" [14]

7 دسمبر کو خلیق الزماں نے سٹار نیوز ایجنسی سے ایک انٹرویو میں بھی اسلامستان پر اصرار کیا۔ اس نے کہا کہ "اسلامستان کوئی نیا نظریہ نہیں ہے۔ یہ اتنا ہی پرانا نظریہ ہے جتنا کہ خود اسلام ہے۔ اس میں کسی سازش کا شبہ کرنا، شبہ و بداعتمادی کی انتہا ہے۔" اس نے ماسکو کے ہفت روزہ نیو ٹائمز کے اسلامستان کے بارے میں مخالفانہ تبصرہ پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے مزید کہا کہ "اگر نظریات کے موجودہ تصادم میں مسلمان دنیا پر یہ ظاہر نہیں کریں گے کہ اسلام نے خود اپنا ایک نظام حیات پیش کیا ہے اور کمیونزم اور سرمایہ پرستی ہی دنیا کے موجودہ اقتصادی اور معاشرتی مسائل کے دو حل ہیں تو وہ اسلام کی جانب سے ان پر عائد شدہ فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کے مرتکب ہوں گے۔ اسلام امن اور معاشرتی انصاف کا مبلغ ہے اور اسے اس مقدس راستہ سے نہیں ہٹایا جا سکتا۔ یہ خیال بالکل لغو ہے کہ برطانیہ کے ساتھ اسلامستان کے متعلق غور و خوض کسی خفیہ معاہدہ کی وجہ سے ہے۔ تاریخی اور دیگر وجوہ کی بنا پر برطانیہ کو مشرق وسطیٰ میں گزشتہ دو سو برس سے جو حیثیت حاصل ہے وہ اگر کمیونسٹوں کو حاصل ہوتی تو میں ماسکو کی حکومت سے بھی یہی درخواست کرتا کہ وہ مشرق وسطیٰ کے ملکوں کے سیاسی اور اقتصادی اتحاد کی راہ میں رکاوٹ نہ پیدا کرے۔ روسی حکومت ایک اسلامی بلاک کی تشکیل میں کوئی اخلاقی امداد دے تو اس کا بھی خیر مقدم کیا جائے گا۔" [15]

9 دسمبر کو خلیق الزماں نے اسلامیہ کالج کے ایک اجتماع کو، جس میں خفیہ پولیس کے ارکان سمیت کل 83 افراد موجود تھے، خطاب کرتے ہوئے یقین دلایا کہ اب برطانیہ ان کے اسلامستان کی تحریک کی مخالفت نہیں کرے گا۔ اس نے کہا کہ "میں پاکستان کے اخباروں کی نکتہ چینیوں اور مخالفتوں کے باوجود اپنے اسلامستان کے منصوبے کو اٹھا رکھنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ کیونکہ سرمایہ داری اور کمیونزم کی موجودہ کشمکش کے دوران اسلامستان کی تحریک کو چلانے کا بہترین موقع ہے۔ نیز کسی اقتصادی پروگرام کی بجائے میں اسلام کے نام پر اسلامستان کا منصوبہ پورا کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے کہا کہ "جس دن پاکستان میں مسلم لیگ اسلام کی بجائے اقتصادی پروگرام اختیار کرے گی اس دن پاکستان کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ مشرق وسطیٰ کے حکمرانوں سے چونکہ اس سلسلہ میں مخالفت کا اندیشہ تھا اس لئے ان کو اسلامستان کا مقصد سمجھانے کے لئے میں نے ملاقاتیں کی ہیں۔ جب اس سے اسلامستان کی وضاحت کا

مطالبہ کیا گیا تو اس نے کہا کہ ''قائداعظم نے پاکستان بننے تک پاکستان کی کوئی وضاحت نہیں کی تھی۔ اسی طرح میں بھی اسلامستان کے متعلق تفصیلات نہیں بتا سکتا۔ البتہ ابتدائی اقدام کی حیثیت سے میں چاہتا ہوں کہ عرب لیگ میں غیر عرب مسلم ممالک کو بھی شامل کر لیا جائے۔'' اس نے کہا کہ ''میں برطانیہ کو مشرق وسطیٰ کے معاملات سے علیحدہ ہونے کا مشورہ دینے کے لئے برطانیہ گیا تھا۔ لندن میں میں نے کوئی معاہدہ نہیں کیا۔ مجھے یقین ہے کہ اب برطانیہ میرے اسلامستان کی مخالفت نہیں کرے گا۔''[16]

جب خلیق الزماں کی اس قسم کی تقریروں سے مشرق وسطیٰ میں سخت مخالفانہ ردعمل ہوا تو قاہرہ میں پاکستانی سفیر حاجی عبدالستار سیٹھ نے سٹار ایجنسی کو بتایا کہ ''پاکستان اسلامستان بنانے کی کوشش نہیں کر رہا ہے بلکہ وہ تو انڈونیشیا اور شمالی افریقہ کے درمیانی ممالک پر مشتمل اسلامی بلاک بھی نہیں بنا رہا ہے۔ اس وقت اصل ضرورت یہ ہے کہ تمام مسلم ممالک انفرادی طور پر کافی طاقتور ہو جائیں جس کے بغیر اتحاد کی گفتگو محض بے سود ہے۔'' اس افواہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہ پاکستان، افغانستان، ایران اور ترکی کا اتحاد قائم کیا جانے والا ہے اور عرب لیگ کو اس میں شمولیت کی دعوت دی جانے والی ہے، اس نے کہا کہ ''ان ممالک کے درمیان ایسے اتحاد کا کیا فائدہ جس کی وجہ سے دنیا کو صرف شبہ کا موقع ملے۔ اسلامی ممالک کو اس وقت ضرورت استحکام اور باہمی تعاون کی ہے جیسی مثلاً کراچی کی حالیہ اسلامی اکنامک کانفرنس میں پیدا کی جا سکی ہے۔ اس کانفرنس نے اسلامی ممالک کے درمیان مستقل تعاون قائم کر دیا ہے۔ پاکستان کا مطمع نظر یہ ہے کہ فاروق اعظمؓ کا درخشاں دور پھر واپس لایا جا سکے اور اسلام کو اس کی اصل شکل میں دنیا کے سامنے پیش کیا جا سکے۔ پاکستان لیڈری کی ہوس نہیں رکھتا لیکن ہر ممکنہ خدمت کی انجام دہی کے لئے ہمہ وقت تیار ہے۔''[17]

اسلامک اکنامک کانفرنس اور ترکی میں امریکی سفارت کاروں کی کانفرنس کے بعد لیاقت کو امریکہ کے دورے کی دعوت اور امریکی امداد کا وعدہ

انٹرنیشنل اسلامک اکنامک کانفرنس کی دس روزہ کاروائی کے دوران، ترکی کے دارالحکومت استنبول میں بھی ایک چار روزہ اہم کانفرنس ہوئی۔ یہ کانفرنس مشرق وسطیٰ میں متعین امریکی سفارت کاروں کی تھی۔ اس کی صدارت امریکہ کے محکمہ خارجہ کے شعبۂ امور

مشرق وسطیٰ کے سربراہ اسسٹنٹ سیکرٹری جارج میگ گھی(George Mcghee) نے کی اور اس میں امریکہ کے ملٹری اتاشیوں نے بھی شرکت کی۔ جب 28 نومبر کو یہ کانفرنس جاری تھی تو قاہرہ کے اخبار المصری نے یہ خبر شائع کی کہ "اس کانفرنس نے مصر سے برطانوی افواج کی واپسی کی منظوری دے دی ہے اور مزید فیصلہ کیا ہے کہ برطانیہ کے عرب ممالک سے تعلقات کو بہتر منایا جائے گا۔ عرب ممالک کے درمیان دفاعی معاہدہ کروایا جائے گا اور ایک کمیونسٹ مخالف بلاک بنایا جائے گا۔ عراق اور شام کے درمیان سیاسی اتحاد کی بجائے معاشی اتحاد قائم کیا جائے گا۔ عرب ممالک اور اسرائیل کے درمیان مستقل امن کے قیام کے لئے اقدامات کئے جائیں گے۔ مشرق وسطیٰ میں برطانیہ و امریکہ کے تیل کے مفادات کے لئے اقدامات کئے جائیں گے اور مشرق وسطیٰ میں امریکی مالی منصوبوں پر عملدرآمد کے لئے مصر کی سربراہی میں ایک مشاورتی کمیٹی مقرر کی جائے گی۔"[18]

اس کانفرنس کے بعد جارج میگ گھی نے مشرق وسطیٰ کے مختلف ممالک کا دورہ کیا اور پھر وہ 7 دسمبر کو کراچی پہنچا اور اس نے بتایا کہ "میں امریکہ اور پاکستان کے تعلقات کو بے انتہا اہمیت دیتا ہوں۔ میں یہاں چار روزہ قیام کے دوران پاکستانی ارباب اقتدار سے باہمی دلچسپی کے معاملات پر بات چیت کروں گا۔ ان معاملات میں پسماندہ ممالک کے لئے صدر ٹرومین کا چار نکاتی امدادی پروگرام کا معاملہ بھی شامل ہوگا۔ امریکی کانگرس جنوری 1950ء میں اس امدادی بل پر غور کرے گی اور جب یہ قانون منظور ہو جائے گا تو امریکہ، پاکستان، ہندوستان اور مشرق وسطیٰ کے ممالک کو ٹیکنیکل امداد دے گا۔"[19] 9 دسمبر کو جارج میگ گھی نے کراچی میں ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے مزید بتایا کہ "ہمارے پاکستان سے تعلقات کے حوالے سے امریکہ کو پاکستان کی اہمیت کے بارے میں روز بروز زیادہ آگاہی ہو رہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری خارجہ پالیسی کے رخ کا زیادہ سے زیادہ تعین پاکستان کی امداد کی جانب ہو رہا ہے۔" اس نے بتایا کہ "امریکی سفارت کاروں کی حالیہ کانفرنس کے نتیجہ کے طور پر مشرق وسطیٰ کے ممالک میں امریکی مفادات میں اصلاح کی گئی ہے۔ مشرق وسطیٰ کے یہ ممالک پاکستان کے ہمسائے ہیں اور ان کے ساتھ اس کے قریبی روابط ہیں۔"[20]

10 دسمبر کو جارج میگ گھی پشاور پہنچا جہاں اس نے وزیراعظم لیاقت علی خان سے

ملاقات کی جس کے بعد سرکاری طور پر اعلان کیا گیا کہ ''امریکہ کے صدر ٹرومین اور اس کی بیگم نے پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خان اور اس کی بیگم کو مئی 1950ء میں امریکہ کا دورہ کرنے کی دعوت دی ہے اور وزیر اعظم نے یہ دعوت بخوشی قبول کر لی ہے۔''[21]

پشاور کے سرکاری اعلان سے اسلامک اکنامک کانفرنس کا ایک مقصد تو یہ پورا ہوا کہ امریکہ سے یہ ثبوت مل گیا کہ اسے پاکستان کی اہمیت کا احساس ہے۔ دوسرا مقصد یہ پورا ہوا کہ وزیر اعظم لیاقت علی خان کے دورہ ماسکو کا امکان بالکل ہی ختم ہو گیا اور تیسرا مقصد یہ پورا ہوا کہ پاکستان اتحاد اسلامی اور اسلامی بلاک کی آڑ لے کر قطعی طور پر اینگلو۔امریکی بلاک سے وابستہ ہو گیا جبکہ ہندوستان تبت میں اشتراکی چین کے ساتھ اپنے تضاد کے باوجود اپنے لئے تیسرا غیر جانبدارانہ راستہ ہموار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ امریکہ اور برطانیہ نے پاکستان اور عالم اسلام کے ساتھ کبھی کوئی بھلائی نہیں کی تھی اور سوویت یونین نے تقسیم فلسطین کے بارے میں اقوام متحدہ میں امریکہ کے ساتھ ووٹ دینے کے سوا عالم اسلام کے ساتھ کبھی کوئی برائی نہیں کی تھی لیکن اس کے باوجود پاکستان میں اسلام کے اجارہ دار اپنے ملک کی تقدیر کو اینگلو۔امریکی بلاک کے ساتھ نتھی کرنے پر مصر تھے۔ وزیر خزانہ غلام محمد کا عملاً اسلام سے کوئی تعلق نہیں تھا اور وہ 48-1947ء میں سیکولر نظام حکومت کا علمبردار تھا لیکن اب اس نے اپنے برطانوی اور امریکی آقاؤں کے مفاد کی خاطر یکا یک ''حضرت مولانا غلام محمد لاہوری'' کا لبادہ اوڑھ لیا تھا اور اب وہ اسلامی نظام، اسلام کی نشاۃ ثانیہ، اتحاد اسلامی، پان اسلام ازم اور اسلامک انٹرنیشنل کا عظیم مبلغ بن گیا تھا۔

پشاور کے اس اعلان سے پاکستان کے اندر اور باہر عمومی طور پر یہ تاثر پیدا ہوا تھا کہ لیاقت علی خان کو دورہ امریکہ کی دعوت محض وزن بیت ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ پاکستان اور روس کے درمیان دوستانہ مراسم کے قیام کا امکان ختم ہو جائے۔ پاکستان کے اندر یہ تاثر اس قدر وسیع پیمانے پر تھا کہ 12 دسمبر کو امریکی ناظم الامور نے لاہور میں اس کی تردید کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ اس نے ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''لیاقت علی خان کے نام امریکہ کے دعوت نامہ کی حیثیت اس دعوت نامے کے خلاف جوابی اقدام کی نہیں ہے جو وزیر اعظم پاکستان کو روس سے موصول ہوا تھا۔ حکومت امریکہ کافی عرصہ سے پاکستان کے وزیر اعظم کو دعوت دینے کی تجویز پر غور کر رہی تھی۔ ایسی تجویز کو ٹھوس شکل اختیار کرنے میں وقت لگتا ہے۔ یہ دعوت

اس سے پہلے نہیں بھیجی جا سکتی تھی۔ اس نے بتایا کہ صدر ٹرومین کے ایشیا کے لئے چار نکاتی پروگرام کا مقصد یہ ہے کہ پسماندہ ممالک کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل بنایا جائے۔ اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ان ممالک کے لوگوں پر زبردستی کر کے ان کی جیبیں ڈالروں سے بھر دی جائیں۔ پاکستان اول الذکر مقصد کے تحت جو کچھ مانگے گا وہ اسے مہیا کیا جائے گا۔ یہ امداد نہ صرف پاکستان کے لئے فائدہ مند ہوگی بلکہ امریکہ بھی تجارتی لحاظ سے اس سے بہت فائدہ اٹھائے گا۔''[22]

تاہم لندن کے سیاسی حلقوں کو امریکی ناظم الامور کے اس بیان سے اتفاق نہیں تھا۔ لاہور کے اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ کی اطلاع کے مطابق ''وہاں لیاقت علی خان کی دورہ امریکہ کی دعوت کی قبولیت سے یہ سوال اٹھ کھڑا ہوا تھا کہ اب اس کے دورہ ماسکو کا منصوبہ پورا ہوگا یا نہیں؟ سٹالن نے گزشتہ جون میں لیاقت کو جو دعوت نامہ دیا تھا نہ تو اس میں اور نہ ہی اس دعوت کی قبولیت کے خط میں کوئی تاریخ مقرر کی گئی تھی۔ اگرچہ مسلسل افواہیں یہ تھیں یہ دورہ نومبر میں ہو گا لیکن پاکستان کے سرکاری حلقے ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ اس دورہ کی کوئی تاریخ مقرر نہیں ہوئی۔ مبصرین کی رائے یہ ہے کہ دورہ ماسکو کے بارے میں کراچی سے سرکاری اعلان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس سلسلے میں کراچی اور ماسکو دونوں کے رویے میں آہستہ آہستہ تبدیلی پیدا ہوگئی ہے یہاں اس امر کی کوئی علامت نہیں ملتی کہ کراچی نے ماسکو کی یہ درخواست منظور کر لی ہے کہ بڑے پیمانے پر سفارتی مشنوں کا تبادلہ کیا جائے۔ پاکستانی سفیر اپنے ساتھ بہت معمولی عملہ لے کر روس پہنچا ہے اس سے مبصرین نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس امر کا امکان ہے کہ اب ماسکو اس بنیاد پر لیاقت علی خان کے دورہ ماسکو کے بارے میں مزید بات چیت پر آمادہ نہیں ہوگا۔ ایک برطانوی اخبار نے تو اپنے دہلی کے نامہ نگار کے حوالے سے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ پاکستان کی روس کے ساتھ اٹھکیلیاں اب ختم ہوگئی ہیں اور ماسکو کی دعوت بار آور نہیں ہوگی۔''[23] سول اینڈ ملٹری گزٹ کی لندن کی یہ اطلاع صحیح تھی۔ اب ماسکو کو لیاقت علی خان کے دورے میں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی اور نہ ہی حکومت پاکستان میں ظفر اللہ خان اور غلام محمد وغیرہ کو روس سے مراسم بڑھانے میں کوئی دلچسپی تھی اس لئے اب لیاقت کے دورہ ماسکو کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگرچہ ''سول'' کی اسی خبر کے آخر میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی تھی کہ ''چونکہ لیاقت علی خان کے پاس ماسکو اور واشنگٹن دونوں ہی کے دعوت نامے ہیں اس لئے اس کی سوداکاری کی پوزیشن

بہت مضبوط ہے۔ جب اس کے پاس صرف ماسکو کا دعوت نامہ تھا اس وقت اس کی پوزیشن اتنی مضبوط نہیں تھی۔'' تاہم نیویارک ٹائمز نے 13 ردسمبر کو لیاقت علی خان کے دورہ امریکہ کے اعلان کے بارے میں جو ادارتی تبصرہ کیا اس میں وزیر اعظم پاکستان کی امریکہ یاترا کو کوئی خاص سیاسی اہمیت نہیں دی گئی تھی۔ اس نے صرف یہ لکھا تھا کہ ''اس قسم کے دورے سودمند ہوتے ہیں کیونکہ اس طرح ہمیں دوست بنانے اور دوستی قائم رکھنے کا موقع ملتا ہے۔ حال ہی میں ہندوستان کا وزیر اعظم پنڈت نہرو امریکہ آیا تھا تو اس کا دورہ ہر لحاظ سے اچھا رہا تھا کیونکہ وہ ہم کو بہتر طور پر جاننا چاہتا تھا اور ہم اسے بہتر طور پر جاننا چاہتے تھے۔ پاکستان کے وزیر اعظم کے بارے میں بھی یہی بات صحیح ہے۔ ہم اس کے اور اس کے ملک کے بارے میں کچھ زیادہ جاننا چاہتے ہیں۔''[24]

گویا نیویارک ٹائمز کی اطلاع کے مطابق لیاقت کا مجوزہ دورہ محض جان پہچان کے لئے تھا۔ اس دورے کی دعوت کا مطلب یہ نہیں تھا کہ امریکہ پاکستان کو کوئی مالی یا فوجی امداد دینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ حالانکہ لندن کے ڈیلی ٹیلیگراف میں لیفٹیننٹ جنرل ایم۔ بی۔ مارٹن اور مانچسٹر گارڈین میں کمانڈر سٹیفن کنگ ہال نے ان ہی دنوں اپنے مضامین میں اس موقف پر بہت زور دیا تھا کہ پاکستان مشرق وسطیٰ میں سوویت کمیونزم کے سدباب کے لئے بہت جنگی اہمیت کا حامل ہے۔

کولمبو میں دولت مشترکہ وزرائے خارجہ کانفرنس......کولمبو پلان کے تحت خطے میں کمیونزم کی روک تھام کے لئے برطانوی امداد

9 رجنوری 1950ء کو کولمبو میں دولت مشترکہ ممالک کے وزرائے خارجہ کی کانفرنس ہوئی تو اس میں پاکستانی مندوب وزیر خزانہ غلام محمد کی کارگزاری سے ایک مرتبہ اور ظاہر ہو گیا کہ پاکستان کے بعض حلقوں نے جون 1949ء کے بعد آزاد خارجہ پالیسی اپنانے کا جو تاثر دیا تھا وہ سراسر بے بنیاد تھا۔ پاکستان کی اینگلو۔امریکی سامراج سے وابستگی غیر متزلزل اور غیر مشروط تھی جبکہ ہندوستان کی ہر معاملے میں روش جداگانہ اور آزادانہ تھی۔ اس کانفرنس کے چھ نکاتی ایجنڈے میں یورپ کی سیاسی صورتحال، جنوب مشرقی ایشیا کی معاشرتی ترقی، جنوب مشرقی ایشیا میں کمیونزم کے سدباب، جاپان کے ساتھ معاہدۂ امن، چین میں کمیونسٹ انقلاب کے نتیجے میں پیدا شدہ صورتحال اور جنوب مشرقی ایشیا کے دفاع کے مسائل شامل تھے۔ اس کانفرنس سے ایک دن پہلے

8 رجنوری کو سوویت یونین کے اخبار پراودا کا تبصرہ یہ تھا کہ ’’کولمبو کانفرنس میں ایک یہ مسئلہ بھی زیر غور آئے گا کہ برطانوی دولت مشترکہ کے ممالک پر سے امریکہ کے اقتصادی دباؤ کو بڑھنے سے کس طرح روکا جائے۔‘‘ اس اخبار کی رائے یہ تھی کہ ’’سرمایہ دار ممالک کے حکمران طبقوں کو جو نفرت ان ممالک سے ہے جو اس وقت سوشلزم کی طرف بڑھ رہے ہیں وہ نفرت بھی ان کے باہمی گہرے داخلی اختلافات کو دور کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اس کانفرنس کا یقینی طور پر ایک رجحان یہ بھی ہوگا کہ ایشیا میں قومی آزادی کی تحریک کے خلاف جنگ کو تیز کر دیا جائے۔‘‘[25] پراودا کا یہ تبصرہ بے بنیاد نہیں تھا۔ امریکہ نے مشرق وسطیٰ میں برطانوی مفادات پر کاری ضرب لگانے کے بعد اب برصغیر پاک و ہند اور جنوب مشرقی ایشیا کی طرف رخ کیا تھا۔

برطانیہ کی کوشش یہ تھی کہ اس دولت مشترکہ کانفرنس میں کوئی ایسا منصوبہ بنایا جائے کہ امریکہ، برطانیہ کے اس وسیع و عریض حلقہ اثر میں کوئی مؤثر مداخلت نہ کر سکے۔ چنانچہ 14 رجنوری کو جب یہ کانفرنس ختم ہوئی تو یہ اعلان ہوا کہ کانفرنس نے جنوب مشرقی ایشیا میں کمیونزم کے سدباب کے لئے ایک امدادی منصوبہ بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس منصوبے کے بعد اس علاقہ کے ممالک کی مالی اور ٹیکنیکل امداد کی جائے گی تاکہ ان کے عوام کا معاشی معیار زندگی بلند ہو اور وہ محض اپنی غربت کے باعث کمیونزم کا اثر قبول نہ کریں۔ یہ منصوبہ دراصل ایشیا کے بارے میں امریکی صدر ٹرومین کے چار نکاتی پروگرام کا جواب تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ جنوبی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا کے جو ممالک اقتصادی طور پر برطانیہ کے حلقہ اثر میں ہیں وہ نہ صرف طبقاتی انقلاب سے بلکہ امریکہ کی دستبرد سے بھی محفوظ رہیں۔

برطانوی اخبارات کی خبروں کے مطابق ہندوستان کے وزیراعظم نہرو نے اس کانفرنس کے دوران یہ رویہ اختیار کیا کہ چین میں ماؤزے تنگ کی حکومت سے دوستانہ تعلقات قائم ہونے چاہئیں۔ اگر غیر کمیونسٹ ممالک نے اشتراکی چین سے کوئی تعلق نہ رکھا تو وہ مزید سوویت یونین کی گود میں چلا جائے گا۔ نہرو نے ہندچینی میں باؤدائی کی حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کیا اور امریکہ کو مشورہ دیا کہ وہ جاپان سے اپنی فوجیں نکال لے۔ کیونکہ اس کی رائے یہ تھی کہ اگر جاپان پر فوجی قبضہ جاری رہا تو اس امر کا امکان ہے کہ 8 کروڑ جاپانی کمیونزم کی طرف مائل ہو جائیں گے۔ لیکن پاکستان کے وزیر خزانہ غلام محمد کو ان بین الاقوامی مسائل میں کوئی خاص دلچسپی

نہیں تھی البتہ وہ ہند چینی میں فرانسیسی سامراج کے پٹھو باؤدائی کی حکومت کو جسے امریکہ کی پشت پناہی حاصل ہو چکی تھی، تسلیم کرنے کے حق میں تھا اور اس کی کولمبو میں مقیم پاکستانی مسلمانوں کو نصیحت یہ تھی کہ وہ انسانی مساوات کے بارے میں اسلام کی عالمگیر تعلیمات کو فراموش نہ کریں۔

مشرق وسطیٰ میں برطانوی اور امریکی غلبہ مستحکم کرنے کے مختلف منصوبے

وزیر خزانہ غلام محمد برطانیہ کی کولمبو میں منعقد کردہ دولت مشترکہ کانفرنس سے واپس آیا تو اس کے چند دن بعد امریکی اخبار کرسچین سائنس مانیٹر کی یہ خبر موصول ہوئی کہ واشنگٹن کی رائے میں پاکستان کی اقتصادی پالیسی امریکی نظریات سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے اس لئے اس ملک کی اقتصادی ترقی کے امکانات روشن ہیں اور اسے ہندوستان کے مقابلے میں امریکی امداد ملنے کا بھی زیادہ امکان ہے۔ تنازعہ کشمیر کی وجہ سے پاکستان کو فوجی امداد بہت مہنگی پڑے گی۔ کرسچین سائنس مانیٹر کے نامہ نگار نے یہ خبر جاپان سے لے کر ترکی تک کے علاقے کو گرفت میں رکھنے کے بارے میں امریکہ کے ایک جامع منصوبہ پر تبصرہ کرتے ہوئے دی تھی۔ اس کی مزید اطلاع یہ تھی کہ ترکی اور ایران کو امریکہ سے مالی اور فوجی امداد ملتی رہے گی کیونکہ ایشیا میں روس کی سامراجی پالیسی کے سدباب کے لئے ایسا کرنا ضروری ہے۔[26] 23 رجنوری کو امریکہ کے محکمہ خارجہ نے مشرق وسطیٰ میں اپنے سفیروں کو یہ ہدایت کی کہ وہ شام اور عراق کے الحاق کی تجویز کے بارے میں عرب ممالک اور اسرائیل کو کوئی دلچسپی نہ لینے کا مشورہ دیں۔[27] ان دنوں عراق میں شام کے ساتھ الحاق کی تحریک زوروں پر تھی جبکہ شام میں شدومد سے اس کی مخالفت کی جارہی تھی۔ دونوں ملکوں کے درمیان اس نئی کشمکش کا آغاز دسمبر کے تیسرے ہفتے میں ہوا تھا جبکہ شام میں امریکہ نواز عناصر نے تیسرا فوجی انقلاب برپا کر کے برطانیہ کی کٹھ پتلی حکومت کا تختہ الٹ دیا تھا اور اس طرح برطانیہ کا وہ منصوبہ خاک میں مل گیا تھا جو اس نے اردن، عراق اور شام کی فیڈریشن یا عظیم تر شام کے قیام کے لئے بنایا ہوا تھا لیکن اب امریکہ نے اپنے مدبروں کو اس سلسلے میں جو ہدایت کی تھی اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر مشرق وسطیٰ میں سوویت مخالف فوجی گٹھ جوڑ کے لئے راہ ہموار کرنے کی خاطر عراق وشام میں یونین ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ہوگا۔ پاکستان ٹائمز کا خیال تھا کہ ''برطانیہ نے اپنے منصوبے کی تکمیل کے لئے غالباً امریکہ کی قیادت قبول کر لی ہے۔''[28]

25 رجنوری کو لندن کے اخبار نیوز کرونیکل (News Chronicle) کے نامہ نگار کی اطلاع یہ تھی کہ مشرق وسطیٰ کی برطانوی ہوائی فوج پر تین ذمہ داریاں پڑی ہوئی ہیں۔ ایک برطانیہ کے تحفظ کی ذمہ داری، دوسری دولت مشترکہ کے بحری راستوں کے تحفظ کی ذمہ داری اور تیسری مشرق وسطیٰ کے تحفظ کی ذمہ داری۔ بظاہر تیسری ذمہ داری کے تقاضے کے تحت برطانیہ کی ہوائی فوج نے چند دن قبل سعودی عرب اور یمن کے درمیان جنگ میں سعودی عرب کے حلیف کی حیثیت سے حصہ لیا تھا اور اس کے نتیجے میں اس نے یمن کا خاص علاقہ خلیج فارس سے متصلہ اپنے مقبوضہ علاقہ میں شامل کر لیا تھا۔ اس پر ایک روسی مبصر کا تبصرہ یہ تھا کہ ''برطانیہ نے یہ کاروائی اس لئے کی ہے کہ اس علاقے میں تیل نکلنے کا امکان ہے اور یہ سٹریٹیجک پوزیشن کا حامل ہے۔ چونکہ امریکہ برطانیہ کو مشرق وسطیٰ میں اس کے پرانے اڈوں سے نکال رہا ہے اس لئے برطانیہ نے اس علاقے میں امریکہ کی آمد سے پہلے اس پر جلدی قبضہ جما لیا ہے۔ چونکہ یمن کو عرب ممالک کی حمایت حاصل نہیں ہے اس لئے اس نے برطانیہ کی اس جارحیت کے خلاف اقوام متحدہ سے کوئی شکایت نہیں کی۔''[29]

راجہ غضنفر علی اور سر آغا خان کا موقف کہ اگرچہ دنیا بھر کے مسلمانوں کو ایک مملکت میں ضم ہو جانا چاہیے لیکن ابھی اس کا وقت نہیں آیا

ان خبروں کے پس منظر کے ساتھ ایران میں پاکستان کا سفیر راجہ غضنفر علی خان جنوری کے اواخر میں کراچی پہنچا تو اس نے 2 رفروری کو ایک پریس کانفرنس میں یہ خبر سنائی کہ ''میں نے مشرق وسطیٰ کے جن ممالک کا دورہ کیا ہے ان کے عوام کا خیال یہ ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ دنیا کے سارے مسلمان ''بطور ایک قوم'' متحد ہو جائیں۔ ایک مثالی اسلامی مملکت کے بارے میں مشرق وسطیٰ کے با اثر مسلم علما کا تصور یہ ہے کہ سارے مسلمانوں کی ایک مملکت ہونی چاہیے۔ اس نظریے کی عوامی حمایت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے تاہم علما کا یہ بھی خیال ہے کہ یہ نصب العین فی الفور پورا نہیں ہو سکتا اس لئے وہ مسلمانوں کی ایک مرکزی تنظیم کے قیام کی وکالت کرتے ہیں تا کہ مسلمان ایک جگہ بیٹھ کر اپنے مشترکہ مسائل کے بارے میں بات چیت کر سکیں۔ مشرق وسطیٰ کے عوام ایک مثالی اسلامی مملکت کے فوری قیام کے حق میں نہیں ہیں اور اوپر سے کوئی چیز ان پر

ٹھونسنی نہیں چاہیے۔ وہ چاہتے ہیں یہ اندر سے ظہور میں آئے۔''[30] راجہ غضنفر علی خان شیعوں کے اثنا عشریہ فرقہ سے تعلق رکھتا تھا اور اسے ایران اور عراق میں بطور سفیر قیام کے دوران اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ مشرق وسطیٰ کے ممالک کے فرمانرواؤں اور ان ممالک کے عوام کے درمیان بے شمار نسلی، لسانی، تاریخی، جغرافیائی، ثقافتی، سیاسی اور قبائلی مخالفانہ تضاد موجود تھے۔ ان میں کوئی چیز بھی مشترکہ نہیں تھی حتیٰ کہ ان کے مذہبی اعتقاد بھی مختلف النوع تھے۔ عرب ممالک میں سیکولر عرب نیشنلزم اور سامراج دشمنی کی لہر آندھی کی طرح چل رہی تھی۔ ترکی کے حکمران اور بیشتر عوام کھلم کھلا عربوں اور مذہب اسلام سے بیزاری کا اظہار کرتے تھے اور ایران کا بادشاہ اور اس ملک کے عوام عربوں کے ساتھ کسی معاملے میں بھی اشتراک عمل کا تصور بھی نہیں کرتے تھے۔ مزید برآں سارے مشرق وسطیٰ میں امریکہ اور برطانیہ کے درمیان سامراجی کشمکش ان ممالک کے سرکاری یا غیر سرکاری اتحاد کے راستے میں حائل تھی لیکن ان تلخ حقائق کے باوجود راجہ غضنفر علی خان پاکستان میں پان اسلام ازم کا علمبردار تھا کیونکہ یہ ایک ایسا نعرہ تھا کہ جس سے پاکستانی عوام کی توجہ ان کے اصلی داخلی اور خارجی مسائل سے ہٹائی جا سکتی تھی۔

غضنفر علی خان کی طرح شیعوں کے اسماعیلیہ فرقہ کا سربراہ آغا خان بھی اسی مقصد کے تحت پان اسلام ازم کا حامی تھا۔ چنانچہ اس کا 2 رفروری کو کراچی میں بیان یہ تھا کہ ''میں اپنی ساری زندگی ''پان اسلامی'' رہا ہوں لیکن میرا خیال یہ ہے کہ ایسا اسلامستان جس میں مختلف مملکتیں اپنی آزادانہ حیثیت کھو بیٹھیں مہلک ثابت ہوگا۔ میری رائے میں اسلامستان برطانوی دولت مشترکہ کی طرح کا ہونا چاہیے یعنی اس میں نرمی اور لچک ہو۔ اگر ان ممالک کو اسلامستان میں باندھ دیا گیا تو ایسا اسلامستان ٹوٹ جائے گا۔ ان ممالک کا سیاسی اتحاد قائم نہیں رہ سکتا۔ اسلامستان کی بنیاد ثقافتی و مذہبی اتحاد پر ہونی چاہیے۔ میرا اسلامستان کا تصور یہ ہے کہ ان اقوام کے درمیان جو ثقافتی اور مذہبی رشتوں میں منسلک ہوں، آزادانہ تعاون ہو۔ بے لچک آئین نے اقوام متحدہ کے مستقبل کو تباہ کر دیا۔ اس نے کہا کہ جہاں تک مشرق اور مغرب کے درمیان کشمکش کا تعلق ہے اس سلسلے میں میرا اسلامی اقوام کو مشورہ یہ ہے کہ غیر جانبدار رہیے لیکن اس کے ساتھ ہی کسی حملے کو پسپا کرنے کے لئے بھی تیار رہیے۔''[31] آغا خان بہت تجربہ کار سیاستدان تھا۔ اگرچہ برصغیر کے بیشتر مذہبی پیشوا اسے اور اس کے فرقہ کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دیتے تھے تاہم اس نے بیسویں

صدی کے اوائل سے تاریخ کے ہر اہم مرحلہ پر ہندوستانی مسلمانوں کی اس طرح رہنمائی کی تھی کہ ان کا انگریزوں کے ساتھ کوئی تصادم نہ ہو اور ان کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی حقوق کو بھی تحفظ و فروغ ملے۔ اس نے بیک وقت انگریزوں اور برصغیر کے مسلمانوں کی سیاسی خدمات بڑی خوبی سے ادا کی تھیں۔ وہ شیعوں کے جس کاروباری فرقہ کا سربراہ تھا وہ کالعدم برطانوی سلطنت کے تقریباً سارے ممالک میں بکھرا ہوا تھا چنانچہ اس فرقہ کے کاروباری مفاد کا تقاضا یہ تھا کہ وہ پان اسلام ازم کے بارے میں کوئی ایسی بات نہ کرے جو کسی مسلم ملک کے حکمران یا عوام کے لئے پسندیدہ نہ ہو لیکن اس کے ساتھ ہی وہ انگریزوں کے اس منصوبہ کی بھی حمایت کرنا چاہتا تھا کہ مشرق وسطیٰ کے ممالک اپنی زیر سرپرستی یکجا کر کے انہیں نہ صرف کمیونسٹوں کے انقلاب بلکہ امریکیوں کی سامراجی دسترس سے بھی محفوظ رکھا جائے۔ برطانیہ نے اپنی کالعدم سلطنت کے ممالک کی دولت مشترکہ اسی مقصد کے تحت بنائی تھی اور آغا خان کا خیال تھا کہ اسی دولت مشترکہ کے نمونے پر مشرق وسطیٰ کے اسلامی ممالک کو بھی انگریزوں کے زیر سایہ یکجا کیا جا سکتا ہے لیکن وہ اپنی اس جنس کو اس طرح بیچنا چاہتا تھا کہ کوئی گاہک ناخوش نہ ہو۔ پاکستان میں پان اسلام ازم کی اشتہار بازی اس کے کاروباری فرقے کے لئے بہت منافع بخش تھی۔

7 رفروری 1950ء کو پاکستان میں ترک سفیر نے لاہور میں ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے ہر نوع کے پاکستانی پان اسلام ازم یا اسلامستان کے غبارے میں سے ہوا نکال دی۔ اس نے کہا کہ ''ترکی ایک جمہوری، قومی اور سیکولر سٹیٹ ہے۔ جس میں مذہب کو انسان اور اس کے خالق کے درمیان ایک نجی معاملہ تصور کیا جاتا ہے۔ چودھری خلیق الزماں کا اسلامستان قابل عمل نہیں ہے۔ اگرچہ ہمیں مختلف ممالک کی علاقائی فیڈریشن پر کوئی اعتراض نہیں۔''[32]
8 رفروری کو آغا خان نے کراچی میں انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل افیئرز کے زیر اہتمام ایک اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے اس مسئلہ کا پھر ذکر کیا اور یہ رائے ظاہر کی کہ فی الحال مسلم ممالک کی سیاسی کنفیڈریشن ممکن نہیں ہے تاہم اس نے امید ظاہر کی کہ پاکستان مسلم دنیا میں ذہنی و روحانی اتحاد قائم کرے گا۔ اس نے کہا کہ افرادی قوت، وسائل، جغرافیائی پوزیشن اور جذباتی امنگوں کے معاملے میں عوام کے بنیادی اتحاد کے باعث پاکستان کے پاس وہ سب کچھ ہے جو مسلم دنیا نے تقریباً دو سو سال قبل گنوا دیا تھا۔[33]

چین اور سوویت یونین کا 30 سالہ معاہدۂ دوستی اور انگریزوں اور امریکیوں کے نزدیک پاکستان کی جغرافیائی اور فوجی اہمیت میں اضافہ...... پاک فوج کی تعریفیں

پاکستان کی افرادی قوت کی عمدگی کی تعریف صرف آغا خان تک ہی محدود نہیں تھی۔ ان دنوں پاکستان کی تینوں مسلح افواج کے سربراہ انگریز ہی تھے۔ بری فوج کا کمانڈر انچیف جنرل گریسی تھا۔ آغا خان کی اس تقریر سے چند ہفتے پہلے ہندوستان کا سابق وائسرائے لارڈ ویول اٹاوہ میں پاکستان کی جغرافیائی اہمیت اور اس کی افرادی قوت کی عمدگی کا ذکر کر چکا تھا اور اس تقریر سے دو چار دن بعد صوبہ سرحد کا سابق گورنر رابرٹ لوکہارٹ (Robert Lockhart) لندن میں پاکستان کی بری افواج کے لئے رطب اللسان تھا۔ اس نے جنوری 1950ء میں پاکستان کا دورہ کیا تھا اور فروری کے اوائل میں لندن واپسی پر اس کا بیان یہ تھا کہ ''میں نے کسی بھی فوج کے جوانوں کو اتنا چاق و چوبند، اتنا تنومند اور اتنا خوش نہیں دیکھا۔ بلاشبہ اس فوج کے سارے درجوں کے ارکان کے حوصلے بہت بلند ہیں۔ ان کے طعام خانوں میں پرانی ٹرافیوں کو اونچا مقام دیا ہوا ہے اور ان کی تقریبی پریڈ اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہے۔ انہیں دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ ماضی کی روایات محفوظ ہاتھوں میں ہیں۔ اس نے کہا کہ ایک سو برس تک پنجاب فرنٹیئر فورس کے یونٹوں نے امن دشمنوں کے خلاف جنگ میں تعاون کر کے اپنی فوجی مہارت کا اعلیٰ معیار پیش کیا ہے مجھے یقین ہے کہ وہ آئندہ بھی ایسا ہی کریں گے۔''[34] گویا اس سابق انگریز افسر کو یقین تھا کہ پاکستانی فوج حسب سابق انگریزوں کی وفاداری کی روایات کو برقرار رکھے گی اور اس کے خلاف جنگ کی صورت میں پھر داد شجاعت دے گی۔ 8 رفروری کو برطانوی بحریہ کا جنگی جہاز ہفتہ عشرہ کے لئے کراچی میں لنگر انداز ہوا تو اس جہاز کا کپتان وائس ایڈمرل وڈ ہاؤس (Woodhouse) بھی سر رابرٹ لوکہارٹ کی طرح پاکستان کی بری فوج کی عمدگی کا مظاہرہ دیکھنے کے لئے پشاور گیا۔ ڈان کی 15 رفروری کی رپورٹ کے مطابق ایک انگریز مبصر پی۔ آر۔ جے۔ ایونز (P.R.J.Evans) نے ان ہی دنوں ایک مضمون میں یہ رائے ظاہر کی تھی کہ پاکستان کے قریبی تعلقات کی وجہ سے برطانیہ کو عالم اسلام میں باعزت مقام ملے گا اور برطانیہ کی رہنمائی میں پاکستان کمیونسٹ توسیع

پسندی کے خلاف ایک بڑے قلعے کی حیثیت اختیار کرے گا۔

انگریزوں کی جانب سے پاکستان کی جغرافیائی پوزیشن اور اس کی افرادی قوت کی عمدگی کے اس قدر بھرپور احساس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اشتراکی چین کا سربراہ ماؤزے تنگ 16ردسمبر 1949ء سے ماسکو میں تھا اور مغربی دنیا کے مبصرین کی قیاس آرائی یہ تھی کہ سٹالن اور ماؤزے تنگ ایشیا میں اشتراکی انقلاب کا کوئی منصوبہ بنا رہے ہیں۔ اس قیاس کی بنا پر امریکہ اور برطانیہ نہ صرف مشرق وسطیٰ میں بلکہ بحرالکاہل کے علاقے میں بھی مغرب نواز ایشیائی ممالک کے فوجی گٹھ جوڑ کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ 15رفروری کو جب ماسکو ریڈیو سے اعلان ہوا کہ سوویت یونین اور عوامی جمہوریہ چین کے درمیان دوستی کا 30 سالہ معاہدہ ہوا ہے تو مغربی دنیا میں بڑی ہلچل مچی کیونکہ اس معاہدے کا مطلب یہ تھا کہ دنیا کی ایک چوتھائی سے زیادہ آبادی اشتراکیت کے حق میں متحد و منظم ہوگئی ہے۔ چنانچہ اسی دن امریکہ کے وزیر خارجہ ڈین اچی سن کا بیان یہ تھا کہ ''بحرالکاہل کے علاقے میں ایشیائی ممالک کے درمیان فوجی معاہدے کی تحریک کے بارے میں امریکہ کا رویہ ہمدردانہ ہوگا۔'' اس نے بتایا کہ فلپائن کا صدر کورینو (Quirino) اس قسم کے معاہدے کے لئے بات چیت کر رہا ہے۔ اس نے بتایا کہ ''اس سلسلے میں مجھ سے کئی مرتبہ رابطہ پیدا کیا گیا ہے اور میں نے ہر مرتبہ یہی جواب دیا ہے۔''[35] حکومت برطانیہ نے روس اور چین کے درمیان اس قسم کے معاہدے کی پیش بینی کر کے ہی جنوری 1950ء میں کولمبو میں دولت مشترکہ کے ممالک کے وزرائے خارجہ کی کانفرنس منعقد کی تھی اور حکومت امریکہ نے فروری میں بنکاک میں فارایسٹ ڈپلومیٹک کانفرنس کی تھی۔ اس کانفرنس کی صدارت ایک سینیئر سفارت کار ڈاکٹر فلپ جیسپ (Phillip Jessap) نے کی تھی اور کانفرنس سے واپسی پر 17رفروری کو اس نے مدراس میں بتایا تھا کہ جنوب مشرقی ایشیا میں کمیونزم کا خطرہ حقیقی ہے کیونکہ اس علاقے کی سرحد پر چین کی ایک طاقتور اشتراکی حکومت موجود ہے۔[36]

پاکستان کے ایران اور عراق کے ساتھ دوستی کے دوطرفہ معاہدے

چونکہ اس قسم کا خطرہ سوویت یونین کی جانب سے خلیج فارس کے علاقہ کو بھی لاحق تھا اس لئے شاہ ایران 3رجنوری 1950ء کو امریکہ کے چھ ہفتے کے دورہ سے واپس ہوا تو اس کے فوراً ہی

بعد پاکستان اور ایران کے درمیان دوستی کے معاہدے کی بات چیت شروع ہوئی۔ جس کے نتیجے میں 18رفروری کو یہ معاہدہ تکمیل پایا۔ ایرانی وزیر خارجہ نے اس معاہدے پر دستخط کرنے کی تقریب کو تاریخی اہمیت کا واقعہ قرار دیا اور یہ امید ظاہر کی کہ یہ معاہدہ دونوں ممالک کے درمیان ''زیادہ قریبی روابط'' کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔[37] اس تقریب سے تقریباً دو ہفتے پہلے کراچی سے اعلان ہو چکا تھا کہ شہنشاہ ایران یکم مارچ سے پاکستان کا دس بارہ دن کا دورہ کرے گا۔ تہران کے اخبار ستارہ کا اس معاہدے پر تبصرہ یہ تھا کہ'' آج کل کی دنیا کے حالات کا تقاضا یہ ہے کہ ان مختلف ممالک کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم ہوں جو ایک دوسرے کے ہمسایہ ہیں اور جو عظیم مشترکہ ورثہ کے حامل ہیں۔ جہاں تک مذہب، ثقافت اور زبان کا تعلق ہے، مسلم اقوام کے لئے لازمی ہے کہ وہ اتحاد کے بنیادی اصول یعنی اسلام پر عمل پیرا ہوں۔ کلمہ کی بنیاد پر استوار شدہ اتحاد اور مسلمانوں کی متحدہ مساعی سے وہ ترقی و خوشحالی کی منزل پر پہنچ جائیں گے۔ ایران اور پاکستان دونوں ہی مشرقی اسلامی ممالک میں ممتاز اور اہم پوزیشن رکھتے ہیں اور وہ اپنی دوستی و مصالحت سے خلوص اور سچائی کی نیک مثال قائم کر سکتے ہیں اور اس امر کا امکان ہے کہ یہ مزید ہمہ گیر دوستانہ تعلقات کی استواری کا باعث بنے۔''[38]

26رفروری کو بغداد میں اخبار ستارہ کے اس مشورے پر عمل ہوا جبکہ پاکستان اور عراق کے درمیان ایک معاہدہ دوستی طے پایا۔ عراق برطانیہ کا ایک طفیلی ملک تھا۔ اس ملک کے ارباب اختیار برطانیہ کی تحریک پر گزشتہ دو اڑھائی سال سے عرب فیڈریشن یا عظیم تر شام کے قیام کے لئے کوشاں رہے تھے۔ اگرچہ جنوری 1950ء میں امریکہ نے بھی اس تحریک کی تائید کر دی تھی مگر یہ بیل منڈھے نہیں چڑھ پائی تھی۔ اس لئے فروری کے اوائل میں بغداد میں نئی کابینہ کی تشکیل ہوئی تھی۔ پاکستان کے پہلے ایران کے ساتھ اور پھر عراق کے ساتھ دوستی کے دوطرفہ معاہدوں کا مطلب یہ تھا کہ اب اینگلو۔ امریکی سامراج مشرق وسطیٰ میں اتحاد اسلامی کا نصب العین منزل بہ منزل پورا کروانا چاہتا تھا۔ برطانیہ کے پہلے ہی مشرق وسطیٰ کے تقریباً سارے ممالک کے ساتھ دو طرفہ معاہدے تھے اور اب فروری 1950ء میں امریکہ نے بھی یہی پالیسی اپنا لی تھی چنانچہ 15رفروری 1950ء کو قاہرہ سے خبر یہ تھی کہ حکومت امریکہ نے مشرق قریب میں اپنے نمائندوں کو ہدایت کی ہے کہ وہ مشرق قریب اور عرب ممالک کے ساتھ اسی طرح دوطرفہ معاہدے کریں جیسا

معاہدہ حال ہی میں لبنان اور امریکہ کے درمیان ہوا ہے۔ لبنان اور امریکہ کے معاہدے میں لبنان پر کوئی فوجی اور سیاسی ذمہ داری عائد نہیں کی گئی تھی اور نہ ہی لبنان پر یہ پابندی عائد کی گئی تھی کہ عرب لیگ کی جانب سے اس پر جو ذمہ داریاں عائد ہوئی ہیں انہیں پورا نہ کرے۔ مزید برآں لبنان کو یہ بھی ممانعت نہیں کی گئی تھی کہ وہ دوسری بڑی طاقتوں سے اس قسم کے معاہدے نہ کرے۔[39]

شاہ ایران اور امریکہ کے خصوصی ایلچی کا دورۂ پاکستان، عالمی امن میں ایران اور پاکستان کی سٹریٹیجک پوزیشن اور امریکی امداد کی باتیں

یکم مارچ 1950ء کو شاہ ایران پاکستان کے دس بارہ دن کے دورہ پر کراچی پہنچا۔ اس دن حکومت امریکہ کا خصوصی سفارتی نمائندہ ڈاکٹر فلپ جیسپ بھی کراچی میں ہی تھا اور اس کا 28 رفروری کو بیان یہ تھا کہ ''امریکہ ایشیائی ممالک میں فوجی معاہدوں کی تکمیل کے لئے کوئی تحریک کرنے کا خواہاں نہیں ہے لیکن ایشیائی ممالک اپنی مرضی سے از خود ایسا کوئی بندوبست کر لیں تو اسے اس میں ہمدردانہ دلچسپی ہوگی۔''[40] قبل ازیں ڈاکٹر فلپ جیسپ 23 رفروری کو نئی دہلی میں یہ کہہ چکا تھا کہ ''امریکہ جنگ نہیں چاہتا اور نہ ہی اسے جنگ کی توقع ہے لیکن جب تک ''آہنی پردے'' کے پیچھے جو کچھ ہو رہا ہے اس کے بارے میں بیرونی دنیا کو علم نہیں ہو جاتا اس وقت تک امریکہ کے لئے لازمی ہے کہ وہ اپنی ''دفاعی پوزیشن'' کو برقرار رکھے اور جارحیت کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہے۔ اس نے ان خبروں کی تردید کی تھی کہ امریکہ اپنی خارجہ پالیسی کے تحت نیپال اور کشمیر میں اپنے فوجی اڈے بنانے میں دلچسپی رکھتا ہے اور یہ کہ وہ کشمیر کے بارے میں کسی حکومت پر دباؤ ڈال رہا ہے۔[41]

ڈاکٹر فلپ جیسپ کے ان بیانات کا مطلب یہ تھا کہ امریکہ ایشیا میں سوویت یونین اور چین کے خلاف معاہدوں کے حق میں تھا لیکن وہ خود اس سلسلے میں پہل اس لئے نہیں کر رہا تھا کہ ایشیائی رائے عامہ ایسے معاہدوں کے حق میں نہیں تھی۔ بالخصوص مشرق وسطیٰ کے مختلف ممالک میں آئے دن اینگلو۔ امریکی بلاک کے خلاف پر تشدد مظاہرے ہوتے تھے۔ کشمیر میں حکومت پر یعنی حکومت ہندوستان پر دباؤ نہ ڈالنے کی یقین دہانی ڈاکٹر فلپ جیسپ نے اس لئے کرائی تھی کہ اقوام متحدہ کے کمیشن نے کثرت رائے سے یہ تجویز پیش کر رکھی تھی کہ کشمیر میں معاہدۂ جنگ کے

بارے میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جو اختلاف رائے موجود ہے اس کے تصفیہ کے لئے ثالث مقرر کیا جائے۔ حکومت ہندوستان اس تجویز کے خلاف تھی اور ڈاکٹر جیسپ اس تجویز کی اعلانیہ حمایت کر کے دہلی کے ارباب اقتدار کو خفا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ تبت اور نیپال کے بارے میں چین اور ہندوستان کے درمیان تضاد میں شدت پیدا ہو رہی تھی اور امریکہ چاہتا تھا کہ یہ شدت بڑھ کر تصادم کی صورت اختیار کر لے۔ نیپال کا وزیر اعظم اشتراکی چین کی توسیع پسندی کے مسئلہ پر اور 1923ء کے معاہدۂ دوستی و تجارت کی جگہ نئے معاہدے کے بارے میں تبادلہ خیالات کرنے کے لئے فروری 1950ء کے وسط میں ہندوستان آیا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ ہندوستان نیپال کی آزادی و خودمختاری کو تسلیم کر لے اور اس کی یہ خواہش اعلانیہ طور پر پوری کر دی گئی تھی حالانکہ اس وقت تک نیپال سوویت یونین کی عدم منظوری کی وجہ سے اقوام متحدہ کا رکن نہیں بنا تھا۔ سوویت یونین کے ذرائع ابلاغ کا اس تجویز پر تبصرہ یہ تھا کہ اینگلو۔ امریکی بلاک اس مجوزہ ثالث کے ذریعے تنازعہ کشمیر کا تصفیہ اس طرح کرائے گا کہ وہاں اسے سوویت یونین اور چین کے خلاف فوجی اڈے قائم کرنے کی سہولت مل جائے اور ہندوستان کے اخبارات کی رپورٹیں یہ تھیں کہ امریکہ اور برطانیہ حکومت ہندوستان پر دباؤ ڈال رہے ہیں کہ وہ اس تجویز کو منظور کر لے۔ ان ہندوستانی رپورٹوں کی بنیاد یہ تھی کہ 31/اگست 1949ء کو امریکہ کے صدر ٹرومین اور برطانیہ کے وزیر اعظم ایٹلی نے مشترکہ طور پر حکومت ہندوستان سے اپیل کی تھی کہ وہ اقوام متحدہ کی اس تجویز کو منظور کر کے تنازعہ کشمیر کے پر امن تصفیہ پر آمادہ ہو جائے۔ مگر ہندوستان کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے ستمبر کے اوائل میں الٰہ آباد میں ایک تقریر کے دوران اس اپیل کو مسترد کر دیا تھا۔

اقوام متحدہ کے کمیشن میں چیکو سلواکیہ کے نمائندہ ڈاکٹر اولڈ رچ چائل (Old Richchile) کی دسمبر 1949ء میں اختلافی رپورٹ یہ تھی کہ اگر جنگ بندی کے انتظامات کے بارے میں ثالث کے تقرر کی تجویز پر عمل ہوا تو اس امر کا قوی امکان ہوگا کہ ثالث پورے تنازعہ کشمیر کا ثالث بن جائے گا۔ اس کا الزام یہ تھا کہ ''ثالث کی تجویز ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کے روبرو پیش کرنے سے پہلے امریکہ اور برطانیہ کی حکومتوں کو دکھائی جا چکی تھی اور اسی لئے صدر ٹرومین اور وزیر اعظم ایٹلی نے پاکستان اور ہندوستان پر اعلانیہ مداخلت

دباؤ ڈالا تھا۔'' ڈاکٹر رچ چائل چیکوسلواکیہ میں 25 رجنوری 1948ء کو کمیونسٹ انقلاب کے ایک سال بعد، جنوری 1949ء میں جوزف کاربل (Josef Korbel) کی جگہ کشمیر کمیشن میں اپنے ملک کا نمائندہ مقرر ہوا تھا۔ اس کی یہ اقلیتی رپورٹ دراصل تنازعہ کشمیر کے بارے میں سوویت یونین کے خیالات کی ترجمانی کرتی تھی۔ سوویت ذرائع ابلاغ کئی بار یہ الزام لگا چکے تھے کہ امریکہ اور برطانیہ کشمیر کے صوبہ لداخ اور پاکستان کے صوبہ سرحد میں فوجی اڈے قائم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

یکم مارچ کی رات کو پاکستان کے گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین نے شاہ ایران کے اعزاز میں عشائیہ دیا تو شاہ نے اس موقع پر اپنی تقریر میں کہا کہ ''قرآن مجید میں حکم ہے کہ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ جہاں تک ایران اور پاکستان کا تعلق ہے خدا کے فضل سے یہ بالکل صحیح ہے۔ جیسا کہ پہلے بہت مرتبہ کہا جا چکا ہے کہ ایران پاکستان کی اعانت کے لئے اور اس کے ساتھ تعاون کے لئے جو کچھ ممکن ہو سکا کرے گا۔'' 3 رمارچ کو شاہ ایران نے کراچی کے شہریوں کے ایک استقبالیہ میں کہا کہ ''ایران اور پاکستان کے درمیان حال ہی میں دوستی کا جو معاہدہ ہوا ہے وہ دراصل دونوں ممالک کے درمیان معاشی اور سیاسی شعبوں میں مزید بہت سے معاہدوں کا پیش خیمہ ہے۔ ان معاہدوں کی بنیاد دونوں ممالک کے عوام کے درمیان باہمی پیار و محبت پر ہو گی۔'' 4 رمارچ کو شاہ ایران پنجاب اور صوبہ سرحد کے دورے پر گیا، پشاور میں دو روزہ قیام کے دوران اس نے تاریخی و جنگی اہمیت کے درہ خیبر کا معائنہ کیا۔ پھر وہ بلوچستان کا دورہ کرنے کے بعد 14 رمارچ کو واپس کراچی پہنچا۔ 15 رمارچ کو اس نے پاکستان پارلیمنٹ کے اجلاس کو خطاب کیا۔ اس کے اس خطاب سے قبل وزیر اعظم لیاقت علی خان کی استقبالیہ تقریر کا حاصل یہ تھا کہ آج کل دنیا بڑے سنگین بحران سے گزر رہی ہے یہی وجہ ہے کہ ہم چاہتے ہیں کہ سارے مسلم ممالک اپنے عوام اور دنیا کے عوام کی بھلائی کے لئے مل جل کر کام کریں۔ پاکستان امن عالم اور عام لوگوں کی حالت کو بہتر کرنے کے لئے نہ صرف مسلم ممالک سے بلکہ دوسرے ممالک سے بھی تعاون کرنے پر آمادہ ہے۔'' شاہ ایران نے اپنی جوابی تقریر میں بڑی اقوام کو تلقین کی کہ وہ چھوٹی اقوام کی امداد کریں تاکہ ان چھوٹی اقوام کی غربت اور اس غربت کے ''برے نتائج'' کا سدباب ہو سکے۔ اس نے اپنی تقریر میں اتحاد اسلامی کا تو کوئی ذکر نہ کیا البتہ یہ کہا کہ اگر مسلم ممالک اسلام کی

تعلیمات پر عمل کریں تو ان کی قومی قوت میں اضافہ ہوگا اور پھر ایک دن ایسا آئے گا کہ وہ سچائی، انصاف اور امن کے پرچم تلے خوشحالی سے ہمکنار ہوں گے اور اس طرح عالمی تہذیب میں اپنا تاریخی کردار ادا کریں گے۔" شاہ نے اسی دن ایک پریس کانفرنس کو بھی خطاب کیا، جس میں اس نے رائے ظاہر کی کہ "دنیا میں امن وامان برقرار رکھنے کے لئے اور مسلم ممالک کے بلاک کی تشکیل کے لئے مشرق وسطیٰ میں معاشی استحکام بے انتہا ضروری ہے۔ اس لحاظ سے ایران اور پاکستان دوسروں کے لئے مثال مہیا کر سکتے ہیں۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ مسلم ممالک کے درمیان دوستی بہت ضروری ہے لیکن مسلم ممالک کا نظریاتی بلاک ان ممالک کی معیشتوں میں استحکام پیدا کرنے کے بعد ہی بن سکتا ہے۔" جب شاہ سے پوچھا گیا کہ وہ امریکہ سے کسی قسم کی امداد کی توقع کرتا ہے تو اس نے کہا کہ "ایران کو امریکی امداد کا سوال عالمی امن کے بڑے سوال سے وابستہ ہے۔ چونکہ ایران سٹرٹیجک نقطہ نظر سے بے انتہا اہم ہے اس لئے اس کی خوشحالی اور اس کے استحکام کی عالمی نقطہ نگاہ سے بڑی اہمیت ہے۔ ایک اور سوال پر اس نے واشنگٹن کی اس رپورٹ کی، کہ حکومت ایران اسرائیل کو تسلیم کرنے کی تجویز پر غور کر رہی ہے۔ تصدیق یا تردید کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ یہ تجویز کچھ عرصہ سے حکومت کے زیر غور ہے۔ میں 16 دن سے اپنے ملک سے باہر ہوں اس لئے مجھے اس سلسلے میں تازہ ترین اطلاع نہیں ہے۔"[42] شاہ کی پارلیمنٹ میں تقریر اور اس کے پریس کانفرنس میں بیان کا مطلب یہ تھا کہ وہ مسلم بلاک کی تجویز کو مناسب اور ممکن العمل نہیں سمجھتا تھا کیونکہ امریکہ نے اس وقت تک ایران اور ترکی کو عرب ممالک کے گٹھ جوڑ میں شامل کرنے کا کوئی منصوبہ نہیں بنایا ہوا تھا۔ شاہ کو امریکہ سے صرف مالی اور فوجی امداد کی توقع تھی اور اس کی رائے یہ تھی کہ مسلم ممالک میں معاشی استحکام ہوگا تو ان ممالک کے اندر اشتراکی تحریکوں کا سد باب ہو سکے گا۔ شاہ کی 16 رمارچ کو کراچی سے واپسی کے چند دن بعد تہران کے ہفت روزہ "ترقی" کا تبصرہ یہ تھا کہ "ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ ہندوستان کی قوم ہمیشہ امن کا راستہ اختیار کرے لیکن اگر خدانخواستہ متعصّب ہندوؤں نے جنگ کا راستہ اختیار کیا تو اس سے انتشار اور افراتفری پھیل جائے گی۔ امن کی حالت میں پاکستان کا مستقبل یقیناً روشن ہوگا۔ اگر کسی دن پاکستان کی آزادی کو خطرہ لاحق ہو گیا تو مشرق وسطیٰ کے دوسرے ممالک کو اور بالخصوص تیل اور کوئلہ پیدا کرنے والے ممالک کے لئے خطرہ پیدا ہو جائے گا۔"[43]

ترکی اور مصر اسلام کے بجائے سیکولر حوالے سے سوویت مخالف بلاک بنانے کے حق میں تھے

جن دنوں شاہ ایران پاکستان کے دورے پر تھا ان ہی دنوں ترکی کے پروفیسروں اور طلبا کا ایک وفد بھی پاکستان کا دورہ کر رہا تھا۔ اس وفد کے قائد نے پاکستان کے مختلف شہروں میں جو تقریریں کیں اس میں اس نے اسلام کا کوئی ذکر نہ کیا اور نہ ہی یہ کہا کہ اسلام کے نام پر مشرق وسطٰی کے ممالک میں کوئی بلاک بننا چاہیے۔ یہ وفد تقریباً دو ہفتے کے دورے کے بعد 4/مارچ کو کراچی سے واپس روانہ ہوا۔ اس سے ایک دن پہلے اس کے قائد نے اپنی الوادعی تقریر میں ترکی اور پاکستان کے درمیان مذہبی رشتوں کا کوئی ذکر نہ کیا۔ اس کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ قائداعظم نے پاکستان کے لئے جو کچھ کیا ہے وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کمال اتاترک نے ترکی کے لئے کیا تھا۔

''ہمیں پاکستان میں جس چیز نے بہت متاثر کیا ہے وہ پاکستان کی ساری آبادی کی اور خاص طور پر صوبہ سرحد کے عوام کی ''مارشل سپرٹ'' ہے۔ یہاں کے نوجوانوں میں نظم وضبط ہے اور ان کی تعلیم اس طریقے سے ہو رہی ہے کہ جو اس مملکت کو ایک طاقتور مملکت بنانے میں مدد دے گا۔ میں امید کرتا ہوں کہ ہمارا یہ برادر ملک بہت جلد عظیم طاقت بن جائے گا۔''[44]

شاہ کے پاکستان میں قیام کے دوران قاہرہ میں مصری سفارت کاروں کی ایک کانفرنس بھی ہوئی جس میں عرب ممالک کے معاہدۂ اجتماعی تحفظ کی تجویز بھی زیر غور آئی۔ مصر نے سیکولر عرب نیشنلزم کی بنا پر عرب ممالک کے درمیان دفاعی معاہدے کی یہ تجویز اکتوبر 1949ء میں عرب لیگ کے اجلاس میں پیش کی تھی اور اس وقت سے لیگ کی پولیٹیکل اور ملٹری کمیٹی اس کی تفصیلات طے کرنے میں مصروف تھی۔ مصر کے سابق وزیر دفاع جنرل صالح حرب پاشا کی اس تجویز کے بارے میں رائے یہ تھی کہ ''اگر یہ معاہدہ فلسطین کی جنگ سے قبل معرض وجود میں آتا تو ہم اس کا خیر مقدم کرتے لیکن اب جبکہ جنگ فلسطین کے پیدا شدہ حالات درپیش ہیں، عوام کے ضروری مسائل سے توجہ ہٹانے کے لئے ایسے معاہدات پر ان کی توجہ کو مرکوز کیا جا رہا ہے حالانکہ اس وقت اس سے اہم مسائل یعنی ''وادیٔ نیل کا اتحاد'' اور ''مصر سے برطانوی فوجوں کا اخراج'' ہیں۔[45] جنرل صالح حرب پاشا کا مطالبہ تھا کہ ملک سے مارشل لاء اٹھا دیا جائے۔ مگر شاہ فاروق

کی مغرب نواز حکومت نے اس مطالبہ پر کوئی توجہ نہ دی لیکن جب یہ مطالبہ عوامی سطح پر زور پکڑ گیا تو مصر کے وزیر برائے سیاسی امور ڈاکٹر احمد ذکی نے 19 رجنوری 1950ء کو یہ بیان جاری کیا کہ مارشل لاء کے متبادل ایک چار نکاتی نیا قانون موسومہ ''ایکٹ برائے دفاع مملکت'' مرتب کیا جا رہا ہے جس کی رو سے مصر کی بندرگاہوں سے ہو کر عازم اسرائیل ہونے والے جہازوں کا معائنہ کیا جائے گا اور اسرائیل کو جو ہتھیار بھیجے جائیں گے انہیں ضبط کر لیا جائے گا۔ اس نے مزید بتایا کہ کمیونسٹ سرگرمیاں قانوناً مستوجب سزا قرار دی جائیں گی۔ کمیونزم پر مصر میں پابندی عائد ہے۔ نئے قوانین کی رو سے کمیونسٹ مجرموں کو معمولی فوجداری قوانین کے مقابلے میں شدید تر سزائیں دی جائیں گی۔ [46]

اسلام اور عیسائیت کے درمیان کمیونزم کے خلاف اتحاد کا منصوبہ

10 رفروری کو لندن ٹائمز کے نامہ نگار مقیم روم نے یہ خبر دی کہ ''مصر کا ایک وزیر محمد طاہر العمری، کمیونسٹ مادہ پرستی کے خلاف اسلام اور مسیحیت کے مشترکہ دفاع کے لئے ویٹی کن اور مسلم دنیا کے درمیان سمجھوتے کی تجویز پر تبادلہ خیالات کر رہا ہے۔''[47] 21 رفروری کو جبکہ قاہرہ میں مصری سفارت کاروں کی کانفرنس جاری تھی، مصر کے وزیر خارجہ محمد صلاح الدین نے ایک پریس کانفرنس میں لندن ٹائمز کی اس خبر کی تصدیق کی اور بتایا کہ مسیحی اور اسلامی قوتیں ''تخریبی رجحانات'' کے خلاف جدوجہد کرنے کے لئے باہمی تعاون کر رہی ہیں۔ [48] 2 رمارچ کو اسی سلسلے میں روم سے ایک اور خبر آئی کہ ''اشتراکیت کے خلاف متحدہ مسیحی محاذ کے سلسلے میں یہاں نیا قدم اٹھایا گیا ہے جبکہ اپنی تاریخ میں پہلی مرتبہ ویٹی کن نے رومن کیتھولک پادریوں اور پروٹسٹنٹ علما کے درمیان مذاکرات کی باضابطہ اجازت دے دی ہے۔ مقدس دفتر نے اس کی بھی اجازت دے دی ہے کہ کیتھولک افراد ایسے پروٹسٹنٹ جلسوں میں بھی شریک ہو سکتے ہیں جو فطری قوانین اور مذہب کو الحاد پرستوں سے بچانے کے لئے منعقد کیے جائیں۔''[49]

3 رمارچ کو شیعوں کے اسماعیلیہ فرقہ کے سربراہ آغا خان نے اسلام اور مسیحیت کے درمیان اتحاد کی اپیل کی۔ اس کی رائے یہ تھی کہ مسلمان زیادہ تر اس اتحاد پر آمادہ ہیں۔ مسیحیوں کو اس سلسلے میں پہل کرنی چاہیے۔ [50] 7 رمارچ کو قاہرہ میں امریکی سفارت کاروں کی ایک اہم

کانفرنس ہوئی جس میں اسکندریہ، عمان، انقرہ، ایتھنز، بغداد، بیروت، دمشق، دہران، حیفہ، استنبول، بیت المقدس، جدہ، نکوسیا، پورٹ سعید، سیلونیکا، تہران، تل ابیب اور واشنگٹن سے آمدہ 50 مندوبین نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں مشرق وسطیٰ کے ہر ملک کے معاشی، معاشرتی اور سیاسی حالات کا جائزہ لے کر پورے مشرق وسطیٰ میں استحکام، خوشحالی اور امن کی تجاویز پر غور کیا گیا۔[51]

15 رمارچ کو تہران میں ایران اور ہندوستان کے درمیان دوستی کے معاہدے پر دستخط ہوئے۔ اس تقریب میں ہندوستانی سفیر سید علی ظہیر نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "ایران اور ہندوستان دونوں ہی ایشیائی اور آریائی ممالک ہیں۔ ان کی ثقافتیں اور روایات بہت پرانی ہیں۔ ان میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ لہٰذا مجھے یقین ہے کہ ہمارے باہمی تعاون کو اور ہمارے دوستانہ تعلقات کو ایشیا کے عظیم براعظم میں ایک طاقتور عنصر کی حیثیت حاصل ہوگی۔"[52]

شاہ ایران کے دورۂ پاکستان کے دوران ان خبروں کا مطلب یہ تھا کہ جہاں تک ترکی کا تعلق تھا وہ قومی یا بین الاقوامی سطح پر مذہب کو سیاست میں ملوث کرنے پر آمادہ نہیں تھا اس لئے اس کی جانب سے اسلام کے نام پر کسی سوویت یونین مخالف گٹھ جوڑ میں شامل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایران کو صرف امریکہ سے زیادہ مالی امداد لینے میں دلچسپی تھی۔ وہ اسلام کے نام پر ممالک عربیہ سے فوجی گٹھ جوڑ کے حق میں نہیں تھا جبکہ دوسری طرف عرب ممالک کے فرمانروا اور شیوخ اسرائیل سے اپنی شرمناک شکست پر پردہ ڈالنے کے لئے شرق اردن اور اسرائیل کے درمیان معاہدہ امن کے باوجود سیکولر عرب نیشنلزم کی بنیاد پر اجتماعی تحفظ کا معاہدہ کرنے کا پروپیگنڈا بھی کرتے تھے اور اس کے ساتھ ہی وہ عرب عوام کی مغربی سامراج اور اپنی غربت کے خلاف ایجی ٹیشن کو کچلنے کے لئے اسلام اور مسیحیت میں اتحاد کی تبلیغ بھی کرتے تھے۔ اسماعیلیہ فرقہ کا سربراہ سر آغا خان دونوں مذاہب کے اس اتحاد کے اس لئے حق میں تھا کہ اس کا کاروباری فرقہ مشرق وسطیٰ کے تقریباً سارے ممالک میں موجود تھا۔ بالخصوص مصر میں تاریخی وجوہ کی بنا پر اس فرقہ کی جڑیں خاصی گہری تھیں اور اس فرقہ کا مفاد عرب فرمانرواؤں اور شیوخ کے مفادات سے وابستہ تھا۔ امریکہ اس علاقے میں بہت سرگرم ہو گیا تھا۔ اگرچہ اس کی زیادہ تر دلچسپی ترکی، ایران اور سعودی عرب میں تھی۔ تاہم وہ دوسرے عرب ممالک میں بھی اپنے مفادات کو فروغ دینے کی پالیسی پر عمل پیرا ہو گیا تھا۔ وہ مصر کے تجویز کردہ اجتماعی تحفظ کے معاہدے کے حق میں تھا کیونکہ

اس طرح سارے ممالک عربیہ میں اس کی بالادستی قائم ہونے کا امکان پیدا ہوتا تھا اور اس علاقے سے برطانیہ کے وقار اور اثر ورسوخ کے خاتمہ کی رفتار تیز ہونا یقینی تھا۔ مصر میں برطانوی فوجوں کی موجودگی کے خلاف زبردست برہمی پائی جاتی تھی اور امریکہ اس عوامی برہمی سے فائدہ اٹھا کر پورے مشرق وسطیٰ میں اپنے مفاد کو فروغ دینا چاہتا تھا لیکن ان سب باتوں کے باوجود مشرق وسطیٰ کے کسی بھی ملک میں پان اسلام ازم، اتحاد اسلامی یا اسلامی بلاک یا اجتماعی تحفظ کے اسلامی معاہدے کا کوئی چرچا نہیں تھا۔ یہاں تک کہ سعودی عرب کا ولی عہد امیر سعود بھی عربوں کے درمیان اجتماعی تحفظ کے معاہدے کی تجویز کا خیر مقدم کرتا تھا۔ اور یہ یقین دلاتا تھا کہ ''سعودی حکومت عرب لیگ کے ہر فیصلے کی پابند ہوگی اور وہ مجوزہ معاہدے کی تکمیل کے لئے متوقع امداد مہیا کرے گی۔''[53] اسے غیر عرب مسلم ممالک کے تحفظ وسلامتی میں بظاہر کوئی دلچسپی نہیں تھی جبکہ شاہ ایران کی پاکستان سے 16 ر مارچ کو تہران واپسی پر اقوام متحدہ میں ایرانی مندوب نصر اللہ انتظام نے اسرائیل کے مندوب کو باقاعدہ مطلع کیا کہ ایران نے اسرائیل کو عملاً تسلیم کر لیا ہے۔

خلیق الزماں کے ''اسلامستان'' کو عربوں کی جانب سے حوصلہ افزا جواب نہ ملا......امریکی پروفیسر کی بالواسطہ تائید

بایں ہمہ پاکستان میں پان اسلام ازم کا نقارہ بجتا رہا۔ 17 ر مارچ کو کراچی کے اسلامیہ کالج کے ایم۔اے کے طلبا کے ایک جلسے میں بین الاقوامی امور کے اسلامی ادارہ کے قیام کا اعلان کیا گیا اور یہ بتایا گیا کہ یہ ادارہ اسلامی ریاست قائم کرنے، مسلم ممالک کے درمیان برادرانہ تعلقات قائم کرنے، اسلامی تاریخ، سیاست، فلسفہ اور اقتصادیات کے سائنٹیفک مطالعہ کرنے کا کام کرے گا۔[54] 21 ر مارچ کو کراچی سے یونائیٹڈ پریس نے یہ خبر دی کہ ''پاکستان مسلم لیگ کے صدر چودھری خلیق الزماں نے اسلامی ممالک کے تقریباً 200 قائدین اور علمائے کرام کو لکھا ہے کہ وہ اسلامی ممالک کے کسی دارالحکومت میں ایک کانفرنس منعقد کریں تاکہ اسلامستان کو ایک حقیقت بنانے کے لئے مذاکرہ کیا جائے اور دنیائے اسلام میں ایک ایسا ادارہ قائم کیا جائے جو اسلامستان کے تخیل کو عملی جامہ پہنائے۔ خیال ہے کہ یہ کانفرنس کراچی، قاہرہ یا دمشق میں ہوگی۔''[55] اس خبر پر نوائے وقت کا تبصرہ یہ تھا کہ ''اجی چودھری صاحب''

''اسلامستان'' کی تعمیر کے سلسلے میں جہاں اتنا خرچ ہونا ہے وہاں ''ٹینڈروں'' کے لئے اسلامی ممالک سمیت دنیا بھر کے اخباروں میں اشتہار دے دیجئے۔ نقشہ تو آپ لندن سے منظور کروا ہی آئے ہیں۔ اشتہار میں اس کا حوالہ دے دیجئے گا۔''[56] تاہم ایران کے ایک شیعہ مُلّا آقائے فقیہی شیرازی کی طرف سے چودھری خلیق الزماں کی حمایت ہوئی۔ اس مُلّا نے مارچ میں پاکستان کا دورہ کیا تھا اور واپسی پر اس نے تہران کے ایک اخبار ''پرچم اسلام'' میں اسلامی ممالک کے اشتراک واتحاد پر زور دیتے ہوئے لکھا کہ ''جب تک مسلمانوں کے روحانی رشتوں کی بنیادوں پر ایک جماعت قائم نہیں ہوگی، اسلام کی حفاظت نہیں کی جاسکتی۔ مشرق اور مشرق وسطیٰ میں مسلمان قوم جس بیچارگی کی حالت میں مبتلا ہے اس پر ہر معقول شخص کا دل دکھے گا۔ ابھی وقت ہے کہ ہم اس قسم کی ایک جماعت قائم کر کے تحفظ کا بندوبست کریں۔''[57] اسی طرح امریکہ سے بھی بالواسطہ طور پر چودھری خلیق الزماں کی تحریک اسلامی کی تائید ہوئی۔ ہارورڈ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر ڈاکٹر جارج مارٹن نے لائبریری آف کانگرس کے زیر اہتمام لیکچروں کے سلسلہ کا آغاز کرتے ہوئے اسلام کے عظیم الشان اور عالمگیر کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ''اسلام دنیا کا ایک بڑا مذہب ہے جس نے عالمی ثقافت کی ترقی میں شایان شان حصہ لیا ہے۔ محمد عربی کے ماننے والوں نے ایک صدی میں اپنی تہذیب وثقافت کی بدولت اس دور کی ساری دنیا کو فتح کیا تھا اور عربی زبان نے مشرق ومغرب کو ملانے کے لئے ایک ثقافتی رابطہ کا کام دیا تھا...... مشرق وسطیٰ کے ممالک نے تہذیب وثقافت کی رہنمائی کی ہے اور اب وہ بھی رہنمائی کر سکتے ہیں۔''[58] اس پروفیسر کے اسلام کی عظمت کا معترف ہونے کا راز یہ تھا کہ ان دنوں امریکہ مختلف ذرائع اختیار کر کے مشرق وسطیٰ میں اپنے سامراجی پنجے پھیلانے میں مصروف تھا۔ شام کے وزیر اقتصادیات سید دوالبی کا الزام یہ تھا کہ ''امریکہ مشرق وسطیٰ کو اپنی نوآبادی بنانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عرب ممالک کو اسرائیل سے صلح کرنے کی تلقین کر رہا ہے اور اسی لئے اس نے مشرق وسطیٰ میں اپنے فوجی ماہرین بھیجے ہوئے ہیں۔ دوالبی کی رائے یہ تھی کہ عرب ممالک تیسری جنگ سے صرف اسی صورت میں بچ سکتے ہیں کہ وہ سوویت یونین سے غیر جارحانہ معاہدہ کریں۔ وہ سمجھتا تھا کہ ممالک عربیہ اس امر کو ترجیح دیں گے کہ وہ سوویت یونین کی ایک جمہوریت بن جائیں لیکن امریکہ کی اس سازش کو برداشت نہیں کریں گے کہ امریکہ انہیں ایک یہودی مملکت بنا دے۔''[59]

عرب لیگ کے سات ممالک کا معاہدۂ مشرق وسطیٰ کی تجویز پر اتفاق جسے امریکی حمایت حاصل تھی

شام کے وزیر اقتصادیات نے امریکہ کے خلاف یہ سنگین الزام اپریل کے دوسرے ہفتے میں قاہرہ میں عائد کیا تھا جہاں عرب لیگ کی سیاسی کمیٹی سات عرب ممالک یعنی مصر، شرق اردن، عراق، شام، لبنان، سعودی عرب اور یمن کے اجتماعی تحفظ کے معاہدہ کی تفصیلات کا جائزہ لے رہی تھی اور بعض اخباری رپوٹوں میں یہ بتایا گیا تھا کہ یہ معاہدہ امریکہ کی تحریک پر ہو رہا ہے جو اس علاقے کو سوویت توسیع پسندی سے محفوظ کرنا چاہتا ہے۔[60] 10راپریل کو عرب لیگ کی سیاسی کمیٹی نے اس معاہدے کی منظوری دے دی۔ مجوزہ معاہدے میں یہ قرار دیا گیا تھا کہ ساتوں عرب ممالک کے نمائندوں کی ایک مشاورتی کونسل قائم کی جائے گی جس کے اجلاس مسلسل طور پر ہوتے رہیں گے۔ عرب ملکوں کی وزارتوں کی تبدیلی سے معاہدہ پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ مشاورتی کونسل کو اختیار دیا جائے گا کہ معاہدے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ضروری اقدامات اختیار کرے۔ اگر کسی وقت ممالک عربیہ میں سے کسی ملک کو خطرہ درپیش ہوا یا کسی ملک کی طرف سے اسے حملہ کی دھمکی دی گئی تو اس صورت میں مشاورتی کونسل اس امر پر غور کرے گی کہ اس خطرے کو دور کرنے کے لئے کیا قدم اٹھانا چاہیے اور جارحانہ اقدام کی صورت میں عرب لیگ کے رکن ملکوں کو کیا فرائض انجام دینے چاہئیں۔ معاہدہ کے تحت مزید قرار دیا گیا تھا کہ اگر معاہدہ کے کسی رکن ملک پر حملہ ہوا تو معاہدہ میں شامل سارے عرب ممالک متحدہ طور پر مقابلہ کریں گے۔ کمانڈر انچیف جارحیت کے شکار ملک سے لیا جائے گا یا پھر اس ملک سے لیا جائے گا جو سب سے زیادہ فوجیں جنگ میں بھیجے گا۔"[61]

ایک برطانوی خبر رساں ایجنسی نے اسی دن معاہدے پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ رپورٹ دی کہ "اس معاہدے کی تجویز ابتداً مصر نے اکتوبر 1949ء میں پیش کی تھی اور اس کا مقصد شام وعراق کے متوقع ادغام کو روکنا تھا۔ اب عرب لیگ کونسل کے اجلاس میں یہ معاہدہ اطلانٹک پیکٹ کے خطوط پر فروغ پذیر ہوا ہے۔ لیکن قاہرہ کے مبصرین کی رائے یہ ہے کہ اس مرحلہ پر مجوزہ معاہدے کے مقاصد کچھ زیادہ ہی بلند ہیں بالخصوص ایسی صورت حال میں کہ فلسطین کی جنگ کے

بعد عرب ممالک کے درمیان باہمی اعتماد کا فقدان ہے۔ اس معاہدے پر بحث کے دوران مصر کا اصرار تھا کہ جنگ چھڑنے سے پہلے متحدہ فوجی کمان کی کوئی ضرورت نہیں۔ مصر کے اس موقف کا یہ مطلب سمجھا گیا کہ مصر دوسرے عرب ممالک پر اپنے فوجی راز منکشف نہیں کرنا چاہتا ہے۔''[62]

برطانوی نیوز ایجنسی کی اس خبر سے صاف ظاہر تھا کہ انگریزوں کو یہ مجوزہ معاہدہ مشرق وسطیٰ میں اپنے مفاد کے منافی نظر آتا تھا جبکہ امریکہ اس علاقے میں اپنے مفاد کے فروغ کے لئے اس معاہدے کے حق میں تھا۔

پنجابی شاونسٹوں نے معاہدۂ مشرق وسطیٰ اور ''اسلامستان'' دونوں کو اینگلو امریکی سامراج کی پیداوار قرار دیتے ہوئے حکومت پاکستان سے دولت مشترکہ چھوڑنے کا مطالبہ کیا......لیاقت مخالف انتخابی مہم کا نعرہ

لاہور کے روزنامہ نوائے وقت کا اس مجوزہ معاہدہ پر تبصرہ یہ تھا کہ ''بظاہر یہ معاہدہ بڑا ہی امید افزا ہے اور عرب ممالک کا یہ اتحاد اور اسرائیل کے خلاف ناکہ بندی کی گرفت سخت سے سخت تر کرنے کا عزم ایک درخشاں مستقبل کا پتہ دیتا ہے لیکن اس معاہدہ کو ایک اور زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ خوشی کافور ہو جاتی ہے اور مسرت کی جگہ مایوسی لے لیتی ہے۔ اور یہ زاویۂ نگاہ اس تلخ لیکن ناقابل تردید حقیقت کا احساس ہے کہ اس معاہدہ کا مسودہ واشنگٹن اور لندن میں تیار کیا گیا اور پریذیڈنٹ ٹرومین کی دعائیں اور مسٹر ایٹلی اور بیون کی تمنائیں اس کے ساتھ ہیں۔ اس معاہدہ کی اصلیت صرف اتنی ہے کہ سامراج اور اشتراکیت کی موجودہ آویزش اور آئندہ جنگ کے خطرے کے پیش نظر ڈالر سامراج اور برطانوی شہنشاہیت مشرق وسطیٰ میں محاذ قائم کرتے ہوئے اپنا مورچہ مستحکم کر رہے ہیں۔ یورپ میں اشتراکیت کے سیلاب کو روکنے کے لئے معاہدہ شمالی بحر اوقیانوس کا بند باندھا گیا اور جب اس کا اندیشہ پیدا ہو چلا کہ یہ سیلاب راستہ بدل کر ایشیا کا رخ کر رہا ہے تو مجوزہ معاہدہ کے ذریعہ جو معاہدہ بحر الکاہل اور عرب ممالک کے اس متوقع معاہدہ کے ذریعے معاہدہ شمالی بحر اوقیانوس کی نقل ہے اور ان ہی خطوط پر ہے۔ نئے بند باندھے جا رہے ہیں اور اسی مقصد کے لئے پریذیڈنٹ ٹرومین کے چار نکاتی پروگرام کے دائرے کو وسیع کر کے اس میں عرب ممالک بھی شامل کر لئے گئے ہیں تاکہ ان کی اقتصادی خوشحالی کی بجائے ان پر ڈالروں

کی بارش کی جائے اور اس طرح انہیں اور بھی زیادہ اقتصادی گرفت میں کس لیا جائے۔ ایک دشمن، روس کے خلاف، جس کا ہوّا برطانوی اور امریکی وزارت خارجہ کا پیدا کردہ ہے عرب ممالک اپنے ان جانے بوجھے دشمنوں، برطانیہ وامریکہ کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں جنھوں نے گزشتہ جنگ عظمٰی میں ان کی وفاداری کا یہ صلہ دیا کہ اب ان کے قلب میں ان کے دشمن جاں، اسرائیل کا تیر پیوست کر دیا اور اتنی مضبوطی سے کہ عرب ممالک کی متحدہ کوششیں بھی اس کو نکالنے میں ناکام رہیں۔ عرب سیاست کا یہ افسوسناک پہلو ہے اور حیرت ہے کہ دو عظیم جنگوں کی تباہ کاریوں اور انقلابات زمانہ نے ابھی تک عربوں میں یہ احساس پیدا نہیں کیا کہ وہ اپنے حقیقی دشمنوں کو پہچان سکیں۔ بلاشبہ آج عرب ممالک بڑے ہی نازک دور سے گزر رہے ہیں اور آج دنیائے اسلام کی نظریں عرب لیگ ہی پر مرکوز ہیں۔ اس لحاظ سے عرب لیگ کو برطانوی وفاداری کے تمام رشتے منقطع کر کے آزاد اداروں کی طرح تاریخ کے ان نازک لمحات میں تدبر وفراست سے قیادت کا فرض انجام دینا چاہیے۔ یہ معاہدہ اس وقت تک بے سود ہوگا جب تک عرب ممالک برطانوی سامراج کی گرفت سے آزاد نہیں ہو جاتے۔ دوسری جنگ عظمٰی نے شہنشاہیت کی بنیادیں ہلا دیں اور اب سامراج دم توڑ رہا ہے۔ یہی موقع تھا کہ عرب ممالک اپنی آزادی کے لئے جدوجہد کرتے لیکن وہ اس سنہرے موقع کو کھو رہے ہیں۔ آج بھی برطانوی افواج مصر، اردن، یمن اور سوڈان میں ڈیرہ ڈالے پڑی ہیں۔ آج بھی عراق اور عرب کے زرخیز تیل کے چشمے امریکہ وبرطانیہ کے استحصال کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ ان حالات میں عرب لیگ کو سب سے پہلے سامراجی غلامی سے نجات حاصل کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔ موجودہ اقتصادی پستی کو دور کرنے اور اقتصادی بحالی کا بہترین حل وہ تھا جو بین قومیتی اسلامی اور اقتصادی کانفرنس کراچی میں پیش کیا گیا تھا...... کاش ان قراردادوں اور تجاویز کو عملی جامہ پہنایا جاتا۔ اس مجوزہ معاہدہ کے منفی پہلو سے بچنے کا صحیح طریقہ وہ ہے جو شام کے وزیر اقتصادیات نے پیش کیا ہے یعنی یہ کہ سوویت یونین سے غیر جارحانہ سمجھوتہ کر لیں تاکہ تیسری جنگ کا خطرہ ٹل سکے ورنہ وہ وقت دور نہیں جب شام کے وزیر اقتصادیات کا یہ اندیشہ پورا ہو کر رہے گا کہ امریکہ عرب ممالک کو یہودی ریاست کے تابع کر دے گا۔"[63]

14 راپریل کو عرب لیگ کونسل نے سات عرب ممالک کے درمیان اس معاہدے کی توثیق کر دی تو اس خبر پر نوائے وقت کی ادارتی رائے یہ تھی کہ "اگر عرب لیگ برطانیہ اور امریکہ

دونوں کے اثر سے آزاد رہتے ہوئے ان سات ملکوں کو آپس میں متحد کر سکے تو یہ اتحاد بڑا مبارک ہو گا اور ممکن ہے ترکی اور ایران سے کسی نوعیت کا رابطہ پیدا کیا جا سکے۔ لیکن اگر زیر بحث معاہدہ بھی سعد آباد پیکٹ کی طرح بودا ثابت ہوا تو اس کی کوئی اہمیت نہ ہو گی۔ ساتوں عرب ممالک کوئی اقدام کریں تو اس کا کچھ نتیجہ نکلنے کی امید بھی کی جا سکتی ہے۔ ورنہ اپنی اپنی جگہ اور تنہا تو کسی عرب ملک میں اتنی سکت نہیں کہ وہ عالمی سیاست میں دوسروں سے اپنے وجود کا اعتراف بھی کروا سکے۔ اس طرح اگر یہ اتحاد انگریزوں اور امریکیوں کے اثر سے پاک اور آزاد ہے تو واقعی خوش آئند ہے لیکن اگر پردۂ زنگاری میں وہی فرنگی معشوق ہے تو اس عرب اتحاد اور اس اسلامستان میں کوئی فرق نہیں جو چودھری خلیق الزماں انگریزوں کی سرپرستی میں قائم کرنا چاہتے ہیں اور جس کا کعبہ مقصود لندن ہو گا۔''[64] ظاہر ہے کہ نوائے وقت کے یہ دونوں اداریے اس کے 30/ اکتوبر 1949ء کے اس اداریے سے بالکل مختلف تھے جن میں اس نے مصر کے تجویز کردہ اجتماعی تحفظ کے معاہدے کی پرزور تائید وحمایت کرتے ہوئے اسے نیک فال قرار دیا تھا اور لکھا تھا کہ ''بہت ممکن ہے کل یہی اتحاد ''اسلامستان'' کی تمہید ثابت ہو۔ اس طرح اقبالؒ کی یہ تمنا پوری ہو جائے کہ ''ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے۔'' اب اس سلسلے میں نوائے وقت کے اکتوبر 1949ء کے موقف میں بنیادی تبدیلی کی وجہ یہ تھی کہ پنجاب میں انتخابی مہم شروع ہو چکی تھی اور اس مہم میں پنجابی شاؤنسٹوں نے وزیراعظم لیاقت علی خان کے خلاف جو نعرے اپنائے تھے ان میں سے ایک نعرہ یہ تھا کہ لیاقت حکومت برطانیہ کی حاشیہ بردار ہے۔ اس نے پاکستان کو ابھی تک برطانوی دولت مشترکہ کا رکن بنا رکھا ہے حالانکہ برطانیہ نے تنازعہ کشمیر کے منصفانہ تصفیہ کے لئے پاکستان کی کوئی مدد نہیں کی۔ لیاقت علی خان سوویت یونین کی بجائے امریکہ جا رہا ہے حالانکہ امریکہ کھلم کھلا ہندوستان کو پاکستان پر ترجیح دیتا ہے۔ اس کی غیر مشروط مغرب نوازی کے باعث دنیا میں پاکستان کا کوئی وقار نہیں ہے۔

اس انتخابی مہم کی وجہ سے حسین شہید سہروردی نے پنجاب کو اپنی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنا لیا تھا۔ اس نے اس مقصد کے لئے صوبہ سرحد کے پیر مانکی کے ساتھ جنوری 1950ء سے سیاسی اتحاد کر لیا ہوا تھا اور اب وہ نوائے وقت کے ممدوح نواب ممدوٹ سے سیاسی گٹھ جوڑ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چونکہ پنجاب کے عوام میں اینگلو۔ امریکی سامراج کے خلاف بوجوہ سخت خفگی تھی

اس لئے 22؍مارچ 1950ء کو سہروردی کا لاہور کی ایک پریس کانفرنس میں مطالبہ یہ تھا کہ ''پاکستان کو دولت مشترکہ سے علیحدہ ہو کر غیر جانبداری کا اعلان کرنا چاہیے'' اور نوائے وقت کا عرب ممالک کو مشورہ یہ تھا کہ وہ اینگلو امریکی سامراج سے رشتہ توڑ کر سوویت یونین سے دوستی کریں۔ یہ مشورہ بالکل صائب اور ترقی پسندانہ بلکہ انقلابی تھا اگرچہ اس کی بنیاد محض لیاقت علی خان کی ہمہ گیر مخالفت پر تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان دنوں یہ اخبار روس کو پاکستان اور عالم اسلام کا دشمن تصور نہیں کرتا تھا اور کہتا تھا کہ روسی خطرے کا ہوّا برطانوی اور امریکی وزارت خارجہ کا پیدا کردہ ہے۔ اسے لندن کے اخبار ''ڈیلی ٹیلیگراف'' کے نامہ نگار مقیم لاہور کی اس خبر سے بھی کوئی تشویش لاحق نہیں ہوئی تھی کہ ''کمیونسٹوں نے اپنا اثر بڑھانے کے لئے وسیع پیمانے پر مہم شروع کر دی ہے۔ کمیونسٹوں کی یہ مہم ماسکو کی طرف سے جاری کردہ ہدایات کی اس مہم سے منسلک ہے جو ہندوستان کے کمیونسٹوں نے شروع کی ہے تاکہ پورے براعظم ہندو پاک پر اپنا تسلط قائم کر سکیں۔ اشتراکیت لاہور کے پڑھے لکھے طبقے اور سندھ کے کسانوں میں کافی اثر رکھتی ہے۔ مشرقی بنگال کے کمیونسٹ مغربی بنگال کے کمیونسٹوں کے ساتھ اشتراک کر رہے ہیں اور ان کمیونسٹوں اور برما و ہند چینی کے گوریلا باغیوں کے درمیان رشتہ کی بھی اطلاع ملی ہے۔ شمال مغربی سرحدی صوبے اور اس کے دروں کے متعلق روس کا اشتیاق دیرینہ بات ہے۔ یہ بات زار روس کے زمانے سے چلی آتی ہے۔ اس لئے اس علاقے میں روسی ایجنٹوں کی سرگرمی تعجب کا باعث نہیں ہے۔''[65] برطانیہ کے خلاف نوائے وقت کی انقلابی مہم کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ لیاقت علی خان کی حکومت کی برطانیہ نواز پالیسی کی وجہ سے پاکستان کی افواج پر بدستور برطانوی افسروں کا غلبہ تھا اور اس بنا پر پنجاب کے بہت سے فوجی افسروں کی ترقیاں رکی ہوئی تھیں۔

30؍اپریل 1950ء کو وزیراعظم لیاقت علی خان صدر امریکہ کی دعوت پر دورہ امریکہ کے لئے روانہ ہوا تو اس موقع پر بھی نوائے وقت نے حکومت پاکستان کی مغرب نواز پالیسی پر نکتہ چینی کرتے ہوئے لکھا کہ ''پاکستان کے عوام کو دنیا کے کسی ملک سے نفرت یا دشمنی نہیں ہے۔ وہ انگریزوں اور امریکیوں سے بھی نفرت نہیں کرتے، نہ ان سے دشمنی مول لینا چاہتے ہیں نہ تعلقات بگاڑنا چاہتے ہیں بلکہ ان کی خواہش یہ ہے کہ ان ملکوں سے ہمارے تعلقات دوستانہ ہوں مگر پاکستانی عوام یہ چاہتے ہیں کہ یہ تعلقات مساویانہ ہوں۔ وہ پاکستان کو برطانیہ اور امریکہ کا دوست

دیکھنا چاہتے ہیں مگر یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ پاکستان برطانیہ یا امریکہ یا اینگلو۔امریکی بلاک کا آلہ کار رہو۔ پاکستان کے عوام یہ نہیں چاہتے کہ ان کی حکومت برطانیہ یا امریکہ یا روس کسی ملک کی بھی خیمہ بردار بن کر پاکستان کو کسی جنگ میں دھکیل دے۔ پاکستان کو سوائے اس جنگ کے جو اسے اپنی آزادی کی حفاظت کے لئے لڑنی پڑے کسی جنگ میں حصہ نہیں لینا چاہیے۔ پاکستان کسی طاقت کے سامراجی مقاصد کو تقویت پہنچانے کے لئے اپنا خون بہانے کے حق میں نہیں۔ نہ وہ اس کے روادار ہیں کہ کوئی غیر ملکی طاقت ہمارے ملک میں کسی قیمت پر اپنے فوجی اڈے قائم کرے۔ پاکستانی عوام روس کی خاطر برطانیہ یا امریکہ سے لڑنے کے لئے تیار نہیں۔ لیکن اسی طرح وہ برطانیہ اور امریکہ کی خاطر روس کے خلاف بھی آمادہ پیکار نہیں ہوں گے۔ ممکن ہے کہ پاکستانی عوام خارجہ پالیسی کی باریکیوں کو نہ سمجھ سکتے ہوں مگر وہ اتنی بات ضرور سمجھتے ہیں کہ پاکستان کو ہر اس ملک سے دوستی رکھنی چاہیے جو اس کا دشمن نہیں اور ہمیں خواہ مخواہ پرائی آگ میں نہیں کودنا چاہیے۔ ہماری دوسری گزارش یہی ہے کہ وزیر اعظم اپنے دورہ امریکہ، کینیڈا اور برطانیہ کے دوان اس امر کو نہ بھولیں کہ ان کے اپنے ملک کے عوام کیا سوچ رہے ہیں۔"[66] نوائے وقت کا یہ مشورہ بالکل غیر مبہم اور واضح تھا اور وہ یہ تھا کہ پاکستان کی خارجہ پالیسی آزادانہ اور غیر جانبدارانہ ہونی چاہیے۔ اس نے یہ مشورہ یہ جانتے ہوئے دیا تھا کہ وزیر اعظم لیاقت علی خان اس پر عمل نہیں کرے گا۔ اس کا دورہ روس پر نہ جانا اور اس کی بجائے اس کی امریکہ کے لئے روانگی اس حقیقت کی واضح علامت تھی کہ حکومت پاکستان غیر مشروط طور پر اپنے آپ کو اینگلو۔امریکی بلاک سے وابستہ رکھنے کا تہیہ کئے ہوئے تھی۔ اس حکومت کی مغرب نواز بیوروکریسی نے نہ صرف وزیر اعظم کو سوویت یونین نہیں جانے دیا تھا بلکہ اس نے سوویت یونین کے ساتھ کوئی تجارتی معاہدہ بھی نہیں کیا تھا حالانکہ سوویت تجارتی وفد 1949ء میں اس مقصد کے لئے تین ماہ تک کراچی میں بیٹھا رہا تھا۔ سوویت یونین کا پہلا سفیر 18 / مارچ 1950ء کو کراچی پہنچا تھا اور اس نے 23 / مارچ کو گورنر جنرل کو اپنی تقرری کی دستاویز پیش کی تھی مگر وزیر اعظم لیاقت علی خان نے امریکہ کے لئے روانگی سے قبل اس سفیر سے ملاقات کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

باب:8

لیاقت کا دورہ امریکہ

اور جنگ کوریا میں اس کا امریکی پٹھو کا کردار

لیاقت نے امریکی انتظامیہ کو یقین دلایا کہ پاکستان سوویت یونین اور اینگلو۔امریکی بلاک کے درمیان جنگ میں اسلام کی آڑ میں اینگلو۔امریکی بلاک کا ساتھ دے گا

وزیر اعظم لیاقت علی خان لندن سے صدر ٹرومین کے ذاتی ہوائی جہاز انڈیپنڈنس میں 3 رمئی کو واشنگٹن پہنچا تو صدر ٹرومین کے علاوہ وزیر خارجہ ڈین ایچی سن اور وزیر دفاع لوئیس جانسن (Louis Johnson) نے اس کا رسمی استقبال کیا۔ اس نے اسی دن صدر ٹرومین سے مختلف دو طرفہ مسائل پر بات چیت کی اور پھر 4 رمئی کو اس نے امریکہ میں پہلی پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میرے پاس دنیا کا نہایت عمدہ انسانی مواد ہے۔ میری خواہش ہے کہ اس انسانی مواد کے پاس بہترین ہتھیار رہوں۔ چونکہ پاکستان انتہائی سٹریٹیجک پوزیشن کا حامل ہے اس لئے میں اپنی مسلح افواج کو جدید ترین اسلحہ سے لیس کرنے میں دلچسپی رکھتا ہوں۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ تمہاری مسلح افواج کو کس قسم کے ہتھیار درکار ہیں؟ تو اس نے کہا کہ جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ نہیں ہے جو تمہارا ملک بنا رہا ہے۔ ایک سوال کے جواب میں اس نے کہا کہ مجھے سوویت حکومت نے ماسکو کے دورہ کی دعوت دی تھی لیکن ابھی تک اس دورے کی کوئی تاریخ مقرر نہیں ہوئی۔ اس سے پاکستان میں کمیونزم کے مسئلہ کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے جواب دیا کہ ہمارے ملک میں کمیونسٹ ہیں لیکن پاکستان میں کوئی بڑا کمیونسٹ خطرہ نہیں ہے کیونکہ مسلمانوں کا

اپنا طرز زندگی ہے اور ہمارے ملک میں دوسرے اطوار زندگی کو زمین زرخیز نہیں ملے گی۔ اسلامی ممالک کی گروپنگ کے بارے میں لیاقت علی خان نے کہا کہ "میری بڑی خواہش ہے کہ وہ ایک دوسرے کے قریب تر ہو جائیں۔ یہ اسلامی ممالک دنیا کے عوام کے لئے کردار ادا کر سکتے ہیں۔ گزشتہ سال ہم نے اسلامک اکنامک کانفرنس منعقد کی تھی اور ہمیں امید ہے کہ معاشی معاملات میں مسلم ممالک کے درمیان قریبی اشتراک عمل ہو گا۔"[1]

پروگرام کے مطابق اسی دن لیاقت علی خان نے امریکی سینیٹ کو خطاب کیا مگر اس موقع پر پتہ چلا کہ امریکہ کے سیاسی لیڈروں کو لیاقت علی خان اور پاکستان میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ لیاقت کو تقریر شروع کرنے کے لئے تقریباً نصف گھنٹہ تک انتظار کرنا پڑا کیونکہ سینیٹ کا کورم ہی پورا نہیں تھا اور جب سینیٹ کے عملہ نے بھاگ دوڑ کر کے کورم پورا کیا تو ایوان کے تقریباً ایک تہائی ارکان نے نہایت سرد مہری کے ساتھ لیاقت علی کی تقریر سنی۔ اس کی اس تقریر کا اہم حصہ یہ تھا کہ "ہم نے عہد کیا ہے کہ پاکستان کی مملکت اپنے اقتدار و اختیار کو عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعے بروئے کار لائے گی۔ ہم نے اس عہد میں اسلام کی ہدایت کے مطابق جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور معاشرتی انصاف کے اصولوں کو پیش نظر رکھا ہے۔ ہمارے ہاں تھیوکریسی کے لئے کوئی گنجائش نہیں کیونکہ اسلام، ضمیر کی آزادی کا علمبردار ہے اور جبر و اکراہ کی مذمت کرتا ہے۔ اسلام میں ملائیت نہیں ہے اور وہ ذات پات کے سسٹم سے نفرت کرتا ہے۔ وہ سارے انسانوں کے درمیان مساوات کا قائل ہے اور ہر فرد کو اپنی محنت کا پھل کھانے کا حق دیتا ہے...... ایک آزاد قوم کی حیثیت سے اپنی مختصر زندگی میں ہم نے دنیا کے بارے میں، زمانہ حال کے بارے میں اور خود اپنے بارے میں بہت کچھ سیکھا ہے۔ ہم نے سیکھا ہے کہ آزادی، خواہ وہ فرد کی ہو یا ملک کی، ہر جگہ اور ہمہ وقت محفوظ نہیں ہے اور یہ کہ ہمارے وطن عزیز کی سالمیت جو ہمیں اپنی زندگیوں سے زیادہ عزیز ہے ہم سے یہ تقاضا کرے گی کہ ہم مسلسل چوکنا رہیں۔"[2]

4رمئی کو ہی لیاقت علی نے واشنگٹن کے نیشنل پریس کلب کے ایک ظہرانے میں تقریر کی جس میں اس نے پھر یقین دلایا کہ "تھیوکریسی کی کوئی گنجائش نہیں اور اسلامی طرز زندگی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم قرون وسطیٰ میں واپس جا رہے ہیں۔ ہم غیر مسلموں پر مذہبی یا ثقافتی جبر

کے خلاف ہیں۔ ہمارے مذہب نے ہمیں معاشرتی و معاشی انصاف اور انسانی اقدار کے بعض ایسے اصول سکھائے ہیں جن کا کاروبار حکومت میں اطلاق کیا جائے تو انسانی بہبود کو لازمی طور پر فروغ حاصل ہوگا۔" اس نے مزید کہا کہ "ثقافتی طور پر ہمارا قدرتی رابطہ دوسرے مسلم ممالک سے ہے اور ہمارے ان کے ساتھ تعلقات انتہائی دوستانہ ہیں۔ ہم مشرق وسطیٰ کے ممالک کی ترقی اور ان کی آزادی میں بہت دلچسپی رکھتے ہیں۔ جب میں مشرق وسطیٰ کے ممالک سے دوستی کی بات کرتا ہوں تو میں یہ نہیں چاہتا کہ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جائے کہ میں کسی طاقتی بلاک کی بات کر رہا ہوں۔ میں محض ان قدرتی اور مذہبی روابط، مشترکہ ثقافت اور معاشی نظریہ کی یکسانیت کا ذکر کرتا ہوں جو ان ممالک کے عوام اور ہمارے عوام کے درمیان موجود ہیں۔ یہ روابط بہت سی آزمائشوں میں بھی قائم رہیں گے اور مجھے یقین ہے کہ ایشیا میں استحکام کا عنصر ثابت ہوں گے...... جہاں تک ایشیا میں انتشار انگیز تحریک کا تعلق ہے جو استحکام کو خطرے میں ڈال سکتی ہے ہمیں اس کے بارے میں بڑی تشویش ہے۔ ہم نے اسی مقصد کے پیش نظر جمہوریہ انڈونیشیا کی حکومت اور برما میں وزیراعظم تھاکن نو کی حکومت سے دوستانہ تعلقات قائم کئے ہیں اور ہم برما کی مالی پوزیشن کے استحکام کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔" اس نے مزید کہا کہ "متصادم نظریات کی آج کل کی دنیا میں جن اقوام نے حال ہی میں مکمل خودمختاری حاصل کی ہے وہ ذہنی انتشار اور نتیجتاً عدم استحکام کا شکار ہوسکتی ہیں۔ اس لئے کیا یہ بات اطمینان بخش نہیں ہے کہ ایسی اقوام میں کم از کم ایک قوم ایسی ہے جو اس قسم کے ذہنی انتشار میں مبتلا نہیں ہے اور جو روایتاً اور عقیدۃً، جمہوریت اور معاشرتی و معاشی انصاف کے واضح اور قابل فہم اصولوں کی پابندی کا عہد کئے ہوئے ہے۔"[3] لیاقت کی ان تقریروں سے بالکل واضح تھا کہ وہ امریکہ کے ارباب اقتدار، سیاسی لیڈروں اور اہل الرائے عناصر کو یہ یقین دلا رہا تھا کہ سوویت یونین اور اینگلو۔ امریکی بلاک کے درمیان سرد اور گرم جنگ میں پاکستان اسلام کی آڑ لے کر اینگلو۔ امریکی بلاک کا بہر قیمت ساتھ دے گا۔ چنانچہ نیویارک ٹائمز نے اس کی تقریروں سے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا۔[4] اس اخبار کا اداریہ یہ تھا "وزیراعظم لیاقت علی خان نے اشارۃً یہ بتا دیا ہے کہ ہر جگہ آزاد لوگوں کو جو خطرہ لاحق ہے وہ اس سے بے خبر نہیں ہے...... اس نے یہ واضح کر دیا ہے کہ پاکستان کو جو خطرہ لاحق ہے وہ اسے سمجھتے ہیں اور وہ اپنے دفاع کا تہیہ کئے ہوئے ہیں۔"[5]

امریکی حکام نے پاکستان کو اسلحہ دینے سے انکار کر دیا

6 رمئی کو وزیر اعظم لیاقت علی خان نے امریکہ کے وزیر دفاع لوئس جانسن (Louis Johnson) سے تقریباً پندرہ منٹ تک ملاقات کر کے دفاع کے بارے میں عمومی طور پر بات چیت کی اور پھر وہ امریکہ کے چیئرمین جائنٹ چیف آف سٹاف جنرل عمر بریڈلے (Omar Bradley) سے ملا۔ ان ملاقاتوں کے دو ہفتے بعد ڈان کی رپورٹ یہ تھی کہ ''پاکستان کے وزیر اعظم نے امریکہ کے وزیر دفاع اور جائنٹ چیف آف سٹاف کے چیئرمین سے خفیہ ملاقاتوں میں انہیں پاکستان کی اسلحہ کی ضروریات سے آگاہ کیا۔ اس نے اپنی قوم کی سٹریٹجک پوزیشن اور پاکستان کے کمیونسٹ دشمن مسلم فوجیوں کی لڑائی کی صلاحیتوں پر زور دیا۔''[6] تاہم یہ ملاقاتیں بارآور نہ ہوئیں۔ امریکی حکام نے پاکستان کی ''نہایت عمدہ'' مسلح افواج کے لئے جدید ترین اسلحہ سپلائی کرنے سے معذوری ظاہر کر دی۔ انہوں نے بالکل اسی طرح انکار کیا جس طرح کہ انہوں نے 1949ء میں پاکستان کے محکمہ دفاع کے سیکرٹری اسکندر مرزا کے دورہ کے موقع پر کیا تھا۔ ان کے اس انکار کی وجہ بھی وہی تھی جس کا اظہار انہوں نے 1949ء میں کیا تھا یعنی یہ کہ اگر تنازعہ کشمیر کی موجودگی میں پاکستان کو اسلحہ دیا گیا تو ہندوستان خفا ہو جائے گا اور چین میں اشترا کی انقلاب کے پیش نظر ہندوستان کی خفگی امریکہ کے مفاد میں نہیں تھی۔

لیاقت نے اپنی تقریروں میں امریکیوں کی تعریف و توصیف اور کمیونسٹ قوتوں اور سوویت یونین کے خلاف خدمات انجام دینے پر اپنا زور بیان صرف کر دیا

تاہم لیاقت علی خان نے اپنے امریکہ میں قیام کے دوران مزید جو تقریریں کیں اور جو بیانات دیئے ان کا نفس مضمون متذکرہ تقریروں اور بیانات جیسا ہی تھا۔ مثلاً اس نے کہا کہ ''پاکستانیوں کی گردونواح کی دنیا میں تاریک قوتیں تہذیب کی اس مشعل کو بجھانے کے لئے برسرکار ہیں جس کو لبرل ادارے، جیسے کہ تمہارا ہے، روشن رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن کوئی دھمکی یا ترغیب، کوئی مادی نظریہ یا نظریاتی کشمکش پاکستانیوں کو ان کے اپنے نظریے سے منحرف

نہیں کرسکتی۔ پاکستان کے اسلامی نظریے کے باعث نہ صرف پاکستان میں استحکام ہے بلکہ اس سے پاکستان اور مشرق وسطیٰ کے ممالک کے درمیان مذہبی اور ثقافتی روابط قائم ہوئے ہیں اور یہ روابط ایشیا میں استحکام کا عنصر ثابت ہوں گے...... پاکستان آزاد اور امن پسند اقوام کے ساتھ تعاون اور ان کی خیر سگالی سے معاشرتی ترقی کو بے انتہا اہمیت دیتا ہے...... نظریاتی اور جنگی نقطہ نگاہ سے پاکستان پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور اس نے تہیہ کیا ہوا ہے کہ وہ ایشیا میں استحکام کے لئے اپنا پورا زور لگا دے گا...... پاکستان دنیا کے آزادی پسند لوگوں کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہے۔ اگر امریکہ یہ فیصلہ کرے کہ تخریب کے سدباب کے لئے بہترین طریقہ یہ ہے کہ تعمیر کی جائے تو پاکستان کے عوام اس کے بہترین دوست ہوں گے...... مجھے امید ہے کہ مستقبل کی تشکیل اس طرح ہوگی کہ امن برقرار رکھنے کے نیک کام میں اور جمہوریت کے تعمیری خوابوں کو حقیقت کا جامہ پہنانے میں کامریڈ ہوں گے۔"[7] ایک اور جگہ اس نے کہا کہ "پاکستان دو حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کی ایک سرحد برما سے ملتی ہے۔ گزشتہ جنگ میں جاپانیوں کی پیش قدمی اس سرحد کے نزدیک ہی روکی گئی تھی۔ دوسری سرحد ایران اور افغانستان سے ملتی ہے اور اس کا محل وقوع مشرق وسطیٰ کے تیل سے بھرپور علاقوں کی مواصلات کے نقطہ نگاہ سے بہت اہم ہے۔ پاکستان کا یہ حصہ ان پہاڑی دروں کو بھی کنٹرول کرتا ہے جہاں سے ماضی میں برصغیر پاک و ہند پر 90 مرتبہ حملے ہو چکے ہیں۔ بہت سے لوگ ایشیا کو دو حصوں میں یعنی جنوب مشرقی ایشیا اور مشرق وسطیٰ میں تقسیم کرتے ہیں۔ پاکستان اپنی مخصوص جغرافیائی صورتحال کی وجہ سے ایشیا کے ان دونوں حصوں کے واقعات میں بڑی دلچسپی رکھتا ہے اور اس بنا پر اس کی پوزیشن بہت نازک ہے۔"[8]

لیاقت علی خان امریکہ کے مختلف شہروں میں اس قسم کی تقریریں کرتے ہوئے 24 رمئی کو نیواورلینز (New Orleans) پہنچا تو مقامی انٹرنیشنل ہاؤس کے صدر لائیڈ جے کاب (Loyd J.Cobb) نے اس کے اعزاز میں ایک عشائیہ دیا اور اس موقع پر اس نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "پاکستان کی نوزائیدہ قوم نے کمیونزم کے خلاف بہت مضبوط اور جرأت مندانہ موقف اختیار کیا ہے۔ کمیونزم مسلم عقیدہ کے اتنا خلاف ہے جتنا کہ یہ مسیحیت کے خلاف ہے۔ پاکستان کی نوزائیدہ قوم درہ خیبر کے چوکیدار کی مانند ہے اور اس حیثیت سے یہ برصغیر کے لئے اور مشرق وسطیٰ کے لئے کمیونزم کے خلاف ایک دفاعی دیوار ہے، جو شمال کی

جانب سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔''[9]

وزیراعظم لیاقت علی خان نے امریکہ میں اپنے قیام کے دوران جب اینگلو۔امریکی بلاک کے ساتھ اپنی وابستگی اور وفاداری کا بار بار یقین دلایا تو اس کے ساتھ ہی اس نے اسلامی طرز زندگی کے بارے میں اپنے تصور کی بھی خوب تبلیغ کی۔ اگرچہ امریکیوں کے لئے اس کے اس تصور میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس کا اسلامی طرز زندگی کا تصور مغرب کے بورژوا طرز زندگی کے تصور کے عین مطابق تھا۔ اس لئے جہاں کہیں بھی اور جب کبھی بھی اس نئے اسلامی طرز زندگی کا ذکر کیا تو اس کا مطلب یہی سمجھا گیا کہ یہ شخص بورژوا طرز زندگی پر اسلام کا لیبل لگا رہا ہے کیونکہ اس کی داخلی سیاست کا تقاضا یہی ہے۔ اس نے مارچ 1949ء میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی سے قرارداد مقاصد بھی اسی تقاضے کے تحت منظور کروائی تھی۔

پاکستان کی جانب سے کمیونزم کے سدباب کے لئے دولت مشترکہ کے 15 ملین پونڈ کے فنڈ میں رقم کا عطیہ اور چین کے خلاف باگیو کانفرنس میں شرکت

لیاقت علی خان نے امریکہ میں سرمایہ دارانہ سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام سے اپنی محبت اور اشتراکی طرز زندگی سے اپنی نفرت کا اظہار صرف زبانی طور پر ہی نہیں کیا تھا بلکہ اس دوران اس کی حکومت نے عملاً بھی پاکستان کی اس نظام زندگی سے وابستگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس سلسلے میں پہلا عملی مظاہرہ 20 رمئی کو سڈنی میں ہوا جبکہ دولت مشترکہ کانفرنس نے جنوب اور جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک کو کمیونسٹ خطرے کے سدباب کے لئے 15 ملین پونڈ کی امداد دینے کا فیصلہ کیا۔ یہ امداد اس 8 ملین پونڈ کی امداد کے علاوہ تھی جو ان ممالک میں ٹیکنیکل امداد کے لئے منظور کی گئی تھی۔ اس کانفرنس میں آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، ہندوستان، پاکستان، کینیڈا، سیلون اور برطانیہ نے شرکت کی تھی۔ اس کانفرنس کے پس منظر میں ملایا میں کمیونسٹوں کی زبردست بغاوت تھی اور اس میں پاکستان کی نمائندگی وزیر صنعت چودھری نذیر احمد خان نے کی تھی۔ اس شخص کا 13 رمئی کو سڈنی پہنچتے ہی اعلان یہ تھا کہ ''ہر جانب مایوسی دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے۔ میرا ایمان ہے کہ اس صورتحال میں کوئی بہتری نہیں ہو گی جب تک ساری دنیا میں روحانیت کا احیا نہیں ہو گا۔ ایسی روحانیت جو ہر رنگ سے بالاتر ہو۔'' اس نے کہا کہ ''اگر یہ کانفرنس بڑے پیمانے پر امداد دیئے

بغیر محض قرارداد منظور کر کے ختم ہوگئی تو یہ ناکام ہوگی اور اس کا کوئی مقصد پورا نہیں ہوگا۔ محض یہاں وہاں چھوٹے چھوٹے اقدامات سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔" اس نے امریکی امداد کا ذکر کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی کہ "بدقسمتی سے امریکہ اس خیال کی طرف زیادہ مائل ہے کہ اگر متعلقہ ملک کی کمزوری کو پیش نظر رکھ کر اسے ڈالر دے دیئے جائیں تو یہ ملک کمیونزم کا مقابلہ کر سکے گا۔ مجھے امید ہے کہ یہ کانفرنس ایسی غلطی نہیں کرے گی۔ اکا دکا اقدامات کروڑوں غریب عوام کا معیار زندگی بلند کرنے کے مسئلہ کو ذرا سا بھی حل نہیں کریں گے۔" اس نے کہا کہ "یہ خیال کرنا غلطی ہے کہ صرف غربت ہی کسی ملک کو کمیونزم قبول کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ امریکہ نے اچھی طرح نہیں سمجھا کہ اسلام کمیونزم کے سامنے ایک ایسی رکاوٹ ہے جسے عبور نہیں کیا جا سکتا۔ مسلمانوں کے مذہب میں نجی ملکیت اور نجی کاروبار کے اصول شامل ہیں اور وہ زندگی کے طور طریقوں پر پابندی یا کنٹرول کے اصول کے سخت خلاف ہے جو کمیونزم کا جزو ہے۔"[10] دولت مشترکہ کانفرنس 20 رمئی 1950ء کو ختم ہوئی۔

پاکستان کی جانب سے اینگلو امریکی بلاک سے وابستگی کا دوسرا عملی مظاہرہ 26 رمئی 1950ء کو ہوا جبکہ اس نے باگیو میں چین مخالف کانفرنس میں شرکت کی۔ یہ کانفرنس فلپائن کے صدر کورینو نے طلب کی تھی اور اس میں ہندوستان، پاکستان، آسٹریلیا، انڈونیشیا، تھائی لینڈ اور سیلون کے نمائندوں نے شرکت کی۔ یہ کانفرنس بلائی تو اس مقصد کے تحت گئی تھی کہ اشتراکی چین کے خلاف ایشیائی ملکوں کے درمیان فوجی گٹھ جوڑ کے لئے زمین ہموار کی جائے گی لیکن ہندوستان کی مخالفت کے باعث اس مسئلہ پر بات آگے نہ بڑھ سکی اور فیصلہ صرف یہ ہوا کہ ثقافتی شعبے میں عمومی طور پر تعاون کریں گے۔ ہندوستان کی اس مخالفت کے مؤثر ہونے کی ایک وجہ یہ تھی کہ امریکہ اس وقت کے حالات میں اس تجویز کو ممکن العمل نہیں سمجھتا تھا کہ بحر الکاہل کے علاقے کے ممالک میں کوئی فوجی معاہدہ کروایا جائے۔ امریکی وزیر خارجہ ڈین اچی سن 12 رجنوری 1950ء کو یہ بیان دے چکا تھا کہ ایشیائی ممالک کی اصل ضرورت یہ ہے کہ ان کے معاشی حالات میں بہتری پیدا کی جائے۔ امریکہ کی جانب سے اس سلسلے میں ہندوستان سے اتفاق کی بنیاد اس کی اس امید پر تھی کہ بہت جلد تبت کے معاملے پر ہندوستان اور اشتراکی چین میں تصادم ہو جائے گا۔ نہرو کی حکومت 27 رجولائی 1949ء کو اعلان کر چکی تھی کہ ہندوستان نے تبت پر چین کے اقتدار

اعلیٰ کو کبھی بھی تسلیم نہیں کیا تھا اور 13 رمئی 1950ء کو پیکنگ ریڈیو کا ایک نشریہ میں الزام یہ تھا کہ
"حکومت امریکہ اور حکومت ہندوستان نے چین کے صوبہ تبت میں مسلح مداخلت کرنے کی سازش
کی ہے۔ اس سازش کے مطابق امریکہ ہتھیار سپلائی کرے گا اور یہ ہتھیار کلکتہ سے ایک امریکی
مشن کی وساطت سے تبت پہنچائے جائیں گے۔"

وزیراعظم لیاقت علی خان امریکہ سے 30 رمئی کو کینیڈا پہنچا تو اس نے اٹاوہ میں ایک
پریس کلب کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ جو لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میں اسلحہ کیوں خرید رہا ہوں
وہ اس حقیقت کو نظرانداز کرتے ہیں کہ پاکستان درہ خیبر کا دفاع کرتا ہے جہاں سے ماضی میں
برصغیر پر 90 مرتبہ حملہ ہو چکا ہے۔ اس نے کہا کہ مجھے نہیں معلوم کہ درہ خیبر سے چند میل دور
روسیوں کے پاس کتنی فوجیں ہیں نہ انہوں نے اس سلسلے میں مجھے مطلع کیا۔"[11] 31 رمئی کو لیاقت
نے کینیڈا کی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس کو خطاب کیا جس میں اس نے امید
ظاہر کی کہ برطانوی دولت مشترکہ جنگ و جارحیت کا سدباب کر کے کروڑوں عوام کو مکمل تباہی کے
خطرے سے نجات دلائے گی۔ 2 رجون کو اس نے کینسنگٹن (Kensington) میں ایک تقریر میں
کہا کہ "پاکستان کے ظہور کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ایشیا کے قلب میں 8 کروڑ عوام ایک دم سیاسی طور پر
متحد ہو گئے ہیں۔ ان 8 کروڑ عوام کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے اور یہ مسلمان مذہبی عقیدہ کے
لحاظ سے جمہوریت پسند ہیں۔ نظریاتی تصادموں کی دنیا میں ہمارا اسلامی طرز زندگی اخلاقی خلفشار
کے خلاف بہت تحفظ مہیا کرتا ہے۔ بالخصوص دنیا کے ایسے حصوں میں جہاں نوزائیدہ اقوام کے قوم
پرستی کے جذبہ اور عوام کی پسماندگی سے بدامنی و بے چینی کے حالات پیدا ہوتے ہیں۔"[12]

کوریا کی جنگ اور لیاقت کا اپنی کابینہ اور پارلیمنٹ سے مشورہ کے بغیر مکمل طور پر امریکہ کا ساتھ دینے کا اعلان

جنگ و جارحیت اور انتشار و بدامنی کے خلاف وزیراعظم لیاقت علی خان کے
مذکورہ اعلانات کے تقریباً دو ہفتے بعد 19 رجون کو امریکی محکمہ خارجہ کے مشیر جان فاسٹر ڈلس
(John Foster Dulles) نے سیول میں جنوبی کوریا کی قومی اسمبلی کو خطاب کرتے ہوئے
امید ظاہر کی کہ شمالی کوریا کے عوام پر سے سوویت کمیونزم کی گرفت ٹوٹ جائے گی اور وہ جنوبی کوریا

سے متحد ہو جائیں گے۔ 20 / جون کو ڈلس نے فوجی افسروں کے ہمراہ شمالی کوریا کی سرحد کا معائنہ کیا۔ 21 / جون کو اس نے ٹوکیو جا کر جنرل میکارتھر (MacArthur)، محکمہ دفاع کے وزیر لوئس جانسن اور جنرل عمر بریڈلے سے کانفرنس کی۔ 22 / جون کو ڈلس نے جنرل میکارتھر سے ایک اور ملاقات کے بعد پیش گوئی کی کہ امریکہ مشرق بعید میں امن کے تحفظ کے لئے مثبت اقدام کرے گا اور اس کی اس پیش گوئی کے بعد 25 / جون کو جنوبی کوریا اور شمالی کوریا میں جنگ شروع ہوگئی۔ اسی دن امریکہ کی تحریک پر اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے ایک قرارداد میں جنگ بندی کا مطالبہ کر کے شمالی کوریا کو ہدایت کی کہ وہ اپنی فوجیں واپس بلا لے۔ کونسل نے اقوام متحدہ کے سارے رکن ممالک کو بھی ہدایت کی کہ وہ اس قرارداد کی تعمیل کے لئے ہر ممکن اعانت کریں۔ 27 / جون کو امریکی صدر ٹرومین نے جاپان میں مقیم امریکی فوجوں کو حکم دیا کہ وہ کوریا میں مداخلت کریں۔ اسی دن سلامتی کونسل نے ایک اور قرارداد میں اقوام متحدہ کے رکن ممالک سے سفارش کی کہ وہ جنوبی کوریا کی مطلوبہ امداد کریں۔ ہندوستان ان دنوں سلامتی کونسل کا رکن تھا اور اس نے کونسل کی ان دونوں قراردادوں کے حق میں ووٹ دیا۔ سوویت مندوب اس موقع پر کونسل کے اجلاس میں موجود نہیں تھا اور وہ ویٹو کے ذریعے ان قراردادوں کو مسترد نہ کر سکا کیونکہ سوویت یونین نے نیشنلسٹ چین کے اقوام متحدہ سے اخراج کے بارے میں اپنی قراردادوں کی ناکامی کے بعد جنوری 1950ء سے سلامتی کونسل کا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔

سلامتی کونسل کی جانب سے ان قراردادوں کی منظوری کے موقع پر پاکستان کا وزیر اعظم لیاقت علی خان اپنی غدودوں کا اپریشن کروانے کے بعد بوسٹن میں آرام کر رہا تھا۔ تاہم اس نے اس سلسلے میں بیان جاری کرنے میں ایک دن کی بھی تاخیر نہ کی۔ اس نے 27 / جون کو ہی ایک بیان میں اعلان کیا کہ ''اقوام متحدہ کوریا کی جنگ میں جو اقدام کرے گی حکومت پاکستان اس کی پوری تائید و حمایت کرے گی۔''[13] لیاقت علی خان نے یہ بیان اپنی کابینہ کے ارکان سے مشورہ کئے بغیر ہی دے دیا تھا۔ چنانچہ 29 / جون کو پاکستان ٹائمز میں برطانوی خبر رساں ایجنسی رائٹر کی خبر یہ تھی کہ ''کوریا کی صورتحال کے بارے میں لیاقت علی خان سے جو بیان منسوب کیا گیا ہے وہ وزیر اعظم کے نظریے کی عکاسی نہیں کرتا۔ اس سلسلے میں وزیر اعظم اپنی کابینہ سے مشورہ کے بعد ہی کوئی بیان جاری کرے گا۔''[14] لیکن پاکستان ٹائمز کی یہ رپورٹ محض قیاس آرائی پر مبنی تھی۔

لیاقت علی خان نے یہ بیان جاری کرنے سے پہلے اپنی کابینہ سے مشورہ کرنے کی دانستہ طور پر ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ چنانچہ 30 رجون کو اقوام متحدہ میں پاکستان کے قائم مقام مستقل نمائندہ آر۔ ایس۔ چھتاری نے سیکرٹری جنرل کے نام ایک خط میں وزیر اعظم کے اس بیان کی تصدیق کی اور یقین دلایا کہ سلامتی کونسل نے کوریا میں جنگ بند کرانے کے لئے جو اقدامات تجویز کئے ہیں حکومت پاکستان ان کی پوری حمایت کرے گی۔ اسی دن اقوام متحدہ میں پاکستانی نمائندے اے۔ ایس۔ بخاری کا اخباری اعلان یہ تھا کہ کوریا کی جنگ شمالی کوریا کی کھلی جارحیت کا نتیجہ ہے۔[15] پھر یکم جولائی کو لیاقت علی نے ایک اور بیان میں کہا کہ ''پاکستان نے جنوبی کوریا کی امداد کے بارے میں اقوام متحدہ کی قرارداد یہ جانتے ہوئے منظور کی ہے کہ اس کے مضمرات کیا ہیں۔''[16]

یکم جولائی 1950ء کو لندن میں برطانوی دولت مشترکہ ممالک کے ہائی کمشنروں کو محکمہ خارجہ میں طلب کر کے کوریا کی جنگ کے بارے میں ان کے ممالک کا ردعمل معلوم کیا گیا اور انہیں بتایا گیا کہ برطانوی کابینہ نے بحرالکاہل کے علاقے میں برطانوی امداد کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے۔ اسی دن شام کو کراچی سے حکومت پاکستان نے سرکاری طور پر یہ اعلان کیا کہ ''پاکستان کوریا کی جنگ کے بارے میں سلامتی کونسل کے مجوزہ اقدامات کی پوری حمایت کرے گا اور حکومت پاکستان کے اس فیصلے سے اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کو مطلع کر دیا گیا ہے۔'' پاکستان ٹائمز کی رپورٹ یہ تھی کہ ''دارالحکومت میں حکومت پاکستان کے اس اعلان پر کوئی ردعمل نہیں ہوا۔ عام لوگوں کی رائے یہ ہے کہ پاکستان کو اس تنازعہ میں غیر جانبدار رہنا چاہیے۔ سیاسی مبصر اس اعلان کو بہت اہم سمجھتے ہیں کیونکہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اگر امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان جنگ شروع ہوگئی تو پاکستان کیا موقف اختیار کرے گا۔''[17]

2 رجولائی کو وزیر اعظم لیاقت علی خان لندن پہنچا تو اس سے اگلے دن 3 رجولائی کو تقریباً 50 برطانوی اور غیر ملکی نامہ نگاروں کو خطاب کرتے ہوئے اس نے کہا ''میری حکومت کی رائے یہ ہے کہ شمالی کوریا کی حکومت نے جارحیت کا ارتکاب کیا ہے اور پاکستان نے اپنی اس رائے کے بارے میں سلامتی کونسل کو مطلع کر دیا ہے۔ حکومت پاکستان نے کوریا کی صورتحال کے بارے میں سلامتی کونسل کی قرارداد منظور کر لی ہے اور پاکستان اس قرارداد کے مطابق اپنے ذرائع کے مطابق ہر امداد کرے گا۔ جب اس سے امداد کی نوعیت کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے کہا

کہ ہمیں اس سلسلے میں پتہ کرنا ہوگا کہ کس قسم کی امداد درکار ہے۔'' اس نے رائٹر کی اس رپورٹ پر افسوس کا اظہار کیا جس میں یونائیٹڈ پریس آف امریکہ کی بوسٹن کی اس رپورٹ کی تردید کی گئی تھی کہ پاکستان سلامتی کونسل کی قرارداد کی پابندی کرے گا۔ اس نے کہا کہ ''رائٹر ایک ذمہ دار ایجنسی ہے۔ مجھے معلوم نہیں اس نے اس رپورٹ کی کیوں تردید کی تھی۔ میں نے بوسٹن کے ہسپتال میں یونائیٹڈ پریس آف امریکہ کے نامہ نگار سے بات کی تھی اور میں نے اسے بتایا تھا کہ پاکستان کی رائے میں شمالی کوریا نے جارحانہ اقدام کیا ہے اور پاکستان سلامتی کونسل کی قرارداد منظور کرے گا۔ مجھے کراچی سے یہ اطلاع پا کر بہت افسوس ہوا تھا کہ رائٹر نے اس رپورٹ کی تردید کر دی ہے اور کہا ہے کہ اس معاملہ کا فیصلہ حکومت پاکستان کرے گی۔''[18] 4 رجولائی کو لیاقت علی خان نے کلیرجز (Claridges) ہوٹل میں پھر ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے اپنے اس فیصلہ کا اعادہ کیا کہ اقوام متحدہ کوریا میں جارحیت کے خاتمہ کے لئے جو فیصلے کرے گی پاکستان ان پر عمل کرے گا۔ اس نے کہا کہ ''امریکہ ایشیا کے پسماندہ ممالک میں وہ کچھ نہیں کر رہا ہے جو اسے کرنا چاہیے۔ معلوم ہوتا ہے کہ فی الحال وہ روس کے ساتھ اپنے مسائل میں الجھا ہوا ہے۔ ایشیا میں کمیونزم کا مؤثر جواب محض قومی اتحاد نہیں ہے بلکہ پسماندہ ممالک کی اقتصادی ترقی میں ہے۔''[19]

پاکستانی فوج کا ایک بریگیڈ کوریا بھیجنے کا فیصلہ مگر رائے عامہ کے دباؤ کی وجہ سے اس پر عمل نہ ہو سکا

کوریا کی اس جنگ میں امریکی سامراج کا ساتھ دینے کے بارے میں لیاقت علی خان کا یہ فیصلہ نہایت احمقانہ تھا۔ اس نے اپنی کابینہ سے مشورہ کئے بغیر یہ فیصلہ کرتے ہوئے نہ تو یہ سوچا تھا کہ امریکہ اس فیصلے کے عوضانہ یا انعام کے طور پر پاکستان کو کیا دے گا اور نہ ہی یہ سوچا تھا کہ پاکستان کی، بالخصوص پنجاب کی، رائے عامہ اس فیصلے کو قبول کرے گی یا نہیں۔ اس کے اس ناعاقبت اندیشانہ فیصلے کے مطابق پاکستانی فوج کا ایک بریگیڈ کوریا جانے کے لئے تیار کر دیا گیا تھا اور امریکہ نے اس بریگیڈ کے لئے جدید ہتھیار مہیا کرنے پر آمادگی بھی ظاہر کر دی تھی مگر حکومت پاکستان میں بعض محب الوطن عناصر کے مشورے کے پیش نظر اور پنجاب کی رائے عامہ کے دباؤ کے تحت وہ لندن سے جولائی کے وسط میں واپسی پر اس بریگیڈ کو کوریا نہ بھیج سکا۔ اس کا 1949ء

میں دورہ ماسکو کا پروگرام ظفراللہ خان اینڈ کمپنی کی سازش کی وجہ سے پورا نہیں ہوا تھا اور اس کے اس دوسرے فیصلے پر ایم۔اے۔ایچ۔اصفہانی اینڈ کمپنی کے دباؤ کی بنا پر عملدرآمد نہ ہو سکا۔گویا لیاقت علی خان نے خارجہ پالیسی کے بارے میں 50-1949ء میں دو بڑے فیصلے کئے اور یہ دونوں ہی فیصلے تشنہ تکمیل رہے۔ایم۔اے۔ایچ۔اصفہانی لکھتا ہے کہ ''جب یہ بریگیڈ بھیجنے کی تیاری ہو رہی تھی تو واشنگٹن سے یہ پوچھا گیا تھا کہ اگر ہندوستان نے پاکستان پر حملہ کر دیا تو کیا امریکہ پاکستان کی امداد کرے گا۔چونکہ امریکہ نے اس مضمون کی یقین دہانی کرانے سے انکار کر دیا تھا، اس لئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ پاکستانی فوج کوریا نہیں بھیجی جائے گی۔''[20] اس فیصلے کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ پنجاب میں جہاں کی افرادی قوت پر مشتمل یہ بریگیڈ تیار کیا گیا تھا، اس بات پر سخت برہمی پائی جاتی تھی کہ لیاقت علی خان نے پہلے یکم جنوری 1949ء کو محض برطانیہ کے حکم کی تعمیل میں کشمیر میں جنگ بند کرا دی تھی اور اب اس نے تنازعہ کشمیر کا کوئی تصفیہ کرائے بغیر پنجابی فوج کو کوریا بھیجنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔پنجاب میں برطانیہ اور اس کی دولت مشترکہ کے خلاف جذبات بہت **برانگیختہ** تھے۔ انتخابی مہم کے دوران پنجاب کے درمیانہ طبقہ کی شہری رائے عامہ اینگلو۔امریکی سامراج کے خلاف نعرے لگا رہی تھی اور یہ الزام لگا رہی تھی کہ لیاقت علی خان اینگلو۔امریکی بلاک کا پٹھو ہے۔اسی لئے یہ ماسکو جانے کی بجائے امریکہ چلا گیا ہے حالانکہ اسے دورہ ماسکو کی دعوت پہلے کی ملی ہوئی تھی۔اس کی حکومت نے سوویت یونین سے سفارتی تعلقات قائم کرنے میں اتنی زیادہ تاخیر کی تھی اور اس نے سوویت یونین کے ساتھ تجارتی معاہدہ بھی نہیں کیا تھا۔اس رائے عامہ کا مطالبہ یہ تھا کہ اگر برطانیہ اور امریکہ تنازعہ کشمیر کا منصفانہ تصفیہ نہیں کراتے تو پاکستان کو اینگلو۔امریکی بلاک کا خیمہ بردار رہنے کی بجائے غیر جانبدارانہ پالیسی اختیار کرنی چاہیے۔جب جون 1949ء میں لیاقت علی خان کو دورہ ماسکو کی دعوت ملی تھی تو پنجاب کی رائے عامہ نے اس کا پرجوش خیر مقدم کیا تھا۔پاکستان کے عوام اور خاص طور پر پنجاب کے عوام کی رائے کے رخ کا تعین پاکستان اور ہندوستان کے قومی تضاد اور تنازعہ کشمیر کی بنیاد پر ہوتا تھا۔یہی وجہ تھی کہ جب لیاقت علی خان نے جولائی کے اوائل میں لندن میں یہ اعلان کیا تھا کہ جنوبی کوریا پر شمالی کوریا کا حملہ ایک جارحانہ اقدام ہے اور پاکستان حسب استطاعت (جنوبی کوریا کو) ہر ممکن امداد دے گا تو روزنامہ نوائے وقت کا تبصرہ یہ تھا کہ ''اگر ہمارے لائق وزیراعظم کو اونچے مسائل سے فرصت ملے تو

مسٹر ایٹلی کی معرفت یو۔ این۔ او اور امریکہ سے اتنا تو پوچھیں کہ کیا کشمیر پر ہندوستان کا فوجی قبضہ ایک جارحانہ اقدام نہیں اور اگر ہندوستان کی کاروائی ایک جارحانہ اقدام ہے تو یو۔ این۔ او، کامن ویلتھ، برطانیہ اور امریکہ کشمیر میں قیام امن کے لئے کیا مدد دیں گے؟ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے کشمیر یقیناً جنوبی کوریا کے مقابلہ پر زیادہ اہم اور فوری توجہ کا مستحق ہے۔''[21]

نہرو کی امریکہ میں بہت زیادہ پذیرائی کے باوجود جنگ کوریا میں اس کا غیر جانبداری کا رویہ، لیاقت کی امریکہ میں کم پذیرائی ہوئی مگر جنگ کوریا میں اس نے امریکی پٹھو کا کردار ادا کیا

لیاقت علی خان کی جانب سے پاکستانی فوج جنوبی کوریا نہ بھیجنے کی تیسری وجہ یہ تھی کہ اگرچہ ہندوستان نے سلامتی کونسل کی 25/جون اور 27/جون کی قراردادوں کے حق میں ووٹ دیا تھا اور اگرچہ 3/جولائی کو نئی دہلی کے محکمہ خارجہ کے ایک ترجمان کے بیان کے مطابق ہندوستان نے اقوام متحدہ کو مطلع کیا تھا کہ وہ ''جنوبی کوریا کو فوجی امداد دے گا حالانکہ اس کی فوج تھوڑی ہے اور وہ تھوڑی سی فوج کشمیر، حیدرآباد اور ہندوستان کے ایسے علاقوں میں بکھری ہوئی ہے جہاں کمیونسٹ سرگرم عمل ہیں۔''[22] لیکن جولائی کے دوسرے ہفتے میں ہندوستان کے وزیراعظم نہرو نے چین میں ہندوستانی سفیر کے۔ ایم۔ پانیکر کے مشورے کے مطابق اپنی اس پالیسی میں تبدیلی کر دی تھی۔ اس نے اپنی حکومت کی پالیسی میں اس تبدیلی کا اعلان کرنے کے لئے 7/جولائی کو ایک پریس کانفرنس کی جس میں اس نے پہلے تو جنوبی کوریا کے خلاف شمالی کوریا کے اچھی طرح سوچے سمجھے جارحانہ حملے پر نکتہ چینی کی اور پھر اس نے کہا کہ ہندوستان نے جب کوریا میں جنگ بندی اور جنوبی کوریا کی اعانت سے متعلقہ سلامتی کونسل کی قرارداد منظور کی تھی تو اسے یہ توقع نہیں تھی کہ اس قرارداد کو وسیع کر دیا جائے گا۔ اس عظیم بحران میں ہندوستان یہی مدد کر سکتا ہے کہ وہ تصادم کے علاقے کو محدود رکھنے میں اور اس تصادم کو ختم کرنے میں مدد کرے۔ ہندوستان بیچ بچاؤ کرنے کی صرف اسی صورت میں پیشکش کر سکتا ہے کہ متعلقہ ارباب اختیار اس امر کی درخواست کریں۔ لیکن اگر گفت وشنید یا بات چیت یا میٹنگ وغیرہ کے ذریعے امن کا کوئی امکان ہو تو میں اس مقصد کے لئے کرۂ ارض کے آخری کنارے تک جانے کو تیار ہوں۔ نہرو نے خیال ظاہر کیا کہ سلامتی

کونسل صرف اسی صورت میں کوریا میں جنگ کو بعجلت ختم کر کے امن بحال کر سکتی ہے کہ عوامی جمہوریہ چین کو سلامتی کونسل میں شامل کیا جائے اور سوویت یونین کونسل میں واپس آجائے۔''[23]
نہرو کی اس پریس کانفرنس سے بالکل واضح تھا کہ اس کی حکومت کوریا کی جنگ کے بارے میں اپنے 25 اور 27 رجون کے موقف سے منحرف ہوگئی ہے اور اب وہ اس جنگ میں غیر جانبدارانہ اور ثالثی کا کردار ادا کرنے کا عزم رکھتی ہے۔ نہرو جب اکتوبر 1949ء میں امریکہ گیا تھا تو اس کی وہاں خوب آؤ بھگت ہوئی تھی اور جب اس نے امریکی کانگرس کو خطاب کیا تھا تو ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مگر اس کے باوجود اس نے امریکہ کی تجویز کے مطابق معاہدہ بحرالکاہل میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے برعکس جب لیاقت علی خان مئی 1950ء میں امریکہ گیا تھا تو اس کی وہاں کوئی خاص پذیرائی نہیں ہوئی تھی۔ وہ جب 4رمئی کو سینیٹ کو خطاب کرنے گیا تھا تو اسے تقریباً نصف گھنٹہ انتظار کرنا پڑا تھا کیونکہ ایوان کا کورم پورا نہیں تھا۔ پھر جب اس نے امریکہ کے محکمہ دفاع کے افسروں سے جدید اسلحہ کی خریداری کی بات کی تھی تو وہاں سے کورا جواب ملا تھا۔ امریکہ کے وزیر دفاع نے اس سے صرف پندرہ منٹ ملاقات کی تھی۔ لیکن اس کے باوجود لیاقت علی خان تقریباً ایک ماہ تک اپنی تقریروں اور بیانات میں امریکیوں کو یہ یقین دلاتا رہا کہ پاکستان ان کے ساتھ وابستہ ہے اور ان کے ساتھ بہر قیمت وابستہ رہے گا۔ اور پھر 27رجون کو اس نے بوسٹن کے ہسپتال سے کوریا کی جنگ کے بارے میں امریکہ کی غیر مشروط ہر ممکن اور ہر قسم کی حمایت کا اعلان کر کے یہ ثابت کر دیا کہ وہ واقعی سامراجی پٹھو ہے اور اسے اپنے ملک کے مفاد اور وقار کا کوئی خیال نہیں۔ جب 3رجولائی کو اس نے لندن میں اپنے اس فیصلے کا زوردار الفاظ میں اعادہ کیا تو پاکستان کی رائے عامہ نے بہت برا منایا۔ جب 11رجولائی کو اس نے بی بی سی پر ایک نشریے میں شمالی کوریا پر ایک مرتبہ پھر جارحیت کا الزام عائد کیا اور خطرہ ظاہر کیا کہ کوریا کی یہ جنگ عالمی جنگ کی صورت اختیار کر سکتی ہے تو پاکستانی عوام کی خفگی میں اضافہ ہوا۔ جب 12رجولائی کو برطانیہ کے وزیر امور دولت مشترکہ گارڈن واکر نے پارلیمنٹ میں بتایا کہ ''پاکستان اور برطانیہ کے درمیان مشترکہ دلچسپی کے دفاعی سوالات اکثر زیر بحث آتے ہیں اور یہ کہ ہندوستان کا رویہ پاکستان کے ساتھ قریبی فوجی تعلقات کے راستے میں حائل نہیں ہوگا''[24] تو پاکستانیوں پر یہ تلخ حقیقت منکشف ہوئی کہ لیاقت حکومت، برطانوی سامراج کے ساتھ فوجی گٹھ جوڑ کی کافی عرصے سے خفیہ

بات چیت کرتی رہی ہے حالانکہ یکم جنوری 1949ء کے بعد سے پاکستان میں مسلسل اور پرزور مطالبہ ہوتا رہا تھا کہ دولت مشترکہ سے تعلقات منقطع کیے جائیں اور آزاد خارجہ پالیسی اپنائی جائے۔ اور پھر جب 13 رجولائی کوڈان میں امریکی سینیٹ کے حوالے سے یہ خبر چھپی کہ پاکستان نے کوریا میں امریکہ کے پولیس ایکشن کی حمایت کے لئے اپنی فوج بھیجنے کی پیشکش کی ہے اور اسی دن ماسکو میں ہندوستانی سفیر نے مارشل سٹالن کو ہندوستانی وزیراعظم نہرو کا ذاتی پیغام دیا تو پاکستانی عوام نے یہ محسوس کیا کہ لیاقت علی خان کے زیر اقتدار پاکستان کی حیثیت اینگلو۔امریکی سامراج کے ایک طفیلی خیمہ بردار ملک سے زیادہ نہیں جبکہ ہندوستان جواہرلال نہرو کی زیر قیادت ایک آزادانہ عالمی کردار ادا کرنے کی پوزیشن اختیار کر رہا ہے۔

جنگ کوریا میں لیاقت کے امریکی پٹھو کے کردار کے خلاف پاکستان میں شدید عوامی اور سیاسی ردعمل

لیاقت علی خان سیاسی لحاظ سے اس قدر کوتاہ اندیش تھا اور وہ بیوروکریسی پر اس قدر انحصار کرتا تھا کہ اس نے اس مسئلہ پر پاکستان کی اور خاص طور پر پنجاب کی رائے عامہ کی ناراضگی کی شدت کا کوئی احساس نہ کیا۔ وہ 13 رجولائی کو لندن سے واپس کراچی پہنچا تو پاکستان مسلم لیگ کا صدر چودھری خلیق الزماں اور اس کے دوسرے حاشیہ بردار ہوائی اڈے پر موجود تھے۔ جب وہ اپنے ہوائی جہاز سے اترا اور ''پرجوش'' استقبال کرنے والوں سے ملا تو اس موقع پر خلیق الزماں نے اس کی اور اس کی بیگم کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا جس میں اس نے کوریا کی جنگ کا ذکر کیا اور کہا کہ وزیراعظم نے اس سلسلے میں سلامتی کونسل کی تائید کرنے کا جو فیصلہ کیا ہم اس کی حمایت کرتے ہیں۔ اس نے کہا کہ اپنی کوتاہیوں اور نقائص کے باوجود اقوام متحدہ ہی واحد تنظیم ہے جو عالمی امن برقرار رکھ سکتی ہے۔'' لیاقت علی خان نے اس استقبالیہ کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ ''سلامتی کونسل نے کوریا میں جو کاروائی کی ہے اس سے اقوام متحدہ میں پھر جان پڑ گئی ہے۔ امید ہے کہ آئندہ سلامتی کونسل عالمی امن کے تحفظ کے لئے تیز رفتاری سے کام کرے گی اور بعجلت فیصلے کرے گی۔ اس نے کہا کہ میں نے سلامتی کونسل کی قرارداد منظور کرنے میں ایک منٹ کی بھی تاخیر اس لئے نہیں کی تھی کہ اس فیصلے سے یہ امید پیدا ہوگئی تھی کہ سلامتی کونسل کو، جو محض ایک مجلس مباحثہ

بنتی جا رہی تھی، عالمی امن برقرار رکھنے کے لیے ابھی تک بر سر عمل کیا جا سکتا ہے۔ اگر ایک مرتبہ جارحیت کی اجازت دی گئی تو چھوٹی اقوام کی آزادی خطرے میں پڑ جائے گی۔"[25]

لیاقت علی خان نے مذکورہ تقریر سے واضح کیا تھا کہ اسے کراچی پہنچنے تک اس امر کا بالکل احساس نہیں تھا کہ کوریا کی جنگ کے بارے میں اس کے فیصلے سے پاکستان میں کتنا شدید ردعمل ہوا ہے اور یہ کہ اس کے لئے عوام کے اس مخالفانہ ردعمل کے سیاسی نتائج نہایت نقصان دہ ہو سکتے ہیں بالخصوص پنجاب میں جہاں کے عوام روز بروز انتخابی بخار میں مبتلا ہو رہے تھے۔ پنجابی عوام کے ردعمل کی عکاسی نوائے وقت کے 6 رجولائی 1950ء کے اداریے میں ہوئی تھی جس کی تان اس فقرے پر ٹوٹی تھی کہ "جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے کشمیر یقیناً کوریا کے مقابلے پر زیادہ اہم اور فوجی توجہ کا مستحق ہے۔" لیکن بظاہر لیاقت علی خان نے پنجابیوں کے اس مخالفانہ ردعمل کو قابل توجہ نہ سمجھا اور وہ سلامتی کونسل کی قرارداد کی تائید وحمایت کی رٹ لگاتا رہا۔

لیاقت علی خان نے اپنے اس موقف پر اصرار کرتے ہوئے اس حقیقت کو بھی نظر انداز کیا کہ بیشتر عرب ممالک نے جن کے ساتھ وہ اپنے ملک کے تاریخی، مذہبی، تہذیبی اور ثقافتی رشتوں کا ذکر کرتے ہوئے نہیں تھکتا تھا، کوریا کی جنگ کے بارے میں سلامتی کونسل کی قرارداد کی حمایت نہیں کی تھی۔ عرب ممالک میں سے اس قرارداد کی مخالفت کرنے والوں میں شام اور مصر پیش پیش تھے۔ شام کی دستور ساز اسمبلی نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ شام کوریا کی جنگ میں غیر جانبدار رہے گا۔ اقوام متحدہ میں مصری نمائندے محمود فوزی کا نشری بیان یہ تھا کہ ہم مصر یا فلسطین کے معاملہ سے چشم پوشی نہیں کر سکتے۔ ہم اسے ہرگز نہیں بھول سکتے۔ آخر آپ یہ کیوں امید کرتے ہیں کہ مصر، جنوبی کوریا کو امداد دینے کی خاطر مصر اور فلسطین کو بھول جائے۔" مصر کے وزیر خارجہ ڈاکٹر صلاح الدین نے سلامتی کونسل کی قرارداد کی تائید کرنے سے انکار کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ اقوام متحدہ نے کوریا سے پہلے دوسرے جارحانہ اقدامات کے بارے میں اتنی عملیت سے کام نہیں لیا تھا" اور عرب لیگ کے سیکرٹری جنرل عزام پاشا کا اعلان یہ تھا کہ کوریا کے معاملے میں مصر نے عرب ملکوں کی ترجمانی کی ہے۔

نوائے وقت نے اپنے اداراتی تبصرے میں عربوں کے اس رویے سے اتفاق کرتے ہوئے پہلے تو ہندوستان کے وزیر اعظم نہرو کے اس بیان کا حوالہ دیا کہ "گو ہندوستان

نے سلامتی کونسل کی قرارداد کو قبول کرلیا ہے مگر وہ کسی بلاک کا ساتھ نہیں دے گا۔ اس لئے کہ اس نے کسی بلاک کا ساتھ دیا تو اس کا بین الاقوامی اثر صفر ہو جائے گا۔ اسے دوسرے ملکوں کی خیمہ برداری کرنی پڑے گی اور آنکھیں بند کر کے ان کی ہاں میں ہاں ملانی پڑے گی۔'' اور پھر یہ لکھا کہ ''ان سب ملکوں کے برعکس پاکستان کا اعلان یہ ہے کہ وہ اپنی استطاعت کے مطابق کوریا کی جنگ میں ہر ممکن مدد کرے گا، سوال یہ ہے کہ پاکستان کا رویہ ان ایشیائی اور مسلمان ملکوں سے کیوں مختلف ہے؟

1۔ کیا پاکستان اپنے مسائل (مثلاً کشمیر) سلجھا چکا ہے جواب اس نے اپنی توجہ کوریا پر مبذول کی ہے۔

2۔ کیا انڈونیشیا اور ہندوستان کے مقابلہ پر پاکستان کو جنوب مشرقی ایشیا کی حفاظت کا زیادہ خیال ہے؟

3۔ کیا پاکستان کے پاس وافر روپیہ اور سامان جنگ ہے جس سے ''حسب استطاعت'' جنوبی کوریا کی امداد کی جائے گی؟

4۔ یا پھر پاکستان کی آبادی ضرورت سے زیادہ بڑھ گئی ہے اور اس کا ایک علاج یہ بھی ہے کہ پاکستانی جوانوں کو ''جمہوریت کی حفاظت'' کے لئے کوریا بھیج دیا جائے۔

آخر کوئی وجہ تو ہو گی جو ہمارے محبوب وزیراعظم نے اپنی کابینہ کے ارکان سے مشورہ بھی ضروری نہیں سمجھا اور جنوبی کوریا کی ''حسب استطاعت'' امداد کا اعلان بوسٹن سے ہی کر دیا۔ اگر یہ وجہ پاکستان کے عوام پر ظاہر کر دی جائے تو وہ شرح صدر کے ساتھ جمہوریت کی حفاظت کی مہم میں حصہ لیں گے۔''[26]

لیاقت علی خان کی جانب سے نوائے وقت کے ان استفسارات کے جواب کی نہ تو کوئی توقع تھی اور نہ ہی اس نے کوئی جواب دیا۔ البتہ سوویت یونین کے ہفت روزہ ''نیو ٹائمز'' نے یہ لکھا کہ لیاقت علی خان اینگلو۔امریکن سامراجیوں کی خدمت گزاری میں ''کاسہ لیسوں کا سا جوش'' دکھا رہا ہے۔ ''نیو ٹائمز'' نے ایک ہندوستانی اخبار نیشن کا حوالہ دیا جس میں یہ رائے ظاہر کی گئی تھی کہ پاکستان سب سے بڑی مسلم مملکت کی حیثیت سے امریکہ کی مشرق قریب اور جنوب مشرقی ایشیا میں سامراجی پالیسی کا سب سے بڑا ستون ہو گا اور اس کے معاوضے میں اسے اسلحہ و گولہ

بارود ملے گا۔ نیوٹائمز نے مزید لکھا کہ لیاقت علی خان کا دورہ امریکہ کاسہ لیسانہ جوش کی غیر مبہم شہادت ہے جس سے وزیر اعظم پاکستان امریکی سامراجیوں کے ناپاک عزائم سے ربط پیدا کرنا چاہتا ہے۔ لیاقت علی خان ایشیا میں قومی آزادی کی تحریک کے خلاف اینگلو۔امریکی سامراجیوں کے تعمیل کنندہ کا کردار ادا کرنا چاہتا ہے۔ وہ کوریا میں امریکی جارحین کو جو امداد دے سکتا ہے وہ بلاشبہ معمولی ہوگی لیکن پاکستان کے وزیر اعظم کی طرف سے امریکی سامراجیوں کی خدمت گزاری کے لئے یہ آمادگی پاکستان کے لئے نہایت اہم اور نہایت افسوسناک نتائج پیدا کرسکتی ہے۔''[27]

13رجولائی کو نوائے وقت نے لیاقت علی خان کی پاکستان میں واپسی پر اس مسئلہ پر ایک اور اداریہ لکھا جو طنزیہ تنقید سے بھرپور تھا اور جس میں یہ رائے ظاہر کی گئی تھی کہ لیاقت علی خان نے امریکہ، کینیڈا اور برطانیہ کا جو 73 دن کا دورہ کیا ہے اس سے پاکستان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ اداریہ یہ تھا کہ ''عزت مآب لیاقت علی خان سیر و تفریح کے لئے امریکہ تشریف نہیں لے گئے تھے۔ بعض عظیم قومی مہمات و مسائل بھی ضرور ان کے پیش نظر رہتے ہوں گے۔ عوام یہی جاننا چاہتے ہیں کہ وزیر اعظم ان قومی معاملات و مسائل سے کس طرح عہدہ برآ ہوئے۔ خبر رساں ایجنسیوں، اخبارات اور ریڈیو کے ذریعے ان کی جو سرگرمیاں عوام تک پہنچیں وہ کچھ اس قسم کی ہیں۔

1۔ آنریبل لیاقت علی خان نے ہزاروں میل کا دورہ کر کے 30 سے زیادہ تقریریں کیں اور امریکی عوام کو پاکستان سے روشناس کرایا۔

2۔ صدر امریکہ، امریکن مدبروں، امریکن صنعت کاروں اور امریکہ کے اہل سرمایہ سے ملاقاتیں کر کے انہیں پاکستان کی سیاسی اہمیت اور مالی استحکام سے آگاہ کیا۔

3۔ ایک آدھ یونیورسٹی سے ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی اور بعض شہروں سے اعزازی حق شہریت قبول کیا۔

4۔ گلے کے غدودوں کا آپریشن کرایا۔

5۔ بوسٹن کے سینی ٹوریم سے کوریا کے متعلق حفاظتی کونسل کی قرارداد منظور کی اور ''حسب استطاعت'' ہر ممکن امداد کا یقین دلایا۔

6۔ پورے 25 منٹ تک ملک معظم سے شرف ہم کلامی حاصل کر کے پاکستان کی ملکہ افتخار کو آسمان تک پہنچا دیا اور مسٹر ایٹلی، مسٹر چرچل اور دوسرے برطانوی مدبروں

سے بھی ملاقات کی...... ہمیں سیاست کے اسرار و رموز سے قطعاً آگاہی نہیں (جب ملکی پارلیمنٹ کے ممبر تک ان سے ناواقف ہیں تو ہمارے جیسے عاجز آدمی ایسی باتوں کے متعلق کیونکر سوچ سکتے ہیں) مگر جب 29/اپریل کو ہمارے محبوب وزیر اعظم نے امریکہ کے لئے رخت سفر باندھا تو چند موٹی موٹی باتیں نہایت موٹی عقل کے پاکستانیوں کے نزدیک بھی توجہ کی مستحق تھیں اور ان کا خیال تھا کہ آنریبل لیاقت علی خان امریکہ و برطانیہ تشریف لے جا رہے ہیں تو وہ ان مسائل کا بھی ضرور ایسا حل ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے جس سے پاکستان مضبوط اور اس کی عزت میں اضافہ ہو۔ مثلاً

1۔ کشمیر کا مسئلہ ہر پاکستانی کے ذہن میں تھا۔

2۔ پاکستان کو سامان جنگ اور آرڈیننس فیکٹریوں کی جو سخت ضرورت ہے سب کو اس کا احساس تھا۔

3۔ پاکستان کی صنعتی پسماندگی ہر محب وطن کے لئے وجہ پریشانی تھی اور یہ سوال بھی زیر غور تھا کہ امریکہ اس معاملے میں کس حد تک پاکستان کی امداد کر سکتا ہے؟ اور پاکستان کو کن شرائط کے ماتحت یہ امداد قبول کرنی چاہیے۔

4۔ پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات کو بہتر بنانے کے لئے کامن ویلتھ کی مادر مہربان حکومت برطانیہ بھی کوئی قدم اٹھاتی ہے یا نہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ ہمارے محبوب وزیر اعظم جن کی انگلیاں ہر وقت عوام کی نبض پر رہتی ہیں پاکستانیوں کے دل کی دھڑکنوں سے ناواقف نہیں ہوں گے۔ جب انہوں نے صدر ٹرومین کے طیارہ میں قدم رکھا ہوگا اس وقت وہی باتیں ان کے ذہن میں ہوں گی جو پاکستانی عوام کے ذہن میں تھیں۔ ہمیں یقین ہے کہ انہوں نے اس سلسلہ میں بہت بڑے کارنامے انجام دیئے ہوں گے مگر اب تک انہوں نے ازراہِ انکسار اپنے کارناموں کو دوسروں سے چھپا کر رکھا ہے۔ ہم ان سے استدعا کریں گے کہ وہ اس معاملہ میں کسر نفسی سے کام نہ لیں بلکہ اپنی اولین فرصت میں اپنے دورہ امریکہ و برطانیہ کی مفصل رپورٹ اپنے ملک کے سامنے رکھیں تاکہ ان (عوام) کے حوصلے بلند ہوں۔"[28]

لیاقت کے دورہ امریکہ کا پاکستان اور اس کے عوام کو کوئی فائدہ نہ پہنچا......

دورہ کی ناکامی کی وجوہات

بلاشبہ لیاقت علی خان کے اس طویل دورہ سے پاکستان کے لئے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا۔ اس سے پاکستان کے بین الاقوامی وقار میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا بلکہ اس کو کچھ نقصان ہی پہنچا تھا۔ لیاقت نے اپنی تقریروں میں اسلام اور اسلامی طرز زندگی کے بارے میں اپنے تصور کی بہت تبلیغ کی تھی جس کا زیادہ تر مقصد یہ یقین دلانا تھا کہ پاکستان میں تھیوکریٹک نظام حکومت رائج نہیں ہوگا اور نہ ہی اس میں قرون وسطیٰ کی استبدادیت کا دور دورہ ہوگا بلکہ اس کا نظام حکومت مغرب کے بورژوا جمہوری نظام حکومت کے عین مطابق ہوگا۔ فرق صرف اتنا ہوگا کہ پاکستان کے بورژوا نظام پر اسلام کا لیبل لگا ہوگا۔ اس نے اپنی تقریروں میں تنازعہ کشمیر کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا اور بظاہر یہ کوشش نہیں کی تھی کہ اس تنازعہ کے منصفانہ تصفیہ کے لئے امریکی ارباب اقتدار اور عوام کی تائید وحمایت حاصل کی جائے۔ اس نے امریکہ کے محکمہ دفاع سے جدید اسلحہ کی درخواست کی تھی مگر اسے کورا جواب ملا تھا۔ البتہ فوجی ٹرکوں وغیرہ کی سپلائی کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اس نے امریکی سرمایہ داروں کو پاکستان میں سرمایہ داری کی بار بار دعوت دی تھی مگر امریکہ کی کسی کمپنی نے اس دعوت میں دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ مگر لیاقت علی خان کی اس ناکامی میں اس کا قصور کم تھا، زیادہ قصور ظفر اللہ خان اینڈ کمپنی کا تھا۔ یہ ٹولہ پاکستان کی خارجہ پالیسی کی تشکیل کا ذمہ دار تھا اور اس نے عزم کر رکھا تھا کہ یہ پاکستان کو بہرصورت و بہر قیمت اینگلو۔ امریکی بلاک سے وابستہ رکھے گا اور ہر اس کوشش کو ناکام کرے گا جو ملک کو بین الاقوامی میدان میں غیر جانبداری یا آزادی وخودمختاری کی راہ پر گامزن کرنے کے لئے کی جائے گی۔ لیاقت علی خان نے جدید اسلحہ کی فروخت اور سرمایہ کاری کے بارے میں امریکیوں کی سردمہری کے باوجود کوریا کی جنگ میں ان کی ''حسب استطاعت'' ہر ممکن امداد کرنے کا اعلان اسی مغرب نواز خارجہ پالیسی کے تحت کیا تھا۔ لیکن اس نے یہ فیصلہ کرتے ہوئے یہ غلطی کی تھی کہ پنجاب کے شہری درمیانہ طبقہ کی رائے عامہ کو نظرانداز کیا تھا۔ یہ رائے عامہ اینگلو امریکی بلاک کی غیر مشروط فوجی امداد پر رضامند نہیں ہوسکتی تھی۔ اس کا کم از کم مطالبہ یہ تھا کہ فوجی امداد کے عوض تنازعہ کشمیر کا تصفیہ پاکستان کے حق میں کروایا جائے یا

پاکستان کو فوجی لحاظ سے اتنا طاقتور بنا دیا جائے کہ ہندوستان نے اس سے جو پے در پے زیادتیاں کی ہیں ان کا وہ خود ہی بزور قوت حساب چکا سکے۔

لیاقت علی خان کے دورہ امریکہ کی ناکامی کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ اگرچہ اس کی حکومت نے 1949ء سے سرکاری اور غیر سرکاری طور پر پان اسلام ازم، اتحاد اسلامی، اسلامی بلاک اور اسلامستان کے نام پر مشرق وسطیٰ کے ممالک کو اینگلو۔امریکی بلاک کے زیر سایہ یکجا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی لیکن اسے کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ لہٰذا مشرق وسطیٰ کے حوالے سے اس کی سیاسی وجنگی اہمیت میں بھی کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا۔ امریکیوں کو تین چار وجہ سے مشرق وسطیٰ میں اسلام کے نام پر سوویت یونین مخالف گٹھ جوڑ میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ عرب ممالک میں سیکولر عرب نیشنلزم کا سامراج دشمن عوامی سیلاب آیا ہوا تھا اور اس سیلاب کو مذہب کے زور سے نہیں روکا جا سکتا تھا۔ ترکی اور ایران کے حکمران طبقوں کی مذہب میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور وہ اسلام کے نام پر ممالک عربیہ کے ساتھ گٹھ جوڑ کے کھلم کھلا خلاف تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ چونکہ پان اسلام ازم یا اتحاد اسلامی یا اسلامی بلاک یا اسلامستان کی تحریک انگریزوں کی پیدا کردہ تھی اس لئے امریکی سامراجی کاروبار میں اپنے حریف کے کسی منصوبے میں مددگار نہیں ہو سکتے تھے۔ بنابریں انہوں نے ترکی اور ایران کے ساتھ الگ الگ سمجھوتے کئے تھے اور جہاں تک عرب ممالک کا تعلق تھا وہ مصر کے تجویز کردہ اجتماعی تحفظ کے معاہدے کی پس پردہ تائید وحمایت کر رہے تھے۔ وہ انگریزوں کے اسلامی بلاک اور عرب فیڈریشن دونوں ہی منصوبوں کے خلاف تھے۔ ان کا نصب العین تو یہ تھا کہ مشرق وسطیٰ اور ایشیا کے دوسرے علاقوں میں انگریزوں کے سامراجی مفادات کی بیخ کنی کر کے، اپنے سامراجی مفادات کی بنیادیں استوار کی جائیں۔ بالفاظ دیگر وہ مغربی یورپ میں اپنی بالادستی قائم کرنے کے بعد ایک عالمی ایمپائر قائم کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے۔

تیسری وجہ یہ تھی کہ لیاقت علی خان نے اپنے دورہ ماسکو کے پروگرام پر عمل نہ کر کے اپنی بلیک میلنگ یا سودا بازی کی صلاحیت خود ہی کھو دی تھی اس لئے امریکیوں کو کسی ٹھوس اقدام سے اس کی یا پاکستان کی دلجوئی یا خوشنودی کی کوئی خاص ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ امریکیوں کی پاکستان میں عدم دلچسپی کی یہ حالت تھی کہ لیاقت علی خان نے کوریا کی جنگ میں ہر ممکن امداد کی

پیشکش سے متعلقہ 27 رجون کے اپنے اعلان کے بعد ٹرومین سے ملنے کی امید کی تھی مگر امریکی صدر کے پاس وزیراعظم پاکستان کے لئے کوئی وقت نہیں تھا۔

چوتھی وجہ یہ تھی کہ امریکیوں کا عالمی مفاد انہیں پاکستان کی خاطر ہندوستان کو خفا کرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ چین میں اشتراکی انقلاب کے بعد ایشیا میں ہندوستان کی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی۔ سامراجی نقطہ نگاہ سے ایشیا میں ہندوستان کی اہمیت اتنی زیادہ تھی کہ اس کے مقابلے میں پاکستان کی سٹریٹیجک پوزیشن اور اس کی نہایت عمدہ افرادی قوت کی کوئی اہمیت نہیں تھی بالخصوص ایسے پاکستان کی جس کے ارباب اختیار اپنے ملک کو بہرصورت اور بہر قیمت مغرب کے ساتھ ہی وابستہ رکھنے کا عزم کئے ہوئے تھے۔

رائے عامہ کا ردعمل دیکھ کر لیاقت نے اپنی امریکہ نوازی کو لگام دی اور بوسٹن ولندن میں کئے اپنے اعلانات سے انحراف اختیار کیا

تاہم لیاقت علی خان جب ہوائی اڈے سے گھر پہنچا تو اسے ایک آدھ دن میں ہی پتہ چل گیا کہ نہ صرف پاکستان کی رائے عامہ پاکستانی فوجیں جنوبی کوریا بھیجنے کے سخت خلاف ہے بلکہ اس کی حکومت کے اندر بھی بعض طاقتور عناصر موجود ہیں جو غیر مشروط طور پر جنوبی کوریا میں فوجیں بھیجنے کے حق میں نہیں ہیں۔ بالخصوص ایسی صورتحال میں کہ ''ہندوستان یہ اعلان کر چکا تھا کہ اگرچہ وہ کوریا کے متعلق اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی قرارداد کا مؤید ہے مگر فوجی امداد نہیں دے گا۔ اس کی تائید محض اخلاقی ہے۔'' چنانچہ 15 رجولائی کو حکومت پاکستان نے واشنگٹن سے موصولہ اس خبر کی تردید کر دی کہ پاکستان اپنی فوجیں کوریا بھیج رہا ہے۔ نوائے وقت کو حکومت پاکستان کی اس تردید سے قدرے اطمینان ہوا تو اس نے چودھری خلیق الزماں کی خوب خبر لی۔ اس نے اپنے اداریے میں لکھا کہ ''چودھری خلیق الزمان نے مسٹر لیاقت علی خان اور ان کی اہلیہ کی خدمت میں درباری بھانڈوں کے انداز میں جو سپاس نامہ پیش کیا اس میں جہاں اور باتیں کہیں وہاں کوریا کے معاملے میں حضور ظل سبحانی کی ہاں میں ہاں ملا دی، نہ ورکنگ کمیٹی سے پوچھا نہ کونسل بلائی اور ازخود ساری لیگ کو جناب وزیراعظم کے قدموں میں ڈال دیا۔ جب ملک میں ایسے ایسے خوشامدی موجود ہوں اور وہ فلک کج رفتار پروری کے باعث مدعیٔ قیادت بھی ہوں تو وزیراعظم کا یہ ارشاد قطعاً

حیرت انگیز نہیں ہونا چاہیے کہ کوریا کے معاملے میں پبلک نے کوئی احتجاج نہیں کیا۔ ہمیں افسوس ہے کہ چودھری خلیق الزماں نے اپنے طرز عمل سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مسلم لیگ کوئی چیز نہیں۔ جو کچھ ہے وہ وزیراعظم کی ذات ہے اور خاکسار مسلم لیگ کا صدر ہونے کے باوجود وزیراعظم کے حضور میں درباری مسخرے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ زمانے کا انقلاب یہ قائداعظم کی مسند پر چودھری خلیق الزماں براجمان ہیں جو عزت نفس سے تو خیر محروم ہیں ہی، جماعت کی عزت کا بھی انہیں کوئی پاس نہیں۔"[29]

لیگ ورکنگ کمیٹی اور لیگ کونسل کا اجلاس نہ بلانے کے بارے میں شکایت صرف نوائے وقت کو ہی نہیں تھی بلکہ پنجاب مسلم لیگ کے بیشتر حلقے یہ شکایت کر چکے تھے کہ جس طرح وزیراعظم لیاقت علی خان نے اپنی کابینہ سے مشورہ کئے بغیر خود ہی کوریا کی جنگ میں پاکستان کو ملوث کرنے کا اعلان کر دیا تھا اسی طرح چودھری خلیق الزماں نے بھی اپنی ورکنگ کمیٹی اور اپنی کونسل سے مشورہ کئے بغیر ہی مسلم لیگ کی جانب سے حکومت پاکستان کی کوریائی پالیسی کی حمایت کر دی ہے۔ خلیق الزماں نے اس شکایت کا ازالہ کرنے کے لئے 15 ر جولائی کو اعلان کیا کہ 6 ر اگست کو لیگ ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوگا جس میں تنظیمی امور کے علاوہ کوریا کی جنگ کے مسئلہ پر بھی غور کیا جائے گا۔ کیونکہ اس جنگ سے عالمی امن خطرے میں پڑ گیا ہے۔ اس نے کہا کہ اگرچہ یہ بحران تا حال ایک خاص علاقے تک ہی محدود ہے لیکن کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ زیادہ تباہ کن حد تک وسیع نہیں ہوگا اور اس میں مشرق وسطیٰ کے ممالک براہ راست ملوث نہیں ہوں گے۔ اس نے کوریا کے مسئلہ پر حکومت پاکستان کے موقف کی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ حکومت پاکستان نے کوریا کے بحران کے بارے میں اقوام متحدہ کی جو حمایت کی ہے اس کی بنیاد اکثریتی فیصلوں کو منظور کرنے کے جمہوری اصول پر ہے۔ بالخصوص ایسی صورت میں کہ یہ فیصلہ جارحیت کے خلاف ہو۔ مسلم ممالک کا ذکر کرتے ہوئے خلیق الزماں نے یاد دلایا کہ "میں نے مسلم ممالک کا بلاک بنانے کی کوششیں کی تھیں تا کہ اقوام متحدہ میں ہماری آواز کی شنوائی ہو سکے۔ ایسا بلاک وقت گزرنے کے ساتھ لازماً متحدہ ہوگا کیونکہ میری رائے میں جمہوری ادارے کو مسلم ممالک کی متحدہ آواز پر توجہ دینا ہی پڑے گی۔ کوریا کے بحران کے بارے میں مسلمانوں کی صفوں میں آج کل جو اختلاف رائے پایا جاتا ہے اس سے سب کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں۔"[30] گویا خلیق الزماں

نے اپنے اس بیان کے ذریعے کوریا کی جنگ میں سے بھی اپنی ان کوششوں کا جواز نکالنے کی کوشش کی جو اس نے ''اسلامستان'' کے قیام کے سلسلے میں کی تھیں۔

لیکن جب 19 رجولائی کو بالآخر وزیر اعظم لیاقت علی خان نے اس مسئلہ کے بارے میں پاکستان کی رائے عامہ کا نوٹس لیا تو اس نے اتحاد اسلامی یا اسلامی بلاک کا کوئی ذکر نہ کیا۔ اس نے اپنی نشری تقریر میں اپنے امریکہ، کینیڈا اور برطانیہ کے دورے کے دوران اپنے کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ کس طرح اس نے ان ممالک میں اسلام اور اسلامی طرز زندگی کی تبلیغ کی ہے۔ ان ممالک کے لیڈروں کے ساتھ پاکستان کی سالمیت وسلامتی کے مسائل پر بات چیت کی ہے اور ایسے سامان کے حصول کے لئے بھی باتیں کیں جو پاکستان کو مضبوط بنانے اور اس کے استحکام کے لئے ہمیں درکار ہیں۔ اس نے اس امر کی وضاحت کی کہ اس نے کوریا کی جنگ کے بارے میں سلامتی کونسل کے فیصلے کی حمایت کا کیوں اعلان کیا تھا۔ اس نے کہا کہ ''اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ شمالی کوریا نے جنوبی کوریا کے خلاف دانستہ طور پر تلخ جارحیت کا مجرمانہ ارتکاب کیا ہے۔ کوئی منصف مزاج شخص جنوبی کوریا سے ہمدردی کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اب حالات نے بہت نازک صورت اختیار کر لی ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس جنگ کے اثرات کب اور کس جگہ پڑیں گے۔ یہ بہت افسوسناک صورتحال ہے کہ ایشیا میں امن کو اس وقت بے حد خطرہ لاحق ہوا ہے جبکہ اسے برقرار رکھنے کی بے حد ضرورت ہے۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ دنیا تیسری عالمی جنگ میں بالکل تباہ ہو جائے گی۔ اس لئے ہر امن پسند شخص کا فرض ہے کہ وہ کوریائی جنگ کے شعلوں کو جتنی جلد ممکن ہو سکے بجھانے کی کوشش کرے۔ پاکستان نے اقوام متحدہ کے رکن کی حیثیت سے کوریا کے بارے میں سلامتی کونسل کی قرارداد کی حمایت کی ہے۔ مناسب ہوگا کہ اس امر کی وضاحت کر دی جائے کہ ہم نے یہ راستہ کیوں اختیار کیا ہے۔ اقوام متحدہ کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ دنیا کو جنگ کی لعنت سے ہمیشہ کے لئے نجات دلانے کی غرض سے ان تمام تضادات کو پر امن طریقے سے حل کیا جائے جو وقتاً فوقتاً مختلف ممالک کے درمیان رونما ہوتے رہتے ہیں۔ ایسا صرف اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ ہر رکن اس تنظیم کے فیصلوں کی پوری حمایت کرے اور کوشش کرے کہ اقوام متحدہ واقعی ایک ایسی تنظیم بن جائے جس کا فیصلہ ہر ملک بلا تامل قبول کرے۔ اگر ایک ملک کے دوسرے ملک پر حملہ کی صورت میں ہم سلامتی کونسل یا اقوام متحدہ کے فیصلے کی تائید نہ کرنے کا فیصلہ کریں تو اس قسم کی تنظیم

کے وجود کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ پاکستان نے صرف امن برقرار رکھنے کی خاطر سلامتی کونسل کے فیصلے کی حمایت کی ہے۔ پاکستان کے لئے کوئی اور فیصلہ کرنا ممکن نہیں تھا۔"[31] لیاقت علی خان کی اس تقریر میں جنوبی کوریا کی "حسب استطاعت" ہر ممکن امداد کرنے کا کوئی ذکر نہیں تھا جس کا مطلب یہ سمجھا گیا تھا کہ لیاقت علی خان نے کوریا میں امریکہ کی امداد کے بارے میں جس جوشیلے فیصلے کا اعلان کیا تھا اب وہ اس سے منحرف ہو گیا ہے اور اب اس کا فیصلہ یہی ہے کہ پاکستان ہندوستان کی طرح جنوبی کوریا کی فوجی امداد نہیں کرے گا بلکہ صرف اخلاقی امداد دے گا۔

نہرو کی غیر جانبدارانہ حکمت عملی کا بھارت کو فائدہ اور لیاقت کی امریکہ نوازی کا پاکستان کو نقصان

لیاقت علی خان کی اس تقریر سے قبل یہ خبر آ چکی تھی کہ سوویت یونین کے سربراہ مملکت مارشل سٹالن نے ہندوستان کے وزیراعظم نہرو کی اس تجویز کا خیر مقدم کیا ہے کہ کوریا کے سوال کے پرامن تصفیہ کے لئے اشتراکی چین کو سلامتی کونسل میں شامل کیا جائے اور یہ خبر بھی شائع ہو چکی تھی کہ حکومت امریکہ نے نہرو کی یہ تجویز مسترد کر دی ہے۔ ان دونوں خبروں سے واضح تھا کہ ہندوستان کے وزیراعظم نے کوریا کے بحران میں ایک غیر جانبدار عالمی لیڈر کا کردار ادا کرنے کے مقصد کے تحت اپنی خارجہ پالیسی کا جھکاؤ کسی حد تک سوویت یونین کی طرف کر دیا تھا جبکہ پاکستان اعلانیہ امریکہ کی خیمہ برداری کا وعدہ کر چکا تھا اور لیاقت علی خان بدستور یہ الزام عائد کئے جا رہا تھا کہ شمالی کوریا نے جنوبی کوریا کے خلاف کھلی جارحیت کا ارتکاب کیا ہے۔ دونوں ملکوں نے اس موقع پر اپنی خارجہ پالیسی کے بارے میں جو فیصلہ کیا تھا وہ اس فیصلے کے بالکل برعکس تھا جو انہوں نے مئی جون 1949ء میں کیا تھا۔ جون 1949ء میں پاکستان کا جھکاؤ کھلم کھلا سوویت یونین کی طرف ہو گیا تھا جبکہ ہندوستان امریکہ کی جانب جا رہا تھا۔ لیکن اب جولائی 1950ء میں ہندوستان سوویت یونین سے روابط بڑھا رہا تھا اور پاکستان امریکہ کی کاسہ لیسی کر رہا تھا۔

ہندوستان کی خارجہ پالیسی میں اس تبدیلی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان کے قومی بورژوا طبقہ کے خود اپنے عظیم الشان عزائم تھے اور اس بنا پر اس طبقہ کا امریکہ و برطانیہ کے سامراجیوں کے ساتھ قدرتی تضاد تھا۔ اس طبقہ کا نظریہ ساز اور پالیسی ساز چین میں متعین

ہندوستانی سفیر کے۔ایم۔پانیکر تھا۔پانیکر نے 25رجون کو کوریا میں جنگ چھڑنے کے فوراً بعد اپنے وزیراعظم نہرو کو یہ مشورہ دیا تھا کہ چونکہ اس جنگ کے پھیل جانے کا اندیشہ ہے اس لئے پہلے تو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ یہ جنگ کوریا تک ہی محدود رہے اور پھر فریقین کے درمیان بیچ بچاؤ کرانے کی پالیسی اختیار کرنی چاہیے اور ایسا اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ اشتراکی چین کو سلامتی کونسل میں شامل کیا جائے اور سوویت یونین نے کونسل کا جو بائیکاٹ کر رکھا ہے وہ ختم کر دیا جائے۔نہرو نے یہ مشورہ فوراً قبول کر کے جون کے اواخر میں برطانیہ کے وزیر خارجہ ارنسٹ بیون کو اپنی رائے سے مطلع کیا۔یکم جولائی کو پانیکر نے پیکنگ میں محکمہ خارجہ میں جا کر چین کے نائب وزیر خارجہ سے ملاقات کی اور اسے اپنی تجویز سے آگاہ کیا۔7رجولائی کو نہرو نے ایک پریس کانفرنس میں اپنی اس تجویز کا اعلان کیا۔10رجولائی کو حکومت نے پانیکر کے نام ایک مراسلے میں ہندوستان کی اس راہ عمل اور تجویز کی تعریف کی۔13رجولائی کو ماسکو میں متعین ہندوستانی سفیر نے مارشل سٹالن کو نہرو کا ایک پیغام دیا اور اسی دن امریکہ کے وزیر خارجہ ڈین اچی سن کو بھی نہرو کا ایک خط ملا۔17رجولائی کو مارشل سٹالن نے نہرو کی تجویز کا خیر مقدم کیا۔لیکن اسی دن حکومت امریکہ نے یہ تجویز مسترد کر دی۔گویا اس طرح تقریباً تین ہفتے میں ہندوستان کی خارجہ پالیسی اس طرح بنیادی طور پر تبدیل ہوگئی کہ جس کے نتیجے میں جواہر لال نہرو کو یہ محسوس ہونے لگا کہ اسے ایک عظیم عالمی کردار ادا کرنے کا موقع مل گیا ہے کوریا کی جنگ چھڑنے سے قبل سوویت یونین اور اشتراکی چین کے ذرائع ابلاغ نہرو کو ایشیا کا دوسرا چیانگ کائی شیک اور سامراج کا پالتو کتا قرار دیتے تھے۔ماسکو میں نہرو کی ہمشیرہ وجے لکشمی پنڈت کا بطور ہندوستانی سفیر تقرر 1947ء کے اوائل میں ہی ہوگیا تھا لیکن سٹالن نے اس سفیر کا کبھی نوٹس نہیں لیا تھا۔لیکن اب ہندوستانی سفیر کے لئے سٹالن کے دروازے کھل گئے تھے اور سوویت اخبارات ہندوستان کی آزادانہ پالیسی کی تعریف کرنے لگے تھے۔

ہندوستان کی خارجہ پالیسی میں اچانک تبدیلی بعض مبصرین کے لئے حیرت انگیز تھی۔ لیکن پاکستان کی جانب سے امریکہ کی خیمہ برداری کی گئی اس پر کسی کو حیرت نہ ہوئی۔اس لئے کہ ظفر اللہ خان، غلام محمد، اکرام اللہ اور اسکندر مرزا وغیرہ سے کسی کو بھی یہ توقع نہیں تھی کہ وہ عالمی تاریخ کے اس نازک موقع پر آزادانہ پالیسی اختیار کریں گے اور لیاقت علی خان خارجی امور کے بارے

میں ہمیشہ ان کے مشورہ کی پابندی کرتا تھا۔ چونکہ ماسکو کو جون 1949ء کے بعد حکومت پاکستان کے اندر کی اس صورتحال سے اچھی طرح آگاہی ہوگئی تھی اس لئے پہلے تو 13ر جولائی کو ہفت روزہ نیو ٹائمز نے لیاقت علی خان پر امریکہ کی کاسہ لیسی کا الزام عائد کیا اور پھر 26ر جولائی کو ماسکو کے ایک جریدے ''لٹریری گزٹ'' نے یہ الزام لگایا کہ ''لیاقت علی خان اپنے امریکی آقاؤں کو یہ یقین دلانے کے بعد واپس آیا ہے کہ وہ پاکستان کے غلام بنانے اور اسے وال سٹریٹ کے لئے سیاسی، معاشی اور سٹریٹیجک ایشیائی اڈہ بنانے سے متعلقہ منصوبوں کی تکمیل میں امداد کرے گا۔ پاکستان مسلم لیگ کے صدر نے کاسہ لیسوں جیسا جوش دکھانے کی خواہش کے تحت وزیراعظم کو چاندی کی ہیلمٹ پیش کی ہے حالانکہ اس قسم کی ٹوپی ایک کاسہ لیس کو زیب نہیں دیتی۔'' لٹریری گزٹ نے مزید لکھا کہ ''پاکستان میں پولیس کے تشدد اور زمینداروں کی مطلق العنانیت کا دور دورہ ہے جبکہ محنت کش عوام غربت کی زندگی گزار رہے ہیں۔ پاکستان برطانیہ کی نوآبادی سے تبدیل ہو کر امریکہ کی نوآبادی بن گیا ہے اور اب یہی پاکستان کا طرز زندگی ہوگا۔ لیاقت علی خان پاکستان کا چیانگ کائی شیک یا سنگمن ری (جنوبی کوریا کا آمر مطلق) بن جائے گا۔''[32]

لیاقت کا غیر جمہوری طرز عمل...... اس کی امریکہ نوازی پر تنقید کرنے والوں کی گرفتاریاں اور نوائے وقت کی بندش

ماسکو کے اس جریدے نے لیاقت علی خان پر جاگیردارانہ مطلق العنانیت اور آمریت کا جو الزام عائد کیا تھا وہ بے بنیاد نہیں تھا۔ یوں تو لیاقت بورژوا جمہوریت کا علمبردار بنتا تھا لیکن وہ اس جمہوریت پر شاذونادر ہی عمل کرتا تھا۔ وہ پارلیمنٹ کا اجلاس بہت ہی کم بلاتا تھا اور سیفٹی آرڈیننسوں کے زور پر اور جبر و تشدد کی پالیسی کے تحت حکومت کرتا تھا۔ وہ اپنی سیاسی مخالفت کو برداشت نہیں کرتا تھا اور اپنے سیاسی مخالفوں کو کتے اور غدار قرار دیتا تھا۔ جب وہ 29ر اپریل 1950ء کو امریکہ کے دورہ پر روانہ ہوا تھا تو اس نے اس سلسلے میں ملک کی پارلیمنٹ کو اظہار خیال کا موقع نہیں دیا تھا۔ اس نے 27ر جون 1950ء کو کوریا کی جنگ کے بارے میں سلامتی کونسل کی قرارداد کی حمایت کا اعلان کرنے سے پہلے اپنی کابینہ سے مشورہ کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی تھی اور پھر جب 13ر جولائی کو وہ کراچی واپس آ گیا تھا تو اس نے اپنے اڑھائی ماہ کے غیر ملکی

دورے پر پارلیمنٹ کو بحث کرنے کا موقع دینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ چنانچہ نوائے وقت نے لیاقت کی اس مطلق العنانیت پر سخت تنقید کی۔ اس نے لکھا کہ ”عزت مآب لیاقت علی خان کوریا میں حق وانصاف کی حمایت کے جذبے سے اس قدر سرشار تھے کہ انہوں نے بوسٹن کے ہسپتال میں لیٹے لیٹے یو۔ این۔ کی قرارداد کی تائید فرمادی اور اعلان کر دیا کہ پاکستان کوریا کے معاملے میں یو۔ این۔ کو مقدور بھر امداد دے گا۔ وزیر اعظم لیاقت علی خان نے کوریا کے مظلوموں کی امداد کے معاملے میں اس قدر تیزی سے کام لیا کہ اپنی وزارت سے مشورہ کرنا بھی مناسب نہ سمجھا اور جب سے وہ واپس تشریف لائے ہیں پارلیمنٹ کا اجلاس بلانا تو درکنار انہوں نے ایک رسمی پریس کانفرنس بلا کر پاکستان کی پوزیشن کی وضاحت کرنا بھی غیر ضروری سمجھا ہے۔ بعض تنگ نظر لوگ اس سے آزردۂ خاطر ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں مسٹر لیاقت علی خان نے پاکستانیوں کو بھیڑ بکریاں سمجھ رکھا ہے کہ وہ انہیں جدھر چاہیں ہانک دیں مگر ہمارا خیال ہے کہ یہ محض سوئے ظن ہے۔ ہمارے ارباب اقتدار تائیدِ حق کے جذبہ سے اس قدر سرشار ہیں کہ وہ عید کے پیغامات میں بھی کوریا کو نہیں بھولے۔ ہم اس کی داد دیتے ہیں۔ ہماری گزارش صرف اتنی ہے کہ وہ کوریا کے مظلوموں کی ہمدردی میں اس قدرے غلو سے کام نہ لیں کہ کشمیر کے مظلوموں کو بھول جائیں۔ جتنی تیزی انہوں نے کوریا میں تائیدِ حق کے معاملہ میں دکھائی ہے امریکہ، برطانیہ اور یو این او سے مطالبہ کریں کہ اس سے ایک چوتھائی تیزی ہی کشمیر کے معاملہ میں اب وہ بھی دکھائیں۔“[33] نوائے وقت کے اس اداریے سے وزیر اعظم لیاقت علی خان کے خلاف نہایت مؤثر حملہ ہوا تھا۔

تنازعہ کشمیر کے تصفیے کے بارے میں وزیر اعظم لیاقت علی خان کی ناکامی کا مسئلہ ایک ایسا مسئلہ تھا جسے پنجاب میں اس کے سیاسی مخالفین بڑے مؤثر طریقے سے استعمال کرتے تھے۔ نوائے وقت لیاقت علی خان کے خلاف چار پانچ ہتھیاروں سے بڑا زہریلا اور تباہ کن پروپیگنڈا کرتا تھا۔ اول یہ کہ لیاقت علی خان کے عہد اقتدار میں پنجاب کی سیاسی و معاشی حق تلفی ہو رہی ہے۔ دوئم یہ کہ لیاقت علی خان سیفٹی قوانین کے تحت جبر و تشدد کے ذریعے حکومت کرتا تھا، وہ تحریر و تقریر کی آزادی نہیں دیتا تھا۔ سوئم یہ کہ لیاقت علی خان نے پنجاب کے شہری عناصر کے خلاف اس صوبہ کے یونینسٹ جاگیرداروں سے گٹھ جوڑ کر لیا ہوا ہے۔ چہارم یہ کہ لیاقت علی خان خود اور اس کی بیگم غیر اسلامی معاشرتی اقدار کو فروغ دے رہے ہیں اور فحاشی و عریانی کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں اور

پنجم یہ کہ لیاقت علی خان نے قضیہ کشمیر کا منصفانہ تصفیہ کروائے بغیر پاکستان کو اینگلو۔امریکی سامراج کی جھولی میں ڈال دیا ہے۔ یہ پانچواں ہتھیار سب سے زیادہ مؤثر تھا۔ تنازعہ کشمیر کے تصفیہ کے سلسلے میں لیاقت علی خان کی ناکامی کا مسئلہ ایک ایسا مسئلہ تھا کہ جس کا ذکر پڑھ کر نہ صرف وسطی پنجاب میں مقیم لاکھوں کشمیری مہاجرین بھڑک اٹھتے تھے بلکہ پنجابی فوج میں بھی خفگی کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ یکم جنوری 1949ء کو کشمیر میں جنگ بندی کے بعد لیاقت علی خان نے فوج کے مختلف یونٹوں کو بار بار یقین دلایا تھا کہ یہ تنازعہ اقوام متحدہ کے ذریعے پرامن طریقہ سے حل کروالیا جائے گا مگر ایسا نہ ہوا اور نہ ہوسکتا تھا۔ ہندوستان نے یکے بعد دیگرے اقوام متحدہ کے کمیشن کی ہر تجویز مسترد کر دی جس پر عمل کرنے سے اس تنازعہ کا تصفیہ پاکستان کے حق میں ہوسکتا تھا۔ بلاشبہ اینگلو۔امریکی سامراج نے کئی مرتبہ بالواسطہ اور بلاواسطہ کوشش کی کہ وادی کشمیر اور لداخ کا علاقہ پاکستان کو مل جائے تاکہ وہاں سوویت مخالف فوجی اڈہ بنایا جاسکے مگر ہندوستان کی غیر مصالحانہ روش کے باعث اسے کامیابی نہ ہوئی۔ امریکہ اور برطانیہ دونوں ہی کو ایشیا میں اشتراکی چین کے خلاف ہندوستان کی دوستی کی ضرورت تھی اس لئے وہ اس تنازعہ کے تصفیہ کی کوشش میں اس حد تک نہیں جانا چاہتے تھے کہ ہندوستان خفا ہوجائے اور لیاقت علی خان کی مجبوری یہ تھی کہ وہ اپنی سامراج نوازی بلکہ سامراج پرستی کی وجہ سے پاکستان کو بہر صورت اور بہر قیمت اینگلو۔امریکی بلاک سے وابستہ رکھنے کی خارجہ پالیسی ترک نہیں کرسکتا تھا۔ چنانچہ جب نوائے وقت نے لیاقت علی خان کے دورہ امریکہ سے واپسی پر کشمیر کا نام لے کر اس پر پے در پے زوردار حملے کئے تو پنجاب میں وزیراعظم کے منظور نظر ہوم سیکرٹری سید احمد علی سے برداشت نہ ہوسکا اور اس نے 3/اگست کے نوائے وقت کے شمارے میں شائع شدہ ایک قابل اعتراض مراسلے کی بنا پر 10/اگست کو تعزیری کاروائی کی۔ مدیر نوائے وقت کو سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کیا گیا مگر ہائی کورٹ کے حکم کے پیش نظر اسے اسی وقت پانچ سو روپے کے ذاتی مچلکہ پر رہا کر دیا گیا۔ تاہم حکومت کی اس کاروائی کی وجہ سے نوائے وقت کی اشاعت تین دن کے لئے بند رہی اور اس کی جگہ نوائے پاکستان کے نام سے ایک اخبار شائع ہوتا رہا۔

حکومت پنجاب کا یہ ہوم سیکرٹری یو۔پی۔ کا ایک ریٹائرڈ پی۔سی۔ایس۔ افسر تھا۔ وہ انگریزوں کی طرح صرف ڈنڈے کے ذریعہ حکومت کرنا جانتا تھا۔ وہ سیاسی بصیرت سے عاری تھا یہ بات اس کی سمجھ سے بالاتر تھی کہ حکومت کے مخالف کسی اخبار کے خلاف اس قسم کی نیم دلانہ

کارروائی سے اس اخبار کی مقبولیت و وقار میں اضافہ ہوتا ہے کمی نہیں ہوتی۔ خاص طور پر ایسی حالت میں کہ یہ اخبار کسی نہ کسی وجہ سے عوام کے ایک بڑے حصے کے افکار و خیالات و جذبات کی ترجمانی کرتا ہو۔ ہوم سیکرٹری سید احمد علی نے نوائے وقت کے خلاف اس اقدام سے پنجاب میں لیاقت علی خان کی سیاسی پوزیشن کو بہت نقصان پہنچایا۔ پنجاب کے شہروں کی رائے عامہ لیاقت علی خان کے پہلے ہی خلاف تھی۔ ہوم سیکرٹری کی اس کارروائی سے اس کی مخالفت میں اور بھی اضافہ ہو گیا اور یہ تاثر پختہ ہو گیا کہ لیاقت علی ان کے عہد اقتدار میں تحریر و تقریر کی واقعی آزادی نہیں ہے اور حکومت جبر و تشدد کے ذریعے ہوتی ہے۔ لیاقت علی خان کی مخالفت کی ایک وجہ اس تاثر میں بھی پنہاں تھی کہ وہ تنازعہ کشمیر کو بالائے طاق رکھ کر اینگلو۔ امریکی بلاک کی خواہش کے مطابق سوویت یونین اور چین کے خلاف ہندوستان کے ساتھ گٹھ جوڑ کرنے پر آمادہ ہے۔

چین اور سوویت یونین کے خلاف ہندو پاک مشترکہ دفاعی معاہدہ کی برطانوی تجویز، نہرو کے دورۂ پاکستان میں پروان نہ چڑھ سکی

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان اشتراکیت اور سوویت یونین کے خلاف فوجی گٹھ جوڑ کے بارے میں امریکہ و برطانیہ کے ارباب اقتدار اور اخبارات کی خواہش کسی سے بھی ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ برطانوی ارباب اقتدار اور اخبارات تو پاکستان کے ظہور میں آنے سے پہلے ہی سے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان مشترکہ دفاع کی باتیں کرتے تھے۔ ان کی اس خواہش نے قدرے ٹھوس صورت اپریل 1949ء میں دولت مشترکہ وزرائے اعظم کی کانفرنس کے درمیان اختیار کی جبکہ یہ فیصلہ ہوا کہ ہندوستان، پاکستان، سیلون اور برطانیہ کی حکومتیں برما میں کمیونسٹوں کے خلاف رنگون کی حکومت کی امداد کے لئے اشتراک عمل کریں گی۔ اس کانفرنس سے چند دن پہلے پاکستان کے گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین کی پیش بینی یہ تھی کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان دفاعی انتظامات ہوں گے۔[34] جنوری 1950ء میں اس اشتراک عمل کو کچھ آگے بڑھایا گیا جبکہ کولمبو میں دولت مشترکہ کے وزرائے خارجہ کی کانفرنس کے دوران جنوبی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک کے لئے امدادی منصوبہ بنانے کا فیصلہ ہوا تاکہ ان ممالک میں اشتراکیت کا سدباب ہو سکے۔ پھر 8/اپریل 1950ء کو ہندوستان کے وزیراعظم جواہر لال نہرو

اور پاکستان کے وزیراعظم لیاقت علی خان کے درمیان اقلیتوں کی سلامتی وتحفظ کے لئے معاہدہ ہوا تو مغربی حلقوں میں یہ امید پیدا ہوئی کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان اشتراک عمل کے زمین مزید ہموار ہوئی ہے۔

25راپریل کو ہندوستانی وزیراعظم جواہرلال نہرو کے کراچی آنے سے ایک دن پہلے، پاکستان کے وزیرخارجہ چودھری محمد ظفراللہ خان نے ایک پریس کانفرنس میں اس امر پرزور دیا کہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان صلح ومفاہمت کے جذبات کو ترقی دینے کی اشد ضرورت ہے۔ اس نے کہا کہ ''مشرق میں پاکستان اور ہندوستان کا بلاک سب سے زیادہ مضبوط ہوسکتا ہے۔ اگر یہ بلاک قائم نہ رہا تو ایشیا کے لئے کوئی امید باقی نہیں رہے گی۔''[35] نہرو 26راپریل سے 28راپریل تک کراچی میں رہا تو اس دوران ہندوستان اور پاکستان کے اخبارات میں یہ قیاس آرائیاں ہوئیں کہ دونوں ملکوں کے درمیان مشترکہ خارجہ پالیسی اور مشترکہ دفاع کے انتظام کا امکان ہے۔ ان قیاس آرائیوں کو 29راپریل کو تقویت ملی جبکہ اخبارنویسوں نے وزیراعظم لیاقت علی خان سے پوچھا کہ آیا اس کی نہرو کے ساتھ بات چیت میں مشترکہ خارجہ پالیسی کی تجویز بھی زیر بحث آئی۔ لیاقت علی خان کا جواب یہ تھا کہ میں وہ ساری باتیں تمہیں نہیں بتاؤں گا جو ہمارے زیر بحث آئی ہیں۔''[36]

مئی 1950ء کے تیسرے ہفتے میں سڈنی میں دولت مشترکہ کے مندوبین کی کانفرنس میں جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک کو، جہاں کمیونسٹ بغاوتیں جاری تھیں، ٹیکنیکل اور اقتصادی امداد دینے کا فیصلہ کیا گیا اور ان ہی دنوں دہلی میں ہندوستان اور پاکستان کے ایڈیٹروں کی کانفرنس ہوئی جس میں فیصلہ کیا گیا کہ دونوں ممالک کے اخبارات بین المملکتی فضا کو خوشگوار بنانے میں مدد دیں گے۔ 29رجون 1950ء کو برطانیہ کی وزارت خارجہ نے اعلان کیا کہ کمیونسٹوں کے خلاف استعمال کے لئے برما کی حکومت کو 60 لاکھ پونڈ کا قرضہ دیا جائے گا۔ قرضہ کی اس رقم میں ہندوستان کا حصہ 10 لاکھ پونڈ اور پاکستان کا حصہ 5 لاکھ پونڈ کا ہوگا۔ سیلون اڑھائی لاکھ پونڈ دے گا اور باقی ساڑھے بیالس لاکھ پونڈ برطانیہ اور آسٹریلیا دیں گے۔

جولائی 1950ء میں لیاقت علی خان کے دورہ امریکہ سے واپسی سے دو دن پہلے برطانیہ کا چیف آف امپریل سٹاف فیلڈ مارشل سر ولیم سلم (William Slim) کراچی آیا اور اس نے غیرمبہم الفاظ میں یہ تجویز پیش کی کہ ''ہندوستان اور پاکستان کے درمیان معاہدہ اطلانتک

کی طرح کا ایک فوجی معاہدہ ہونا چاہیے۔''[37] فیلڈ مارشل سلم نے یہ تجویز بظاہر اس امید میں پیش کی تھی کہ اب جبکہ وزیر اعظم لیاقت علی خان کوریا کی جنگ میں امریکہ کی غیر مشروط حمایت کا اعلان کر چکا ہے اور ہندوستان کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو کا تبت کے مسئلہ پر اشتراکی چین کے لیڈروں سے تنازعہ ناگزیر ہے تو دونوں ملکوں میں مشترکہ دفاع کی تجویز کے بارے میں فضا سازگار ہوگی۔ لیکن یہ اس کی بہت بڑی بھول تھی۔ جہاں تک ہندوستان کے وزیر اعظم نہرو کا تعلق تھا وہ جولائی 1950ء میں تبت کے معاملے میں چین کے لیڈروں سے اختلاف کے باوجود ان کے ساتھ دوستی کی بنیادیں استوار کر رہا تھا اور جہاں تک پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خان کا تعلق تھا وہ تنازعہ کشمیر کے بارے میں پنجاب کی رائے عامہ کو نظر انداز کر کے ہندوستان کے ساتھ مشترکہ دفاع کی تجویز کو جامہ عمل نہیں پہنا سکتا تھا۔

نوائے وقت اس مسئلہ پر پنجاب کے درمیانہ طبقہ کی رائے کی صحیح ترجمانی کرتا تھا۔ چنانچہ فیلڈ مارشل سلم کی اس تجویز پر اس اخبار کا تبصرہ یہ تھا کہ ''اندر خانے یہ تجویز اس سے پہلے بھی ضرور پیش ہوئی ہوگی مگر پبلک طور پر برطانیہ نے پہلی مرتبہ اپنے چیف آف سٹاف سر ولیم سلم کے ذریعے غیر مبہم الفاظ میں پاکستان اور ہندوستان کے مشترکہ ڈیفنس کی تجویز پیش کی ہے۔ ہم غیر مبہم الفاظ میں اس تجویز کی مخالفت کرتے ہیں اور اپنی حکومت کو یہ مشورہ دینا چاہتے ہیں کہ وہ اس تجویز کو قبول نہ کرے...... مشترکہ دفاع کی تجویز آج سے کافی عرصہ پہلے بھی اخبارات میں موضوع بحث بنی رہی تھی اور ہم نے اس وقت بھی اس کی مخالفت کی تھی۔ اب بھی حالات وہی ہیں۔ اینگلو امریکن بلاک اشتراکیت سے نپٹنا چاہتا ہے تو اس کی یہ صورت نہیں کہ پاکستان اور ہندوستان کو قربانی کا بکرا بننے کے لئے گلے ملا دیا جائے۔ کشمیر اور دوسرے جھگڑوں کی موجودگی میں مشترکہ ڈیفنس کی اسکیم بالکل مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے۔ ہم تعاون کی اہمیت سے انکار نہیں کرتے بلکہ اس پر زور دیتے ہیں مگر تعاون ان حدود کے اندر ہو کہ اس سے تصور آزادی پر زد نہ آتی ہو اور تعاون کی بنیاد کسی دوسرے ملک یا طاقت کے مفاد میں نہ ہو بلکہ خود پاکستان کے مفاد میں تعاون کے محرک ہوئے ہوں۔''[38]
فیلڈ مارشل سلم کراچی سے دہلی گیا تو وہاں بھی اس کی اس تجویز پر غیر موافق ردعمل ہوا اور اس طرح برطانیہ نے کوریائی جنگ سے فائدہ اٹھا کر برصغیر پاک و ہند کے لئے مشترکہ دفاع کی جو تجویز پیش کی تھی وہ ہندوستان اور پاکستان کے قومی تضاد کے پہاڑ کے نیچے دفن ہوگئی۔

عرب قوم پرستوں، اخبارات اور عوام الناس میں برطانوی اور امریکی سامراج کے خلاف شدید نفرت اور سوویت یونین کی طرف جھکاؤ

لیاقت علی خان کی جانب سے کوریا کی جنگ میں ہر ممکن امداد کی پیشکش پر پاکستان کے اندر نہایت مخالفانہ ردعمل ہونے کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ جن دنوں لیاقت علی خان امریکہ میں اسلام اور اسلامی طرز زندگی کے بارے میں اپنے تصور کی تبلیغ کر رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی یہ تاثر دے رہا تھا کہ پاکستان کے مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک کے ساتھ نہایت دوستانہ تعلقات ہیں اور یہ دوستانہ تعلقات اس علاقے میں استحکام کا باعث بنیں گے۔ ان دنوں عالم عرب میں امریکہ کے خلاف عوامی غیض وغضب کا طوفان آیا ہوا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ امریکہ ترکی اور ایران سے اسرائیل کو تسلیم کروانے کے بعد مصر، شام، لبنان اور عراق پر دباؤ ڈال رہا تھا کہ وہ اسرائیل کو تسلیم کر کے اس کے ساتھ امن کا معاہدہ کرلیں۔ برطانوی خبر رساں ایجنسی رائٹر کی اطلاع کے مطابق ''چونکہ عرب رائے عامہ اس صورتحال کو کبھی قبول نہیں کر سکتی تھی اس لئے وہ دل برداشتہ ہو کو عالمی صیہونیت کی محکومیت پر روس کے ساتھ قریب تر اتحاد کو ترجیح دے رہی ہے۔ عرب سیاسی حلقوں کے نزدیک امریکہ کی عرب پالیسی کا مقصود یہ ہے کہ مشرق وسطیٰ پر امریکی تسلط قائم ہو جائے...... اور مشرق وسطیٰ کو امریکہ کی اقتصادی اور فوجی امداد کا مقصود یہ ہے کہ امریکہ مشرق وسطیٰ کے ممالک کو کمیونزم کے خلاف اپنے گرد جمع کرنا چاہتا ہے۔ وہ عرب ممالک کو اپنی پالیسی کا محکوم بنانا چاہتا ہے اور خود غرضانہ مقاصد کے تحت فوجی اڈے تلاش کر رہا ہے۔''[39] اس خبر پر نوائے وقت کا اداریہ یہ تھا کہ ''امریکہ کی یہ پالیسی نئی ہے نہ انوکھی نہ غیر متوقع۔ کئی برس سے امریکہ کی کوشش یہ ہے کہ اسے مشرق وسطیٰ میں وہی پوزیشن حاصل ہو جائے جو آج سے چند برس پہلے برطانیہ کو حاصل تھی۔ یعنی مشرق وسطیٰ کے ملک کہنے کو آزاد ہوں مگر دراصل ان کی خارجہ پالیسی کی عنان امریکہ کے ہاتھ میں ہو۔ انگریز نے جو جگہ اپنی فوجی اور سیاسی چالبازیوں سے حاصل کی تھی وہ جگہ اب امریکہ اپنی دولت اور سیاسی جوڑ توڑ کے ذریعے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ عربوں کو یہ بات آج سے بہت عرصہ پہلے سمجھ لینی چاہیے تھی۔ اب امریکہ اور برطانیہ نے جس بے رحمی سے فلسطین کو قتل کیا ہے اس سے عربوں کی آنکھیں کھل گئی ہیں...... انگریزوں سے عربوں کے تعلقات کی داستان

کم از کم 35۔40 برس پرانی ہے۔ انگریزوں نے عربوں کو بڑے سبز باغ دکھائے اور ان سے بڑے خوش نما وعدے کر کے انہیں ترکوں سے توڑا مگر جب ان وعدوں کے پورا کرنے کا وقت آیا تو آنکھیں پھیر لیں اور عربوں سے پے در پے بدعہدی کی۔ عربوں سے امریکہ کے تعلقات کی داستان اتنی پرانی نہیں تھی مگر اس سے مختلف بھی نہیں۔ امریکیوں نے بھی عربوں سے وہی سلوک کیا جو انگریزوں نے کیا تھا اور اب تک کر رہے ہیں۔ پاکستان کے واجب الاحترام قائدین کو بھی انگریزوں اور امریکیوں سے بڑی امیدیں ہیں اور اس وقت انہیں امریکہ اور برطانیہ سے زیادہ اپنا غمگسار کوئی نظر نہیں آتا۔ خدا کرے ہم عربوں کے تلخ تجربہ سے سبق سیکھیں اور وہ غلطیاں نہ کریں جن کا خمیازہ آج عرب بھگت رہے ہیں۔ ورنہ خدانخواستہ ایک دن پاکستان یا تو شرق اردن بن کر رہ جائے گا (خدا وہ روز بد نہ دکھائے) یا پاکستانی بھی مصریوں اور شامیوں کی طرح یہ کہتے ہوئے سنائی دیں گے کہ اس سے تو روسی جمہوریہ بن جانا ہی بہتر ہے۔ یہ دن بھی پاکستان کے لئے کم منحوس نہیں ہوگا۔‘‘[40] جس دن نوائے وقت کا یہ اداریہ شائع ہوا اس دن لیاقت علی خان واشنگٹن میں سیاسی لیڈروں اور اخبار نویسوں کو یہ یقین دلا رہا تھا کہ پاکستان بہر قیمت اینگلو امریکی بلاک سے وابستہ رہے گا۔ پاکستان کے پاس نہایت عمدہ افرادی قوت ہے۔ اسے جدید اسلحہ سے لیس کرو تو یہ برصغیر کی شمالی سرحد کا مؤثر دفاع کرے گی۔

امریکہ اور برطانیہ کے خلاف سب سے زیادہ غصہ مصر میں پایا جاتا تھا۔ وہاں کے عوام کی سامراج دشمنی اتنی شدید تھی کہ شاہ فاروق کی حکومت اس کے سامنے بے بس تھی۔ وہ اپنے سامراجی آقاؤں کے حکم کی تعمیل کرنے سے قاصر تھی جبکہ مصری پارلیمنٹ کے متعدد ارکان شام کے لیڈروں کی طرح سوویت یونین سے دوستی کرنے کی تجویز پیش کرتے تھے۔ ایک رکن پارلیمنٹ محمد شفیع لی بان کی تجویز یہ تھی کہ ’’مصر کو برطانیہ اور امریکہ کے سوا دوسرے ذرائع سے سامان حرب حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس نے اس سلسلے میں روس کا خاص طور پر ذکر کیا۔‘‘[41] مصر کی سب سے پرانی سیاسی نیشنلسٹ پارٹی روس کے ساتھ عدم جارحیت کا معاہدہ کرنے کے حق میں تھی اور اس کا مزید موقف یہ تھا کہ نئی عالمی جنگ کی صورت میں نہر سویز سب کے لئے کھلی رہنی چاہیے۔ نیشنلسٹ پارٹی نے اپنے اس موقف کا اعلان مئی 1950ء کے تیسرے ہفتے میں اپنی سہ روزہ کانفرنس کے بعد کیا تھا۔ اس موقع پر پارٹی کے جنرل سیکرٹری کا بیان یہ تھا کہ ’’عربوں کے

بارے میں اینگلو امریکی بلاک کے معاندانہ رویے کے پیش نظر ہمیں روس کے ساتھ مصالحت کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔'' اس کا خیال تھا کہ ''روس کے ساتھ عدم جارحیت کا معاہدہ کرنے اور کمیونسٹ اصولوں کو تسلیم کرنے میں بڑا فرق ہے۔ عرب کمیونسٹ بنے بغیر سوویت یونین کے ساتھ نباہ کرلیں گے۔''[42]

مصر کی نیشنلسٹ پارٹی کے اس اعلان سے دو تین دن قبل 18 رمئی کو معاہدہ اطلانتک کے 12 ممالک کے وزرائے خارجہ نے لندن میں ایک کانفرنس کے بعد طے کیا تھا کہ وہ جدید اسلحہ سے لیس ایک ایسا دفاعی نظام تعمیر کریں گے جو اس معاہدہ کے کسی بھی رکن ملک کے خلاف بیرونی خطرے کا مقابلہ کرسکے گا۔ 19 رمئی کو برطانیہ اور امریکہ کے وزرائے خارجہ نے ایک مشترکہ بیان میں یونان، ترکی اور ایران کو سرحدوں کی ضمانت دی تھی حالانکہ یہ تینوں ممالک معاہدہ اطلانتک کے رکن نہیں تھے اور پھر پارٹی کے اس اعلان کے دو تین دن بعد 25 رمئی کو فرانس، برطانیہ اور امریکہ کے وزرائے خارجہ نے ایک مشترکہ اعلان کیا کہ وہ مشرق وسطیٰ میں اسلحہ اسی صورت میں فروخت کریں گے جبکہ اسلحہ خریدنے والا ملک یہ یقین دلادے گا کہ وہ کسی دوسرے ملک کے خلاف جارحانہ اقدام نہیں کرے گا۔ اس مشترکہ اعلان میں مزید کہا گیا تھا کہ یہ تینوں طاقتیں مشرق وسطیٰ کے ممالک کے درمیان طاقت کے استعمال یا طاقت کے استعمال کی دھمکی کی بدستور مخالفت کرتی رہیں گی۔ چونکہ اس اعلان کے موقع پر فوجی لحاظ سے اسرائیل کا پلہ بھاری تھا۔ اس لئے پورے مشرق وسطیٰ میں اس کا مطلب یہ سمجھا گیا تھا کہ مغربی طاقتیں عربوں کو اسرائیل کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کررہی ہیں۔ سوویت حکومت کی رائے یہ تھی کہ مغربی طاقتوں کے اس اعلان کا مطلب یہ ہے کہ صرف ان ہی عرب ممالک کے حکمرانوں کو اسلحہ فروخت کیا جائے گا جو اس اسلحہ کو اپنے عوام کی قومی آزادی کی تحریکوں کو کچلنے کے لئے استعمال کرنے کا یقین دلادیں گے۔

27 رمئی کو مصر کے مشہور سوشلسٹ لیڈر احمد حسین نے امریکہ، برطانیہ اور فرانس کے وزرائے خارجہ کو تار بھیجا جس میں اس نے لکھا کہ ''مشرق وسطیٰ میں اس وقت تک استحکام قائم نہیں ہوسکتا جب تک برطانوی فوجیں مصر سے نہ نکل جائیں۔ برطانیہ وادئ نیل کے اتحاد کو تسلیم نہ کرلے اور بڑی طاقتیں اسرائیل کے متعلق اپنا رویہ تبدیل نہ کرلیں۔'' اس نے انتباہ کیا کہ ''اگر ان امور کے لئے فوری اقدامات نہ کئے گئے تو عرب روس کی امداد طلب کرنے پر مجبور ہوجائیں گے۔''[43]

نوائے وقت نے تینوں بڑی طاقتوں کے اس اعلان پر عربوں کے ردعمل کا اپنے ادارتی کالم میں قدرے تفصیل سے ذکر کیا۔اس نے بتایا کہ ''عرب حلقے کہہ رہے ہیں کہ تین بڑی حکومتوں کا یہ اعلان اسرائیل کے حق میں ہے اور اس کی غرض وغایت یہ ہے کہ اسرائیل کی سرحدوں کی ضمانت دی جائے۔حالانکہ یہ سرحدیں 1947ء کی تقسیم کی تجویز کے مطابق نہیں ہیں۔ ان عرب حلقوں کا بیان ہے کہ عربوں اور اسرائیل کے لئے اسلحہ فراہم کرنے کا اعلان ایک آمریت کی حیثیت رکھتا ہے جو تین بڑی حکومتوں کی طرف سے ممالک عربیہ پر تھوپی جارہی ہے۔ اس اعلان کا مطلب یہ بھی ہے کہ تین بڑے ممالک عربیہ کے اندرونی معاملات میں دخل دیں۔ لیکن عرب اس اقدام کی سخت مخالفت کریں گے سیاسی حلقے کہہ رہے ہیں کہ اس اعلان کا مطلب تو یہ ہوا کہ عرب اپنی قسمت کے خود مالک نہیں بلکہ وہ شطرنج کے مہرے ہیں جو امریکہ، برطانیہ اور فرانس کے اشارے پر بڑھتے اور ہٹتے رہتے ہیں۔عرب سیاستدان اس اعلان کا یہ مطلب لے رہے ہیں کہ تین بڑی حکومتیں یہ چاہتی ہیں کہ عربوں کو روس کی جنگ میں دھکیل دیں۔ چنانچہ عرب سیاستدان اس اعلان کی سخت مخالفت کر رہے ہیں۔لبنان کے ایک اخبار نے بھی لکھا ہے کہ عرب ارض مقدس کے سوا کسی جنگ میں شامل نہیں ہوسکتے اور پیرس کو محسوس کرنا چاہیے کہ عرب روس کے خلاف کسی جنگ میں شریک ہونے کو تیار نہیں کیونکہ ایسی جنگ کا مقصد تو یہ ہوگا کہ یہودیوں کی ترقی اور عیش کا انتظام ہوجائے۔'' عربوں کے ردعمل کے اس ذکر کے بعد نوائے وقت نے لکھا کہ ''آج سے چند روز پہلے اسی مسئلہ پر اظہار رائے کرتے ہوئے ہم بالکل یہی خیالات ظاہر کر چکے ہیں۔ آج ہم صرف اس قدر عرض کرنا چاہتے ہیں کہ پاکستان کو عربوں سے سبق سیکھنا چاہیے۔عربوں نے آنکھیں بند کر کے انگریزوں پر اعتماد کیا اب وہ سزا بھگت رہے ہیں اور شرق اردن کے سوا سب عرب ممالک کی آنکھیں کھل گئی ہیں۔شرق اردن کی حالت باقی عرب ممالک سے مختلف ہے۔ اردن کی فوج کے تمام اعلیٰ افسر انگریز ہیں اور اس فوج کے مصارف بھی انگریز ہی برداشت کرتے ہیں۔اس لئے شاہ عبداللہ کی حیثیت دراصل وہی ہے جو آزادی سے پہلے نظام یا ہری سنگھ یا کسی اور دیسی راجہ کی انگریزی حکومت کے مقابلے میں تھی۔ اس لئے شاہ شرق اردن تو کبھی انگریزوں سے متنفر یا بیزار نہیں ہوگا۔باقی عرب ممالک بالخصوص ان کے عوام پچھتا رہے ہیں اور زبان حال سے پاکستانیوں سے کہہ رہے ہیں۔

من نہ کردم شما حذر بہ کنید''[44]

نوائے وقت میں جس دن یہ اداریہ چھپا تھا اس سے دو تین دن قبل وزیر اعظم لیاقت علی خان نے کینسنگٹن میں تقریر کی تھی کہ ''نظریاتی تصادموں کی اس دنیا میں اسلامی طرز زندگی اخلاقی خلفشار کے خلاف سب سے بڑا تحفظ مہیا کرتا ہے بالخصوص دنیا کے ایسے علاقوں میں جہاں نوزائیدہ اقوام کی قوم پرستی کا جوش اور عوام کی پسماندگی مل جل کر بدامنی و بے چینی کے حالات پیدا کرتے ہیں۔''[45] اس کا مطلب یہ تھا کہ عرب ممالک میں اسلام کے زور سے سامراج دشمن قوم پرستی کے پرجوش مظاہروں پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ لیکن پاکستان میں بجا طور پر سمجھا گیا تھا کہ لیاقت علی خان نہ صرف مشرق وسطیٰ میں اسلام کی آڑ لے کر اینگلو امریکی سامراج کی خدمت کرنا چاہتا ہے بلکہ وہ پاکستان کو دوسرا شرق اردن بنانے سے بھی گریز نہیں کرے گا۔ ان دنوں پاکستان کی تینوں افواج کے سربراہ انگریز تھے۔ دوسرے بہت سے سینیئر فوجی عہدوں پر بھی انگریز ہی فائز تھے اور لیاقت علی خان امریکہ میں پاکستان کی نہایت عمدہ فوج کے لئے جدید اسلحہ کی بھیک مانگ رہا تھا۔

امریکہ کے ایما پر مصر، شام، سعودی عرب، لبنان اور یمن کے مابین دفاعی معاہدہ پر دستخط تاکہ عرب عوام کی توجہ اینگلو امریکی ریشہ دوانیوں سے ہٹائی جا سکے

نوائے وقت نے امریکہ، برطانیہ اور فرانس کے 25 مئی کے مشترکہ اعلان پر عرب حلقوں کے جس ردعمل کی تفصیل بتائی تھی وہ دراصل عالم عرب کے حکمرانوں کا ردعمل نہیں تھا بلکہ وہ وہاں کے قوم پرست لیڈروں، اخبارات اور عوام الناس کا ردعمل تھا۔ مصر سمیت عرب ممالک کے فرمانروا، شیوخ اور دوسرے حکمران دراصل اینگلو امریکی سامراج کے اس طرح کے کاسہ لیس تھے جس طرح کہ حکومت پاکستان کے اندر لیاقت علی خان، ظفر اللہ خان، غلام محمد، اسکندر مرزا، اکرام اللہ اور چودھری محمد علی وغیرہ تھے۔ وہ امریکہ اور برطانیہ سے ناتا توڑ کر سوویت یونین سے دوستی کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنے ممالک کی سامراج دشمن رائے عامہ سے بہت خوفزدہ تھے اور اس رائے عامہ کو گمراہ کرنے کے لئے وہ طرح طرح کی تدبیریں بھی

اختیار کرتے تھے۔ ایک تدبیر معاہدۂ تحفظ کے بارے میں مصر کی تجویز تھی۔ اس تجویز کو امریکہ کی اندرخانہ حمایت حاصل تھی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ عرب ممالک کے عوام کے سامنے فوجی معاہدے کا نعرہ لگا کر ان کی توجہ اس شرمناک حقیقت کی طرف سے ہٹائی جائے کہ عربوں نے اسرائیل سے فیصلہ کن شکست کھائی ہے، برطانوی فوجیں ابھی تک نہر سویز کے علاقے میں موجود ہیں اور یہ کہ امریکہ و برطانیہ وادیٔ نیل کے اتحاد یعنی مصر اور سوڈان کے اتحاد کے خلاف ہیں۔ ایک مقصد یہ بھی تھا کہ برطانیہ نے عرب فیڈریشن یا عظیم تر شام کے قیام کے لئے جو منصوبہ بنایا ہوا ہے اسے امریکہ کے مفاد کو فروغ دینے کی خاطر ناکام کیا جائے۔ مصر نے اس معاہدے کی تجویز اکتوبر 1949ء میں پیش کی تھی اور تقریباً 9 ماہ میں عرب لیگ کی سیاسی کمیٹی نے اس کی تفصیلات طے کی تھیں۔ چنانچہ 17 رجون کو عرب لیگ کے پانچ رکن ملکوں مصر، شام، سعودی عرب، لبنان، یمن نے عرب لیگ کے سیاسی کمیٹی کے اجلاس میں ممالک عربیہ کے مشترکہ دفاع کے معاہدے پر دستخط کر دیئے۔ اس موقع پر عرب لیگ کے سیکرٹری جنرل سید عبدالرحمان عزام پاشا نے اعلان کیا کہ ''عراق نے معاہدہ پر دستخط محض ٹیکنیکل وجوہ کی بناء پر نہیں کئے۔ اور شرق اردن کا کوئی نمائندہ عرب لیگ کی سیاسی کمیٹی کے اس اجلاس میں شریک ہی نہیں تھا۔''[46]

دراصل اسکندریہ میں دفاعی معاہدہ کا یہ ڈھونگ عرب عوام کی توجہ امریکہ، برطانیہ اور فرانس کے 25 رمئی 1950ء کے اس اعلان سے ہٹانے کے لئے رچایا گیا جس کے تحت عرب ممالک کو اسلحہ کی سپلائی پر پابندی عائد کر کے اسرائیل کو سرحدوں کی ضمانت دی گئی تھی۔ عرب لیگ کی سیاسی کمیٹی نے اس نام نہاد معاہدے پر دستخطوں کی رسم کی ادائیگی سے پیشتر تینوں طاقتوں کے اس اعلان کا ایک جواب بھی تیار کیا تھا جس میں اسلحہ کی سپلائی کے بارے میں ان کی نئی پالیسی پر تشویش کا اظہار کیا گیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی اس امر پر اطمینان کا اظہار کیا گیا تھا کہ ان تینوں بڑی طاقتوں کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ مشرق وسطیٰ کو اثر ورسوخ کے حلقوں میں تقسیم کریں یا ممالک عربیہ کی آزادی اور خودمختاری پر چھاپہ ماریں۔ عرب لیگ برطانوی سامراج کی پیداوار تھی اور اس کا سیکرٹری جنرل عبدالرحمان عزام پاشا انگریزوں کا نہایت قابل اعتماد پٹھو تھا۔ جب امریکہ کی جانب سے اسرائیل کی مسلسل اور کھلم کھلا امداد پر اپریل 1950ء کے اواخر میں عرب ممالک میں بے پناہ غصے کا اظہار کیا گیا تھا اور شام کے ایک وزیر نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر امریکہ کا دباؤ

اسی طرح جاری رہا تو عرب ممالک میں رائے عامہ صیہونیت کی محکوم بن جانے کی بجائے روسی جمہوریہ بننے کو ترجیح دے گی تو عزام پاشا نے یہ اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ اب حالات جو کروٹ لے رہے ہیں وہ شامی لیڈر کے زاویہ نظر کو عام عربوں کی رائے نہ ثابت کر دیں۔ اور پھر جب مئی 1950ء کے تیسرے ہفتے میں یہ خبر چھپی تھی کہ امریکہ، مصر، شام، لبنان اور عراق پر یہ دباؤ ڈال رہا ہے کہ وہ اسرائیل کے ساتھ امن کا معاہدہ کر لیں تو عزام پاشا کا بیان یہ تھا کہ ''عرب امریکہ اور امریکیوں کی بہت قدر کرتے ہیں لیکن اگر امریکہ کی موجودہ پالیسی جاری رہتی ہے تو مجھے شبہ ہے کہ انڈونیشیا سے لے کر کاسا بلانکا تک امریکہ کا کوئی قدر دان نہیں رہے گا۔ میں اپنے امریکی دوستوں کو یہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ہم نے ماضی میں پانچ سو سال کے دوران کئی تہذیبوں کو جنم دیا ہے۔ اس وقت امریکہ کے براعظم کا کسی کو پتہ بھی نہیں تھا۔ عرب امریکی خیرات کے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں۔''[47] چونکہ عزام پاشا کو عرب عوام کی سامراج دشمنی کی شدت کا پتہ تھا اس لئے اس کے اس قسم کے بیانات کا مقصد صرف اپنے سامراجی آقاؤں کو متنبہ کرنا تھا کہ اسرائیل کی اس طرح کھلم کھلا حمایت کرنے سے عرب عوام اپنے مغرب نواز حکمرانوں کو مجبور کر دیں گے کہ وہ سوویت یونین سے دوستی کریں۔

چونکہ نوائے وقت کی پالیسی ان دنوں بوجوہ اینگلو امریکی سامراج کے خلاف تھی اس لئے وہ امریکہ، برطانیہ اور فرانس کے 25رمئی 1950ء کے اعلان کے بارے میں عرب لیڈروں کی دوغلی پالیسی پر سخت نکتہ چینی کرتا تھا۔ عرب لیگ کی سیاسی کمیٹی کے اجلاس کی کاروائی پر اس اخبار کا ردعمل یہ تھا کہ ''عرب ممالک کی بدنصیبی ہے کہ وہ برطانیہ کی محسن کشی اور بے وفائی کا ہزار بار امتحان لینے کے باوجود اس کے چنگل سے رہائی نہ پاسکے۔ اب تو ان کے گلے میں امریکہ کا طوق بھی پڑ گیا ہے۔ اینگلو امریکن بلاک نے، جو مشرق وسطیٰ میں کمیونزم کے خلاف زبردست مورچہ بنا رہا ہے، ایک طرف شاہ عبداللہ کو کٹھ پتلی بنا کر اور دوسری طرف حکومت اسرائیل کا قیام عمل میں لا کر عربوں کی طاقت توڑ دی ہے تاکہ وہ کمیونزم کی طرف مائل نہ ہوسکیں اور اب انہیں اسلحہ سے لیس کیا جا رہا ہے۔ بدقسمتی سے عرب اب اس قابل نہیں رہے کہ وہ استعماریت کے اثر سے نجات حاصل کر سکیں۔ اس کی وجہ عرب ممالک کا فرسودہ جاگیرداری نظام ہے جس کا اینگلو امریکن سرمایہ داروں سے گٹھ جوڑ ہو گیا ہے۔ دوسری اور سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ ممالک نہ تو مکمل طور پر آزاد ہیں نہ

اپنے پاؤں پر کھڑے ہیں۔ ان کی فوجی طاقت کا راز امریکہ و برطانیہ کے اسلحہ کے کارخانوں میں بند ہے۔ اس کمزوری کی بنا پر اینگلو امریکی طاقت اپنی سیاست کے پنجے مشرق وسطیٰ میں بہت گہرے گاڑ چکی ہے۔''[48] جب نوائے وقت نے یہ اداریہ لکھا تھا اس وقت لیاقت علی خان بوسٹن کے ہسپتال میں آپریشن کے بعد آرام کر رہا تھا۔ اس آپریشن سے پہلے وہ کینیڈا کے سیاسی لیڈروں اور اخبارات کو بتا چکا تھا کہ پاکستانی فوج درۂ خیبر کی محافظ ہے جہاں سے ماضی میں برصغیر پر 90 مرتبہ حملہ ہو چکا ہے۔

رجعت پسند حکمران اور اخبارات کا اینگلو امریکی سامراج کے خلاف رویہ اسے متنبہ کرنے کے لئے تھا کہ اگر اس نے یہود و ہنود کو مسلمانوں پر ترجیح دی تو مسلم عوام روس کے حلقہ اثر میں چلے جائیں گے

25 جون 1950ء کو جب کوریا کی جنگ شروع ہوئی تو پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خان نے اپنے ملک کی رائے عامہ کو نظر انداز کر کے فوراً ہی اعلان کر دیا کہ پاکستان اس جنگ میں امریکہ کی ہر ممکن امداد کرے گا لیکن عرب ممالک کے حکمرانوں پر رائے عامہ کا دباؤ اتنا زیادہ تھا کہ وہ لیاقت علی خان کی تقلید نہ کر سکے اور سعودی عرب و عراق سمیت سارے عرب ممالک کے حکمرانوں کو یکے بعد دیگرے یہ اعلان کرنا پڑا کہ وہ کوریا کی جنگ میں غیر جانبدار رہیں گے۔ عالم عرب کی اس صورتحال کی نزاکت کے پیش نظر نوائے وقت نے لندن کے ایک ماہنامے ''اسلامک ریویو'' کا ایک مضمون شائع کیا۔ اس مضمون میں پہلے حصہ میں مشرق وسطیٰ میں امریکیوں کی بالادستی بلکہ زبردستی کی ایک مثال پیش کی تھی۔ مثال یہ تھی کہ عرب لیگ کے اجلاس سے ایک دن قبل رات کو قاہرہ میں مقیم امریکی نمائندہ نے حکم دیا کہ عرب نمائندوں کو رات میں سوتے سے جگایا جائے اور ان سے کہا جائے کہ امریکہ چاہتا ہے کہ عرب یہود کے ساتھ قطعی طور پر آخری فیصلہ کریں۔ اس لئے یہ مسئلہ لیگ کے کل ہونے والے اجلاس میں زیر بحث لایا جائے اور اس کے نتائج موافق ہوں۔ امریکہ کے اس رعونت آمیز رویہ کے عواقب و نتائج بجا طور پر امریکی خواہش کے عین خلاف رہے۔ شام کے وزیر معاشیات اور عرب لیگ میں اپنے ملک کے نمائندہ معارف الدوالیبی نے اس کے فوراً بعد اعلان کیا ''عرب ممالک امریکہ کا غلام بننے کی بجائے روس کا ایک حصہ بننا پسند کریں

گے۔علاوہ بریں روسی سفیر شام اور روس کے مابین عدم اقدام کا ایک معاہدہ طے کرانے کی غرض سے ماسکو روانہ ہو گئے اور اس کے فوراً بعد ماسکو میں مقیم شامی وزیر مختار فرید زین الدین ماسکو سے اس امر کی ایک تجویز لے کر دمشق آئے کہ روس شام کو ہر قسم کا فوجی سامان فراہم کرے گا۔'' اس مضمون کا دوسرا حصہ یہ تھا کہ ''ہم ہی نہیں آج پوری مہذب دنیا اس رویے سے واقف ہے کہ اگر امریکہ کو اشتراکیت کا خطرہ نہیں ہوتا تو امریکی، عراق، اردن، شام اور لبنان پر یہود کو مسلط کر دیتے اور پھر کچھ عرصہ میں ساری عرب دنیا کو غلام بنا دیتے۔لیکن صرف سرخ خطرہ کے تحت وہ ایسا کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں اور اگر آئندہ جنگ میں اشتراکیت کو کچل دیا گیا تو عربوں کو یہودی غلام بننے کے لئے تیار رہنا ہوگا۔عربوں کا مفاد اسی میں ہے کہ روس مضبوط رہے تاکہ دنیا میں طاقت کا توازن قائم رہے۔ نیز مسلمانوں کا مفاد بھی اسی میں ہے کہ وہ کسی آئندہ جنگ میں غیر جانبدار رہیں۔مسلمانوں کو جنگ سے کوئی واسطہ نہیں۔مسلمانوں کا نظریۂ حیات جداگانہ ہے۔ وہ صرف انہی کے خلاف جنگ کریں گے جو مسلمانوں کی زمین یہودی ملکیت میں تبدیل کر رہے ہیں۔''

ماہنامہ اسلامک ریویو لندن سے پاکستان کی احمدیہ جماعت کے مبلغین شائع کرتے تھے۔ اس جماعت کا ایک نہایت ممتاز رکن ظفر اللہ خان پاکستان کا وزیر خارجہ تھا اور اس کی اس وقت تک کی پالیسی برطانیہ کی فرمانبرداری تک محدود تھی۔اس لئے اس مضمون میں مشرق وسطیٰ میں برطانیہ کے سامراجی کردار کا کوئی ذکر نہیں تھا اور صرف امریکہ کو ہدف ملامت بنایا گیا تھا۔اس مضمون کا بنیادی مقصد یہ نہیں تھا کہ عرب ممالک کے عوام کی سامراج دشمن تحریکوں کی حمایت کی جائے یا عرب حکمرانوں کو تلقین کی جائے کہ وہ محض برسر اقتدار رہنے کے لئے اینگلو امریکی سامراج کے پاس اپنی قومی عزت، غیرت اور حمیت فروخت نہ کریں بلکہ اپنی داخلی اور خارجی پالیسی میں بالکل آزاد روش اختیار کریں بلکہ اس کا مقصد امریکہ اور اس کے حلیف ممالک کو یہ احساس دلانا تھا کہ مشرق وسطیٰ میں کمیونسٹ عناصر روز بروز تقویت حاصل کر رہے ہیں۔انہیں صرف مواقع کا انتظار ہے اور وقت آنے پر وہ عرب عوام کی غربت، فاقہ کشی، بے چینی اور آلام و مصائب سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں گے۔مضمون کے آخر میں لکھا گیا تھا کہ ''حالات بتا رہے ہیں کہ شام کا حشر بھی چین جیسا ہوگا...... ہمارا خیال ہے کہ امریکہ کا بہترین مفاد اس امر کا متقاضی ہے کہ وہ یہود نوازی کی پالیسی ترک کر دے کیونکہ اس کی یہ روش مشرق وسطیٰ میں بے چینی کا باعث بنتی جا رہی ہے اور اگر اس نے اپنا رویہ

تبدیل نہ کیا تو اسے یہ دیکھنے کے لئے تیار رہنا ہوگا کہ مستقبل قریب میں مشرق وسطیٰ پر ''آہنی پردہ'' مسلط ہو جائے گا۔ اس وقت امریکہ کو مشرق وسطیٰ کے ''سیاہ سونے'' پٹرولیم کو خدا حافظ کہنا پڑے گا۔''[49] یہ مضمون نوائے وقت کی پالیسی کے عین مطابق تھا۔ نوائے وقت بھی جب کبھی اینگلو۔امریکی سامراج کے خلاف خامہ فرسائی کرتا تھا تو اس کا لیاقت علی خان کی مخالفت کے مقصد کے علاوہ ایک مقصد امریکہ اور برطانیہ کو متنبہ کرنا ہوتا تھا کہ اگر تم نے یہودیوں کو عربوں پر ترجیح دینے اور پاکستان پر ہندوستان کو ترجیح دینے کی پالیسی جاری رکھی تو عرب عوام اور پاکستانی عوام روس کے حلقہ اثر میں چلے جائیں گے اور جس دن ایسا ہوا وہ دن بڑا ''منحوس'' ہوگا۔ گویا بے وفا معشوق سے یہ التجا کی جاتی تھی کہ رقیب روسیاہ کی جانب رغبت کا اظہار مت کرو۔

جنگ کوریا سے پیدا شدہ صورتحال سے توجہ ہٹانے کے لئے غلام محمد، خلیق الزماں اور الطاف حسین کی طرف سے عالم اسلام کے اتحاد کے نعرے

چونکہ عرب ممالک کے فرمانرواؤں، شیوخ اور جاگیردار حکمرانوں کا بھی اینگلو امریکی بلاک کے بارے میں کچھ اسی قسم کا رویہ تھا۔ اس لئے کوریا کی جنگ کے بارے میں ان سب کی ''غیر جانبداری'' کے باوجود برطانیہ کے ارباب اقتدار اور ان کے پاکستانی پٹھوؤں کو امید تھی کہ مشرق وسطیٰ میں مذہب کے نام پر بالآخر سوویت مخالف بلاک کی تشکیل ہو ہی جائے گی۔ چنانچہ پاکستان کا وزیر خزانہ غلام محمد لندن میں سٹرلنگ کانفرنس میں شرکت کرنے کے بعد واپسی پر تین دن کے لئے قاہرہ میں ٹھہرا تو اس نے مسلم ممالک کو پھر یہ مشورہ دیا کہ وہ اسلامک اکنامک بلاک بنائیں۔ اس کی رائے یہ تھی کہ ''عصر حاضر میں کوئی بھی ملک الگ تھلگ نہیں رہ سکتا۔ اس لئے مسلم ممالک کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ معاشی شعبے میں ایک دوسرے سے تعاون کر کے اپنے آپ کو مضبوط بنائیں۔ اس نے کہا کہ اگرچہ مسلم ممالک رقبہ اور آبادی کے لحاظ سے بڑے ہیں لیکن معاشی ترقی کے نقطہ نگاہ سے ان کی حیثیت بہت چھوٹی اکائیوں کی ہے۔ ان کا مفاد اسی میں ہے کہ وہ عوام الناس کی بھلائی کے لئے تنگ نظر قوم پرستی کے نظریے کو ترک کر کے اسلام کو تقویت پہنچائیں۔''[50] اس شخص کی عملی زندگی کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ 48-1947ء میں سیکولر سیاست کا پرچار کرتا تھا لیکن 50-1949ء میں اس نے اسلام کا نام محض اس لئے لینا شروع کر دیا

تھا کہ اس کے انگریز آقاؤں کی رائے یہ تھی کہ مشرق وسطیٰ میں سوویت مخالف بلاک بنانے کے لئے پان اسلام ازم کا حربہ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ نومبر 1949ء میں اس کی انٹرنیشنل اسلامک اکنامک کانفرنس بھی اس سامراجی رائے کی پیداوار تھی۔ پاکستان مسلم لیگ کے صدر چودھری خلیق الزماں نے بھی انگریزوں کی اسی رائے کے پیش نظر اکتوبر 1949ء میں آل ورلڈ مسلم لیگ یا مسلم پیپلز لیگ اور اسلامستان کے قیام کے لئے پہلے مشرق وسطیٰ کے ممالک کا اور پھر لندن کا دورہ کیا تھا اور اب اگست 1950ء میں اس کا نمائندہ علیم اللہ صدیقی بغداد میں تھا۔ وہاں برطانیہ کی سٹار نیوز ایجنسی سے اس کا انٹرویو یہ تھا کہ ''چودھری خلیق الزماں کی تجویز کردہ مسلم پیپلز کانفرنس کا مقصد یہ ہے کہ مسلم دنیا کا تحفظ کیا جائے اور اس کے مناسب دفاع کو یقینی بنایا جائے۔ اس نے امید ظاہر کی کہ مجوزہ کانفرنس جلد ہی منعقد ہوگی۔''[51]

روزنامہ ڈان کا الطاف حسین بھی انگریزوں کی اس رائے سے متاثر تھا لیکن اسے خلیق الزماں کے بھونڈے طریق کار پر سخت اعتراض تھا کیونکہ اس سے فائدہ کی بجائے نقصان ہوتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اسلامک بلاک کی تشکیل کے لئے وزیر خزانہ غلام محمد کا لائحہ عمل صحیح ہے۔ چنانچہ جب وہ اگست کے دوسرے ہفتے میں لندن سے واپسی پر قاہرہ میں ٹھہرا تو اس نے مقامی ریڈیو پر ایک نشری تقریر میں مسلم دنیا کے بعجلت اتحاد کی ضرورت پر زور دیا۔ اس نے تجویز پیش کی کہ اس مقصد کے تحت مسلم ممالک کے درمیان تعاون کے تین پروگراموں پر عمل ہونا چاہیے۔ اول یہ کہ انہیں خبروں کے تبادلے کے ذریعے ایک دوسرے کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنی چاہئیں دوئم یہ کہ انہیں ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ تجارت کرنی چاہیے اور اگر ضرورت ہو تو اس مقصد کے لئے تجارتی ترجیحات کا نظام رائج کرنا چاہیے۔ سوئم یہ کہ انہیں سارے بین الاقوامی اداروں میں تخویف وتحریص سے بالاتر ہو کر ایک دوسرے کی حمایت کرنی چاہیے۔ اس نے کہا کہ فی الحال مجوزہ مسلم بلاک کا قیام ممکن نہیں ہے۔ البتہ ایک ایسا ادارہ ہونا چاہیے جہاں مشترکہ مفاد کے معاملات کے بارے میں تبادلہ خیالات ہو سکے اور معاشی اور معاشرتی تعاون کے طریقوں پر غور کیا جا سکے۔ اس نے مسلم اتحاد کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے مزید کہا کہ مسلمان عالمی امور میں مثبت کردار ادا کر سکتے ہیں اور انہیں لازماً یہ کردار ادا کرنا چاہیے۔''[52]

الطاف حسین کی اس تقریر سے واضح تھا کہ وہ چاہتا وہی تھا جس کے لئے خلیق الزماں اتنے مہینوں

سے کوشاں تھا۔ البتہ اس کا لیبل مختلف تھا۔ وہ ''مسلم بلاک'' کی بجائے ''مسلم اتحاد'' کا خواہاں تھا۔ حالانکہ دوسری جنگ عظیم کے بعد چار پانچ سال کے تجربے سے یہ ثابت ہوگیا تھا کہ نہ صرف عالمی سطح پر اینگلو امریکی بلاک اور اشتراکی بلاک کے درمیان کشمکش کی وجہ سے بلکہ امریکہ، برطانیہ کی باہمی رقابتوں کی وجہ سے بھی مذہب کے نام پر کوئی بلاک یا اتحاد قائم نہیں ہوسکتا۔ ترکی اور ایران نے امریکہ کی ہدایت کے مطابق اسرائیل کو تسلیم کرلیا تھا جبکہ عرب ممالک نے اس سلسلے میں امریکہ کا حکم نہیں مانا تھا۔ وہ یہودی غلامی پر سوویت یونین کا ہمنوا بننے کو ترجیح دیتے تھے۔ کوریا کی جنگ کے بارے میں بھی مسلم ممالک کے موقف میں اتفاق و اتحاد نہیں تھا۔ ترکی اور پاکستان شمالی کوریا کو جارحیت کا مجرم قرار دیتے تھے اور جنوبی کوریا کی ہر ممکن امداد کے حق میں تھے جبکہ عرب ممالک کے حکمران اپنی رائے عامہ کے دباؤ کی وجہ سے غیر جانبدار رہنے پر مجبور تھے۔

عوامی رائے عامہ کے شدید دباؤ اور آئندہ انتخابات کے پیش نظر لیاقت نے کوریا کی پالیسی میں ترمیم کر کے صرف گندم اور ادویات کوریا بھیجنے پر اکتفا کیا

پاکستان کی رائے عامہ کوریا کی جنگ کے بارے میں عرب ممالک کی رائے عامہ کی ہمنوا تھی۔ عرب ممالک کی رائے عامہ کو تو یہ شکایت تھی کہ اسی اقوام متحدہ نے نومبر 1947ء میں امریکہ کے دباؤ کے تحت فلسطین کو تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور پھر جب 1948ء میں اسرائیل نے جارحیت کا ارتکاب کر کے عربوں کے مزید تقریباً 7 ہزار مربع میل پر قبضہ کرلیا تھا تو سلامتی کونسل حرکت میں نہیں آئی تھی مگر اب جبکہ کوریا میں امریکی سامراج کے مفادات کا سوال اٹھا ہے تو سلامتی کونسل اور اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی دونوں نے ہی بر سر عمل ہونے میں ذرا تاخیر نہیں کی۔ اسی طرح پاکستانی عوام کو شکایت تھی کہ جب جنوری 1948ء میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں تنازعہ کشمیر پیش ہوا تھا تو اسے طویل بحث مباحثے کے ذریعے کھٹائی میں ڈال دیا گیا تھا مگر اب کوریا کے معاملے میں سلامتی کونسل نے کسی بحث کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خان کو ابتداً یہ احساس نہیں تھا کہ پاکستان کے عوام کوریا کے بارے میں اس کے سامراج نواز موقف کی اس قدر شدت سے مخالفت کریں گے مگر جب وہ 13 رجولائی 1950ء کو دورہ امریکہ سے واپس کراچی پہنچا تو تھوڑے ہی دنوں میں اسے

اپنی غلطی کا پتہ چل گیا۔ چنانچہ اس نے آہستہ آہستہ اس مسئلہ پر پینترا بدلنا شروع کیا۔ اس نے اس سلسلے میں اپنے رویے میں تبدیلی کا پہلی مرتبہ 19 رجولائی 1950ء کو اظہار کیا۔ اس نے اپنی نشری تقریر میں جنوبی کوریا کی امداد و حمایت کے بارے میں اتنا زوردار موقف اختیار نہ کیا جتنا کہ اس نے 3 رجولائی 1950ء کو لندن کی پریس کانفرنس میں اختیار کیا تھا۔ اس کے رویے میں تبدیلی کا دوسرا اظہار 6 راگست 1950ء کو ہوا جبکہ پاکستان مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے ایک قرارداد میں کوریا کے سوال پر اقوام متحدہ کے فیصلے کی حمایت کے بارے میں حکومت پاکستان کے فیصلے کی مکمل تائید کی لیکن اس قرارداد میں اس حقیقت کی بھی نشاندہی کی گئی کہ ''اگر اقوام متحدہ کشمیر، فلسطین، جوناگڑھ اور حیدرآباد (دکن) کے خلاف جارحیت کے موقع پر اتنی ہی مستعدی کا مظاہرہ کرتی تو کوریا کا یہ بحران پیدا نہ ہوتا۔''[53] لیگ کی مجلس عاملہ میں یہ قرارداد چودھری خلیق الزماں نے پیش کی تھی اور یہ وہی چودھری خلیق الزماں تھا جس نے 13 رجولائی 1950ء کو لیاقت علی خان اور اس کی بیگم کی خدمت میں نہایت خوشامدانہ سپاس نامہ پیش کرتے ہوئے کوریا کی جنگ کے بارے میں وزیراعظم کے فیصلے کی نہایت صدق دل سے حمایت کی تھی اور اس موقع پر کشمیر اور فلسطین وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔

تاہم مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا 6 راگست کو ترمیم شدہ موقف بھی حسین شہید سہروردی کے کارکنوں کو مطمئن نہ کر سکا۔ چنانچہ انہوں نے 12 راگست کو کراچی میں ان کارکنوں کے ایک کنونشن میں مطالبہ کیا کہ ''چونکہ وزیراعظم لیاقت علی خان نے کوریا کی جنگ کے بارے میں اپنی کابینہ، دستور ساز اسمبلی اور عوام کی رائے معلوم کئے بغیر ہی فیصلہ صادر کر دیا تھا اس لئے اس فیصلے میں ترمیم کی جائے۔ پاکستان کو تمام بین الاقوامی تنازعات میں غیر جانبدار رہنا چاہیے۔'' کنونشن نے مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کی 6 راگست کی قرارداد پر افسوس کا اظہار کیا اور حقارت کے ساتھ یہ رائے ظاہر کی کہ ''عاملہ نے پاکستان کی رائے عامہ کو نظر انداز کر کے غلامانہ ذہنیت کے تحت وزیراعظم کے فیصلے کی توثیق کی ہے۔''[54]

لیاقت علی خان نے 14 راگست 1950ء کو عوامی مسلم لیگ کے کارکنوں کے اس کنونشن کا ذکر کئے بغیر کوریا کی جنگ کے مسئلہ پر اپنے رویے میں تبدیلی کا تیسرا اظہار کیا۔ اس نے یوم پاکستان کے موقع پر کراچی کے ایک جلسہ عام میں کوریا کی جنگ کے بارے میں حکومت پاکستان کی پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ''پاکستان نے کوریا کے بارے میں اقوام متحدہ کی قرارداد کی

حمایت کی ہے۔ میرا موقف یہ ہے کہ پاکستان اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اقوام متحدہ کا قیام اس اصول کی بنیاد پر عمل میں آیا تھا کہ اگر دو ملکوں کے درمیان کوئی تنازعہ پیدا ہو تو اس کا تصفیہ جنگ کی بجائے پرامن طریقے سے ہونا چاہیے۔ اگر آج ہم یہ فیصلہ کر لیں کہ بین الاقوامی تنازعات کا تصفیہ پرامن طریقے کی بجائے جنگ کے طریقے سے ہوگا تو بنی نوع انسان پر قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ اقوام متحدہ کے 53 ممالک نے کوریا سے متعلقہ قرارداد کی حمایت کی ہے۔ یہ فیصلہ صحیح ہے کیونکہ بنی نوع انسان کی بقا کی امید اسی صورت میں کی جاسکتی ہے کہ اقوام متحدہ قائم رہے۔ جو لوگ کوریا کے مسئلہ پر حکومت کے فیصلے کو ہدف تنقید بنا رہے ہیں وہ جاہل ہیں۔ موجودہ زمانہ میں کوئی قوم اپنے آپ کو اور اپنی نگاہ کو اپنی سرحدوں کے اندر ہی محدود نہیں رکھ سکتی۔ یہ بین الاقوامی تعلقات کا زمانہ ہے۔ اگر پاکستان بین الاقوامی تعلقات استوار نہ کرے اور ان تعلقات کو برقرار نہ رکھے تو اسے اقوام عالم میں کوئی مقام حاصل نہیں ہوگا۔ جہاں تک کوریا کی امداد کے سوال کا تعلق ہے ہر ملک کو یہ دیکھنا ہوگا کہ اس کے پاس اپنی آزادی کے تحفظ کے لئے بہت کچھ ہے۔ دوسروں کو امداد اسی صورت میں دی جاسکتی ہے کہ اپنا گھر خطرے میں نہ ہو۔ تاہم حکومت پاکستان اس سوال پر غور کر رہی ہے۔ مسلمان اپنے وعدوں سے منحرف نہیں ہوتے۔ ہم دیکھیں گے کہ ہم کوریا میں اقوام متحدہ کی کوئی امداد کر سکتے ہیں یا نہیں۔ [55] اگر ہم کوئی امداد کر سکے تو ضرور کریں گے۔ جو دوسرا سوال ہمارے زیر غور ہے وہ یہ ہے کہ اگر ہمارا دشمن کسی وقت بھی ہم پر حملہ کرنے پر تیار ہو تو ہم کوریا میں امداد دے سکتے ہیں یا نہیں؟ لیاقت علی خان کی یہ تقریر ٹائیں ٹائیں فش کی حیثیت رکھتی تھی۔ کہاں اس کا جولائی کے اوائل میں یہ اعلان کہ پاکستان حسب استطاعت جنوبی کوریا کی ہر ممکن امداد کرے گا اور کہاں تقریباً پانچ ہفتے بعد یہ اعلان کہ دوسروں کو امداد اسی صورت میں دی جاسکتی ہے کہ اپنا گھر خطرے میں نہ ہو۔ اس کی اس تقریر کا مطلب یہ تھا کہ ان دنوں حکومت پاکستان امریکہ سے یہ ضمانت حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ پاکستانی فوج کی جنوبی کوریا کے لئے روانگی کے بعد ہندوستان نے پاکستان پر حملہ کر دیا تو امریکہ پاکستان کی امداد کرے گا۔ لیکن اس کی یہ ضمانت طلبی بے سود تھی کیونکہ حکومت امریکہ کسی معاوضہ کے بغیر ہی پاکستان کو قربانی کا بکرا بنانا چاہتی تھی۔ اس وقت تک ترکی پہلا ملک تھا جس نے جنوبی کوریا میں اپنی بری فوج بھیجنے کی پیشکش کی تھی اور اس کے ساتھ ہی اس نے معاہدہ اطلانتک کی باقاعدہ

رکنیت کے لئے درخواست بھی دی تھی۔

23؍اگست 1950ء کو لیاقت علی خان سے ایک پریس کانفرنس میں پوچھا گیا کہ اگر سلامتی کونسل نے کشمیر کے بارے میں کوئی اقدم نہ کیا تو کیا آپ کوریا کے مسئلہ پر اپنے رویے میں تبدیلی کردیں گے۔ اس پر اس کا جواب یہ تھا کہ ''جہاں تک کوریا کا تعلق ہے میں نے اپنی پوزیشن بالکل واضح کردی ہے۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، ہم سمجھتے ہیں کہ شمالی کوریا نے جنوبی کوریا کے خلاف جارحیت کا ارتکاب کیا ہے۔ اس بات کا اس سے کوئی تعلق نہیں کہ سلامتی کونسل کشمیر کے بارے میں کیا کرے گی۔ کوریا کو امداد دینے کا سوال ابھی تک حکومت کے زیرغور ہے۔'' ایک اور سوال کے جواب میں اس نے کہا کہ ''میرے دورہ ماسکو کا انحصار اس بات پر ہے کہ روس اس معاملے میں پہل کرتا ہے یا نہیں۔ جب تک مجھے دعوت نہیں ملتی میں سوٹ کیس باندھ کر وہاں نہیں جا سکتا۔ مجھے گزشتہ سال دورہ ماسکو کی دعوت ملی تھی اور انہوں نے میرے اس دورے کے لئے 14؍اگست 1949ء کی تاریخ مقرر کی تھی۔ چونکہ 14؍اگست کو یوم پاکستان تھا اس لئے میں نے اس تاریخ کو ماسکو جانے سے معذوری ظاہر کی تھی۔ اس کے بعد مجھے ماسکو سے کوئی جواب نہیں ملا۔''[56] لیاقت علی خان کی اس پریس کانفرنس کا مطلب یہ تھا کہ 23؍اگست 1950ء تک امریکہ کی جانب سے پاکستان کو سلامتی وتحفظ کی مطلوبہ یقین دہانی نہیں کرائی گئی تھی۔ تاہم بظاہر لیاقت کو امید لگی ہوئی تھی کہ چونکہ ہندوستان کا وزیراعظم نہرو کوریا کی جنگ کے بارے میں غیرجانبدارانہ پالیسی پر عمل پیرا ہو گیا ہے اور وہ سوویت یونین اور اشتراکی چین سے دوستانہ مراسم بڑھا رہا ہے اس لئے شاید پاکستان کو بھی سلامتی وتحفظ کی اسی طرح ضمانت دے دی جائے گی جیسی کہ مئی 1950ء میں اطلانٹک طاقتوں نے یونان، ترکی اور ایران کو دی تھی۔ لیکن جب کئی دن گزر گئے اور یہ امید پوری نہ ہوئی تو اقوام متحدہ میں پاکستان کے مستقل نمائندے پروفیسر بخاری نے سیکرٹری جنرل ٹریگوے لی کو ایک خط میں بتایا کہ ''پاکستان جنوبی کوریا میں اقوام متحدہ کی ہر ممکن امداد کرنے کا خواہاں ہے۔ لیکن مقام افسوس ہے کہ حکومت پاکستان اس وقت اس قابل نہیں کہ وہ جنوبی کوریا میں فوجیں یا فوجی سامان بھیج سکے...... البتہ پاکستان پانچ ہزار ٹن گندم بھیجنے پر آمادہ ہے۔''[57]

پروفیسر بخاری کے مذکورہ خط کے تقریباً دو ہفتے بعد 12؍ستمبر 1950ء کو وزیراعظم لیاقت علی خان نے قائداعظم کے یوم وفات کے موقع پر ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے

پہلے تو اپنے سیاسی حریف حسین شہید سہروردی کو گالیاں دیں اور پھر کہا کہ ''یہ شخص کہتا ہے کہ پاکستان کو کوریا کے مسئلہ پر غیر جانبدار رہنا چاہیے تھا۔ اب ذرا غور کیجئے کہ اقوام متحدہ کے 59 ارکان ہیں۔ ان میں 53 ارکان نے کوریا کے مسئلہ پر سلامتی کونسل کی قرارداد کی حمایت کی ہے اور صرف روس کے پانچ طفیلی ممالک نے اس کی مخالفت کی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی مجھے بتائے کہ اس صورتحال میں پاکستان کیسے غیر جانبدار رہ سکتا ہے آپ یا تو کوئی چیز منظور کرتے ہیں یا مسترد کرتے ہیں۔ اگر آپ منظور کرتے ہیں (کوریا کے مسئلہ پر سلامتی کونسل کی قرارداد) تو آپ اقوام متحدہ کے 52 ارکان کے ساتھ ہیں اور اگر آپ منظور نہیں کرتے تو آپ چھ کمیونسٹ ممالک کے ساتھ ہیں۔ میں پھر کہتا ہوں کہ پاکستان نے کوریا کے مسئلہ پر جو فیصلہ کیا تھا وہ صحیح تھا اور پاکستان اس کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔''[58]

لیاقت علی خان کا یہ بیان صفائی صحیح نہیں تھا۔ پاکستان میں اس کا جو فیصلہ عوامی تنقید کا ہدف بنا تھا وہ صرف یہی نہیں تھا کہ اس نے کابینہ اور دستور ساز اسمبلی سے مشورہ کئے بغیر سلامتی کونسل کی قرارداد کی حمایت کیوں کی تھی بلکہ وہ دراصل یہ تھا کہ اس نے لندن میں جنوبی کوریا کی ''حسب استطاعت'' ہر ممکن امداد کرنے کا کیوں اعلان کیا تھا اور اس اعلان کے بعد اس نے پاکستان کی بری فوج کے ایک بریگیڈ کو کیوں حکم دیا تھا کہ وہ جنوبی کوریا جانے کی تیاری کرے۔ لیاقت علی خان بعد میں رائے عامہ کے دباؤ کی وجہ سے اور اپنی حکومت کے اندر بعض عناصر کی مداخلت کی وجہ سے اپنے اس فیصلے کو جامہ عمل نہ پہنا سکا۔ چنانچہ 26 ستمبر کو یہ خبر چھپی کہ ''ایک بحری جہاز پانچ ہزار ٹن گندم اور خاصی مقدار میں ادویات لے کر کراچی سے عنقریب جاپان کے لئے روانہ ہو رہا ہے۔ چونکہ حکومت پاکستان کوریا میں اپنی فوجیں بھیجنے سے قاصر ہے اس لئے وہ جنرل میکارتھر کی افواج کے لئے اناج وادویات بطور امداد بھیج رہی ہے۔'' اس خبر کی اشاعت کے موقع پر پاکستان میں کوریا کے مسئلہ پر بحث بہت حد تک ختم ہو چکی تھی اور کمیونزم، اسلام اور پان اسلام ازم پھر عوامی بحث کا موضوع بن گئے تھے۔

باب:9

مسئلہ نہر سویز اور لیاقت کی برطانیہ نواز پالیسی، کمیونزم کے خلاف مذہب کے استعمال میں اضافہ

پاکستان میں اسلام کے حوالے سے کمیونزم کے خلاف مہم میں اضافہ اور برطانوی ذرائع ابلاغ کی طرف سے اس مہم کی حوصلہ افزائی

رائے عامہ کے دباؤ کے تحت کوریا کے بارے میں لیاقت علی خان نے اپنی پالیسی میں تھوڑی ترمیم کردی اور اس مسئلہ پر عوامی ردعمل کی گرد بیٹھنے لگی تو کمیونزم، اسلام اور پان اسلام ازم پھر سے سرکاری وغیر سرکاری حلقوں میں موضوع بحث بن گئے۔ اس بحث کی ابتدا دراصل 29 راگست 1950 کو ہوئی جبکہ وزیر اعظم لیاقت علی خان نے لاہور کے اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ کے نامہ نگار سے ایک خصوصی انٹرویو میں کہا کہ ''پاکستان کو کمیونزم سے کوئی خطرہ نہیں۔ پاکستانیوں کا اسلام پر ایمان ہے۔ کمیونزم انہیں اپیل نہیں کرے گا۔'' سول اینڈ ملٹری گزٹ کو وزیر اعظم کی اس رائے سے اختلاف تھا۔ اس اخبار کی ادارتی رائے یہ تھی کہ ''اگرچہ پاکستان کے عوام اسلام کے گرویدہ ہونے کے باعث کمیونزم کو قبول نہیں کریں گے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ پاکستان پر باہر سے اشتراکیت کا حملہ نہیں ہوگا۔ تبت کے عوام بدھ ازم کے پیروکار ہونے کی وجہ سے کمیونزم کو قبول نہیں کرتے لیکن اس کے باوجود وہ بیرونی اشتراکیت کی زد میں ہیں اور بعض رپورٹوں کے مطابق عنقریب لہاسہ پر اشتراکی جھنڈا لہرانے لگے گا۔[1] نوائے وقت کو بھی لیاقت علی خان کی اس رائے سے اتفاق نہیں تھا اور اس کی ادارتی گزارش یہ تھی کہ ''کمیونزم کی حامی قوتوں کو حقیر نہ سمجھا جائے۔ وہ اندر ہی اندر اپنا کام کر رہی ہیں۔ ان کا مقابلہ محض جذبے کے نعروں اور کھوکھلے منفی پروپیگنڈے سے نہیں کیا جا

سکتا۔ نہ یہ فرض کر کے آنکھیں بند کر لینی چاہئیں کہ اسلام کے نام لیوا پاکستانی کمیونزم کے پاس بھی نہ پھٹکیں گے۔ ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ افریقہ اور مشرق وسطیٰ کے مسلمان ملکوں کے نوجوانوں میں کمیونزم کا خاصا چرچا ہے۔ اس سے بھی اہم تر بات یہ نہ بھولنی چاہیے کہ چین کے بعد تبت اور تبت کے بعد کشمیر کمیونزم کے آغوش میں چلے گئے تو مغربی پاکستان کے مسلمان پسند کریں یا ناپسند کمیونزم کو روکنا ناممکن ہو جائے گا، اسی طرح اگر چین کے بعد برما اور برما کے بعد مغربی بنگال اور آسام کمیونزم کے جھنڈے تلے آ گئے تو مشرقی پاکستان میں صورتحال قابو سے باہر ہو جائے گی۔ ہماری رائے میں خطرہ حقیقی ہے اور محض منفی تدابیر سے اس کی روک تھام ناممکن ہے۔ نظریہ حیات کی کاٹ نظریہ حیات سے ہی ممکن ہے۔ اسلام کمیونزم کا مسکت جواب نہیں بن سکتا ہے بشرطیکہ اسلام کا نعرہ پاکستان کے حلق سے نہیں دل سے بلند ہو...... نظریہ جب تک محض نظریہ ہے کتابوں میں ہی محدود رہے گا۔ جب اسے عملی جامہ پہنایا جائے گا تو لوگ دوسرے نظریہ حیات سے اس کا مقابلہ کریں گے اور ظاہر ہے کہ بہتر نظریہ کو دوسرے نظریہ پر ترجیح دیں گے۔''[2]

تقریباً ایک ہفتہ بعد نوائے وقت کا اداریہ یہ تھا کہ ''20 ہزار کردوں نے ایران کی افواج سے چھیڑ چھاڑ شروع کر رکھی ہے۔ مانچسٹر گارڈین کے نامہ نگار کی روایت کے مطابق کردوں کی یہ سرگرمیاں روسیوں کی ترغیب وایما پر ہیں۔ مانچسٹر گارڈین ایک نہایت ذمہ دار اور سنجیدہ اخبار ہے۔ بایں ہمہ یہ امر یقینی ہے کہ مذکورہ بالا رپورٹ میں انگریزی پروپیگنڈا کا عنصر بھی شامل ہے مگر پوری رپورٹ بے بنیاد نہیں قرار دی جا سکتی۔ مشرق بعید میں روس نے کوریا میں ایک ہنگامہ برپا کر رکھا ہے۔ مشرق قریب میں سب سے پہلے اس کی نظر ایران پر ہی پڑے گی اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ابتدا اس قسم کی سرگرمیوں سے ہو گی کہ کردوں نے بغاوت کر دی اور آذربائیجانیوں نے اپنے لئے خود مختار حکومت کا مطالبہ پیش کر دیا۔''[3]

سوویت یونین اور اشتراکیت کے بارے میں نوائے وقت کا یہ موقف اس کے اس مسئلہ پر اپریل، مئی اور جون 1950ء کے موقف سے بالکل مختلف تھا ان تین مہینوں میں نوائے وقت کے اداریوں کا ماحصل یہ تھا کہ اشتراکیت اور سوویت یونین عالم اسلام کے اصل دشمن نہیں ہیں بلکہ اصل دشمن امریکہ اور برطانیہ ہیں جنہوں نے عالم عرب کے قلب میں یہودی ریاست قائم کر دی ہے۔ روس کا ''ہوّا'' برطانوی و امریکی وزارت خارجہ کا پیدا کردہ ہے اور صدر ٹرومین کے چار نکاتی

پروگرام کا مقصد یہ ہے کہ ڈالروں کی بارش کر کے عرب ممالک کو اور زیادہ اقتصادی گرفت میں کس لیا جائے۔ عرب ممالک کو چاہیے کہ وہ سوویت یونین سے غیر جارحانہ سمجھوتہ کر لیں تاکہ تیسری جنگ کا خطرہ ٹل سکے۔ ورنہ وہ وقت دور نہیں جب شام کے وزیر اقتصادیات کا یہ اندیشہ پورا ہو کر رہے گا کہ امریکہ عرب ممالک کو یہودی ریاست کے تابع کر دے گا۔ لیکن اب نوائے وقت کو یکایک یہ خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ روس اور اس کا اشتراکی نظام پاکستان، ایران، تبت، مغربی بنگال، برما، آسام، اور کشمیر سمیت پورے ایشیا کو ہڑپ کر لے گا۔ اب اس کے نزدیک روس کا ''ہوّا'' برطانوی اور امریکی وزارت خارجہ کا پیدا کردہ نہیں تھا بلکہ یہ حقیقی تھا اور برطانیہ اور امریکہ سے ایشیا اور عالم اسلام کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ایران کے تیل اور دوسری معدنیات پر برطانیہ اور امریکہ کی کمپنیوں کا قبضہ تھا اور ایران کی اندرونی و بیرونی پالیسی امریکہ کے کنٹرول میں تھی مگر اس اخبار کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اسے خطرہ تو صرف یہ تھا کہ مشرق قریب میں سب سے پہلے روس کی نظر ایران پر پڑے گی۔ نوائے وقت کی اس قلابازی کی ایک تو وجہ یہ تھی کہ چین میں اشتراکی انقلاب کی کامیابی کے بعد پاکستان کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے ایک حلقہ میں اشتراکی لٹریچر روز بروز مقبول ہو رہا تھا۔ نوجوان ایشیا اور بالخصوص عالم اسلام کی پسماندگی، غربت اور بیماری سے بہت دکھی تھے۔ انہیں یقین تھا کہ اینگلو امریکی سامراج پاکستان سمیت سارے ایشیا کی ہمہ گیر پسماندگی کا باعث ہے۔ لہٰذا وہ ہر اس نظریاتی قوت کے حق میں تھے جو عالمی سامراج کے خاتمہ کا موجب بن سکتی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ کوریا کی جنگ شروع ہونے کے بعد عالمی سطح پر امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان کشمکش اتنی شدید ہو گئی تھی کہ نوائے وقت جیسا اخبار محض لیاقت علی خان کی مخالفت کی خاطر زیادہ دیر تک سوویت یونین کی دوستی کا علمبردار نہیں رہ سکتا تھا۔ اندرونی اور بیرونی سامراج نواز قوتیں ذرا سی تخویف و تحریص سے اس اخبار کی خارجہ پالیسی کا کانٹا بدل سکتی تھیں اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔ ان دنوں لاہور میں امریکی قونصلر اور برطانوی ڈپٹی ہائی کمشنر سرگرم تھے۔

امریکہ اور برطانیہ کے سفارت کاروں کی سرگرمیوں کا ایک اور نتیجہ 12 ستمبر 1950ء کو کراچی میں برآمد ہوا جبکہ پاکستان کی جماعت احمدیہ کے سربراہ مرزا بشیر الدین محمود احمد نے کراچی میں ایک تقریر کے دوران ایک پان اسلامک سٹیٹ کے قیام کی زوردار وکالت کی۔ اس نے کہا کہ کچھ لوگ یونائیٹڈ اسلامک سٹیٹ کی باتیں کرتے ہیں۔ ان کا یہ نظریہ مبہم ہے اور ان میں قربانی کا

مطلوبہ جذبہ نہیں ہے۔اس نے مزید کہا کہ ''یونائیٹڈ اسلامک سٹیٹ کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ مختلف مسلم ممالک کی سیاسی، معاشرتی، معاشی اور قومی امنگوں کا خاتمہ کیا جائے۔ ہمیں اس منزل کی جانب بہت آہستہ سے اور احتیاط سے لیکن پورے عزم کے ساتھ بڑھنا چاہیے۔لوگوں کو پان اسلامی یا کٹڑ مسلمان کہلوانے سے نہیں ڈرنا چاہیے کیونکہ اگر کوئی سیاسی دنیا میں اپنا جائز مقام حاصل کرنے کی کوشش کرے تو اسے عصبیت نہیں کہا جا سکتا۔ پان اسلام ازم کا پروپیگنڈا مسلمان ممالک کے علاوہ غیر مسلم ممالک میں بھی کرنا چاہیے تاکہ مسلمانوں کو عصر حاضر کے تقاضوں کا احساس ہو اور غیر مسلموں کو پتہ چلے کہ مسلمانوں کی امنگیں جائز ہیں۔''[4] مرزا بشیر الدین محمود پاکستان کے ایک ایسے مذہبی فرقے کا سربراہ تھا جس کے خلاف 1949ء سے احراری ملاؤں نے تکفیر کی مہم شروع کر رکھی تھی۔ مسلمانوں کے ہر فرقہ کے علما احمدیہ فرقہ کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دیتے تھے اور احراری ملا بالخصوص یہ مطالبہ کرتے تھے کہ پاکستان کی اسلامی مملکت میں اس فرقہ کو ایک غیر مسلم اقلیتی فرقہ قرار دیا جائے اور اس اقلیتی فرقہ کے ممتاز رکن چودھری ظفر اللہ خان کو وزارت خارجہ سے اور بعض دوسرے احمدیوں کو حکومت کی کلیدی اسامیوں سے الگ کیا جائے۔ اس صورتحال میں مرزا بشیر الدین محمود، چودھری ظفر اللہ خان اور ان کے فرقہ کی سیاسی مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ قومی اور بین الاقوامی سطح پر سیکولرازم کا پرچار کرتے۔ مرزا بشیر الدین محمود نے 1947ء میں ایسا ہی کیا تھا لیکن بعد میں ان کا کانٹا بدل گیا۔اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وزیراعظم لیاقت علی خان کی جاگیردارانہ سیاست کی کامیابی کے لئے اندرون ملک اور بیرون ملک اسلام اور پان اسلام ازم کا ڈھول بجانا ضروری تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ برطانوی سامراج پان اسلام ازم کو فروغ دے کر مشرق وسطیٰ میں اپنے زیر سایہ مسلم ممالک کا بلاک بنانے کا متمنی تھا۔ چونکہ اس فرقہ کو انیسویں صدی کے اواخر ہی سے انگریزوں کی سرپرستی حاصل رہی تھی اس لئے اس کے ارکان انگریزوں کی وفاداری و خدمت گزاری کو ''مذہبی فریضہ'' تصور کرتے تھے۔ اگر مرزا بشیر الدین محمود میں سیاسی بصیرت ہوتی تو وہ مارچ 1949ء میں چودھری ظفر اللہ خان کو قرارداد مقاصد کی حمایت کرنے کی کبھی اجازت نہ دیتا اور اس کے بعد پان اسلام ازم کا پرچم بلند نہ کرتا۔ اس نے ستمبر 1950ء میں پان اسلام ازم کی تبلیغ زوردار الفاظ میں محض اس لئے شروع کی تھی کہ برطانوی محکمہ خارجہ کے بعض ماہرین کی رائے میں کوریا کی جنگ کے دوران مسلم ممالک میں اینگلو۔امریکی سامراج کے مفادات کا فروغ اور

اشتراکیت کا سدباب اسی نعرے کے زور سے ہوسکتا تھا۔ 1949ء میں ان ہی برطانوی ماہرین کی ہدایت کے مطابق وزیرخزانہ غلام محمد نے انٹرنیشنل اکنامک کانفرنس کا اور پاکستان مسلم لیگ کے صدر چودھری خلیق الزماں نے اسلامستان کا ڈھنڈورا پیٹا تھا۔ اگرچہ ان دونوں کی کوشش کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا۔ تاہم ستمبر 1950ء میں مرزا بشیر الدین محمود نے بھی یہ کام اپنے ذمے لے لیا۔

اس سے قبل جولائی۔ اگست 1950ء میں پاکستان کے ایک مبلغ مولانا شاہ محمد عبدالعلیم صدیقی نے چودھری خلیق الزماں کے نمائندہ کی حیثیت سے اسی مقصد کے تحت مشرق وسطیٰ کے بعض عرب ممالک کا دورہ کیا تھا اور پھر آخر میں وہ چودھری خلیق الزماں کی طرح لندن نہیں گیا تھا بلکہ واشنگٹن گیا تھا۔ اس نے امریکہ میں قیام کے دوران اسلامی اصولوں کی تبلیغ کے لئے وہاں کے کئی شہروں کا دورہ کیا تھا اور اپنے اس دورہ کے اختتام پر اس نے نیویارک میں امریکہ کی مسلم جماعتوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ اسلام کے اصولوں کی تبلیغ کریں اور ایک نمائندہ تنظیم قائم کریں۔''[5] وہ 12ر ستمبر 1950ء کو واپس کراچی پہنچا تھا اور مرزا بشیر الدین محمود نے اسی دن یونائیٹڈ اسلامک سٹیٹ کے عزم کا اعلان کیا تھا۔ انگریزوں کو مرزا بشیر کا یہ عزم اتنا پسند آیا کہ لندن کے ڈیلی ٹیلیگراف کے نامہ نگار متعین پاکستان ایرک ڈاؤنٹن (Eric Downton) نے اپنے ایک مراسلے بعنوان ''پاکستان میں پان اسلام ازم'' میں اشتراکیت کے خلاف بین الاقوامی اتحاد اسلامی کے امکان پر روشنی ڈالی۔ ڈاؤنٹن نے لکھا کہ ''اس وقت پاکستان کی حکومت' وہاں کے اخبارات اور تمام سیاستدان اشتراکیوں اور ان کے حامیوں کے خلاف پان اسلام ازم کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ دوسرے مسلم ممالک سے ثقافتی، تجارتی اور سفارتی تعلقات استوار کرنے پر زور دیا جا رہا ہے۔ اس کوشش کی دو وجوہ پیش کی گئی ہیں۔ اول ماسکو کی زیر ہدایت اشتراکی جارحانہ کاروائیوں کا بڑھتا ہوا خطرہ اور دوئم مسلم ریاستوں کا مؤثر اتحاد قائم کرنے میں نمایاں حصہ لینے کی تمنا۔'' ڈاؤنٹن مزید لکھا کہ ''پاکستان کی حکومت جب بین الاقوامی منظر پر نظر ڈالتی ہے تو اس کو تنہائی کا احساس ہوتا ہے اور اس احساس کے تحت مسلمانوں کو متحد کرنے کا یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ ملک اپنے انوکھے جغرافیائی مسائل کے ساتھ جب اشتراکی لہروں کو اپنی سرحدوں سے ٹکراتے دیکھتا ہے اور بھارت کو (جہاں بے شمار پاکستان مخالف عناصر موجود ہیں) اشتراکی چین سے رابطے استوار کرتا ہوا پاتا ہے تو تنہائی کا یہ احساس اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ کوریا کی جنگ کے ردعمل نے اس خواہش کو

تیز تر کر دیا ہے۔ اگرچہ کوریا کے واقعات نے اپنی حفاظت کے متعلق پاکستانیوں کی تشویش بڑھا دی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ایک اور ردعمل پیدا ہوا ہے۔ کوریا کے متعلق زیادہ شدید ردعمل آبادی کے ایک محدود حلقہ ہی تک ہے لیکن عام طور پر اس کا اعتراف کیا جاتا ہے کہ اگر روس نے ترکی یا ایران کے خلاف کوئی کاروائی کی تو اس وقت عوام جوش وخروش کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوں گے۔'' پان اسلام ازم کی کامیابی یا ناکامی کے متعلق ڈاؤننگ نے چودھری ظفر اللہ خان کا یہ بیان نقل کیا کہ ''اسے اس کی توقع نہیں ہے کہ مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک ایک متحد اسلامی بلاک قائم ہو سکے گا۔ اس کے خیال میں ایسی صورتحال کی پیدائش خصوصاً عرب ممالک کے اندرونی مناقشات کی وجہ سے قرین قیاس نہیں ہے لیکن وزیر خارجہ کو اس کی امید ہے کہ مسلم ریاستوں کے درمیان اقتصادی تعاون پیدا ہو جائے گا۔'' ڈاؤننگ نے اس بیان پر اپنا مراسلہ ختم کیا کہ ''اکثر پاکستانیوں کا واقعی یہ خیال ہے کہ اگر اسلامی اخلاقی اصولوں کو زندہ کیا جائے اور مغرب کی مسیحی دنیا اقتصادی امداد کرے تو ایشیا میں روس کے مقابلہ کا مؤثر نظام ممکن ہے۔''[6] ڈیلی ٹیلیگراف برطانیہ کے حکمران طبقہ کے قدامت پسند عناصر کا ترجمان تھا اور کھلم کھلا سامراجی نقطہ نگاہ کا مبلغ تھا۔ اگر اس اخبار کو نوائے وقت کی اسلام پسندی اور مرزا بشیر الدین محمود کے پان اسلام ازم پر کوئی اعتراض نہیں تھا تو یہ امر کسی تعبیر وتشریح کا محتاج نہیں تھا۔ برطانوی محکمہ خارجہ کے ماہرین پاکستان کی حکومت، یہاں کے اخبارات اور سارے سیاستدانوں کی اسلام کے نام پر اشتراکیت کی مخالفت سے مطمئن تھے۔

اسلامک اکنامک کانفرنس کا دوسرا اجلاس منعقدہ تہران......لندن کے اخبار ٹائمز کی جانب سے غلام محمد کی مداح سرائی

اکتوبر 1950ء کے اوائل میں پاکستان کے وزیر خزانہ غلام محمد کی انٹرنیشنل اسلامک اکنامک کانفرنس کا دوسرا اجلاس تہران میں منعقد ہوا۔ اس کانفرنس کا پہلا اجلاس نومبر 1949ء میں کراچی میں منعقد ہوا تھا تو اس میں غلام محمد نے جو تقریر کی تھی اس میں اس نے مسلم ممالک کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اجتماعی سوداکاری اور اجتماعی تحفظ کا سسٹم قائم کریں مگر تہران میں اس نے اپنے صدارتی خطبہ میں اجتماعی تحفظ کے نظام کا کوئی ذکر نہ کیا۔ اس کی اس تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ ''آج دنیائے اسلام کے سامنے اہم مسئلہ یہ ہے کہ وہ علم کی جدید بنیادوں پر اپنی تعمیر نو کریں۔ علاقائی

بنیادوں پر مشترکہ صنعتی منصوبوں کی سکیم بنائی جائے کیونکہ اس طرح اس علاقے کو صنعتی ترقی کے لئے ایک ٹھوس پروگرام مل جائے گا۔ مسلم ممالک کو اپنی زراعت میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے جدید کھادوں، بہتر بیج، عمدہ آبپاشی اور مشینی کاشتکاری کا انتظام کرنا چاہیے۔ جب تک ہماری زراعت جدید پیمانے پر ترقی نہیں کرے گی مسلم ملکوں میں غربت جاری رہے گی۔ مشرق وسطیٰ کے ملکوں نے اقوام متحدہ کے غیر سیاسی اور معاشی کاموں میں بہت دلچسپی لی ہے۔ اگر مشرق وسطیٰ کے ممالک کی حکومتیں بین الاقوامی امداد سے فائدہ نہیں اٹھائیں گی تو وہ اپنے عوام کے ساتھ بے انصافی کریں گی۔ اس وقت کوئی بھی مسلمان ملک اپنے ذرائع اور علاقے کے لحاظ سے اس قابل نہیں کہ وہ صنعتی اور اقتصادی طور پر اتنا طاقتور ہو جائے کہ دنیا کی صنعتوں کا مقابلہ کر سکے۔ اس لئے باہمی مفاد کی بنیادوں پر اقتصادی یکجہتی نہایت ضروری ہے۔ بعض مسلمان ملک اقوام متحدہ سے مالی یا فنی امداد قبول نہیں کر رہے ہیں۔ ان کا رویہ درست نہیں ہے۔ تمام مسلم ممالک میں اقتصادیات کی تعلیم کے لئے کالج کھولنے چاہئیں۔ اب ہمیں زندگی کے طریقوں میں تبدیلی کرنی چاہیے۔ یہ تبدیلی ناگزیر ہے ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔"[7] غلام محمد پاکستان کے قیام سے قبل جمشید ٹاٹا کے ہاں ملازمت کر چکا تھا اور وہاں سے اس نے یہ سبق سیکھا تھا کہ ایشیائی ممالک کی ترقی کا راز بے قید سرمایہ دار معیشت میں ہے۔ چنانچہ قیام پاکستان کے بعد وہ اس سبق پر عمل پیرا ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ برطانیہ اور امریکہ کی مالی و فنی امداد سے پاکستان اور دوسرے مسلم ممالک میں صنعتی ترقی کی راہیں کھل سکتی ہیں اور وہ راہیں کھولنے کے لئے اینگلو۔ امریکی بلاک کی رہنمائی میں براستہ معاشی یکجہتی مسلم ممالک کے سوویت یونین مخالف فوجی گٹھ جوڑ کی منزل پر پہنچنا چاہتا تھا۔ وہ سیاسی لحاظ سے انتہائی احمق تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اینگلو۔ امریکی سامراجیوں نے دوسری جنگ عظیم کے بعد ایشیا میں جدید نوآبادیاتی نظام کے ذرائع یعنی اپنے مقامی پٹھوؤں کے ذریعے اپنا دیرینہ استحصالی نظام جاری رکھنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔ وہ کسی بھی ایشیائی یا مسلم ملک میں پرامن بورژوا صنعتی انقلاب کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔

بظاہر یہی وجہ تھی کہ لندن کا اخبار ٹائمز غلام محمد کا مداح تھا۔ تہران کانفرنس پر اس اخبار کا ادارتی تبصرہ یہ تھا کہ "گیارہ ماہ قبل کراچی میں سات مسلم ممالک کے مندوبین نے پوری مسلم دنیا میں قریبی اقتصادی تعاون کی جس تجویز پر غور کیا تھا اب اس کے اثرات کئی اسلامک ممالک میں

مرتب ہونے لگے ہیں۔ اگرچہ اس سال ایران میزبان ہے لیکن اس اجلاس نے پاکستان کے وزیرخزانہ غلام محمد کو ہی اپنا صدر منتخب کیا ہے۔ یہ غلام محمد کا جوش وجذبہ ہی تھا جس کی وجہ سے گزشتہ سال کراچی کا اجتماع کامیاب ہوا تھا۔ غلام محمد یہ باور کرتا ہے کہ اگر مشرق وسطیٰ کے اسلامی ممالک کے معاشی مفادات مشترک ہو جائیں تو اس امر کا امکان ہے کہ ان کی سیاسی رقابتیں ختم ہو جائیں گی جن کی وجہ سے وہ ابھی تک کوئی متحدہ اقدام نہیں کر سکے۔ تجربہ سے یہ ظاہر ہوا ہے کہ محض مغربی ممالک کے نظریات ٹھونسنے سے مشرق کے عوام ٹھوس معاشی ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکتے۔ بہت سے راسخ العقیدہ مسلمانوں کا خیال ہے کہ اس مقصد کے لئے اسلام کی تعلیمات سے مطلوبہ جذبہ پیدا ہو سکتا ہے اور اس جذبہ کے تحت ایسی بہبودی ریاست کی تعمیر ہو سکتی ہے جس میں پیغمبر اسلام کے ارشادات کے مطابق اگر کوئی شخص خیرات دینے کے لئے بازار میں جائے تو اسے خیرات لینے والا کوئی نہ ملے۔"[8] اس کانفرنس کے آخری اجلاس میں غلام محمد کو مزید تین سال کے لئے اس کا صدر منتخب کیا گیا۔ اس کی اختتامی تقریر یہ تھی کہ آج مسلم دنیا ایک دوراہے پر کھڑی ہے۔ اگر اس نے پیش قدمی کی تو یہ اس درماندہ عالم کے لئے سہارا بنے گی جو مشکلات سے دوچار ہے اور اگر اس نے آگے کی جانب قدم نہ اٹھایا تو یہ اپنی نااہلی کے بوجھ تلے دفن ہو جائے گی۔ اس نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ مسلم اقوام کی بے عملی اور مایوسی نے ان کے اعتماد وایمان کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ تہران سے غلام محمد بغداد گیا جہاں اس نے اسلامی ممالک کے لئے غیر ملکی امداد کا خیر مقدم کیا بشرطیکہ یہ امداد قرضے کی صورت میں ہو خیرات کی صورت میں نہ ہو۔ بغداد سے وہ لندن پہنچا جہاں اس نے دولت مشترکہ کے وزرائے خزانہ کی کانفرنس میں شرکت کی۔

شمالی کوریا پر امریکی فوج کی چڑھائی اور جواب میں چین کی افواج کی مداخلت...... پاکستان نے امریکہ کا ساتھ دیا...... بھارت غیر جانب دار رہا

غلام محمد جب اپنی اسلامی اقتصادی کانفرنس کے لئے تہران پہنچا تو اس وقت ایک ایسا واقعہ رونما ہو گیا تھا جس سے تیسری عالمی جنگ کا خطرہ بہت بڑھ گیا تھا۔ وہ واقعہ یہ تھا کہ یکم اکتوبر 1950ء کو کوریا میں جنرل میکارتھر کی فوجوں نے 38ویں خط متوازی یعنی جنوبی کوریا اور شمالی کوریا کی درمیانی سرحد کو عبور کر کے شمالی کوریا پر حملہ کر دیا تھا۔ اس واقعہ سے مغربی ممالک اور مغرب نواز

ایشیائی ممالک کے حکمران طبقوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ کیونکہ ان میں یہ امید پیدا ہوگئی تھی کہ جنرل میکارتھر کا یہ حملہ چین اور دوسرے ایشیائی ممالک میں اشتراکیت کے خاتمہ کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ پاکستان کے وزیر خارجہ محمد ظفر اللہ خان کو بھی بہت خوشی ہوئی تھی۔ چنانچہ اس کا 6/اکتوبر کو امریکہ میں بیان یہ تھا کہ ''اقوام متحدہ کی نظروں میں اب کوریا میں 38 ویں خط متوازی کا کوئی وجود باقی نہیں رہا۔ اقوام متحدہ کی اب پالیسی یہ ہے کہ پورے کوریا میں آزادانہ انتخابات کروائے جائیں گے تاکہ وہاں کے عوام اپنے مستقبل کے بارے میں خود ہی کوئی فیصلہ کرسکیں۔''[9] یہ ایک سامراجی پٹھو کا بیان تھا جسے یہ نہیں معلوم تھا کہ شمالی کوریا میں امریکیوں کی پیش قدمی سے کوریا میں عوامی جمہوریہ چین کی فوجی مداخلت ناگزیر ہوجائے گی اور یہ کہ جب چینیوں نے کوریا میں فوجی مداخلت کی تو امریکیوں کے چھکے چھوٹ جائیں گے۔ اس کی اس بے خبری یا جہالت کا ہی نتیجہ تھا کہ جب 7/اکتوبر کو اقوام متحدہ نے ایک قرارداد میں جنرل میکارتھر کو باقاعدہ یہ اختیار دے دیا کہ وہ شمالی کوریا پر حملہ کرسکتا ہے تو پاکستان ان 47 ملکوں میں سے تھا جنہوں نے اس قرارداد کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ سوویت یونین اور اس کے بلاک کے چار ممالک نے اس قرارداد کے خلاف ووٹ دیئے اور سات ممالک نے رائے شماری میں حصہ نہ لیا۔ ان سات ممالک میں ہندوستان بھی شامل تھا کیونکہ پیکنگ میں مقیم ہندوستانی سفیر کے ایم۔ پانیکر نے 2/اکتوبر کو نصف شب کو چین کے وزیر اعظم چو این لائی سے ملاقات کے بعد اپنی حکومت کو مطلع کردیا تھا کہ چین کوریا میں فوجی مداخلت کرے گا۔ اقوام متحدہ کی اس قرارداد کے تحت کوریا کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لئے ایک نیا سات رکنی کمیشن مقرر کیا گیا تھا اور اس کمیشن کے رکن ممالک میں فلپائن، تھائی لینڈ اور ترکی کے علاوہ پاکستان بھی شامل تھا۔ جب یہ قرارداد منظور ہوئی اس وقت چینی فوج کوریا میں داخل ہوچکی تھی اور اس کے ساتھ یہ رپورٹیں بھی موصول ہوچکی تھیں کہ چینی فوج نے تبت کو زیر تسلط کرنے کا عمل شروع کردیا ہے۔

10/اکتوبر کو پاکستان کی پارلیمنٹ نے حکومت پاکستان کے اس فیصلے کی توثیق کردی جس کے تحت کوریا کے مسئلہ پر سلامتی کونسل کی قرارداد کی حمایت کی گئی تھی۔ پارلیمنٹ میں اس مسئلہ پر بحث کے دوران مشرقی پاکستان کے ممبر نور احمد کی تقریر یہ تھی کہ ''چونکہ اسلام کمیونزم کے خلاف ہے اور چونکہ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہے اس لئے پاکستان پر لازم ہے کہ وہ کوریا کے مسئلہ پر اقوام متحدہ کی حمایت کرے۔'' میاں افتخار الدین نے اپنی تقریر میں وزیر اعظم لیاقت علی

خان کو اینگلو۔امریکی بلاک کا پٹھو قرار دیا اور کہا کہ ’’پاکستان نے فلسطین اور جنوبی افریقہ میں تو اپنی فوجیں نہیں بھیجی تھیں لیکن وہ کوریا میں اپنی فوجیں بھیجنے پر بھی تیار ہے۔‘‘ لیاقت علی خان نے اپنی جوابی تقریر میں افتخار الدین کے اس الزام کی تردید کی اور بتایا کہ ’’چونکہ پاکستان کی فوج کا اولین فرض یہ ہے کہ اپنے ملک کی سالمیت اور آزادی کو لاحق شدہ خطرے کا سدباب کرے اور چونکہ یہ خطرہ محض خیال نہیں ہے اس لئے ہم نے جنوبی کوریا کو کوئی فوجی امداد نہیں دی۔ بلکہ پانچ ہزار ٹن گندم کا تحفہ دیا ہے۔ اس نے مزید کہا کہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے کوریا میں 38 ویں خط متوازی کو کبھی بھی مستقل سرحد تسلیم نہیں کیا ہے۔ شمالی کوریا نے جنوبی کوریا پر حملہ کر کے اقوام متحدہ اور اس کے کمیشن کی ساری قراردادوں کی خلاف ورزی کی ہے۔ اس لئے اقوام متحدہ کے پاس اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا کہ وہ پورے کوریا کو اپنے کنٹرول میں لائے اور جب جنگ ختم ہو جائے تو اس کے فوراً بعد پورے ملک میں ایک متحدہ آزاد اور جمہوری حکومت کے قیام کے لئے آزادانہ انتخابات کرائے۔‘‘[10] لیاقت علی خان نے پارلیمنٹ میں یہ تقریر واضح طور پر اس یقین کے ساتھ کی تھی کہ کوریا میں امریکیوں کی فتح ہوگی اور اس کے ساتھ ہی ایشیا میں اشتراکیت کے خاتمہ کا عمل شروع ہو جائے گا۔ اسے یہ یقین اس حقیقت کے باوجود تھا کہ اس دن پیکنگ کی وزارت خارجہ کا اعلان یہ تھا کہ کوریا میں امریکہ اور اس کے ساتھی ملکوں کے حملے سے جو سنگین صورتحال پیدا ہوگئی ہے عوامی جمہوریہ چین اس کا خاموشی سے تماشا نہیں دیکھ سکتا۔

پاکستان کو مغرب کی حد درجہ چاپلوسی کے باوجود وہ اہمیت نہ ملی جو مغربی سامراج ہندوستان کو دیتا تھا

وزیراعظم پاکستان کے مذکورہ بیان کی بنیاد اس امید پر تھی کہ چونکہ دوسری جنگ عظیم کے بعد سوویت بلاک اور اینگلو۔امریکی بلاک کے درمیان پہلے خونریز تصادم کے موقع پر ہندوستان نے غیر جانبدارانہ پالیسی اپنالی ہے اور پاکستان نے اس بلاک کے ساتھ اپنی غیر مشروط وابستگی کا واضح ثبوت مہیا کر دیا ہے اس لئے آئندہ امریکہ اور برطانیہ ہندوستان کو پاکستان پر ترجیح نہیں دیں گے اور پاکستان کو اقتصادی و فوجی لحاظ سے اتنا مضبوط بنائیں گے کہ وہ نہ صرف مشرق وسطیٰ میں سوویت یونین مخالف بلاک بنانے میں مددگار رہوگا بلکہ وہ اپنے تاریخی حریف ہندوستان

سے بھی اس کی ماضی کی زیادتیوں کا حساب چکا سکے گا۔ ان دنوں پاکستان کی بری فوج کا پہلا پاکستانی نامزد کمانڈر انچیف لیفٹیننٹ جنرل محمد ایوب خان برطانیہ کے چھ ہفتے کے دورے پر تھا جہاں نہ صرف اس کی برطانیہ کے فوجی مراکز میں خاصی پذیرائی ہوئی تھی بلکہ ملک معظم جارج ششم نے بھی اسے شرف باریابی بخشا تھا، برطانیہ کا چیف آف سٹاف سر ولیم سلم ان دنوں پاکستان میں تھا اور اس کی کاکول اکیڈمی میں ایک فوجی پریڈ کے موقع پر تقریر یہ تھی کہ ''تم ایسی نسلوں سے تعلق رکھتے ہو جو اپنی شجاعت کے لئے مشہور ہیں۔ میں نے ہر قسم کے ممالک میں لڑائیاں لڑی ہیں جن میں مجھے فتح ہوئی اور شکست بھی۔ لیکن میں نے تمہارے سپاہیوں سے بہتر سپاہیوں کے ساتھ کبھی فوجی خدمات سرانجام نہیں دیں۔''[11]

لیکن ان ساری باتوں کے باوجود اینگلو۔ امریکی بلاک کے ہندوستان کے بارے میں ترجیحی رویے میں کوئی فرق نہ آیا بلکہ اس سارے عرصہ میں برطانیہ کا وزیر خارجہ ارنسٹ بیون ہندوستان کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو سے خط و کتابت کرتا رہا کیونکہ برطانیہ کی خواہش و کوشش یہ تھی کہ کوریا کی جنگ کا دائرہ وسیع نہ ہونے پائے۔ جب 25/اکتوبر 1950ء کو ماسکو ریڈیو سے یہ اعلان ہوا کہ ''چین کے پاس اتنی فوج ہے کہ وہ تبت کو آزاد کرا سکتی ہے۔ تاہم چین کی حکومت یہ مقصد پرامن گفت و شنید کے ذریعے حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ تبت عوامی جمہوریہ چین کا ایک حصہ ہے لیکن برطانیہ اور امریکہ کی پالیسی یہ ہے کہ تبت کو چین سے الگ کر کے اسے ایک نو آبادی بنا کر یہاں سوویت یونین اور چین کے خلاف فوجی اڈہ قائم کیا جائے۔'' اور 26/اکتوبر کو حکومت چین نے یہ تسلیم کر لیا کہ اس کی کچھ فوجیں تبت میں گئی ہیں تو اینگلو۔ امریکی بلاک کی نظر میں ہندوستان کی قدر و قیمت اس امید کے تحت اور بھی بڑھ گئی کہ اب ہندوستان اور چین کے درمیان لازماً تصادم ہوگا۔ 27/اکتوبر کو ہندوستان کی حکومت نے حکومت چین کے نام ایک مراسلے میں تبت پر چینی فوجوں کے مبینہ حملے کے خلاف احتجاج کیا۔ یہ مراسلہ تبت کے مسئلے پر ہندوستان کی پارلیمنٹ کے ہنگامی اجلاس کے بعد بھیجا گیا تھا۔ جب ہندوستان کے اس مراسلے کا چین سے یہ جواب ملا کہ تبت کا معاملہ چین کا داخلی معاملہ ہے ہندوستان کو اس میں دخل اندازی کا کوئی حق حاصل نہیں تو یکم نومبر کو حکومت ہندوستان نے پیکنگ کو دوسرا احتجاجی مراسلہ بھیجا۔ اس کے بعد پیکنگ اور نئی دہلی کے درمیان کئی مراسلوں کا تبادلہ ہوا۔ اس دوران امریکہ کے وزیر خارجہ ڈین ایچی سن اور

برطانیہ کے نائب وزیر خارجہ ارنسٹ بیون نے ہندوستان کے موقف کی حمایت میں بیانات دیئے مگر بات احتجاجی خط وکتابت سے آگے نہ بڑھی۔ کوریا کے بارے میں ہندوستان کی پالیسی غیر جانبدارانہ ہی رہی اور اینگلو۔امریکی بلاک نے بھی ہندوستان کے بارے میں معاندانہ رویہ اختیار نہ کیا۔ اس کی ایک وجہ حکومت برطانیہ کی اس خواہش میں مضمر تھی کہ جواہر لال نہرو کا چو۔این۔لائی کے ساتھ رابطہ قائم رہے تاکہ کوریا کی جنگ کوریا تک ہی محدود رہے اور اس جنگ کے گفت وشنید کے ذریعے خاتمہ کا امکان باقی رہے۔ برطانیہ تبت میں چینی فوج کی مداخلت کو اپنے مفادات کے لئے خطرہ تصور نہیں کرتا تھا۔ ماضی میں برطانیہ تبت پر چین کے اقتدار اعلیٰ کو تحریری طور پر تسلیم کر چکا تھا اور ہندوستان میں متعین امریکی سفیر رائے پینڈرلن (Pendralan) کے بقول امریکہ کی تاریخی پالیسی یہ رہی تھی کہ تبت پر چین کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہے۔

نہر سویز اور سوڈان سے برطانوی فوجوں کے انخلا کے مطالبہ پر مصر اور برطانیہ کے مابین تنازعہ میں شدت اور پاکستان کی جانب سے برطانیہ کی بالواسطہ حمایت

پاکستان کے ارباب اقتدار کو ہندوستان کے بارے میں امریکہ و برطانیہ کی اس پالیسی پر سخت مایوسی ہوئی مگر انہوں نے اپنی مغرب نواز پالیسی میں ذرا سی بھی تبدیلی نہ کی۔ ان کی برطانیہ سے وفاداری کا یہ عالم تھا کہ ان ہی دنوں جب مصر اور برطانیہ کے درمیان برطانوی فوجوں کے انخلا کے مسئلہ پر اختلاف کی شدت نے بہت خطرناک صورت اختیار کر لی تو بھی حکومت پاکستان کے کسی چھوٹے یا بڑے اہلکار نے مصر کی حمایت میں کوئی آواز بلند نہ کی۔ اس جھگڑے میں شدت دراصل ستمبر 1950ء میں پیدا ہو گئی تھی جبکہ مصری پارلیمنٹ کے رکن ابوالفتح الشالا خانی کے بیان کے مطابق مصریوں نے 1936ء کے برطانوی مصری معاہدۂ دوستی وتعاون کو بہرصورت، اور بہر طور ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ستمبر کے اواخر میں بعض اخبارات میں یہ خبر چھپی کہ برطانیہ، امریکہ اور آسٹریلیا، نہر سویز سے اپنی فوجیں ہٹا لینے پر رضامند ہو گئے ہیں مگر قاہرہ میں برطانوی سفارت خانے نے فوراً ہی اس کی تردید کر دی۔ اس تردید سے قدرتی طور پر مصری عوام میں برہمی پیدا ہوئی تو مصر کی

حکومت کو بھی اس مسئلہ پر سخت موقف اختیار کرنا پڑا۔ چنانچہ 13 رنومبر 1950ء کو ایسوسی ایٹیڈ پریس آف امریکہ کی اطلاع کے مطابق مصر کے وزیراعظم نحاس پاشا نے اعلان کیا کہ مصر وادی نیل سے برطانوی فوجوں کے انخلا کے سلسلے میں کسی سودابازی پر راضی نہیں ہوگا۔ قاہرہ میں وفدیٔ کلب کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے کہا کہ ''مصر غیر مشروط طور پر برطانوی فوجوں کا انخلا چاہتا ہے اور وہ کسی ایسی شرط کو قبول نہیں کرے گا جس سے وادیٔ نیل کا اتحاد متاثر ہو۔ ہم اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے کسی سودابازی کو قبول نہیں کر سکتے۔''[12] 16 رنومبر کو مصر کے شاہ فاروق نے مصری پارلیمنٹ کی افتتاحی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا ''میری حکومت یہ سمجھتی ہے کہ اب برطانیہ و مصر 1936ء کا معاہدہ دونوں ممالک کے درمیان تعلقات کی موزوں بنیاد مہیا نہیں کرتا۔ اس نے پارلیمنٹ کے ارکان کی پرزور تالیوں کے درمیان کہا کہ ''برطانیہ کو نہر سویز کے علاقے سے اور سوڈان سے فوراً نکل جانا چاہیے۔ حکومت مصر چاہتی ہے کہ اینگلو۔مصری معاہدے کو منسوخ کیا جائے اور مصری تاج کے ماتحت وادیٔ نیل کو متحد کیا جائے۔''[13]

شاہ فاروق کے اس اعلان پر نوائے وقت کا تبصرہ یہ تھا کہ ''مصر کا عظیم جذبہ قومیت ان دو مطالبات کی پشت پناہی کر رہا ہے۔ قومیت کا وہ جوالامکھی عرصہ دراز سے اندر ہی اندر پک رہا تھا جس کے مراکز جامعہ ازہر اور دوسرے جامعات تھے، جس کی رہنمائی سعد زاغلول پاشا مرحوم اور ان کے جانشین مصطفی نحاس پاشا نے کی، وہ پھوٹ رہا ہے۔ مصر کے نوجوانوں میں وہ ذوق یقین پیدا ہو چکا ہے جو غلامی کی زنجیروں کو کاٹ دیتا ہے۔ مصر کے نوجوان طلبا اپنے بالغ نظر رہنماؤں کی زیر قیادت اپنے ملک کو آزاد کرانے کا عزم کر چکے ہیں۔ انہیں اس کا احساس ہے کہ برطانیہ کس بری طرح ان کا استحصال کرتا رہا ہے اور اب شاہ مصر نے اپنے اس اعلان کے ذریعے نقارے پر چوٹ لگا دی ہے۔''[14] نوائے وقت کا یہ اداریہ ترقی پسندانہ تھا کیونکہ اس میں جغرافیائی حدود سے بالاتر مسلم قومیت کا ڈھول نہیں بجایا گیا تھا اور نہ ہی سیکولر مصری قومیت کے اس جوالامکھی کا سہرا اخوان المسلمین کے سر باندھا گیا تھا۔ نوائے وقت کی طرح روزنامہ امروز نے بھی اینگلو۔مصری تنازعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے حکومت برطانیہ کو ہدف تنقید بنایا اور لکھا کہ ''خود پاکستان کے معاملے میں برطانیہ کا پچھلے تین برس کا ریکارڈ انتہائی تاریک ہے۔ جس حکومت نے قیام پاکستان کی ابتدا ہی ریڈ کلف ایوارڈ کے فیصلہ سے کی ہو، جواب تک نہایت بے حسی سے کشمیر کے المیہ کا تماشا دیکھ رہی ہو

اور جس نے ایک منظم پلان کے ماتحت پاکستان کو مشینری اور بھاری کلوں سے محروم رکھا ہو، کیا اس سے اب تک کوئی توقع رکھنا جائز قرار دیا جا سکتا ہے؟ کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ حکومت پاکستان کے نمائندے کس بنا پر دولت مشترکہ کی افادیت کے معتقد ہیں اور انہیں اس نظام میں کونسی بات نظر آتی ہے جو پاکستان کے حق میں مفید ثابت ہو سکتی ہے۔"؟[15] مگر حکومت پاکستان کے مقتدر رہنماؤں نے اس سوال کا کوئی جواب نہ دیا اور وہ بدستور برطانوی سامراج کی کاسہ لیسی کرتے رہے۔

20 نومبر 1950ء کو برطانیہ کے وزیر خارجہ ارنسٹ بیون نے دارالعوام میں تقریر کرتے ہوئے مصر کے ان دونوں مطالبات کو مسترد کر دیا۔ اس نے کہا کہ "نہر سویز کے علاقہ میں 83 سال سے برطانوی فوجیں متعین ہیں۔ فوجی اہمیت کے اس علاقے سے برطانوی فوج نکالنے کا سوال صرف مصر اور برطانیہ سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ یہ سوال مشرق وسطیٰ کے کئی دوسرے علاقوں سے بھی تعلق رکھتا ہے کیونکہ نہر سویز میں برطانوی فوج کا تعین مشرق وسطیٰ کے کئی ملکوں کی آزادی کے تحفظ کے لئے ضروری ہے۔ برطانیہ کسی صورت میں بھی کوئی ایسا قدم نہیں اٹھا سکتا جس کی وجہ سے مشرق وسطیٰ کے کئی ملکوں کی آزادی خطرے میں پڑ جائے۔ متحدہ دفاع کا اصول مشرق وسطیٰ کے کئی ملکوں کی طرف سے تسلیم کیا جا چکا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ اصول ان کی آزادی کے تحفظ کے لئے بے حد ضروری ہے۔" بیون نے سوڈان سے متعلق مصر کے مطالبہ کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ "سوڈان کے عوام مصر میں شامل ہونے کے لئے تیار نہیں۔ برطانیہ تھوڑے عرصے تک سوڈان کے مستقبل کا فیصلہ کرنے والا ہے۔ برطانیہ کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہتا جس سے سوڈان کے عوام متفق نہ ہوں۔ جہاں تک 1936ء کے برطانوی مصری معاہدے کا تعلق ہے برطانیہ کا خیال ہے کہ مصر یا برطانیہ اسے یک طرفہ طور پر منسوخ کرنے کے مجاز نہیں۔ اس معاہدے کی تنسیخ کے لئے دونوں ملکوں کا رضامند ہونا ضروری ہے۔"[16] بیون کی یہ رعونت آمیز تقریر مصری عوام کے لئے بہت اشتعال انگیز تھی لیکن جب اس کی اس تقریر کے بعد برطانیہ نے یہ اعلان کیا کہ آئندہ مصر کو ہتھیار سپلائی نہیں کئے جائیں گے تو مصری عوام بالکل آگ بگولا ہو گئے۔ چنانچہ 21 نومبر کو قاہرہ، اسکندریہ اور پورٹ سعید میں زبردست ہنگامے ہوئے جن کے پیش نظر حکومت مصر نے ہنگامی حالات کا اعلان کر کے مصری طلبا کو یقین دلایا کہ مصر کے مفادات کے تحفظ کے لئے اور مقاصد کے حصول کے لئے جتنے بھی اقدامات ضروری ہوں گے انہیں اختیار کرنے میں گریز نہیں کیا جائے

گا۔حکومت نے طلبا سے اپیل کی کہ وہ مصر کے مفاد کی خاطر پرامن رہیں۔‘‘[17] 22رنومبر کو مصر کے وزیراعظم نحاس پاشا نے برطانیہ کو متنبہ کیا کہ ’’حکومت مصر نے وادیٔ نیل کو متحد کرنے اور نہر سویز کے علاقے سے برطانوی فوجوں کو نکالنے کا عزم کیا ہوا ہے۔‘‘[18]

اس صورتحال کے پیش نظر نوائے وقت نے اینگلو مصری تنازعہ پر ایک اور اداریہ سپرد قلم کیا۔اس نے لکھا کہ ’’اب مصر میں برطانیہ کے خلاف اتنا لاوا پک چکا ہے کہ کسی بھی دن جوالا مکھی پھٹ سکتا ہے۔برطانیہ اپنی اس بے جا ہٹ دھرمی سے مشرق وسطیٰ ہی کے نہیں بلکہ ایشیا کے تمام ممالک کو اپنا مخالف بنالے گا۔ان حالات میں مصلحت کا تقاضا اور وقت کی آواز یہی ہے کہ برطانیہ اپنے رویے میں تبدیلی کرکے مصر کو حریف کی بجائے حلیف بنائے۔بصورت ثانی اس کا اندیشہ ہے کہ سارا مشرق وسطیٰ کسی اور کیمپ میں نہ چلا جائے۔‘‘[19] نوائے وقت کے اس اداریے کا مطلب یہ تھا کہ نومبر 1950ء میں اس کی جانب سے برطانیہ کی مخالفت صرف اس حد تک تھی جس حد تک کہ ’’دوسرے کیمپ‘‘ کا خطرہ نہیں تھا۔اس کے اس مسئلہ پر 19رنومبر کو اداریے کی تان بھی اس فقرے پر ٹوٹی تھی کہ ’’اگر برطانیہ نے عاقبت نااندیشی کا ثبوت دیا تو وہ مصر کو ہی نہیں سارے عالم اسلام کو اپنا دشمن بنالے گا۔اب وہ اپریل 1950ء کی طرح عرب ممالک کو یہ مشورہ نہیں دیتا تھا کہ اینگلو۔امریکی سامراج سے نجات حاصل کرنے کے لئے اور یہود کی غلامی سے بچنے کے لئے سوویت یونین یعنی ’’دوسرے گروپ‘‘ سے دوستی کرو۔اب وہ برطانیہ کو مشورہ دیتا تھا کہ عربوں پر اتنا ظلم مت کرو کیونکہ اندیشہ ہے کہ وہ دوسرے کیمپ میں چلے جائیں گے۔

لیکن روزنامہ پاکستان ٹائمز کو یہ نہیں اندیشہ تھا کہ اگر عرب ممالک ’’دوسرے کیمپ‘‘ میں چلے گئے تو قیامت آ جائے گی۔البتہ اس اخبار کو حیرت تھی کہ پاکستانی ارباب اقتدار اینگلو۔مصری تنازعہ کے بارے میں خاموشی کیوں اختیار کئے ہوئے ہیں۔اس نے اپنے اداریے میں امید ظاہر کی کہ ’’پاکستان کے برطانوی دولت مشترکہ سے جو روابط ہیں ان کی وجہ سے ہمارے سرکاری زعما اینگلو۔مصری تنازعہ کے بارے میں اپنی اور اپنی قوم کی رائے کے اظہار سے گریز نہیں کریں گے۔اگر مصر کی وفد پارٹی کے زعما اپنے اعلانات پر قائم رہنے کا تہیہ کئے ہوئے ہیں اور وہ دباؤ کی سیاسیات کا کھیل نہیں کھیل رہے ہیں تو مصر کو بیرونی ممالک سے ہر ممکن اخلاقی اور سفارتی اور شاید مالی مدد بھی درکار ہوگی۔پاکستان کے لئے مناسب ہوگا کہ وہ اقوام متحدہ کے اندر

اوراس کے باہر بین الاقوامی رائے عامہ کو منظم کرنے میں پہل کرے تاکہ احتجاجی کاروائی سے مصر میں برطانیہ کے کھیل کو ناکام کیا جاسکے۔ اگر پاکستان ایسا کرے گا تو اس کے بین الاقوامی وقار میں اضافہ ہوگا۔ مشرق وسطیٰ کے ممالک کے ساتھ اس کی دوستی مستحکم ہوگی اور ایک مسلم قوم کو مکمل آزادی حاصل کرنے میں مدد ملے گی۔"[20]

مگر پاکستان ٹائمز کی یہ امید پوری نہ ہونی تھی اور نہ ہوئی۔ 25 نومبر 1950ء کو جب اس اخبار کے مالک افتخار الدین نے مرکزی پارلیمنٹ میں ایک تحریک التوا پیش کر کے مصر میں برطانوی فوجوں کی موجودگی کی مذمت کرنے اور ان فوجوں کے انخلا کے بارے میں مصری حکومت کے موقف کی حمایت کرنے کی کوشش کی تو اس موقع پر وزیر اعظم لیاقت علی خان نے مختصر تقریر کی۔ اس میں اس نے نہ تو مصر میں فوجوں کی موجودگی کی مذمت کی اور نہ ہی ان فوجوں کے انخلا کے بارے میں حکومت مصر کے مطالبہ کی حمایت کی۔ اس نے کہا کہ "مصر سے برطانوی فوجوں کے اخراج کا مسئلہ مصر اور برطانیہ کا باہمی مسئلہ ہے اور حکومت پاکستان کا اس معاملہ سے براہ راست کوئی تعلق نہیں۔ جہاں تک پاکستانی عوام کی عام ہمدردی کا سوال ہے تو اس بات سے ہر شخص واقف ہے کہ پاکستانی عوام کی ہمدردیاں ہمیشہ مسلم ممالک کے ساتھ رہی ہیں اور رہیں گی اور حکومت پاکستان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے اور رہے گی کہ اسلامی ملکوں کی کامل آزادی کے لئے ہر ممکن مساعد روبہ کار لائی جائیں۔ اگر مجھے یہ یقین دلایا جائے کہ پاکستان کے دولت مشترکہ سے نکل جانے سے تمام اسلامی ملکوں کو کامل آزادی مل سکتی ہے تو میں فوراً علیحدہ ہونے کے لئے تیار ہوں۔"[21] وزیر اعظم لیاقت علی خان اور پاکستان کے دوسرے ارباب اقتدار، اسلامی اتحاد اور اسلامی اخوت کے عظیم علمبردار بنتے تھے لیکن اسلامی ملکوں کے لئے ان کی ہمدردی وہاں جا کر ختم ہو جاتی تھی جہاں پر اس کی زد سے برطانوی مفادات کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو سکتا تھا۔

برطانوی وزیر خارجہ کا تو دارالعوام میں بیان یہ تھا کہ "فوجی اہمیت کے اس علاقے سے برطانوی فوج نکالنے کا سوال صرف مصر اور برطانیہ سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ یہ سوال مشرق وسطیٰ کے کئی دوسرے علاقوں سے بھی تعلق رکھتا ہے۔" لیکن لیاقت علی خان کا پارلیمنٹ میں بیان یہ تھا کہ "مصر سے برطانوی فوجوں کے اخراج کا مسئلہ مصر اور برطانیہ کا باہمی مسئلہ ہے اور حکومت پاکستان کا اس معاملہ سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔" لیاقت علی خان کے اس رویے کی وجہ

صرف یہی نہیں تھی کہ وہ برطانوی سامراج کا کاسہ لیس تھا بلکہ اس کی وجہ یونائیٹڈ پریس آف امریکہ کی اس خبر میں بھی مضمر تھی کہ ''حکومت امریکہ نے نہر سویز سے برطانوی فوج نکالنے کے متعلق مصر اور برطانیہ کے جھگڑے میں برطانیہ کی حمایت کی ہے۔ امریکہ اور برطانیہ کا اس رائے سے اتفاق ہے کہ جب تک بین الاقوامی صورتحال کی پوری طرح اصلاح نہیں ہو جاتی نہر سویز سے برطانوی فوج کا نکلنا بڑی غلطی ہوگی۔''[22] اور غالباً برطانوی نیوز ایجنسی ''سٹار'' کی یہ خبر بھی لیاقت علی خان کے اس رویے کی ذمہ دار تھی کہ ''اقوام متحدہ میں سوویت یونین کے وزیر خارجہ ایم وشنسکی (M.Vishinsky) نے نیویارک میں ایک مصری اخبار کے نمائندہ کو یقین دلایا ہے کہ نہر سویز کے علاقے سے برطانوی فوج کے انخلا کے متعلق مصر کے مطالبہ کو سوویت یونین کی حمایت حاصل ہوگی۔ پراودا میں ایک مقالہ بھی شائع ہوا ہے جس میں مصری مطالبہ کو سراہا گیا ہے اور اینگلو۔مصری معاہدہ کی تنسیخ کو ضروری بتایا گیا ہے۔ ابھی تک یہ نہیں معلوم ہوا کہ مصری حکومت پر سوویت یونین کے اس رویے کا کیا ردعمل ہوا ہے۔''[23]

نہر سویز کے تنازعہ پر لیاقت کی برطانیہ نوازی کے خلاف پاکستان کے عوام الناس کا شدید ردعمل

لیاقت علی خان کی پارلیمنٹ میں متذکرہ تقریر پر پاکستان کی، خاص طور پر پنجاب کی رائے عامہ نے سخت خفگی کا اظہار کیا۔ پنجاب میں برطانیہ اور اس کی دولت مشترکہ کے خلاف ظہور پاکستان کے پہلے دن ہی سے ریڈ کلف ایوارڈ کی وجہ سے سخت مخالفانہ جذبات پائے جاتے تھے۔ اکتوبر 1947ء میں ان جذبات میں شدت پیدا ہوئی جبکہ ہندوستان کے انگریز گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی امداد سے ہندوستان نے کشمیر پر قبضہ کر لیا۔ اپریل 1948ء میں پنجابیوں کے درمیانہ طبقہ کے ان جذبات کی تلخی و شدت میں اضافہ ہو گیا جبکہ برطانیہ نے ہندوستان کے سفارتی دباؤ کی وجہ سے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل سے تنازعہ کشمیر کے بارے میں ایسی قرارداد منظور کرائی جس کا مطلب یہ تھا کہ اس تنازعہ کا تصفیہ پاکستان کے حق میں کبھی نہیں ہوگا۔ یکم جنوری 1949ء کو ان برطانیہ دشمن جذبات نے شعلوں کی صورت اختیار کر لی جبکہ لیاقت علی خان نے انگریزوں کے زیر اثر کشمیر میں جنگ بندی کرا دی اور پھر جب لیاقت علی خان تقریباً دو سال کے عرصے میں

برطانیہ کی بے پناہ کاسہ لیسی کے باوجود اس تنازعہ کا منصفانہ تصفیہ کرانے میں ناکام رہا تو پنجاب کے ہر کونے سے برطانیہ اور اس کی دولت مشترکہ کے خلاف بے پناہ نفرت کا اظہار ہوا۔ 1950ء کا سال پنجاب میں انتخابی مہم کا سال تھا۔ اس لئے لیاقت علی خان کا ہر چھوٹا بڑا حریف اس کی برطانیہ نوازی کو ہدف تنقید بناتا تھا۔ حسین شہید سہروردی نے نواب ممدوٹ سے گٹھ جوڑ کر لیا تھا اور ان دونوں نے پنجاب کی سیاسی فضا لیاقت علی خان کے لئے بہت مکدر کر دی تھی۔ جب 25 رنومبر 1950ء کو لیاقت علی نے پارلیمنٹ میں اینگلو۔مصری تنازعہ کے بارے میں پاکستان کی بے تعلقی کا اظہار کیا تو پنجاب سمیت پورے پاکستان میں سخت غصے کا اظہار کیا گیا۔

10 ردسمبر 1950ء کو پاکستان میں ''یوم مصر'' منایا گیا اور اس موقع پر بے شمار چھوٹے بڑے شہروں میں قراردادوں کے ذریعے برطانوی سامراج کی مذمت کرتے ہوئے مطالبہ کیا گیا کہ برطانوی فوجوں کو مصر سے نکالا جائے۔ کراچی کے جلسہ میں سعودی عرب، شام اور مصر کے سفارتی نمائندوں نے بھی تقریریں کیں۔ نوائے وقت کے لئے لیاقت علی خان کی مخالفت کا یہ موقع بہت غنیمت تھا۔ چنانچہ اس کا ادارتی تبصرہ یہ تھا کہ'' آنریبل لیاقت علی خان پر پاکستانی عوام کی طرف سے جلسوں اور اخبارات کے ذریعے زور دیا جا رہا ہے کہ وہ کامن ویلتھ کے ایک ممبر ملک کی حیثیت سے کامن ویلتھ کے سربراہ برطانیہ سے یہ مطالبہ کریں کہ وہ مصر سے اپنی فوجیں ہٹا لے اور سوڈان کے معاملہ میں مصر سے انصاف کرے۔ اس سلسلہ میں پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے مسٹر لیاقت علی خان نے فرمایا تھا کہ برطانیہ اور مصر کے جھگڑے سے پاکستان کو کیا واسطہ؟ ہماری رائے میں اس وقت وزیراعظم نے یہ بات سوچے سمجھے بغیر کہہ دی تھی اور اب انہوں نے یقیناً یہ محسوس کر لیا ہو گا کہ پاکستان کو برطانیہ اور مصر کے اس جھگڑے سے گہری دلچسپی ہے۔ پاکستان کامن ویلتھ کا ممبر ہے اور برطانیہ کامن ویلتھ کا سربراہ۔ مصر سے پاکستان کا رشتہ اسلامی اخوت کا رشتہ ہے۔ اس دوہرے رشتے کی وجہ سے پاکستان کو زیب نہیں دیتا کہ وہ یہ کہہ کر یہ جھگڑا برطانیہ اور مصر کا آپس کا جھگڑا ہے بالکل لاتعلق ہو جائے۔ پاکستان کا فرض ہے کہ وہ کامن ویلتھ کے سربراہ کو معقول روش اختیار کرنے کا مشورہ دے۔ اگر خدانخواستہ یہ منطق درست ہو کہ پاکستان کو مصر سے کوئی دلچسپی نہیں تو پھر مصر کو پاکستان سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ یا کوئی اسلامی ملک کشمیر کے معاملے میں پاکستان سے ہمدردی کیوں کرے؟ اگر پاکستان خدانخواستہ دوسرے

اسلامی ملکوں سے اتنا ہی بے تعلق ہے تو اس میں اور سیکولر ہندوستان میں (اسلامی ملکوں کے نقطۂ نظر سے) کیا فرق ہے؟ ہمیں پورا یقین ہے کہ پاکستانی عوام اس منطق سے ہرگز اتفاق نہیں کرتے۔ اب رہی کامن ویلتھ کی بات تو وزیر اعظم پاکستان یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو کامن ویلتھ دولت مشترکہ کے دو ممبر ملکوں یعنی خود پاکستان اور ہندوستان کا جھگڑا نہیں نپٹا سکتی، مصر اور برطانیہ کے قضیے میں اس سے کیا امید کی جا سکتی ہے؟ لیکن پاکستانی عوام بھی اپنے وزیر اعظم سے یہ پوچھنے میں حق بجانب ہیں کہ اگر کامن ویلتھ ایسا ہی ناکارہ ادارہ ہے کہ وہ ہندوستان کو ایک دوسرے ممبر ملک پاکستان کے بارے میں معقول روش اختیار کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتا اور اس کا ایک ممبر ملک پاکستان اس کے سربراہ برطانیہ کو ایک اسلامی ملک مصر کے بارے میں معقول روش اختیار کرنے کا مشورہ دے گا تو اس مشورہ پر کوئی توجہ نہیں دی جائے گی تو پاکستان کو اس کامن ویلتھ سے چمٹے رہنے میں کیا حاصل''؟[24] نوائے وقت کے اس اداریے میں پنجاب کے شہری عوام کے جذبات کی پوری طرح عکاسی ہوئی تھی۔ پنجاب کی شہری رائے عامہ لیاقت علی خان کی داخلہ اور خارجہ پالیسی سے فی الحقیقت بیزار تھی جس کا زوردار مظاہرہ تقریباً دو ماہ قبل 28 اکتوبر 1950ء کو ہوا تھا جبکہ لیاقت علی خان پاکستان مسلم لیگ کا صدر منتخب ہونے کے بعد پہلی مرتبہ لاہور آیا تھا تو وہ یونیورسٹی گراؤنڈ میں حاضرین کے ہنگامہ کی وجہ سے تقریر نہیں کر سکا تھا۔

پنجابی درمیانہ طبقہ کا ترجمان نوائے وقت لیاقت علی سے آزادانہ خارجہ پالیسی کی توقع رکھتا تھا لیکن ملک کے اندر استحصالی نظام کو جوں کا توں برقرار رکھتے ہوئے ایسا ممکن نہ تھا

دو چار دن کے بعد نوائے وقت نے پاکستان کی خارجہ پالیسی کا پھر اداراتی جائزہ لیا اور یہ رائے ظاہر کی کہ ''کسی ملک کی آزادی کا سب سے بڑا مظہر اس ملک کی آزاد خارجہ پالیسی ہوتی ہے۔ اور ملک کے باہر دنیا اس کے متعلق جو رائے قائم کرتی ہے وہ بالعموم اس کی خارجہ پالیسی پر ہی مبنی ہوتی ہے۔'' یہ اداراتی جائزہ خاصا طویل تھا اور اس کو سہولت کے لئے پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا (1) ہندوستان کے بارے میں (2) برطانیہ کے بارے میں (3) ممالک اسلامیہ کے بارے میں (4) امریکہ کے بارے میں (5) روس کے بارے میں۔ جہاں تک ہندوستان کا

تعلق تھا نوائے وقت کی ادارتی رائے یہ تھی کہ ''گزشتہ تین سالوں میں دونوں ملکوں کے تعلقات میں کوئی تسلی بخش اصلاح نہیں ہوئی۔ کشمیر کا قضیہ، نہروں کے پانی کا جھگڑا، پاکستانی کرنسی کی قیمت کا قضیہ، متروکہ جائیدادوں کا مسئلہ اوران بدنصیب عورتوں کا مسئلہ جنہیں مغویہ کا مذموم لقب دیا گیا ہے، ابھی تک مسائل لاینحل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہندوستان کی پالیسی پاکستان کے متعلق کیا ہے؟ اس پر بحث کئے بغیر ہم بڑے ادب کے ساتھ یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ ہندوستان کے معاملے میں پاکستان کی پالیسی کمزور بلکہ بے جان ہے۔ پاکستان نے کسی معاملہ میں بھی مضبوطی نہیں دکھائی۔ تفاصیل کا بیان نہ ممکن ہے نہ مفید...... اس وقت ہندوستان اور پاکستان کے مابین جو مسائل متنازعہ فیہ ہیں، ہماری خارجہ پالیسی کی کمزوری ان سب پر اثر انداز ہے۔ پاکستان نے اپنی بے جان خارجہ پالیسی سے ہندوستان کو اس غلط فہمی یا خوش فہمی میں مبتلا کر دیا ہے کہ ہندوستان کے بارے میں پاکستان کی پالیسی رعایتیں دینے کے اصول پر مبنی ہے۔ جو اشخاص بین الاقوامی سیاست کی ابجد سے بھی واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ دوسرا ملک خواہ ہمسایہ ہو خواہ مخالف اگر وہ غلط یا صحیح طور پر سمجھنے لگے کہ فریق ثانی رعایتیں دینے کے اصول پر پابند ہے تو وہ کبھی معقولیت اختیار نہیں کرتا۔ برطانیہ اور کامن ویلتھ سے پاکستان کے تعلقات کی نوعیت نا قابل فہم حد تک عجیب وغریب ہے۔ پاکستان کامن ویلتھ کا ممبر ہے اور یو این کے اندر اور یو این کے باہر صرف مملکت اسرائیل کو تسلیم کرنے کے معاملہ کے سوا باقی ہر معاملہ میں پاکستان کی خارجہ پالیسی وہی رہی ہے جو برطانیہ کی خارجہ پالیسی تھی۔ ہر بین الاقوامی مجلس میں ہمارے نمائندوں کا ہاتھ برطانوی نمائندوں کے ہاتھ کے ساتھ اٹھا ہے۔ مگر اس تعلق اور نیاز مندی سے خود پاکستان کو کیا حاصل ہوا؟...... کامن ویلتھ کے اندر رہنے میں پاکستان کا بدیہی نقصان یہ ہے کہ برطانیہ اور کامن ویلتھ کے اس تعلق سے قطعاً کچھ حاصل کئے بغیر پاکستان نے مفت میں ہی اپنے آپ کو بدنام کر لیا۔ اینگلو۔امریکن، مسٹر لیاقت علی کے اپنے الفاظ میں ہمیں ''گھر کی مرغی'' سمجھتے ہیں اور روس ہمیں اینگلو۔امریکن بلاک کا دم چھلا گردانتا ہے۔ کیا دنیا میں اپنے متعلق یہ تاثر پیدا کر دینا تدبر کا ثبوت ہے؟ ممالک اسلامیہ نے قیام پاکستان کو تیرہ وتار آسمان پر ایک شعاع نور سمجھا تھا۔ کیا ہم ان کی توقعات پر پورے اترے ہیں؟ ابتدا میں خدا جانے یہ حماقت کس کو سوجھی تھی کہ ہمارے لیڈروں نے پاکستان کو اسلامی ممالک کا قائد کہنا شروع کر دیا (یادرہے یہ حماقت ابتدا میں نوائے

وقت کو ہی سوجھی تھی جبکہ وہ ستمبر، اکتوبر، نومبر 1947ء میں پاکستان کی زیر قیادت اسلامی ممالک کا تیسرا بلاک بنانے کا مبلغ تھا۔ اس کا 3/نومبر 1947ء کا اداریہ یہ تھا کہ ''پاکستان کے سوا کوئی ملک اسلامی ممالک کی قیادت کا اہل نہیں۔ یہی چیز کسی دوسرے ملک کے لیڈر کہتے تو کوئی بات بھی تھی۔ مگر ہم اپنے منہ آپ میاں مٹھو بنے اور ممالک اسلامیہ کے حساس لوگوں کو بلاوجہ ناراض کیا۔ آج افغانستان سے ہمارے تعلقات ناخوشگوار ترین ہیں۔ اس کی وجہ افغان حکمرانوں کی بے تدبیری اور ہندوستان اور برطانیہ کی ڈپلومیسی ہے۔ مگر کیا ہماری ڈپلومیسی بالکل بے قصور ہے؟ کیا ہماری وزارت خارجہ اور ہمارے سفیر کا فرض نہ تھا کہ وہ ہندوستان اور برطانیہ کی چالوں کو ناکام بناتا اور افغان حکمرانوں کو گمراہی سے بچاتا؟ ترکی سے ہمارے تعلقات محض تبادلہ سفراء کی حد تک محدود ہیں۔ انڈونیشیا میں نہرو کا اثر لیاقت علی کے مقابلہ پر زیادہ ہے۔ مشرق وسطیٰ کے ملکوں میں مصر سب سے اہم ملک ہے۔ مصر اور برطانیہ کے جھگڑے میں مسٹر لیاقت علی خان نے یہ کہہ کر لٹیا ہی ڈبودی کہ پاکستان کو اس سے کیا دلچسپی؟ پاکستان کو برما سے کیا دلچسپی تھی جو انگریزوں کے کہنے پر آپ نے لاکھوں پونڈ قرضہ برما کو دے دیا؟ کل ہی مصری اخباروں نے مصری علما کا فتویٰ شائع کیا ہے کہ ممالک اسلامی کشمیر کے لئے جہاد کریں۔ مسٹر لیاقت علی کی منطق کے مطابق اسلامی ممالک کو کشمیر سے کیا دلچسپی ہے؟ اسلامی ملکوں کے تعاون اور اشتراک سے پاکستان ''اسلام'' کو بین الاقوامی سیاسی میدان میں ایک طاقت بنا سکتا تھا مگر ہم اس میں بری طرح ناکام رہے۔ ایک ایران سے راجہ غضنفر علی کی محنت و تدبر کی وجہ سے برادرانہ روابط قائم ہیں مگر یہاں بھی جنرل اسمبلی کے انتخاب صدارت میں ایران کا مقابلہ کر کے دودھ میں مکھی ڈال دی گئی۔ امریکہ اور روس کے بارے میں ہماری خارجہ پالیسی کیا ہے؟ وزیر اعظم امریکہ گئے، سیر کی، دعوتیں کھائیں اور واپس آ گئے۔ مگر ملک کے لئے کیا لائے؟ شرمن ٹینک؟ ہوائی جہاز؟ کشمیر کے معاملے میں اخلاقی مدد؟ کیا ان سب سوالوں کا جواب یہ نہیں کہ ''کچھ بھی نہیں لائے۔'' اگر مسٹر لیاقت علی خان بین الاقوامی سیاست کی حد تک امریکہ کے دل میں پاکستان کے لئے وہی جگہ پیدا کراتے جو ہندوستان کے لئے ہے تو ہم انہیں پاکستان کا کامیاب ترین سفیر قرار دیتے مگر وہ تو اس معاملے میں بھی ناکام رہے۔ آج امریکہ کا رجحان سو فیصدی ہندوستان کی طرف ہے۔ وزیر اعظم نے ماسکو جانے کی دعوت بھی قبول کی تھی مگر اب تک بوجوہ وہ تشریف نہیں لے جا سکے۔ اس میں بھی غلطی روس ہی کی

ہو گی مگر کیا ہماری ڈپلومیسی بالکل بری الذمہ ہے؟ یو این میں نیو یارک ٹائمز کے خاص نامہ نگار روز نتھل (Rosenthal) نے لکھا ہے کہ اس وقت روس جس ملک کو کھلم کھلا ناراض کرنے سے سب سے زیادہ ہچکچاتا ہے وہ ملک ہندوستان ہے۔ ایک امریکی اخبار نویس کی ہدایت کے مطابق روس کو ہندوستان کا اس قدر لحاظ ہے مگر وزیر اعظم پاکستان کے متعلق روس کی رائے اسی سے ظاہر ہے کہ روسی اخبار ''ریڈ سٹار'' جو ایک طرح کا سرکاری اخبار ہے، آپ کو ''پاکستان کا سنگمن ری'' کا خطاب دیتا ہے۔ یہ خطاب نہیں گالی ہے۔ ہم تو اسے اپنی خارجہ پالیسی کی ناکامی ہی کہیں گے کہ دنیا کے دونوں پاور بلاک پاکستان کے مقابلہ پر ہندوستان ہی کی طرف مائل ہوں۔ ایک جس کے ہم نیاز مند ہیں، ہمیں ''گھر کی مرغی'' سمجھے اور دوسرا وزیر اعظم کو ''سنگمن ری'' کی گالی دے۔ مسٹر لیاقت علی سے ہزار اختلاف کے باوجود ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ گالی دراصل سارے پاکستانیوں کو دی گئی ہے...... پاکستان اپنی جغرافیائی اہمیت، اپنی اسلامی آئیڈیالوجی اور اپنی جاندار توانا قوم کی وجہ سے اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دنیا کا ایک عظیم ملک بن سکتا ہے بشرطیکہ وہ اپنی خارجہ پالیسی کو اس طرح مرتب کرے کہ نہ انگریز اور امریکی اسے ''گھر کی مرغی'' سمجھیں، نہ روس اسے برطانیہ کا دم چھلا گردانے۔ پاکستان کی خارجہ پالیسی کسی بلاک کی خیمہ بردار بھی نہیں ہونی چاہیے بلکہ آزاد ہونی چاہیے۔ غیر جانبداری کا مطلب یہ ہے کہ ہم کسی صورت میں بھی کسی کا ساتھ نہیں دیں گے۔ آزاد پالیسی کا مطلب یہ ہے کہ ہم کسی کے خیمہ بردار نہیں، جس کو حق پر سمجھیں گے جب مناسب سمجھیں گے یا جب اپنے لئے مفید اور ضروری سمجھیں گے اس وقت اس کا ساتھ دیں گے۔ پاکستان اینگلو۔ امریکیوں کی یہ خوش فہمی رفع کردے کہ ہم ہر حال میں ان کے نیاز مند ہیں اور روس کی یہ غلط فہمی دور کر دے کہ پاکستان تو بہر طور اینگلو۔ امریکیوں کا ہی ساتھ دے گا تو آج ہی مشرق وسطیٰ میں پاکستان کو یہ اہمیت حاصل ہو جائے گی کہ نہ روس اسے ناراض کرنے کی جرأت کرے گا نہ برطانیہ و امریکہ اسے نظر انداز کریں گے۔''[25]

نوائے وقت نے تقریباً ایک سال قبل بھی پاکستان کے ارباب اقتدار کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ آزاد خارجہ پالیسی اپنائیں اور پاکستان کی دوستی کی حدود صرف اینگلو۔ امریکی بلاک تک محدود نہ رکھیں بلکہ انہیں سوویت یونین تک بھی بڑھائیں۔ اب دسمبر 1950ء میں بھی اس نے اسی مشورہ کا تفصیل کے ساتھ اعادہ کر کے آزاد خارجہ پالیسی کی وکالت کی تھی۔ ان دونوں مشوروں

کا بین الاقوامی پس منظر یہ تھا کہ پہلے مشورے سے قبل اپریل 1949ء میں مغربی یورپ میں معاہدہ اطلانتک وجود میں آ چکا تھا۔ اس مہینے میں لندن کی دولت مشترکہ کانفرنس کے موقع پر ہندوستان کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو کی بہت پذیرائی ہوئی تھی اور پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خان سے اہانت آمیز سلوک کیا گیا تھا۔ مئی میں اسرائیل اقوام متحدہ کا رکن بن گیا تھا۔ اس مہینے میں مغربی جرمنی میں وفاقی جمہوریہ جرمنی کی حکومت قائم ہوئی تھی۔ جون میں فرانسیسی سامراج کی طرف سے ویت نام میں باؤدائی کی پٹھو حکومت کے قیام کے بعد ہو چی منہ کی زیر قیادت کمیونسٹوں کی جنگ آزادی تیز ہو گئی تھی۔ اسی مہینے میں مارشل سٹالن نے وزیر اعظم لیاقت علی خان کو دورہ ماسکو کی دعوت دی تھی۔ اگست میں سوویت یونین نے ایٹم بم کا پہلا تجربہ کیا تھا۔ ستمبر میں برطانیہ نے اپنی کرنسی کی قیمت میں 40 فیصدی کی کمی کر دی تھی۔ اکتوبر میں عوامی جمہوریہ چین کے قیام کا اعلان ہو گیا تھا اور اسی مہینے میں ہندوستان کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے امریکہ کا دورہ کیا تھا۔ گویا نوائے وقت کے پہلے مشورے سے قبل یہ واضح ہو گیا تھا کہ برطانیہ اور امریکہ ہندوستان کو بہت اہمیت دیتے تھے اور پاکستان کو ''گھر کی مرغی'' تصور کرتے تھے جبکہ روس کے ایٹمی دھماکے کے بعد چین میں اشتراکی انقلاب کی کامیابی سے دنیا کے طاقتی توازن میں بنیادی تبدیلی آ گئی تھی۔ چونکہ پاکستان اور خاص طور پر پنجاب کا درمیانہ طبقہ اپنے ملک کی خارجہ پالیسی کا تعین ہندوستان کے ساتھ اپنے قومی تضاد کے حوالے سے کرتا تھا اس لئے نوائے وقت کی اینگلو۔ امریکی بلاک سے بیزاری اور اس کی جانب سے آزاد خارجہ پالیسی کا مشورہ قابل فہم اور حسب توقع تھا۔ اس کے دسمبر 1950ء میں دوسرے مشورے سے قبل مئی 1950ء میں وزیر اعظم پاکستان کا دورہ امریکہ ہر لحاظ سے ناکام رہا تھا۔ اسے وہاں سے نہ تو کوئی مالی امداد ملی تھی اور نہ ہی کوئی فوجی امداد ملی تھی اور نہ ہی تنازعہ کشمیر کے منصفانہ تصفیہ کے لئے امریکی امداد کا کوئی وعدہ ملا تھا۔ جون میں وزیر اعظم لیاقت علی خان نے کوریا کی جنگ کے بارے میں سلامتی کونسل کے فیصلے کی غیر مشروط حمایت کر کے اور پھر جولائی میں اس نے جنوبی کوریا کی ''حسب استطاعت'' ہر ممکن امداد کا اعلان کر کے پاکستان کی رائے عامہ کو بہت ناراض کیا تھا کیونکہ اس طرح اس نے بین الاقوامی سطح پر اس تاثر کو پختہ کر دیا تھا کہ پاکستان اینگلو۔ امریکی سامراج کا طفیلی ملک ہے جبکہ ہندوستان کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے اس مسئلہ پر غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کر کے یہ

ثابت کر دیا تھا کہ اس کا ملک کسی پاور بلاک کا پٹھو ملک نہیں ہے۔ اکتوبر میں عوامی جمہوریہ چین نے کوریا میں فوجی مداخلت کی تھی اور اسی مہینے میں اس نے تبت کو اپنے زیر تسلط کر لیا تھا۔ نومبر میں چین کی فوج نے کوریا میں امریکہ اور اس کے ساتھی ملکوں کی فوجوں کی ایسی پٹائی کی تھی کہ اینگلو امریکی بلاک کو دن میں تارے نظر آ گئے تھے۔ یکم دسمبر کو امریکی صدر ٹرومین نے کوریا میں ایٹم بم استعمال کرنے کی دھمکی دی تھی لیکن اس کی اس دھمکی سے برطانیہ اور مغربی یورپ کے سارے ممالک میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ انہیں خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ اگر امریکیوں نے کوریا میں ایٹم بم استعمال کیا تو تیسری عالمی جنگ چھڑ جائے گی اور ایسی صورت میں مغربی یورپ بالکل تباہ ہو جائے گا۔ ٹرومین کی اس دھمکی کے فوراً ہی بعد برطانیہ کا وزیر اعظم ایٹلی اور مغربی یورپ کے دوسرے سربراہان حکومت واشنگٹن پہنچے اور ان سب نے امریکی صدر پر زور دیا کہ وہ کوریا کی جنگ کی نوعیت اور دائرے کو وسیع نہ کرے بلکہ اس جنگ کو چین کے ساتھ گفت وشنید کے ذریعہ ختم کرے۔ اس صورتحال میں ایک طرف تو ساری دنیا کو پتہ چل گیا تھا کہ سوویت بلاک کی طاقت اینگلو۔ امریکی بلاک کی طاقت سے کسی صورت کم نہیں تھی اور دوسری طرف ہندوستان کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو کے عالمی وقار میں بہت اضافہ ہو گیا تھا کیونکہ وہ جولائی 1950ء سے ہی بالاصرار یہ موقف اختیار کئے ہوئے تھا کہ کوریا کی جنگ کو عوامی جمہوریہ چین کے ساتھ بات چیت کے ذریعہ حل کیا جائے۔ جواہر لال نہرو کے مقابلے میں لیاقت علی خان کا وقار نہ صرف بین الاقوامی حلقوں میں بلکہ پاکستان کے اندر بھی مٹی میں مل گیا تھا کیونکہ اس نے پہلے جون۔ جولائی 1950ء میں غلط پیش بینی کر کے کوریا کی جنگ میں اینگلو امریکی بلاک کی غیر مشروط اور ہر ممکن امداد کا اعلان کر دیا تھا اور پھر اکتوبر میں جب امریکی جنرل میکارتھر کی فوجوں نے کوریا کے 38 ویں خط متوازی کو عبور کر کے شمالی کوریا پر حملہ کر دیا تھا تو لیاقت علی خان نے امریکیوں کی فتح کو یقینی تصور کر کے یہ اعلان کرنے میں ذرا بھی تاخیر نہیں کی تھی کہ پاکستان نے شمالی کوریا اور جنوبی کوریا کے درمیان سرحد کو کبھی تسلیم نہیں کیا تھا اور یہ کہ پورے کوریا میں انتخابات کے بعد ایک متحدہ وجمہوری حکومت قائم ہونی چاہیے۔ نومبر میں جب اس کی دوسری پیش بینی بھی غلط ثابت ہوئی تھی تو اس مہینے میں اس نے یہ اعلان کر کے لٹیا ہی ڈبو دی تھی کہ پاکستان کا مصر کے معاملہ سے براہ راست کوئی تعلق نہیں۔

اس بین الاقوامی پس منظر میں نوائے وقت کے 50-1949ء کے یہ دونوں ہی مشورے بظاہر درست اور صائب تھے۔ لیکن پاکستان میں نوائے وقت جیسے عناصر جب حکومت پاکستان کو آزاد خارجہ پالیسی اپنانے کا مشورہ دیتے تھے تو ان کے اس مشورے کی محرک صرف ایک ہی خواہش ہوتی تھی کہ پاکستان کو ہر مقام پر، ہر مرحلہ پر، ہر سطح پر اور ہر فورم پر ہندوستان سے بالاتر درجہ حاصل ہونا چاہیے اور پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جتنے قومی تضادات ہیں وہ سب کے سب پاکستان کے حق میں حل ہونے چاہئیں۔ حب الوطنی کے نقطہ نگاہ سے یہ خواہش بڑی اچھی تھی لیکن بدقسمتی سے اس خواہش کی بنیاد حقیقت پسندی پر نہیں تھی۔ یہ عناصر جب آزاد خارجہ پالیسی کا ذکر کرتے تھے تو اس کے ساتھ اس حقیقت کا ذکر نہیں کرتے تھے کہ کوئی ملک اپنے ہاں خودکفیل و ترقی پسندانہ معاشی نظام رائج کئے بغیر آزاد خارجہ پالیسی پر عمل پیرا نہیں ہوسکتا۔ جب کبھی پاکستان میں کسی حلقہ کی طرف سے یہ مطالبہ کیا جاتا تھا کہ برطانوی کمپنیوں کا استحصالی کاروبار ختم کیا جائے، بڑی جاگیرداریاں و زمینداریاں ختم کر کے کروڑوں غریب کسانوں کی زندگی میں آسودگی پیدا کی جائے اور ملک میں جدید اور بنیادی صنعت کاری کے لئے نہ صرف سوویت بلاک سے کاروباری مراسم قائم کیے جائیں بلکہ اس بلاک سے فنی امداد بھی حاصل کی جائے تو فوراً ہی اس حلقہ کے ارکان کو کمیونسٹ، ملحد، کافر اور مرتد قرار دے دیا جاتا تھا۔ نوائے وقت جیسے عناصر نے ملک کے معاشی ڈھانچے میں بنیادی تبدیلی کے حق میں کبھی بھی آواز نہیں اٹھائی تھی۔ ان کی خواہش یہ ہوتی تھی کہ ملک کا معاشی و معاشرتی ڈھانچہ جوں کا توں رہے۔ کروڑوں، غریب عوام مغربی سامراجیوں اور مقامی بڑے زمینداروں کے استحصال کی چکی میں پستے رہیں۔ نواب مشتاق احمد گورمانی اور نواب افتخار حسین خان آف ممدوٹ وغیرہ کی نوابیاں قائم رہیں۔ شیخ محمد امین اور نصیراے شیخ وغیرہ جیسے نودولتیوں کی لوٹ کھسوٹ جاری رہے۔ بلوچستان، سندھ، سرحد اور مشرقی بنگال کی پسماندہ قومیتیں پنجاب اور کراچی کے استحصالیوں کی بے حسی کے باعث بے روزگاری، فاقہ کشی، غربت اور بیماری میں مبتلا رہیں۔ ان قومیتوں پر پنجابی اور ''تلئیر'' افسر شاہی کے ہاتھوں جبر و استبداد ہوتا رہے، انتظامیہ کے اس جبر و استبداد پر اسلامی اخوت اور مسلم قومیت کا پردہ ڈالا جاتا رہے اور فکر و عمل، علم و دانش کے دروازوں پر دقیانوسی ملائیت کا پہرہ لگا رہے۔ لیکن اندرون ملک ان سب کوتاہیوں اور بدعنوانیوں کے باوجود وزیر اعظم لیاقت علی خان کوئی ایسا جادو

کرے کہ ساری دنیا میں پاکستان کا ڈنکا بجے۔ اسلامی ممالک پاکستان کی قیادت قبول کریں اور ہندوستان کو دنیا میں کہیں بھی کوئی پوچھنے والا نہ ہو۔

خود لیاقت علی خان بھی پاکستان کے اسی خوش فہم مکتب فکر سے تعلق رکھتا تھا لیکن وہ بے بس تھا اور وہ اس خواہش کو پورا نہیں کر سکتا تھا۔ اوّل اس لئے کہ وہ بھی ملک کے معاشی ومعاشرتی ڈھانچے میں ایسی بنیادی تبدیلی کا خواہاں نہیں تھا جو ملک کو صحیح معنوں میں جدید صنعتی ترقی کی راہ پر ڈالنے کا باعث بن سکتی تھی۔ دوئم اس لئے کہ وہ جاگیردار خاندان سے ہونے کی وجہ سے برطانوی سامراج کا پشتینی وفادار تھا اور سوئم اس لئے کہ ظفر اللہ خان اور غلام محمد وغیرہ اسے اینگلو۔امریکی سامراج کے شکنجے سے نکلنے ہی نہیں دیتے تھے۔

ہندوستان کا وزیر اعظم نہرو 50-1949ء میں ساری دنیا میں اپنا اور اپنے ملک کا وقار بلند کرنے میں اس لئے کامیاب ہوا تھا کہ وہ ہندوستان کے ایک قومی بورژوا طبقہ کی نمائندگی کرتا تھا جس کے خود اپنے توسیع پسندانہ یا سامراجی عزائم تھے۔ چین میں اشتراکی انقلاب کے باعث اینگلو۔امریکی بلاک کی نظر میں ہندوستان کی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی اور اسی نسبت سے ہندوستان کے قومی بورژوا طبقے کے عزائم میں اضافہ ہوا تھا۔ اس طبقہ کا مغرب کے سامراجی استحصالیوں سے قدرتی تضاد تھا۔ وہ مغربی ممالک کی مالی وفنی امداد سے اپنے ملک میں پرامن صنعتی انقلاب کا متمنی تھا لیکن وہ ان ممالک کا طفیلی بننا گوارا نہیں کرتا تھا۔ اس طبقہ کی رائے یہ تھی کہ چین کے اشتراکی زعما سوویت یونین کے پٹھو نہیں ہیں۔ لہٰذا چین اور ہندوستان کے درمیان مفاہمت ہو سکتی ہے اور اگر یہ مفاہمت ہو جائے تو بورژوا جمہوری نظام کے تحت ہندوستان کی صنعتی ترقی کی بہت سی راہیں کھل سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جواہر لال نہرو جب اکتوبر 1949ء میں امریکہ گیا تھا تو اس نے وہاں اپنی تقریروں میں ہندوستان کے کسی بلاک سے وابستہ ہونے کا انکار کر دیا تھا۔ پھر جب جون 1950ء میں کوریا کی جنگ چھڑی تھی، اس نے غیر جانبداری کا رویہ اختیار کرنے میں کوئی زیادہ دیر نہیں کی تھی اور اس کا یہ فیصلہ بعد میں بین الاقوامی سیاست کے افق پر اس کے اور اس کے ملک کے عروج کا باعث بنا تھا۔ نہرو نے جب یہ فیصلہ کیا تھا اس وقت تک اس نے اندرون ملک سوشلزم کی کوئی علمبرداری نہیں کی تھی بلکہ وہ مقامی کمیونسٹوں کے ساتھ بڑی شدت کے ساتھ برسر پیکار تھا اور برما اور ملایا کے کمیونسٹ باغیوں کی سرکوبی کے لئے انگریزوں کی بھرپور مدد کر رہا تھا۔ اس کے

سوویت یونین کے ساتھ تعلقات بھی اچھے نہیں تھے۔ ماسکو اور پیکنگ کے ذرائع ابلاغ اسے اینگلو۔امریکی سامراج کا پالتو کتا اور ایشیا کا دوسرا چیانگ کائی شیک قرار دیتے تھے۔لیکن چونکہ ہندوستان کے بورژوا طبقے اور اس طبقے کے سیاسی نمائندوں کی سیاسی بصیرت کا معیار پاکستان کے جاگیردار طبقے اور اس طبقے کے سیاسی واخباری نمائندوں کی سیاسی بصیرت کے معیار سے بہت بلند تھا، اس لئے نہرو تو کوریا کی جنگ کے شعلوں میں سے سیاسی طور پر کندن بن کر نکلا اور لیاقت علی خان سیاسی لحاظ سے اس جنگ کی آگ میں بھسم ہوگیا۔ 2 دسمبر 1950ء کو صدر ٹرومین کا یورپی لیڈروں سے ملاقات کے بعد انکشاف یہ تھا کہ اگرچینی کمیونسٹوں اور مغربی دنیا کے درمیان کوریا کی جنگ میں پیکنگ کی مداخلت کے سوال پر گفت وشنید کے ذریعے پرامن تصفیے کا کوئی امکان ہے تو امریکہ اس سلسلے میں ہندوستان کے بطور مصالحت کنندہ کے کردار پر بہت انحصار کر رہا ہے۔[26]

اشتراکیت کے خلاف مذہب کا ہتھیار استعمال کرنے کے لئے نوائے وقت جیسے عناصر، لیاقت علی، برطانوی اور امریکی حکومتیں، مغربی نظریہ ساز اور اسلامی و مسیحی جماعتیں سب آپس میں متحد تھے

پاکستان میں نوائے وقت جیسے عناصر جب یہ خواہش کرتے تھے کہ پاکستان کو بین الاقوامی میدان میں نمایاں مقام ملے تو وہ اس کے ساتھ ہی اندرون ملک اور بیرون ملک دقیانوسی ملائیت کو فروغ دینے کی بھی سرتوڑ کوشش کرتے تھے۔ یہ محض اتفاق نہیں تھا کہ ان کی جانب سے اتحاد اسلامی، اسلامی بلاک یا اسلامستان بنانے کی یہ کوشش برطانوی سامراج کی اس کوشش کے ساتھ ہی شروع ہوئی تھی کہ مشرق وسطیٰ میں پان اسلام ازم کی آڑ لے کر ایک سوویت مخالف بلاک بنایا جائے۔ اسی زمانے میں یہ پاکستانی عناصر اینگلو۔امریکی بلاک سے کھلم کھلا یہ کہتے تھے کہ پاکستان کی جغرافیائی اہمیت کا احساس کر کے اس کی مالی وفوجی امداد کرو تو اس ملک کی نہایت عمدہ فوج خلیج فارس کے علاقے میں تمہارے تیل کے ذخائر کی خوش اسلوبی سے چوکیداری کرے گی اور یہ کہ پاکستان کا مشرق وسطیٰ کے ممالک سے اسلامی رشتہ اس علاقے میں امن واستحکام کا باعث بنے گا۔ 1949ء میں وزیراعظم لیاقت علی خان کا مشرق وسطیٰ کا دورہ، وزیر خزانہ غلام محمد کی انٹرنیشنل اسلامک اکنامک کانفرنس اور پاکستان مسلم لیگ کے صدر چودھری خلیق الزماں کا

اسلامستان اسی موقف کی پیداوار تھا۔ حکومت برطانیہ نے اسی موقف کی حوصلہ افزائی کے لئے ''سٹار'' کے نام سے ایک خصوصی خبر رساں ایجنسی بنائی تھی جو ہر روز اسلامی اتحاد اور پان اسلام ازم کی تبلیغ کرتی تھی۔ یہ ایجنسی ہر مسلم ملک کے اندر اسلامی نظام کے بارے میں قدامت پرست ملاؤں کے تصور کی بھی اسی مقصد کے تحت حوصلہ افزائی کرتی تھی کہ مسلم عوام جدید نظریہ حیات سے بے خبر رہیں اور ان کے لئے جدید علوم کے دروازے نہ کھلنے پائیں۔

1949ء میں حکومت امریکہ نے بھی نظریاتی میدان میں اشتراکیت کے سدباب کے لئے مذہب کو فروغ دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ چنانچہ صدر ٹرومین نے ایک نشری تقریر میں امریکی عوام کو بتایا تھا کہ ''اگر انسان پرانے پیغمبروں کے اصولوں اور یسوع مسیح کے مواعظ حسنہ کے مطابق زندگی بسر کریں تو دنیا کا ہر مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔''[27] امریکی دانشوروں و مذہبی پیشواؤں نے امریکی عوام کو مذہب کی اہمیت کا احساس دلانے کی منظم کوشش کی تھی۔ جبکہ اسی سال رواں میں مصر میں اخوان المسلمین، ایران میں فدائیان اسلام اور پاکستان میں جماعت اسلامی اور بعض دوسری مذہبی تنظیموں نے اسلامی نظام اور نفاذ شریعت کی مہم چلائی تھی۔ یورپ میں کیتھولک فرقہ کے سربراہ پوپ نے عیسائیت اور اسلام کے درمیان مفاہمت کی تلقین کی تھی اور شیعوں کے اسماعیلیہ فرقہ کے سربراہ سر آغا خان نے ان دونوں مذاہب کے درمیان اتحاد کی وکالت کی تھی۔ پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خان نے بھی اپریل 1949ء کے اواخر میں اپنی بیگم کے ہمراہ پاپائے روم سے ملاقات کی تھی۔ جون 1950ء میں جب کوریا کی جنگ شروع ہوئی تھی تو کچھ عرصہ کے لئے ساری دنیا میں یہ مذہبی تحریکیں قدرے مدھم پڑ گئی تھیں لیکن جب اکتوبر 1950ء میں امریکی فوجوں کی چینی فوج کے ہاتھوں سرکوبی ہوئی تو امریکی صدر ٹرومین کو پھر مذہب یاد آیا۔ چنانچہ اس نے 3ر نومبر 1950ء کو امریکہ کی زندگی میں مذہب کی اہمیت کی دوسری سالانہ مہم کا آغاز کیا۔ اس موقع پر اس کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ ''امریکہ کی عظمت کا سنگ بنیاد امریکہ والوں کی مذہب سے والہانہ عقیدت میں مضمر ہے۔ امریکی زندگی کا سرچشمہ مذہب ہے لہٰذا سب امریکیوں سے درخواست ہے کہ وہ اس زمانہ میں اپنی اپنی عبادات سے شفقت کا اظہار کریں۔'' اس مہم کے پروگرام میں یہ طے کیا گیا تھا کہ نومبر کے مہینے میں تین ہزار سے زائد جماعتیں جلسے کریں گی اور تقاریب منائیں گی۔[28]

صدر ٹرومین کی اس تقریر سے تقریباً دو ہفتے قبل برطانوی مؤرخ آرنلڈ ٹوئین بی (Arnold Toynbee) نے کیلی فورنیا کے ایک کالج کے یوم تاسیس کی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے مغربی اقوام کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اشتراکیت کا کامیابی سے مقابلہ کرنے کے لئے عملی طور پر عیسائیت قائم کریں۔ اس کی رائے یہ تھی کہ ''آج کل قوم پرستی پر بہت زیادہ انحصار کیا جاتا ہے اور بنیادی اخلاقی اقدار کی طرف بہت کم توجہ کی جاتی ہے۔ چونکہ اشتراکیت کے تحت معاشرے اور مملکت کی تعریف و تحسین کی جاتی ہے اس لئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ مذہب عیسائیت کے مقابلے میں زیادہ پائیدار ہے۔ عیسائیت میں صرف افراد کی اعلیٰ اقدار کی تعریف کی جاتی ہے۔ مغرب کے لئے لازمی ہے کہ وہ اشتراکیت کے خلاف لڑنے کے لئے انفرادی مسیحی طرز زندگی پر زیادہ شدت سے عمل پیرا ہو۔ اگر ہمیں روس کے خلاف برابری کی سطح پر لڑنا ہے تو ہمیں اپنے رویے سے اپنے مذہبی عقائد کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔''[29]

واشنگٹن میں ٹرومین کی اس مذہبی مہم کے شروع ہونے کے تین دن بعد کراچی میں مؤتمر عالم اسلامی نے رابطہ تعارف اسلامی کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ مقصد یہ تھا کہ یہ تنظیم امریکہ کی روٹری کلب کی طرح کا لائحہ عمل اختیار کر کے ساری دنیا میں اسلامی اخوت کے اصولوں کی تبلیغ کرے گی اور ممتاز علما اور دانشوروں کو یہ موقع فراہم کرے گی کہ وہ اسلام کے بارے میں افکار و نظریات کا اظہار کریں۔[30] اس تنظیم کے قیام سے تقریباً تین ہفتے قبل بیروت کے ایک ممتاز قانون دان ڈاکٹر صبحی مہماسانی (Sobhe Mahmasani) نے اپنے دورۂ پاکستان کے دوران اپنی تقریروں میں یہ رائے ظاہر کی تھی کہ اسلام کے ان قوانین کو جو روایت، فقہ اور اجماع پر مبنی ہیں، وقت کی بدلتی ہوئی ضرورتوں کے مطابق بدلا جا سکتا ہے۔[31] چونکہ برطانوی نیوز ایجنسی کے نقطہ نظر سے ڈاکٹر مہماسانی کا یہ اجتہادی نظریہ مغربی سامراج کے لئے فائدہ مند نہیں تھا اس لئے اس نے مصر کی جامعہ ازہر کی ''ایک نمایاں مذہبی شخصیت'' سے اس سلسلے میں استفسار کیا تو اس کو جواب ملا کہ ''اگر اسلام کے قاعدوں کو قرآن کے طے کردہ اصولوں سے بدل دیا جائے تو وہ اسلامی نہیں رہیں گے۔ لیکن ان قرآنی اصولوں کو زمانہ کی بدلتی ضرورتوں کے مطابق کیا جا سکتا ہے۔ وہ اس قدر لچکدار اور ترقی پسند ہیں کہ ہر زمانہ کی ضرورت پوری کر سکتے ہیں۔'' اس نے کہا کہ ''اگر ڈاکٹر مہماسانی نے واقعی ان خیالات کا اظہار کیا ہے تو وہ مسلم قانون دان نہیں ہو سکتے۔ اصل قصہ

یہ ہے کہ اسلام کے قوانین پر اب تک اتنے وسیع پیمانے پر عمل نہیں کیا گیا کہ موجودہ زمانہ میں ان کی موزونیت کے متعلق کوئی مفید کام کیا جا سکے۔ کسی ایسے قانون پر چلنا جو قرآن میں موجود نہیں غیر اسلامی ہوگا۔"[32] 8/ نومبر کو مؤتمر عالم اسلامی نے تعلیم بالغان کی ایک مہم شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں جو اسکیم بنائی گئی اس میں یہ طے کیا گیا تھا کہ "یہ مہم ٹیگور تعلیمی سکول کے خطوط پر چلائی جائے گی اور اس کے تحت بالغوں کو قرآن پاک اور اسلامی تعلیمات کی تعلیم دے کر انہیں صحیح مسلمان بنایا جائے گا۔"[33]

11/ نومبر 1950ء کو پاکستان میں مصر کے نئے سفیر عبدالوہاب عزام نے گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین کو اپنی تقرری کی دستاویز پیش کیں تو اس موقع پر اس نے کہا کہ "دنیا روحانیت پر مادیت کے غلبہ کے باعث نفرت وعناد سے بھرپور ہے۔ اس لئے اسے اسلامی اصولوں کی سخت ضرورت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان اصولوں کو جامہ عمل پہنانے کے لئے مصر اور پاکستان کے درمیان جو تعاون ہوگا اس سے نہ صرف ان دونوں ملکوں میں ترقی وخوشحالی ہوگی بلکہ اس بنی نوع انسان کی ترقی وخوشحالی کی راہیں کھلیں گی اور دنیا میں امن کے قیام میں مدد ملے گی۔"[34] اسی دن صوبہ سرحد کے گورنر آئی۔ آئی۔ چندریگر نے پشاور میں ایڈورڈ کالج کے یوم تاسیس کی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے نوجوانوں کو تلقین کی کہ وہ "اسلام کے حقیقی جذبہ سے سرشار ہوں اور جس اعلیٰ نصب العین کے لئے پاکستان قائم ہوا تھا اسے پورا کرنے کے لئے محنت سے کام کریں۔"[35]
13/ نومبر کو خان افتخار حسین خان ممدوٹ نے باغ بیرون موچی دروازہ کے ایک جلسہ عام میں اپنی جناح مسلم لیگ کا جو 14 نکاتی پروگرام پیش کیا ان میں اہم نکات یہ تھے کہ "پاکستان میں اسلامی نظام قائم کیا جائے گا۔ قرآنی احکام کی بنیاد پر آئین پاکستان کی تشکیل ہوگی۔ زکوٰۃ کی بنیاد پر بیت المال قائم کیا جائے گا اور اسلامی تعلیم کو رواج دیا جائے گا۔"[36]

17/ نومبر کو روزنامہ ڈان نے اسلام اور عیسائیت کے اتحاد کی تجویز پر تبصرہ کرتے ہوئے اس امر پر افسوس وغصے کا اظہار کیا کہ "امریکی صدر نے اشتراکیت کے سدباب کے لئے مسیحی مغرب میں تو ڈالروں کے انبار لگا دیئے ہیں لیکن مسلم مشرق وسطیٰ کو اس نے محض الفاظ اور مبہم وعدوں ہی سے ٹرخا دیا ہے۔ بظاہر اس کی وجہ یہ ہے کہ مغربی لیڈروں نے یہ باور کر لیا ہوا ہے کہ مسلمان اپنی پسماندگی اور غربت کے باوجود محض اپنے مذہبی عقیدے کی وجہ سے اشتراکیت کو

قبول نہیں کریں گے۔ چند سال قبل تک جب مسلمان، اسلام اور سیاست کا ایک ساتھ ذکر کرتے تھے تو انہیں مذہبی دیوانے قرار دیا جاتا تھا لیکن آج کل جب کوئی مسلمان مغربی ممالک میں سفر کرتا ہے تو اس سے ہر جگہ ہر کوئی یہ سوال پوچھتا ہے کہ کیا اسلام اشتراکیت کے خلاف ایک حفاظتی دیوار کی حیثیت نہیں رکھتا ہے؟ جب مغرب کے لوگ یہ سوال پوچھتے ہیں تو یہ بھول جاتے ہیں کہ انہوں نے ماضی میں اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ کتنی زیادتیاں کی ہوئی ہیں۔ مغربی طاقتیں سرخ سیلاب کے خلاف مسلمانوں کا تعاون چاہتی ہیں تو انہیں چاہیے کہ وہ پہلے شمالی افریقہ کے مسلم ممالک کو آزاد کریں۔ مصر سے غیر ملکی فوجیں نکالیں۔ اسرائیل کو اس کی حدود میں رکھیں اور کشمیر کی آزادی کے لئے پاکستان کی امداد کریں۔ اگر وہ ایسا کرنے سے قاصر ہیں تو پھر صلیب اور ہلال کا اتحاد نہیں ہوسکتا اور مشرق ومغرب کے تصادم میں ہلال غیر جانبداری کی علامت ہوگا۔"[37] تاہم 22 رنومبر کو روزنامہ ڈان کے مالک اور آسٹریلیا میں پاکستان کے ہائی کمشنر یوسف ہارون نے ایک کالج کے طلبا سے خطاب کرتے ہوئے ان لوگوں کی ذہنیت پر افسوس کا اظہار کیا کہ جو انسان کے روحانی کارناموں کے منکر ہیں۔ اس نے کہا کہ "ان لوگوں کا نظریہ زندگی بہت تنگ ہے اور یہ اس حقیقت کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ ماضی کی تمام عظیم تہذیبوں کی بنیاد روحانی نظریات پر تھی۔ انسانیت آج مصائب کا محض اس لئے شکار ہے کہ اس نے اپنے دستوروں کی ترتیب کے سلسلے میں روحانیت اور مذہب کو خیر باد کہہ دیا ہے۔ پاکستانی عوام تو اپنی مادی اور روحانی دونوں ضرورتوں کی تکمیل کے خواہاں ہیں۔"[38]

6 ردسمبر کو ایسوسی ایٹیڈ پریس آف پاکستان نے کراچی کے باخبر حلقوں کے حوالے سے یہ اطلاع دی کہ "مختلف مسلم ممالک کے ممتاز عوامی لیڈروں نے ایک مسلم پیپلز آرگنائزیشن کے قیام کے مقصد کے تحت ایک مسلم پیپلز کانفرنس منعقد کرنے کی تجویز سے اتفاق کرلیا ہے۔ اس کانفرنس میں دنیا کی موجودہ صورتحال پر اس نقطہ نگاہ سے غور کیا جائے گا کہ یہ صورتحال مسلمانوں پر کس طرح اثر انداز ہو رہی ہے۔ یہ کانفرنس غیر سرکاری سطح کی ہوگی۔ اگرچہ سرکاری مبصرین بھی اس میں شریک ہوسکیں گے۔ اس میں ان مسائل کو حل کرنے کے طریقوں پر بحث کی جائے گی جو آج کل اسلامی دنیا کو درپیش ہیں اور مسلم ممالک کے سیاسی، معاشی اور دوسرے مفادات کے تحفظ وفروغ کے اقدامات بھی زیر بحث آئیں گے۔ کانفرنس کے کنوینروں میں چودھری خلیق

الزماں بھی شامل ہے جس نے سال رواں کے اوائل میں اس کے انعقاد کی تجویز پیش کی تھی۔"[39]
یہ خبر اس لحاظ سے اہم تھی کہ چند دن قبل یونائیٹڈ پریس آف امریکہ کی خبر کے مطابق حکومت امریکہ نے افغانستان اور پاکستان سے کہا تھا کہ وہ اپنا باہمی تنازعہ ایک کانفرنس منعقد کر کے حل کریں۔[40] 4 دسمبر کو مانچسٹر گارڈین نے مشرق وسطیٰ میں اطلانتک تنظیم کی طرح ایک فوجی تنظیم قائم کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ اخبار کی رائے یہ تھی کہ اگر اس تنظیم میں انگریزوں کے علاوہ امریکی شریک ہوں تو اسے بہت تقویت ملے گی۔ امریکیوں نے ترکی، ایران اور سعودی عرب کو جو ضمانت دے رکھی ہے اس کی وجہ سے ان کے اہم مفادات پہلے ہی اس علاقے سے وابستہ ہیں اور اگر اس تنظیم کو پاکستان کی بھی جو کہ قوی ترین مسلم طاقت ہے، حمایت مل جائے تو وہ بھی گراں قدر ہو گی۔"[41] 12 دسمبر 1950ء کو کراچی میں یہ بتایا گیا کہ حکومت امریکہ نے صدر ٹرومین کے چار نکاتی پروگرام کے تحت پاکستان کی ٹیکنیکل اعانت کے لئے 6 لاکھ ڈالر دیئے ہیں۔ اس رقم سے جون 1951ء تک تقریباً ایک سو پاکستانیوں کو ٹریننگ کے لئے امریکہ بھیجا جائے گا۔ اس مقصد کے لئے ہندوستان کو 12 لاکھ ڈالر دیئے گئے تھے۔[42]

دسمبر کے مہینے میں ہی پاکستان اور امریکہ کے درمیان ایک معاہدہ ہوا تھا جس کے تحت امریکہ نے پاکستان کو کچھ فوجی ساز و سامان دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اس سلسلے میں اصولی طور پر فیصلہ لیاقت علی خان کے دورہ امریکہ کے دوران ہوا تھا۔ تاہم اس ساز و سامان میں کوئی جدید اسلحہ شامل نہیں تھا۔ اس معاہدے کے پس منظر میں وہ نیوز لیٹر تھا جو روزنامہ ڈان کو 16 دسمبر 1950ء کو کابل سے موصول ہوا تھا۔ اس نیوز لیٹر کا خلاصہ یہ تھا کہ سوویت یونین، اب پاکستان اور افغانستان کے تعلقات میں دلچسپی لینے لگا ہے۔ نیو ٹائمز اور دوسرے اخبارات صوبہ سرحد کے بارے میں پاکستان کے سامراجی عزائم کا ذکر کرتے رہے ہیں اور انہوں نے افغان علاقے پر پاکستان کی بمباری کی بھی مذمت کی ہے۔ ایران کی سوویت نواز تودہ پارٹی کے اخبار "پرخاش" نے بھی ایک اداریے میں اس مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے پاکستان پر حملے کئے ہیں۔ اس نے لکھا ہے کہ "افغان حکومت کو یہ احساس ہو گیا ہے کہ سوویت یونین کے ساتھ اس کی سرحد بہت لمبی ہے اس لئے وہ سوویت حکومت کے بارے میں معاندانہ پالیسی اختیار نہیں کر سکتی اور نہ ہی سوویت یونین کے خلاف برطانیہ کا آلہ کار بن سکتی ہے۔ قدرتی طور پر افغان حکومت کا یہ رویہ سامراجی طاقت کے

لئے پسندیدہ نہیں ہے۔ افغانستان کا سوویت یونین کے ساتھ ذرا بھی اختلاف نہیں ہے اور اس نے اپنے مثبت رویہ سے اپنے شمالی ہمسایہ کے دل میں خیر سگالی کے جذبات پیدا کئے ہیں۔ برطانیہ اس صورتحال سے خوش نہیں ہے کیونکہ اس طرح اس کی افغانستان کے معاملات میں مداخلت کاری کی خواہش میں رخنہ پڑتا ہے۔ پاکستان افغانستان کے ساتھ اپنے اختلافات میں شدت پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور برطانیہ ان اختلافات کے تصفیہ کے حق میں نہیں ہے۔[43]

ایران میں اینگلو ایرانین آئل کمپنی کے ساتھ تجدید معاہدہ کے خلاف ایرانی عوام کا احتجاج اور کمپنی کو قومی ملکیت میں لینے کا مطالبہ

21ردسمبر کو امریکی اخبار نویس ولیم گبسن (William Gibson) نے کراچی میں پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل افیئرز میں تقریر کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی کہ ''بڑی طاقتوں میں جنگ کی صورت میں ایران لازماً میدان جنگ بنے گا کیونکہ یہاں تیل کے ذخائر ہیں اور ان ذخائر پر جس طاقت کا قبضہ ہو جائے گا اس کی فتح ہوگی۔ گبسن نے جو ایرانی امور کا ماہر سمجھا جاتا تھا اور جو تہران میں چھ ماہ گزارنے کے بعد پاکستان آیا تھا۔ ایران کی قومی زندگی کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی پہلوؤں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ''ایران کی قدیم قوم کو اس طرح کے مسائل درپیش ہیں جس طرح کے مسائل سے نوزائیدہ پاکستان دوچار ہے۔ ایران میں انگلینڈ اور امریکہ کے خلاف جو بے اعتمادی پائی جاتی ہے بالکل ظاہر اور باہر ہے۔ ایران کے اخباروں پر نظر ڈالی جائے تو ایسا لگتا ہے کہ بالشوزم کے خلاف نفرت اور سوویت یونین کے خلاف خطرہ رفتہ رفتہ ناپید ہو رہا ہے۔ کچھ عرصہ سے ایران اور سوویت یونین کے درمیان بہت پرانے اختلافات رفع کئے جا رہے ہیں اور دونوں ملک باہمی عناد میں کمی کر رہے ہیں۔ حال ہی میں دونوں ملکوں کے درمیان جو تجارتی معاہدہ ہوا ہے اس کا ایرانی پریس بالخصوص شمالی ایران کے اخبارات میں بہت خیر مقدم کیا گیا ہے۔'' گبسن نے مزید کہا کہ ''ایران میں تودہ پارٹی ہے، جو اشتراکیت نواز ہونے کی وجہ سے غیر قانونی قرار دی جا چکی ہے۔ یہ ایک ایسی پارٹی ہے جو منظم ہے اور جسے صحیح معنوں میں سیاسی پارٹی کہا جا سکتا ہے۔ تودہ پارٹی کا ایران کے عوام میں بہت اثر ہے۔ اس کا ہفت روزہ ''مردم'' ملک کا مقبول ترین جریدہ ہے۔''[44] گبسن کی اس

تقریر سے ظاہر تھا کہ وہ وہاں کے حالات سے خوفزدہ تھا کیونکہ وہاں بھی مصر کی طرح اینگلو۔امریکی بلاک کے خلاف عوام الناس کی قوم پرست تحریک زور پکڑ رہی تھی۔اس تحریک کا لیڈر ڈاکٹر مصدق تھا جس نے اسی دن اپنے آٹھ ساتھیوں کے ہمراہ ایران کی مجلس کی بلڈنگ میں پناہ لی تھی کیونکہ چند دن قبل نہ صرف اس کی پارٹی کے دس سرکردہ لیڈروں کو کسی خفیہ تنظیم نے اغوا کرلیا تھا بلکہ حزب اختلاف کے دو ایڈیٹروں کو بھی گرفتار کرلیا گیا تھا۔

ڈاکٹر مصدق مجلس میں حزب اختلاف کا قائد تھا اور گزشتہ سال حکومت ایران اور اینگلو۔ایرانین آئل کمپنی کے درمیان جو ضمنی معاہدہ ہوا تھا وہ اس کی توثیق کے خلاف تھا جبکہ ایرانی عوام بڑی صنعتوں پر غیر ملکی کنٹرول کے خلاف سخت ناراضگی کا اظہار کرتے تھے۔اس مسئلہ پر عوام الناس کی ناراضگی اتنی شدید تھی کہ 26ردسمبر کو ایران کی مجلس کا اجلاس شروع ہوا تو وزیر اعظم جنرل علی رزم آرا کی حکومت کے وزیر خزانہ غلام حسین فروہار نے وہ مسودۂ قانون واپس لے لیا جس کے تحت متذکرہ معاہدہ کی توثیق مطلوب تھی۔ اس نے پارلیمنٹ کو بتایا کہ ''اس سلسلے میں اینگلو۔ایرانین آئل کمپنی سے ازسرنو گفت وشنید کی جائے گی۔کیونکہ مجلس کی آئل کمیٹی نے اس ضمنی معاہدے کو متفقہ طور پر یہ کہہ کر مسترد کردیا تھا کہ حکومت برطانیہ نے اس معاہدہ کے عوضانے کے طور پر 35 ملین پونڈ کی جو پیشکش کی ہے وہ ناکافی ہے جبکہ طلبا اور دوسرے مظاہرین ہفتہ بھر سے یہ مطالبہ کررہے تھے کہ اینگلو۔ایرانین آئل کمپنی سے معاہدہ منسوخ کرکے تیل کی صنعت کو قومی ملکیت میں لیا جائے۔''[45] قدرتی طور پر ایران کی یہ صورتحال امریکیوں کے لئے پریشان کن تھی۔اس لئے کہ کوریا میں چینیوں سے بری طرح مار کھانے کے بعد انہیں مشرق وسطیٰ میں اپنے سامراجی مفادات مزید خطرے میں نظر آنے لگے تھے اور ان کا پروپیگنڈا یہ تھا کہ سوویت یونین کوریا میں بالواسطہ طور پر امریکہ کے ساتھ پنجہ آزمائی کے بعد اب خلیج فارس کے علاقے کے تیل کی طرف دھیان دے گا۔ چنانچہ 27ردسمبر کو رائٹر کی واشنگٹن سے ایک اطلاع کے مطابق ''پاکستان اور مشرق وسطیٰ کے سات ملکوں (جن میں مصر، عراق، شام اور سعودی عرب شامل ہیں) کے سفیروں نے امریکی وزارت خارجہ میں نائب وزیر خارجہ سے ملاقات کی۔اس ملاقات میں ان سفیروں کو مطلع کیا گیا کہ امریکہ نے سارے محاذوں پر کمیونزم کا سختی کے ساتھ مقابلہ کرنے کا فیصلہ کررکھا ہے کیونکہ مشرق وسطیٰ کے ممالک روس کے خاص منصوبوں میں شامل ہیں۔''[46]

امریکی صدر کا دنیا کی تمام مذہبی و اخلاقی قوتوں کو کمیونزم کے خلاف اکٹھے ہو جانے کا مشورہ

مذکورہ ملاقات سے دو چار دن قبل 23 دسمبر کو صدر ٹرومین کی کنساس میں اخبار نویسوں کے کرسمس ظہرانے میں تقریر یہ تھی کہ ''اشتراکیت خدا کے وجود سے منکر ہے اور جمہوریت خدا پر عقیدے کی پیداوار ہے۔''[47] ایرانی عوام کے نقطہ نگاہ سے صدر ٹرومین کی اس تقریر کا مطلب یہ تھا کہ اگر ایران کا تیل ایرانی عوام کی تحویل میں چلا گیا تو وہاں اشتراکیت کا غلبہ ہو جائے گا اور خدا کا وجود ختم ہو جائے گا لیکن اگر اس تیل پر اینگلو۔امریکی بلاک کی اجارہ داری قائم رہے تو جمہوریت پروان چڑھے گی اور خدا کا وجود قائم رہے گا۔

صدر ٹرومین نے اپنی اس تقریر میں مزید کہا تھا کہ ''چنگیز خان اور تیمور لنگ دنیا کے سب سے بڑے قاتل تھے اور آج آزاد دنیا ان قاتلوں کے ورثا سے نبرد آزما ہے۔ اس نے کہا کہ ہمارے اخلاق اور ہمارے قوانین کی بنیاد ان اصولوں پر ہے جو میسوپوٹیمیا میں حضرت موسیٰ نے پیش کئے تھے اور جن کی تشریح و تعبیر حضرت عیسیٰ نے کی تھی۔ حضرت عیسیٰ نے پہاڑی پر چڑھ کر جو خطبہ دیا تھا وہ زندگی کا بہترین اخلاقی پروگرام ہے۔'' ٹرومین نے عصر حاضر کی اخلاقی قوتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ''میں کیتھولکوں، پروٹسٹنٹوں، یہودیوں، روایت پسند عیسائیوں، تبت کے دلائی لامہ، (یعنی بدھوں) اور ہندوستان کے سنسکرتی ضابطہ اخلاق (یعنی ہندومت) کو منظم کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ میں ان سب لوگوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتا رہا ہوں کہ اس دنیا میں ہماری بہبود، ہمارے وجود اور ہماری عزت و آبرو کے دفاع کا انحصار اس بات پر ہے کہ ہم اکٹھے ہو کر کام کریں اور ایک دوسرے کا گلا نہ کاٹیں۔''

چونکہ ٹرومین نے دنیا کی جن اخلاقی قوتوں کی فہرست بنائی ہوئی تھی اس میں اسلام یعنی مسلمان شامل نہیں تھے اس لئے کراچی کے روزنامہ ڈان کو بہت شکایت پیدا ہوئی اور اس نے اس شکایت کی بنا پر ایک اداریے میں ٹرومین کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرائی کہ ''پاکستان اور دوسرے مسلم ممالک کے زعما بار بار یہ کہہ چکے ہیں کہ جمہوریت، آزادی اور دوسری انسانی اقدار کے تحفظ کے لئے مسلم ممالک قدرتی طور پر مثبت کردار ادا کر سکتے ہیں کیونکہ اسلام

ایک ولولہ انگیز اخلاقی قوت ہے۔ ایسی باتوں پر مغربی زعما کا ردعمل بہت مایوس کن رہا ہے۔ کبھی کبھار اسلام کے اصولوں کی تعریف کی جاتی رہی ہے اور ان کے بارے میں اچھے الفاظ کہے جاتے رہے ہیں تاکہ مسلمان کمیونسٹ دنیا کے بارے میں سوچنے اور اس کو برداشت کرنے سے باز رہیں۔ صدر ٹرومین نے بھی بعض تقریبی مواقع پر مثلاً ہمارے وزیراعظم کے دورہ امریکہ کے موقع پر اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں اچھی باتیں کی ہیں۔ لیکن جب کبھی مثبت اقدام کا وقت آیا ہے تو مسلم اقوام سے بے وفائی کی گئی ہے۔ اس کی بہترین مثالیں فلسطین اور کشمیر ہیں۔''

مسٹر ٹرومین کی اس تقریر کے تین دن بعد امریکہ کے نائب وزیر خارجہ برائے امور مشرق بعید ڈین رسک (Dean Rusk) نے پاکستان سمیت آٹھ عرب اور جنوبی ایشیا کی اقوام کو اپنے دفتر میں جمع کر کے امید ظاہر کی کہ ''آئندہ مشکلات کا جو دور آرہا ہے اس میں عرب دنیا ثابت قدمی کے ساتھ امریکہ کے ساتھ رہے گی۔ بظاہر اس سارے قصے میں کسی نہ کسی جگہ بہت بڑی خلیج ہے جو محض الفاظ سے خواہ وہ کتنے ہی دلکش کیوں نہ ہوں عبور نہیں کی جاسکتی۔ ہمارے لیڈروں کو چاہیے کہ وہ محض خوش فہمی کی بنا پر اس خلیج کے کنارے تک پہنچیں۔''[48] ڈان کے اس اداریے کا مطلب یہ تھا کہ اگرچہ پاکستان مذہبی نعرے کے زور سے مشرق وسطیٰ میں اشتراکیت کے سدباب کے لئے مثبت کردار ادا کرسکتا ہے تاکہ امریکی ارباب اقتدار کوریا میں چنگیز خان کی اولاد سے شرمناک ہزیمت اٹھانے کے بعد مشرق وسطیٰ میں اپنے سامراجی مفادات کے تحفظ کے لئے جو منصوبہ بنا رہے ہیں اس میں شریک ہونے سے پہلے سودابازی کریں۔ مشرق وسطیٰ کے بعض لیڈروں کی رائے بھی ڈان کی اس رائے سے مطابقت رکھتی تھی۔ چنانچہ 29 دسمبر کو مصری سینیٹ کی فارن افیئرز کمیٹی کے رکن جلال حسین نے تنبیہ کی کہ ''اگر عرب ممالک میں معاشی اور سیاسی بے اطمینانی کی ابھرتی ہوئی لہر کو نہ روکا گیا تو اس امر کا خطرہ ہے کہ مشرق وسطیٰ بھی اشتراکی چین کی راہ پر گامزن ہوجائے گا۔ اس نے کہا کہ باوجود اس کے کہ مشرق وسطیٰ میں مذہب اسلام مشرق وسطیٰ کے ممالک میں کمیونزم کے خلاف ایک قدرتی رکاوٹ ہے لیکن اگر عرب ممالک میں سوویت یونین کے زبردست پروپیگنڈے کا توڑ کرنے کے لئے مؤثر اقدامات نہ کئے گئے تو یہ ممالک مغربی جمہوریتوں سے منہ موڑ لیں گے۔ سارے مشرق وسطیٰ میں پروپیگنڈے کا بہت اثر ہو رہا ہے۔ اس علاقے کی رائے عامہ ایشیا میں اشتراکی چین کے ظہور سے بہت متاثر ہوئی ہے۔''[49]

باب: 10

لیاقت کی سامراج نواز خارجہ پالیسی
اور ملک میں اسلام فروشی کا کاروبار

لیاقت کوریا میں امریکی شکست کے بعد برطانوی دولت مشترکہ ممالک کے مشترکہ دفاع کی تجویز کے حق میں ہو گیا تھا

کوریا میں چنگیز خان کی اولاد نے یعنی عوامی جمہوریہ چین کی فوج نے نہایت غیر معمولی بہادری وشجاعت کا جو مظاہرہ کیا تھا اس نے امریکیوں کی طرح انگریزوں پر بھی لرزہ طاری کر دیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے پہلے تو صدر ٹرومین کو قائل کیا کہ وہ جنرل میکارتھر کی تجویز کے مطابق کوریا میں ایٹم بم استعمال کر کے جنگ کا دائرہ وسیع نہ کرے بلکہ ہندوستان کے وزیر اعظم نہرو کی خدمات سے فائدہ اٹھا کر چینیوں سے گفت وشنید کے ذریعے اس جنگ کا خاتمہ کرے۔ اور پھر انہوں نے جنوبی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا کو اشتراکیت سے بچانے کے لئے تدبیریں سوچنا شروع کیں کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ کوریا کی جنگ میں چینیوں کی فتح سے ایشیا کی رائے عامہ پر گہرے اثرات مرتب ہوں گے۔ اس سلسلے میں برطانوی اخبارات میں کئی قیاس آرائیاں ہوئیں۔ ایک یہ تھی کہ برطانوی دولت مشترکہ کے اجتماعی تحفظ کا بندوبست کیا جائے گا۔ دوسری قیاس آرائی یہ تھی کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان مشترکہ دفاع کا انتظام ہو گا اور تیسری یہ تھی کہ بحر الکاہل کے علاقے کے ممالک میں ایک فوجی معاہدہ ہو گا جس میں ہندوستان اور پاکستان بھی شامل ہوں گے۔ پاکستان کا وزیر اعظم لیاقت علی خان پہلی تجویز کے حق میں تھا۔ چنانچہ 17 ر دسمبر 1950ء کو ایسوسی ایٹیڈ پریس سے ایک خصوصی انٹرویو کے دوران جب اس سے پوچھا گیا کہ آیا وہ اپنی تجویز

دولت مشترکہ کی لندن کانفرنس میں پیش کرے گا تو اس کا جواب یہ تھا کہ ''بات چیت آگے بڑھے گی تو ہم سارے معاملات پر بحث کریں گے۔''[1]

19 / دسمبر کو برطانوی پارلیمنٹ کے ایک رکن ایل ڈی اے گیمنز (Gammons) کی لندن ٹائمز میں بذریعہ مراسلہ تجویز یہ تھی کہ بھارت اور پاکستان کا متحدہ محاذ بنایا جائے اور جاپان کو روس کے خلاف جدوجہد میں شریک کیا جائے۔ اسے اندیشہ تھا کہ اگر ایک سال کے اندر ایسا نہ کیا گیا تو پورا ایشیا اشتراکیت کی لپیٹ میں آ جائے گا کیونکہ چینی کمیونسٹوں نے یہ واضح کر دیا ہے کہ کوریا پر گفت وشنید کا جو کچھ بھی نتیجہ برآمد ہوا وہ جلد ہی اپنی توجہ ہانگ کانگ، فرانسیسی ہند چینی، ملایا اور جنوب مشرقی ایشیا کے دوسرے ممالک کی طرف مبذول کریں گے۔ اگر ایشیا کی طرف سے پہلے سے زیادہ عملی تعاون نہ ہوا تو امریکہ اور برطانیہ کی فوجیں بیک وقت بحرالکاہل اور بحراوقیانوس کے معاہدے کو قائم نہیں رکھ سکیں گی۔ مشرق بعید میں بھارت، پاکستان اور جاپان ہی ایسے ممالک ہیں جو اشتراکیت کے خلاف دفاعی جنگ میں کوئی ٹھوس کردار ادا کر سکتے ہیں۔ امید کرنی چاہیے کہ لندن میں دولت مشترکہ وزرائے اعظم کی جو کانفرنس ہونے والی ہے اس میں اس تعطل کو دور کرنے کی کوشش کی جائے گی جو بھارت اور پاکستان کے درمیان کشمیر کے مسئلہ پر پیدا ہو چکا ہے۔''[2] گیمنز نے لندن ٹائمز میں یہ مراسلہ بظاہر لندن میں پاکستانی ہائی کمیشن کی تحریک پر شائع کروایا تھا اور اس کا مقصد پاکستان کے عوام میں یہ تاثر پیدا کرنا تھا کہ وزیراعظم لیاقت علی خان نے 27 / جون 1950ء کو کوریا کی جنگ میں امریکیوں کی غیر مشروط حمایت کا اعلان کرنے کی جو غلطی کی تھی اب وہ اس کا اعادہ نہیں کرے گا بلکہ کوریا میں امریکیوں کی شکست کے نتیجہ میں پیدا شدہ صورتحال کے پیش نظر دولت مشترکہ کانفرنس میں جو دفاعی منصوبہ زیر غور آئے گا وہ اس میں شامل ہونے سے پہلے تنازعہ کشمیر کے تصفیہ پر زور دے گا اور ڈان کے مشورے کے مطابق سودا بازی کرے گا۔

لیکن 27 / دسمبر 1950ء کو سیلون کے وزیراعظم ڈون سٹیفن سینا نائکے (Don Stephen Senanayke) نے برطانوی دولت مشترکہ کے مشترکہ دفاع کی تجویز کے غبارے میں سے ہوا نکال کر لیاقت علی خان کی سودا بازی کی پوزیشن کو بہت کمزور کر دیا۔ اس کا کراچی میں انٹرویو یہ تھا کہ ''یہ تجویز ناقابل عمل ہے۔ کیونکہ اگر ہم دولت مشترکہ کے مشترکہ دفاع

کے رشتے میں منسلک ہو جائیں تو جب دولت مشترکہ کے دور کن ممالک باہمی جنگ میں ملوث ہو جائیں گے تو ہم کیا کریں گے۔''[3]

جہاں تک پاکستان اور ہندوستان کے درمیان مشترکہ دفاع کی تجویز کا سوال تھا اس پر بھی عمل ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا کیونکہ اول اس لئے کہ پاکستان کی رائے عامہ تنازعہ کشمیر کے تصفیہ کے بغیر لیاقت علی خان کو یہ تجویز قبول کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی اور دوئم اس لئے کہ ہندوستان کے سوویت یونین اور چین کے ساتھ دوستانہ مراسم روز بروز گہرے ہو رہے تھے اور اس کا وزیر اعظم جواہر لال نہرو اس بنا پر ایک عالمی لیڈر کی حیثیت اختیار کر رہا تھا۔ اب وہ پاکستان کے ساتھ سوویت مخالف بلاک بنانے پر اپنے آپ کو اینگلو۔ امریکی بلاک کے پٹھو کی پوزیشن میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ اسی طرح بحرالکاہل کے علاقے کے ممالک کے درمیان چین مخالف فوجی گٹھ جوڑ کی تجویز پر عملدرآمد بھی بعید از امکان تھا۔ فلپائن کے صدر نے اس مقصد کے لئے 1950ء میں جو کانفرنس بلائی تھی وہ ہندوستان کی مخالفت کی وجہ سے ناکام رہی تھی۔

سیلون کے وزیر اعظم کا متذکرہ انٹرویو پاکستان ٹائمز کے 28/دسمبر کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ 29/دسمبر کو اس اخبار نے اجتماعی تحفظ کے بارے میں اس مغربی تصور پر نکتہ چینی کی کہ کسی ملک کی مخصوص حکومت کو برسر اقتدار رکھنے کے لئے جو مسلح کاروائی کی جائے گی وہ بھی دفاعی کاروائی ہو گی۔ اخبار نے لکھا کہ ''کوئی دیانتدار جمہوریت پسند شخص قومی یا بین الاقوامی تصادموں کے بارے میں مسخ کردہ اس نظریے کو قبول نہیں کر سکتا کیونکہ عوام کے حق خود ارادیت یا جمہوریت کی اصطلاحیں بے معنی ہو کر رہ جائیں گی۔ اگر پاکستان نے دفاع کے بارے میں اس اینگلو۔ امریکی تصور کو مان لیا تو پھر ہمارے سپاہی ملایا کے عوام سے لڑیں گے تا کہ وہاں کے ربڑ اور ٹین سے برطانیہ کی خوشحالی قائم رہے، مصریوں سے لڑیں گے تا کہ نہر سویز کا مناسب دفاع ہو سکے، افریقی عوام سے لڑیں گے تا کہ وہاں کی برطانوی ایمپائر میں کوئی گڑبڑ نہ ہونے پائے۔ تاہم پاکستان کے عوام اس قسم کے کسی انتظام کو قبول نہیں کریں گے خواہ اس کی کتنی ہی اچھی طرح پردہ پوشی کیوں نہ کی گئی ہو۔ ہمیں امید ہے کہ مسٹر لیاقت علی خان دولت مشترکہ کی کانفرنس میں یہ بات بالکل واضح کر دیں گے...... اگر خدانخواستہ پاکستانی نمائندے بات چیت کے دوران ایمپائر کے دفاع کی کسی سکیم پر رضامند ہو گئے تو نہ صرف ان کے اس فیصلے کی اپنے ملک میں کوئی اخلاقی حمایت نہیں

ہوگی بلکہ اس سے پاکستان اوراس کے عوام کے لئے انتہائی تباہ کن نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔"[4]

جب پاکستان ٹائمز نے یہ اداریہ لکھا تھا اس وقت پاکستان کے سیاسی واخباری حلقوں میں یہ مطالبہ زور شور سے ہو رہا تھا کہ جنوری کے دوسرے ہفتے میں لندن میں دولت مشترکہ وزرائے اعظم کی جو کانفرنس ہورہی ہے اگر اس کے ایجنڈے میں تنازعہ کشمیر کا مسئلہ شامل نہ کیا جائے تو وزیراعظم لیاقت علی خان کو اس کانفرنس میں شریک نہیں ہونا چاہیے۔ پنجاب میں یہ مطالبہ اتنا زوردار تھا کہ لیاقت علی خان نے دسمبر کے اواخر میں اپنا لندن جانے کا پروگرام ملتوی کردیا اور حکومت برطانیہ سے بالاصرار مطالبہ کیا کہ تنازعہ کشمیر کو کانفرنس کے ایجنڈے میں شامل کیا جائے۔ لیاقت علی خان کی جانب سے یہ موقف اختیار کرنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ لیاقت علی خان کی کوریا کے بارے میں ناعاقبت اندیشانہ پالیسی کی وجہ سے اندرون ملک اس کی سیاسی ساکھ کو جو زبردست نقصان پہنچا تھا وہ اس کا ازالہ کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے کہ پنجاب میں دو ایک ماہ میں عام انتخابات ہونے والے تھے اوران انتخابات سے قبل اس کے اپنے، اس کی حکومت اور اس کی مسلم لیگ کے سیاسی وقار کی بحالی بہت ضروری تھی۔ حسین شہید سہروردی، نواب افتخار حسین خان آف ممدوٹ اور مخالف جماعتوں کے دوسرے سیاسی لیڈر پنجاب میں جگہ جگہ جلسے کر کے یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ پاکستان کو دولت مشترکہ سے الگ ہو جانا چاہیے کیونکہ یہ تنظیم تنازعہ کشمیر کے تصفیہ کے لئے پاکستان کی امداد کرنے میں ناکام رہی ہے۔ 31 ردسمبر کو نواب ممدوٹ کا مشورہ یہ تھا کہ "اگر کشمیر کا مسئلہ لندن کانفرنس کے ایجنڈے میں شامل نہ کیا جائے تو مسٹر لیاقت علی خان کانفرنس میں شرکت سے انکار کردیں...... لیاقت علی نے اپنا سفر لندن عارضی طور پر ملتوی کر دیا ہے۔ میں اس نیم دلانہ اقدام پر انہیں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔"[5]

پاکستانی عوام کا مطالبہ کہ تنازعہ کشمیر دولت مشترکہ کانفرنس کے ایجنڈے میں شامل کیا جائے ورنہ پاکستان اس سے الگ ہوجائے گا

یکم جنوری 1951ء کو لاہور کے مختلف اداروں اور افراد کی طرف سے پاکستان کے وزیراعظم کو تار روانہ کئے گئے کہ وہ اس وقت تک لندن میں ہونے والی دولت مشترکہ کی کانفرنس میں شرکت نہ کریں جب تک اس کانفرنس میں مسئلہ کشمیر پر بحث کرنے کا وعدہ نہ کرلیا جائے۔[6]

3/جنوری کو پشاور میں حسین شہید سہروردی کا کہنا یہ تھا کہ ''پاکستان کو دولت مشترکہ سے اپنے تعلقات منقطع کر لینے چاہئیں۔ اقوام متحدہ اور دولت مشترکہ مسئلہ کشمیر کے بارے میں سرد مہری کا ثبوت دے رہے ہیں۔''[7] 4/جنوری کو مظفر آباد کے ایک جلسہ میں کشمیر مسلم کانفرنس جنگ بند کرنے کے معاہدے سے سبکدوش ہوگئی کیونکہ کانفرنس کی رائے یہ تھی کہ ''کشمیر کو آزاد کرانے کا وہی ایک راستہ ہے جسے دو سال پیشتر ترک کر دیا گیا تھا۔ اقوام متحدہ مسئلہ کشمیر کو حل کرنے میں ناکام ہو چکی ہے۔ پاکستان کو دولت مشترکہ کے متعلق اپنی پالیسی پر نظر ثانی کرنی چاہیے...... کشمیر کی آزادی کے لئے از سر نو جہاد شروع کر دینا چاہیے۔''[8] 5/جنوری کو مشرقی بنگال مسلم لیگ کے صدر مولانا اکرم خان کا بیان یہ تھا کہ ''اگر دولت مشترکہ رکن ممالک کے تنازعات بھی نہیں نپٹا سکتی تو اسے ختم کر دینا ہی بہتر ہے...... پاکستانی عوام اینگلو۔ امریکن فریب کاریوں سے تنگ آ چکے ہیں۔''[9] اسی دن نوائے وقت نے ایک اداریہ لکھا جس میں مسٹر لیاقت علی خان کو یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ ملک کی رائے عامہ کا احترام کریں اور وہی قدم اٹھائیں جس کا مطالبہ قوم ان سے کر رہی ہے۔ ورنہ وزرائے اعظم کی کانفرنس میں شرکت سے انکار، مگر اس کے باوجود کامن ویلتھ سے وابستگی اور برطانیہ کی خیمہ برداری کوئی معنی ہی نہیں رکھتی۔ اسی دن نوائے وقت نے ایک ادارتی نوٹ بھی لکھا جس میں یہ رائے ظاہر کی گئی تھی کہ ''مسٹر لیاقت علی خان نے مسلم لیگ سے جو سلوک کیا ہے اس نے مسلم لیگ کی رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا دی ہے۔ اگر مسلم لیگ ہی اس ملک کی نمائندہ سیاسی جماعت ہے اور وزارت مسلم لیگ ہی کی ہے تو وزیر اعظم نے اتنے اہم مسئلہ (کامن ویلتھ وزرائے اعظم کانفرنس میں شرکت) کو مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے سامنے کیوں نہیں رکھا؟...... عام لوگ یہ کہتے ہیں کہ مسلم لیگ وزارت کی لونڈی بن گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ لیگ کی پوزیشن لونڈی سے بھی بدتر ہے۔ جس زمانے میں لونڈیاں رکھنے کا رواج تھا امراء لونڈیوں سے بھی مشورہ کر لیا کرتے تھے۔ مسٹر لیاقت علی خان نے تو مسلم لیگ کو اس قابل بھی نہ سمجھا۔'' اور اسی دن نوائے وقت کے طنزیہ کالم میں بھی اسی مسئلہ پر زہر افشانی کی گئی تھی اور لیاقت علی خان نے دولت مشترکہ میں شرکت کے لئے لندن جانے کا پروگرام ملتوی کرنے کا جو فیصلہ کیا تھا اس سے یہ مطلب نکالا گیا تھا کہ ''خان لیاقت علی خان صرف پنجاب کے الیکشن کی وجہ سے تذبذب میں پڑے ہوئے ہیں کہ لندن جائیں یا نہ جائیں...... ووٹوں نے انہیں مشکل میں ڈال دیا ہے۔ اگر الیکشن قریب نہ ہوتے تو کشمیر کے مسئلہ کو دولت مشترکہ

کے وزرائے اعظم کے اجلاس کے ایجنڈے میں شامل کرانے کی ضرورت محسوس نہ کرتے؟''[10]

6 / جنوری 1951ء کو نوائے وقت نے اپنے ایک اور اداریے میں لیاقت علی خان کی برطانوی دولت مشترکہ سے متعلقہ پالیسی پر نکتہ چینی کی اور یہ رائے ظاہر کی کہ ''برطانیہ کا مقصد یہ ہے کہ دولت مشترکہ کے مشترکہ دفاع کی کوئی سکیم بن جائے اور چونکہ برطانیہ کی اپنی فوجیں یورپ میں پھنسی ہوئی ہیں، پاکستان اور ہندوستان کی فوجیں مشرق بعید اور مشرق وسطیٰ میں ''کامن ویلتھ کے زیر اثر علاقوں'' یعنی دراصل برطانیہ کے زیر اثر علاقوں کی حفاظت اپنے ذمہ لیں۔ ہماری دیانت دارانہ رائے یہ ہے کہ کشمیر کا مسئلہ حل ہو جانے کے باوجود پاکستان کو مشترکہ دفاع کی کوئی سکیم منظور نہیں کرنی چاہیے۔ نہ پاکستان کے وزیراعظم کو یہ وعدہ کرنا چاہیے کہ مادر پاکستان کے بیٹے ملایا کے جنگلوں اور مصر و عراق کے صحراؤں میں برطانوی مفاد کی حفاظت کے لئے اپنا خون بہائیں۔''[11] لیکن جس دن یہ اداریہ لکھا گیا اس دن لیاقت علی خان کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن روانہ ہو گیا۔ حالانکہ کانفرنس کے ایجنڈے میں تنازعہ کشمیر کا مسئلہ شامل نہیں کیا گیا تھا البتہ امریکہ کے وزارت خارجہ کے پریس آفیسر نے رائے ظاہر کی تھی کہ امریکہ کو مسئلہ کشمیر کے تصفیہ میں بہت دلچسپی ہے۔ ظاہر ہے کہ دولت مشترکہ میٹنگ میں اس مسئلہ پر بحث کا موقع مہیا ہوگا۔ بیگم لیاقت علی خان اور اس کے دو بیٹے اشرف اور اکبر 3 / جنوری کو ہی لندن پہنچ چکے ہوئے تھے۔

نوائے وقت لیاقت علی خان کی اس قلابازی پر بہت برہم ہوا۔ اس نے پہلے تو اپنے 9 / جنوری کے شمارے میں ڈان، سول اینڈ ملٹری گزٹ اور سندھ آبزرور کے اداریے نقل کئے جن میں یہ رائے ظاہر کی گئی تھی کہ دولت مشترکہ کی کانفرنس سے کوئی خاص امید نہیں کی جاسکتی اور پھر اس کے اگلے دن اس نے اپنے ایک اداریے میں پہلے تو لیاقت علی خان کی جانب سے کوئے ملامت کے طواف اور اس کے پندار کے صنم کدہ کی ویرانی پر نکتہ چینی کی اور پھر اسے مشورہ دیا کہ وہ دولت مشترکہ کانفرنس میں پاکستان اور ہندوستان کے مشترکہ دفاع کی تجویز منظور نہ کرے۔ اس کی رائے یہ تھی کہ ''اس وقت تو کشمیر کی الجھن بھی ہے۔ اگر یہ الجھن نہ ہوتی تو بھی ہندوستان اور پاکستان کے مشترکہ دفاع کی تجویز سرے سے ہی قابل غور نہیں۔ دفاع مشترک ہوگا تو رسل و رسائل بھی لازمی طور پر مشترکہ ہوں گے اور خارجہ پالیسی، دفاع اور رسل و رسائل کے امور مشترکہ ہیں تو آزادی و خودمختاری کیا ہوئی؟'' اداریے میں مزید رائے ظاہر کی گئی تھی کہ ''اس وقت پاکستان کی خارجہ

پالیسی بے جان اور بے معنی ہے۔ اس بے جان اور بے معنی خارجہ پالیسی نے پاکستان کو بین الاقوامی دنیا میں ایک یتیم بنا دیا ہے۔ اس وقت کوئی طاقت پاکستان کی دوست نہیں، نہ کوئی طاقت پاکستان سے مرعوب ہے۔ جن کے ہم دوست ہیں وہ ہمیں بستۂ فتراک سمجھتے ہیں اور جن سے ہم دور دور ہیں (محض اول الذکر دوستوں کی وجہ سے) وہ ہمیں برطانیہ اور امریکہ کے خیمہ بردار گردانتے ہیں۔ ساڑھے تین سال سے پاکستان اپنی موجودہ خارجہ پالیسی پر کاربند ہے اور اس کا نتیجہ سب کے سامنے ہے۔ اب وقت ہے کہ پاکستان اپنی خارجہ پالیسی پر نظرثانی کرے اور لندن کانفرنس میں وزیراعظم کا موقف اسی نظرثانی شدہ پالیسی پر مبنی ہونا چاہیے۔ اگر پاکستان کے کارفرماؤں نے اس وقت بھی پالیسی پر نظرثانی نہ کی تو ان کی یہ غلطی پاکستان کی پوزیشن کو ہمیشہ کے لئے نہایت گھٹیا اور ناقابل رشک بنا دے گی۔''[12]

کوریا میں شکست کے بعد امریکہ کی مشرق وسطیٰ میں دلچسپی میں اضافہ اور ملاؤں کے طرف سے پان اسلام ازم کے پروپیگنڈے میں اضافہ

لیاقت علی خان کی لندن کے لئے روانگی سے چار پانچ یوم قبل کراچی میں تعلیمات اسلامیہ بورڈ کے سربراہ سید سلیمان ندوی کی زیر صدارت جمعیت العلمائے اسلام کی ایک تقریب ہوئی تھی جس میں مصری سفیر عبدالوہاب عزام پاشا نے یہ توقع ظاہر کی تھی کہ ''تمام عالم اسلام جلد ہی ایک مضبوط وحدت کی شکل میں متحد ہو جائے گا۔'' اس سے پہلے اس تقریب میں جمعیت العلمائے اسلام کراچی کے صدر پروفیسر سید یحییٰ ندوی نے ''پان اسلام ازم'' کی ضرورت کا ذکر کیا تھا اور اس سلسلے میں یہ تجاویز پیش کی تھیں۔ (1) عربی کو تمام اسلامی ممالک میں سرکاری زبان کی حیثیت دی جائے۔ (2) یا تو اقوام متحدہ کے اندر ہی ایک آزاد اسلامی بلاک قائم کیا جائے یا پھر ایک علیحدہ بین الاسلامی ادارہ کی تشکیل کی جائے۔ (3) ایک علیحدہ بین الاسلامی کرنسی کا قیام عمل میں لایا جائے جو اسلامی ممالک کے مابین تبادلہ کا ذریعہ بن سکے۔ (4) ایک اسلامی دستور وضع کیا جائے جس پر تمام اسلامی حکومتوں کی بنیاد ہو۔ اور (5) اسلامی ممالک کے مابین مال واسباب اور افراد کی آمد و رفت کو ہر ممکن سہولت اور آزادی دی جائے۔ پروفیسر یحییٰ کی اس تقریر کے بعد علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنی تقریر میں اس گفتگو کا ذکر کیا تھا جو انہوں نے 1936ء میں مرحوم

سعد زاغلول پاشا کے ساتھ کی تھی۔ اور جس میں اس نے پیش گوئی کی تھی کہ تمام اسلامی ممالک ایک ایک کر کے اپنی جنگ آزادی میں کامیاب ہو جائیں گے اور ایک مضبوط اسلامی بلاک کی تشکیل کریں گے۔ ندوی نے مزید کہا تھا کہ ''پاکستان اور انڈونیشیا کے حصول آزادی کے ساتھ ساتھ اریٹیریا اور مراکش بھی کامیابی سے آزادی کی جدوجہد میں مصروف ہیں اور ہر جگہ بیداری عام ہوتی جارہی ہے اور وہ دن دور نہیں جب سعد زاغلول پاشا کی پیش گوئی حرف بحرف پوری ہو جائے گی۔''[13]

پان اسلام ازم کے پروپیگنڈا کے لئے منعقدہ اس تقریب کے پس منظر میں گزشتہ چند دن کے دوران لندن سے موصول شدہ یہ خبریں تھیں کہ دولت مشترکہ کانفرنس میں مشرق وسطیٰ کے دفاع کا مسئلہ بھی زیر بحث آئے گا۔ جب اپریل 1949ء میں دولت مشترکہ کانفرنس میں مشرق وسطیٰ کے دفاع کے مسئلہ پر غور ہوا تھا تو اس سے پہلے پاکستان میں نہ صرف قرارداد مقاصد منظور ہوئی تھی بلکہ پان اسلام ازم کا خوب پروپیگنڈا ہوا تھا اور پھر اس کانفرنس کے بعد وزیراعظم لیاقت علی، وزیر خارجہ ظفر اللہ خان، وزیر خزانہ غلام محمد، پاکستان مسلم لیگ کے صدر چودھری خلیق الزماں اور جمعیت العلمائے اسلام کے صدر مولانا شبیر احمد عثمانی سمیت دوسرے بے شمار سیاسی ملاؤں اور اخبارات نے قومی اور بین الاقوامی سطح پر اتحاد اسلامی، اسلامی بلاک، اسلامی مشترکہ دفاع اور پان اسلام ازم کی خوب تبلیغ کی تھی۔ اب جب 6/جنوری 1951ء کو لیاقت علی خان دولت مشترکہ کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے کراچی سے روانہ ہوا تو اسی دن اخبارات میں خبر شائع ہوئی کہ ''مؤتمر عالم اسلامی کا پہلا سالانہ اجلاس اگلے مہینے منعقد ہوگا۔ اس اجلاس کے لئے مسلم دنیا کے مستقبل سے متعلقہ مسائل پر مشتمل جو بھاری ایجنڈا مرتب کیا گیا ہے اس کی بارہ مدات ہیں۔ (1) بین الاقوامی اسلامی زبان۔ (2) عربی رسم الخط کا رواج۔ (3) پروفیسروں اور طلبا کا تبادلہ۔ (4) مواصلات کی سہولتوں میں اضافہ۔ (5) بین الاقوامی شبان المسلمین کا قیام۔ (6) ایوان تجارت وصنعت۔ (7) ہلال احمر۔ (8) اسلامی خبر رساں ایجنسی۔ (9) مسلمان اخبار نویسوں کی بین الاقوامی یونین کا قیام۔ (10) اسلامی معاشرتی زندگی۔ (11) مؤتمر سیکرٹریٹ۔ (12) اقوام متحدہ میں مؤتمر کے نمائندے کا تقرر۔''[14]

پاکستانی اخبارات کے دفاتر میں یہ خبر بھی موصول ہوئی کہ امریکہ کی ریاست کیلیفورنیا

کے اخبار سان فرانسسکو کرانیکل نے اپنے ایک اداریے میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ چونکہ مصری عوام مسلمان ہیں اس لئے ان کے اشتراکیت کے ساتھ کوئی مشترک مفادات نہیں ہو سکتے۔ اس اخبار نے اس ادارتی رائے کا اظہار مصری پارلیمنٹ کے ایک رکن کے اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے کیا تھا کہ ''مصر کو چاہیے کہ وہ اشتراکی ملکوں سے معاہدہ کرے اور اس کے ذریعہ دباؤ ڈال کر مغربی ملکوں سے مزید مراعات حاصل کرے۔'' ''شیطان کے ساتھ رقص نہیں ہو سکتا'' کے زیر عنوان سان فرانسسکو کرانیکل نے مزید لکھا ہے کہ مصری رکن کی اس تجویز کا مطلب یہ ہے کہ مصر کو شیطان کی مدد سے ''جنت'' حاصل ہو سکتی ہے۔ یعنی اس کی منشا یہ ہے کہ کوئی شخص یہ کہے کہ وہ تھوڑی سی افیون استعمال کرے گا حالانکہ افیون کے استعمال میں اعتدال برقرار رکھنا ناممکنات میں سے ہے۔ اس طرح کوئی شخص بین الاقوامی اشتراکی سازش میں بھی تھوڑا سا حصہ نہیں لے سکتا۔ یہ بات یقینی ہے کہ مصر اس رکن پارلیمنٹ کے مشورے پر عمل نہیں کرے گا خواہ مصریوں کے جذبات برطانیہ کے خلاف کس قدر ہی برانگیختہ کیوں نہ ہوں۔ مصری بہر حال مسلمان ہیں جن کے اشتراکیت کے ساتھ کوئی مشترکہ مفادات نہیں ہو سکتے۔''[15] امریکی اخبار کے اس اداریے کا مطلب یہ تھا کہ کوریا میں چینیوں کے ہاتھوں مار کھانے کے بعد حکومت امریکہ کو بھی مشرق وسطیٰ کے دفاع میں اتنی ہی دلچسپی تھی جتنی کہ حکومت برطانیہ کو تھی اور یہ کہ امریکہ بھی برطانیہ کی طرح مشرق وسطیٰ میں سوویت یونین کے خلاف اسلام کو بطور سیاسی حربہ استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

ایسی صورتحال میں پاکستان مسلم لیگ کا سابق صدر چودھری خلیق الزماں خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔ چنانچہ 9 رجنوری کو اس نے ایسوسی ایٹیڈ پریس آف پاکستان کے نامہ نگار کو بلا کر بتایا کہ ''مختلف مسلم ممالک کے جن لیڈروں نے مسلم پیپلز ورلڈ آرگنائزیشن کے قیام کی تحریک کی حمایت کی ہے ان کا قاہرہ میں 23۔24 رمارچ کو اجلاس ہوگا۔ یہ اجلاس دراصل ماہ رواں کے آخری ہفتے میں ہونا تھا لیکن بعض لیڈروں نے اپنی دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے اسے دو ماہ کے لئے ملتوی کر دینے کی درخواست کی ہے۔ چودھری خلیق الزماں نے اس التوا پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ اگر یہ اجلاس اب ہو جاتا تو اس میں نہ صرف دنیا کی موجودہ دھماکہ خیز صورتحال زیر غور آتی بلکہ کشمیر اور مصر سے غیر ملکی افواج کے انخلا کے مسائل پر بھی بحث ہوتی۔[16] گویا چودھری خلیق الزماں کو افسوس تھا کہ اسلامی اتحاد کا مسئلہ ایسے موقع پر زیر بحث نہیں آیا جبکہ برطانیہ اور امریکہ دونوں ہی

مشرق وسطیٰ کے دفاع کا کوئی نہ کوئی بندوبست کرنے کے لئے بے تاب ہیں۔

لیاقت کا دورہ لندن اور مشرق وسطیٰ میں دولت مشترکہ ممالک کی افواج بھیجنے کی تجویز

6 رجنوری کو لندن کے مبصرین کا خیال یہ تھا کہ ''برطانوی وزیر اعظم ایٹلی دولت مشترکہ کانفرنس کے دوران آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے وزرئے اعظم سے کہے گا کہ ان کی فوجیں مشرق بعید اور مشرق وسطیٰ میں برطانیہ کی فوجی ذمہ داریوں میں شریک ہوں چونکہ برطانیہ معاہدۂ اوقیانوس کے تحت یورپ میں بہت ملوث ہو چکا ہے اس لئے دولت مشترکہ اقوام کے معاہدے کا خیر مقدم کرے گی۔ مشرق وسطیٰ میں دولت مشترکہ کی فوجیں بھیجنے کی تجویز اب اس مرحلہ پر ہے کہ جو ملایا اور ہانگ کانگ میں فوجیں بھیجنے کی تجویز کے مرحلہ سے آگے ہے۔''[17] اور امریکی نائب وزیر خارجہ میگ گھی (Mcghee) کا کہنا یہ تھا کہ ''مشترکہ مفاد کے پیش نظر عرب ممالک کو مغرب کے کیمپ کی لامحالہ حمایت کرنی ہوگی...... مشرق وسطیٰ بہت ہی اہم علاقہ ہے اور مستقبل کی جنگ میں ایران، عراق، کویت اور سعودی عرب کے تیل کا بھی نمایاں حصہ ہوگا۔ تیل کے چشموں کی حفاظت کا بار تنہا برطانیہ پر نہیں ہوگا۔ امریکہ بھی ان کے دفاع میں پوری طرح شرکت کرے گا۔''[18] 8 رجنوری کو لندن سے اطلاع یہ تھی کہ ''برطانیہ کے وزیر اعظم ایٹلی نے مشرق وسطیٰ اور مشرقی بحیرہ روم کے علاقے کے دفاع کے مسئلہ پر جنوبی افریقہ، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے وزرائے اعظم سے غیر رسمی بات چیت کی ہے۔ چونکہ برطانیہ پر یورپ اور مشرق بعید کے دفاع کی بھاری ذمہ داریاں عائد ہیں اس لئے جنوبی افریقہ، آسٹریلیا، اور نیوزی لینڈ کو اس علاقے میں زیادہ ذمہ داریاں سنبھالنی ہوں گی۔ پاکستان، بھارت اور سیلون اس بات چیت میں شریک نہیں ہوئے۔ لیاقت علی نے آج صبح ایٹلی سے نجی ملاقات کی تھی لیکن وہ دفاعی بات چیت شروع ہونے سے 20 منٹ پہلے 10 ڈاؤننگ سٹریٹ سے چلا گیا تھا۔''[19]

11 رجنوری کو پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خان نے برطانیہ کے وزیر خارجہ ارنسٹ بیون سے ملاقات کی جس کے دوران معاشی ترقی اور مشرق وسطیٰ کے دفاع کا مسئلہ زیر بحث آیا۔ ''بیون نے لیاقت علی خان کو بتایا کہ اینگلو۔مصری تنازعہ کے تصفیہ کے لئے گزشتہ

دسمبر کو مصر کے وزیر خارجہ صلاح الدین سے کہاں تک بات چیت ہوئی تھی۔ لیاقت علی خان کی بیون سے اس ملاقات کے بعد مصر کے سفیر نے ان سے ملاقات کی۔"[20] لاہور کے روزنامہ امروز نے اس خبر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ "حال ہی میں برطانوی اور امریکی اخباروں نے مشرق وسطٰی کے "دفاع" کا بہت تذکرہ کیا ہے۔ وزیر اعظم ایٹلی، صدر ٹرومین، وزیر خارجہ بیون اور سیکرٹری آف اسٹیٹ ایچی سن نے بھی مشرق وسطٰی کے "دفاع" سے ایسے تعلق کا اظہار کیا ہے گویا یہ ان کی ذمہ داری ہے...... مشرق وسطٰی کے ملکوں کی حکومتیں روس کے "خطرے" کا اتنا ذکر نہیں کرتیں جتنا کہ امریکہ اور برطانیہ کے حکمران۔ اس کے بالکل برعکس مراکش سے آواز اٹھتی ہے کہ ہمیں فرانسیسی استعمار اور ہسپانوی فسطائیت سے نجات دلاؤ۔ مصر سے شور اٹھتا ہے کہ گورا فوج ہمارے سینے پر مونگ دل رہی ہے اور سوڈان ہم سے چھینا جا رہا ہے، اس عذاب سے نجات دلاؤ۔ ارض مقدس پر امریکی نژاد یہودیوں نے قبضہ کر رکھا ہے۔ لیبیا میں برطانیہ اور امریکہ مسلط ہیں۔ یمن ہر دوسرے تیسرے روز برطانوی سازش کا رونا روتا ہے غرضیکہ سارے مشرق وسطٰی میں کہرام مچا ہوا ہے کہ مغربی طاقتوں نے ہماری آزادی سلب کر لی ہے۔ ایک عام سمجھ بوجھ کا آدمی صرف خبر رساں ایجنسیوں کی اطلاعات اور مغربی اخبارات کے مطالعہ کی بنا پر یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ مشرق وسطٰی کو "خطرہ" ضرور لاحق ہے لیکن یہ خطرہ سوویت روس کی طرف سے نہیں مغربی طاقتوں کی طرف سے ہے۔ مشرق وسطٰی کے دفاع کا سوال بعد میں آئے گا۔ فی الوقت تو ان کی آزادی کا مسئلہ درپیش ہے جو مغربی طاقتوں نے غصب کر رکھی ہے...... اور جن کے سیلانی تاجر دن دگنی رات چوگنی رفتار سے مشرق وسطٰی کے عوام کا خون چوس رہے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ سوویت روس کا "خطرہ" محض ایک بہانہ ہے۔ مغربی سامراجیوں کو مشرق وسطٰی کے عوام سے خطرہ ہے۔ وہ ڈرتے ہیں کہ کہیں مشرق وسطٰی کے تیل کے چشمے ان کے ہاتھوں سے نہ نکل جائیں۔ کہیں یہ تجارتی منڈیاں ان کی دسترس سے باہر نہ ہو جائیں یعنی مشرق وسطٰی کے ان بیش بہا قدرتی وسائل پر کہیں مشرق وسطٰی کے عوام کا قبضہ نہ ہو جائے اور اسی لئے انہوں نے جگہ جگہ فوجی ڈیرے ڈال دیئے ہیں۔"[21]

12 رجنوری کو قاہرہ سے یہ خبر آئی کہ "اس وقت مصر اور اسرائیل میں مفاہمت کرانے کی جو کوشش کی جا رہی ہے تل ابیب اور قاہرہ میں اس کا بالکل مختلف ردعمل ہوا ہے۔ قاہرہ کے اخبار "الاہرام" نے ایک مقالہ میں اسرائیل سے صلح کرنے سے متعلق ہر کوشش کی مذمت کی ہے اور

اسرائیل کے وزیر اعظم بن گورین (Ben Goriun) نے اس پر اصرار کیا ہے کہ ان کے ملک کو مشرق یا مغرب سے ''منسلک نہ ہونے'' کی پالیسی پر عمل کرنا چاہیے اور ہر سمت سے اقتدار اور غلبہ کی کوشش کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ الاہرام نے بیان کیا ہے کہ لندن کے حلقوں کا خیال ہے کہ مصر سے برطانوی فوجوں کے انخلا کا واحد حل یہ ہے کہ مشرقی بحیرہ روم کے علاقے میں ایک معاہدۂ امن کر لیا جائے۔ ایسا معاہدہ ناممکن ہے کیونکہ اس وقت عرب ممالک کی اسرائیل سے جنگ ہے اور وہ کسی ایسے معاہدہ میں شرکت کرنے سے انکار کر دیں گے جس میں اسرائیل شامل ہو۔''[22] 13 رجنوری کو سوویت فوج کے اخبار ''ریڈ سٹار'' نے لکھا کہ ''امریکہ بحیرہ روم کے علاقے کے ممالک کا ایک بلاک بنانے کی کوشش کر رہا ہے جس میں اسرائیل، یونان اور ترکی کے علاوہ عرب ممالک بھی شامل ہوں گے۔ اس مقصد کے لئے عرب لیگ کے سیکرٹری جنرل عزام پاشا کی وساطت سے دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔ اسرائیل کے فوجی لیڈروں میں سے ایک لیڈر کرنل موشے دایان (Moshe Dayan) نے گزشتہ دسمبر کے اوائل میں یونان اور ترکی کے فوجی افسروں سے ملاقات کی تھی تا کہ ان تینوں کے درمیان کوئی فوجی گٹھ جوڑ ہو جائے۔''[23] 15 رجنوری کو مصر کے زیریں علاقے کے شہر منصورہ میں طلبا نے مظاہرہ کر کے برطانوی فوجوں کے انخلا اور وادئ نیل کے اتحاد کا مطالبہ کیا۔ اس مظاہرے میں 60 طلبا اور 20 پولیس کے سپاہی زخمی ہوئے۔

لیاقت دولت مشترکہ کانفرنس میں ''جیسا گیا تھا ویسا ہی چل پھر کے آ گیا'' جبکہ نہرو نے عالمی سفارت کاری میں اہمیت حاصل کی

18 رجنوری 1950ء کو لیاقت علی خان لندن سے واپس آیا تو نوائے وقت نے ''جیسا گیا تھا ویسا ہی چل پھر کے آ گیا'' کے زیر عنوان ایک بہت تند و تیز اداریہ شائع کیا۔ جس میں لکھا تھا کہ ''ہمیں گستاخی کے لئے معاف فرمایا جائے مگر اس تلخ اور افسوسناک حقیقت کا اظہار کئے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں کہ ہمارے محبوب اور لائق وزیر اعظم کو کامن ویلتھ کے ناخداؤں نے بدھو بنایا...... مسٹر لیاقت علی خان کی لیاقت کے بارے میں ہمیں جو حسن ظن تھا اس واقعہ کے بعد اسے بڑا صدمہ پہنچا ہے...... اب لندن سے خالی ہاتھ واپسی پر بھی وہ صحیح قدم اٹھانے میں تامل کریں تو یہ ان کی عاقبت نااندیشی کی انتہا ہو گی۔ صحیح قدم صرف یہی نہیں کہ مسٹر لیاقت علی بلا تاخیر یہ اعلان کر

دیں کہ پاکستان کامن ویلتھ کانفرنس کے کسی فیصلہ کا پابند نہیں ہوگا اور آئندہ جنگ میں کسی ذمہ داری کو قبول نہیں کرے گا بلکہ صحیح قدم یہ ہے کہ کامن ویلتھ کو ساڑھے تین سال آزما چکنے کے بعد پاکستان اس سے قطع تعلق کا اعلان کردے۔''[24] نوائے وقت کے اس اداریے کا پس منظر یہ تھا کہ لیاقت علی خان کے لندن میں قیام کے دوران دولت مشترکہ کے سات وزرائے اعظم نے تنازعہ کشمیر کے تصفیہ کے لئے تین مرتبہ غیر رسمی بات چیت کی تھی لیکن ہندوستان کے وزیراعظم جواہر لال نہرو کے غیر مصالحانہ رویے کے باعث یہ بات چیت نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئی تھی۔ لیاقت علی خان کے بقول اس بات چیت میں تین تجاویز زیر غور آئی تھیں۔ (1) استصواب کرانے کے لئے دولت مشترکہ ممالک کی فوجیں کشمیر میں متعین کی جائیں۔ (2) پاکستان اور ہندوستان کی فوجیں مشترکہ طور پر استصواب کی نگرانی کریں۔ (3) ناظم استصواب کو اختیار دیا جائے کہ وہ مقامی لوگوں کی نئی فوج تیار کر کے اپنا کام مکمل کرے۔ لیاقت علی خان کے لئے یہ تینوں ہی تجاویز قابل قبول تھیں لیکن جواہر لال نہرو نے انہیں مسترد کر دیا۔ اس طرح کشمیر کا تنازعہ وہیں رہا جہاں کہ لیاقت علی خان کی 6 رجنوری کو لندن کے لئے روانگی سے پہلے تھا۔ اور نوائے وقت کے بقول بدھو میاں ''جیسا گیا تھا ویسا ہی چل پھر کے آ گیا۔''

لیاقت علی خان کی اس سلسلے میں ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ دولت مشترکہ کانفرنس میں مشرق وسطیٰ کے دفاع کے لئے جو منصوبہ زیر غور آیا تھا اس میں پاکستان کو شامل نہیں کیا گیا تھا کہ مشرق وسطیٰ میں جو فوجی گٹھ جوڑ ہوگا اس میں ترکی، ایران، یونان، اسرائیل اور مصر وغیرہ شامل ہوں گے۔ لہٰذا بقول لیاقت علی خان اس کے ساتھ دولت مشترکہ کے کسی رکن ملک نے دفاعی مسئلہ پر بات چیت نہیں کی تھی اور اس نے اس معاملہ کے بارے میں کسی سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ مشرق وسطیٰ کے بارے میں باہمی تبادلہ خیالات ہوا تھا لیکن کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ دولت مشترکہ کانفرنس محض تبادلہ خیالات اور صورتحال کا جائزہ لینے کے لئے منعقد ہوتی ہے۔ اس میں کسی معاملہ پر کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ انگلستان اور مصر کے باہمی تعلقات کا سوال زیر بحث آیا تھا۔ میں ان دونوں ملکوں کے درمیان بیچ بچاؤ کرانے کا کوئی مشن نہیں رکھتا۔[25] گویا اس دولت مشترکہ کانفرنس کے دوران نہ تو پاکستان کو مشرق وسطیٰ کے فوجی گٹھ جوڑ میں شامل کرنے کی کسی تجویز پر بحث ہوئی اور نہ ہی پاکستان اور ہندوستان کے درمیان مشترکہ دفاع کے کسی منصوبے پر غور ہوا

تھا۔ کانفرنس میں زیادہ تر بحث کوریا کی جنگ اور جاپان کو ازسرنو مسلح کرنے اور فارموسا (تائیوان) کے مستقبل کے مسائل پر ہوئی تھی اور یہ تینوں ہی مسائل ایسے تھے کہ ان کے بارے میں ہندوستان کے وزیراعظم جواہر لال نہرو کی ہر بات کو بڑے غور سے سنا گیا۔ لندن کے ہفت روزہ اخبار ''دی پیپل'' (The People) کی رپورٹ یہ تھی کہ ''کوریا میں عارضی معاہدۂ امن کے مسئلہ پر برطانیہ کے وزیر خارجہ ارنسٹ بیون اور ہندوستان کے وزیراعظم جواہر لال نہرو میں اتفاق رائے ہے جبکہ دولت مشترکہ کے دوسرے وزرائے اعظم ان کی رائے سے اختلاف کرتے ہیں۔ بیون اور نہرو کی رائے یہ ہے کہ کوریا میں جنگ بندی کی غرض سے اور جنگ بندی کے بعد اقوام متحدہ کے کمیشن کی نگرانی میں کوریا کے اتحاد کے قیام کی غرض سے وہاں چین کی فوجی مداخلت کو نظرانداز کر دینا چاہیے۔ لیکن دولت مشترکہ کے دوسرے وزرائے اعظم کی رائے ہے کہ امریکہ اس تجویز سے متفق نہیں ہوگا۔''[26]

جہاں تک جاپان کو ازسرنو مسلح کرنے کا سوال تھا لیاقت علی خان اور بعض دوسرے وزرائے اعظم اس کے زبردست حامی تھے لیکن نہرو اس کے خلاف تھا۔ اس کا موقف یہ تھا کہ جنرل میکارتھر نے جاپان کے لئے جو آئین تیار کروایا تھا اس کے تحت جاپان کو یہ اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ ازسرنو اپنی فوج منظم کرے۔ البتہ فارموسا (تائیوان) کے مستقبل کے بارے میں سب میں اس تجویز پر اتفاق ہوگیا تھا کہ یہ مسئلہ طے کرنے کے لئے مشرق بعید کے ممالک کی ایک کانفرنس منعقد کی جائے۔ نہرو نے 18/جنوری کو اپنی پیرس کی پریس کانفرنس میں چین اور جاپان کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ وہ جاپان کو ازسرنو مسلح کرنے کے خلاف تھا اور اس تحریک کے بھی خلاف تھا کہ چین کو کوریا میں جارحیت کا مرتکب ٹھہرایا جائے۔ اس کا موقف یہ تھا کہ چین نے یکم اکتوبر 1950ء سے پہلے ہی متنبہ کر دیا تھا کہ اگر کوریا میں 38 ویں خط متوازی کو عبور کیا گیا تو وہ مجبوراً فوجی مداخلت کرے گا۔ ''ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ ماضی میں چین پر کوریا کی جانب سے حملہ ہو چکا تھا اور اس تاریخی حقیقت کا ساری حکومتوں کو علم تھا۔''[27] اور 23/جنوری کو برطانیہ کے وزیراعظم ایٹلی کا بیان یہ تھا کہ ''ایشیا اور مشرق وسطیٰ کے ممالک کوریا میں جنگ بندی کرانے اور کوریا کے تنازعے کو گفت وشنید کے ذریعے تصفیہ کرانے کے لئے جو پہل کر رہے ہیں، حکومت برطانیہ اس کا خیر مقدم کرتی ہے۔''[28] مختصراً یہ کہ جنوری 1951ء کی دولت

مشترکہ کانفرنس کے دوران نہرو بڑی اونچی ہواؤں میں تھا۔ وہ عالمی لیڈر بننے کے خواب دیکھ رہا تھا اس لئے اس کی جانب سے تنازعہ کشمیر کے کسی منصفانہ تصفیہ پر رضامند ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیاقت علی خان کے پاس کوئی سفارتی پتا نہیں تھا جس کے زور پر وہ تنازعہ کشمیر کا تصفیہ کرا سکتا تھا۔ جون 1949ء میں مارشل سٹالن نے اسے دورہ ماسکو کی دعوت دے کر اسے ایک بڑے زوردار سفارتی پتے کی پیشکش کی تھی مگر ظفراللہ خان اینڈ کمپنی نے اسے اس پیشکش سے فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ تاہم جب دولت مشترکہ کانفرنس کے خاتمہ پر پاکستانی اخبارات میں یہ خبریں چھپیں کہ تنازعہ کشمیر کے تصفیہ کی طرف کوئی پیش قدمی نہیں ہوئی تو بلوچستان مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری سردار محمد عثمان جوگیزئی نے 17 رجنوری کو ایک بیان میں یہ رائے ظاہر کی کہ ''پاکستان کو اس تنازعہ کے منصفانہ تصفیہ کے لئے اینگلو۔امریکی بلاک کی بجائے روس کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ روس نے وزیراعظم لیاقت علی خان کو دورہ ماسکو کی دعوت دے کر دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ پاکستان کو اس موقع سے فائدہ اٹھا کر روس کے ساتھ اپنے تعلقات مستحکم کرنے چاہئیں۔''[29] 19 رجنوری کو وزیر خارجہ ظفراللہ خان نے جوگیزئی کی اس رائے کو مسترد کر دیا۔ اس کا پریس ٹرسٹ آف انڈیا کے نامہ نگار سے انٹرویو یہ تھا کہ ''مسٹر لیاقت علی خان کے نام ماسکو سے جو دعوت نامہ موصول ہوا تھا اسے کالعدم سمجھنا چاہیے۔ اگرچہ دعوت نامہ کو منسوخ نہیں کیا گیا ہے لیکن اب یہ اتنا پرانا ہو چکا ہے کہ حکومت پاکستان اب اس پر کوئی غور نہیں کر رہی ہے۔''[30] اس کے اس انٹرویو سے تقریباً ایک ہفتہ پہلے حکومت پاکستان نے دو پاکستانی ادیبوں ابراہیم جلیس اور ممتاز حسن کو روس جانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ان دونوں ادیبوں کو چند ماہ قبل سوویت ادیبوں کی انجمن نے دورہ روس کی دعوت دی تھی۔[31]

لیاقت اور ظفراللہ کی لندن اور مشرق وسطیٰ میں سفارتی سرگرمیاں، مشرق وسطیٰ میں سامراج نواز بلاک بنانے پر مرکوز رہیں

لیاقت علی خان کا یہ بیان صحیح نہیں تھا کہ دولت مشترکہ کانفرنس میں مشرق وسطیٰ کے دفاع کے بارے میں سرے سے کوئی رسمی یا غیر رسمی فیصلہ ہوا ہی نہیں تھا اور یہ کہ وہ برطانیہ اور مصر کے تنازعہ میں بیچ بچاؤ کرانے کا کوئی مشن نہیں رکھتا تھا۔ اس کے اس بیان کے برعکس مصر کے باا ثر

اخبار الاہرام کی رپورٹ یہ تھی کہ ''لندن دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس میں ایک عرب اسلامی بلاک بنانے کے مسئلہ پر بھی غور وخوض ہوا۔''[32] 8رجنوری کو جب دولت مشترکہ کانفرنس کا پہلا مکمل اجلاس ہوا تھا تو اس میں برطانیہ کے وزیر اعظم ایٹلی کے علاوہ سروس چیف آف سٹاف، وزیر دفاع عمانویل شنویل(Emanvel Shinuell)وزیر خارجہ ارنسٹ بیون، چیف آف امپریئل جنرل سٹاف فیلڈ مارشل سر ولیم سلم اور چیف آف ایئر سٹاف ایئر مارشل سر آرتھر سانڈرز(Arthur Sanders) نے بھی شرکت کی تھی اور اسی روز وزیر اعظم لیاقت علی خان نے وزیر اعظم ایٹلی سے پرائیوٹ طور پر ملاقات کی تھی۔ 11رجنوری کو لیاقت علی خان نے وزیر خارجہ بیون سے ملاقات کر کے مشرق وسطیٰ کے دفاع کے مسئلہ پر تبادلہ خیالات کیا تھا اور اس کے بعد اسی دن مصری سفیر نے لیاقت سے ملاقات کی تھی۔ 18رجنوری کو لیاقت علی خان لندن سے براستہ قاہرہ واپس کراچی آیا تھا اور قاہرہ میں اس نے مصر کے وزیر خارجہ، شام کے وزیر اعظم اور عرب لیگ کے سیکرٹری جنرل سے ملاقاتیں کی تھیں اور مصر کے وزیر خارجہ کے بیان کے مطابق ''ان ملاقاتوں میں جو باتیں ہوئی تھیں وہ نہ صرف مصر کے لئے بلکہ سارے عرب ممالک کے لئے بڑی اہمیت کی حامل تھیں۔''[33]

22رجنوری کو پاکستان کے وزیر خارجہ ظفر اللہ خان نے قاہرہ میں عرب زعما سے بند کمرے میں تبادلہ خیالات کیا تھا اور پھر وہ لندن پہنچ کر برطانوی وزیر اعظم ایٹلی کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ جب ظفر اللہ خان کراچی سے اقوام متحد کے لیے لیک سیکس (Lake Success) جاتے ہوئے قاہرہ پہنچا تو اسی دن عرب لیگ کے سات رکن ممالک کا اجلاس ہوا تھا۔ عراقی مندوب کا بیان یہ تھا کہ ''یہ اجلاس ایسی صورت حال میں ہو رہا ہے کہ ایران میں اشتراکیت نواز طوفان آیا ہوا ہے اور چونکہ عراق کی سرحد ایران سے ملتی ہے اس لئے اس ملک کو بھی سرخ اثرات کا خطرہ لاحق ہے۔'' عراقی مندوب نے مزید کہا کہ ''اس اجلاس میں مشرق ومغرب کے تصادم کا مسئلہ لازماً زیر بحث آئے گا۔ عرب ممالک کمیونزم کی مخالفت کا بار بار اعلان کر چکے ہیں۔ وہ عالمی تصادم میں غیر جانبدار نہیں رہ سکتے۔ ان میں سے بعض ممالک برطانیہ جیسی مغربی طاقتوں کے ساتھ معاہدوں کے رشتوں میں بندھے ہوئے ہیں۔''[34] اور ابھی ظفر اللہ خان وہیں تھا کہ یونائیٹڈ پریس آف امریکہ کی خبر یہ تھی کہ ''بحیرہ روم کے علاقے، مشرق وسطیٰ اور نہر سویز کے دفاع کے لئے

اینگلو۔امریکی پلان تیار ہورہا ہے۔مبصرین کا خیال ہے کہ جنرل آئزن ہاور (Eisenhower) نے مغربی یورپ میں جتنی فوج تیار کی تھی، اتحادی طاقتیں اس سے زیادہ فوج اس علاقے میں سے حاصل کرسکتی ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ نے دنیا کے اس علاقے کے مختلف النوع مفادات کے درمیان دوطرفہ معاہدات کے طویل اور مشکل طریقے کو ترک کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔اس کی بجائے انگریز اور امریکی اس علاقے کو منقسم اقوام کے ساتھ براہ راست لیکن غیر رسمی فوجی مفاہمت کے حق میں ہیں تاہم ان انتظامات سے ہمسایہ ممالک کے درمیان الگ الگ فوجی معاہدوں کے امکانات ختم نہیں ہوں گے۔"[35] جب ظفر اللہ خان لندن میں تھا تو وہاں کے اخبار ٹائمز کے نامہ نگار متعین استنبول کی رپورٹ تھی کہ "سر بربن رابرٹس (Bourbon Roberts) جو مشرق وسطیٰ میں برطانوی افواج کا سپہ سالار ہے، انقرہ جائے گا۔ جہاں وہ ترکی کے سیاسی وفوجی لیڈروں سے شخصی ربط قائم کرے گا، ایسے وقت جبکہ دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم نے اپنی پریس کانفرنس میں مشرق وسطیٰ کے متعلق بعض اہم فیصلے کئے ہیں۔اس سلسلے میں مالٹا میں اینگلو۔امریکن کانفرنس بھی ہوچکی ہے اور امریکی بحریہ کا کمانڈر انچیف ایڈمرل رابرٹ کارنی (Robert Carney) بھی حال ہی میں انقرہ کا دورہ کرچکا ہے۔جس کا مطلب یہ ہے کہ مغربی طاقتیں دنیا کے اس خطے کی حفاظت وحیات کے لئے فکر مند ہیں۔سر رابرٹس کی انقرہ میں آمد بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ترکی کے سیاسی حلقے جنرل رابرٹ کی آمد کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔سمجھا جاتا ہے کہ یہ دراصل ترکی اور یونان کے جنرل سٹاف کی بحیرہ روم کی کمیٹی سے رابطہ کی تیاریاں ہیں۔"[36]

عرب لیگ کا کوریا کی جنگ میں چین کے کردار کے بارے میں غیر جانبدار رہنے کا فیصلہ،عرب عوامی دباؤ کا مظہر تھا

24رجنوری کو عرب لیگ کی سیاسی کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ جب اقوام متحدہ کی سیاسی کمیٹی چین کو جارح قرار دینے کے متعلق امریکہ کی تحریک پر ووٹ لئے جائیں تو ممالک عربیہ کو غیر جانبدار رہنا چاہیے اور اپنے نمائندوں کو ہدایت کردینی چاہیے کہ وہ اس فیصلے پر عمل کریں۔ سیاسی کمیٹی نے یہ فیصلہ عراق کے وزیراعظم نوری السعید پاشا کی مخالفت کے باوجود کیا۔نوری کی رائے یہ تھی کہ "عربوں کو جنگ کا خطرہ لاحق ہے اس لئے انہیں بلا تاخیر اور رسمی طور پر اعلان کردینا

چاہیے کہ وہ مغربی جمہوریتوں کے حامی ہیں۔'' اس نے کہا کہ ''وقت تھوڑا ہے اس لئے عرب ممالک کو اس بارے میں فوراً فیصلہ کرنا چاہیے۔ مغربی طاقتوں نے اس خطرے کے مقابلے کی بڑے وسیع پیمانے پر تیاریاں کی ہیں لیکن عرب ممالک نے ابھی تک کوئی قابل اعتماد اقدام نہیں کیا۔'' لیکن مصر کا وزیر خارجہ صلاح الدین، نوری السعید کی اس رائے سے متفق نہیں تھا۔ اس کی رائے یہ تھی کہ ''اگر اس وقت عرب ملکوں نے اپنے آپ کو کسی دھڑے بندی میں منسلک کر دیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بین الاقوامی صورتحال اور بھی بگڑ جائے گی۔'' بعض عرب ذرائع کی اطلاع یہ تھی کہ ممالک عربیہ اس سوال پر سوچ بچار کر رہے ہیں کہ ایشیائی ملکوں سے مل کر ''تیسری طاقت'' قائم کی جائے۔[37]

جس دن عرب لیگ کی سیاسی کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا اس سے اگلے دن شام کے دارالحکومت دمشق اور دوسرے شہروں میں طلبا کے زبردست مظاہرے ہوئے جن میں مطالبہ کیا گیا کہ مشرقی اور مغربی بلاکوں کی کشمکش میں شام کو غیر جانبدار رہنا چاہیے۔ شام کی متعدد سیاسی پارٹیوں نے بھی اپنے بیانات میں اس مطالبہ کی تائید کی۔ 26/جنوری کو شام کے وزیر اعظم ناظم الدین قدسی نے عرب لیگ کی سیاسی کمیٹی کے روبرو ایک یادداشت پیش کی جس میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ چار کروڑ آبادی کے سات عرب ممالک کو ایک متحدہ مملکت یا فیڈریشن میں مدغم کرایا جائے۔[38] نوائے وقت نے اس تجویز کا پرجوش خیر مقدم کیا کیونکہ اس کی رائے میں اس تجویز کا پیش کیا جانا ہی عرب ممالک اور مشرق وسطیٰ کی ریاست میں ایک نئے رجحان اور ایک نئے موڑ کی علامت تھا۔ اخبار کا اداریہ یہ تھا کہ ''پہلی جنگ عظیم کے بعد انگریز سیاست نے وحدت عربیہ کو پارہ پارہ کیا اور اپنے ایجنٹوں اور پٹھوؤں کی معرفت عالم عرب کو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کر دیا۔ ان ریاستوں کی تقسیم اس طرح کی گئی کہ فوجی لحاظ سے ان میں سے کوئی بھی اپنا دفاع آپ نہ کر سکے اور اقتصادی اعتبار سے ان میں سے کوئی بھی اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل نہ ہوتا کہ نام نہاد آزادی کے باوجود یہ ممالک برطانیہ کے دست نگر رہیں۔ کہنے کو تو یہ آزاد ہوں مگر ان کی اقتصادی پالیسی برطانیہ مرتب کرے۔ ان کی خارجہ پالیسی برطانوی فارن آفس کے ہاتھ میں ہو۔ ان کی حفاظت کے بہانے برطانوی افواج ان کی چھاؤنیوں میں ڈیرے ڈالے ہوں۔ پورے تیس سال عرب ممالک برطانوی سیاست کے صید زبوں بنے رہے ہیں۔ ایک چوتھائی صدی کے

تلخ تجربے کے بعد (جس سے پاکستان کو بھی فائدہ حاصل کرنا چاہیے) وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ جب تک ہماری اقتصادی پالیسی ہم خود مرتب نہ کریں، جب تک ہماری خارجہ پالیسی ہمارے اپنے ہاتھ نہ ہو، جب تک ہماری چھاؤنیاں انگریزی فوجوں سے پاک نہ ہوں، ہم صحیح معنوں میں آزاد کہلانے کے قابل نہیں۔ انگریز کے پڑھائے ہوئے ''نیشنلزم'' کے سبق کو طوطے کی طرح پورے 25 سال رٹنے کے بعد عرب ممالک کو اب اس امر کا احساس ہوا ہے کہ برطانوی استادان سیاست نے عربوں کو یہ سبق ان کے فائدے کے لئے نہیں پڑھایا تھا بلکہ اس تعلیم سے ان کا مقصد عربوں میں انتشار پیدا کرتے ہوئے انہیں مختلف چھوٹی چھوٹی قوموں اور مملکتوں میں تقسیم کر کے برطانیہ کا دست نگر بنانا تھا۔ شام کی یہ تجویز پروان چڑھتی ہے یا نہیں۔ یہ نیا رجحان عرب ممالک کے لئے نیک فال ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عربوں میں احساس زیاں تو پیدا ہوا اور صرف یہ احساس ہی پیدا نہیں ہوا تلافی مافات کا خیال بھی آیا۔ انشاء اللہ آج نہیں تو کل ضرور ملیں گے۔ سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک۔ وہ دن صرف عرب ممالک کے لئے ہی نہیں پورے مشرق وسطیٰ اور ایران، افغانستان اور پاکستان کے لئے بھی ایک مبارک دن ہوگا کیونکہ اس دن انگریز کی گرفت سارے مشرق وسطیٰ میں ڈھیلی پڑ جائے گی۔''[39] نوائے وقت کی یہ خوش فہمی مشرق وسطیٰ کے امور کے بارے میں اس کی بے خبری یا جہالت کا مظہر تھی۔ بلاشبہ پہلی جنگ عظیم کے بعد مشرق وسطیٰ میں عربوں کے باہمی سیاسی، معاشی اور معاشرتی، ثقافتی اور قبائلی تضادات کی وجہ سے ان کی جو مختلف مملکتیں وجود میں آئیں ان کے قیام میں برطانوی سامراج کی بھی کارفرمائی تھی۔ لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانوی سامراج مشرق وسطیٰ میں ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی پالیسی پر عمل پیرا نہیں ہوا تھا بلکہ ان کی پالیسی یہ تھی کہ پان اسلام ازم کی آڑ میں یا عرب نیشنلزم کے نام پر مختلف عرب ممالک کو یکجا کر کے اپنی زیر سرپرستی ایک عرب فیڈریشن قائم کی جائے۔ 1949ء کے دوران برطانیہ اپنا یہ مقصد پورا کرنے کے لئے سرتوڑ کوشش کرتا رہا جبکہ امریکی سامراج اندر ہی اندر اس علاقے میں برطانوی مفادات کی بیخ کنی کرتا رہا۔ 1950ء کے اوائل میں امریکہ نے پہلے شام کے ارباب اقتدار کے ذریعے اور پھر مصر کے ارباب اقتدار کے ذریعے انگریزوں کی اس اسکیم کو سبوتاژ کر دیا اور وہ عالم عرب کے اتحاد کے لئے اپنی الگ سکیم لے آئے جس کے مطابق مصر، شام، لبنان، سعودی عرب اور یمن کے درمیان اجتماعی تحفظ کا معاہدہ ہوا تھا۔

اب کوریا میں عبرتناک ہزیمت کے بعد مشرق وسطیٰ میں برطانیہ اور امریکہ کی باہمی رقابت وقتی طور پر دب گئی تھی اور دونوں ہی طاقتیں اس کوشش میں تھیں کہ کسی نہ کسی طرح مشرق وسطیٰ کے ممالک کو اینٹی سوویت مخالف بلاک کی صورت میں یکجا کیا جائے۔

مصر کے اخبار الاہرام کی اطلاع کے مطابق جنوری 1951ء کی دولت مشترکہ کانفرنس میں مشرق وسطیٰ میں اسلامی عرب بلاک بنانے کی تجویز زیر غور آئی تھی جبکہ امریکہ، ترکی، یونان اور عرب ممالک پر مشتمل ایک بلاک بنانے کے لئے کوشاں تھا۔ مشرق وسطیٰ میں برطانوی افواج کا کمانڈر انچیف جنوری 1957ء کے تیسرے ہفتے میں اسی مقصد کے لئے انقرہ گیا تھا۔ قبل ازیں مالٹا میں امریکہ اور برطانیہ کے نمائندوں کی کانفرنس بھی اسی مقصد کے تحت ہوئی تھی۔ امریکی بحریہ کے سپہ سالار نے بھی اسی مقصد کے پیش نظر انقرہ کا دورہ کیا تھا اور اب قاہرہ میں عرب لیگ کی سیاسی کمیٹی کا اجلاس بھی یہی مقصد پورا کرنے کے لئے ہو رہا تھا۔ شام کی یہ تجویز نہ تو عالم عرب میں نئے رجحان کی آئینہ دار تھی اور نہ ہی یہ عرب ممالک کے لئے نیک فال تھی۔ اس تجویز کے پس پردہ شامی ارباب اقتدار کی ایک خواہش تو یہ تھی کہ عرب ممالک کے گٹھ جوڑ کے بارے میں اینگلو۔ امریکی سکیم کے لئے راہ ہموار کی جائے اور دوسری خواہش یہ تھی کہ شام اور دوسرے عرب ممالک کے سامراج دشمن عوام کی توجہ ان کے اصلی دشمنوں کی طرف سے ہٹا کر انہیں یہ غلط امید دلائی جائے کہ عرب ممالک اکٹھے ہو جائیں گے تو ان کے سارے داخلی اور خارجی مسائل حل ہو جائیں گے۔ عراق کا وزیراعظم نوری السعید پاشا بھی نہ صرف عرب ممالک کے اتحاد کا خواہاں تھا بلکہ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ عرب ممالک اینگلو۔ امریکی بلاک کی حمایت کا کھلم کھلا اعلان کریں۔

حامد بدایونی، خلیق الزماں اور مفتیٔ اعظم فلسطین کی طرف سے عالم اسلام کے اتحاد کے لئے بیان بازی

شام کے وزیراعظم کی جانب سے عربوں کی متحدہ مملکت یا فیڈریشن کے قیام کی تجویز پیش کئے جانے کے چار پانچ دن بعد جمعیت العلمائے پاکستان کے صدر مولانا عبدالحامد بدایوانی نے ایک بیان میں وکالت کی کہ اسلامی دنیا کی ایک انجمن اقوام قائم کی جائے۔ اس نے کہا کہ ''مغربی طاقتیں اسلامی دنیا پر حکومت کرنے کی تمنا رکھتی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلامی

حکومتیں اپنے تمام اختلافات کو ختم کر دیں اور ایک مرکزی ادارہ قائم کریں۔ اس ادارے کو ایسی پالیسی اختیار کرنی چاہیے کہ اسلامی اقوام میں باہمی ربط وضبط پیدا ہو۔''[40] 2؍فروری کو قاہرہ میں عرب لیگ کی سیاسی کمیٹی کی تجویز کے مطابق چھ عرب ممالک کے ایک مشترکہ دفاعی معاہدے پر دستخط کنندگان میں اردن شامل نہیں تھا کیونکہ عرب لیگ مشرقی فلسطین کی اس ملک میں شمولیت کو تسلیم نہیں کرتی تھی۔ یہ نیا معاہدہ گزشتہ سال کے اجتماعی تحفظ کے معاہدے کی جگہ ہوا تھا۔ پرانے معاہدے میں اردن کے علاوہ عراق بھی شامل نہیں تھا۔ لیکن اس نئے معاہدے میں عراق موجود تھا اور اس کی موجودگی اس امر کا ثبوت تھی کہ یہ معاہدہ امریکہ اور برطانیہ دونوں کی تحریک پر ہوا تھا۔ اس معاہدے میں یہ طے کیا گیا تھا کہ مصر، شام، عراق، لبنان، سعودی عرب اور یمن کی سیاسی اور فوجی حکمت عملی میں ربط ہوگا اور اس مقصد کے لئے ایک جوائنٹ ڈیفنس کونسل قائم کی جائے گی جو ان ممالک کے وزرائے خارجہ اور وزرائے دفاع پر مشتمل ہوگی۔[41] تاہم اسلامستان کی تجویز کے خالق اور مسلم پیپلز ورلڈ آرگنائزیشن کے قیام کی تجویز کے علمبردار چودھری خلیق الزماں کی رائے یہ تھی کہ چونکہ اردن اس معاہدے میں شامل نہیں ہے اس لئے سامراجی طاقتیں اسے کامیاب نہیں ہونے دیں گی۔ اس نے مسلم ملکوں کی ایسی مستحکم فیڈریشن کے قیام کی اہمیت پر زور دیا جو ''مسلمانوں کی سرزمین کے ایک ایک انچ کی آزادی کے لئے سینہ سپر ہو سکے خواہ اس سرزمین پر مغربی جمہوریتوں کا غلبہ ہو یا کمیونسٹ ممالک کا تسلط ہو۔'' اس نے کہا کہ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ سارے مسلم ممالک کی ایک پیپلز آرگنائزیشن قائم کی جائے جو ایسی فیڈریشن کے قیام کے لئے جدوجہد کرے۔ اس نے افسوس ظاہر کیا کہ شام کے وزیراعظم نے عرب ملکوں کی فیڈریشن کی جو تجویز پیش کی تھی وہ عرب لیگ کے دوسرے رکن ممالک کے حکمرانوں نے محض خاندانی عداوتوں اور ذاتی مفادات کی وجہ سے مسترد کر دی ہے۔''[42] چودھری خلیق الزماں پاکستان کا بدنام ترین لیڈر تھا۔ اس نے 1949ء میں پاکستان مسلم لیگ کا صدر منتخب ہونے کے بعد انگریزوں کے زیرسایہ مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک پر مشتمل سوویت مخالف اسلامستان کے قیام کی بڑے زور شور سے تبلیغ کی تھی اور اس بنا پر وہ پاکستان کے اندر اور باہر بہت رسوا ہوا تھا۔ پھر 1950ء میں اس نے کوریا کی جنگ کے بارے میں وزیراعظم لیاقت علی کی سامراج نواز پالیسی کی اس قدر خوشامدانہ طریقے سے حمایت کی تھی کہ پاکستان میں اس کا نام گالی بن گیا تھا۔ اس کے خلاف

عوامی نفرت وحقارت اتنی زیادہ ہوگئی تھی کہ اسے اگست 1950ء میں پاکستان مسلم لیگ کی صدارت سے مستعفی ہونا پڑا تھا۔لیکن اس کے بعد بھی یہ وقتاً فوقتاً اخباری بیانات کے ذریعے نہ صرف اسلامستان کی یا اتحاد اسلامی یا اسلامی فیڈریشن یا پان اسلام ازم کی علمبرداری کرتا رہتا تھا بلکہ مسلم پیپلز ورلڈ آرگنائزیشن کے قیام کی بھی وکالت کرتا رہتا تھا۔ یہ شخص اخباری بیانات کی حد تک پاکستان کے ان لوگوں میں سے تھا جو صرف مسلم ممالک میں اشتراکیت کا سدباب ہی نہیں چاہتے تھے بلکہ یہ بھی عزم رکھتے تھے کہ وہ سوویت یونین اور چین کے زیر تسلط مسلمانوں کے علاقوں کو آزاد کرائیں گے اور دہلی کے لال قلعے پر بھی ہلالی پرچم لہرائیں گے۔ اب فروری 1951ء میں اس کی جانب سے متذکرہ بیان جاری کرنے کی وجہ یہ تھی کہ چند دن میں کراچی میں مؤتمر عالم اسلامی کا سالانہ اجلاس ہونے والا تھا اور ایسے ''سنہری موقع'' پر خاموشی اختیار کئے رکھنا اس کے بس میں نہیں تھا۔

جس روز چودھری خلیق الزماں نے اپنا یہ بیان جاری کیا تھا اس کے دو دن پہلے مؤتمر عالم اسلامی کے صدر اے۔ بی۔ اے۔ حلیم نے ایک پریس کانفرنس میں اعلان کیا تھا کہ مؤتمر کا پہلا سالانہ اجلاس دنیا کے مسلمانوں کو ان کے وحدت ملت اسلامیہ کے نصب العین کے قریب پہنچا دے گا۔ اس نے کہا تھا کہ ''مؤتمر عالم اسلامی ایک ثقافتی نوعیت کی عوامی تنظیم ہے جس کی پختہ پالیسی یہ ہے کہ اپنے رکن ممالک کے داخلی معاملات میں مداخلت نہیں کرتی لیکن یہ ایسے بین الاقوامی مسائل کو نظرانداز نہیں کرسکتی جن کا تعلق مسلم دنیا سے ہو۔ مؤتمر کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ مسلم ممالک کے درمیان عملی تعاون کے ذریعے انتشار انگیز قوتوں کو نیست و نابود کیا جائے۔ انتشار انگیز قوتوں سے میرا مطلب فوجی قوتیں نہیں ہیں بلکہ الحاد جیسی نظریاتی قوتیں ہیں۔ ہمیں کمیونزم کے معاشی، معاشرتی نظریات سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ہم ان نظریات کا جائزہ لینے پر آمادہ ہیں۔ لیکن جہاں تک اس کی بنیاد انکار خدا پر ہے ہم اس سے اتفاق نہیں کرتے۔''[43]

6رفروری 1951ء کو فلسطین کے مفتیٔ اعظم الحاج امین الحسینی نے کراچی میں ایک پریس کانفرنس کے دوران اسلامی اقوام کو متنبہ کیا کہ اگر وہ زندہ رہنا چاہتی ہیں تو دنیا کی سلامتی و بھلائی کے لئے اپنا ایک بلاک بنانا چاہیے۔ اس نے عرب ممالک کے مشترکہ معاہدۂ تحفظ کے بارے میں شام کے وزیراعظم کی طرف سے پیش کردہ تجویز کی حمایت کی اور کہا کہ یہ عرب بلاک

اسلامی بلاک کا ایک حصہ ہونا چاہیے۔ ابتداً اسلامی ممالک کی دولت مشترکہ کا قیام مفید ہوسکتا ہے لیکن مسلم دنیا کی ضرورت یہ ہے کہ اسلامی بلاک میں زیادہ یکجہتی اور قربت ہو۔ مسلم دنیا سامراجیوں کی سازشوں اور شرانگیزیوں کا مقابلہ صرف اسی صورت میں کرسکتی ہے کہ مسلم ممالک کی حکومتوں اور عوام کا اتحاد قائم ہو۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ کوریا کی جنگ کے بارے میں مسلمانوں کا رویہ کیا ہونا چاہیے تو مفتیٔ اعظم نے کہا کہ مسلم عوام کو دونوں بڑی طاقتوں میں سے کسی ایک کے مفاد کی خاطر ایندھن نہیں بننے دینا چاہیے۔ مسلم عوام سے جو کام بھی لیا جائے وہ ان کے اپنے مفاد کی خاطر ہونا چاہیے تاہم بحیثیت انسان ہم ساری بنی نوع انسان کی بھلائی کے خواہاں ہیں اور چاہتے ہیں کہ کوئی جنگ نہ لڑی جائے۔"[44] مفتی اعظم سے آخری سوال پوچھے جانے کی وجہ یہ تھی کہ یکم فروری 1951ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں جب امریکہ کی اس قرارداد پر رائے شماری ہوئی تھی کہ "چین نے کوریا میں جارحیت کا ارتکاب کیا ہے" تو پاکستان ان نو ممالک میں شامل تھا جنہوں نے اس رائے شماری میں حصہ نہیں لیا تھا۔ دوسرے آٹھ ممالک افغانستان، مصر، انڈونیشیا، سعودی عرب، سویڈن، شام، یمن اور یوگوسلاویہ تھے۔ سوویت بلاک کے پانچ ملکوں کے علاوہ ہندوستان اور برما نے اس قرارداد کے خلاف ووٹ دیئے تھے اور 44 ممالک نے قرارداد کی حمایت کی تھی۔ پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خان نے داخلی سیاست کے تقاضے کے تحت اس رائے شماری میں حصہ نہیں لیا تھا۔

پنجاب میں عام انتخابات ہونے والے تھے اور وہ اس موقع پر اس الزام کی عملاً تردید کرنا چاہتا تھا کہ "پاکستان اینگلو۔امریکی بلاک کا خیمہ بردار ہے۔" لیکن اقوام متحدہ میں پاکستان کے اس رویے کے باوجود لیاقت علی خان کی یہ خواہش وکوشش کامیاب نہ ہوئی۔ وہ ان دنوں اپنی پہلی انتخابی مہم کے سلسلے میں پنجاب میں تھا جبکہ جگہ جگہ یہ الزام لگ رہا تھا کہ وہ اینگلو۔امریکی بلاک کا پٹھو ہے۔ وہ امریکہ گیا تھا تو وہاں سے کچھ نہ لایا۔ اس نے بار بار لندن کا سفر کیا مگر کشمیر کا مسئلہ حل نہ ہوا۔ روس کی دعوت مدت سے آئی پڑی ہے اور اس نے اس سے دوستانہ تعلقات استوار نہیں کئے۔

چند دن بعد جب لیاقت علی خان صوبہ میں مسلم لیگ کی انتخابی ٹکٹوں کی تقسیم کے بعد لاہور سے واپس کراچی روانہ ہوا تو مقامی اخبار نویسوں نے اس سے پوچھا کہ پاکستان نے امریکی

قرارداد کے خلاف ووٹ کیوں نہیں دیا کیونکہ اس قرارداد کی منظوری سے گفت وشنید کے ذریعے کوریا کی جنگ کے پرامن تصفیہ کا دروازہ بند ہو گیا ہے؟ تو اس کا گول مول جواب یہ تھا کہ ''پاکستان نے 12 عرب اور ایشیائی اقوام کی قرارداد پر دستخط کئے تھے اگر یہ قرارداد منظور کر لی جاتی تو اس معاملہ کا پرامن تصفیہ ہو جاتا لیکن دوسری اقوام نے اس قرارداد سے اتفاق نہ کیا۔ اس سے مسلم بلاک کے بارے میں مفتیٔ اعظم کے بیان پر تبصرہ کرنے کو کہا گیا تو اس نے کہا کہ ''میرا ہمیشہ یہ نظریہ رہا ہے کہ دنیا کے مسلم ممالک کو اکٹھا ہو جانا چاہیے۔''[45] لیاقت علی خان کا یہ انٹرویو 8 رفروری کے اخبارات میں شائع ہوا تو اسی دن مفتی اعظم امین الحسینی نے کراچی مسلم لیگ کی جانب سے دیئے گئے ایک استقبالیہ میں تقریر کرتے ہوئے اپنے اس موقف کا اعادہ کیا کہ مسلم ممالک کو اپنا الگ الگ وجود ختم کر کے ایک اسلامی بلاک میں مدغم ہو جانا چاہیے۔ اس نے کہا کہ ''بڑی طاقتیں بھی حالات سے مجبور ہو کر بلاک بنا رہی ہیں اس لئے مسلم ممالک کی حکومتوں اور عوام کو بھی چاہیے کہ وہ اسلامی بلاک کی صورت میں اکٹھے ہو جائیں۔ یہ بلاک دنیا کے امن کے لئے ہوگا۔''[46] تاہم لاہور کے روزنامہ امروز نے کہا کہ مفتی اعظم اور اس کے علاوہ بعض دوسرے اسلامی ملکوں پر بلاواسطہ یا بالواسطہ مغربی استعمار کی لعنت مسلط ہے۔ لہٰذا قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ صحیح اسلامی اتحاد کس طرح ممکن ہے۔ ان حالات میں اسلامی اتحاد کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ سب سے پہلے مغربی استعمار کی لعنت کو دور کیا جائے اور جن ملکوں کی حکومتیں برطانیہ یا امریکہ کے زیر اثر اپنے عوام کے مفاد کو کچل رہی ہیں خود وہاں کے عوام ان حکومتوں کا خاتمہ کرنے کی کوشش کریں۔ اسلامی ملکوں کا اتحاد قائم ہو گیا تو اس کی باگ ڈور برطانیہ یا امریکہ کے دفتر خارجہ کے ہاتھ میں ہوگی۔ ایسا اتحاد بالکل بے معنی ہوگا اور اس سے اسلامی ملکوں پر مغربی شہنشاہیت کا تسلط اور زیادہ مضبوط ہو جائے گا۔''[47]

امریکی اور برطانوی ماہرین کا تیل کے علاقے کے دفاع کی حکمت عملی میں مذہب کے استعمال پر غور

جب مفتیٔ اعظم نے کراچی میں اسلامی بلاک کی زوردار الفاظ میں تبلیغ کی تھی اس وقت لندن میں امریکہ اور برطانیہ کے ماہرین نے مشرق وسطیٰ میں تیل سے بھرپور علاقے کے دفاع

کے لئے طویل المیعاد حکمت عملی پر بحث شروع کر دی تھی۔ رائٹر نیوز ایجنسی کی اطلاع یہ تھی کہ ''اس بحث میں برطانیہ کا ایک مقصد یہ ہوگا کہ علاقہ میں اس کے موجودہ دفاع کو از سر نو منظم کرنے کے امکانات تلاش کئے جائیں اور نئے فوجی اڈے ڈھونڈے جائیں تا کہ اگر برطانوی فوجوں کو نہر سویز کے علاقے سے نکلنا پڑے تو وہ وہاں جا سکیں۔ امریکی یونان اور ترکی کے معاہدہ اوقیانوس کے ساتھ زیادہ قریبی ربط قائم کرنے کے امکانات کا جائزہ لیں گے۔ لیکن دونوں کا مشترکہ مقصد یہ ہوگا کہ مشرق وسطیٰ میں پالیسیوں اور دفاعی اقدامات میں تال میل پیدا کیا جائے تا کہ مشرق وسطیٰ میں ویسی پھوٹ نہ پڑے جیسی کہ مشرق بعید کے بارے میں برطانیہ اور امریکہ کے درمیان پڑی ہوئی ہے۔ آئندہ کئی ہفتوں کے دوران مشرق وسطیٰ کے علاقے پر بڑی توجہ دی جائے گی۔ مثلاً (1) 12 اور 13 رفروری کو بحیرہ روم کے علاقے میں برطانیہ اور امریکہ مشترکہ بحری فوج کی مشقیں کریں گے۔ (2) فروری کے وسط میں مشرق وسطیٰ میں متعین سارے امریکی سفیر استنبول میں میٹنگ کریں گے۔ (3) مشرقی بحیرہ اوقیانوس اور بحیرہ روم میں امریکی بحریہ کا کمانڈر انچیف ایڈمرل رابرٹ کارنی مشرق وسطیٰ میں برطانیہ کی بری افواج کے کمانڈر انچیف جنرل سر برین رابرٹس سے ایک اور کانفرنس کرے گا (ان دونوں کے درمیان پہلی کانفرنس جنوری 1951ء کے آخری ہفتے میں ہوئی تھی)۔ (4) امریکی ہوائی فوج کا وزیر تھامس فن لیٹر (Thomas Finlitter) فروری کے وسط میں ترکی جائے گا اور دیکھے گا کہ وہاں امریکی اسلحہ کا کس طرح استعمال ہو رہا ہے۔ یہ سب کچھ ان انکشافات کے بعد ہو رہا ہے کہ امریکہ یہ مطالبہ کر رہا ہے کہ اسے مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ میں برطانیہ کے 14 ہوائی اڈوں کی سہولتیں دی جائیں۔ فرانس پہلے ہی اپنے پانچ ہوائی اڈوں کی سہولتیں امریکہ کو دینے پر رضامند ہو چکا ہے۔ برطانوی ماہرین کا خیال ہے کہ اسرائیل نہر سویز کا بہترین متبادل اڈہ ہوگا۔ تاہم یہ بات یقینی ہے کہ اگر یونان یا ترکی پر حملہ ہوا تو امریکہ اور برطانیہ دونوں ہی بلا تاخیر امدادی کاروائی کریں گے۔ یہ کاروائی یا تو وہ از خود کریں گے یا پھر یہ کوریا کی طرح اقوام متحدہ کے ذریعے ہوگی۔''[48] لندن میں امریکی اور برطانوی ماہرین کی اس کانفرنس کے دوران جان پرائس (John Price) نے، جو ایران میں برطانیہ کے قونصل کی حیثیت سے کام کر چکا تھا اور حال ہی میں نیپال، سکم اور بھوٹان کے لئے برطانیہ کے خصوصی مشن کا رکن تھا، لندن کی رائل

ایمپائر سوسائٹی کو بتایا کہ ''اگر پاکستان نے اپنی توانائی اور جرأت کو برقرار رکھا تو اس امر کا امکان ہے کہ یہ ملک مشرق وسطیٰ کے ممالک کا لیڈر بن جائے گا۔ اس میں یہ پوزیشن حاصل کرنے کی خاصی اہلیت وصلاحیت موجود ہے۔ اگر ہم پاکستان کی دوستی کو معمولی نہ سمجھیں تو یہ ملک ہمارا بہت طاقتور دوست بن سکتا ہے۔ فی الوقت اسے ہماری ضرورت ہے لیکن ایسا وقت آسکتا ہے کہ جبکہ ہمیں اس کی زیادہ ضرورت ہوگی۔ اس نے ایران کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ایران مشرق اور مغرب کے درمیان ایشیائی براعظم کی ایک قدرتی شاہراہ ہے۔ اس کی مغربی سرحد پر عربوں کی سرزمین ہے اس کے مشرق میں افغانستان اور ایک اور توانا مملکت پاکستان ہے۔ ایران دونوں کو جغرافیائی لحاظ سے متحد کرتا ہے۔ ایران کی معیشت اپنے ہمسایوں سے بے نیاز نہیں ہے اور اگر حالیہ مسلم اکنامک کانفرنس کا منصوبہ بار آور ہوا تو ایران کا ان ہمسایوں سے اور زیادہ رابطہ ہو جائے گا۔'' اس نے کہا کہ ''کمیونزم کا جواب اس امید میں پنہاں ہے کہ اسلام کا احیا ہوگا جس کے دوران پاکستان مسلم ممالک کی لیڈر شپ حاصل کرنے کی بہت اہلیت رکھتا ہے۔ یہ غلط ہے کہ ایران روس کے قریب جا رہا ہے۔ ایران مسلم اتحاد کے لئے ایک پل ثابت ہو سکتا ہے۔ مسلم دنیا طاقت کا ایک گودام ہے۔ کمیونزم کا سد باب اس سے زیادہ طاقتور عقیدے سے ہی ہو سکتا ہے اور یہ عقیدہ مشرق وسطیٰ اور مشرق قریب میں موجود ہے۔ مشرق وسطیٰ اور مشرق قریب کو مشرق بعید کی طرح کمیونزم کا زبردست خطرہ لاحق ہے لیکن مذہب کے زور سے اس کا سد باب ہو سکتا ہے۔ چین میں مشرق وسطیٰ اور مشرق قریب کے ممالک کے برعکس کمیونزم کے متبادل نظریے کا حامل کوئی مذہب نہیں تھا۔ اس نے پیش گوئی کی کہ ایران مشرق یا مغرب کے قریب ہونے کی بجائے اپنی غیر جانبداری کو برقرار رکھے گا اور یہ صورت اتحادی اقوام کے لئے بہتر ہوگی۔''[49]

لندن میں امریکی اور برطانوی ماہرین کی میٹنگ اور جان پرائس کی تقریر کی ان دونوں خبروں سے یہ واضح تھا کہ امریکہ اور برطانیہ بھی مشرق وسطیٰ کی سلامتی کے بارے میں اتنے ہی فکرمند تھے جتنا کہ فلسطین کا مفتیٔ اعظم تھا اور جان پرائس جیسے انگریز مشرق وسطیٰ میں اسلامی اتحاد یا اسلامی بلاک کے اتنے ہی خواہاں تھے جتنا کہ مفتیٔ اعظم تھے۔ ان انگریزوں کی نظر میں پاکستان کے وزیر خزانہ غلام محمد کی انٹرنیشنل اسلامک کانفرنس قابل تعریف تھی۔ انہوں نے چودھری خلیق الزماں کے اسلامستان کی بھی حمایت کی تھی۔ اور اب بظاہر وہ مؤتمر عالم اسلامی کے پہلے سالانہ

اجلاس کو بھی اپنے مفاد کے لئے اچھا سمجھتے تھے۔

کراچی میں مؤتمر عالم اسلامی کا اجلاس اور ملک میں اسلام فروش جماعتوں کا کاروبار......اقبال شیدائی اور خلیق الزماں کی شعبدہ بازیاں

مؤتمر کے اس سہ روزہ اجلاس کا افتتاح 9رفروری کو وزیراعظم پاکستان نے اس اعلان کے ساتھ کیا کہ پاکستان مسلم ممالک کے درمیان دوستی اور تعاون کو فروغ دینے کے لئے ہر ممکن کوشش کرے گا۔ اسلامی نظریے کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے تحت مسلم اخوت ایک زندہ حقیقت بنے۔ پاکستان اس نظریے کو جامہ عمل پہنانے اور اس کا مظاہرہ کرنے کے لئے حاصل کیا گیا ہے۔ اس نے کہا کہ ''اتحاد کی اس تحریک کے پس پردہ کسی خودغرضی یا علاقائی مفاد کی کارفرمائی نہیں ہے۔'' فلسطین کے مفتیٔ اعظم الحاج امین الحسینی نے اپنی صدارتی تقریر میں ساری دنیا کے مسلمانوں کو تلقین کی کہ وہ بلا تاخیر متحد ہو جائیں۔ اس نے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے جو پروگرام پیش کیا اس میں روحانی ترقی، مسلم ملت کے اتحاد، اخوت، معاشرتی انصاف، اسلامی امور کی جانب خاص توجہ اور مؤتمر کی جانب سے اتحاد کی تحریک کے نکات شامل تھے۔ استقبالیہ کمیٹی کے صدر فضل الرحمان نے اپنی تقریر میں عالم اسلام کو نصیحت کی کہ وہ یہ ثابت کرے کہ دنیا کو جو مشکلات درپیش ہیں ان کا علاج نہ کمیونزم میں ہے اور نہ کیپٹیلزم میں ہے بلکہ یہ صرف اسلام میں ہے۔''[50]

روزنامہ ڈان نے مؤتمر کی کانفرنس کی اس افتتاحی تقریب کے موقع پر اپنے ایک اداریے میں اس تنظیم کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے لئے بہت عظیم الشان نصب العین متعین نہ کرے۔ اس نے لکھا کہ ''ماضی میں اسلامی اتحاد کی بہت سی کوششیں اس لئے ناکام ہوئی تھیں کہ مختلف مواقع پر چند اہم شخصیتوں کو جمع کر کے ان کے سپرد بہت بڑا کام کر دیا گیا تھا۔ اگر ایسے تجربوں کو نظرانداز کر دیا گیا تو ہمیں اندیشہ ہے کہ مستقبل میں مؤتمر عالم اسلامی کی کارگزاری بھی بہتر نہیں ہوگی لہٰذا یہ بہت ضروری ہے کہ مؤتمر ابتدا میں اپنے مقاصد بہت محدود رکھے۔ ہمیں یقین ہے کہ ساری دنیا کے حقیقت پسند عناصر مؤتمر کی اس کانفرنس کے فیصلوں کا خیر مقدم کریں گے بشرطیکہ وہ مختصر المیعاد ہوں اور قابل عمل ہوں۔ اگر یہ فیصلے شاندار قراردادوں کی صورت میں ہوئے تو کاغذوں پر ہی رہیں گے...... اگر ایسی قراردادیں جمع ہوتی رہیں اور ان پر عمل نہ ہوا تو مؤتمر کمزور تر ہوتی چلی

جائے گی۔ عالم اسلام کے لیڈروں کو ایک اور خطرہ بھی درپیش ہے اور وہ یہ کہ ایک ہی مقصد کے لئے کئی ایجنسیاں بنی ہوئی ہیں......اس صورتحال کی زیادہ تر ذمہ داری پاکستان پر عائد ہوتی ہے۔ یہاں ایک اسلامی انٹرنیشنل کانفرنس ہے جس کے دوسالانہ اجلاس ہو چکے ہیں اور اب اس نے ایک مہنگا مرکزی سیکرٹریٹ قائم کر رکھا ہے۔ ایک مؤتمر عالم اسلامی ہے اور ایک موہوم سی مسلم پیپلز آرگنائزیشن ہے جو پاکستان مسلم لیگ کے سابق صدر کے ذہن کی پیداوار ہے۔ پاکستان کی کابینہ کا ایک وزیر انٹرنیشنل اسلامک اکنامک کانفرنس کا بانی صدر ہے اور ایک دوسرا وزیر مؤتمر کے ساتھ منسلک ہے۔ جبکہ پاکستان کی قومی سیاسی تنظیم کا سابق سربراہ موہوم مسلم پیپلز آرگنائزیشن کی پرورش کر رہا ہے تاکہ عملی طور پر اس کی کوئی شکل وصورت بن جائے۔ کیا اسلامی بین الاقوامی تعاون کے شعبہ میں اتنا زیادہ کام ہے کہ اس کے لئے اتنی تنظیمیں درکار ہیں۔''[51]

ڈان نے اپنے مذکورہ حوصلہ شکن اداریے میں ایک اور تنظیم کا نام نہیں لیا تھا جو ڈان کی 8رفروری کو رپورٹ کے مطابق پیرس کے سند یافتہ حجام اختر حسین وارثی کی زیرنگرانی وجود میں آئی تھی۔ اس تنظیم کا نام انٹرنیشنل اسلامک ہیئر ڈریسرز سیلون تھا۔ اس اسلامی سیلون کے بارے میں آل پاکستان باربرز ایسوسی ایشن کا اعلان یہ تھا کہ ''مؤتمر عالم اسلامی کی اس تاریخی کانفرنس کے موقع پر آل پاکستان باربرز ایسوسی ایشن نے فیصلہ کیا ہے کہ کانفرنس میں شرکت کرنے والے نمائندوں، خبررساں ایجنسیوں، اخباری نمائندوں اور معززین کے ہیئر ڈریسنگ، شیونگ، شمپو، مساج وغیرہ بغیر کسی اجرت کے کئے جائیں گے اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے کانفرنس کے پنڈال کے قریب جدید طرز پر ایک سیلون ترتیب دیا گیا ہے جس کا نام انٹرنیشنل اسلامک ہیئر ڈریسنگ سیلون ہے۔'' اس اعلان پر امروز کے ایڈیٹر مولانا چراغ حسن حسرت کی طنزیہ نگاری یہ تھی کہ ''مؤتمر اسلامی کے نمائندوں، اخبارنویسوں، وزیروں اور کراچی کے بعض معززین کے پاس باربرز ایسوسی ایشن نے کارڈ بھیج دیئے ہیں۔ ''اسلامک ہیئر ڈریسنگ سیلون'' میں جاکے کارڈ دکھایئے اور خلیفہ صاحب سو کام چھوڑ کر پہلے آپ کی ''اسلامی حجامت'' کر دے گا۔ چنانچہ ایڈیٹر امروز بھی ان ہی خوش نصیب لوگوں میں ہے جنہیں اس التفات کے لائق سمجھا گیا ہے۔ راقم نے یہ کارڈ جماعت اسلامی کے دفتر میں بھیج دیا ہے کیونکہ جماعت اسلامی راقم سے کہیں زیادہ ''حجامت اسلامی'' سے فائدہ اٹھانے کی مستحق ہے اور اسلامک ہیئر ڈریسنگ سیلون کو صحیح داد بھی اسی جماعت

کی جانب ہی سے مل سکتی ہے۔''[52]

مولانا حسرت نے اپنی اس طنزیہ نگاری سے ''اسلامک ہیئر ڈریسنگ سیلون'' کے ''اسلامی کار پردازان'' سے کچھ زیادتی کی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ ان دنوں پاکستان میں اسلام فروشی کا قومی اور بین الاقوامی سطح پر بڑے وسیع پیمانے پر کاروبار ہوتا تھا۔ بے شمار چھوٹے بڑے شہروں کے طالع آزماؤں نے اسلامی نظام اور پان اسلام ازم کی دکانیں سجائی ہوئی تھیں۔ ان کے کئی قسم کے سائن بورڈ تھے مثلاً اسلامک اولمپک ایسوسی ایشن، اسلامک یوتھ ایسوسی ایشن، آل پاکستان عربک سوسائٹی، ورلڈ مسلم ایسوسی ایشن، اسلامک ورلڈ ریلیشنز ایسوسی ایشن، اسلامک چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری، اسلامک یوتھ آرگنائزیشن وغیرہ وغیرہ۔ کراچی میں ایک پان اسلامک سٹیم شپ کمپنی کا بورڈ بھی لگا ہوا تھا۔ جس کے ڈائریکٹروں کی فہرست میں لاہور کے روزنامہ زمیندار کے ایڈیٹر مولانا اختر علی خان کا نام بھی شامل تھا۔ ان اسلام فرشوں میں ایک شخص ڈاکٹر اقبال شیدائی بھی تھا۔ یہ شخص کم علم اور کم عقل تھا۔ اس کے پاس ڈاکٹری کی کوئی ڈگری نہیں تھی لیکن یہ اپنے آپ کو ''ڈاکٹر'' کہلوانے اور لکھوانے پر مصر تھا۔ بیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں تحریک خلافت کے دوران یہ شخص کوتاہ اندیش ملاؤں کے فتووں کے زیر اثر بالائی ہندوستان کے دوسرے ہزاروں مسلمانوں کی طرح ہندوستان سے ہجرت کر کے مختلف ممالک سے ہوتا ہوا اٹلی پہنچ گیا تھا۔ جہاں یہ مسولینی کے محکمہ نشریات میں ملازم ہو گیا تھا لیکن وہاں اسے کوئی قابل ذکر مقام حاصل نہ ہوا۔ جب پاکستان قائم ہوا تو اس کے دو ایک ماہ بعد نوائے وقت میں یکا یک اس ''مسلمان مجاہد آزادی'' کا زبردست پروپیگنڈا شروع ہو گیا۔ اس مبالغہ آمیز پروپیگنڈے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اقبال شیدائی کے بھائی ڈاکٹر جمال بھٹہ نے قیام پاکستان سے قبل مدیر نوائے وقت کی ابتدائی صحافتی زندگی میں اس کی کچھ امداد و اعانت کی تھی اور اس بنا پر وہ اس کا دوست تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ نوائے وقت کو پاکستان کے لئے ایک سبھاش چندر بوس کی ضرورت محسوس ہوتی تھی چونکہ ہندوستان میں آزاد ہند فوج کے بانی آنجہانی سبھاش چندر بوس کے بارے میں زوردار پروپیگنڈا کر کے ہندوستانی قوم پرستی کو تقویت پہنچائی جا رہی تھی اس لئے نوائے وقت کا خیال تھا کہ مسلم مجاہد آزادی اقبال شیدائی کے ''کارہائے عظیم'' کے بارے میں پروپیگنڈے کے زور سے ''مسلم قومیت'' کے تصور کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایسا نہ ہوا تھا کیونکہ اقبال شیدائی کی حیثیت

ایک ایسی بطخ کی تھی جو کسی طرح بھی عقاب کی بلندی پر پرواز نہیں کر سکتی تھی۔ یہ شخص قیام پاکستان کے بعد مشرق وسطیٰ کے مختلف ممالک کا دورہ کرتے ہوئے اکتوبر 1947ء کے وسط میں لاہور پہنچا۔ یہاں اس نے اخباری بیانات کے ذریعے مشرق وسطیٰ کے اسلامی ممالک کے ثقافتی اتحاد کی تحریک شروع کی۔ نوائے وقت نے ''مسلم مجاہد آزادی'' کی اس تحریک کی حمایت میں کئی اداریے لکھے اور بہت سی خبریں چھاپیں مگر کوئی بات بن نہ سکی۔ 22رنومبر 1947ء کو اقبال شیدائی نے لاہور میں مصری اخبار نویسوں کے اعزاز میں منعقدہ ایک استقبالیہ میں ایک اسلامک ورلڈ ایسوسی ایشن آف پاکستان کے قیام کا اعلان کیا۔ اس ایسوسی ایشن کی ایڈہاک کمیٹی میں مولانا شبیر احمد عثمانی، نواب افتخار حسین خان آف ممدوٹ، خواجہ ناظم الدین، خان عبدالقیوم خان، ایم۔ اے۔ کھوڑو، میاں افتخار الدین، ملک فیروز خان نون، ممتاز دولتانہ، پیر مانکی شریف، الطاف حسین ایڈیٹر ڈان، چودھری خلیق الزماں، مولانا عبدالرحمان صدیقی، ظفر علی خان، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، حمید نظامی ایڈیٹر نوائے وقت اور اقبال شیدائی کے نام شامل تھے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی جو اس تقریب میں شریک نہیں ہوا تھا، اس ایسوسی ایشن کا عبوری صدر اور اقبال شیدائی اس کا کنوینز مقرر ہوا۔ نوائے وقت نے اس ایسوسی ایشن کی مشہوری کے لئے کئی اداریے لکھے اور بہت سی خبریں شائع کیں مگر یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ کیونکہ یہ محض ایک کاغذی بیل تھی جو کسی صورت بھی نشوونما نہیں پا سکتی تھی۔ 14رجنوری 1948ء کو اقبال شیدائی نے اعلان کیا کہ مارچ 1948ء کے آخری ہفتے میں کراچی میں ایک عالمگیر مسلم کانفرنس منعقد ہوگی جس میں تمام مسلم ممالک کے نمائندے شرکت کریں گے۔ مگر یہ کانفرنس منعقد نہ ہوئی حالانکہ نوائے وقت کی 24رجنوری 1948ء کی اداراتی رائے کے مطابق ''بعد از جنگ کی مسلم تاریخ میں اس کانفرنس کی اہمیت اور حیثیت ایک نشان راہ کی تھی۔'' اکتوبر 1948ء میں ''انجمن مسلمانان عالم کا سیکرٹری جنرل ڈاکٹر اقبال شیدائی'' ہندوستان کے زہریلے پروپیگنڈے کے اثرات زائل کرنے کے لئے پیرس گیا۔ جنوری 1949ء میں اس نے برطانیہ میں اپنی ''ورلڈ مسلم ایسوسی ایشن'' کی ایک شاخ قائم کر دی اور اس کے ساتھ ہی اس نے نوائے وقت کو یہ خوش خبری دی کہ وہ مصر، لبنان، شرق اردن، شام، عراق اور ایران میں اپنی عالمگیر انجمن کی شاخیں قائم کرے گا۔ مارچ 1949ء میں اقبال شیدائی واپس کراچی پہنچا اور اس نے مولانا شبیر احمد عثمانی کے ہمراہ گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین سے

ملاقات کر کے اسے اپنی انجمن کی خدمات پیش کیں مگر نہ تو گورنر جنرل نے اور نہ ہی پاکستان میں کسی اور اہل نظر نے پاکستان اور عالم اسلام کے مفاد کی خاطر اقبال شیدائی اور اس کی انجمن کی خدمات سے کوئی فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ 1949ء کے اواخر تک یہ ''عظیم مسلمان مجاہد آزادی'' پاکستان کی اخباری بیانات کی سیاست کے افق سے ناپید ہوگیا کیونکہ اس وقت تک پان اسلام ازم کا پرچم وزیراعظم لیاقت علی خان، وزیر خزانہ غلام محمد، وزیر تعلیم فضل الرحمان اور پاکستان مسلم لیگ کے صدر چودھری خلیق الزماں وغیرہ کے ہاتھوں میں چلا گیا تھا۔ چونکہ کراچی کے ان اسلام فروشوں کے پان اسلام ازم کی اخباروں میں چکا چوند بہت زیادہ تھی اس لئے جب فروری 1951ء میں مؤتمر عالم اسلام کی کانفرنس منعقد ہوئی، اس وقت بے چارے ڈاکٹر اقبال شیدائی کی ''انجمن مسلمانان عالم'' کا چراغ گل ہو چکا تھا۔

اقبال شیدائی کی اس ''انجمن مسلمانان عالم'' کا چراغ بہت جلدی گل ہو جانے کی وجہ یہ تھی کہ اس نے اپنا یہ سیاسی کاروبار چلانے کے لئے متروکہ جائیدادوں یا الاٹ منٹوں اور پرمٹوں وغیرہ کے ذریعے اپنی معاشی پوزیشن کو ترقی دینے اور اسے مستحکم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے برعکس چودھری خلیق الزماں بڑا گھاگ ''خلافتی'' تھا۔ اس نے پہلے تو 48-1947ء میں قائداعظم محمد علی جناح کے خلاف لیاقت علی خان کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے پاکستان مسلم لیگ پر قبضہ کیا تھا پھر ستمبر 1948ء میں قائداعظم کے انتقال کے بعد اس نے کراچی، لاڑکانہ اور سندھ کے بعض دوسرے علاقوں میں اپنے اور اپنے خاندان کے بہت سے دوسرے افراد کے نام متروکہ جائیداد حاصل کر کے اپنی معاشی حالت کو خوب ترقی دی تھی اور پھر اس نے 1949ء میں پان اسلام ازم، اسلامی بلاک اور اسلامستان کے سائن بورڈ کے تحت بین الاقوامی سطح پر اپنا سیاسی کاروبار شروع کیا تھا۔ اگرچہ اکتوبر 1949ء میں اس کے دورۂ لندن کے موقع پر اس کے اسلامستان کے ڈھول کا پول کھل گیا تھا اور اگست 1950ء میں وہ پاکستانی رائے عامہ کی نفرت وحقارت کے دباؤ کے تحت پاکستان مسلم لیگ کی صدارت سے بھی مستعفی ہوگیا تھا۔ تاہم اس نے اخباری بیانات کے ذریعے اپنا مسلم بلاک اور اپنی مسلم پیپلز آرگنائزیشن کی دکان کھلی رکھی ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ روزنامہ ڈان نے اپنے 9رفروری 1951ء کے اداریے میں اس کی اس دکان کا ذکر کیا تھا۔ خلیق الزماں نے اس دن ایک بیان میں ڈان کے اس اداریے کا جواب دیا اور کہا کہ

''اگر مؤتمر عالم اسلامی ''عوامی تنظیم'' بن جائے، اس کا ایک واضح نصب العین ہو، اس کے آئین کے تحت اس کی رکنیت کے دروازے مسلم ممالک کے ان تمام لوگوں پر کھول دیئے جائیں جو اس کے مسلک سے اتفاق کرتے ہیں اور یہ انتخابی اصول کی تابع ہو تو پھر کسی اور تنظیم کی ضرورت نہیں ہو گی۔ جہاں تک نصب العین کا تعلق ہے مسلم ذہن مسلم بلاک کی تشکیل کا زبردست حامی ہے۔ اگرچہ اسے ابھی تک واضح طور پر یہ نہیں معلوم کہ اس بلاک کے رکن ممالک کو مشترکہ مفاد کی خاطر کس حد تک اپنے اختیار سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ مؤتمر کا بطور عوامی تنظیم آئین مرتب کرتے ہوئے مشرق وسطیٰ کے مختلف مسلم ممالک کی سیاسی وحدت کو ذہن میں رکھنا ہوگا۔ اگر بعض ممالک کے سرکاری نمائندے اس عوامی تنظیم کے ساتھ منسلک ہو جائیں تو کوئی حرج نہیں ہو گا بلکہ اس سے فائدہ ہو گا لیکن دوسرے بعض ممالک کے سرکاری نمائندوں کو اس تنظیم میں شامل کرنا نہ تو ممکن ہو گا اور نہ ہی مناسب ہوگا۔ اگر اس مشکل صورتحال سے نپٹنے کے لئے طریقے دریافت نہ کئے گئے اور ہر حکومت کے نمائندوں کو اس عوامی تنظیم سے منسلک کر لیا گیا تو یہ عوام الناس میں کوئی جوش وجذبہ پیدا نہیں کرے گی اور نہ ہی یہ بلا رکاوٹ کوئی کام کرے گی۔ اگر یہ مشکل صورتحال درپیش نہ ہو تو بھی مشرق وسطیٰ میں انتخابی اصولوں کی بنیاد پر کسی عوامی تنظیم کے لئے کام کرنا آسان نہیں ہو گا لیکن اگر ابتدا ہی میں عوام کے ذہنوں میں شکوک وشبہات پیدا کر دیئے گئے تو یہ کوشش لازماً ناکام ہو گی۔''[53] خلیق الزماں کا یہ بیان اس حقیقت کا مظہر تھا کہ سیاسی طور پر اس شخص کا واقعی کوئی دین ایمان نہیں تھا۔ 1949ء میں جب اس نے اسلامستان کے قیام کے لئے پہلے مشرق وسطیٰ کے مختلف ممالک کا اور پھر آخر میں لندن کا دورہ کیا تھا تو اس نے ہر جگہ سرکاری نمائندوں سے ملاقاتیں کی تھیں کیونکہ ان دنوں یہ پاکستان مسلم لیگ کا صدر ہونے کے علاوہ لیاقت علی خان کی حکومت کا منظور نظر تھا۔ لیکن اب چونکہ نہ تو اس کے پاس پاکستان مسلم لیگ کی صدارت تھی اور نہ ہی کراچی کے ایوان اقتدار میں اسے کوئی زیادہ رسائی حاصل تھی، اس پر مسلمانوں کی بین الاقوامی تنظیم کے عوامی ہونے، آئین وضوابط کا پابند ہونے اور انتخابی اصولوں کے مطابق ہونے کے حق میں ہو گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ چونکہ مؤتمر عالم اسلامی اس کے تصور کے مطابق کبھی بھی عوامی تنظیم نہیں بنے گی اس لئے اس کی مسلم پیپلز آرگنائزیشن کی دکان کھلی رہے گی۔ مزید برآں اسے یہ بھی معلوم تھا کہ چونکہ پاکستانی عوام کی ہمدردیاں مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک کی سامراج نواز حکومتوں کے ساتھ

نہیں تھیں بلکہ ان ممالک کے سامراج دشمن عوام کے ساتھ تھیں اس لئے اس کی داخلی سیاست کا تقاضا یہ بھی یہ تھا کہ یہ اپنے آپ کو عوام دوست ظاہر کرے۔ تاہم 11 رفروری کو یہ خبر شائع ہوئی کہ پاکستان کے قبائلی علاقوں کے مندوبین نے مؤتمر عالم اسلامی کی کانفرنس میں اسلامی بلاک کی تشکیل کے بارے میں ایک قرارداد پیش کی ہے اور یہ قرارداد برائے غور کانفرنس کی آئینی کمیٹی کے حوالے کر دی گئی ہے۔[54] اس سے اگلے دن شام کے مندوب ڈاکٹر مصطفی صبائی کی یہ تقریر چھپی کہ "اگر یورپ متحد ہو رہا ہے اور کمیونسٹ اپنا بلاک بنا رہے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلم دنیا بھی ایک بلاک کی صورت میں متحد نہ ہو۔"[55] اسی دن چودھری خلیق الزماں کی یہ فاتحانہ تقریر بھی اخبارات کی زینت بنی کہ "دنیا کے مسلمانوں کو ایک طاقتی بلاک یا دوسرے طاقتی بلاک سے امداد کی توقع کرنے کی بجائے اپنے پروردگار اور اپنے آپ پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ اس نے مسلم پیپلز آرگنائزیشن کی تشکیل پر زور دیا اور یہ رائے ظاہر کی کہ "مسلمان صرف اسی طرح متحد ہو سکتے ہیں۔"[56]

12 رفروری 1951ء کو مؤتمر عالم اسلامی کی کانفرنس کے دوسرے سیشن کی صدارت ترکی کے مندوب عمر رضائی ذوگرال نے کی۔ اس نے اپنی صدارتی تقریر میں مؤتمر پر زور دیا کہ وہ مسلم دنیا کے مسائل کے حل اور اسلام کے احیا کے لئے قابل عمل فارمولا وضع کرے۔ اس نے کہا کہ "ترکی کے مسلمان اعتدال کی حدود سے تجاوز نہیں کرتے۔ وہ مذہب کا پورا احترام کرتے ہیں لیکن وہ ترقی کے راستے میں سیاست اور مذہب کو مداخلت کی اجازت نہیں دیتے۔"[57] جس دن عمر رضائی نے یہ تقریر کی تھی اسی دن واشنگٹن سے موصولہ یہ خبر شائع ہو چکی تھی کہ امریکہ کی ہوائی فوج کا وزیر اپنے بحیرہ روم کے علاقوں کے دورے کے دوران ترکی جا کر وہاں کے سٹریٹیجک ہوائی اڈوں کو بعجلت جدید بنانے کے مسئلے پر بات چیت کرے گا۔ حکومت امریکہ مراکش سے لے کر ترکی تک کے تمام فوجی ہوائی اڈوں کو جدید بنانے کا انتظام کر رہی ہے تا کہ یہ اڈے جدید قسم کے بمبار ہوائی جہازوں کے استعمال کے قابل ہو سکیں۔"[58] گویا امریکہ سارے ترکی کو سوویت مخالف فوجی اڈہ بنا کر وہاں کے "مسلمانوں کے مسائل" حل کر رہا تھا اور عمر رضائی کراچی میں تقریر کے زور سے "اسلام کے احیا" کا بندوبست کر رہا تھا جبکہ ترکی سب سے پہلا مسلم ملک تھا جو یہودیوں کی اسرائیلی مملکت کو تسلیم کر چکا ہوا تھا۔ ترکی کے علاوہ ایران نے بھی اسرائیلی مملکت کو عملاً تسلیم کر لیا ہوا تھا لیکن اس کے باوجود کانفرنس کے تیسرے سیشن میں پاکستان کے

وزیرداخلہ خواجہ شہاب الدین کی تجویز یہ تھی کہ اتحاد اسلامی کو فروغ دینے کے لئے ایک پان اسلامک ریلوے لائن کے ذریعے ایک دوسرے سے منسلک کیا جائے۔ اس کی رائے یہ تھی کہ ''اس مجوزہ ریلوے کی تعمیر سے وہ رکاوٹ دور ہو جائے گی جو اب تک مسلم ممالک کے عوام کے درمیان معاشی، معاشرتی، ثقافتی اور تعلیمی تعلقات استوار کرنے کے رستے میں حائل رہی ہے۔ جب یہ ریلوے بن جائے گی تو مسلم ممالک کے عوام بآسانی اکٹھے ہوسکیں گے۔ ان میں ان ممالک کا سفر کرنے کی خواہش پیدا ہوگی اور اس طرح اسلامی اخوت کے جذبہ کو فروغ حاصل ہوگا۔'' اس نے کہا کہ ''آج کل، جبکہ دنیا دو بلاکوں میں منقسم ہو چکی ہے اور ان بلاکوں کے درمیان کسی وقت بھی تصادم ہوسکتا ہے، یہ لازمی ہے کہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے۔ لیکن ذرائع مواصلات کی عدم موجودگی اس نصب العین کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔''[59] مشرق وسطیٰ میں ریلوے لائن بچھانے کا منصوبہ مغربی سامراج کا پرانا منصوبہ تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ ایشیا کی منڈیوں تک بآسانی رسائی حاصل کرنے کے لئے وہ قدیم تجارتی راستہ کھولا جائے جس کے لئے انہوں نے طویل عرصے تک ترکوں سے صلیبی جنگیں لڑی تھیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اس منصوبے کی اہمیت میں بہت اضافہ ہو گیا تھا۔ اول اس لئے کہ مصری عوام کی زبردست ایجی ٹیشن کے باعث نہر سویز کا راستہ غیر محفوظ ہو گیا تھا اور دوئم اس لئے کہ عراق، ایران، کویت اور سعودی عرب میں تیل کے ذخائر کے تحفظ کے لئے فوجوں اور گولہ بارود کی نقل وحمل کا خاطر خواہ انتظام ضروری تھا۔ بظاہر انگریزوں کا خیال تھا کہ اگر اس منصوبے پر پان اسلام ازم کا ٹھپہ لگا دیا جائے تو اسے جامہ عمل پہنانے میں آسانی ہوگی چنانچہ پاکستان کے وزیر داخلہ خواجہ شہاب الدین نے یہی کیا۔

13 رفروری کو مؤتمر کانفرنس کے آخری سیشن میں 13 قراردادیں منظور کی گئیں جن میں سے ایک قرارداد میں یہ اعلان کیا گیا کہ ''اگر کسی ایک مسلم ملک کے خلاف جارحیت کا ارتکاب ہو تو یہ جارحیت سارے مسلم ممالک کے خلاف تصور ہونی چاہیے۔'' یہ قرارداد بڑے بلند عزائم کی حامل تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سارے مسلم ممالک کے درمیان فوجی گٹھ جوڑ ہونا چاہیے۔ چونکہ ان مسلم ممالک میں سے کسی بھی ملک میں اسلحہ سازی کی کوئی صنعت نہیں تھی اس لئے یہ مجوزہ فوجی گٹھ جوڑ اینگلو۔ امریکی سامراج کے زیر سایہ ہی ہوسکتا تھا اور جو فوجی گٹھ جوڑ اینگلو امریکی سامراج

کے زیر سایہ ہوسکتا تھا وہ سوویت مخالف ہی ہوسکتا تھا اور یہی بات تھی جسے پورا کرنے کے لئے امریکہ اور برطانیہ کے ارباب اقتدار شب وروز کوشاں تھے۔ کوریا کی جنگ میں چینیوں کے ہاتھوں مار کھانے کے بعد ان کی نیندیں حرام ہوگئی تھیں کیونکہ انہیں خلیج فارس کے علاقے میں اپنے تیل کے ذخائر خطرے میں نظر آتے تھے اور انہیں یوں لگتا تھا کہ اب مشرق وسطیٰ سمیت پورا ایشیا اشتراکیت کی لپیٹ میں آجائے گا۔ امریکہ کی برسر اقتدار ریپبلکن پارٹی کے گورنر تھامس ڈیوی کی رائے یہ تھی کہ ''مشرق وسطیٰ میں خلا پایا جاتا ہے۔ اب وقت ہے کہ ہم اسلام کی پوری طاقت کو پوری طرح اپنے ساتھ ملائیں۔''[60] برطانیہ کے ایک بوڑھے ماہر کا خیال یہ تھا کہ ''خلیج فارس کا علاقہ خطرے میں ہے اس لئے پاکستان ہمارے لئے ضروری ہے اور امریکہ و برطانیہ کی اس باہمی ضرورت کا تقاضا یہ ہے کہ کراچی اور کوئٹہ کے فوجی اڈے اقوام متحدہ کی تحویل میں دے دیئے جائیں۔ ان دونوں اڈوں سے برطانیہ، امریکہ اور دوسری اقوام عراق اور ایران کو اپنی فوجیں بآسانی بھیج سکیں گی۔ امریکہ کو خلیج فارس اور اس علاقے کے تیل میں اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی کہ ہم کو ہے۔ عراق کو بھی بہت تشویش ہے۔ وہ شط العرب کے علاقے میں یقیناً اپنے اڈے دے دے گا اور وہ تیل کی پائپ لائنیں اور عراق کمپنی کی دوسری تنصیبات کے تحفظ کے لئے اپنے دوسرے اڈے دینے میں بھی تامل نہیں کرے گا۔''[61] لندن کے اخبار ڈیلی ایکسپریس کا ادارتی مشورہ یہ تھا کہ ''پاکستان کا خیال رکھو۔ وہ آج صنعتی لحاظ سے کمزور ہے اور برطانیہ سے مدد کی توقع رکھتا ہے۔ لیکن وہ ذرائع کے لحاظ سے عظیم ہے اور اثر ورسوخ کے اعتبار سے عظیم تر۔ اگر بہت سے سیاستدانوں کی پیشگوئی درست ہے کہ دنیائے اسلام ایک بار پھر پوری طاقت اور ایمان کے ساتھ کمیونزم کے مقابلے پر اٹھے گی تو پاکستان ہی اس کا قدرتی رہنما ہوگا۔''[62] اور قاہرہ کے بااثر اخبار ''الاہرام'' کی اطلاع یہ تھی کہ ''امریکہ اس بات پر آمادہ ہے کہ بحر اوقیانوس کے سواحل سے لے کر پاکستان تک اسلامی بلاک قائم کرنے میں مدد دی جائے۔''[63]

پاکستان کے وزیر خارجہ چودھری محمد ظفر اللہ خان کو اسلامی بلاک کے قیام میں امریکہ کی اس دلچسپی کا یقیناً علم تھا۔ بظاہر یہی وجہ تھی کہ اس نے 14 رفروری کو واشنگٹن میں امریکہ کے صدر ٹرومین سے ملاقات کر کے اس کی خدمت میں قرآن پاک کے ترجے کی دوسری جلد پیش کی جو امریکہ میں تحریک احمدیہ کی طرف سے شائع کی گئی تھی۔ اس نے ٹرومین کو پہلی جلد 1950ء میں

دی تھی۔اس سال جب امریکی صدر نے کانگرس کے اجتماع میں اپنی سالانہ تقریر کی تھی تو اس کے بعد ظفراللہ خان نے اسے بتایا تھا کہ اس تقریر میں ان اصولوں کی عکاسی ہوئی ہے جو قرآن پاک میں طے کئے ہوئے ہیں۔ٹرومین کو جب یہ پتہ چلا تھا تو اس نے ظفراللہ خان سے کوئی ''حوالہ جاتی مواد'' مانگا تھا۔ چنانچہ پہلی جلد تو اسے اسی وقت دے دی گئی تھی اور دوسری جلد اسے فروری 1951ء میں دی گئی۔اس موقع پر ظفراللہ خان کو گفتگو کے دوران یہ پتہ چلا تھا کہ ٹرومین اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہا ہے۔[64] ظفراللہ خان کو اپنے فرقہ کے ''اسلامی نظریہ'' کی تبلیغ کا جنون تھا۔تاہم صدر ٹرومین ''مسیح موعود'' مرزا غلام احمد کی ''نبوت'' کا قائل نہ ہوا کیونکہ دراصل اسے کسی مذہب میں بھی دلچسپی نہیں تھی۔اگر دلچسپی تھی تو صرف اس مسئلہ میں تھی کہ کس طرح عالم اسلام میں امریکہ کے سامراجی مفادات کا تحفظ کیا جائے۔

پنجاب کی انتخابی مہم میں لیاقت حکومت کی سامراج نواز خارجہ پالیسی پر مخالفین کی شدید تنقید

جس دن ظفراللہ خان نے اپنے تبلیغی مشن کے تحت صدر ٹرومین سے ملاقات کی تھی اسی دن استنبول میں امریکہ کے سفارت کاروں اور اعلیٰ فوجی افسروں کی کانفرنس میں اس مسئلہ پر غور شروع ہوا تھا۔یہ کانفرنس پانچ دن تک جاری رہی تھی۔ایک رپورٹ کے مطابق اس کانفرنس میں یہ طے ہوا تھا کہ اگرچہ مشرق وسطیٰ میں کمیونسٹوں کی جانب سے کھلی فوجی یا سیاسی جارحیت کا امکان نہیں ہے تاہم یونان، ترکی اور ایران کے لئے امریکی امداد میں خاصا اضافہ کیا جائے گا۔[65] اور ایک دوسری رپورٹ یہ تھی کہ اس کانفرنس میں یہ تجویز منظور ہوئی تھی کہ ایتھنز سے لے کر نئی دہلی تک ایک سوویت مخالف علاقہ قائم کیا جائے گا۔اس علاقے میں ایسے امریکی اڈے قائم کئے جائیں گے جہاں سے بحیرہ روم کے علاقہ پر اور ایشیا کی وسیع وعریض سرزمین پر فوجی پروازیں کی جاسکیں گی۔''[66] جب یہ کانفرنس 21رفروری کو ختم ہوئی تو اس وقت تیونس، مراکش اور الجیریا میں فرانسیسی سامراج کے خلاف جدوجہد آزادی شروع ہو چکی تھی جبکہ ایران ومصر میں برطانوی سامراج کے خلاف عوامی تحریکیں بہت زور پکڑ رہی تھیں۔ مارچ 1951ء کے اوائل میں شمالی افریقہ کے عوام کی جنگ آزادی کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا تو لاہور کے طلبا نے اسمبلی ہال، جہاں ایشیا

اورمشرق بعید کے اقتصادی کمیشن کا اجلاس ہو رہا تھا، کے سامنے مظاہرہ کر کے مراکش پر فرانسیسیوں کی بمباری پر سخت غم وغصے اظہار کیا اور کراچی کے چودہ اخبارات کے ایڈیٹروں نے ایک مشترکہ بیان میں مراکش کے حریت پسندوں کے نصب العین کی حمایت کا اعلان کیا۔
6/مارچ کو لاہور کے اخبار پاکستان ٹائمز نے اس امر پر ادارتی افسوس کا اظہار کیا کہ اگر چہ حکومت پاکستان محکوم مسلم اقوام سے ہمدردی کے اعلانات کرتی رہی ہے لیکن اب اس نے مراکش کے مسلمانوں کی حمایت میں کوئی مؤثر کاروائی تو بالائے طاق کوئی رسمی اعلان بھی نہیں کیا۔ وزیراعظم لیاقت علی خان ان دنوں پنجاب کے انتخابی دورے پر تھا مگر اس نے پاکستان ٹائمز کے اس اداریے کو قابل توجہ نہ سمجھا حالانکہ اس کے مخالفین اس کی سامراج نواز خارجہ پالیسی پر سخت نکتہ چینی کرتے تھے۔ حتیٰ کہ نواب افتخار حسین خان آف ممدوٹ کا کہنا یہ تھا کہ ''جب تک پاکستان برطانوی دولت مشترکہ سے منسلک رہے گا اس وقت تک اس کی خارجہ پالیسی کا تعین اینگلو۔امریکی بلاک ہی کرتا رہے گا۔ اگر ہم ایک آزاد ملک کی حیثیت میں باعزت طریقے سے رہنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی خارجہ پالیسی کو نئی شکل دینی پڑے گی تا کہ دنیا کے تمام ممالک سے دوستانہ تعلقات قائم کئے جائیں۔ بین الاقوامی تصادم کی صورت میں پاکستان کو غیر جانبدار رہنا چاہیے۔''[67]

7/مارچ کو آزاد پاکستان پارٹی کے رہنما افتخار الدین کی گوجرانوالہ میں تقریر یہ تھی کہ ''پاکستان کے برطانوی دولت مشترکہ میں شامل رہنے سے پاکستان اور پوری اسلامی دنیا کے مفاد کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ جن انگریزوں نے جبل الطارق سے لے کر انڈونیشیا تک جا بجا مسلمانوں کو غلام بنا رکھا ہے انہیں پاکستان میں لوٹ کھسوٹ کی عام اجازت ہے۔ جب تک یہاں یہ لوٹ کھسوٹ جاری رہے گی اس وقت تک پاکستان کے عوام اقتصادی طور پر خوشحال نہیں ہو سکتے۔''[68]
لیاقت علی خان کا اس قسم کی نکتہ چینی کے جواب میں کہنا یہ تھا کہ ''حزب مخالف کے پاس بس ایک ہی تعمیری تجویز ہے اور وہ یہ ہے کہ پاکستان کامن ویلتھ سے علیحدہ ہو جائے۔ لیکن میں دریافت کرتا ہوں کہ کامن ویلتھ سے علیحدگی سے فائدہ کیا ہوگا۔ کیا اس طرح کشمیر حاصل کرنے میں مدد ملے گی۔''[69] 8/مارچ 1951ء کو لیاقت علی خان نے گوجرانوالہ کے ایک انتخابی جلسہ میں دعویٰ کیا کہ ''پاکستان کی خارجہ پالیسی آزاد ہے۔ خارجہ پالیسی کے بارے میں جو فیصلے کئے جاتے ہیں ان پر کوئی مصلحت اثر انداز نہیں ہوتی ماسوائے اس کے کہ دنیا میں امن برقرار رہے۔ پاکستان کی

خارجہ پالیسی کی بنیادیں یہ ہیں کہ دنیا کے سارے ممالک سے دوستانہ تعلقات قائم کئے جائیں۔ مسلم ممالک سے برادرانہ تعلقات استوار کئے جائیں، جو مسلم ممالک ابھی تک غیر ملکی غلامی میں ہیں ان کی سیاسی آزادی کی حمایت کی جائے اور دنیا میں امن برقرار رکھنے کے لئے دوسرے ممالک سے تعاون کیا جائے۔ پاکستان نہ تو اینگلو۔امریکی بلاک کے دامن سے وابستہ ہے اور نہ ہی کمیونسٹ بلاک کا خیمہ بردار ہے۔ پاکستان ان دونوں بلاکوں کی رقابت سے بے تعلق ہے اوراس کی خارجہ پالیسی قطعی طور پر آزاد ہے۔ پاکستان نے کبھی دونوں بلاکوں کی کشمکش سے اثر قبول نہیں کیا اوراس نے اس نصب العین کی حمایت کی ہے جسے منصفانہ تصور کیا ہے۔اس حقیقت کا ثبوت اقوام متحدہ کے مباحثوں کے ریکارڈ سے مل سکتا ہے۔ہم نے صورتحال اورزیر بحث مسئلہ کے تقاضے کو پیش نظر رکھ کر کبھی ویسٹرن بلاک سے اتفاق کیا ہے اور کبھی کمیونسٹ بلاک کا ساتھ دیا ہے۔ پاکستان آزادروش اختیار کرسکتا ہے کیونکہ یہ کسی غیر ملک کے زیر بار نہیں ہے۔ دنیا کے کسی ملک نے ہماری امداد نہیں کی۔ ہم نے جو کامیابی حاصل کی ہے وہ اپنے ذرائع سے کی ہے۔ اس لئے خارجہ پالیسی میں کسی کے تابع ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''[70] حکومت پاکستان نے گزشتہ چار سال میں سوویت یونین، چین، برما، مصر، ایران اورکوریا کے بارے میں جو خارجہ پالیسی اختیار کی تھی اس کے پیش نظر لیاقت علی خان کا یہ دعویٰ مضحکہ خیز تھا۔ بلاشبہ اقوام متحدہ میں چندایک مواقع پر پاکستان نے امریکہ کا ساتھ نہیں دیا تھا۔لیکن اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ پاکستان کی خارجہ پالیسی آزاد تھی بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ زیر بحث مسئلہ کے بارے میں امریکہ اور برطانیہ میں اتفاق رائے نہیں تھا مثلاً اقوام متحدہ میں ہندوستانی مندوب بی۔این۔ رائے کے بقول ''کوریا کی جنگ کے بارے میں برطانیہ کی پالیسی دوغلی تھی۔ وہ ظاہراً اس مسئلہ پر بحث کے دوران امریکہ کا ساتھ دیتا تھا لیکن اندر خانے کامن ویلتھ کے رکن ممالک کو مشورہ دیتا تھا کہ امریکہ کی مخالفت کرو۔''[71]

اقوام متحدہ میں پاکستان کے رویے کا تعین برطانیہ کی مختلف مسائل کے بارے میں اسی قسم کی پالیسی کے زیر اثر ہوتا تھا۔ لیاقت علی خان نے اپنی اس تقریر میں اس نکتہ چینی کا کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ پاکستان مصر اور ایران کے قوم پرستوں اور مراکش، الجیریا اور تیونس کے حریت پسندوں کی اس طرح کھلم کھلا حمایت کیوں نہیں کرتا تھا جس طرح کہ اس نے کمیونسٹوں کے خلاف برما اور جنوبی کوریا کی حکومتوں کی حمایت کی تھی۔ مراکش، الجیریا اور تیونس کے حریت

پسندوں کے مندوبین مؤتمر عالمی اسلامی کانفرنس میں شریک ہوئے تھے۔ان مندوبین میں تیونس کا بورقیبہ بھی شامل تھا۔ ان مندوبین نے اپنی تقریروں اور اخباری بیانات میں پاکستان سے امداد طلب کی تھی مگرانہیں کوئی مثبت جواب نہیں ملا تھا۔لیاقت علی خان نے اس کانفرنس میں جو تقریر کی تھی اس میں شمالی افریقہ کے مسلم عوام کی جدوجہد آزادی کا کوئی ذکر نہیں تھا۔چودھری خلیق الزماں کا بیان یہ تھا کہ مسلم ممالک شمالی افریقہ کو اسلحہ گولہ بارود نہیں بھیج سکتے کیونکہ وہ خود اس سلسلے میں مغربی طاقتوں پر انحصار کرتے ہیں۔[72]

جہاں تک پاکستان کے دوسرے ممالک کے زیر بار نہ ہونے کا تعلق تھا یہ اس لئے نہیں تھا کہ حکومت پاکستان خود انحصاری کی پالیسی پر عمل پیرا تھی اور اس نے اپنی ''آزاد خارجہ پالیسی'' کے تقاضے کے تحت غیر ممالک سے قرضے اور مالی امداد کی استدعا نہیں کی تھی بلکہ اس لئے تھا کہ برطانیہ کا دوسری جنگ عظیم میں دیوالیہ نکل چکا تھا۔ وہ کسی ایشیائی ملک کو کوئی قابل ذکر مالی امداد یا قرضہ دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا اور امریکہ نے مالی امداد کے سلسلہ میں اولیت مغربی یورپ، یونان، ترکی، ایران اور جنوبی کوریا کو دی تھی۔ایشیا کے لئے صدر ٹرومین کا چار نکاتی پروگرام فراڈ تھا اور اس کے تحت صرف ''ٹیکنیکل امداد'' ہی دی جاسکتی تھی۔ برطانیہ کے کولمبو پلان کی حالت بھی ایسی ہی تھی۔لیاقت علی خان نے 8 ستمبر 1949ء کو پاکستان کونسل آف انڈسٹریز کے افتتاحی اجلاس میں غیر ملکی سرمایہ داروں سے درخواست کی تھی کہ وہ پاکستان میں سرمایہ کاری کریں مگر برطانیہ، امریکہ اور مغربی یورپ کے کسی ملک کے کسی سرمایہ دار نے پاکستان میں سرمایہ لگانے میں دلچسپی ظاہر نہیں کی تھی۔مئی 1950ء میں لیاقت علی خان نے اپنے دورہ امریکہ وکینیڈا کے دوران اپنی استدعا کا کئی بار اعادہ کیا مگر ان دونوں ممالک کی کسی کمپنی نے ان استدعاؤں کو قابل اعتنا نہیں سمجھا تھا۔لیاقت نے حکومت امریکہ سے بھی مالی امداد مانگی تھی مگر وہاں سے بھی کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ قبل ازیں پاکستان کا وزیر خزانہ غلام محمد کئی مرتبہ مغرب کے سرمایہ دار ممالک کو پسماندہ وغریب ایشیائی ممالک کی اقتصادی وصنعتی ترقی کی ضرورت کا احساس دلانے کی ناکام کوشش کر چکا تھا۔ اگست 1950ء میں حکومت پاکستان نے بین الاقوامی تعمیراتی وترقیاتی بینک سے 75 کروڑ روپے کا قرضہ مانگا مگر مارچ 1951ء تک اس کی یہ درخواست منظور نہیں ہوئی تھی۔

باب: 11

مشرق وسطیٰ پر غلبہ کے لئے امریکہ اور برطانیہ میں کشمکش اور برطانیہ نواز لیاقت علی خان کا قتل

ایران میں برطانوی تیل کی کمپنی کے انخلا اور مصر میں سویز سے برطانوی انخلا کے لئے ایرانی اور مصری عوام کا ایجی ٹیشن

9/مارچ 1951ء کو حکومت پاکستان نے ایک سرکاری اعلان میں انکشاف کیا کہ پاکستان کی افواج کے بعض افسروں کو حکومت پاکستان کا تختہ الٹنے کی سازش کرنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے۔ اس سازش میں کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے سرکردہ لیڈر بھی ملوث تھے اور گرفتار شدگان میں پاکستان ٹائمز کا ایڈیٹر فیض احمد فیض بھی شامل تھا۔ 11/مارچ کو پاکستان کی بری فوج کا ایک سات رکنی خیر سگالی مشن میجر جنرل محمد یوسف خان کی سربراہی میں ایران کے دس روزہ دورے پر روانہ ہوا جہاں برطانوی سامراج کے خلاف عوامی غم وغصہ کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ تودہ پارٹی جسے فروری 1949ء میں غیر قانونی قرار دے دیا گیا تھا اب فروری 1951ء کے دوسرے ہفتے میں نئے روپ میں منظر عام پر آ گئی تھی اور اس کی زیر قیادت ایرانی عوام کا مطالبہ یہ تھا کہ اینگلو۔ایرانین آئل کمپنی کو قومی ملکیت میں لیا جائے۔ 7/مارچ کو ایران کے وزیر اعظم جنرل رزم آرا کو تہران کی ایک مسجد میں قتل کر دیا گیا تھا۔ قاتل اس مسجد کا ایک قاری بنام عبداللہ دستگیر تھا جو ایک انتہا پسند مذہبی تنظیم فدائیان اسلام کا رکن تھا۔ چونکہ جنرل رزم آرا اینگلو۔ایرانین آئل کمپنی کو قومی ملکیت میں لینے کے مطالبہ کے خلاف تھا اس لئے مغربی اخبارات کا الزام یہ تھا کہ یہ قتل سوویت یونین کی سازش کا نتیجہ ہے لیکن سوویت یونین کا اخبار پراودا اس قتل کی ذمہ داری امریکی ایجنٹوں پر

عائد کرتا تھا۔ یہ اخبار اپنے اس الزام کی تائید میں دلائل پیش کرتا تھا کہ اگرچہ جنرل رزم آرا اینگلو ایرانین آئل کمپنی کو قومی تحویل میں لینے کے خلاف تھا تاہم وہ سوویت یونین کے ساتھ دوستانہ روابط بڑھانے کے حق میں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے نہ صرف سوویت یونین کے ساتھ تجارتی معاہدہ کیا تھا بلکہ اس نے دونوں ملکوں کے مفاد میں کئی اور معاہدے بھی کئے تھے۔ اس نے امریکہ کے نام نہاد مالی مشیر کو ایران سے نکل جانے کا حکم دیا تھا اور اس نے ریڈیو تہران سے سوویت مخالف مواد کو نشر کرنے کی مخالفت کر دی تھی جو وائس آف امریکہ مہیا کرتا تھا۔ مزید برآں اس نے کئی امریکی کارپوریشنوں اور ان کے مشیروں کے ساتھ کئے گئے معاہدے منسوخ کر دیئے تھے۔[1]

12 / مارچ کو ایرانی مجلس نے شاہ ایران کے نامزد امیدوار حسین اعلیٰ پاشا کے وزارت عظمیٰ کے عہدے پر تقرری کی منظوری دے دی۔ حسین اعلیٰ کے حق میں 69 ووٹ اور مخالفت میں 27 ووٹ پڑے جبکہ 10 ارکان نے رائے شماری میں حصہ نہ لیا۔ 15 / مارچ کو ایرانی مجلس نے سپیشل آئل کمیٹی کے 8 / مارچ کے اس فیصلے کی توثیق کر دی کہ ملک میں تیل کی تنصیبات کو قومی تحویل میں لے لیا جائے لیکن تودہ پارٹی مجلس کے اس فیصلے سے مطمئن نہ ہوئی اس کا 16 / مارچ کو تہران کے ایک بہت بڑے جلسہ عام میں اعلان یہ تھا کہ یہ فیصلہ نامکمل ہے اور اس کا فائدہ امریکی سامراج کو پہنچے گا۔ جس دن تہران میں تودہ پارٹی کا یہ اجلاس ہوا اس دن امریکہ کا وزیر خارجہ جارج میگھی پاکستان اور امریکہ کے باہمی مفاد کے مسائل پر بات چیت کرنے کے لئے کراچی میں تھا۔ 15 / مارچ کو جب اس نے یہاں ایک پریس کانفرنس کو خطاب کیا تھا تو اس سے استفسار کیا گیا تھا کہ آیا وہ اسلامی بلاک کی تشکیل کی حمایت کرے گا یا نہیں؟ اس پر اس کا جواب یہ تھا کہ امریکہ نے اقوام کی گروپنگ کی حمایت کی ہے۔ اقوام متحدہ کے چارٹر میں ایسی گروپنگ کی گنجائش موجود ہے۔[2] اس کے اس گول مول جواب کا مطلب یہ تھا کہ چونکہ فی الحال مشرق وسطیٰ میں بوجوہ کسی بلاک کی تشکیل کا امکان نظر نہیں آتا تھا اس لئے امریکہ اس سلسلے میں ابتدائی اقدام کے طور پر ایتھنز سے لے کر نئی دہلی تک دوطرفہ معاہدوں کے ذریعے فوجی اڈے حاصل کرنے کا خواہاں ہے چنانچہ ٹائمز آف انڈیا کی اطلاع یہ تھی کہ ”امریکی پاکستانی فوجی معاہدے کے لئے مذاکرات جاری ہیں۔ اس معاہدہ کے ماتحت امریکہ کو دو فوجی اڈے مغربی پاکستان اور دو اڈے مشرقی پاکستان میں مل جائیں گے۔“[3]

اسلامی بلاک کے بارے میں میگگھی کے پرامید نہ ہونے کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ ایران کی طرح مصر میں بھی سامراج دشمن تحریک ایک قومی تحریک کی صورت اختیار کر رہی تھی۔ 17/مارچ کو قاہرہ کے ہفت روزہ الیوم کی اطلاع یہ تھی کہ ''مصری پارلیمنٹ کے بہت سے ارکان نے نہر سویز کی کمپنی کو قومی ملکیت بنانے کے لئے سلسلہ جنبانی شروع کر دی ہے۔ یہ ارکان ایران کی تیل کی صنعت کو قومی بنانے کے لئے ایرانی پارلیمنٹ میں پیش شدہ مسودۂ قانون کی بنا پر ایک مسودۂ قانون مصری پارلیمنٹ میں پیش کرنے والے ہیں۔ نہر سویز کی کمپنی پر فرانس کا کنٹرول ہے لیکن اس میں برطانوی حکومت کے 45 فیصدی حصص ہیں۔ دو سال قبل ایک معاہدے کی رو سے مصری حکومت بھی کمپنی کے منافع میں 7 فیصدی کی حصہ دار بن گئی تھی۔''[4] 18/مارچ کو قاہرہ سے خبر یہ تھی کہ دنیائے عرب کے تعلق سے اینگلو۔امریکی بلاک کے طرز عمل پر مصری پریس نے ایک بار پھر کڑی نکتہ چینی کی ہے۔ مغربی طاقتوں کی پالیسی سے عرب ممالک کو جس قدر مصائب اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑا ہے، اس سے بیزار ہو کر عرب جرائد نے ممالک عربیہ کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ کسی اور طاقت کا ساتھ دیں خواہ یہ طاقت دنیا بھر کے شیاطین ہی پر مشتمل کیوں نہ ہو۔ وفدی جماعت کے اخبار ''الندیٰ'' نے امریکہ پر یہ الزام عائد کیا ہے کہ چھوٹی قوموں کے امور اور قسمتوں سے نمٹنے میں وہ سامراجی پالیسی اختیار کئے ہوئے ہیں۔ یہ الزام بھی عائد کیا جا رہا ہے کہ امریکہ اپنی مشرق وسطیٰ کی پالیسی تشکیل دیتے وقت عرب ممالک سے مشورہ کرنا بھی مناسب نہیں سمجھتا۔ ''ہمارے مشورہ کے بغیر جو پالیسی بھی مرتب کی جائے گی اس کے ہم پابند نہیں رہیں گے۔'' ان الفاظ میں اس اخبار نے انتباہ کر دیا ہے۔ مغربی طاقتوں سے یہ مطالبہ کرتے ہوئے کہ وہ مصر اور مشرق وسطیٰ کے بارے میں ایسی حکمت عملی پر نظر ثانی کریں۔ ''الاہرام'' نے کہا ہے کہ ''ہر عرب یہ محسوس کرتا ہے کہ موجودہ مغربی پالیسی کی اساس عرب وقار اور موقف کی مکمل بے قدری پر ہے۔''[5]

ایران، ترکی اور پاکستان کے مابین وفود کے تبادلے اور عوامی سطح پر سامراج دشمن مظاہرے

23/مارچ کو پاکستان کا فوجی وفد ایران سے واپس کراچی پہنچا۔ اس وفد کے ایران میں تقریباً دو ہفتے کے دورے کے دوران وہاں سرکاری سطح پر اس کی خاصی آؤ بھگت کی گئی۔ وفد

نے شاہ ایران کے علاوہ نئے وزیر اعظم حسین اعلیٰ سے ملاقات کی اور متعدد فوجی مراکز اور تنصیبات کا معائنہ کیا۔ 22 /مارچ کو ایران کے کمانڈر انچیف نے وفد کے اعزاز میں ایک استقبالیہ دیا جس میں تقریروں کے ذریعے امید ظاہر کی گئی کہ آئندہ پاکستان اور ایران کے درمیان اخوت و دوستی کے جذبات میں اضافہ ہوگا۔ تاہم عوامی سطح پر اس وفد کا کوئی نوٹس نہ لیا گیا کیونکہ 7 /مارچ کو وزیر اعظم رزم آرا کے قتل کے بعد پورا ایران برطانوی سامراج کی دشمنی کے جذبہ سے بے انتہا مغلوب ہو چکا تھا۔ 11 /مارچ کو یہ وفد تہران پہنچا تو اس کے تین چار دن بعد 15 /مارچ کو ایرانی مجلس نے اینگلو۔ ایرانین آئل کمپنی کو قومی ملکیت میں لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس فیصلے کے اگلے دن کالعدم تودہ پارٹی نے اپنی ایک ذیلی تنظیم کے زیر اہتمام ایک بہت بڑا جلسہ عام کر کے یہ واضح کر دیا تھا کہ اب اسے برسر اقتدار آنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ ایرنی مجلس کے اس فیصلے اور تودہ پارٹی کے اس مظاہرے کی دھمک پورے مشرق وسطیٰ میں محسوس کی گئی۔ چنانچہ نہ صرف مصر میں سویز کمپنی کو قومی ملکیت میں لینے کا مطالبہ زور پکڑ گیا بلکہ عراق میں بھی یہ مطالبہ شروع ہو گیا کہ مغربی بلاک اور روسی بلاک کے درمیان موجودہ سرد جنگ میں اور ممکنہ گرم جنگ میں غیر جانبداری کی پالیسی اختیار کرنی چاہیے[6] اور یہ کہ عراق میں جو غیر ملکی تیل کمپنیاں ہیں انہیں قومی تحویل میں لیا جائے۔[7]

18 /مارچ کو ایران کے نئے وزیر اعظم حسین اعلیٰ نے اپنی نئی کابینہ بنانے کی کوشش کی مگر اسے کامیابی نہ ہوئی کیونکہ جن ارکان مجلس کو اس نے وزارتوں کے لئے نامزد کیا تھا ان میں سے چار نے یہ عہدے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ 19 /مارچ کو مقتول جنرل رزم آرا کے وزیر تعلیم کو تہران یونیورسٹی میں گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا اور وہ زخموں کی تاب نہ لا کر دو چار دن کے بعد جاں بحق ہو گیا۔ یہ واردات بھی فدائیان اسلام کی تنظیم نے کرائی تھی جو سوویت یونین کے الزام کے مطابق امریکی سامراج کی پروردہ تھی۔

20 /مارچ کو ایرانی سینیٹ نے مجلس کے 15 /مارچ کے فیصلے کی توثیق کر دی تو اسی دن پورے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا کیونکہ تودہ پارٹی کی تحریک پر اینگلو۔ ایرانین آئل کمپنی کے مزدوروں اور دوسرے ملازمین کی ہڑتال نے تیل کی پوری صنعت کو مفلوج کر دیا تھا اور نامزد وزیر اعظم حسین اعلیٰ کی جانب سے حکومت نہ بنا سکنے کی وجہ سے پورے ملک کا نظم و نسق درہم برہم ہو گیا تھا اور برطانوی وزیر خارجہ ہربرٹ موری سن (Herbert Morison) کا پارلیمنٹ

میں اعلان یہ تھا کہ ''برطانیہ کی ہمیشہ سے پالیسی رہی ہے کہ ایران کی آزادی کے تحفظ میں ہر ممکن مدد دی جائے گی۔'' ایران کی ''آزادی کے تحفظ'' کا مطلب یہ تھا کہ اینگلو۔ایرانین آئل کمپنی کے استحصالی کاروبار کا تحفظ کیا جائے گا۔ یہ کمپنی ایران سے سالانہ تقریباً تین کروڑ ٹن تیل حاصل کرتی تھی۔ اس کے تیل بردار جہازوں کی تعداد 140 تھی اور یہ تیل صاف کرنے کے 12 کارخانے چلاتی تھی۔ کویت سے سالانہ جو ایک کروڑ 70 لاکھ ٹن تیل نکالا جاتا تھا اس کا 50 فیصدی حصہ بھی اس کمپنی کو ملتا تھا اور توقع تھی کہ کویت میں تیل کی پیداوار عنقریب تین کروڑ ٹن تک پہنچ جائے گی۔ عراق سے جو سالانہ 60 لاکھ ٹن تیل نکالا جاتا تھا اس میں سے بھی 25 فیصدی حصہ اس کمپنی کو ملتا تھا اور قطر کے تیل میں اس کی حصہ داری تھی۔''[8]

تاہم سعودی عرب کے تیل میں اس برطانوی کمپنی کا کوئی حصہ نہیں تھا۔ اس تیل پر امریکی کمپنی ''آرامکو'' کی اجارہ داری تھی۔ اس کمپنی نے 1951ء کے پہلے دو مہینوں میں یہاں سے 35,141,341 بیرل تیل نکالا تھا۔ یہ مقدار مشرق وسطیٰ کے تیل کے باقی سارے چشموں کی مجموعی پیداوار سے زیادہ تھی۔ تاہم سعودی عرب کے وزیر خارجہ شہزادہ فیصل کا اعلان یہ تھا کہ ایران میں تیل کی صنعت کو قومیانے کی کاروائی کا سعودی عرب میں تیل کی صنعت کے مستقبل پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔''[9]

جب پاکستان کا فوجی وفد ایران سے واپس آیا تھا تو ترکی کا ایک خیرسگالی فوجی وفد کراچی پہنچا ہوا تھا۔ 23 مارچ کو وزیراعظم لیاقت علی خان نے اس وفد کے اعزاز میں ایک استقبالیہ دیا جس میں تقریباً 400 مہمانوں نے شرکت کی۔ 25 مارچ کو اس وفد کے ارکان کوئٹہ پہنچے جہاں چار پانچ دن قیام کے دوران ان کی بڑی خاطر تواضع کی گئی۔ یکم اپریل کو یہ فوجی وفد راولپنڈی پہنچا جہاں اس نے چار دن تک قیام کیا اور پھر 5 اپریل کو اس وفد نے لاہور پہنچ کر یہاں کے فوجی مراکز کا معائنہ کیا اور تاریخی مقامات کی سیر کی اور پھر دو ایک دن کے بعد یہ وفد ترکی واپس چلا گیا۔ اس وفد کے پاکستان میں آنے سے ہفتہ عشرہ قبل ایک امریکی اخبار نویس ڈریو پیئرسن (Drew Pearson) نے استنبول سے یہ خبر نامہ بھیجا تھا کہ ''نیو یارک سے آنے والا تقریباً ہر امریکی بل ڈوزر ترکی لا رہا ہے۔ کیونکہ یہاں سوویت یونین کے خلاف ہوائی اڈوں سے ایک جال بچھایا جا رہا ہے۔ کریمیا کے علاوہ ترکی کے دوسرے حصوں میں بھی لڑاکا طیاروں

کے لیے اترنے کی جگہ بنائی جارہی ہے۔البرص میں ساحل کے نزدیک امریکہ کی ایک چوکی قائم کردی گئی ہے۔شمالی افریقہ میں بھی امریکہ کے جو اڈے بنائے گئے ہیں ان کی زد میں روس کے بڑے بڑے صنعتی شہر ہیں۔ترکی میں ٹرومین کا جو اصول برتا جارہا ہے اور جو رقم صرف ہورہی ہے اس سے منافع بھی ہوگا۔عام خیال یہ ہے کہ ماسکو کا ارادہ یہ ہے کہ اس موسم بہار میں ایران میں داخل ہوجائے۔پھر عراق کے تیل سے بھرپور علاقے سے گزرتا ہوا سعودی عرب پہنچے۔وہ اس طرح ترکی کو چھوڑتا ہوا، ترک فوج سے الجھے بغیر گزر جائے گا لیکن ترکی بالکل محصور ہو جائے گا۔"[10] پیئرسن کا یہ خبرنامہ لیک سیکس کی 26ر مارچ کی (جبکہ ترکی کا فوجی مشن کوئٹہ میں تھا) اس خبر کا پیش خیمہ تھا کہ "امریکہ ایتھنز سے لے کر نئی دہلی تک سوویت مخالف علاقہ قائم کررہا ہے اور اس مقصد کے لئے اس سارے علاقے میں فوجی اڈے قائم کئے جائیں گے۔اس وقت مراکش کی پورٹ لیوئی میں اور طرابلس (اٹلی) اور دہران (سعودی عرب) میں امریکہ کے ہوائی اڈے قائم ہیں اور یونان میں ایسے متعدد اڈے بنائے جارہے ہیں۔ترکی اور یونان معاہدہ اوقیانوس میں شرکت کے خواہاں ہیں اور یہاں کے اخبارات نے اس سلسلے میں تاخیر پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔دوسری خبروں کے مطابق ترکی اور یونان پر حملہ کی صورت میں امریکی فضائیہ اور بحریہ ان ملکوں کی مدد کرے گی لیکن امریکہ بری افواج بھیجنے کا وعدہ نہیں کرسکتا۔"[11] 29ر مارچ کو برطانیہ کی کنزرویٹو پارٹی کے ترجمان اخبار ڈیلی ٹیلیگراف نے ایران کی موجودہ بدامنی پر سخت افسوس کا اظہار کیا۔اخبار نے لکھا کہ فدائیان اسلام (امریکہ نواز) اور تودہ پارٹی (روس نواز) کی دھمکیاں مؤثر ثابت ہورہی ہیں۔دوسری طرف اینگلو۔ایرانین آئل کمپنی یہ پیشکش کرنے کو تیار ہے کہ ایران کو کمپنی کے منافع کا مناسب حصہ ملے لیکن قوم پرستی کے جذبے نے دہشت پسندی کے ذریعے ایرانی عوام کو اپنے مفاد کے بارے میں اندھا کررکھا ہے۔اخبار کی رائے یہ تھی کہ موجودہ مشکلات کی وجہ مشرق وسطیٰ کی خصوصاً مصر کے سلسلہ میں برطانیہ کی کمزور پالیسی ہے برطانیہ اور امریکہ کو اب مضبوط اور متوازن پالیسی اختیار کرنی چاہیے۔"[12] 31ر مارچ کو لندن کے ہفت روزہ اکونومسٹ کا اداریہ یہ تھا کہ مراکش سے لے کر کراچی تک سارے عالم اسلام میں جو ہیجان پایا جاتا ہے اب ایران اس کا مرکز بن گیا ہے۔تہران میں بحران کی زیادہ تر ذمہ داری دو بڑی طاقتوں کے عزائم اور مقامی سیاسی لیڈروں کی حمایت پر عائد ہوتی ہے۔"[13]

مشرق وسطیٰ میں امریکہ اور برطانیہ کے مابین مفادات کی کشمکش اور مشرق وسطیٰ کا دفاعی منصوبہ

2/اپریل 1951ء کو قاہرہ کے اخبار الاہرام نے یہ اطلاع دی کہ شاہ عبداللہ والئی شرق اردن ایک اسلامی بلاک تشکیل دینے کے مسئلہ میں دلچسپی لے رہا ہے۔ شاہ عبداللہ نے اس سلسلہ میں ترکی اور ایران کے ساتھ ابتدائی بات چیت بھی کر لی ہے۔ شرق اردن نے یہ قدم عرب لیگ پر کڑی نکتہ چینی کے فوراً بعد اٹھایا ہے۔ ابھی چند دن ہوئے شرق اردن کے وزیر اعظم سمیری پاشا نے عرب لیگ پر نکتہ چینی کرتے ہوئے افسوس ظاہر کیا تھا کہ آج سے چھ سال پہلے عرب لیگ عربوں کے درمیان اتحاد و تعاون کے جن مقاصد کے لئے قائم کی گئی تھی وہ ان کی تکمیل میں بری طرح ناکام رہی ہے۔ اگر باہمی ضد اور متصادم مقاصد کا خاتمہ نہیں ہوگا تو عرب رائے عامہ کا عرب لیگ پر سے اعتماد اٹھتا چلا جائے گا۔ تیل سے مالا مال اس علاقے میں عرب لیگ ہی ایک علاقائی بلاک ہے اور اس حیثیت سے یہ تنظیم مغربی طاقتوں کے دفاعی منصوبہ کا اہم ستون بن سکتی ہے۔''[14] 4/اپریل کو جبکہ اینگلو۔ ایرانین آئل کمپنی کے مزدوروں اور دوسرے ملازمین کی ہڑتال جاری تھی۔ تہران سے یہ خبر آئی کہ ''وزیر اعظم حسین اعلیٰ نے پولیس کے ایک سابق سربراہ جنرل فضل اللہ زاہدی کو وزیر داخلہ مقرر کیا ہے اور ایرانی افواج کے ایک سابق چیف آف سٹاف کو وزیر مواصلات مقرر کیا ہے۔''[15] 6/اپریل کو ایک برطانوی وفد یہ تجویز لے کر واشنگٹن پہنچا کہ ''مشرق وسطیٰ میں مغربی مفادات کو قومی ملکیت میں لینے اور رائلٹیز (Royalties) کی شرح میں اضافہ کے جو مطالبات کئے جا رہے ہیں ان کے بارے میں برطانیہ اور امریکہ کو مشترکہ رویہ اختیار کرنا چاہیئے۔''[16] برطانیہ کی اس تجویز کا پس منظر یہ تھا کہ امریکہ دوسری جنگ عظیم کے بعد مشرق وسطیٰ میں برطانوی مفادات کی مسلسل بیخ کنی کر رہا تھا۔ اس نے مصری حکومت اور عرب لیگ کے ذریعے برطانیہ کے عظیم تر شام یا عرب فیڈریشن یا اسلامی بلاک کے منصوبے کو سبوتاژ کیا تھا۔ وہ مصر میں اس مطالبہ کی اخوان المسلمین کے ذریعے پس پردہ حوصلہ افزائی کرتا تھا کہ وہاں سے برطانوی فوجوں کو نکالا جائے اور وہ ایران میں بھی فدائیان اسلام کی تنظیم کے ذریعے اینگلو۔ ایرانین آئل کمپنی کو قومیانے کی تحریک کو ہوا دے رہا تھا جبکہ سوویت یونین یہی کام تودہ پارٹی کے ذریعے کر رہا تھا۔

7 رمارچ 1951ء کو ایران کے وزیراعظم رزم آرا کے قتل کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ ایران میں امریکی مفادات کے فروغ کے راستے میں حائل تھا۔ اس کی جگہ حسین اعلیٰ کی کمزور حکومت بنی تھی جس کو اب امریکہ نواز جنرل زاہدی کی شمولیت سے اس امید میں تقویت پہنچائی گئی تھی کہ وہ امریکی مفادات کے راستے میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہونے دے گا۔ 6 راپریل کو ایران کی اس نوساختہ کابینہ کا اجلاس ہوا تو ملک میں 20 رمارچ سے نافذ شدہ مارشل لاء اٹھا لیا گیا اور پھر 9 راپریل کو واشنگٹن میں امریکہ اور برطانیہ کے درمیان بات چیت شروع ہونے سے پہلے امریکہ کے محکمہ خارجہ کے ایک ترجمان نے بتایا کہ ''ایران میں تیل کے ذخائر کو قومیانے کے سوال پر امریکہ کی پوزیشن معین نہیں ہے۔''[17] امریکی ترجمان کے اس بیان کا مطلب یہ تھا کہ امریکہ ایران کی تیل کی دولت پر سے برطانیہ کی اجارہ داری ختم کر کے اس پر بلاواسطہ یا بالواسطہ اپنی اجارہ داری قائم کرنے کا متمنی تھا۔ سوویت یونین کے اخبار ''پراودا'' کا اس صورتحال پر تبصرہ یہ تھا کہ امریکہ برطانیہ کے ساتھ اپنے فوجی اشتراک عمل سے فائدہ اٹھا کر مشرق وسطیٰ میں بڑی تیزی کے ساتھ وہ معاشی پوزیشن حاصل کر رہا ہے جو برطانیہ کو حاصل رہی ہے۔ امریکیوں نے سعودی عرب کے تیل کے ذخائر پر پہلے ہی قبضہ کر لیا ہے اور اب وہ برطانیہ کو عراق اور ایران سے نکالنے کی سازش کر رہے ہیں۔ امریکہ کے نائب وزیر خارجہ میگ گھی نے حال ہی میں مشرق وسطیٰ کا جو دورہ کیا ہے وہ اینگلو۔ ایرانین آئل کمپنی کے قومیانے، ایران کے وزیراعظم رزم آرا کے قتل اور ترکی کی حکومت میں تبدیلیوں کے واقعات سے بے تعلق نہیں ہے۔ امریکی ایران کو قرضے دے کر وہاں کے تیل پر قبضہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ امریکہ کے زیر سرپرستی بحیرہ روم کے علاقے میں بلاک بنانے کا جو منصوبہ تیار کیا گیا ہے اس کا مقصد سارے مشرق وسطیٰ پر امریکہ کی بالادستی قائم کرنا ہے۔ برطانوی حکمران اب اس حقیقت کو نہیں چھپا سکتے کہ وہ اپنے آپ کو امریکی سامراجیوں کے ساتھ منسلک کر کے امریکہ کے جال میں پھنس گئے ہیں۔ امریکی مغربی یورپ اور مشرق بعید پر مکمل کنٹرول قائم کر چکے ہیں اور اب وہ بحیرہ روم کے علاقے میں، ایران میں اور آسٹریلیا میں اپنی ایمپائر مرتب کر رہے ہیں۔''[18] دوسری طرف برطانیہ کی خواہش اور کوشش یہ تھی کہ پاکستان، شرق اردن اور عراق کی برطانیہ نواز حکومتوں کی مدد سے مشرق وسطیٰ میں کوئی ایسا بلاک وجود میں آجائے جو اس علاقے میں برطانوی مفادات کی نگہبانی کے فرائض سرانجام دے۔

اس کی یہ بھی خواہش اور کوشش تھی کہ دولت مشترکہ کے رکن ممالک کا کوئی ایسا فوجی گٹھ جوڑ ہو جائے جو نہ صرف جنوبی و جنوب مشرقی ایشیا میں بلکہ مشرق وسطیٰ میں بھی برطانوی مفادات کا تحفظ کرے۔ جنوری 1951ء میں دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کی جو کانفرنس ہوئی تھی اس میں یہ تجویز زیر بحث آئی تھی۔ اس بحث میں پاکستان، ہندوستان اور سیلون کے وزرائے اعظم کو شامل نہیں کیا گیا تھا اگرچہ برطانوی حکام نے پاکستان اور سیلون کے وزرائے اعظم سے ان کی دفاعی مسائل کے بارے میں الگ الگ بات چیت کی تھی۔ ''جب مئی میں کامن ویلتھ ڈیفنس کانفرنس ہوگی تو مشرق وسطیٰ ایک ایسا علاقہ ہوگا جس کے دفاعی منصوبے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہوگی۔ ایسی علامتیں موجود ہیں کہ اب امریکہ مشرق وسطیٰ کو دفاعی نظام میں باندھنے کے لئے اہم کردار ادا کرنے پر آمادہ ہے۔''[19]

9/ اپریل کو برطانیہ کے اخبار سکاٹس مین (Scotsman) کی اطلاع یہ تھی کہ ''ترکی نے مشرق وسطیٰ کے دفاعی معاہدہ کا ایک منصوبہ عراقی وزارت خارجہ کو روانہ کیا ہے۔ اس منصوبہ کو امریکہ کی حمایت بھی حاصل ہے۔ عنقریب ایک یادداشت شائع کی جائے گی جس کے بعد ترکی کا وزیر خارجہ عرب دارالحکومتوں کا دورہ کرے گا۔ حال ہی میں دمشق میں متعین امریکی وزیر مختار نے یہ کہا تھا کہ امریکہ عرب ممالک کو متحد کرنے کی سرگرمیوں کا مخالف نہیں ہے اور جو ریاستیں مغرب سے مل کر اپنی دفاعی پالیسی متعین کریں گی انہیں امریکہ اسلحہ بھی دے گا۔ سفیر کے اس اعلان کے بعد یہ منصوبہ پیش ہوا ہے۔ ترکی کے نقطہ نظر سے اس مسئلہ کا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ ایک ایسا علاقائی نظام مرتب کیا جائے جس میں اسرائیل بھی شریک ہو سکے۔ ایسا نہ ہوا تو پھر وہی صورت پیدا ہو جائے گی جو جنگ سے پہلے اتحاد بلقان میں بلغاریہ کی عدم شرکت سے پیدا ہوئی تھی۔ ترکی عراق کو آمادہ کر رہا ہے کہ وہ اب اسرائیل سے جھگڑے کو بھول جائے۔''[20] دمشق میں متعین امریکی وزیر مختار کا یہ بیان فروری 1951ء کے دوسرے ہفتے میں ایک مقامی اخبار ''الجبل'' میں شائع ہوا تھا۔ اس بیان میں اس نے کہا تھا کہ ہم امریکی اس اتحاد کی حمایت کرتے ہیں بشرطیکہ (1) یہ اتحاد، مساوی بنیاد پر ہو اور کوئی حکومت دوسرے رکن ممالک پر اپنا کنٹرول قائم نہ کرے۔ (2) یونین کسی غیر ملکی طاقت یعنی امریکہ، برطانیہ یا سوویت یونین کی پٹھو نہ ہو۔ (3) جو ممالک یونین میں شامل نہ ہونا چاہیں انہیں اس پر مجبور نہیں کرنا چاہیے اور نہ ہی کسی حکومت کو اس معاہدے

میں شمولیت کی ممانعت ہونی چاہیے۔[21] امریکی سفیر نے یہ بیان شام کے وزیراعظم کی جانب سے جنوری 1951ء کے اواخر میں منعقدہ عرب لیگ کے اجلاس میں اس تجویز پر تبصرہ کرتے ہوئے دیا تھا کہ موجودہ عرب ملکوں کو ملا کر ایک متحدہ عرب مملکت قائم کی جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم از کم یہ کیا جائے کہ موجودہ عرب ملکوں کی ایک فیڈریشن قائم کر دی جائے اور دفاع اور خارجہ پالیسی اس فیڈریشن کے ہاتھ میں ہو۔ امریکی سفیر کی ان تین شرائط کا مطلب یہ تھا کہ (1) مجوزہ عرب فیڈریشن پر برطانیہ کی پٹھو عراقی حکوت کی بالادستی نہ ہو۔ (2) اس فیڈریشن پر برطانیہ کا غلبہ نہ ہو اور (3) اسرائیل و ترکی کو اس فیڈریشن میں شامل ہونے سے نہ روکا جائے۔ بیشتر عرب فرمانرواؤں کے لئے امریکی سفیر کی یہ شرائط قابل قبول تھیں لیکن عرب عوام کی سامراج دشمنی ان کے راستے میں حائل تھی۔ تاہم سکاٹس مین کے ایڈیٹر کے اس بیان کے چند دن بعد واشنگٹن میں متعین مصری سفیر کامل عبدالرحیم نے تقریر کرتے ہوئے امریکہ سے کہا کہ اسے مشرق وسطیٰ اور مشرق قریب میں 20 کروڑ آبادی پر مشتمل بلاک قائم کرنے کے سلسلے میں پہل کرنی چاہیے۔ ترکی میں اس تقریر کو سراہا گیا۔ استنبول کے مبصرین نے مصری سفیر کے بیان کردہ جذبات سے اتفاق کیا اور یہ یقین ظاہر کیا کہ ایسے علاقائی بلاک کا قیام اشتراکیت کے خلاف ایک مؤثر مزاحمت ثابت ہوسکتا ہے۔"[22]

ایران میں تیل کی صنعت پر حکومت کے کنٹرول کا فیصلہ اور ڈاکٹر مصدق کا بطور وزیراعظم انتخاب

اپریل 1951ء کے آخری دو ہفتوں میں ایران میں کچھ ایسے واقعات ہوئے کہ امریکیوں نے ترکی کی وساطت سے مشرق وسطیٰ کے دفاع کے لئے جو منصوبہ پیش کیا تھا اس میں کچھ رخنہ پڑ گیا۔ ان واقعات کا خلاصہ یہ تھا کہ اگرچہ شاہ ایران نے 12/اپریل کو صوبہ خوزستان کے گورنر کو برطرف کر کے آبادان میں اینگلو۔ایرانین آئل کمپنی کے مزدوروں اور دوسرے ملازمین کی ہڑتال کو کچلنے کے لئے خاصی قوت استعمال کی تھی مگر روس نواز تودہ پارٹی کی زیر قیادت اس ہڑتال کی شدت میں اضافہ ہوتا ہی چلا گیا۔ مزدور برطانیہ اور امریکہ کے خلاف نعرے لگاتے تھے اور ایرانی پولیس اور فوج کے تشدد کے باوجود ہر روز مظاہرے کرتے تھے۔ برطانیہ نے

مزدوروں کو دھمکانے کے لئے اپنا ایک جنگی بحری جہاز اس علاقے میں بھیجا تھا مگر اس کا بھی مظاہرین پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اپریل کے آخری ہفتے میں مزدوروں کی یہ تحریک اتنی زور پکڑ گئی کہ ایرانی مجلس کی مقرر کردہ آئل کمیٹی نے یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ مجلس کی جانب سے 15/مارچ کو اور سینیٹ کی جانب سے 20/مارچ کو منظور کردہ قانون کے مطابق تیل کی صنعت کا انتظام فوری طور پر مجلس اور سینیٹ کے ارکان کے ایک جائنٹ بورڈ کے سپرد کر دیا جائے۔ جس کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا اس کا صدر ایک 70 سالہ قوم پرست لیڈر ڈاکٹر محمد مصدق تھا جسے تودہ پارٹی کی حمایت حاصل تھی حالانکہ وہ کمیونسٹ نہیں تھا بلکہ ایک اعتدال پسند زمیندار تھا۔ آئل کمیٹی کے اس فیصلہ کے پیش نظر 27/اپریل کو وزیر اعظم حسین اعلیٰ کی حکومت مستعفی ہو گئی۔ امریکیوں کے لئے یہ صورتحال بالکل غیر متوقع تھی۔ ان کے گمان میں نہیں تھا کہ ایران کے حالات میں 24 گھنٹے کے اندر اتنی تبدیلی ہو جائے گی۔[23] 29/اپریل کو ایرانی مجلس نے آئل کمیٹی کے متذکرہ فیصلہ کی توثیق کر دی اور اسی دن ڈاکٹر محمد مصدق کو وزیر اعظم منتخب کر لیا۔

مجلس میں اس مسئلہ پر بحث کے دوران جنوبی صوبہ فارس کے نمائندہ ابوالفضل فرنگی نے اعلان کیا کہ انگریز گزشتہ پچاس سال سے ہمارے تیل کی دولت لوٹتا رہا ہے لیکن اب ایرانی عوام کی آنکھیں کھل چکی ہیں۔ ایک اور نمائندہ عباس اسلامی نے کہا ”اب ہم اس معاہدہ کی زنجیروں سے آزاد ہو چکے ہیں جو 1933ء میں حکومت ایران کے اینگلو۔ ایرانین آئل کمپنی سے کیا تھا۔ نیشنلسٹ پارٹی کے اخبار ”شاہد“ نے لکھا کہ ایرانی عوام نے اپنے نصب العین کی طرف قدم بڑھانے کا فیصلہ کر لیا ہے اور وہ انگریز اور اس کے ساتھیوں کی دھمکیوں کو ہرگز خاطر میں نہیں لائیں گے۔ ایک نئے اخبار ”آتش“ نے لکھا کہ ”آج کا یہ فیصلہ تمام دنیا کے حالات پر اثر انداز ہوگا۔ ہمارے نمائندوں کو چاہیے کہ وہ اپنے ملک سے غیر ملکی اثر کو ختم کریں تا کہ اینگلو ایرانین آئل کمپنی کی سازشوں کا سلسلہ ختم ہو جائے۔“[24] 29/اپریل کو ایرانی سینیٹ نے مجلس کے فیصلے کی توثیق کر دی۔ 30/اپریل کو شاہ ایران نے ایک فرمان کے ذریعہ ڈاکٹر مصدق کو وزیر اعظم مقرر کر دیا اور یکم مئی کو ایران میں روسی سفیر نے وزیر اعظم ڈاکٹر مصدق سے ملاقات کی جو نصف گھنٹے تک جاری رہی۔

تاہم ایران کے ان واقعات سے امریکہ کا حکمران طبقہ کوئی زیادہ پریشان نہ ہوا۔ چنانچہ یکم مئی کو واشنگٹن پوسٹ کا اداریہ یہ تھا کہ ایران کے نئے وزیر اعظم کے طور پر ڈاکٹر محمد مصدق

کے تقرر سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ایران کی صنعت کو قومیانے کی کاروائی کمیونسٹوں کی چالبازی کا نتیجہ نہیں ہے۔ یہ تقریباً کلی طور پر ایرانیوں کی اپنی کاروائی ہے اور ڈاکٹر مصدق اس کا سربراہ ہے۔ ایران میں حکومت کی جو تبدیلی ہوئی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ یورپی دنیا میں قومیانے کی جو لہر اٹھی ہوئی ہے وہ ایران تک پہنچ گئی ہے۔ اینگلو۔ ایرانین آئل کمپنی سامراج کی غلامی کی علامت ہے کہ شاید قومیانے کی کاروائی موجودہ بے انصافی کی عکاسی نہیں کرتی بلکہ یہ پرانی تلخی کی مظہر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ حالات بہتر ہوئے ہیں، تاہم اینگلو۔ ایرانین کمپنی اب بھی زبردستی کرتی ہے۔"[25] واشنگٹن پوسٹ کے اس اداریے سے "پروڈا" کے 20/اپریل 1951ء کے اس اداریے کی تصدیق ہوئی کہ امریکی سامراج مشرق وسطیٰ میں برطانوی سامراج کے مفاد کی بیخ کنی کرنے میں مصروف ہے۔ واشنگٹن پوسٹ نے ایران میں تیل کی صنعت کو قومیانے کی کاروائی کی ذمہ داری ایرانی عوام یا ایرانی لیڈروں پر عائد نہیں کی تھی بلکہ اس کی رائے یہ تھی کہ برطانیہ کی لیبر حکومت نے دوسری جنگ عظیم کے بعد فولاد سازی کی صنعت، کوئلہ کی کان کنی کی صنعت، ریلوے اور بجلی وغیرہ کی سروسز اور صنعتوں کو قومیانے کی جو کاروائی کی تھی ایران میں تیل کو قومیانے کی کاروائی اس کا منطقی نتیجہ تھا۔ فرانس، اٹلی، سویڈن اور بعض دوسرے یورپی ممالک میں بھی بڑی بڑی صنعتوں کو قومی تحویل میں لے لیا گیا تھا جبکہ امریکی بورژوا بالکل بے قید معیشت کا علمبردار تھا۔ ایرانیوں کی اس کاروائی پر واشنگٹن پوسٹ کے اطمینان کی وجہ یہ تھی کہ وہ نئے وزیراعظم ڈاکٹر محمد مصدق کو اعتدال پسند لیڈر تصور کرتا تھا اور اسے امید تھی کہ اس کی کابینہ میں امریکہ نواز عناصر کا غلبہ ہوگا۔ 2/مئی کو یہ امید صحیح ثابت ہوئی جبکہ یہ پتہ چلا کہ ڈاکٹر مصدق نے شاہ ایران کے حضور میں اپنی جو بارہ رکنی کابینہ پیش کی ہے ان میں امریکہ نواز عناصر کی کمی نہیں تھی۔ جنرل فضل اللہ زاہدی بدستور وزارت داخلہ کے عہدے پر فائز تھا۔

ایران کی برطانوی شکنجے سے نکلنے کی کوشش...... پاکستان میں اسلامی اتحاد کے علمبرداروں نے اس کی حمایت نہ کی

ایرانیوں نے برطانیہ کے پچاس سالہ پرانے استحصالی شکنجے سے نجات حاصل کرنے کے لئے جو کاروائی کی تھی اس کی پاکستان کی حکومت اور یہاں کے حکمران طبقوں نے حمایت نہ

کی۔اس کی وجہ یہ تھی کہ پاکستان میں پٹ سن، چائے، کپاس اوردوسری خام اشیاء کے کاروبار پر اور تیل کی صنعت پر انگریزوں کا غلبہ تھا اور پاکستان کے بعض محب الوطن قوم پرست حلقوں کی جانب سے یہ مطالبہ ہوتا رہتا تھا کہ پاکستان کی معیشت کو انگریز سامراجیوں کی گرفت سے آزاد کیا جائے۔ چونکہ پاکستان عملاً ایک نیم آزاد ملک تھا اس لئے اس کے ارباب اقتدار ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ اس ملک کی داخلہ اور خارجہ پالیسی کا تعین لندن میں ہوتا تھا۔ مزید برآں یہاں کے جاگیردار طبقہ اور رجعت پسند درمیانہ طبقہ پر قومیانے کا لفظ سن کر ہی لرزہ طاری ہوجاتا تھا۔ ان دونوں طبقوں کا خیال تھا کہ قومیانے کی ہر کاروائی طبقاتی انقلاب کی جانب ایک قدم کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر کسی ملک میں اس قسم کے اقدامات کی روایات پڑ جائیں تو نہ صرف بڑی زمینداریاں خطرے میں پڑ جاتی ہیں بلکہ یہ شبہ بھی پیدا ہوجاتا ہے کہ درمیانہ طبقہ کے بورژوا عزائم پورے نہیں ہوسکیں گے۔ لاہور کا روزنامہ نوائے وقت 50-1949ء میں پاکستان اور عالم اسلام پر برطانیہ کے غلبہ کی مذمت کرتا رہا تھا اور وہ مسلسل مطالبہ کرتا تھا کہ مسلم ممالک کو اس غلبہ سے نجات حاصل کر کے بین الاقوامی میدان میں آزاد روش اختیار کرنی چاہیے۔ مگر اب جب ایرانیوں نے یہ روش اختیار کی تو نوائے وقت پبلیکیشنز کی جانب سے شائع ہونے والے روزنامہ ''جہاد'' نے ان کی حمایت نہ کی کیونکہ اسے یہ خطرہ لاحق ہوگیا تھا کہ ایران میں حالات نے جو رخ اختیار کیا ہے اس کے نتیجہ میں کوریا کی طرح کی گرم جنگ شروع ہوجائے گی۔ اس اخبار کا 2رمئی 1951ء کا اداریہ یہ تھا کہ ''ڈاکٹر مصدق کے برسر اقتدار آجانے کا مطلب یہ ہے کہ ایران میں برطانوی ڈپلومیسی ہی کو شکست نہیں ہوئی بلکہ برطانیہ نے بحری جہاز بھیج کر ایرانیوں کو جو دھمکی دی تھی وہ بھی کارگر ثابت نہیں ہوئی۔ برطانیہ کا خیال تھا کہ ایرانی سرحد کے قریب برطانوی جنگی جہازوں کی نمائش ایرانیوں کو سراسیمہ کردے گی مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نتیجہ الٹا نکلا۔ ایران کے تیل کا مسئلہ یہیں تک محدود نہیں کہ اس کی آمدنی سے کون فائدہ اٹھاتا ہے۔ برطانیہ یا ایران؟ ایرانی تیل کی جنگی اور بین الاقوامی اہمیت اس سے کہیں زیادہ ہے۔ دنیا کا 42 فیصدی سے زائد تیل مشرق وسطیٰ کے ان علاقوں میں پیدا ہوتا ہے اور یہ تیل جس بلاک کے تصرف میں ہوگا جنگ کی صورت میں اس کی پوزیشن دوسرے بلاک کے مقابلہ پر بے حد مضبوط ہوگی۔ آثار کہتے ہیں کہ ایران میں انگریزوں کے اثر کی بحالی کی اب کوئی امید باقی نہیں رہی مگر اینگلو۔امریکن بلاک ہتھیار نہیں ڈال

دے گا اور اب امریکہ ایران میں برطانیہ کی جگہ لینے کی کوشش کرے گا۔ دوسری طرف روس اب اپنے پاؤں پھیلائے گا۔ تیل یا پٹرول ''گرم جنگ'' کا ایک بہت بڑا ہتھیار ہے۔ اس تیل کی خاطر ایران میں سرد جنگ شروع ہے۔ کچھ عجیب نہیں کہ یہ ''سرد جنگ'' کسی وقت کوریا کی طرح ''گرم جنگ'' کی شکل اختیار کر لے۔''[26] مدیر نوائے وقت کو یہ خطرہ اس حقیقت کے باوجود لاحق تھا کہ فروری 1951ء کے تیسرے ہفتے میں استنبول میں امریکی سفارت کاروں، اعلیٰ افسروں اور وزیروں کی جو کانفرنس ہوئی تھی اس کا تجزیہ یہ تھا کہ مشرق وسطیٰ میں کمیونسٹوں کی جانب سے فوجی یا سیاسی جارحیت کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔ اور یکم مئی 1951ء کو واشنگٹن پوسٹ کی رائے یہ تھی کہ ایرانیوں نے جو کارروائی کی ہے اس میں کمیونسٹوں کی چالبازی کو کوئی دخل نہیں ہے۔

نوائے وقت نے 50-1949ء میں برطانیہ کی بالادستی کی مخالفت کی جو پالیسی اپنائی تھی اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ یہ اخبار فی الحقیقت برطانوی سامراج کا دشمن تھا بلکہ اس کی بنیاد محض وزیراعظم لیاقت علی خان کی مخالفت پر تھی۔ دراصل اس اخبار کا نقطہ نگاہ امریکہ کے صدر ٹرومین کے نقطہ نگاہ سے مختلف نہیں تھا اور وہ یہ تھا کہ ایشیا میں جہاں کہیں بھی مروجہ سیاسی، معاشرتی اور معاشی نظام کے خلاف کوئی عوامی تحریک اٹھے تو اس میں لازماً سوویت یونین کا ہاتھ ہوتا ہے اس لئے اسے کچل دینا چاہیے۔ ٹرومین نے اپنے اس عالمی نظریے کا اعلان 12 مارچ 1947ء کو کیا تھا۔ لیکن اب اگرچہ امریکیوں کو ایرانیوں کی جانب سے تیل کی صنعت کو قومیانے کی کارروائی میں سوویت یونین یا کمیونسٹوں کا کوئی ہاتھ دکھائی نہیں دیتا تھا اور نہ ہی انہیں کوریا کی قسم کی جنگ کا خطرہ لاحق تھا لیکن مدیر نوائے وقت کو ایرانیوں کی یہ کارروائی پسند نہیں آئی تھی اور اسے اس کے نتائج سے بہت ڈر لگتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ برطانیہ کی حکومت اور اخبارات ایران کے واقعات کی ذمہ داری سوویت یونین اور مقامی کمیونسٹوں پر عائد کرتے تھے۔

اب مدیر نوائے وقت کی نظر میں روس کے خطرے کا ہوّا برطانیہ اور امریکہ کی وزارت خارجہ کی پیداوار نہیں تھا۔ برطانیہ عالم اسلام کا بدترین دشمن نہیں تھا اور نہ ہی یہودیوں کی اسرائیلی مملکت عالم عرب کے قلب میں خنجر کی حیثیت رکھتی تھی۔ اب اسے صرف روس سے خطرہ لاحق تھا۔ چنانچہ 4 مئی 1951ء کو نیویارک کے ایک جریدے یونائیٹڈ نیشنز ورلڈ کی اس رائے پر کہ ''روسی ٹینک مشرق وسطیٰ میں چند دن کے اندر جہاں چاہیں پہنچ سکتے ہیں۔'' روزنامہ جہاد کا ادارتی تبصرہ یہ

تھا کہ ''مشرق وسطیٰ روسی اور اینگلو۔امریکن دونوں بلاکوں کے لئے ایک بڑی اہم رزم گاہ ہے۔ تیسری جنگ کل ہو یا چند سال بعد اس کے سب سے اہم معرکے مشرق وسطیٰ میں ہی ہوں گے۔ مشرق وسطیٰ کے ملکوں میں اس وقت تک روس کو خاص اثر حاصل نہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان ملکوں کا برسر اقتدار طبقہ اشتراکیت سے خائف ہے لیکن بڑی وجہ یہی ہے کہ عام مسلمان کو روس کے لادینی نظام حیات پر اعتماد نہیں اور حتیٰ الوسع اس سے سمجھوتہ نہیں کرنا چاہتا۔ دوسری طرف انگریز گزشتہ 30 سال سے مشرق وسطیٰ کی سیاست پر چھائے ہوئے ہیں۔ ترکی پر چند سالوں سے امریکہ کا بڑا اثر ورسوخ ہے۔ ایران میں بھی کچھ عرصہ سے امریکہ کا اثر بڑھ رہا ہے۔ شام ولبنان میں فرانس کا اثر غالب رہا۔ مگر بحیثیت مجموعی مشرق وسطیٰ کا علاقہ ''برطانوی اثر کا علاقہ'' ہے۔ 30 سال برطانیہ سے اتنے گہرے تعلق اور روابط کے باوجود آج مشرق وسطیٰ کے تمام ممالک مل کر بھی اس قابل نہیں کہ چند روز ہی غنیم کی یلغار کو روک سکیں۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ کیا برطانیہ نے یہ چاہا ہی نہیں کہ یہ ملک فوجی اعتبار سے مؤثر بن سکیں یا وہ 30 سال کی مدت میں بھی انہیں اس قابل نہیں بنا سکا کہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں۔''[27] مدیر نوائے وقت کا یہ اداریہ اس کی علم تاریخ، علم سیاسیات اور علم جہانبانی سے بے خبری یا بے علمی کا عکاس تھا۔ برصغیر کے مسلم عوام الناس کی بہت سی بدنصیبیوں میں ایک بڑی بدنصیبی یہ تھی کہ سترہویں واٹھارہویں صدی میں مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہونے کے بعد انہیں تحریر وتقریر کے میدانوں میں اکثر وبیشتر ایسے رہنما ملے جو الفاظ فروش اور فقرے باز تھے اور جو محض زور قلم یا زور خطابت سے ان کے مسائل حل کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے اور جنہوں نے کبھی مسلم عوام کو عہد حاضر کے حقائق و تقاضوں سے روشناس کر کے انہیں صحیح راہ پر نہیں ڈالا تھا۔ مدیر نوائے وقت بھی ایسے ہی قلمی رہنماؤں میں سے تھا۔ جب اس نے یہ اداریہ لکھا تھا تو اسے جدید تاریخ کی اتنی سی حقیقت کا شعور نہیں تھا کہ برطانوی سلطنت نے 18 ویں اور 19 ویں صدی میں جو عالمگیر سلطنت قائم کی تھی اس کا مقصد محض اور محض یہ تھا کہ ایشیائی اور افریقی اقوام کا ہمہ گیر استحصال کیا جائے۔ اس کی خواہش وکوشش یہ نہیں تھی اور نہ ہو سکتی تھی کہ محکوم اقوام کو مؤثر بنا کر انہیں سیاسی ومعاشرتی اور معاشی ترقی کی راہ پر پردہ ڈالا جائے۔ اس نے برصغیر میں ہندوستانیوں کی جو فوج تیار کی تھی وہ محض ایک بھاڑے کی غلام فوج تھی۔ دوسری جنگ عظیم تک اس فوج کی کمان مکمل طور پر انگریزوں کے ہاتھوں میں تھی۔ جب 1939ء

میں برطانوی سامراج کو مجبوراً چھوٹے درجے کی کمان ہندوستانیوں کو دینی پڑی اور اس طرح یہ فوج کچھ مؤثر ہوگئی تو 1947ء میں اسے برصغیر پر اپنا بلا واسطہ قبضہ چھوڑنا پڑا۔ انگریزوں نے جب پہلی جنگ عظیم کے بعد مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں کو ترکوں کی استبدادیت سے نجات دلائی تھی تو انہوں نے ایسا اس لئے نہیں کیا تھا کہ وہ اس علاقے کے مسلمانوں کی ترقی وخوشحالی و آزادی کے خواہاں تھے بلکہ اس لئے کیا تھا کہ وہ ترکوں کی بجائے خود مشرق وسطیٰ کا استحصال کرنا چاہتے تھے۔ وہ وہاں اتنی ہی فوج اور پولیس چاہتے تھے جو مقامی عوام کی قوم پرستانہ یا انقلابی تحریکوں کو کچل سکے۔ وہ مسلمانوں کی ایسی جدید فوج تیار نہیں کر سکتے تھے جو غنیم کی یلغار کو روک سکے۔ وہ مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں کی مؤثر فوج بنا کر اپنے تیل کے ذخائر کو خطرے میں نہیں ڈال سکتے تھے۔ لیکن اتنی معمولی سی بات مدیر نوائے وقت کی سمجھ میں نہیں آتی تھی اور اسے پتہ نہیں چلتا تھا کہ مشرق وسطیٰ کی دفاعی پوزیشن اتنی کمزور کیوں ہے؟

اسلامی اتحاد کے علمبردار عہد حاضر کے تقاضوں سے بے بہرہ تھے

ایران میں تیل کی صنعت کو قومیانے کی جو کاروائی ہوئی تھی وہ سوویت یونین کی سازش کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ یہ ایک خالصتاً قوم پرستانہ کاروائی تھی۔ سوویت یونین نے اس کاروائی کی حمایت اس لئے کی تھی کہ اس طرح مشرق وسطیٰ میں اس کے پرانے حریف برطانوی سامراج کے مفادات کی بیخ کنی ہوتی تھی اور امریکہ نے فدائیان اسلام کی وساطت سے اس کاروائی کی حوصلہ افزائی اس لئے کی تھی کہ وہ مشرق وسطیٰ میں سامراجی پوزیشن حاصل کرنا چاہتا تھا جو برطانیہ کو یہاں گزشتہ 30 سال کے دوران حاصل رہی تھی۔ امریکہ سعودی عرب میں یہ پوزیشن حاصل کر چکا تھا اور اب وہ مصر، عراق، کویت اور ایران میں یہ پوزیشن حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چنانچہ جب ایران میں ڈاکٹر مصدق کی حکومت بن گئی اور اینگلو۔ ایرانین آئل کمپنی کے اثاثہ جات کو قومی ملکیت میں لینے کی کاروائی مکمل ہوگئی تو یکم مئی کو لندن سے یہ خبر آئی کہ اگرچہ برطانیہ کی زیر تحفظ مملکت کویت کا حکمران شیخ عبداللہ اپنے ملک کی تیل کی صنعت کو قومیانے کی تجویز پر غور نہیں کر رہا ہے تاہم وہ 1934ء میں قائم شدہ اینگلو۔ امریکن آئل کمپنی سے رائلٹی کی شرح میں اضافہ کا مطالبہ کئے جا رہا ہے۔ شیخ عبداللہ کا کویت آئل کمپنی کے بارے میں رویہ بہت دوستانہ ہے۔ وہ کمپنی پر

کوئی دباؤ نہیں ڈالتا البتہ وہ امید کرتا ہے کہ اسے اتنی ہی رائلٹی دی جائے گی جتنی کے مشرق وسطیٰ کے دوسرے ممالک کو دی جاتی ہے۔''[28]

2رمئی کو مصر کی پارلیمنٹ کے ایک رکن حنفی شریف نے پارلیمنٹ کے اجلاس کے دوران 1936ء کے اینگلو۔مصری معاہدے کی ایک کاپی پھاڑ دی اور حکومت مصر سے مطالبہ کیا کہ وہ بھی برطانیہ کے خلاف ایسی ہی کاروائی کرے جیسی کہ حکومت ایران کر چکی ہے۔ایوان نے زوردار نعروں سے حنفی شریف کی اس مسئلہ پر تقریر کی تائید کی۔نعرے یہ تھے کہ 1936ء کے معاہدہ کو اور سوڈان کی مصر سے علیحدگی کے معاہدے کو منسوخ کیا جائے۔شریف کی تجویز یہ تھی کہ نہر سویز کے علاقے میں جو برطانوی افواج موجود ہیں انہیں دشمن افواج قرار دیا جائے جو مصری عناصر ان برطانوی دشمنوں کے لئے سپلائی، مواصلات اور تعمیرات وغیرہ کا کام کرتے ہیں انہیں ملک کے غدار تصور کیا جائے۔''[29] لیکن امریکہ کو مصر میں برطانیہ کے خلاف اس روز افزوں ایجی ٹیشن پر کوئی پریشانی نہیں تھی بلکہ بظاہر اسے کچھ اطمینان ہی تھا اور یہ اسی اطمینان ہی کا نتیجہ تھا کہ 4رمئی کو واشنگٹن میں سرکاری طور پر یہ اعلان کیا گیا کہ امریکہ اور مصر میں ایک معاہدہ ہو گیا ہے جس کے تحت صدر ٹرومین کے چار نکاتی پروگرام کے مطابق مصر کو ٹیکنیکل مدد دی جائے گی۔''[30]

قبل ازیں جب 24راپریل 1951ء کو مصری پارلیمنٹ نے مذہبی انتہا پسندوں کی تنظیم اخوان المسلمین پر سے پابندی اٹھانے کا فیصلہ کیا تھا تو اس وقت بھی امریکہ نے کسی پریشانی کا اظہار نہیں کیا تھا۔اس تنظیم کو اڑھائی سال قبل حکومت برطانیہ کی تحریک پر غیر قانونی قرار دیا گیا تھا کیونکہ اس تنظیم کے ارکان مصر کے برطانیہ نواز عناصر کو قتل کرنے کی وارداتیں کرتے تھے۔اس تنظیم نے 1949ء کے اوائل میں مصر کے برطانیہ نواز وزیر اعظم نقراشی پاشا کا قتل کیا تھا اور اس کے چند دن بعد حکومت مصر کے انگریز انسپکٹر جنرل پولیس نے اس تنظیم کے سربراہ حسن البنا کو قتل کروا دیا تھا۔مصر میں یہ سب کچھ امریکہ اور برطانیہ کی باہمی سامراجی رقابت کی وجہ سے ہوا تھا اور اب بھی اخوان المسلمین پر سے پابندی اٹھانے کی کاروائی رقابت ہی کا نتیجہ تھی۔مصر میں امریکہ نواز حکومت قائم تھی اس لئے ایسی تنظیم پر سے پابندی اٹھانے میں کوئی عذر نہیں ہو سکتا تھا جس کا سیاسی نصب العین امریکہ کے سامراجی حریف یعنی برطانیہ کے مفاد کے منافی تھا۔لیکن مدیر نوائے وقت اس حقیقت سے بے خبر تھا۔اس کا خیال تھا کہ ''اخوان المسلمین'' مشرق وسطیٰ کی ایک ایسی

جماعت ہے جو ''احیائے اسلام کے نصب العین کو لے کر اٹھی ہے اور جس کے کارکنوں کے متعلق بلا مبالغہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ جو کہتے ہیں کرتے بھی ہیں۔ جماعت کے بانی اور پہلے قائد شیخ حسن البنا کی شہادت کے بعد اخوان المسلمون مصائب میں گھر کر رہ گئی تھی۔ جماعت کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا تھا مگر مردان حق نے پامردی کا ثبوت دیا اور جادۂ استقلال پر ڈٹے رہے تا آنکہ حکومت مصر کو خود ہی یہ اعلان کرنا پڑا کہ یہ جماعت خلاف قانون نہیں۔''[31] اخوان المسلمین یا اخوان المسلمون کو بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر امریکہ کی حمایت حاصل تھی اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ یہ تنظیم مشرق وسطیٰ میں برطانوی مفادات کے خلاف تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ امریکی صدر ٹرومین کی جانب سے 1949ء میں طلب کردہ مذہبی کانفرنس کا فیصلہ یہ تھا کہ اشتراکی نظریے کے فروغ کو روکنے کے لئے ساری دنیا میں بالعموم اور ایشیا میں بالخصوص مذہبی تحریکوں کی حوصلہ افزائی کی جائے کیونکہ محض غیر مذہبی بورژوا دلائل پر مبنی پروپیگنڈے سے اس نظریے کا سدباب نہیں کیا جاسکتا تھا۔

8 رمئی کو مشرق وسطیٰ کے دفاع کے بارے میں مدیر نوائے وقت کا ایک اور اداریہ شائع ہوا جس میں اس نے مشرق وسطیٰ کے ممالک کو یہ مشورہ دیا کہ ''مشرق وسطیٰ کے یہ ملک اپنی آزادی اور بقا کی کوئی قیمت سمجھتے ہیں تو انہیں ان نعمتوں کے تحفظ کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اس کی یہ صورت ناکام ثابت ہو چکی ہے کہ وہ کسی بالادست قوت کے دست نگر بنے رہیں۔ اب انہیں اپنے پاؤں پر آپ کھڑا ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ کوشش 5 برس میں کامیاب ہوتی ہے یا 25 برس میں، اس کا آغاز اب معرض تعویق میں نہیں رہنا چاہیے۔ مشرق وسطیٰ کے ملک ''اے'' بلاک کا ساتھ دیں یا ''بی'' بلاک کا...... یہ مسئلہ ہمارے اس مضمون کے دائرہ سے خارج ہے۔ جو بلاک ان کے نظریہ حیات کے نزدیک ہو اور جس کا ساتھ دینے میں ان کا فائدہ ہو، شوق سے اس بلاک کا ساتھ دیں مگر جس کسی کا بھی ساتھ دیا جائے اس طرح دیا جائے کہ وہ آپ کو اپنا ساتھی سمجھے۔ خیمہ بردار نہ سمجھے۔ احترام صرف ساتھیوں کا کیا جاتا ہے۔ خیمہ برداروں کا احترام نہ افراد کرتے ہیں اور نہ قومیں کرتی ہیں۔ اگر مشرق وسطیٰ کے ممالک اپنی کوئی حیثیت بنالیں اور اس کے بعد کسی کا ساتھ دیں تو یہ ساتھ بے معنی نہ ہوگا۔ موجودہ پوزیشن تو مضحکہ خیز ہے کہ بالاتر قوت کو آلہ کار بنانے کی ضرورت نہ ہوئی تو باہر نکال دیا۔ ترکیہ کی مثال سب کے سامنے ہے۔ آج روس سے جنگ چھڑے تو اتحادیوں کا سب سے پہلا مورچہ ترکیہ ہے۔ مگر اطلانتک پیکٹ میں ترکیہ کے لئے کوئی

جگہ نہیں۔ ترکیہ کی فوجیں کوریا تک میں لڑیں مگر آئزن ہاور یورپ کی حفاظت کے لئے جو قلعہ تعمیر کر رہے ہیں اس کے دروازے ترکیہ پر بند۔ ایک طرف اطلانٹک پیکٹ ہے۔ دوسری طرف پیسفک پیکٹ کے ماتحت حفاظتی تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں۔ مشرق وسطیٰ کے ملک جو اتفاق سے مسلمان ملک ہیں بیچ میں معلق ہیں۔ نہ ادھر نہ ادھر۔ روسی ٹینک چاہیں تو بلا مزاحمت ان ملکوں میں گھس آئیں اور انگریز اور امریکن ضروری سمجھیں تو جس بادشاہ یا صدر اعظم کو چاہیں جلاوطن کر کے موریشس بھجوا دیں اور ان مشرقی ملکوں کا اصل قصور؟ جرم ضعیفی! اتنا بڑا علاقہ، اتنی اہم جغرافیائی اور دفاعی پوزیشن، ایسے اچھے فوجی جوان اور یہ بے حسی و کسمپرسی...... عقیدہ و خیال کی یہ یکسانیت کہ استنبول سے جکارتا تک سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے اور اس کے باوجود یہ انتشار۔ اگر اطلانتک پیکٹ ممکن ہے اور انگریز اور امریکن، جرمنوں اور اطالویوں کے دوش بدوش کھڑے ہو کر لڑنے کے لئے تیار ہیں۔ اگر پیسفک پیکٹ ممکن ہے اور آسٹریلوی اور جاپانی ایک ہی صف ہی کھڑے ہو سکتے ہیں تو ترکوں، عربوں، ایرانیوں، افغانوں، پاکستانیوں اور انڈونیشیائیوں میں کوئی پیکٹ کیوں ممکن نہیں؟ ان ملکوں کے بادشاہ، وزرائے اعظم اور لیڈر دوسروں کی طرف دیکھنے کی بجائے اپنی قوم پر کیوں اعتماد نہیں کرتے؟ کیا یہ مل کر آرڈیننس فیکٹریوں کا ایسا انتظام نہیں کر سکتے کہ اسلحہ کے لئے دوسروں کے دست نگر نہ رہیں؟ کیا وہ ایک ایسی مشترکہ فوج نہیں کھڑی کر سکتے جو پورے مشرق وسطیٰ کی آزادی کی ضامن بن سکے؟ یہ سب کچھ ممکن ہے۔ اس لئے کہ خام مواد بھی موجود ہے اور ''آدمیوں کا مواد'' بھی موجود ہے۔ مگر فرمانرواؤں اور رہنماؤں میں یہ بالغ نظری مفقود ہے یا خود اعتمادی نہیں۔ حالانکہ اگر وہ اس مرحلہ پر بالغ نظری اور خود اعتمادی کا ثبوت دیں اور ترکیہ سے انڈونیشیا تک مشرقی اور اسلامی ملکوں کا متحدہ محاذ قائم کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ اقدام نہ صرف مشرق کے ان ملکوں کی آزادی کی ضمانت ہوگا بلکہ امن عالم کے تحفظ کے لئے بھی ایک نئی قوت معرض وجود میں آجائے گی۔''[32]

مدیر نوائے وقت کے مذکورہ اداریے کی بنیاد بظاہر مسلمانان عالم کے لئے بڑے نیک مقاصد اور بلند عزائم پر تھی۔ لیکن بدنصیبی سے جن نیک خواہشات اور خوش کن تجاویز کا ذکر کیا گیا تھا ان کا اس زمانے کے حقائق سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ اداریہ دراصل پنجاب کے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ کے ان برخود غلط عناصر کے افکار و خیالات و جذبات کی ترجمانی کرتا تھا جنہوں نے مسلمانوں

کے شاندار ماضی کے بارے میں ولولہ انگیز تاریخی ناول پڑھ کر اور نیم تعلیم یافتہ ملاؤں، سیاسی لیڈروں، پروفیسروں اور شاعروں کے خطبات، تقاریر، اسباق اور اشعار سن کر اپنی ایک خیالی دنیا بنائی ہوئی تھی اور وہ اس دنیا میں پنجابی سلطنت قائم کر کے اسلام کا بول بالا کرنے کے متمنی تھے۔ ان برخود غلط عناصر کو خود معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ کیا کہتے تھے اور کیا لکھتے تھے۔ جب یہ عناصر یہ کہتے تھے اور لکھتے تھے کہ مسلم ممالک کو اپنے پاؤں پر خود کھڑا ہونا چاہیے اور دونوں بلاکوں سے آزاد ہو کر ایک تیسرا بلاک بنانا چاہیے تو یہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے تھے کہ اس زمانے کی دنیا میں کوئی مسلم ملک ایسا نہیں تھا کہ جس کا فرمانروا، وزیر اعظم یا صدر اعظم مغربی سامراج کی پیداوار ہونے کی وجہ سے اس کے اشاروں پر نہیں ناچتا تھا۔ ایسے فرمانرواؤں، وزرائے اعظم اور صدور اعظم سے بالغ نظری اور خود اعتمادی کی توقع کرنا خود فریبی یا جہالت کی انتہا تھی۔ جب یہ عناصر مسلم ممالک کے سامراج نواز حکمرانوں کو یہ مشورہ دیتے تھے کہ وہ اکٹھے ہو کر اپنے ممالک کے مادی و افرادی وسائل کے ذریعے جدید اسلحہ سازی کی صنعت قائم کریں تو ان کی بحث کا معیار موچی دروازے کے شیر فروش کی شام کی گپ شپ کے معیار سے زیادہ بلند نہیں ہوتا تھا۔ ان کی سمجھ سے یہ بات بالاتر تھی کہ برطانیہ کی عالمگیر سلطنت کے زوال سے مغربی سامراج کا زوال نہیں ہو گیا تھا۔ فرق صرف اتنا پڑا تھا کہ ایشیا اور افریقہ میں برطانیہ کے براہ راست نو آبادیاتی نظام کی جگہ امریکہ کا جدید نو آبادیاتی نظام قائم ہو رہا تھا۔ اس عالمی نظام میں ایشیا و افریقہ کے کسی پسماندہ ملک میں ہمہ گیر صنعتی انقلاب ممکن نہیں تھا اور ہمہ گیر صنعتی انقلاب کے بغیر جدید اسلحہ سازی کی صنعت کے قیام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ان پسماندہ ممالک میں ہمہ گیر صنعتی انقلاب صرف ایسی صورت میں ممکن ہو سکتا تھا کہ ان ممالک کے عوام پہلے جاگیرداری نظام کا خاتمہ کر کے اپنے سامراج نواز حکمرانوں سے نجات حاصل کریں اور پھر مغربی سامراج کی سیاسی، معاشرتی، ثقافتی اور معاشی غلامی سے نجات حاصل کر کے مکمل آزادی و خود مختاری کی راہ پر گامزن ہوں۔ انگلستان اور یورپ کے دوسرے ممالک میں پندرہویں صدی سے لے کر انیسویں صدی تک صنعتی انقلاب اسی طرح برپا ہوا تھا۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی سے جاپانیوں نے صنعتی انقلاب کی منزل اسی راستے سے گزر کے حاصل کی تھی اور بیسویں صدی میں سوویت یونین اور چین کے لئے صنعتی ترقی کی راہیں اسی طریقے سے کھلی تھیں۔ امریکہ کے صدر ٹرومین کو اس حقیقت کا علم تھا اس لئے اس

نے 12 مارچ 1947ء کے اعلان میں ساری دنیا میں عوام الناس کے طبقاتی انقلاب کی ممانعت کر دی تھی لیکن پنجاب کے یہ لال بجھکڑ چاہتے تھے کہ مسلم ممالک کے سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی نظام میں کوئی بنیادی تبدیلی نہ آئے اور یہ ممالک محض حکمرانوں کی بالغ نظری اور خود اعتمادی کے باعث ہمہ گیر صنعت کاری اور جدید اسلحہ سازی کی منزل پر پہنچ جائیں۔ ان پنجابی شاونسٹوں کو اپنے ''آدمیوں کے مواد'' پر بڑا ناز تھا۔ یہ سمجھتے تھے کہ اگر ان کے ''آدمیوں کے مواد'' کو جدید اسلحہ مل جائے تو پہلے تو دہلی کے لال قلعے پر ہلالی پرچم لہرائیں گے اور پھر ساری دنیا کو فتح کر کے اسلام کو سر بلند کریں گے۔ مختصراً ان کا عزم یہ تھا کہ یہ ترکوں کی سلطنت عثمانیہ کی طرح کی ایک پنجابی سلطنت قائم کریں گے اور پھر پان اسلام ازم کے زور پر اس سلطنت کو نہ صرف برقرار رکھیں گے بلکہ اس میں توسیع کریں گے ''تاریخی اسلامی ناولوں'' ''ولولہ انگیز اسلامی شاعری'' اور ''ایمان افروز خطبوں'' نے انہیں اسی قسم کا سہانا خواب دکھا رکھا تھا۔

پاکستان میں اسلامی اتحاد کے علمبردار صرف روس سے خطرہ کا نعرہ لگاتے تھے اور برطانیہ وامریکہ کی حمایت کرتے تھے جبکہ مسلم ممالک کے عوام اس کے برعکس سوچ کے حامل تھے

مذکورہ کوتاہ اندیش پنجابی شاونسٹوں نے مغربی ذرائع ابلاغ کے پروپیگنڈے کے زیر اثر سوویت یونین کو خواہ مخواہ اپنا دشمن تصور کر رکھا تھا۔ پاکستان کے ارباب اقتدار اور ملاؤں نے بھی پہلے ہی دن سے انہیں یہ سبق پڑھانا شروع کر دیا تھا کہ سوویت یونین اسلام اور پاکستان کا دشمن ہے اور ایشیا میں جہاں کہیں بھی عوامی تحریک شروع ہوتی ہے اس میں سوویت یونین کا ہاتھ ضرور ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے ایرانیوں کی جانب سے تیل کی صنعت کو قومیانے کی کاروائی کی حمایت نہیں کی تھی۔ پاکستان کا وزیر خارجہ پنجاب کے درمیانہ طبقہ کے اسی مکتب فکر سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی برطانوی سامراج کے ساتھ وفاداری غیر متزلزل تھی اور وہ اس خیال کا حامل تھا کہ مسلمانوں کا نظریہ حیات مغربی بلاک کے نظریہ حیات کے نزدیک ہے۔ چنانچہ اسے اینگلو۔ایرانین آئل کمپنی کے خلاف ایرانیوں کی کاروائی بہت بری لگی۔ وہ ان دنوں لندن میں تھا۔ اس نے وہاں 8 مئی کو برطانیہ کے وزیر اعظم ایٹلی سے ملاقات کی اور پھر اسی دن ایک پریس

کانفرنس میں پاکستان کی اس مخلصانہ خواہش کا اظہار کیا کہ ایران کے تیل کا تکلیف دہ مسئلہ بہت جلد اس طریقے سے حل ہو جائے گا جو سب متعلقہ فریقوں کے لئے اطمینان بخش اور باعزت ہو گا۔ اس نے رائے ظاہر کی کہ "اگر ایرانی تیل کا مسئلہ فریقین کے درمیان پرامن طریقے سے حل نہ ہوا تو اس کے ممکنات بہت برے ہوں گے۔"[33] ظفر اللہ خان نے یہ بیان ایسے موقع پر دیا تھا جبکہ ایرانی مجلس اور سینیٹ میں متفقہ طور پر یہ مسئلہ طے کیا جا چکا تھا۔ حتیٰ کہ شاہ ایران نے بھی 2 رمئی کو تیل کی صنعت کو قومیانے کے فیصلے کی باقاعدہ توثیق کر دی ہوئی تھی۔ ظفر اللہ خان نے اپنے اس بیان کے ذریعے یہ ثابت کر دیا تھا کہ حکومت پاکستان مشرق وسطیٰ کے اسلامی ممالک کے ساتھ بالعموم اور ایران کے ساتھ بالخصوص اخوت و دوستی کے جو دعوے کرتی رہی تھی وہ کھوکھلے تھے۔

دراصل پاکستان کے ارباب اقتدار کو عالم اسلام کے مفاد سے برطانوی سامراج کا مفاد زیادہ عزیز تھا۔ مدیر نوائے وقت نے ظفر اللہ خان کے اس شرمناک بیان پر کوئی نکتہ چینی نہ کی بلکہ اس نے برطانیہ اور ایران کو مشورہ دیا کہ وہ مصالحانہ سپرٹ کے تحت اپنے باہمی جھگڑے کا خوش اسلوبی سے تصفیہ کریں۔ اس کا یہ مشورہ اس رائے کی بنیاد پر تھا کہ "برطانیہ کو ایران کے علاوہ بلکہ ایران سے بھی زیادہ روس کے متوقع ردعمل کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ روس کو ایران کے تیل سے ہی نہیں، ایران کی جغرافیائی، فوجی اور جنگی پوزیشن سے بھی گہری دلچسپی ہے اور روس مدت سے کسی اچھے بہانے کی تلاش میں ہے جو اسے ایران کے معاملات میں مداخلت کرنے میں مدد دے سکے۔ روس کے لئے اس سے بہتر بہانہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ برطانیہ نے اپنے بحری جہاز ساحل ایران پر جمع کر دیئے ہیں اور چھاتا فوج سرزمین ایران پر اتار دی ہے؟ روس "ایران کی آزادی" اور "سالمیت" کے تحفظ کے لئے فوراً میدان میں کود پڑے گا اور ایران مشرق وسطیٰ کا کوریا بن کر رہ جائے گا۔ آخری نتیجہ چاہے کچھ نکلے ہماری رائے میں ایران کا ان دو بڑی طاقتوں کے باہمی تصادم کا میدان بن جانا ہی اس کی بہت بڑی بدقسمتی ہو گی کیونکہ اس تصادم میں ایران کو اتنا نقصان پہنچ جائے گا کہ برسوں اس کی تلافی نہیں ہو سکے گی۔ اندریں حالات فریقین کی بہتری اسی میں ہے کہ اس قضیہ کو مصالحت سے سلجھانے کی کوشش کریں۔ مگر کسی مصالحتی فارمولا میں اس بنیادی حقیقت کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ ایران کا تیل بہرحال ایران کی ملکیت ہے اور ایران جب چاہے اسے "قومیا" سکتا ہے۔ اینگلو۔ ایرانین آئل کمپنی کا زیادہ سے زیادہ مطالبہ یہ ہو سکتا ہے کہ

اسے مناسب معاوضہ دیا جائے۔ اگر فریقین مصالحانہ سپرٹ سے کام لیں تو یہ قضیہ خوش اسلوبی کے ساتھ طے کیا جا سکتا ہے۔ پاکستان کامن ویلتھ کا ممبر ہے اور ایران سے بھی اس کے تعلقات دوستانہ ہیں۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ پاکستان اس سلسلہ میں فریقین کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوشش کرے۔ اگر یہ کوشش کامیاب ہو جائے تو نہ صرف جنگ کے تصور سے خوفزدہ دنیا اطمینان کا سانس لے گی بلکہ اس سے پاکستان کے وقار میں بھی یقیناً اضافہ ہوگا۔''[34] اس اداریے سے صاف ظاہر تھا کہ اب مدیر نوائے وقت کی نظر میں روس کا خطرہ حقیقی تھا اور اسے برطانیہ سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اس کا روس کے خطرے کی بنا پر برطانیہ اور دوسری مغربی طاقتوں کو مشورہ یہ تھا کہ مصر اور ایران کے واقعات کو پیش نظر رکھ کر اپنے مفاد کی خاطر مسلم ممالک سے برابری کی سطح پر تعلقات استوار کریں۔ اس کی رائے یہ تھی کہ برطانیہ اور برطانیہ ہی نہیں سبھی سامراجی اور کالونیل طاقتوں کا اپنا فائدہ اسی میں ہے کہ وہ خود بھی مشرقی ملکوں سے اپنے موجودہ تعلقات پر نظرثانی کریں۔ حاکم اور محکوم یا ظالم اور مظلوم کی تفریق کی بنا پر اب یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہیں چل سکتا۔ موجودہ سلسلہ یا ڈھانچہ کی موت لازمی ہے اگر برطانیہ اور اس کی طرح دوسری طاقتیں خود مشرقیوں کے ساتھ مل کر اسے دفن کر دیں تو بہتر ہوگا۔ اس طرح ایک نئے باہمی تعلقات کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے جو پرانے تعلق سے یقیناً زیادہ خوشگوار ہوگا۔ لیکن اگر اس زوال پذیر نظام کو زندہ رکھنے کی کوشش کی گئی جیسا کہ فرانس مراکش میں اس وقت کر رہا ہے...... تو بالآخر اس کا نتیجہ بے حد خطرناک ہوگا۔ استعماری طاقتیں مشرقی ملکوں کو براہ راست اپنا غلام بنا کر رکھنا چاہیں یا ان ملکوں میں اپنے ایجنٹوں، گماشتوں اور خیمہ برداروں کے ذریعے، یہ کوشش بالآخر ناکام ہی ثابت ہوگی۔ جب سیلاب آتا ہے تو کمزور بند اسے روک نہیں سکتے اور سیلاب کی رفتار اس وقت کم سہی مگر اس سے انکار ناممکن ہے کہ سیلاب شروع ہو چکا ہے۔''[35] اس اداریے کی بنیاد صریحاً اس نظریے پر تھی کہ اگر امیر اور طاقتور شخص میں شرافت وانصاف کا جذبہ پیدا ہو جائے تو وہ غریب اور کمزور شخص کو برابری کا درجہ دے سکتا تھا۔ حالانکہ ایسا نہ کبھی ہوا تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔ سامراجی طاقتیں محض پند ونصائح کی وجہ سے محکوم ومظلوم اقوام کو ان کے حقوق نہیں دے سکتی تھیں۔ مصر اور ایران میں جو آگ لگی تھی وہ امریکی سامراجیوں کے لئے پریشان کن نہیں تھی۔ انہیں اس میں اپنا فائدہ نظر آتا تھا۔

مدیر نوائے وقت کے روس سے خوفزدہ ہونے کا پس منظر یہ تھا کہ مئی کے اوائل میں مصر کے ایوان بالا کے جو انتخابات ہوئے تھے ان میں وفد پارٹی کو کل 180 نشستوں میں سے 107 نشستیں ملی تھیں۔ یہ پارٹی قوم پرست تھی اور اس کا منشور یہ تھا کہ مصر سے برطانوی افواج کو نکالا جائے گا اور سوڈان اور مصر کا اتحاد عمل میں لایا جائے۔ اس پارٹی کی انتخابی کامیابیوں کے چند دن بعد عرب لیگ کے سیکرٹری جنرل عزام پاشا نے قاہرہ میں تقریر کرتے ہوئے برطانیہ کے سامراجی نظریے پر سخت نکتہ چینی کی تھی اور یہ کہا تھا کہ مصر کو روس سے زیادہ برطانیہ سے خطرہ ہے۔ عزام پاشا کی رائے یہ تھی کہ ''برطانیہ کی یہ دلیل مضحکہ خیز ہے کہ اس نے نہر سویز کے علاقے میں مصر اور مشرق وسطیٰ کے دوسرے ممالک کے دفاع کے لئے اپنی فوجیں رکھی ہوئی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ برطانیہ خود اپنے دشمن کے خلاف اپنا دفاع کرنا چاہتا ہے۔ فرض کیجئے اس کا دشمن روس ہے لیکن ہمارے اور روس کے درمیان کوئی دشمنی نہیں ہے۔ روس نے کبھی ہم سے کوئی مطالبہ نہیں کیا اور نہ ہی ہم نے کبھی روس سے کوئی مطالبہ کیا ہے۔ اس کے اپنے اصول ہیں اور اس کا اپنا مذہب ہے اور ہمارے اپنے اصول ہیں اور ہمارا اپنا مذہب ہے۔ عرب ممالک نہ تو مشرق سے وابستہ ہیں اور نہ ہی مغرب سے۔ ہمارے مذہب اسلام کی بنیاد رنگ و نسل سے بالاتر مساوات پر ہے۔''[36] عزام پاشا نے جس اجتماع میں تقریر کی تھی اس میں مصر کا وزیر خارجہ ڈاکٹر صلاح الدین پاشا بھی موجود تھا۔ چنانچہ اسی روز قاہرہ سے یہ خبر جاری ہوئی کہ ''ڈاکٹر صلاح الدین نے امریکہ کو مطلع کر دیا ہے کہ اگر برطانیہ نے مصر اور وادئ نیل سے اپنی فوجیں نہ نکالیں تو حکومت مصر 1936ء کے معاہدے کو منسوخ کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔''[37] اگرچہ قاہرہ سے موصولہ یہ دونوں خبریں مصر کی سامراج دشمن رائے عامہ کی عکاسی کرتی تھیں تاہم بظاہر کوئی خاص تشویش ناک بات نہیں تھی کیونکہ ان میں امریکہ اور برطانیہ کی سامراجی رقابت کی بھی جھلک نظر آتی تھی۔ لیکن اسی دن تہران سے جو خبر ملی وہ کراچی اور پنجاب کے استحصالیوں اور شاونسٹوں کے لئے پریشان کن تھی۔ خبر یہ تھی کہ ''تہران میں 60 ہزار لوگوں نے امریکی سفارت خانے کے سامنے مظاہرہ کر کے امریکی سامراج مردہ باد کے نعرے لگائے۔ یہ مظاہرہ کمیونسٹوں کی تحریک پر ہوا تھا۔ مظاہرین نے لال جھنڈے اٹھائے ہوئے تھے اور ایک موقع پر سٹالن زندہ باد کا نعرہ بھی لگایا گیا۔''[38]

13 مئی کو ایران کے وزیر اعظم ڈاکٹر مصدق نے مجلس کو بتایا کہ ''دہشت پسندوں کی

طرف سے اسے قتل کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔'' اس انکشاف کے بعد وہ بے ہوش ہو گیا اور پھر ہوش آنے پر اس نے مجلس سے اجازت طلب کی کہ چونکہ اس کی زندگی کو خطرہ لاحق ہے اس لئے اسے مجلس کی عمارت میں ہی رہنے کی اجازت دی جائے۔[39] ڈاکٹر مصدق کو یہ دھمکیاں امریکہ نواز ''فدائیان اسلام'' کی طرف سے دی جا رہی تھیں۔ یہ تنظیم مارچ 1951ء میں ایران کے وزیراعظم علی رزم آرا اور اس کے وزیر تعلیم عبدالحمید کے قتل کی ذمہ دار تھی۔ ابتداً یہ تنظیم تیل کی صنعت کو قومیانے کے حق میں تھی اور اس نے رزم آرا کو اس بنا پر قتل کیا تھا کہ وہ قومیانے کی تجویز کے خلاف تھا مگر اب یہ ڈاکٹر مصدق کی جان کے درپے تھی۔ جس کی بظاہر وجہ یہ تھی کہ مصدق کو روس نواز تودہ پارٹی کی حمایت حاصل تھی۔ ایران میں ''فدائیان اسلام'' کا کردار تقریباً ایسا ہی تھا جیسا کہ مصر میں اخوان المسلمین کا تھا۔ 14 رمئی کو امریکی سفیر گریڈی (Grady) نے مجلس کی عمارت میں ڈاکٹر مصدق سے ملاقات کر کے اسے یہ مشورہ دیا تھا کہ تیل کی صنعت کو قومیانے کی کارروائی نہ کی جائے۔ امریکی سفیر نے یہ مشورہ اس لئے دیا تھا کہ امریکہ یہ چاہتا تھا کہ برطانیہ اور ایران کے درمیان گفت وشنید میں چودھراہٹ کا کردار ادا کر کے ایران کی تیل کی دولت میں اپنی حصہ داری کا بندوبست کیا جائے۔ اسے اس مشورے کی فوری ضرورت اس لئے محسوس ہوئی تھی کہ اسی دن مجلس کی اس 11 رکنی کمیٹی کا اجلاس ہوا تھا جو تیل کی صنعت کو قومیانے سے متعلقہ قانون کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مقرر کی گئی تھی۔ اس کمیٹی کے ایک رکن کا برطانیہ کو انتباہ یہ تھا کہ وہ اینگلو۔ ایرانین آئل کمپنی کی سہولتیں پر امن طریقے سے حکومت ایران کے حوالے کر دے ورنہ اس امر کا امکان ہے کہ تیسری عالمی جنگ شروع ہو جائے گی۔''[40] 17 رمئی کو خبر یہ تھی کہ برطانیہ نے امریکہ سے مشورہ کرنے کے بعد حکومت ایران کو متنبہ کیا ہے کہ اگر اس نے تیل کے تنازعہ کا گفت وشنید کے ذریعے پر امن تصفیہ نہ کیا تو اس کے بڑے خطرناک نتائج برآمد ہوں گے۔[41]
اس انتباہ سے قبل برطانیہ ایران میں اپنی چھاتا فوج اتارنے کی مشقیں کر چکا تھا اور 18 رمئی کو برطانوی بحریہ کا اعلان یہ تھا کہ برطانوی جنگی جہاز خلیج فارس میں بھیجنے کی وجہ سے بحیرہ روم میں برطانوی بیڑے میں جو کمی واقع ہوئی ہے اسے بہت جلد پورا کر دیا جائے گا۔ اس صورتحال میں ایران کے بااثر مذہبی رہنما آیت اللہ کاشانی کا فتویٰ یہ تھا کہ اگر برطانیہ نے ایران کے خلاف فوجی کارروائی کی تو جہاد کا اعلان کرنے میں کوئی پس وپیش نہیں کیا جائے گا۔ ایرانی عوام غلامی کی

شرمناک زندگی پر حق وصداقت اور مذہب وقومیت کی خاطر موت کو ترجیح دیں گے۔

21 رمئی کو ایران نے امریکہ کی یہ اپیل مسترد کر دی کہ تیل کو قومیانے کے بحران کے دوستانہ تصفیہ کے لئے برطانیہ سے گفت وشنید کی جائے۔ حکومت ایران کی رائے یہ تھی کہ گذشتہ ہفتے امریکہ نے اس سلسلے میں جو سفارش کی تھی اس سے ایران کے اندرونی معاملات میں مداخلت ہوئی ہے۔ ایران کے وزیر مالیات کا مجلس میں اعلان یہ تھا کہ ایرانی حکومت کسی دھمکی سے مرعوب نہیں ہوگی اور اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنا کر رہے گی۔ اس نے برطانیہ کو متنبہ کیا کہ وہ آگ سے نہ کھیلے۔[42] امریکی حکومت کی ایران سے اس اپیل کا مطلب یہ نہیں تھا کہ امریکہ نے ایران کے خلاف برطانیہ کی متوقع فوجی کاروائی کی حمایت کرنے کا فیصلہ کیا تھا بلکہ اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ امریکہ خود کو ایرانی تیل کے تنازعے کے تصفیے میں بطور ثالث ایک فریق کی حیثیت دینا چاہتا تھا۔ لیکن مدیر نوائے وقت کو امریکہ کی اس سامراجی چالبازی کا علم نہیں تھا اور اس کا خیال تھا کہ اب امریکہ نے کھلم کھلا برطانیہ کی حمایت شروع کر دی ہے اور وہ ایران پر دباؤ ڈال رہا ہے۔ مدیر نوائے وقت کو یہ خطرہ لاحق تھا کہ ”برطانیہ اور امریکہ کہیں ایران کے تیل کا ”تحفظ“ کرتے کرتے خود ایران ہی کو روس کے حوالے نہ کر دیں۔ اگر برطانیہ نے ایران کو مرعوب کرنے کے لئے فوجی قوت کے استعمال کی حماقت کی تو روس لازمی طور پر میدان میں اتر پڑے گا لیکن اگر نوبت فوجی قوت کے استعمال تک نہ پہنچے تو بھی محض جارحانہ رویہ اور مستبدانہ طرز عمل ہی عام ایرانیوں کو برطانیہ سے دور کرنے اور روس کے قریب تر لانے کے لئے کافی ہے۔ مصر میں نہر سویز کے بارے میں برطانیہ کی نامعقول روش نے یہ فضا پیدا کر دی ہے کہ بااثر مصری اب کھلم کھلا یہ تلقین کر رہے ہیں کہ مصر کو برطانیہ سے قطع تعلق کرتے ہوئے روس اور اس کے حلیف ممالک سے روابط استوار کر لینے چاہئیں۔ ایران میں بھی گزشتہ دو ماہ میں روس نواز عناصر کو جو تقویت حاصل ہوئی ہے۔ عام حالات میں دس برس میں بھی وہ یہ تقویت حاصل نہ کر سکتے۔ اس کا سبب بھی برطانوی پالیسی ہے جو ایران کے اشتراکی و نیم اشتراکی عناصر کے ہاتھ مضبوط کر رہی ہے۔ اگر برطانیہ (اور امریکہ) نے تدبر کا ثبوت نہ دیا تو اندیشہ ہے کہ سارا مشرق وسطیٰ ان سے دور ہو جائے گا کیونکہ یہ آگ ایک مرتبہ بھڑک اٹھی تو صرف مصر اور ایران تک محدود نہیں رہے گی۔ مشرق وسطیٰ کے سبھی ملک زود یا بدیر اس کی لپیٹ میں آ جائیں گے۔“[43] مدیر نوائے وقت کے اس خوف کی تازہ ترین بنیاد

20رمئی کی اس خبر نے مہیا کی تھی کہ ''قاہرہ کے جریدہ المصور کے مدیر اعلیٰ اور مصری پریس سنڈیکیٹ کے صدر فکری عباس پاشا نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ مصر اور روس کے معاہدے کے بعد مصر کا بحران رفع ہوسکتا ہے اور ملک میں کمیونسٹ تحریک کا زور کم ہوسکتا ہے۔ عباس پاشا نے حال ہی میں ایک مقالہ افتتاحیہ میں لکھا ہے کہ ''مصر کو روس کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کر کے روسی امداد حاصل کرنی چاہیے اور برطانیہ سے قطع تعلق کر لینا چاہیے۔ چونکہ برطانیہ مصر کے اسلحہ بندی کے منصوبوں کی راہ میں روڑے اٹکا رہا ہے اس لئے مصر کو امداد کے لئے روس کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ گزشتہ جنگ عظیم کے دوران میں جنگ پسند چرچل نے برطانوی سلطنت کے دشمنوں کو نیست و نابود کرنے کی غرض سے کمیونسٹ روس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے میں ذرا بھی تامل نہیں کیا تھا اور آج کل بھی روس کے ساتھ برطانیہ کے مضبوط تجارتی تعلقات ہیں۔ مصر کے وزیر خارجہ ڈاکٹر صلاح الدین پاشا نے حال ہی میں پارلیمنٹ میں یہ بیان دیا تھا کہ اگر حالات نے تقاضا کیا تو مصر شیطان کے ساتھ بھی دوستی کرنے سے نہیں چوکے گا۔ لیکن مصر کو شیطان اور برطانیہ کے علاوہ بھی حلیف مل سکتا ہے۔ فکری عباس پاشا نے خارجہ پالیسی کے لئے مندرجہ ذیل پرگرام پیش کیا ہے۔ (1) روس اور اس کے حلیفوں کے ساتھ دوستی اور جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کیا جائے۔ (2) کمیونسٹ چین کی حکومت کو تسلیم کیا جائے جو چینی عوام کی بہت بڑی اکثریت کی نمائندہ ہے۔ (3) مشرق اور مغرب کے موجودہ تنازعہ میں مصر اپنی غیر جانبداری کا اعلان کرے۔ اور (4) روس اور اس کے حلیفوں کے ساتھ تجارتی معاہدے کئے جائیں۔''[44]

23رمئی کو مدیر نوائے وقت کے اس خوف میں اور بھی اضافہ ہوا جبکہ تقریباً ڈیڑھ لاکھ لوگ برطانیہ کے رویے کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے تہران کے پارلیمنٹ چوک میں جمع ہوئے اور انہوں نے ایران کے داخلی معاملات میں امریکہ کی بے جا مداخلت کی بھی مذمت کی۔[45] اسی دن آیت اللہ کاشانی نے بحرین میں امریکہ کی تیل کی تنصیبات کو قومیانے کا مطالبہ کیا اور اعلان کیا کہ اگر ضرورت پڑی تو اینگلو۔ ایرانین آئل کمپنی کو قومیانے کی کاروائی کو مکمل کرنے کے لئے سوویت یونین سے امداد طلب کی جائے گی۔ بحرین میں تیل نکالنے کا کام پرشین گلف کمپنی کر رہی تھی جو نیوجرسی کی سٹینڈرڈ آئل کمپنی کی ذیلی کمپنی تھی اور کینیڈا میں رجسٹرڈ تھی۔ کاشانی کا موقف یہ تھا کہ جزیرہ بحرین ایران کا جزو ہے اس لئے وہاں کی تیل کی صنعت کو

لازمی طور پر قومیانہ چاہیے۔ اور 23رمئی کو امریکہ کے جوائنٹ چیف آف سٹاف کے چیئرمین جنرل عمر بریڈلے نے سینیٹ کو بتایا کہ بلاشبہ یہ خطرہ موجود ہے کہ روس ایران میں جارحیت کا ایک اور ارتکاب کرے گا۔ جنرل بریڈلے کوریا میں اقوام متحدہ کی افواج کے سربراہ جنرل میکارتھر کی 10راپریل 1951ء کو برطرفی کی انکوائری کے دوران بیان دے رہا تھا۔ جنرل میکارتھر کی برطرفی اس لئے عمل میں آئی تھی کہ وہ چین کے ساتھ بھرپور جنگ پر اصرار کرتا تھا جبکہ صدر ٹرومین مغربی یورپ کے اتحادیوں کی اس رائے سے متفق ہو چکا تھا کہ اگر کوریا کی جنگ کا دائرہ وسیع کیا گیا تو یورپ اس سے محفوظ نہیں رہ سکے گا۔ 24رمئی کو ماسکو کے اخبارات نے ان خبروں کو شہ سرخیوں سے شائع کیا کہ امریکہ نے ایران کے معالات میں بھونڈی مداخلت کی ہے۔ حکومت ایران نے تیل کے تنازعہ کے تصفیہ کی ثالثی کے بارے میں برطانیہ کی تجویز کی پیشکش مسترد کر دی ہے۔ اس نے اس سلسلے میں امریکہ کے مراسلے کو بھی منظور نہیں کیا اور وہ قومیانے کی کاروائی مکمل کرنے میں لگی ہوئی ہے۔

تاہم 25رمئی کو ایران کے وزیراعظم ڈاکٹر مصدق نے اعلان کیا کہ حکومت ایران اینگلو۔ایرانین آئل کمپنی کے اثاثے پر قبضہ کے بعد نظم ونسق کے موجودہ ڈھانچے کو برقرار رکھے گی تاکہ دنیا کو تیل کی فراہمی کی رفتار میں کمی نہ آئے۔ 26رمئی کو حکومت برطانیہ اور اینگلو۔ایرانین آئل کمپنی نے اپنے ایرانی تیل کے تنازعہ کے تصفیہ کے لئے بین الاقوامی عدالت میں درخواستیں دائر کیں۔ اسی دن بیروت میں ایرانی سفارت خانے نے ان اخباری رپورٹوں کی تردید کی کہ ایران نے روس سے ایک معاہدہ کیا ہے جس کے تحت یہ طے پایا ہے کہ اگر برطانیہ نے ایران کے تیل کے چشموں پر قبضہ کیا تو سوویت افواج کو ایران میں داخلہ کا اختیار حاصل ہوگا۔ اسی دن امریکہ نے اس الزام کی تردید کی کہ وہ ایران کے معاملات میں مداخلت کر رہا ہے تاہم اس نے ایران سے ایک بار پھر استدعا کی کہ وہ تیل کو قومیانے کے مسئلہ پر برطانیہ سے مذاکرات کرے اور اسی دن ایرانین آئل نیشنلائزیشن بورڈ کے سیکرٹری حسین مکی نے اخبار ''اطلاعات'' کو بتایا کہ ایران اپنے جنوبی علاقوں کے چشموں کا تیل روس کے پاس فروخت نہیں کرے گا اور نہ ہی ان چشموں سے تیل نکالنے کے لئے روس کی امداد حاصل کرے گا۔[46] ان ساری خبروں کا مطلب یہ تھا کہ امریکہ کی کوششوں کے نتیجہ میں ایران کے تیل کے تنازعہ کی بنا پر پیدا شدہ کشیدگی میں کمی کا

عمل شروع ہو گیا تھا اور وہاں تودہ پارٹی کے برسراقتدار آنے کا امکان باقی نہیں رہا تھا۔ اسی کوشش میں صدر ٹرومین نے یکم جون کو ایران اور برطانیہ کے وزرائے اعظم کے نام اپنے ذاتی پیغامات میں درخواست کی تھی کہ وہ اپنے تنازعہ کے تصفیہ کے لئے گفت وشنید کریں کیونکہ ''ایران کی صورتحال دھماکہ خیز ہوگئی ہے۔''[47] 2رجون کو ایرانی سینیٹ کے ایک خفیہ اجلاس میں وزیراعظم ڈاکٹر مصدق نے ٹرومین کی یہ اپیل مسترد کر دی۔ تاہم اس نے کہا کہ اگر اینگلو۔ ایرانین آئل کمپنی کوئی وفد بھیجے گی تو ہم اس سے ملاقات کریں گے۔ کمپنی چاہے تو اس مقصد کے لئے برطانیہ کے کسی وزیر کو بھی بھیج سکتی ہے۔[48] مصدق کے اس بیان کی تعبیر یہ تھی کہ حکومت ایران برطانیہ سے گفت وشنید پر آمادہ ہوگئی تھی جبکہ مئی کے اواخر میں برطانیہ کا وزیر خارجہ موریسن پارلیمنٹ میں اشارتاً یہ بتا چکا تھا کہ برطانیہ ایران کے ساتھ اپنے ''تنازعہ کے تصفیہ کے لئے قوت استعمال نہیں کرے گا۔ امریکہ ایران کی اس صورتحال سے مطمئن تھا کیونکہ اس طرح اس علاقے میں جنگ کا خطرہ ٹل گیا تھا۔''[49]

مڈل ایسٹ ڈیفنس آرگنائزیشن (MEDO) کے قیام کے لئے برطانوی سامراجی منصوبہ اور مشرق وسطیٰ میں برطانیہ مخالف عوامی لہر

مئی کے اواخر میں برطانوی نیوز ایجنسی سٹار نے یہ خبر دی تھی کہ ترکی میں اب یہ جذبہ پیدا ہو رہا ہے کہ محض یونان سے اتحاد وتعاون اور اطلانٹک پیکٹ سے وابستگی کافی نہیں۔ ترکی کو مشرق وسطیٰ کے ملکوں سے بھی رابطہ پیدا کرنا چاہیے اور ان ممالک سے مل کر کمیونزم کے مقابلہ کے لئے ایک بلاک بنانا چاہیے۔ سٹار کی یہ خبر دراصل برطانوی حکومت کے اس منصوبہ کا پیش خیمہ تھا کہ مشرق وسطیٰ کے دفاع کے لیے ایک مڈل ایسٹ ڈیفنس آرگنائزیشن (MEDO) قائم کی جائے۔ برطانیہ نے جنوری 1951ء میں دولت مشترکہ وزرائے اعظم کی کانفرنس کے دوران آسٹریلیا، کینیڈا، نیوزی لینڈ اور جنوبی افریقہ کے وزرائے اعظم سے اس سلسلے میں تبادلہ خیالات کیا تھا اور اب اس نے اسی مقصد کے لئے 21رجون کو مالٹا میں دولت مشترکہ کے وزرائے دفاع کی ایک پریس کانفرنس طلب کی تھی۔ اس کانفرنس کے لئے پاکستان، ہندوستان اور سیلون کے وزرائے دفاع کو دعوت نہیں دی گئی تھی۔ برطانیہ اس منصوبہ پر اس حقیقت کے باوجود غور کر رہا تھا

کہ اسے اس سلسلہ میں امریکہ کی تائید وحمایت حاصل نہیں تھی۔ امریکہ کے نائب وزیر خارجہ جارج میگھی کی 24رمئی کوتقریر یہ تھی کہ چونکہ مشرق وسطیٰ کے ممالک روایتاً بڑی طاقتوں کے مہرے رہے ہیں اس لئے اب وہ غیر جانبداری کی پالیسی کی طرف مائل ہیں۔ ان ممالک میں باہمی حسد اور کشیدگی کی فضا پائی جاتی ہے اس لئے مشرق قریب اور ایشیا میں باہمی تعاون سے کسی کاروائی کی کوئی بنیاد موجود نہیں ہے۔[50] تاہم برطانیہ کے حکمران طبقہ کے بعض عناصر امریکہ کے اس عدم تعاون کے باوجود مشرق وسطیٰ میں اجتماعی تحفظ کی کسی سکیم کے ذریعے اپنے سامراجی مفادات کے تحفظ کے لئے بہت فکرمند تھے۔ ایران کی تیل کی صنعت کی کاروائی نے اور مصر میں روزافزوں قوم پرستی نے ان کی نیندیں حرام کردی تھیں۔

مشرق وسطیٰ میں برطانیہ کے خلاف عوامی جذبات کی برانگیختگی کا یہ عالم تھا کہ مئی 1951ء کے اوائل میں برطانیہ کے طفیلی ملک عراق کے پٹھو وزیراعظم نوری السعید پاشا کو رائے عامہ کے دباؤ کے تحت پارلیمنٹ میں یہ اعلان کرنا پڑا تھا کہ ''عراق برطانیہ سے باہمی امداد کو ختم کردے گا۔ عراق اپنی سرزمین کو برطانوی اداروں سے پاک رکھنا چاہتا ہے۔ تیل کی صنعت کو ''قومی ملکیت'' قرار دینے کے سلسلہ میں عراق بھی وہی کچھ کرے گا جو ایران نے کیا ہے۔'' نوری السعید کے اس بیان پر مدیر نوائے وقت کا تبصرہ یہ تھا کہ ''نوری السعید بڑا انگریز دوست ہے مگر اس کے ذاتی رجحانات سے بھی زیادہ اہم خود عراق کے شاہی خاندان کی پوزیشن ہے۔ عراق میں شریف حسین کا ہاشمی خاندان فرمانروا ہے اور موجودہ نابالغ بادشاہ فیصل ثانی شریف حسین کے لڑکے، فیصل کے پوتے اور شاہ عبداللہ والئی اردن کے بھتیجے ہیں۔ اس خاندان کے انگریزوں سے تعلقات کسی سے مخفی نہیں بلکہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ عراق کی حکومت دراصل اس خاندان کو برطانیہ کا عطیہ ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود اگر عراق کی حکومت برطانیہ سے اپنے تعلقات پر نظرثانی کرنے کا اعلان کرتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مشرق وسطیٰ میں آزادی کا رجحان تقویت حاصل کررہا ہے۔ مصر اور ایران میں جو آگ شروع ہوئی ہے وہ مشرق کے دوسرے ملکوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے۔ حکمران طبقہ کے ذاتی مفاد اور ذاتی رجحانات چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ وہ بھی مجبور ہیں یا مجبور ہوجائیں گے کہ اپنے عوام کے ہمنوا ہوکر اپنے ملکوں کی حقیقی آزادی کا علم بلند کریں۔''[51] 13رمئی کو عراق کی استقلال پارٹی (قوم پرست) کے ڈپٹی لیڈر

نے پارلیمنٹ کو بتایا کہ اگر حکومت عراق نے عراقی پٹرولیم کمپنی سے کوئی ایسا سمجھوتہ کیا جس کی بنیاد تیل کی صنعت کو قومیانے پر نہیں ہوگی تو عوام الناس اس کی مخالفت کریں گے۔[52] 23رمئی کو اسی لیڈر نے عراقی پارلیمنٹ کے ایوان زیریں کے صدر سے مطالبہ کیا کہ پارلیمنٹ کے آئندہ اجلاس کے ایجنڈے میں تیل کی صنعت کو قومیانے کا مطالبہ شامل کیا جائے۔[53] اس کے چند دن بعد عراق میں ''قومی محاذ پارٹی'' کے نام سے ایک نئی جماعت معرض وجود میں آئی۔ اس جماعت نے اپنا مقصد یہ بیان کیا کہ ''ملک کو غیر ملکیوں کے اثر سے پاک کیا جائے گا'' اور اس جماعت میں عراق کے تین سابق وزرائے اعظم معظم پاچاشی، علی جودت ایوبی اور جنرل طٰہٰ الہاشمی کے علاوہ پانچ سابق وزرا اور پارلیمنٹ کے بارہ ممبر شامل ہیں۔[54]

برطانیہ کے جو حلقے مشرق وسطیٰ کی صورتحال سے بہت پریشان تھے ان میں برطانوی پارلیمنٹ کا ایک رکن سمرسٹ ڈی چیئر (Somerset Dechair) بھی تھا۔ یہ شخص فلسطین، شام اور عراق میں برطانیہ کی خفیہ پولیس کے ایک آفیسر کے طور پر کام کر چکا تھا۔ اس کا 31رمئی کو ڈیلی ٹیلی گراف میں ایک مضمون شائع ہوا جس میں اس نے یہ تجویز پیش کی کہ مشرق وسطیٰ میں ایک معاہدہ کیا جائے جس کے چھ اساسی رکن ممالک میں پاکستان بھی شامل ہو۔ اس کی رائے یہ تھی کہ مشرق وسطیٰ میں ''آزاد دنیا'' کے دفاع کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ اگر اس کا تجویز کردہ معاہدہ ہو جائے تو مغربی طاقتیں معاہدہ اطلانتک کی دفاعی نوعیت میں کسی تبدیلی کے بغیر ترکی اور یونان کی سالمیت کا بہترین طریقے سے دفاع کر سکیں گی۔ اس کی مزید تجویز یہ تھی کہ اس کی مجوزہ مڈل ایسٹ آرگنائزیشن میں پاکستان کے علاوہ یونان، ترکی، اسرائیل، شرق اردن اور عراق کو شامل کیا جائے۔ اس نے ہندوستان کی اس تنظیم میں شمولیت کا کوئی ذکر نہ کیا اور لکھا کہ جب تک تیل کو قومیانے کے تنازعہ کا تصفیہ نہیں ہوتا ایران کو اس میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ ترکی اور یونان کو اس تنظیم کے لیڈروں میں شامل ہونا چاہیے کیونکہ دو عالمی جنگوں نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ دونوں مشرق وسطیٰ میں جنگی کاروائی کے علاقے کا جزو ہیں۔ اگر روسی فوجیں تیل کے ذخائر پر قبضہ کرنے اور مصر میں اپنا تسلط جمانے کے لئے ایران و عراق کے صحراؤں سے طوفان کی طرح گزر جائیں تو یہ دونوں ممالک مغرب کے لئے فائدہ مند نہیں ہو سکیں گے۔ اگر جنگ ہوئی تو اس انداز نبرد آزمائی میں تو اس امر کا زیادہ امکان ہے کہ مغرب، مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید حقائق کا مقابلہ کریں گے اور

اطلانٹک کو باسفورس کے ساحل تک پہنچانے کی کوشش نہیں کریں گے۔" رائٹر نے ڈی چیئر کے مضمون کے یہ اقتباس دینے کے بعد یاددہانی کرائی کہ مشرق وسطیٰ میں برطانیہ کی بری افواج کا کمانڈر انچیف جنرل رابرٹس (Robetrs) اس سلسلے میں ترکی کے فوجی حکام سے بات چیت کرنے کے لئے حال ہی میں وہاں گیا تھا۔"[55]

پاکستان کے ارباب اقتدار نے ترکی کی حکومت اور اس برطانوی لیڈر کی پیش کردہ اس تجویز پر کئی دن تک کوئی تبصرہ نہ کیا۔ لیکن جب پاکستان کے اخبارات اور سیاسی حلقوں میں اس سلسلے میں مختلف قسم کی قیاس آرائیاں ہونے لگیں تو وزیر خارجہ چودھری ظفراللہ خان نے 10 رجون کو ایسوسی ایٹیڈ پریس کے نامہ نگار سے خصوصی انٹرویو کے دوران بین الاقوامی صورتحال کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ "خطرناک طاقتیں، مراکش، تیونس، لیبیا، مصر، فلسطین، ایران، کشمیر، ہندچینی، کوریا اور نیوگنی تک کے علاقے میں دنیا کے امن کو خطرہ لاحق کر رہی ہیں۔ کوریا اور ہندچینی کے سوا ان سارے علاقوں سے مسلم عوام اور ان کے مفادات وابستہ ہیں۔" جب اس سے پوچھا گیا کہ ترکی نے مشرق وسطیٰ کے علاقے میں دفاعی معاہدے کی جو تحریک کی ہے اس کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے تو اس نے کہا کہ میں اس پر اس وقت تبصرہ کروں گا جب اس کے بارے میں زیادہ ٹھوس اطلاعات ملیں گی۔ تاہم اس نے کہا کہ ایسی ساری تحریکوں کا خیرمقدم کرنا چاہیے جن کا مقصد یہ ہو کہ کسی علاقے کے ممالک قریبی روابط قائم کر کے اپنے مشترکہ مسائل کو نمٹائیں کیونکہ ایسی کارروائیوں کی حیثیت صحیح سمت میں اقدامات کی ہوگی۔"[56]

ظفراللہ خان کی جانب سے ترکی کی اس تجویز پر محتاط الفاظ میں تبصرہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ عرب ممالک میں اس تجویز پر غیرموافق ردعمل ہوا تھا۔ لبنان کے وزیراعظم کا 15 رجون کو تبصرہ یہ تھا کہ عرب لیگ کے رکن ممالک عجلت میں مغربی طاقتوں کے ساتھ مڈل ایسٹ یا میڈیٹرینین پیکٹ (Mediterranian) نہیں کریں گے۔ عرب لیگ مشرقی یا مغربی بلاک کا ساتھ دینے میں اس لئے تامل کر رہی ہے کہ عرب ممالک اسرائیل کی یہودی مملکت کو اپنی خودمختاری کے لئے خطرہ تصور کرتے ہیں۔[57] عرب لیگ کے سیکرٹری جنرل عزام پاشا کا انقرہ میں بیان یہ تھا کہ مجھے اسلامک یونین کی تجویز کے بارے میں کچھ علم نہیں۔ میں یہاں ترکی کی حکومت کی دعوت پر آیا ہوں۔ مجھے اسلامک یونین کے موضوع میں کوئی دلچسپی نہیں۔ اسلامی ممالک کے درمیان روحانی یونین پہلے

سے ہی موجود ہے۔ جب عزام پاشا سے پوچھا گیا کہ مڈل ایسٹ میں کوئی دفاعی معاہدہ کیا جائے گا تو اس نے کہا کہ "تحریری معاہدوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ روحانی معاہدے اس سے زیادہ اہم ہوتے ہیں۔"[58] بظاہر عرب لیڈروں کے اس قسم کے بیانات مالٹا میں دولت مشترکہ کے وزرائے دفاع کی کانفرنس پر اثر انداز ہوئے۔ چنانچہ جب جون کے اواخر میں لندن میں دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس ختم ہوئی تو اس کے نتیجے کے بارے میں کوئی مفصل اور واضح بیان جاری نہ کیا گیا۔ مختصر بیان میں صرف یہ بتایا گیا کہ مشرق وسطیٰ کے دفاعی مسائل پر بحث کی گئی۔ تاہم 30ر جون کو یونائیٹڈ پریس آف امریکہ کی اطلاع یہ تھی کہ "اس کانفرنس کے نتیجے میں مڈل ایسٹ ڈیفنس سسٹم قائم ہونے کی توقع نہیں ہے بلکہ توقع یہ ہے کہ ایسٹ میڈیٹرینین سیکورٹی سسٹم کا قیام عمل میں آئے گا۔ کیونکہ کانفرنس میں یہ محسوس کیا گیا تھا کہ امریکہ کی امداد یا عرب ممالک کے تعاون کے بغیر مشرق وسطیٰ میں کمیونسٹوں کی توسیع کے سدباب کے لئے کوئی بند نہیں باندھا جاسکتا۔"[59]

امریکہ کی طرف سے یہ باور کرانے کی کوشش کہ وہ برطانیہ کی طرح کا سامراجی ملک نہیں ہے

برطانیہ اور اس کی دولت مشترکہ کے غیر ایشیائی رکن ممالک اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ امریکہ نے نہ صرف مصر اور ایران کے بحرانوں کے حل کے لئے برطانیہ کی کھل کر حمایت نہیں کی تھی بلکہ اس نے اندر ہی اندر عراق اور کویت میں بھی برطانیہ کے مفادات کی بیخ کنی کرنے کی کوشش کی تھی۔ جب مئی 1949ء کے وسط میں برطانیہ نے ایران کے خلاف فوجی کارروائی کے بارے میں امریکہ سے مشورہ طلب کیا تھا تو وہاں سے اسے حوصلہ افزا جواب نہیں ملا تھا۔ واشنگٹن کی رائے یہ تھی کہ تیل کا تنازعہ گفت وشنید کے ذریعے حل ہونا چاہیے اور پھر جب ڈاکٹر مصدق نے اس سلسلے میں امریکہ کی اپیل مسترد کر دی تھی تو واشنگٹن کی جانب سے اسے یقین دلایا گیا تھا کہ امریکہ ایران کے اندرونی معالات میں مداخلت نہیں کرے گا۔ جب یکم جون کو صدر ٹرومین نے ایران اور برطانیہ کے وزرائے اعظم کے نام نجی پیغامات میں انہیں پھر مذاکرات کی تلقین کی تھی اور ایران کے وزیر اعظم نے یہ اپیل مسترد کر دی تھی تو امریکہ نے اس پر کسی سخت ردعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔

ان دنوں حکومت امریکہ اور اس کے نمائندے ایشیائی حکمرانوں اور عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہے تھے کہ امریکہ برطانیہ کی طرح کا سامراجی ملک نہیں ہے بلکہ وہ سارے ممالک سے برابری کی سطح پر تعلقات استوار کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ 5/جون 1951ء کو پولیٹیکل سائنس اور انٹرنیشنل افیئرز کے امریکی پروفیسر ڈاکٹر جیرارڈ فریٹرز (Gerard Friters) نے لاہور میں پنجاب یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ایشیا میں سوویت یونین کی کامیابی کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایشیائی ممالک سے تعلقات استوار کرتے ہوئے نسلی مساوات کے اصول پر عمل کرتا ہے۔ اب تک امریکہ سمیت مغربی طاقتیں نسلی مساوات کے اصول کی اہمیت کو نظر انداز کرتی رہی ہیں۔ جبکہ روس نے بڑی دیر پہلے اس اصول کی اہمیت کا احساس کر لیا تھا اور اس نے اس لئے اپنی یونیورسٹیوں میں مشرقی زبانوں کی تعلیم شروع کر دی تھی۔ اس نے کہا کہ ایشیا میں روس کے روز افزوں اثر کو زائل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ امریکی اور دیگر مغربی طاقتیں ایشیائی اقوام کے متعلق اپنے طرز عمل کو مزید تبدیل کریں۔ ایشیا میں روس کے متعلق حسب ذیل دو امور سے متعلق وسیع پروپیگنڈا ہو چکا ہے۔

1۔ روس تمام آزادی پسند عوام کا لیڈر ہے

2۔ روس تمام اقوام کو مساوی حقوق دینے کا حامی ہے۔ روسی آئین میں رنگ و نسل کی کوئی تمیز نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ روس کے ارباب اقتدار نے اس دل فریب پروپیگنڈا کی آڑ میں کافی عرصہ سے سامراجی پالیسی پر عمل شروع کر رکھا ہے اس کے برعکس امریکی ارباب اقتدار ہمیشہ مظلوم اور پسماندہ اقوام کے مدد و معاون رہے ہیں مگر انہوں نے کسی کی آزادی سلب نہیں کی۔"[60]

قبل ازیں امریکہ کا نائب وزیر خارجہ جارج میگگھی جب فروری 1951ء میں پاکستان آیا تھا تو اس نے مختلف قوموں اور ملکوں کے درمیان مساوات کا درس دیا تھا اور 24/مئی 1951ء کو اس نے واشنگٹن کے پولیٹیکل سٹڈی کلب میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ امریکہ کو چاہیے کہ جنوبی ایشیا اور مشرق قریب کی اقوام سے مساوی برتاؤ کرے اور ان پر زور دے کہ وہ امریکی دباؤ کے خوف سے بے نیاز ہو کر اپنے فیصلے خود کریں۔"[61] اس نے جب یہ تقریر کی تھی اس وقت مصر اور ایران کے بحران اپنی انتہا کو پہنچے ہوئے تھے چنانچہ اس کی اس تقریر کا مطلب یہ سمجھا

گیا کہ مصر اور ایران کو برطانیہ کے دباؤ میں نہیں آنا چاہیے بلکہ مساوی سطح پر بات چیت کے ذریعے اپنے باہمی مسائل حل کرنے چاہئیں۔ میلگھی کی اس تقریر کے اگلے دن 25 رمئی کو پاکستان مسلم لیگ کے صدر چودھری خلیق الزماں نے حکومت برطانیہ کو متنبہ کیا تھا کہ اگر اس نے کوئی ایسی پالیسی اختیار کی جس سے ایران کی رائے عامہ کو کچلا گیا یا جس سے ایرانی حکومت کی خودمختاری متاثر ہوئی تو وہ ایسی سنگین مشکلات کو دعوت دے گی جس کے مضمرات کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ایران میں برطانوی حکومت کی فوجی کاروائی سے کمیونسٹوں کو ایران میں مداخلت کا موقع مل جائے گا اور اس طرح ایک مسلم ملک دوسرا کوریا بن جائے گا۔[62] اور پھر 2 رجون کو پاکستان کے وزیر خارجہ چودھری ظفر اللہ خان نے ڈان کے نامہ نگار سے خصوصی انٹرویو میں یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ایران میں تیل کی صنعت کو قومیانے کے اصول پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم اس کاروائی کی بنا پر حکومت ایران اور آئل کمپنی کے درمیان جو مسائل پیدا ہوئے ہیں ان کا تصفیہ ہونا چاہیے۔ امید ہے کہ یہ مسائل گفت وشنید کے ذریعے پرامن طور پر حل کر لئے جائیں گے۔[63] یہ وہی ظفر اللہ خان تھا جس نے 8 رمئی 1951ء کو لندن میں برطانیہ کے وزیر اعظم ایٹلی سے ملاقات کرنے کے بعد ایک پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ اگر ایرانی تیل کا مسئلہ پرامن طریقے سے حل نہ کیا گیا تو اس کے بہت برے نتائج برآمد ہوں گے۔ وہ اس مسئلہ کا ایسا تصفیہ چاہتا تھا جو فریقین کے لئے اطمینان بخش اور باعزت ہو۔

دولت مشترکہ وزرائے دفاع کانفرنس اور تیل کی صنعت قومیانے پر ایران اور برطانیہ کے مابین کشیدگی میں اضافہ

جب لندن میں برطانوی دولت مشترکہ کے وزرائے دفاع کی کانفرنس شروع ہوئی تھی تو اس سے دو تین دن پہلے برطانوی پارلیمنٹ کے 60 کنزرویٹو ارکان نے ایک تحریک کے ذریعے مطالبہ کیا تھا کہ مشرق وسطیٰ کے لئے دفاعی منصوبہ تیار کیا جائے[64] اور اس سے ایک دن پہلے یعنی 20 رجون کو ایران کے وزیر اعظم ڈاکٹر مصدق نے اینگلو۔ایرانین آئل کمپنی کے اثاثوں پر قبضہ کرنے کا حکم جاری کر دیا تھا۔ ایرانیوں نے کمپنی کے دفاتر پر اپنے ملک کے جھنڈے لہرا دیئے تھے۔ ایرانی مجلس نے ڈاکٹر مصدق پر اعتماد کا اظہار کیا تھا اور برطانیہ نے

مشرق وسطیٰ کے سارے ہوائی اڈوں پر اپنی ہوائی فوج کو چوکس کر دیا تھا۔ تاہم 27ر جون کو چین میں امریکہ کے سابق سفیر پیٹرک ہرلے نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ایرانی تیل کے مسئلہ کے بارے میں اب تک غلط رویہ اختیار کیا گیا ہے۔ اینگلو۔ایرانین آئل کمپنی کی روش متکبرانہ، کوتاہ اندیشانہ اور حریصانہ رہی ہے۔ ایران کا مسئلہ سامراج کی وجہ سے ہے۔ کمیونزم کی وجہ سے نہیں ہے۔ روس کا رویہ اس مسئلے کے بارے میں بہت محتاط رہا ہے کیونکہ اس کا خیال ہے کہ مغربی دنیا کی حرص کی وجہ سے ایران خود بخود کمیونسٹوں کی جھولی میں گر پڑے گا۔[65] ہرلے کی اس تقریر سے قبل برطانوی پارلیمنٹ میں آر۔ایچ۔ایس۔کراسمین (R.H.S.Crasman) اور ایک اور رکن نے الزام عائد کیا تھا کہ امریکی آئل کمپنیوں کے بعض ایجنٹ ایران میں تیل کا بحران پیدا کر رہے ہیں۔ چنانچہ 22ر جون کو امریکہ کے محکمہ خارجہ کے حکام نے برطانوی پارلیمنٹ کے ان ارکان کی تردید کی اور کہا کہ ایران میں برطانیہ کے تیل کے مفادات کو جو خطرہ لاحق ہے اس کی ذمہ داری امریکہ پر عائد نہیں ہوتی۔ نائب وزیر خارجہ میگگھی نے بھی اس الزام کو غلط قرار دیا کہ اس نے یہ تاثر دیا تھا کہ اگر برطانیہ کو نکال دیا گیا تو ایران کسی اور پر بھروسہ کر سکتا ہے۔[66]

لیکن پھر 24ر جون کو جبکہ لندن میں دولت مشترکہ کی دفاعی کانفرنس شروع ہو چکی تھی، امریکہ کے محکمہ خارجہ کا بیان یہ تھا کہ امریکہ نے ایرانی تیل کے تنازعہ کے بارے میں برطانیہ کا ساتھ دینے کا فیصلہ نہیں کیا ہے۔ وزیر خارجہ ڈین اچی سن کے 20ر جون کے بیان کے مطابق امریکہ ایرانی تیل کے تنازعہ میں مداخلت کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔[67] 25ر جون کو اینگلو۔ایرانین کمپنی نے آبادان میں اپنا تیل کا کارخانہ بند کر دیا کیونکہ برطانیہ کے وزیر خارجہ ہربرٹ موریسن (Hurbert Morrison) کی رائے یہ تھی کہ ایرانیوں کے پاس یہ کارخانہ چلانے کے لئے مطلوبہ فنی مہارت نہیں ہے۔[68] اور پھر 26ر جون کو برطانیہ کا بحری جنگی جہاز ''ماریشس'' خلیج فارس میں پہنچ گیا تو 27ر جون کو حکومت ایران نے اعلان کیا کہ آبادان کے علاقے میں ایران کی فوجیں بھیجی جا رہی ہیں۔ مصر میں حکومت ایران کے اس اعلان پر فوری ردعمل ہوا اور ایک سرکاری ترجمان نے اعلان کیا کہ اگر اینگلو۔ایرانین تنازعہ نے جنگ کی صورت اختیار کی تو مصر برطانیہ کو ہر قسم کی سہولت دینے سے انکار کر دے گا۔ عین ممکن ہے کہ برطانوی جنگی جہازوں اور جنگی سامان کو نہر سویز سے گزرنے کی ممانعت کر دی جائے۔ حکومت مصر نے عراق کو

بھی یہ مشورہ دیا کہ ایران پر حملہ کی صورت میں برطانیہ کو عراق کے فوجی اڈے استعمال کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔عرب لیگ کے سیکرٹری عزام پاشا نے اعلان کیا کہ عرب ممالک اپنے ہمسایہ اسلامی ملک ایران کی ہر ممکن ذریعے سے امداد کریں گے اور باا ثر انجمن شبان المسلمین کے صدر نے ایک بیان میں ایران کے جرأت مندانہ اقدام کی تعریف کرتے ہوئے وزیر اعظم ایران کو ہر ممکن امداد کا یقین دلایا۔اس نے ایران کی فتح کو ''اسلام کی فتح'' کے مترادف قرار دیتے ہوئے توقع ظاہر کی کہ غیر ملکی سامراج کے خاتمہ کے لئے تمام اسلامی ممالک ایران کی تقلید کریں گے۔[69]

لیاقت علی کی جانب سے ایران کی حمایت نہ کرنے پر پنجابی شاونسٹوں کی طرف سے اسکی برطانیہ نواز خارجہ پالیسی پر تنقید

اس صورتحال میں مدیر نوائے وقت نے بھی پہلی مرتبہ اینگلو۔ایرانین تنازعہ میں ایران کی کھل کر حمایت کی اور لکھا ''اس وقت ایران کو امداد کی ضرورت ہے۔اخلاقی امداد کی، مالی امداد کی اور فوجی امداد کی۔اس وقت اخلاقی امداد کی بھی بڑی اہمیت ہے۔بالخصوص امریکہ اس سے بڑا متاثر ہوگا......حکومت پاکستان ملت پاکستان کے دلی جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے اس امر کا اعلان کردے کہ اگر برطانیہ نے ایران کے خلاف فوجی یا جارحانہ کاروائی کی تو نہ صرف یہ کہ پاکستان برطانیہ کو کسی قسم کی سہولت نہیں دے گا بلکہ پاکستان کی تمام تر ہمدردی مظلوم ایران کے ساتھ ہوگی۔ہمیں یقین ہے کہ یہ اعلان غیر مؤثر ثابت نہیں ہوگا۔اس سے نہ صرف ایرانیوں کے حوصلے بڑھیں گے بلکہ انگریز بھی جارحانہ قدم اٹھانے سے پہلے دومرتبہ سوچیں گے۔دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کی حیثیت سے پاکستان کو مردانہ وار اپنا فرض ادا کرنا ہے۔''[70] پھر 3رجولائی کو اس مسئلہ پر مدیر نوائے وقت کا اداریہ یہ تھا کہ

1۔ ''ایران مظلوم ہے اور حق بجانب...... پاکستانی عوام، پاکستانی پریس اور پاکستانی حکومت سب متفق ہیں کہ ایران راستی پر ہے اور برطانیہ اس کی کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔پاکستان ہر مظلوم کا حامی ہے۔(اس کا روشن ترین ثبوت یہ ہے کہ پاکستان نے جنوبی کوریا کی حمایت کا اعلان کرنے سے قبل رسمی تکلفات میں پڑنے سے بھی انکار کردیا۔)

2۔ ایران ایک ایشیائی ملک ہے اور ہمارا ہمسایہ ہے۔ ایران میں سیاست جو کروٹ لے گی پاکستان اس سے ضرور متاثر ہوگا۔ اس لئے پاکستان کا اپنا مفاد اس میں ہے کہ ہم یہ کوشش کریں کہ ایران میں سیاست ''غلط کروٹ'' نہ لے۔

3۔ ایران ایک اسلامی ملک ہے اور ہمارے ساتھ اس کے تعلقات انتہائی برادرانہ ہیں۔

4۔ ایران نے کشمیر کے معاملہ میں پاکستان کی انتہائی اخلاقی امداد کی ہے۔

اب جبکہ ایران پر سخت وقت آیا ہے اور اسے اخلاقی مدد کی ضرورت ہے۔ احسان شناسی کا تقاضا ہے کہ ہم ایران کی مدد سے دریغ نہ کریں...... مشرق وسطیٰ کے تعلق سے پاکستان بلا مبالغہ کامن ویلتھ کا سب سے اہم رکن ہے اور ایران سے پاکستان کے جو تعلقات ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں۔ یہ پاکستان کا حق ہی نہیں پاکستان کا فرض بھی ہے کہ وہ اس معاملہ میں دخل دے اور فریقین میں باعزت مصالحت کرانے کی کوشش کرے اور خدانخواستہ یہ کوشش ناکام ثابت ہو تو پھر پاکستان کا رستہ سیدھا اور صاف ہے۔ وہ اس فریق کا ساتھ دے جو مظلوم ہے اور راستی پر ہے۔ کامن ویلتھ سے تعلق کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ برطانیہ کی وجہ سے ہم اپنی خارجہ پالیسی کو کمزور اور بے جان بنا دیں۔ برطانیہ کی خواہش واقعی یہ ہوگی اور وہ یہ ہے کہ (وزیراعظم پاکستان کے الفاظ میں) پاکستان گھڑے کی مچھلی اور انگریزوں کے گھر کی مرغی (اس لئے دال برابر) بنا رہے ہیں۔ مگر ایک آزاد و خودمختار ملک کی حیثیت سے پاکستان یہ پوزیشن قبول نہیں کر سکتا۔ بے شک پاکستان برطانوی کامن ویلتھ کا ممبر ہے۔ مگر پاکستان ایک اور کامن ویلتھ کا ممبر بھی ہے۔ یہ کامن ویلتھ ایشیائی اور اسلامی ملکوں کی کامن ویلتھ ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ابھی یہ کامن ویلتھ تخیل ہی میں ہے۔ مگر زود یا بدیر اس کا ایک ٹھوس حقیقت بن جانا ناگزیر ہے۔ ایشیا کے مسلمان ملکوں میں ایک نئی لہر اٹھی ہے اور ایک نئی تحریک جنم لے رہی ہے۔ پاکستان چاہے بھی تو اس نئی لہر سے بے تعلق نہیں رہ سکتا۔ مگر وہ بے تعلق رہنا کیوں پسند کرے؟ اس کا ماضی ان ملکوں سے وابستہ رہا ہے اور اب اس کا مستقبل ان ملکوں سے وابستہ ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ پاکستان ان ملکوں کی قیادت کرے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ پاکستان ایشیا کا سب سے مضبوط مسلمان ملک ہے۔ وہ ان ملکوں کی مدد کرے اور انہیں مضبوط بنائے۔ یہ ملک پاکستان کی مدد کریں گے اور اسے مضبوط بنائیں گے۔ پاکستان اپنی آزاد، مضبوط اور جاندار خارجہ پالیسی کی بدولت ان ملکوں کو اینگلو۔ امریکی سامراج

اور روسی اشتراکیت دونوں کے خوف سے نجات دلا سکتا ہے۔ ہم نے محض ایک جذباتی بات نہیں لکھی۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ ایشیا کے مسلمان ممالک اپنی خارجہ پالیسی کو صحیح معنوں میں آزاد اور جاندار بنائیں اور ایک دوسرے سے اشتراک کریں تو ان کا یہی اشتراک انڈونیشیا اور ہندوستان تک سے اتحاد کا پیش خیمہ بن سکتا ہے اور ایشیا کے چھوٹے چھوٹے ملک فی الواقع اینگلو۔امریکی سامراج اور روسی اشتراکیت دونوں کے خوف سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔"[71] 7ر جولائی کو مدیر نوائے وقت نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ "مسلم لیگ کے کسی لیڈر سے تو اتنا بھی نہ ہو سکا کہ وہ ایران کے موقف کی حمایت میں اور برطانیہ کے جارحانہ طرز عمل کے خلاف ایک رسمی بیان ہی جاری کر دے۔ نہ مرکزی مسلم لیگ کے صدر (لیاقت علی خان) کو اس کے لئے فرصت ملی نہ کسی صوبہ مسلم لیگ کے صدر یا سیکرٹری کو یہ توفیق نصیب ہوئی۔ شاید وہ مرکزی لیگ کی ہدایات کے منتظر ہیں...... پاکستان نے اپنی مختصر سی زندگی میں عالم اسلام کے اتحاد کے لئے قابل قدر کوششیں کی ہیں۔ اس مرحلہ پر پاکستان کی سب سے بڑی جماعت کا یہ مرگ آسا سکوت ان سب کوششوں پر پانی پھیر دے گا۔ اس لئے مسلم لیگ کو جرأت اور حوصلہ سے کام لینا چاہیے اور برطانیہ اور کامن ویلتھ سے تعلق کو غیر ضروری اہمیت دیئے بغیر اپنا اثر ورسوخ ایران کے حق میں استعمال کرنا چاہیے۔ ایران سے اسلام اور ایشیائیت کا رشتہ، برطانیہ سے کامن ویلتھ کے تعلق سے بہر حال مضبوط تر ہے۔"[72]

پنجابی شاونسٹوں نے زوال پذیر برطانیہ کو چھوڑ کر چڑھتے سورج امریکہ کی پوجا شروع کر دی

پنجاب میں مدیر نوائے وقت کی قسم کے شاونسٹوں کی جانب سے لیاقت علی خان کی حکومت کی خارجہ پالیسی پر اس نئے بھرپور حملے کے پس پردہ کئی عوامل کارفرما تھے۔ سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ لیاقت علی خان نے مارچ 1951ء میں پنجاب کے عام انتخابات میں "کامیابی" حاصل کر کے پورے ملک میں اپنے اقتدار کا جو دبدبہ قائم کیا تھا تین چار ماہ میں اس کا اثر زائل ہونا شروع ہو گیا تھا۔ ممتاز دولتانہ کی زیر سرکردگی مسلم لیگی حکومت نے اپریل 1951ء میں برسر اقتدار آنے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا تھا کہ نوائے وقت کی اشاعت بند کر دی تھی جس کی

بنا پر مدیر نوائے وقت اور اس قسم کے دوسرے پنجابی شاونسٹوں پر ایک قسم کا خوف طاری ہو گیا تھا اور انہوں نے وزیر اعظم لیاقت علی خان کی داخلی اور خارجی پالیسی پر حملوں کی شدت میں کچھ کمی کر دی تھی مگر کوریا کی جنگ کی وجہ سے پیدا شدہ خوشحالی کا دور ختم ہونے، کوریا کے بارے میں پاکستان کی خارجہ پالیسی کے ناکام ہونے، آئین کی تشکیل کے مسئلہ کو غیر معین عرصہ تک معرض التوا میں ڈالے جانے اور بعض دوسری وجوہ کی بناء پر جون 1951ء میں ملک کی عنان حکومت پر لیاقت علی خان کی گرفت ڈھیلی ہو گئی تو پنجاب میں اس کی مرکزی حکومت پر نکتہ چینی میں پھر وہی زہر شامل ہو گیا جو مارچ 1951ء کے عام انتخابات سے پہلے ہوا کرتا تھا۔ پنجاب میں لیاقت علی خان کی انگریز نواز خارجہ پالیسی 1949ء سے ہی غیر مقبول تھی جبکہ اس نے کشمیر میں جنگ بندی کی تھی۔ مگر جب 1950-51ء میں مشرق وسطیٰ اور دوسرے ایشیائی ممالک میں انگریزوں کے مفاد اور وقار کو امریکیوں کے ہاتھوں مسلسل نقصان پہنچا تو مدیر نوائے وقت سمیت پنجابی شاونسٹوں کو بھی یہ پتہ چل گیا کہ اب عالمی طاقت کی حیثیت سے برطانیہ کا ستارہ زوال پذیر ہے اور امریکہ بڑی تیزی کے ساتھ اس کی جگہ لے رہا ہے۔ لیکن وزیر اعظم لیاقت علی خان اپنے وزیر خارجہ ظفر اللہ خان اور دوسرے مشیروں کے مشورے کے مطابق زوال پذیر برطانیہ کے ساتھ ہی چمٹا ہوا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ لیاقت علی خان جب مئی 1950ء میں امریکہ گیا تو وہاں کے ارباب اقتدار نے اس سے ہتک آمیز سلوک کیا تھا۔ انہوں نے نہ تو اس کی ٹھیک سے پذیرائی کی تھی اور نہ ہی اسے کوئی مالی اور فوجی امداد دی تھی اور پھر جب جون۔ جولائی 1950ء میں لیاقت علی خان نے کوریا کی جنگ میں غیر مشروط طور پر امریکیوں کی حمایت و امداد کا اعلان کیا تھا تو اس کی کوئی قدر افزائی نہیں کی گئی تھی۔ تاہم پنجاب میں لیاقت علی خان کی انگریز نواز پالیسی غیر مقبول ہی رہی۔ اپریل 1951ء میں جب اینگلو۔ ایرانین تنازعے نے زور پکڑنا شروع کیا تھا تو مدیر نوائے وقت نے اس موقع پر ایران کی حمایت نہیں کی تھی۔ مگر جب جون 1951ء تک ساری دنیا پر یہ بالکل واضح ہو گیا کہ امریکہ مصر، ایران اور مشرق وسطیٰ کے دوسرے ممالک میں برطانوی مفادات کی بیخ کنی کر رہا ہے، برطانوی پارلیمنٹ میں امریکہ کے اس رویے پر احتجاج ہوا اور امریکی سفارت کاروں اور پروفیسروں نے ایشیائی ممالک کے دورے کئے اور با اثر عناصر سے براہ راست روابط قائم کر کے امریکہ نواز لابی تیار کرنا شروع کی تو پاکستان میں بھی برطانیہ نواز مرکزی حکومت

کے مخالفوں کے حوصلے بڑھے اور انہوں نے چڑھتے سورج کی پوجا شروع کر دی۔ لیکن لیاقت علی خان نے پورے پاکستان میں بالعموم اور پنجاب میں بالخصوص اپنے سیاسی مخالفین کی اس حکمت عملی کا بروقت نوٹس نہ لیا اور وہ 1951ء میں اینگلو۔ایرانین تنازعہ کے بارے میں اسی بے تعلقی کی پالیسی پر عمل پیرا رہا جو اس نے 1950ء میں اینگلو۔مصری تنازعے کے بارے میں اپنائی تھی۔

7رجولائی کو لیاقت علی خان نے کراچی میں ایک بہت بڑے جلسہ عام کو خطاب کیا جس میں اس نے مسلمان ملکوں کی توجہ اتحاد اسلامی کی ضرورت و اہمیت کی طرف مبذول کرائی۔ اس نے کہا کہ ''اگر مغربی جمہوریتیں اپنے طرز زندگی کے تحفظ کے لئے معاہدے کر سکتی ہیں، اگر کمیونسٹ ممالک اپنے نظریے کی بنیاد پر بلاک بنا سکتے ہیں تو مسلم عوام اپنے تحفظ کے لئے اکھٹے کیوں نہیں ہو سکتے اور دنیا پر یہ ظاہر کیوں نہیں کر سکتے کہ ان کے پاس ایک نظریہ ہے اور ایک طرز زندگی ہے جن کو اپنانے سے دنیا میں امن و امان برقرار رہ سکتا ہے۔ اگر مسلم عوام کی جانب سے اپنی آزادی کے تحفظ کے لئے اور دنیا کے امن و خوشحالی کو پائیدار بنانے کی غرض سے اپنی طاقت میں اضافہ کے لئے اتحاد کی کوئی تحریک ہوئی تو پاکستان صدق دل سے اس تحریک میں شامل ہو کر اپنا کردار ادا کرے گا۔''[73] مگر لیاقت علی خان نے اپنی اس تقریر میں ایران کے قضیے کا کوئی ذکر نہ کیا۔ اس کی اس خاموشی پر مدیر نوائے وقت کا تبصرہ یہ تھا کہ ''مسٹر لیاقت علی خان کی تقریر کی جو رپورٹ لاہور کے دو اخبارات میں نظر سے گزری اس میں ایران کا کوئی ذکر نہیں۔ غالباً خبر رساں ایجنسی کی فروگزاشت کہ تقریر کا یہ حصہ حذف ہو گیا یا شاید مسٹر لیاقت علی خان ہی اس وقت یہ ذکر بھول گئے ہوں۔ مگر ہمیں یقین ہے کہ وہ مسئلہ ایران کی نزاکت و اہمیت سے غافل نہیں۔ ان جیسے مدبر سے بہتر کون جانتا ہے کہ ایران اسلامی ملکوں کی اخلاقی و مادی مدد کا محتاج ہے اور وہ ''سامراجیت'' کے ناکام عزائم کا مقابلہ اسی صورت میں کر سکتا ہے جب ہم میں اتحاد ہو۔ مسٹر لیاقت علی خان نے بجا طور پر ارشاد فرمایا کہ اب تک ہم قراردادیں پاس کر کے یا بیانات جاری کر کے دوسروں سے ہمدردی ظاہر کرتے رہے ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے زیادہ قریب آ جائیں۔ موجودہ دنیا میں بیانات اور قراردادوں کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ اس لئے مسلم لیگ کو بیانات و قراردادوں کو بیکار سمجھتے ہوئے خاموش نہیں رہنا چاہیے جبکہ ایران کے حق میں زیادہ سے زیادہ بیانات دینے چاہئیں اور زیادہ سے زیادہ قراردادیں منظور کرنی چاہئیں۔ مگر

جیسا کہ مسٹر لیاقت علی خان نے کہا ہے کہ محض قرارداد یں کافی نہیں۔ ''وقت آ گیا ہے کہ اسلامی ملک ایک دوسرے کے زیادہ سے زیادہ قریب آ جائیں'' ...... ہماری تجویز یہ ہے کہ اس مبہم خیال کو ٹھوس شکل دینے کے لئے خود مسٹر لیاقت علی خان پہل کریں اور ترکی، مصر، حجاز، عراق، فلسطین، شام، یمن، شرق اردن، افغانستان اور انڈونیشیا کے مسلمان ملکوں کے نمائندوں کی ایک کانفرنس بلا تعویق کراچی یا قاہرہ میں طلب کریں اور ایران کے مسئلہ کو اس کانفرنس میں پیش کریں۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر مسلمان ملکوں کے رہنما خلوص اور تدبر اور ان سب سے بڑھ کر جرأت کا مظاہرہ کریں تو یہی کانفرنس اتحاد اسلامی کا تاسیسی اجلاس بن سکتی ہے۔''[74] مدیر نوائے وقت نے یہ اداریہ لیاقت علی خان کی انگریز نواز پالیسی کو بے نقاب کرنے کے لئے لکھا تھا اور اس مقصد میں اسے کامیابی ہوئی۔ لیاقت علی خان نے نہ تو ایران کی حمایت میں کوئی بیان دیا نہ ہی اس کی مسلم لیگ نے اس مسئلہ پر کوئی قرارداد منظور کی اور نہ ہی اس نے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے اسلامی ملکوں کی کوئی کانفرنس طلب کی۔

مشرق وسطیٰ کے ممالک کے اتحاد کے لئے ترکی کی تجویز اور ترکی میں سیکولر ازم کے خلاف اسلام پسندی کی مقبولیت کا پروپیگنڈا

لیاقت علی خان کی جانب سے اتحاد اسلامی کے اس تازہ نعرے کا پس منظر یہ تھا کہ مئی 1951ء کے اواخر میں جبکہ اینگلو۔ ایرانین تنازعہ انتہائی شدت اختیار کر چکا تھا اور یہ کہ ترکی کی حکومت نے تحریک کی تھی کہ کمیونزم کا مقابلہ کرنے کے لئے مشرق وسطیٰ کے ملکوں کا ایک بلاک بنایا جائے۔ یہ تحریک مشرق وسطیٰ میں برطانیہ کی بری فوج کے کمانڈر انچیف جنرل رابرٹس کی ترکی کے فوجی حکام سے ملاقات کے بعد ہوئی تھی اور اس کے فوراً بعد عرب لیگ کے سیکرٹری جنرل عزام پاشا کو ترکی کا دورہ کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ عزام پاشا نے 2رجون کو یہ دعوت، اس اعلان کے ساتھ، منظور کر لی تھی کہ ''ترکی میں اسلامک پارٹی برسر اقتدار ہے جو روحانی طور پر عرب ملکوں کی جانب مائل ہے۔'' 10رجون کو پاکستان کے وزیر خارجہ ظفر اللہ خان نے اصولی طور پر ترکوں کی اس تحریک کا خیر مقدم کیا تھا۔ 14رجون کو عزام پاشا انقرہ پہنچا تو اس کے دو دن بعد 16رجون کو ترکی کے صدر جلال بایار نے اس سے مشرق وسطیٰ کی عمومی صورتحال کے بارے میں تبادلہ خیالات

کیا تھا۔ روزنامہ ''جہاد'' میں اس ملاقات کی خبر کی سرخی یہ تھی کہ ''آملیں گے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک۔'' تاہم عزام پاشا نے اپنے ترکی کے اس دورہ کے دوران اسلامک یونین کی تحریک کی حمایت نہیں کی تھی اور کہا تھا کہ ''تحریری معاہدوں کی کوئی اہمیت نہیں۔'' چودھری خلیق الزماں نے عزام پاشا کی اس رائے سے اختلاف کیا تھا اور کہا تھا ''روحانی رشتے صرف اسی صورت میں بروئے کار آسکتے ہیں کہ مناسب سیاسی ماحول پیدا کیا جائے۔ صرف اسلام ہی سے ایسا روحانی ماحول پیدا ہوسکتا ہے۔ ہماری سیاسی سرگرمیوں کا نصب العین قوم پرستی یا نسل پرستی نہیں ہونا چاہیے۔ مسلم بلاک کی تعمیر ایسے معاہدوں پر نہیں ہونی چاہیے جو عارضی ہوں اور جن میں تبدیلی ہو سکے بلکہ اس کی بنیاد سیاسی اتحاد کے مضبوط پتھر پر رکھی جانی چاہیے۔ اس قسم کا مسلم سیاسی اتحاد مسلم ممالک کے آئین میں ایسی تبدیلیوں سے ہی آسکتا ہے جن کے تحت مسلم دنیا کے تقاضے پورے کرنے کے لئے مرکزی اتھارٹی قائم ہو سکے۔''[75] گویا خلیق الزماں ابھی تک اپنے اس اسلامستان یا خلافتی نظام کی تجویز پر مصر تھا جس کی تبلیغ کے لئے وہ 1949ء میں مشرق وسطیٰ کے ممالک کے علاوہ لندن بھی گیا تھا۔ جب اس نے یہ بیان دیا تھا اس وقت لندن میں دولت مشترکہ کے وزرائے دفاع کی کانفرنس شروع ہو چکی تھی۔ اس کانفرنس میں مشرق وسطیٰ کے دفاع کا مسئلہ زیر بحث آیا تھا۔ پاکستان کے وزیر خارجہ ظفراللہ خان کی جانب سے ترکی کی حکومت کی اس تحریک کے اصولی خیر مقدم کے بعد خلیق الزماں کے اس بیان کا مطلب یہ تھا کہ برطانیہ نے 1949ء میں مشرق وسطیٰ میں اپنے مفادات کے تحفظ وفروغ کے لئے مذہب کو بطور سیاسی حربہ استعمال کرنے کی جو پالیسی اختیار کی تھی وہ ابھی تک اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ برطانیہ کی اسی پالیسی کے تحت جون 1951ء کے وسط میں لندن میں دنیا کے مختلف مذاہب کے علما کی ایک عالمی کانگرس ہوئی تھی۔ اس کانفرنس کا مقصد یہ تھا کہ مذہب کے ذریعے بنی نوع انسان میں باہمی رفاقت کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ اس کانگرس کے افتتاحی اجلاس میں برطانیہ کی مسلم سوسائٹی کے صدر اسماعیل ڈی یورک نے بھی اسلام پر تقریر کی تھی اور پھر ایک کلیسا میں تمام مذاہب کے پیروکاروں نے مشترکہ طور پر روحانی عبادت کی تھی اور اس میں قرآن کریم کی تلاوت بھی شامل تھی۔ مزید برآں اس میں مسیحی گیت، اور ہندو اور بدھ اشلوک بھی سنائے گئے تھے۔''[76]

2 رجولائی 1951ء کو روزنامہ ''جہاد'' میں استنبول سے موصولہ ایک مراسلہ شائع ہوا

جس میں یہ اطلاع دی گئی تھی کہ ''ترکی میں احیا اسلام اور قرآن و حدیث کی تعلیم کے اجرا کے لیے ایک تحریک بڑے زور شور سے جاری ہے۔ترک مسلمانوں میں مصطفیٰ کمال کے دور حکومت کو ایک نیچر پسند اور نیم ملحدانہ دور تصور کیا جا رہا ہے۔عوام کے علاوہ ترکی کے تعلیم یافتہ اور سنجیدہ حلقوں میں بھی یہ رجحان زور پکڑ رہا ہے کہ مصطفیٰ کمال پاشا نے دنیاوی ترقی کے سلسلے میں مذہبی تعلیمات، مذہبی رسوم و رواج اور شرعی طور و طریق میں بزعم خود جو اصلاحات روا رکھی تھیں وہ نہ صرف دنیاوی ترقی کے لئے غیر ضروری، مبالغہ آمیز اور جانبدارانہ تھیں بلکہ مذہبی، اخلاقی اور روحانی حیثیت سے بھی یک قلم نا قابل تسلیم اور نا قابل برداشت تھیں۔ مادیات اور جدید علوم و سائنس میں انتہائی کمال کے باوجود یورپ کے اکثر ممالک کو تباہی و بربادی اور انسانی زندگی میں جس عدم سکون اور بے قراری کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، اس سے ترکی کے عوام و خواص ہر دو حد درجہ متاثر ہیں اور وہ اسلام کے لئے اخلاقی، روحانی اور دنیاوی ترقی کے حامل علوم کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ وہ مستقبل کے لئے ترکی کا نقشہ اور ملکی حکومت اور قومی تصورات کا نیا خاکہ قرآن اور احادیث کی روشنی میں اسلامی تعلیمات کے بالکل مطابق بنانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ حال ہی میں ترکی کے عوام نے کمال اتاترک کی نیم لا مذہبی دور حکومت کے خلاف سخت مظاہرے کئے ہیں اور مذہبی تعلیمات اور اصول اسلامی نیز مذہبی رسوم و رواج کے متعلق مصطفیٰ کمال کی یورپ مزاج نیم مذہبی ذہنیت اور اس کی بنا پر ترکی حکومت کی حکمت عملی کی سخت مذمت کی ہے۔مظاہروں کے دوران مواصلات کے ایک افسر نے ترکی کے مرحوم لیڈر کمال اتاترک کے دو مجسمے توڑ ڈالے اور ''بت پرستی مردہ باد'' کے نعرے لگائے۔مظاہرین نے دار الحکومت میں بہت سے اشتہارات تقسیم کئے ہیں۔ان میں تھیٹر اور سینما بند کرنے اور بداخلاقی کے دور کو ختم کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔عصمت انونو کو ترکی کے انتخابات میں اس لئے شکست ہوئی تھی کہ ترک عوام مذہب کے متعلق ان کی اس پالیسی سے متفق نہ تھے جو مصطفیٰ کمال مرحوم کے جانشین کی حیثیت سے انہوں نے اختیار کی تھی۔الیکشن جیتنے کے لئے جلال بایار کی پارٹی نے ترک عوام سے وعدہ کیا تھا کہ ان کی حکومت اسلام، قرآن اور مذہبی تعلیمات کی روشنی میں نظام حکومت چلائے گی مگر الیکشن جیتنے کے بعد انہوں نے بھی بڑی حد تک سابق نیم لا مذہبی طرز حکومت جاری رکھا جس سے ترکی کے مسلمانوں میں، جو اسلام کھو کر سب کچھ کھو چکے ہیں اور اب اسلام کی طرف از سر نو واپس آنا چاہتے ہیں، بڑی بے چینی اور اضطراب پھیل

رہا ہے۔ متعدد مظاہرے اس بے چینی کا نتیجہ ہیں۔ جلال بایار کی حکومت دوسرے ممالک میں یہ پروپیگنڈا کر رہی ہے کہ چند کمیونسٹ مذہبی لبادہ اوڑھ کر یہ مظاہرے کروا رہے ہیں۔" [77]

"جہاد" کے اس مراسلے میں ترکی کے اندرونی سیاسی حالات کا جو نقشہ کھینچا گیا تھا وہ مبنی برصداقت نہیں تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ ترکی میں حکومت کی تبدیلی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ جلال بایار امریکہ کو ترکی میں فوجی اڈوں کی وہ ساری سہولتیں دینے پر آمادہ تھا جن کے بارے میں عصمت انونو پس وپیش کرتا تھا یا سودے بازی کرتا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد ترکی ایک نیم آزاد ملک تھا جس کی داخلہ اور خارجہ پالیسی کا تعین واشنگٹن یا لندن میں ہوتا تھا۔ وہاں مصر، ایران اور پاکستان کی طرح مذہبی تحریک اس لئے شروع نہیں ہوئی تھی کہ ترک عوام بابائے قوم مصطفیٰ کمال کے سیکولر طرز حکومت سے بیزار تھے بلکہ اس لئے شروع ہوئی تھی کہ ترکی کے جاگیردار طبقے کی اس تحریک کی امریکہ اور برطانیہ پشت پناہی کرتے تھے۔ مشرق وسطیٰ میں عام تاثر یہ تھا کہ ترکی کی حکومت خارجی امور میں جو کچھ بھی کرتی ہے اس میں امریکہ یا برطانیہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ خود نوائے وقت بھی 50-1949ء میں یہی لکھتا رہا تھا لیکن اب اس تاثر کو دور کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ چنانچہ برطانیہ کی نیوز ایجنسی رائٹر نے 5 رجولائی کو قاہرہ کے اخبار "المصری" کے ایڈیٹر محمود بے کا یہ انٹرویو جاری کیا کہ جیسا کہ بعض بزرگوں کا خیال ہے کہ عرب اور دیگر اسلامی ریاستوں کی جانب ترکی کی نئی حکمت عملی کسی غیر ملکی اثر کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ برسر اقتدار ڈیموکریٹک پارٹی کی اپنی پالیسی ہے۔ محمود بے 18 سال کے بعد ترکی گیا تھا اور اس نے اسلام کی جانب حکومت کی حکمت عملی میں نمایاں تبدیلی محسوس کی تھی۔ اس کا مزید بیان یہ تھا کہ موجودہ ترک حکومت اسلامی تہذیب کی علمبردار ہے اور عرب ریاستوں سے تعاون رکھنا چاہتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ امریکہ عرب اور دیگر اسلامی ممالک کے سلسلے میں ترکی کی پالیسی کا حامی ہے۔ ڈیموکریٹک پارٹی کو پچھلے انتخابات میں اس لئے کامیابی ہوئی تھی کہ وہ ملک میں اسلامی روایات کو زندہ کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ 30 سال میں پہلی مرتبہ اذان عربی میں دی جا رہی ہے۔ سکولوں میں اسلامیات پڑھائی جا رہی ہے اور توپوں کی گرج سے سحری اور افطار کا اعلان ہوتا ہے۔ بہت سی مساجد عوام کے چندوں سے تعمیر کی گئی ہیں۔ تاہم اندرون ملک کے عوام اس کام میں حکومت کی رفتار سے مطمئن نہیں ہیں اور دھمکی دے رہے ہیں کہ اگر اسلامی روایات زندہ کرنے میں تیز رفتاری سے کام نہ لیا گیا تو وہ

حکومت کے خلاف کھڑے ہو جائیں گے۔''[78] تاہم رائٹر نے محمود بے سے یہ بات منسوب نہیں کی تھی کہ ترکی میں اسلامی احیا کی اس تحریک کے پیش نظر عرب ممالک کو اس کے ساتھ مل کر اسلامی بلاک بنا لینا چاہیے۔ حالانکہ جلال بایار کی حکومت کا نظام بھی سیکولر ہے اور اس نے اسرائیل کی یہودی مملکت کو بھی تسلیم کر رکھا ہے۔

راغب احسن اور نوائے وقت کی متحد اسلامی دنیا کی خام خیالی درمیانہ طبقہ کی ٹھوس عالمی حقائق سے لاعلمی اور مذہبی نعرے بازی پر مبنی تھی

لیاقت علی خان کی متذکرہ تقریر کے ایک دو دن بعد مشرقی پاکستان کی جمعیت العلمائے اسلام کے نائب صدر مولانا راغب احسن نے ایک طویل بیان میں اس امر پر زور دیا کہ مشرق وسطیٰ کے اسلامی ملکوں کی علاقائی کانفرنس بلائی جائے۔ اس کانفرنس کو عرب ممالک کی مکمل آزادی کا مطالبہ کرنا چاہیے۔ عرب علاقوں سے فوجیں ہٹانے پر زور دینا چاہیے اور مکمل مساوات، آزادی اور غیر ممالک سے دوستی کی بنیاد پر نئے معاہدوں پر اصرار کرنا چاہیے۔ پاکستان، ایران اور مصر کو اس مسئلے پر پہل کرنی چاہیے۔ ''میں مسٹر لیاقت علی خان، ڈاکٹر مصدق اور نحاس پاشا سے درخواست کرتا ہوں کہ بلا تاخیر وہ اس معاملے میں قدم اٹھائیں۔ مشرق وسطیٰ کی علاقائی کانفرنس طلب کرنا ایک اسلامی فرض ہے اور ذاتی مفاد کا تحفظ ہے۔ اس کانفرنس میں مشرق وسطیٰ کے علاقے میں منرو کے اصولوں (Monroe Doctrine) کو نافذ کرنا چاہیے۔ موجودہ وقت ہی اس کے لئے ایسا بہترین موقع ہے کہ ایک آزاد و طاقتور قدم پورے مشرق وسطیٰ کے اندر ایک مصمم عزم کے ساتھ اٹھایا جائے۔ برطانیہ مشرق وسطیٰ کی بربادی پر آمادہ ہے۔ اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ پاکستان، ایران اور مصر متحد ہو کر ایک آواز کے ساتھ سامنے آئیں۔ مولانا احسن نے برطانوی دولت مشترکہ کی اس دفاعی کانفرنس پر سخت نکتہ چینی کی جس میں دولت مشترکہ کے صرف سفید فام ارکان یعنی برطانیہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، جنوبی افریقہ، جنوبی رہوڈیشیا اور کینیڈا شامل تھے اور کالے ارکان یعنی پاکستان، ہندوستان اور سیلون شامل نہ تھے۔ باوجودیکہ اس کے اندر بطور خاص مشرق وسطیٰ کے مسائل زیر بحث آئے جس سے پاکستان، ہندوستان اور سیلون بطور ہمسائے اور ایشیائی اقوام کے خاص تعلق رکھتے ہیں جبکہ آسٹریلیا اور کینیڈا کا دور کا بھی واسطہ

نہیں......کیا یہ ایک مجرمانہ سازش اس مقصد کے لئے نہ تھی کہ مشرق وسطیٰ کو مشرق کے خلاف مغربی اقوام کی جنگ گاہ بنا دیا جائے......مشرق وسطیٰ اسلام کا دل ہے۔ پاکستان کو اس مخالف اسلام، مخالف عرب، مخالف ایران اور مخالف ایشیا شرمناک سازش کی شدید مذمت کرنی چاہیے۔ جن سفید فام اقوام نے دنیا پر غلبہ واقتدار حاصل کرنے کے لئے مشرق وسطیٰ کو میدان جنگ میں تبدیل کرنے کے لئے برپا کر رکھی ہے اور جس کا مقصد یہ ہے کہ عالمگیر اقتصادی لوٹ اور استحصال کے لئے وہ اسے ایک اڈا بنائیں جس کی ایک بہت ہی نمایاں مثال عرب لیگ اور ایران کے تیل پیدا کرنے والے ممالک ہیں جن میں خود تیل پیدا کرنے والوں کے مفاد کے خلاف مغرب کی استحصالی اجارہ داری قائم ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ پاکستان، ایران اور عرب لیگ کے ممالک ایک کانفرنس میں جمع ہو کر شدت کے ساتھ لندن کانفرنس میں کی جانے والی اس کوشش کے خلاف احتجاج کریں جو مشرق وسطیٰ کی آزادی، سالمیت، خودداری اور حقوق پر ایک مجرمانہ ڈاکہ ہے۔"[79] مدیر نوائے وقت نے مولانا راغب احسن کی اس تجویز کی حمایت کرتے ہوئے "مشرق وسطیٰ کی نجات کے لئے ملت بیضا کے ربط وضبط" پر زور دیا۔ اس نے لکھا کہ "مشرق وسطیٰ میں برطانیہ کی موجودہ مساعی امن کے لئے نہیں بلکہ اس کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ مشرق کے یہ ملک تیسری جنگ عظیم میں روس کے خلاف پہلا مورچہ بنیں۔ اگر برطانیہ کی یہ تدبیر کامیاب ہوگئی تو جنگ میں خواہ اشتراکیوں کو فتح حاصل ہو خواہ اینگلو۔امریکیوں کو، مشرق وسطیٰ کے ان ملکوں کی تباہی یقینی ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک کا وہی حشر ہوگا جو دوسری جنگ عظیم میں پولینڈ کا ہوا یا اب کوریا کا ہو رہا ہے۔ تدبر اور عاقبت اندیشی کا تقاضا یہ ہے کہ مشرق وسطیٰ کے ملکوں کے مدبر اور رہنما سر جوڑ کر بیٹھیں اور سوچیں کہ اس ہم رنگ زمین دام ہلاکت سے بچ نکلنے کی کیا تدبیر ہے۔؟"[80]

مولانا راغب احسن کی یہ تجویز اور مدیر نوائے وقت کی حمایت بڑی دلکش تھی اور بظاہر نیک نیتی پر مبنی تھی لیکن بدقسمتی سے یہ تجویز ناقابل عمل تھی۔ پاکستان میں جدید نوآبادیاتی جاگیرداری نظام رائج تھا اور اس نظام کے تحت حکومت پاکستان میں برطانیہ نواز بیوروکریسی کا غلبہ تھا۔ ظفر اللہ خان، غلام محمد، اسکندر مرزا، ایوب خان، اکرام اللہ اور چودھری محمد علی وغیرہ یہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ پاکستان کو برطانیہ کے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی شکنجے سے آزاد کروا کر اسے صحیح معنوں میں آزاد وخود مختار ملک بنایا جائے۔ ان افسروں کی سرپرستی میں کراچی اور پنجاب

میں نئے کاروباری سرمایہ دار پیدا ہوئے تھے۔ان کا مفاد بھی اسی میں تھا کہ انگریز یہاں جو سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام چھوڑ گئے تھے وہ جوں کا توں قائم رہے۔ چنانچہ ان سب نے اپنے طبقاتی مفادات کے تحفظ و فروغ کے لئے پان اسلام ازم اور اتحاد اسلامی کی آڑ لے کر جو خارجہ پالیسی اپنائی اس کی سامراج نوازی میں کسی کو کوئی شک و شبہ نہیں تھا لہٰذا مشرق وسطیٰ کے قوم پرست عناصر پاکستان کی تجویز کردہ اسلامی کانفرنسوں کے جال میں نہیں پھنستے تھے۔مزید برآں امریکہ ایسی اسلامی کانفرنسوں اور اسلامی بلاکوں کے خلاف تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اس ڈھونگ سے صرف برطانیہ کے مفادات کو ہی فروغ حاصل ہوگا۔ اگرچہ امریکہ ایشیائی ممالک میں عوامی انقلاب کے سدباب کے لئے مذہب کو بطور سیاسی حربہ استعمال کرنے کا حق میں تھا اور صدر ٹرومین نے 1949ء ہی سے مذہبی جلسوں اور مذہبی کانفرنسوں کا ایک سلسلہ شروع کر رکھا تھا لیکن وہ مذہب کے نام پر کانفرنسوں اور بلاک سازی کی بجائے دوطرفہ معاہدوں کو ترجیح دیتا تھا۔اس لئے کہ اس طرح اسے مشرق وسطیٰ اور ایشیا کے دوسرے ممالک میں برطانیہ کے مفادات کی بیخ کنی کرنے میں آسانی ہوتی تھی۔ پاکستان میں درمیانہ طبقہ کے جو لوگ اس زمانے کے ٹھوس حقائق کو نظر انداز کر کے محض زور قلم یا زور خطابت سے عالم اسلام کو صحیح معنوں میں آزاد و خود مختار بنانے کے علمبردار تھے۔ وہ اعلیٰ ترین تعلیمی ڈگریاں رکھنے کے باوجود جاہل اور ان پڑھ تھے۔یہ ملاؤں کی طرح سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں ہی کی مذمت کرتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ اگر صدقہ، خیرات، زکوٰۃ اور وراثت کے بارے میں اسلامی اصولوں و احکامات پر عمل کیا جائے تو معاشرے کی ناہمواری خود بخود دور ہو جائے گی۔ یہ لوگ مزید کہتے تھے کہ اسلام میانہ روی اور اعتدال کی تلقین کرتا ہے۔لیکن یہ نہیں بتاتے تھے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد کے سوا اسلام کی تاریخ کے کونسے عہد میں اس اعلیٰ اسلامی اصول پر عمل ہوا تھا۔ دراصل ان کا اسلام درمیانہ طبقہ کا اسلام تھا۔ یہ لوگ اسلام کے نام پر ایسا نظام رائج کرنا چاہتے تھے کہ ان کی درمیانہ طبقہ کی حیثیت پر کوئی زد نہ پڑے۔ بادی النظر میں ان کی یہ خواہش بری نہیں تھی لیکن یہ غیر حقیقت پسندانہ تھی۔ دنیا کی تاریخ میں کبھی بھی اور کہیں بھی محض صدقہ، خیرات، زکوٰۃ اور وراثت کے اصولوں و قوانین پر عمل کرنے سے ارتکاز اموال کے رجحان کا سدباب نہیں ہوسکا تھا اور نہ آئندہ کبھی ہوسکتا ہے۔

تاہم لیاقت علی خان نے مولانا راغب احسن کی تجویز کو قابل توجہ نہ سمجھا اور نہ ہی اس

نے انگریزوں کے خلاف ایرانیوں کی اخلاقی یا مادی امداد کا اعلان کیا۔ البتہ 15 جولائی کو ایک پریس کانفرنس میں اس نے یہ سنسنی خیز انکشاف کیا کہ ہندوستان نے اپنی 90 فیصدی فوجیں پاکستان کی سرحد پر جمع کر دی ہیں اور اس بنا پر ہندوستان اور پاکستان کے درمیان بھرپور جنگ شروع ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس کے اس انکشاف کے بعد پاکستان کے اخباری اور عوامی حلقوں کی توجہ ہندوستان کے ساتھ دیرینہ قومی تضاد پر مرتکز ہو گئی اور کئی ہفتے تک ملک کی سیاسی فضا پر کشیدگی طاری رہی۔ لیاقت علی خان کے اس انکشاف سے ہفتہ عشرہ قبل ایران نے بین الاقوامی عدالت کا وہ فیصلہ مسترد کر دیا تھا جو اس نے تیل کے تنازعہ کے بارے میں حکومت برطانیہ اور اینگلو ایرانین آئل کمپنی کے حق میں دیا تھا لیکن 11 جولائی کو امریکی صدر ٹرومین کے خصوصی مشیر ایورل ہیری مین (Avril Harriman) سے بات چیت کرنے کی پیشکش منظور کر لی تھی جبکہ نیویارک کے باخبر سفارتی حلقوں نے بتایا تھا کہ امریکہ اس تنازعہ کو سلامتی کونسل میں پیش کئے جانے کی حوصلہ افزائی نہیں کرے گا۔

امریکہ کی جانب سے خلیج فارس اور مشرق وسطیٰ سے برطانوی انخلا کے عمل کو تیز کر کے اس علاقے پر جلد اپنا کنٹرول قائم کرنے کی کوشش

12 جولائی کو امریکی نائب وزیر خارجہ جارج میگ گھی کی تقریر یہ تھی کہ ”خلیج فارس کا علاقہ بدستور روس کی توجہ کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ تاہم امریکہ کی روایتی پالیسی یہ رہی ہے کہ نہ صرف اس علاقے میں بلکہ ایشیا اور مشرق وسطیٰ کے دوسرے علاقوں میں سیلف گورنمنٹ کی جانب پرامن تحریکوں کی حمایت کی جائے۔ امریکہ کو مشرق وسطیٰ کی معاشی، معاشرتی اور فوجی کمزوری کا اچھی طرح علم رہا ہے لیکن استطاعت کی کمی کی وجہ سے ہم اس علاقے کی اقوام کی امداد کے لئے وہ سب کچھ نہیں کر سکے ہیں جو ہم کرنا چاہتے ہیں۔ گزشتہ کئی سالوں کے دوران یورپ اور مشرق بعید میں ہماری مساعی کا دائرہ وسیع رہا ہے اس لئے ترکی اور یونان کے سوا مشرق وسطیٰ کے دوسرے علاقوں میں ہماری کوششیں محدود رہی ہیں۔ سعودی عرب، ایران اور اسرائیل کی ہم نے قرضوں کے ذریعے مدد کرنے کی کوشش کی ہے اور ہم اس علاقے کی دوسری اقوام کی جانب سے قرضے کی درخواستوں پر بھی غور کرنے کو تیار ہیں۔“[81] میگ گھی کی اس تقریر کا مطلب یہ تھا کہ

ایران برطانوی شکنجے سے آزاد ہونے کی جو کوشش کر رہا ہے امریکہ اس کی حمایت کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے اس نے ایران کو قرضہ دیا ہے اور آئندہ بھی قرضہ دے گا۔ 13 رجولائی کو جب ایورل ہیری مین بات چیت کے لئے تہران روانہ ہوا تھا تو جارج میگھی کی نشری تقریر یہ تھی کہ اگرچہ ایران کے لئے موجودہ مسئلہ کا سرچشمہ اصلاً ایران کے اندر ہی ہے لیکن ایران کے تیل کے تنازعے سے سوویت یونین کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔ ہیری مین جب 15 رجولائی کو تہران پہنچا تھا تو یونائیٹڈ پریس آف امریکہ کی خبر یہ تھی کہ سوویت فوجیں ایران کی شمال مشرقی سرحد پر جمع ہو رہی ہیں۔ اسی دن تہران میں 10 ہزار کمیونسٹوں کے مظاہرے کے دوران فساد ہوا تھا جس میں 15 افراد مارے گئے تھے اور 70 زخمی ہوئے تھے۔[82]

لیاقت علی خان کے 15 رجولائی کے اعلان کا بین الاقوامی سطح پر کوئی خاص نوٹس نہ لیا گیا۔ امریکہ اور برطانیہ کے سرکاری حلقوں کی توجہ دوسرے عالمی مسائل کی طرف ہی مبذول رہی۔ 16 رجولائی کو برطانیہ کے سرکاری حلقوں کی پیش گوئی یہ تھی کہ مڈل ایسٹ کمانڈ کو اطلانٹک پیکٹ کے ساتھ منسلک کرنے کے لئے جلدی ہی معاہدہ ہو جائے گا اور افریقہ کے دفاع کے لئے آٹھ دوسری طاقتوں سے صلاح مشورہ جاری ہے۔[83] اس وقت تک امریکہ میں ایک تنظیم بنام امریکن فرینڈز آف دی مڈل ایسٹ وجود میں آ چکی تھی۔ اس تنظیم کا نصب العین یہ تھا کہ مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں کی کمیونزم کی ملحدانہ مادہ پرستی کے خلاف حمایت کی جائے گی۔

20 رجولائی کو اردن کے شاہ عبداللہ کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا جبکہ وہ نماز ادا کرنے کے لئے مسجد اقصیٰ میں جا رہا تھا۔ شاہ عبداللہ مشرق وسطیٰ میں برطانیہ کا سب سے بڑا ستون تھا جس کے منہدم ہونے سے برطانیہ کو سخت نقصان پہنچا اور امریکہ کو بہت فائدہ ہوا۔ 22 رجولائی کو امریکہ اور سعودی عرب کے درمیان ایک فوجی معاہدے پر دستخط ہوئے اور 25 رجولائی کو واشنگٹن میں اعلان کیا گیا کہ حکومت امریکہ نے پاکستان، افغانستان، سیلون، نیپال اور ہندوستان کی امداد کے لئے 80 ملین ڈالر کی منظوری دی ہے۔ 30 رجولائی کو برطانیہ کے وزیر خارجہ ہربرٹ موریسن نے پارلیمنٹ میں اعلان کیا کہ تیل کے بحران کے بارے میں حکومت ایران سے بات چیت کے لئے لارڈ پریوی سیل رچرڈ سٹوکس (Richard Stokes) کی زیر قیادت ایک برطانوی وفد تہران جائے گا۔ اس نے کہا کہ برطانیہ مشرق وسطیٰ میں شعور کی نمود کا قوی خیر مقدم کرتا ہے لیکن محب

الوطنی اور غیر ذمہ دارانہ قوم پرستی میں بڑا فرق ہے۔[84] 4راگست کو برطانیہ کا وفد تہران پہنچا تو ایران کے وزیر اعظم ڈاکٹر مصدق نے مجلس کے خفیہ اجلاس میں بتایا کہ برطانیہ کے وفد کے ساتھ بات چیت اس کے تیل کی صنعت کو قومیانے کے عزم پر اثر انداز نہیں ہوگی۔ اس نے روتے ہوئے کانپتی آواز میں مجلس کو یقین دلایا کہ ایران نے 42 سالہ تیل کی مراعات کو کلی طور پر ختم کر دیا ہے۔ ڈاکٹر مصدق دائیں بازو کے انتہا پسند قوم پرستوں کے اس الزام کا جواب دے رہا تھا کہ اس نے امریکی سفارت کار ہیری مین کی وساطت سے برطانیہ کے ساتھ سودا بازی کر لی ہے۔ 16راگست کو برطانوی وفد کے ساتھ بات چیت شروع ہوئی تو شاہ ایران نے نشری تقریر میں ایرانی عوام سے اپیل کی کہ وہ اس بات چیت کے دوران امن برقرار رکھیں۔ تیل کے تنازعہ پر شاہ ایران کا یہ پہلا بیان تھا۔[85] تاہم اس گفت وشنید کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ ایران کے بااثر مذہبی رہنما آیت اللہ ابوالقاسم کاشانی کے 12راگست کے اس انتباہ میں پنہاں تھی کہ اگر ڈاکٹر مصدق یا کوئی اور ایرانی لیڈر تیل کی صنعت کے معاملے میں برطانیہ سے سودا بازی کرے گا تو ایرانی عوام اسے موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔ کاشانی نے یہ انتباہ برطانوی وفد کے قائد رچرڈ سٹوکس سے ملاقات کے دوران دیا تھا۔

پاکستان کی برطانیہ نوازی کی وجہ سے پاک۔ بھارت جنگ کی صورتحال میں کسی اسلامی ملک نے پاکستان کی حمایت نہ کی

ایران میں ان واقعات کے دوران پاکستانی لیڈروں کی جانب سے یہ کوشش ہوتی رہی کہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جنگ کی جو صورت حال پیدا ہوگئی ہے اس میں مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک کی حکومتوں سے کم از کم اخلاقی حمایت حاصل کی جائے۔ کل ہند ریاستی مسلم لیگ کے سابق جنرل سیکرٹری محمد محمود کی تجویز یہ تھی کہ دنیا کے تمام اسلامی ممالک کے مشترکہ دفاع کے منصوبے کے امکانات پر غور کرنے کے لئے اسلامی ملکوں کے وزرائے اعظم کو کراچی آنے کی دعوت دی جائے۔ اس کی رائے یہ تھی کہ اگر مسلم ممالک کو حالات کی نزاکت سے مطلع کیا جائے تو پاکستان کے وزیر اعظم کو تعاون یا عملی حمایت کی کمی محسوس نہیں ہوگی۔[86] اس سے قبل پاکستان کے بہت سے علما ہندوستان کے خلاف جہاد کے فتوے صادر کر چکے تھے مگر مشرق وسطیٰ کے سارے

مسلم ممالک کے ارباب اقتدار اس سلسلہ میں منقار زیر پر رہے اور کسی حکومت کے ترجمان نے ہندوستان کے خلاف پاکستان کی حمایت کا اعلان نہ کیا۔ البتہ مصر کے مذہبی علما مفتی اعظم فلسطین، عظیم الگیلانی فقیہہ الشریعت بغداد اور کربلا اور نجف کے مجتہدین کی طرف سے پاکستان کی حمایت کے اعلانات پاکستانی اخبارات میں شائع ہوئے۔

مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک کی جانب سے اس سلسلے میں خاموشی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ یوں تو پاکستان کے ارباب اقتدار پان اسلام ازم، اسلامی اتحاد اور اسلامی بلاک کے بڑے زوردار نعرے لگاتے تھے مگر جب کبھی اس علاقے کے کسی مسلم ملک کا مغربی سامراج کے ساتھ قومی تضاد منظر عام پر آتا تھا تو کراچی سے کبھی سامراج کے خلاف آواز نہیں اٹھی تھی۔ 1950ء میں وزیراعظم لیاقت علی خان نے اینگلو۔مصری تنازعہ سے پاکستان کی بے تعلقی کا اظہار کیا تھا اور 1951ء میں اینگلو۔ایرانین تنازعہ میں اس نے پاکستانی عوام اور اخبارات کے بالاصرار مطالبہ کے باوجود انگریزوں کے خلاف ایرانیوں کی حمایت کا اعلان نہیں کیا تھا۔ جب لیاقت علی خان نے 15 رجولائی کو ہندوستان کے ساتھ بھرپور جنگ کے خطرے کا اعلان کیا تھا، اس وقت سارے مشرق وسطیٰ کی توجہ اینگلو۔ایرانین تنازعہ کے علاوہ اینگلو۔مصری تنازعہ کی طرف مبذول تھی۔ امریکی سفارت کار ایورل ہیری مین کے دورۂ مشرق وسطیٰ کے پروگرام میں مصر کا دورہ بھی شامل تھا۔ ان دنوں مصر کے عوامی حلقوں کی جانب سے حکومت مصر پر زبردست دباؤ ڈالا جا رہا تھا کہ وہ (1) 1936ء کے اینگلو۔مصری معاہدے کو منسوخ کر کے برطانوی افواج کو مصر کی سرزمین سے نکالے۔ (2) سویز کینال کمپنی کو قومی ملکیت میں لے۔ اور (3) وادیٔ نیل کے اتحاد کا اعلان کرے یعنی سوڈان کو مصر میں مدغم کرے۔ 30 رجولائی کو برطانیہ کے وزیر خارجہ ہربرٹ موری سن، جس نے 9 رمارچ 1951ء کو ارنسٹ بیون کی جگہ وزارت خارجہ کا قلمدان سنبھالا تھا، پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے مصری عوام کے ان مطالبات کو غیر ذمہ دارانہ اور غیر حقیقت پسندانہ قرار دیا اور یہ اعلان کیا کہ مشرق وسطیٰ اور ایشیا کے دوسرے ممالک کے دفاع کے لئے مصر میں برطانوی فوجوں کی موجودگی ضروری ہے۔

یکم اگست کو مصری کابینہ کے ایک رکن ابراہیم پاشا نے موری سن کی اس تقریر کے جواب میں اعلان کیا کہ مصر اس وقت تک مشرق وسطیٰ کی کسی دفاعی تنظیم میں شریک نہیں ہوگا جب

تک کہ وہ آزاد و خود مختار نہیں ہوگا۔ مصر پر اس کی مرضی کے خلاف جو معاہدہ ٹھونسا جائے گا وہ غیر حقیقت پسندانہ ہوگا۔ یہ امر افسوسناک ہے کہ پندرہ ماہ کی مسلسل مساعی کے باوجود برطانیہ کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ مصر کا یہ حق تسلیم نہیں کرتا کہ اس کا علاقہ مکمل طور پر آزاد ہونا چاہیے۔[87] ابراہیم پاشا کے اس بیان کی تعبیر یہ تھی کہ امریکہ کی جانب سے مصری حکومت پر کوئی زیادہ دباؤ نہیں ڈالا جا رہا تھا کہ وہ اپنی سرزمین پر برطانوی فوجوں کی موجودگی برداشت کرتی رہے مصری حکومت کا یہ رویہ نہ صرف مصری عوام کے سامراج دشمن رویہ کے مطابق تھا بلکہ اس میں امریکہ اور برطانیہ کے تضاد کی علامتیں بھی نظر آتی تھیں۔

7 راگست کو سعودی عرب کے وزیر خارجہ امیر فیصل کا دورۂ لندن بھی ان ہی حقائق کا مظہر تھا۔ امیر فیصل کو حکومت برطانیہ نے اس دورے کی دعوت دی تھی اور ہوائی اڈے پر ملک معظم جارج ششم کے بھائی ڈیوک آف گلوسٹر نے اس کا خیر مقدم کیا تھا۔ امیر فیصل نے اپنے لندن میں قیام کے دوران برطانوی حکام سے خفیہ بات چیت کی تھی اور اس بات چیت کے خاتمے پر کوئی سرکاری اعلان جاری نہیں ہوا تھا۔ 13 راگست کو اینگلو۔عراقی آئل کمپنی نے حکومت عراق سے ایک معاہدے پر دستخط کئے جس میں یہ قرار دیا گیا تھا کہ کمپنی کو عراقی تیل کے کاروبار میں جو منافع ہوگا اس کا 50 فیصدی حصہ حکومت عراق کو ملے گا۔

امریکی بحریہ کے کمانڈر کی پاکستان آمد اور مڈل ایسٹ ڈیفنس کونسل کے ذریعہ مشرق وسطیٰ میں امریکہ و برطانیہ کے اشتراک عمل کی ابتدا

16 راگست کو ایک امریکی بحری جہاز ''گرین وچ بے'' (Greenwich Bay) کراچی پہنچا۔ اس جہاز میں مشرق وسطیٰ میں امریکی بحریہ کا کمانڈر ریئر ایڈمرل ایچ۔ڈی۔فیلٹ (H.D.Felt) تھا جسے پاکستانی بحریہ کی توپوں نے سلامی دی۔ فیلٹ کی کراچی میں آمد کے موقع پر حکومت مصر نے اسرائیل کو جانے والے تیل بردار جہازوں کے نہر سویز سے گزرنے پر پابندی لگا دی ہوئی تھی اور مصری عوام کا یہ مطالبہ بہت زور پکڑ گیا تھا کہ 1936ء کا اینگلو۔مصری معاہدہ منسوخ کیا جائے۔

12 راگست کو لندن سے موصولہ ایک خبر کے مطابق وہاں کے باخبر سفارتی حلقوں کا

خیال تھا کہ ''مصر کی حکومت نے یہ سخت رویہ امریکی سفارت کار ایورل ہیری مین کے متوقع دورۂ قاہرہ کے پیش نظر اختیار کیا ہے۔ ان حلقوں کا کہنا تھا کہ ''امریکہ مشرق وسطیٰ کے دفاع کی ذمہ داری میں برطانیہ کے ساتھ شریک ہونے پر آمادہ ہو گیا ہے کیونکہ اب اسے یہ احساس ہو گیا ہے کہ نہر سویز کا علاقہ افریقہ اور ایشیا کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں سے مشرق وسطیٰ کے تیل کے ذخائر اور مشرق بعید کی طرف جانے والی شاہراہ کا بہترین تحفظ ہو سکتا ہے۔ حکومت مصر 1936ء کے اینگلو۔مصری معاہدے کو منسوخ کرنے کی جو دھمکی دے رہی ہے اس کو نہر سویز کے علاقے میں امریکہ کی دلچسپی کی روشنی میں دیکھنا چاہیے..... مشرق وسطیٰ میں امریکہ کی دلچسپی کی ایک اور علامت یہ ہے کہ واشنگٹن نے اس علاقہ کے ممالک کو 415 ملین ڈالر کی فوجی امداد اور 125 ملین ڈالر کی اقتصادی امداد دینے کا منصوبہ بنایا ہے۔ اس رقم میں سے 85 ملین ڈالر 1951ء کے میوچل سکیورٹی ایکٹ کے تحت مخصوص کئے گئے ہیں۔ مشرق وسطیٰ میں برطانیہ اور امریکہ کے درمیان تعاون کا مزید ثبوت برطانیہ کی اس تجویز میں نظر آتا ہے کہ ایک مڈل ایسٹ ڈیفنس کونسل قائم کی جائے۔ اس تنظیم کے قیام کے منصوبے کو آخری شکل آئندہ ماہ اٹاوہ میں اور اکتوبر میں روم میں اطلانتک پیکٹ کی کونسل کی میٹنگوں میں دی جائے گی۔ اس مجوزہ تنظیم میں امریکہ، برطانیہ، فرانس، جنوبی افریقہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، اور ترکی شامل ہوں گے۔ ترکی برطانیہ کو یقین دلا چکا ہے کہ وہ اس منصوبے کو منظور کر لے گا۔ ترکی نے جواباً امریکہ کی جانب سے برطانیہ کو دی اس نصیحت کی حمایت کی ہے کہ مشرق وسطیٰ کی قوم پرستی کے بارے میں زیادہ سمجھ بوجھ کا مظاہرہ کیا جائے اور مشرق وسطیٰ کے ممالک کے ''حقوق وتمنائیں'' پوری کرنے کی غرض سے مراعات دینے پر آمادہ رہا جائے۔''[88]

مذکورہ خبر سے کئی ایک باتیں واضح ہو گئی تھیں جن پر اب تک مبہم اور ذو معنی الفاظ کا پردہ ڈالا جا رہا تھا۔ اول یہ کہ برطانیہ نے بالآخر اس تلخ حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا کہ مشرق وسطیٰ پر اس کی اجارہ داری قائم نہیں رہ سکتی اور یہ کہ اس علاقے کی لوٹ کھسوٹ میں امریکہ کو شریک کرنا ہی پڑے گا۔ دوئم یہ کہ امریکہ نے پہلے مصر، ایران، اور مشرق وسطیٰ کے بعض دوسرے ممالک میں قوم پرستی کی تحریکوں کی حوصلہ افزائی کر کے اور پھر پر امن گفت وشنید کے ذریعے تنازعات کا تصفیہ کرنے کی تجویز پیش کر کے اس علاقے سے برطانیہ کی مکمل بے دخلی کے عمل کی ابتدا کر دی تھی۔

سوئم یہ کہ ترکی نے مئی 1951ء کے اواخر میں مشرق وسطیٰ میں کمیونزم کا مقابلہ کرنے کے لئے بلاک بنانے کی جو تحریک کی تھی اس کے پس پردہ کوئی اسلامی جذبہ کارفرما نہیں تھا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ برطانیہ اور امریکہ کے درمیان مشرق وسطیٰ کے بارے میں مفاہمت یا سودابازی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ اور ترکی اس سودابازی کے عمل کی تکمیل میں برطانیہ کی مدد کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ اور چہارم یہ کہ پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی نے اتحاد اسلامی کے بارے میں 7؍جولائی 1951ء کو کراچی میں جو تقریر کی تھی اس کا مطلب یہ تھا کہ امریکہ اور برطانیہ کے درمیان مشرق وسطیٰ کے بارے میں سودابازی کی جو تحریک ہوئی ہے پاکستان اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں پان اسلام ازم کے زور سے امداد کرے گا۔

لیکن جب جولائی۔ اگست 1951ء میں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جنگ کی صورتحال میں کسی مسلم ملک کی حکومت نے پاکستان کی حمایت کا اعلان نہ کیا تو پاکستان میں پان اسلام ازم یا اتحاد اسلامی کے علمبرداروں کا ''اسلامی جذبہ'' بھی خاصا ٹھنڈا پڑ گیا۔ چنانچہ جب 23؍اگست 1951ء کو کراچی میں شام کے وزیر مختار عمر بہاالامیری نے ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ ''اسلامی ملکوں کو اپنے دفاع کے لئے اپنا ایک علیحدہ بلاک بنانا چاہیے تو پاکستان کے کسی سیاسی حلقہ میں سے لبیک کی کوئی آواز نہ آئی۔ پھر 25؍اگست کو جب قاہرہ کے ایک اخبار نے یہ خبر دی کہ ''مصر اور شام میں اخوان المسلمین کی تنظیموں کا ایران کی فدائیان اسلام کی تنظیم سے ادغام کی کوشش ہو رہی ہے۔'' تو پاکستان کے کسی اسلام پسند حلقے نے اس کوشش کی کامیابی کے لئے دعا نہ کی۔ پھر جب ستمبر کے اوائل میں ایران کے مذہبی لیڈر علامہ کاشانی نے عالم اسلام کی ایک کانفرنس کی تجویز پیش کی تو پاکستان میں کسی قابل ذکر حلقے نے اس کی تائید نہ کی۔ مدیر نوائے وقت کی رائے یہ تھی کہ ''اسلامی ملکوں کی کانفرنس غیر سرکاری افراد کی بجائے کسی اسلامی حکومت کو بلانی چاہیے اور کسی ایک لیڈر کی بجائے کسی مسلمان حکومت کی طرف سے دوسری مسلمان حکومتوں کو دعوت نامے بھیجے جائیں۔ صرف اسی صورت میں مجوزہ کانفرنس نتیجہ خیز ثابت ہو سکتی ہے۔ ورنہ غیر سرکاری کانفرنس میں بعض اوقات بعض ممالک کی نمائندگی ایسے افراد سنبھال لیتے ہیں جن کی اپنے ملک میں کوئی نمائندہ حیثیت نہیں ہوتی اور وہ اپنے ملک کی طرف سے کوئی ذمہ داری قبول نہیں کر سکتے۔ یوں بھی ایسی غیر سرکاری کانفرنسوں کا نتیجہ بالعموم نشتند و گفتند و برخاستند سے زیادہ کچھ نہیں نکلتا۔''[89]

مسلم ممالک سے بھارت کے خلاف آواز نہ اٹھنے پر پاکستان میں پان اسلام ازم کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا

مدیر نوائے وقت نے اپنی سابقہ آراء کے برعکس اپنی اس نئی رائے کا اظہار اپنے 3 ستمبر 1951ء کو جاری کردہ اخبار نوائے پاکستان میں کیا تھا۔ اس کا اخبار ''جہاد'' پنجاب کی دولتانہ حکومت نے جولائی 1951ء میں ٹیکنیکل وجوہ کی بنا پر بند کر دیا تھا۔ اس کا اصل قصور یہ تھا کہ اس نے جون 1951ء میں لیاقت علی کی حکومت پر پنجابی شاونزم کی بنیاد پر بھرپور حملے شروع کر دیئے تھے۔ پان اسلام ازم کے بارے میں مدیر نوائے وقت کا جوش وجذبہ 6 ستمبر کو مزید ٹھنڈا ہو گیا جبکہ لندن سے یہ خبر آئی کہ وہاں افغانستان کے سفارت خانے نے ''یوم پختونستان'' کے سلسلے میں جو تقریب منعقد کی اس میں سعودی عرب کے سفیر شیخ حافظ واہبہ نے شرکت کی۔[90]

اس خبر کے دو چار دن بعد مدیر نوائے وقت کا پاکستان میں پان اسلام ازم کے نعرہ بازوں کو مشورہ یہ تھا کہ وہ اسلامی ممالک سے غیر مناسب توقعات وابستہ نہ کریں۔ اس کا اداریہ یہ تھا کہ ''مسلمان ملک بالخصوص مشرق وسطیٰ کے ممالک دل سے پاکستان کے ہمدرد اور دوست ہیں اور وہ پاکستان کی ہر ممکن مدد کرنا چاہتے ہیں مگر لفظ ممکن کو ذہن میں رکھیے کیونکہ اس کو بڑی اہمیت ہے۔ اب افغانستان کا قصہ تو آپ کو معلوم ہی ہے۔ ہماری اب بھی یہی تمنا اور دعا ہے کہ خدا افغانستان کے حکمرانوں کو ہدایت دے اور افغانستان اور پاکستان کے تعلقات دوستانہ اور برادرانہ ہوں مگر اس وقت بدقسمتی سے افغانستان سے خیر کی کوئی توقع نہیں۔ شر کا اندیشہ البتہ ضرور ہے۔ انڈونیشیا بہت دور ہے اور اخلاقی مدد کے سوا کوئی مدد نہیں دے سکتا۔ یوں بھی ابھی انڈونیشیا ''سیکولر یقین'' کا تجربہ کر رہا ہے۔ ترکی سے کسی فوجی اور اقتصادی مدد کی توقع عبث ہے۔ ترکی کی سیاست اب تک یہ ہے کہ مذہبی بنیاد پر کوئی اتحاد نہ ہو۔ ترکی اسرائیل کے مقابلہ پر عرب ملکوں سے متحدہ محاذ بنانے کے لئے تیار نہیں، تو وہ پاکستان کو فوجی یا اقتصادی مدد دینے پر کیوں آمادہ ہونے لگا؟ اب رہ گئے مصر اور ایران۔ وہ اس وقت اپنی اپنی مصیبت میں گرفتار ہیں لیکن اگر وہ فارغ بھی ہوں تو پاکستان کی کیا مادی مدد کر سکتے ہیں؟ خدا عرب ملکوں کی مدد کرے اور انہیں توفیق دے کہ وہ فلسطین کو پنجہ یہود سے آزاد کرا سکیں۔ ان ملکوں کی فوجی قوت کے بارے میں کوئی غلط

فہمی نہیں ہونی چاہیے۔ اقتصادی لحاظ سے بھی برطانیہ اور فرانس نے گزشتہ 25 سالوں میں عرب ممالک کی حالت اتنی خراب کر دی ہے کہ وہ خود ہر چیز کے لئے دوسروں کے محتاج ہیں۔ ان سے اقتصادی امداد کی توقع عبث ہے۔ ممکن ہے اس نقشہ سے بعض دوستوں کو دکھ ہو مگر یہ دکھ اس مایوسی سے بہتر ہے جو غلط توقعات کا لازمی نتیجہ ہوا کرتی ہے۔ تدبر کا تقاضا یہی ہے کہ غلط توقعات قائم ہی نہ کی جائیں۔"[91] پان اسلام ازم کے بارے میں مدیر نوائے وقت کی 50-1949ء کی گرمجوشی کے مقابلے میں اب ستمبر 1951ء میں اس کی یہ سرد مہری دراصل اس حقیقت کی مظہر تھی کہ پنجاب کے درمیانہ طبقہ کے بعض بر خود غلط عناصر میں حقیقت پسندی و حقیقت شناسی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ 50-1949ء میں یہ عناصر پاکستان کی زیر قیادت اسلامی ممالک کا ایک ایسا تیسرا بلاک بنانے کا خواب دیکھ رہے تھے جس کے بارے میں ان کا اعلان یہ تھا کہ دنیا کا طاقتی توازن اس بلاک کے ہاتھ میں ہوگا اور اینگلو۔ امریکی بلاک اور سوویت بلاک دونوں ہی اس اسلامی بلاک کی دوستی کے خواہاں ہوں گے۔ یہ عناصر مسلم ممالک میں ہمہ گیر صنعتی انقلاب کے بغیر ہی ان ممالک کے باہمی اشتراک و تعاون سے اسلحہ سازی کی جدید صنعت قائم کرنے کا منصوبہ بھی بناتے تھے اور یہ خواب دیکھتے تھے کہ جب پنجابی فوج مسلم ممالک میں تیار کردہ اس جدید اسلحہ سے لیس ہو جائے گی تو پھر ساری دنیا میں اسلام کا بول بالا ہو جائے گا۔ انہیں پنجاب کے "آدمیوں کے مواد کی عمدگی" پر بڑا ناز تھا۔

اگرچہ مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک کے ارباب اقتدار بھی پاکستان کے ارباب اقتدار کی طرح سامراج نواز تھے لیکن وہ اپنی رائے عامہ کے دباؤ کے تحت ظاہراً سامراج کے خلاف پالیسی اپنانے پر مجبور تھے اور اسی رائے عامہ کے دباؤ کے تحت سامراج کے طفیلی ملک پاکستان کی اعلانیہ حمایت کرنے سے گریز کرتے تھے۔ پاکستان کے بارے میں عرب عوام کا تاثر یہ تھا کہ برطانوی سامراج نے برصغیر کو تقسیم کر کے یہ ملک اسی طرح قائم کیا ہے جس طرح کہ انہوں نے فلسطین کو تقسیم کر کے اسرائیل کی مملکت قائم کی ہے۔ بدقسمتی سے گزشتہ چار سال کے عرصے میں پاکستان کے ارباب اقتدار ہر مسئلہ پر سامراج نواز پالیسی اختیار کر کے عرب عوام کے اس تاثر کو پختہ تر ہی کرتے رہے۔ 7 ر ستمبر کو عرب عوام یہ تاثر اور بھی پختہ ہو گیا جبکہ پاکستان کے وزیر خارجہ چودھری محمد ظفر اللہ خان نے سان فرانسسکو میں جاپان کے ساتھ معاہدۂ امن کے سلسلہ میں منعقدہ کانفرنس میں اپنی

لچھے دار تقریر میں پہلے تو دوسری جنگ عظیم میں پاکستانی سپاہیوں کے شاندار کارناموں کا ذکر کیا اور پھر اس نے قرآن مجید کی آیات کے حوالے دے کر ''اسلامی نقطہ نگاہ سے جاپان کے ساتھ مجوزہ معاہدۂ امن کی حمایت کی۔ حالانکہ اس میں امریکہ کو یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ جاپان میں اپنی بری، بحری اور ہوائی فوجیں رکھ سکے گا۔ یوگوسلاویہ، برما اور ہندوستان نے اس کانفرنس کا بائیکاٹ کیا تھا اور مصر کے مندوب نے امریکہ اور برطانیہ کی طرف سے تجویز کردہ اس صلح نامے کی مخالفت کی تھی۔ مصری مندوب کی رائے یہ تھی کہ اس معاہدے کی رو سے غیر ملکی فوجیں جاپان میں متعین کی جائیں گی۔ ان کی وہاں موجودگی وہاں کے عوام کی مرضی کے خلاف ہوگی۔ چونکہ مصر کی سرزمین پر غیر ملکی افواج کا قبضہ ہے اس لئے اس کے پاس یہ اعتراض کرنے کا جواز موجود ہے کہ اس صلح نامے میں جاپان کی سرزمین پر غیر ملکی افواج کا قبضہ رکھنے کی گنجائش کیوں رکھی گئی ہے۔''[92]

مڈل ایسٹرن کمانڈ کا اینگلو امریکی منصوبہ...... برطانیہ نے مشرق وسطیٰ میں امریکہ کی بالادستی قبول کرلی

12 ستمبر کو مصر کے بااثر اخبار ''الاہرام'' نے برطانیہ کو مشورہ دیا کہ وہ مصر کے ساتھ مل کر خوشی خوشی اینگلو۔مصری معاہدے پر خط تنسیخ پھیر دے ورنہ مصر یکطرفہ کارروائی کرے گا اور اس معاہدہ کو منسوخ کر دے گا۔ اخبار ''المقطم'' نے لکھا کہ مشرق وسطیٰ کے عرب اب امریکہ، برطانیہ اور فرانس کو جمہوریت نواز نہیں سمجھتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نہ صرف ان ملکوں کے ساتھ اپنے دوستانہ تعلقات پر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہیں بلکہ روس کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کی باتیں بھی سننے میں آنے لگی ہیں۔ بائیں بازو کے اخبار ''الخطیب'' نے امریکہ اور برطانیہ کی یہود نوازی کی شدید مذمت کی۔[93] مصری اخبارات نے یہ تبصرے معاہدہ اطلانتک کی کونسل کے اٹاوہ میں ہونے والے اجلاس کو پیش نظر رکھ کر کئے تھے۔ نیویارک سے اطلاع یہ تھی کہ ''اس اجلاس میں ترکی اور یونان کے معاہدۂ اطلانتک میں شمولیت کا فیصلہ ہونے کے بعد مڈل ایسٹرن کمانڈ کا منصوبہ زیر غور آئے گا۔ اگر اس منصوبے پر بحث میں یہ طے ہوا کہ اس کمانڈ کا سربراہ کوئی امریکی یا برطانوی فوجی افسر ہوگا تو فرانس کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ فرانس کو مشرق وسطیٰ کے دفاعی انتظامات میں بہت دلچسپی ہے۔''[94] پاکستانی اخبارات میں یہ خبر 11 ستمبر 1951ء کو چھپی تو اس سے اگلے دن

کراچی سے یہ خبر جاری ہوئی کہ ''دمشق میں 3 نومبر 1951ء کو انٹرنیشنل اسلامک اکنامک کانفرنس کا جو اجلاس ہو رہا ہے اس میں مسلم ممالک کی عمومی ترقی کے لئے ایک ایسا اقتصادی ترقیاتی منصوبہ تیار کیا جائے گا جو ہر لحاظ سے مکمل ہوگا۔ دمشق کی اس کانفرنس کو شام کی اس تحریک کے پیش نظر بہت اہمیت دی جا رہی ہے کہ سارے مسلم ممالک کو دفاعی معاہدہ کرنا چاہیے۔ معاشی روابط سے دنیا کے مسلم ممالک کے درمیان قریبی تعاون کی ضرورت پوری ہو جائے گی۔''[95] کراچی کی اس خبر کی تعبیر یہ تھی کہ پاکستان کے ارباب اقتدار مڈل ایسٹرن کمانڈ کے اینگلو۔ امریکی منصوبے کی تکمیل میں مدد دینے پر آمادہ تھے حالانکہ مصر اور عالم عرب کے دوسرے ممالک کے لئے یہ منصوبہ قابل قبول نہیں تھا۔ کراچی کے جن سیاسی حلقوں نے یہ خبر جاری کروائی تھی بظاہر اس وقت انہیں معلوم نہیں تھا کہ مشرق وسطیٰ کے دفاع کے اس منصوبے میں پاکستان کو شامل کرنے کی تجویز نہیں تھی۔

ستمبر 1951ء کے تیسرے ہفتے میں اٹاوہ میں معاہدہ اطلانٹک کے رکن ممالک کے وزرائے خارجہ کی کانفرنس شروع ہوئی تو حکومت برطانیہ نے اسرائیل میں برطانوی سفیر سر ناکس ہیلم (Knox Helm) کو ترکی میں اپنا سفیر مقرر کر دیا۔ کراچی کے روزنامہ ڈان کی لندن سے رپورٹ یہ تھی کہ مشرق وسطیٰ میں برطانوی سفیر کے اس تبادلے کو بہت اہمیت دی جا رہی ہے اور اس کی تعبیر یہ ہے کہ مشرق وسطیٰ میں برطانیہ کی پرانی پالیسی کا دور ختم ہو گیا ہے۔ اب برطانیہ کی پالیسی کا انحصار مشرق وسطیٰ میں نئے دوستوں کے ساتھ اتحاد پر ہوگا۔ جنگ عظیم کے دوران جب قاہرہ میں برطانیہ کا دفتر مشرق وسطیٰ قائم ہوا تھا، اس وقت سے برطانیہ کی پالیسی یہ رہی تھی کہ عرب لیگ کے ''منتخب نمائندوں'' کے ذریعے عالم عرب کو متحد کیا جائے۔ لیکن اب عرب لیگ کو چھوڑ دیا گیا ہے اور برطانیہ کی پالیسی کی تعمیر ترکی، اسرائیل اور اردن کے اتحاد کی بنیاد پر کی جا رہی ہے۔ ترکی کو مشرق وسطیٰ کے فوجی نظام میں بھاری حصہ دینے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اس وعدے میں سپریم لینڈ کمانڈر کی نامزدگی بھی شامل ہے۔ مشرق وسطیٰ میں امریکی اثر و رسوخ میں اضافہ ہونے کے باعث انقرہ مشرق وسطیٰ کے دفاعی نظام پر زیادہ بھروسہ کرنے لگا ہے۔ اردن کا شاہ عبداللہ اپنے قتل سے پہلے انقرہ گیا تھا۔ اس کے اس دورے کا مقصد اس اسکیم کے لئے حمایت حاصل کرنا تھا کہ شام کی خستہ حال جمہوریہ کو اردن میں مدغم کر کے اس کی سلطنت کی سرحدیں ترکی کے ساتھ ملا دی جائیں۔''[96] اس رپورٹ کا مطلب یہ تھا کہ برطانیہ نے مشرق وسطیٰ میں امریکہ کے سامنے

گھٹنے ٹیک دیئے تھے۔ اردن کا شاہ عبداللہ مشرق وسطیٰ میں برطانیہ کا آخری سہارا تھا۔ اس سہارے کے غائب ہو جانے کے بعد برطانیہ کو مشرق وسطیٰ میں اپنی کسی سکیم کی کامیابی کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔ اس لئے اب اس کی پالیسی یہ تھی کہ آئندہ وہ مشرق وسطیٰ میں امریکہ کے رقیب کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس کے معاون کی حیثیت سے کارفرما ہوگا۔ تاہم اس کی کوشش یہ تھی کہ ترکی اطلانتک پیکٹ سے باہر رہے اور برطانیہ کی اعلیٰ کمان کے ماتحت مشرق وسطیٰ کی دفاعی تنظیم کا سربراہ بنے۔ مگر ترکی کو یہ پوزیشن قبول نہیں تھی اور وہ اطلانتک پیکٹ میں شمولیت پر مصر رہا چنانچہ بالآخر 20 ستمبر 1951ء کو اٹاوہ میں اطلانتک کانفرنس ختم ہوئی تو یہ اعلان ہوا کہ وزرائے خارجہ نے ترکی اور یونان کی اس معاہدہ میں شمولیت کی منظوری دے دی ہے اور اب اس معاہدہ کے رکن ممالک اپنے آئندہ اجلاس میں مڈل ایسٹرن کمانڈ کی تشکیل کے منصوبہ پر غور کریں گے۔ یہ اجلاس نومبر 1951ء میں روم میں ہوگا۔ اس منصوبے کی تفصیل یہ تھی کہ اینگلو۔امریکی بلاک مشرق وسطیٰ میں ایک فوجی تنظیم قائم کرے گا جس میں ترکی، مصر، عراق، شام، سعودی عرب، اردن، لبنان اور اسرائیل شامل ہوں گے۔ اس تنظیم کی اعلیٰ کمان کسی برطانوی جرنیل کے ہاتھ میں ہوگی اور اس کا نائب اعلیٰ ایک ترک جرنیل ہوگا۔ اس تنظیم میں ترکی کے علاوہ ان سب ملکوں کی فوجیں شامل کی جائیں گی اور روس سے عالمگیر جنگ کی صورت میں یہ فوجی تنظیم مشرق وسطیٰ کے دفاع کی ذمہ دار ہوگی۔ یعنی ہتھیار اور روپیہ امریکہ دے گا۔ کمانڈر انچیف برطانیہ سے آئے گا۔ سپاہی مشرق وسطیٰ کے ان ملکوں سے ہوں گے اور ترکی اس منصوبہ میں نمایاں حصہ لے گا۔[97] رائٹر کی اطلاع یہ تھی کہ اس مجوزہ معاہدے سے عربوں اور اسرائیل کے بہت سے مسائل بھی حل ہو جائیں گے۔ مغربی حکومتیں عربوں اور اسرائیل کی مشترک سرحدوں کی گارنٹی دیں گے جس کی وجہ سے مشرق وسطیٰ میں پوری طرح امن قائم رہ سکے گا۔[98]

عرب لیگ کا فیصلہ کہ کوئی عرب ملک مڈل ایسٹرن کمانڈ میں شامل نہیں ہوگا۔

پاکستان کی اپیل کہ عرب اور غیر عرب ملکوں کا اتحاد ہونا چاہیے،

ستمبر کے اواخر میں عرب لیگ کونسل نے اس مجوزہ منصوبہ پر غور کیا اور یہ فیصلہ کیا کہ عرب ممالک اس میں شامل نہیں ہوں گے اور اگر اینگلو۔امریکی بلاک اور سوویت بلاک کے

درمیان جنگ ہوئی تو عرب ممالک غیر جانبدار رہیں گے۔ اس فیصلے کی ایک وجہ یہ تھی کہ مصر کے ارباب اقتدار اپنی سرزمین سے برطانوی افواج کے انخلا سے پہلے مشرق وسطیٰ کے کسی فوجی نظام میں شامل نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ مصری رائے عامہ کے غیض وغضب سے بہت ڈرتے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اسرائیل اور عرب ممالک کا کسی معاملہ میں اشتراک خارج از تصور تھا۔ کسی عرب ملک کا کوئی حکمران اسرائیل کے وجود کو تسلیم کر کے زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ تاہم جب عرب لیگ کا یہ اجلاس جاری تھا تو قاہرہ میں پاکستانی سفارت خانہ کی طرف سے ایک بیان جاری کیا گیا جس میں دنیائے عرب سے اپیل کی گئی تھی کہ ''انہیں معمولی اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر اپنے مطمع نظر کو وسیع تر کرنا چاہیے اور ان غیر عرب ممالک کو اپنے مذاکرات میں شامل کرنا چاہیے جن کے عرب ممالک کے ساتھ نہ ٹوٹنے والے روحانی تعلقات ہیں۔ یہ ممالک عربوں کی جدوجہد میں کافی مدد دے سکتے ہیں۔ یہ ممالک شروع ہی سے عربوں کے عزائم کے مخلص حامی رہے ہیں۔ ہم تو یہاں تک کہنے کو تیار ہیں کہ تمام اسلامی ممالک کے سامنے، جن میں عرب بھی شامل ہیں، دو ہی راستے ہیں۔ یا تو وہ الگ الگ رہ کر اپنی تکالیف کے متعلق سینہ کوبی کرتے رہیں یا آپس میں اتحاد کا رشتہ استوار کریں۔ اپنی کوئی طاقت نہ بنائیں۔ ایسے ہمدردی کے ذرائع کا تجزیہ اور ان کے استعمال سے بھی انکار کریں جو ان کے پاس موجود ہیں اور غیر ملکی طاقتوں کے سامنے جھکے رہیں اور مصائب سہیں اور بالآخر پورے بلاک کے مفاد کے لئے جنگوں کی آماجگاہ بن جائیں یا پھر آپس میں متحد ہو کر مدافعت کی مؤثر طاقت پیدا کریں تا کہ زمانۂ امن میں دوسرے ممالک انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھیں اور اگر جنگ شروع ہو جائے تو وہ اپنی مرضی کے مطابق اس سے الگ رہ سکیں اور اگر اس دوسری تجویز پر اتفاق ہو تو پھر اسے جامہ عمل پہنانے کے لئے فوری اقدامات کئے جائیں کیونکہ جدید دنیا بڑی تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی ہے اور وقت کا مسئلہ بہت اہمیت اختیار کر چکا ہے۔ انہیں اپنے باہمی مسائل کے لئے مشترکہ طور پر بات چیت کرنی ہوگی۔ اس کے علاوہ موجودہ ذرائع رسل و رسائل کو بہتر بنانا ہوگا اور موجودہ قوانین کو نرم کرنا ہوگا جن کے تحت ایک اسلامی ملک کے باشندوں کو دوسرے اسلامی ملک میں بالکل اجنبی اور غیر تصور کیا جاتا ہے۔''[99] لیکن حکومت پاکستان کی اس سرکاری اپیل کا شام کے سوا عرب لیگ کے دوسرے رکن ممالک پر کوئی اثر نہ ہوا۔ شام کے وزیر خارجہ سید فیضی المطالی نے 2 اکتوبر کو دمشق میں ایران اور

پاکستان کے سفیروں سے اس تجویز پر تبادلہ خیالات کیا کہ عرب لیگ میں عرب ممالک کے علاوہ دوسرے اسلامی ممالک کو بھی شامل کیا جائے۔ مگر اس بات چیت کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہوا کیونکہ دوسرے عرب ممالک عرب لیگ کے منشور میں کوئی ترمیم کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔

عرب ممالک پاکستان کی جانب سے اس قسم کی اپیلوں، تحریکوں اور تجویزوں کو قابل توجہ اس لئے نہیں سمجھتے تھے کہ گزشتہ چار سال کے تجربہ نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ کراچی سے پان اسلام ازم یا اتحاد اسلامی یا اسلامی فیڈریشن یا اسلامی بلاک یا اسلامستان کی جو آواز اٹھتی تھی اس کے پیچھے برطانوی سامراج کا ہاتھ کارفرما ہوتا تھا۔ پاکستان میں پان اسلام ازم کا تازہ نعرہ جون 1951ء میں لگایا گیا تھا جبکہ ترکی نے برطانیہ کی تحریک پر مشرق وسطیٰ کے بلاک میں دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ جب ستمبر 1951ء میں معاہدہ اطلانٹک کے رکن ممالک نے برطانیہ کے اس منصوبے کو بالائے طاق رکھ کر امریکہ کے مڈل ایسٹرن کمانڈ کا منصوبہ اپنا لیا تو پہلے تو کراچی میں یہ توقع ظاہر کی گئی کہ نومبر میں دمشق میں جو تیسری انٹرنیشنل اسلامک اکنامک کانفرنس ہو رہی ہے۔ اس کے نتیجے میں اسلامی بلاک وجود میں آ جائے گا اور پھر ستمبر کے اواخر میں قاہرہ میں پاکستانی سفارت خانے نے یہ اپیل جاری کی کہ عرب لیگ میں دوسرے اسلامی ممالک کو بھی شامل کیا جائے اور اس طرح عالمگیر اتحاد اسلامی کا بندوبست کیا جائے۔ یہ اپیل اس حقیقت کے باوجود کی گئی تھی کہ عرب ممالک کا اسرائیل سے تضاد لاینحل تھا جبکہ ترکی، ایران اور انڈونیشیا یہودیوں کی اس مملکت کو تسلیم کر چکے ہوئے تھے۔ اس اپیل میں اس حقیقت کو بھی نظرانداز کیا گیا تھا کہ 1950ء میں پاکستان کے وزیراعظم لیاقت علی خان نے اینگلو۔مصری تنازعہ سے بے تعلقی کا اظہار کیا تھا اور مصری عوام نے اس کی اس سامراج نوازی کو فراموش نہیں کیا تھا۔

مصر کی طرف سے اینگلو۔مصری معاہدہ کی تنسیخ، کا باضابطہ اعلان

8/اکتوبر 1951ء کو اتحاد اسلامی کے بارے میں حکومت پاکستان کی یہ اپیل مصری عوام کی نظر میں پھر کھوکھلی ثابت ہوئی جبکہ مصر کے وزیراعظم نحاس پاشا نے رسمی طور پر یہ اعلان کیا کہ ''حکومت مصر نے برطانیہ کے ساتھ اپنی گفت وشنید منقطع کر دی ہے۔'' اور پاکستان کے ارباب اقتدار نے اس اعلان کی حمایت میں کوئی بیان جاری نہ کیا۔ نحاس پاشا کا مزید اعلان یہ تھا

کہ 1936ء کے معاہدہ اور 1899ء کے معاہدۂ سوڈان کی تنسیخ کا وقت آ گیا ہے۔ اس نے اس سلسلے میں پارلیمنٹ کے سامنے 1936ء کے معاہدے کو منسوخ کرنے کے سرکاری اعلان کا ایک مسودہ پیش کیا۔ اس اعلان میں یہ کہا گیا تھا کہ ''نہر سویز کے علاقے میں برطانوی افواج کو جو سہولتیں حاصل ہیں انہیں ختم کیا جاتا ہے اور شاہ فاروق کو والئی مصر و سوڈان قرار دیا جاتا ہے۔'' لیکن حکومت برطانیہ نے اس اعلان کو تسلیم نہ کیا۔ قاہرہ میں برطانوی سفارت خانے نے یہ اعلان کیا کہ ''مصر نے اینگلو۔مصری معاہدے کی یکطرفہ تنسیخ کی جو کاروائی کی ہے وہ غیر قانونی ہے۔ اس سے نہر سویز کے علاقے میں برطانوی فوجوں کی موجودگی میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔''[100] 9؍اکتوبر کو برطانیہ کی کنزرویٹو پارٹی کے لیڈر ونسٹن چرچل نے اپنی ایک انتخابی تقریر میں مصری حکومت کی اس کاروائی کو ایک کاری ضرب قرار دیتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی یہ ضرب آبادان کی ضرب سے مہلک ہے۔ تاہم 10؍اکتوبر کو مصری سینیٹ کے مقرر کردہ کمیشن نے اینگلو۔مصری معاہدہ کی تنسیخ کے بل کا مسودہ بغیر کسی ترمیم کے منظور کرلیا۔ یہ کمیشن اس مسودہ پر غور کرنے کے لئے دو دن قبل مقرر کیا گیا تھا۔ اینگلو۔مصری معاہدے کی اس تنسیخ کا سب سے زیادہ نمایاں ردعمل فرانس میں ہوا اور یہ خدشہ ظاہر کیا گیا کہ مصریوں کے اس فیصلے کا شمالی افریقہ میں فرانس کی مقبوضات پر اثر پڑے گا۔ دائیں بازو کے ریڈیکل اخبار ''یورپ'' نے لکھا کہ ہم جانتے ہیں کہ کل ہماری باری آئے گی۔ نحاس پاشا کے ایما پر عرب لیگ مراکش کی آزادی کے مسئلہ کو اقوام متحدہ میں پیش کر رہی ہے اور ہمیں اس بات کے متعلق کسی غلط فہمی میں نہیں رہنا چاہیے کہ چند ہفتوں بعد تیونس کی آزادی کا مسئلہ بھی اقوام متحدہ میں پیش کر دیا جائے گا۔ اگر فرانس نے اس موقع پر ہتھیار ڈال دیئے تو الجیریا بھی اس کی لپیٹ میں آ جائے گا اور بہت جلد سارا شمالی افریقہ تخریب پسندوں کے ہاتھ میں آجائے گا۔ جو شمالی افریقہ میں اشتراکیت کے لئے راستہ ہموار کررہے ہیں۔''[101]

12؍اکتوبر کو شاہ فاروق نے اینگلو۔مصری معاہدے کی تنسیخ کے بارے میں مسودۂ قانون کی منظوری دے دی۔ اسی دن قاہرہ کے عوام نے ترکی کے سفارت خانے کے سامنے پرتشدد مظاہرہ کیا کیونکہ وہ ترکی کو مغربی سامراج کا پٹھو اور عرب عوام کا دشمن تصور کرتے تھے۔ 14؍اکتوبر کو مصر کے وزیر خارجہ ڈاکٹر محمد صلاح الدین پاشا نے برطانوی سفیر کو مطلع کیا کہ جب

تک نہر سویز کے علاقے میں برطانوی افواج موجود رہیں گی مصر مشرق وسطیٰ کے مجوزہ دفاعی منصوبہ میں شامل نہیں ہوگا۔ ڈاکٹر صلاح الدین نے اس مضمون کا بیان 10راکتوبر 1951ء کو ایک امریکی جریدے ''یو ایس نیوز اینڈ ورلڈ رپورٹ'' کو بھی دیا تھا۔ اس جریدے کے نامہ نگار سے انٹرویو کے دوران اس نے کہا تھا کہ اگر برطانیہ نہر سویز اور سوڈان سے نکل جائے تو مصر مشرق وسطیٰ کی معاہداتی تنظیم میں شمولیت کے مسئلہ پر غور کرے گا۔''[102] ڈاکٹر صلاح الدین کے ان بیانات کا مطلب یہ تھا کہ حکومت مصر کو اینگلو۔امریکی بلاک کے ساتھ مل کر سوویت مخالف فوجی بلاک بنانے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ چاہتی صرف یہ تھی کہ مصر سے برطانوی فوجوں کے انخلا اور مصر و سوڈان کے اتحاد سے مصری عوام کے جذبہ قوم پرستی کی تسکین ہو جائے۔ مصری عوام کی اس تسکین کے بغیر مصر کا کوئی حکمران اپنے ملک کو اینگلو۔امریکی بلاک کے ساتھ وابستہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ بالخصوص ایسی صورتحال میں کہ حکومت امریکہ برطانیہ کے خلاف مصری عوام کی قوم پرستی کی تحریک کی پس پردہ حوصلہ افزائی کرتی تھی۔ 13راکتوبر 1951ء کو فرانس، ترکی، برطانیہ اور امریکہ نے مصر کو الائیڈ مڈل ایسٹ ڈیفنس کمانڈ کا منصوبہ پیش کیا۔ اس منصوبے میں یہ بتایا گیا تھا کہ برطانیہ کے نہر سویز کے علاقے میں جو فوجی اڈے ہیں وہ اس نئی فوجی تنظیم کو منتقل ہو جائیں گے۔ اس سلسلہ میں جو نیا معاہدہ ہوگا وہ 1936ء کے اینگلو۔مصری معاہدے کی جگہ لے لے گا اور جو برطانوی فوجیں مصر اور چار طاقتوں کے سمجھوتے سے مجوزہ کمانڈ کے حوالے نہیں ہوں گی وہ مصر سے نکال لی جائیں گی۔[103] حکومت مصر نے فوری طور پر اس تجویز کا جواب اس طرح دیا کہ 15راکتوبر کو مصر کے نمائندوں کے دونوں ایوانوں نے 1936ء کے اینگلو۔مصری معاہدے کی تنسیخ کے بل کی متفقہ طور پر منظوری دے دی اور اس طرح حکومت مصر نے برطانیہ کے خلاف ایسی ہی کارروائی مکمل کر دی جیسی کہ مئی 1951ء میں حکومت ایران نے کی تھی۔

برطانیہ نواز لیاقت علی، امریکہ۔برطانیہ تضاد میں مارا گیا

تاہم حکومت پاکستان کی طرف سے سرکاری طور پر اس کارروائی کی تائید و حمایت میں کوئی اعلان نہ کیا حالانکہ عوام نے اور بعض غیر سرکاری تنظیموں نے مصریوں کی قوم پرستی کی پرجوش حمایت کی اور انہیں برطانوی سامراج کے خلاف اس کارروائی پر مبارکباد دی تھی۔ شاید وزیر اعظم

لیاقت علی خان 16 / اکتوبر 1951ء کو راولپنڈی کے جلسہ عام میں اس مسئلہ پر کوئی اچھا یا برا تبصرہ کرتا لیکن ایک قاتل کی گولیوں نے اس کے دل کی بات دل ہی میں رہنے دی۔ شاید یہ محض اتفاق ہی تھا کہ لیاقت علی خان کا قاتل بھی مصر اور ایران کے برطانیہ نواز وزرائے اعظم نقراشی پاشا اور رزم آرا کے قاتلوں کی طرح مذہبی جنون میں مبتلا تھا۔ لیکن تاریخ کا کوئی طالب علم اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرسکتا کہ لیاقت علی خان کے قتل کے بعد ہی پاکستان میں امریکیوں کی بالادستی کی صحیح معنوں میں ابتدا ہوئی تھی۔ پاکستان کی بری فوج کا کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خان اس قتل سے دو ماہ قبل اگست 1951ء میں فیصلہ کر چکا تھا کہ "ہمارا ایک مضبوط اور قابل اعتماد دوست ہونا چاہیے۔"[104]

باب:12

اسلامی اتحاد کی آڑ میں سامراجی عزائم کی تکمیل کے لئے پاکستان کے کردار کا اجمالی جائزہ

(1947-51ء)

امریکہ کی جانب پاکستان کا جھکاؤ دراصل مئی 1950ء میں لیاقت علی خان کے دورہ امریکہ کے دوران ہی شروع ہو گیا تھا۔ لیکن کوریا کی جنگ کے باعث گزشتہ ڈیڑھ سال میں اس ملک پر امریکہ کی گرفت کی رفتار سست رہی تھی۔ ستمبر 1951ء میں وزیر خارجہ ظفر اللہ خان نے سان فرانسسکو کانفرنس میں امریکہ کے مجوزہ صلح نامہ جاپان کی پرزور حمایت کر کے اس رفتار کو کچھ تیز کیا تھا۔ اس رفتار کو تیز کرنے کے لئے پاکستان کے محکمہ خارجہ کا سیکرٹری محمد اکرام اللہ اکتوبر میں امریکہ گیا تھا۔ جب 16/اکتوبر 1951ء کو لیاقت علی خان کا قتل ہوا تھا، اس وقت وہ امریکہ میں ہی تھا۔ ''ایک مضبوط اور قابل اعتماد دوست'' کی تلاش میں حکومت پاکستان کے اس چار سالہ دور میں بظاہر ''پان اسلام ازم'' کی بنیاد پر وضع کردہ خارجہ پالیسی کی اس دستاویزی داستان پر نظر ڈالی جائے تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ اس خارجہ پالیسی کی بنیاد دراصل ''اسلام دوستی'' پر نہیں تھی بلکہ سوویت دشمنی پر تھی حالانکہ پاکستانی عوام ہندوستانی توسیع پسندوں کے علاوہ برطانوی سامراج کو اپنا قومی دشمن تصور کرتے تھے۔ اور انہیں سوویت یونین سے کوئی عناد نہیں تھا۔ پاکستان کے ارباب اقتدار کی سوویت دشمنی کی انتہا یہ تھی کہ بابائے قوم قائداعظم جناح کا قیام پاکستان سے چند ماہ قبل غیر مشروط اعلان یہ تھا کہ پاکستان بیرونی جارحیت کے خلاف ہندوستان کے ساتھ دفاعی

معاہدہ کرنے پر آمادہ ہوگا اور پھر پاکستان قائم ہونے کے دو ایک ماہ بعد انہوں نے امید ظاہر کی تھی کہ امریکہ سوویت یونین کے خلاف پاکستان کی مالی و فوجی امداد کرے گا۔ پھر جب اکتوبر 1947ء میں برطانوی سامراج اور ہندوستانی توسیع پسندوں کی ملی بھگت سے اور مسلم لیگ کی ریاستی امور کے بارے میں غلط پالیسی کی بنا پر ریاست جموں وکشمیر کا تنازعہ کھڑا ہو گیا اور ہندوستانی ارباب اقتدار نے کئی دوسرے معاندانہ اقدامات سے یہ واضح کر دیا کہ انہوں نے برصغیر کی تقسیم کے فیصلے کو تسلیم نہیں کیا اور وہ پاکستان کا ایام طفلی ہی میں گلا گھونٹنے کے درپے ہیں تو اس کے باوجود بھی پاکستان کے ارباب اقتدار کی نظر میں پاکستان کا قومی دشمن نمبر ایک سوویت یونین ہی رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ 1947ء میں پاکستان کی آزادی بالکل موہوم تھی۔ برطانوی سامراج کا اس ملک کی سیاست، انتظامیہ، افواج، معیشت، معاشرت اور ثقافت پر پوری طرح غلبہ تھا اور اس کی داخلہ اور خارجہ پالیسی کا تعین لندن میں ہوتا تھا جبکہ پاکستانی عوام یہ سمجھتے تھے کہ انہوں نے کلکتہ، مشرقی پنجاب، دہلی اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے بے شمار جانی و مالی قربانیاں دے کر انگریز سامراجیوں اور ہندو سرمایہ داروں کے غلبہ سے بیک وقت آزادی حاصل کی ہے اور پنجاب کے درمیانہ طبقہ کے بعض برخود غلط عناصر یہ خواب دیکھ رہے تھے کہ پاکستان کے قیام سے پوری دنیا میں اسلام کی سربلندی کے دور کی ابتدا ہوئی ہے۔ عنقریب پاکستان کی زیر قیادت مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک ایک عظیم الشان اسلامی سلطنت وجود میں آجائے گی۔

12 / مارچ 1947ء کو امریکہ کے صدر ٹرومین کی جانب سے سوویت یونین کے خلاف سرد جنگ کے اعلان کے بعد ساری دنیا عملاً دو دھڑوں میں تقسیم ہو گئی تھی اس لئے پاکستان کے مغرب نواز ارباب اقتدار کی خارجہ پالیسی کا اینگلو۔ امریکی بلاک کی عالمی پالیسی سے مطابقت رکھنا ضروری تھا۔ نومبر 1947ء میں اقوام متحدہ میں پاکستانی مندوب سر ظفر اللہ خان نے جب فلسطین کی تقسیم کی مخالفت کی تھی تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ پاکستان کی خارجہ پالیسی آزاد تھی اور اس نے جذبہ اسلامی کے تحت فلسطینی عربوں کے موقف کی حمایت کی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس تجویز کے بارے میں برطانیہ کی پالیسی غیر واضح تھی۔ چنانچہ جب اس تجویز پر رائے شماری ہوئی تھی تو امریکی دباؤ کے باوجود برطانیہ نے اس میں حصہ نہیں لیا تھا۔ ذاتی طور پر ظفر اللہ خان کو فلسطین کی تقسیم کی تجویز پر جو سب سے بڑی پریشانی لاحق تھی وہ یہ تھی کہ صدر ٹرومین نے امریکی یہودیوں کو

خوش کرنے کے لئے جب اس تجویز کی حمایت کرنے کا فیصلہ کیا تھا تو اس نے اس واضح حقیقت کو نظرانداز کر دیا تھا کہ روس اور اس کے ہم خیال ممالک بھی تقسیم کی تائید میں ہیں اور اس موقف سے ان کی واحد غرض یہ ہے کہ تقسیم کی تجویز منظور ہو جائے تا کہ عرب ریاستوں کے ساتھ امریکہ کے تعلقات الجھ جائیں۔[1] بظاہر برطانیہ کا بھی یہی خیال تھا، تاہم اسے امید تھی کہ اس تجویز کی منظوری سے عالم عرب میں اینگلو۔امریکی بلاک کے خلاف جو برہمی پیدا ہو گی اس میں اسلامی مملکت پاکستان کی وساطت سے کمی کی جا سکے گی۔ چنانچہ ظفراللہ خان نے پہلے تو اقوام متحدہ میں اس تجویز پر بحث کے آخری مرحلے میں فلسطین کی تقسیم کو اس طرح اصولی طور پر تسلیم کر لیا کہ اس نے اس تجویز میں ترمیمیں پیش کرنا شروع کر دیں۔ اس کی یہ روش عرب مندوبین کو ناگوار گزری تو اس نے فلسطینی وفد کے سربراہ جمال الحسینی کے اصرار پر ترمیمیں پیش کرنے کا سلسلہ بند کیا۔ جمال الحسینی کی دلیل یہ تھی کہ ''اگر تقسیم ہمارے حقوق کو واضح طور پر غصب کرنے والی نہ ہوئی تو ہمارے لوگ اس کے خلاف جنگ کرنے پر آمادہ نہیں ہوں گے اور ہمیں سخت نقصان پہنچے گا۔ تم مہربانی کرو اور کوئی ترمیم پیش نہ کرو۔''[2] 29/نومبر 1947ء کو اقوام متحدہ میں یہ تجویز دو تہائی اکثریت سے منظور ہو گئی تو ظفراللہ خان شام کے مندوب فارس فوزی کے مشورے کے مطابق دمشق پہنچا اور وہاں اس نے عرب حکومتوں کے وزرائے خارجہ کو مشورہ دیا کہ اسرائیل سے جنگ نہ کی جائے۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ اس سوال پر غور کرتے ہوئے ''یہ امر ضرور ذہن میں رکھیں کہ اسرائیل کے لئے سمندر کھلا ہو گا، امریکہ کے یہودی طبقہ کی طرف سے، جو مالدار ہے، اسرائیل کو ہر قسم کی مدد پہنچنے کی توقع ہو سکتی ہے اور اسرائیل کی جنگی تیاری اور تربیت آپ کے اندازے سے کہیں بڑھ کر ہے۔''[3] بالفاظ دیگر ظفراللہ خان کا وکیلانہ انداز میں مشورہ یہ تھا کہ اب اسرائیل کے وجود کو تسلیم کر لو اور آرام سے گھر بیٹھو۔

عالم عرب کے قلب میں صیہونیت کا چھرا گھونپنے کی اس واردات کے باوجود پاکستان کے ارباب اقتدار کی اینگلو۔امریکی بلاک سے وفاداری میں کوئی فرق نہ آیا۔ دسمبر 1947ء میں وفاداری کا یہ رشتہ مزید پختہ ہو گیا جبکہ ظفراللہ خان کو پاکستان کی وزارت خارجہ کے عہدے پر فائز کر دیا گیا اور اس کے بعد حکومت پاکستان کی جانب سے اینگلو۔امریکی بلاک کے ساتھ وفاداری اور سوویت یونین کے ساتھ دشمنی کے جو مظاہرے ہوئے ان کا خلاصہ یہ ہے:

1۔ ماسکو میں کوئی پاکستانی سفیر مقرر نہ کیا گیا اور وہاں پاکستان کے مفادات کی نگرانی کا کام برطانوی سفیر کے سپرد رہا۔ غیر مشروط حمایت کا اعلان کر دیا کیونکہ اس کی رائے یہ تھی کہ شمالی کوریا نے جارحیت کا ارتکاب کیا ہے۔

2۔ 28 فروری 1948ء کو وزیر خزانہ غلام محمد نے پارلیمنٹ میں پاکستان کا پہلا مکمل بجٹ پیش کرتے ہوئے جو تقریر کی اس کا مطلب یہ تھا کہ پاکستان کی شمال مغربی سرحدوں کو روس کی جانب سے خطرہ لاحق ہے۔ لہٰذا امریکہ اور برطانیہ کو پاکستان کی مالی و فوجی امداد کرنی چاہیے اس تقریر میں ہندوستان کے ساتھ کشمیر کی جنگ اور فلسطین کے معاملہ پر اسرائیل اور عربوں کی جنگ کا کوئی ذکر نہیں تھا۔

3۔ مارچ 1948ء کے دوسرے ہفتے میں قائد اعظم محمد علی جناح نے سوئٹزرلینڈ کے اخبار کو انٹرویو دیا جس کا مطلب بھی وہی تھا جو غلام محمد کی تقریر کا تھا۔ یعنی یہ کہ برصغیر کی سرحدوں کو روس کی جارحیت کا خطرہ درپیش ہے۔ پاکستان اور ہندوستان کو اس مقابلہ کرنے کے لئے اشتراک عمل کرنا چاہیے۔ لیکن اس اشتراک عمل کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ پہلے اپنے باہمی اختلافات دور کریں۔

4۔ اکتوبر 1948ء میں برطانوی دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس ہوئی تو وزیر اعظم لیاقت علی خان نے پہلے تو ایک انٹرویو میں روس پر توسیع پسندی اور بدامنی پھیلانے کا الزام لگایا اور پھر اس نے کانفرنس کے اس فیصلے سے اتفاق کیا کہ پاکستان، ہندوستان، سیلون اور برطانیہ کے اشتراک عمل سے کمیونسٹوں کے خلاف برما اور مشرق بعید کے دوسرے ملکوں کی حکومتوں کی امداد کی جائے گی۔ جب لیاقت علی خان نے پاکستان کو اس گٹھ جوڑ میں شریک کیا تھا، اس وقت کشمیر میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ جاری تھی اور تقریباً ایک ماہ قبل ہندوستان فوجی کاروائی کر کے ریاست حیدر آباد (دکن) پر قبضہ کر چکا تھا۔

5۔ یکم جنوری 1949ء کو وزیر اعظم لیاقت علی خان نے کشمیر میں جنگ بندی کا اعلان کر دیا۔ اس نے یہ فیصلہ انگریزوں کے اس خدشہ کے پیش نظر کیا تھا کہ اگر کشمیر کی لڑائی جاری رہی تو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان بھرپور جنگ شروع ہو جائے گی۔

پاکستان کے عوامی حلقوں میں لیاقت کے اس فیصلے پر بہت سخت مخالفانہ ردعمل ہوا تھا اور پاکستانی فوج کے ارکان ششدر رہ گئے تھے۔

6۔ مارچ 1949ء میں وزیراعظم لیاقت علی خان اور وزیر خارجہ ظفراللہ خان نے کراچی میں برطانوی وزرا آرتھر بوٹملے اور گارڈن واکر سے گفت وشنید کی۔ جس میں سوویت یونین اور اشتراکیت کے خلاف دفاعی انتظام کے مسئلہ پر غور ہوا۔ اسی مہینے میں برطانیہ کی کنزرویٹو پارٹی کا ایک ممتاز لیڈر سر اینتھونی ایڈن بھی پاکستان آیا اور اس نے کراچی کے ارباب اقتدار سے بات چیت کرنے کے علاوہ پاکستان کی شمال مغربی سرحد کا بھی معائنہ کیا اور اسی مہینے میں ماسکو کے ہفت روزہ نیوٹائمز نے الزام عائد کیا کہ برطانیہ پاکستان میں افغان سرحد کے نزدیک فوجی اڈہ بنانے کا ارادہ رکھتا ہے۔

7۔ اپریل 1949ء میں دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس کے دوران لندن میں وزیراعظم لیاقت علی خان سے ہتک آمیز سلوک کیا گیا۔ تاہم اس نے وہاں سے واپسی پر قاہرہ میں ایک انٹرویو دیا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ مشرق وسطیٰ میں اینٹی سوویت بلاک بنانے کے حق میں تھا۔ یہ تجویز دولت مشترکہ کانفرنس میں زیر بحث آئی تھی۔

8۔ 23رمئی 1948ء کو پاکستان کے وزیر خزانہ غلام محمد کا انٹرویو یہ تھا کہ کمیونزم کا مقابلہ کرنے کے لئے مغربی ممالک اور امریکہ کو پاکستان کی ہرممکن امداد کرنی چاہیے۔ غلام محمد کے اس انٹرویو سے قبل لیاقت علی خان کو تہران میں غیر رسمی طور پر دورۂ ماسکو کی دعوت مل چکی تھی۔

9۔ 26رمئی کو ماسکو کے ہفت روزہ نیوٹائمز نے لکھا کہ حال ہی میں دولت مشترکہ کانفرنس ہوئی ہے۔ اس میں خفیہ گفت وشنید کے بعد ہندوستان، پاکستان اور سیلون پر مشتمل ایک اینٹی ڈیموکریٹک بلاک بنایا گیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک میں جمہوری تحریک کو دبایا جائے۔

10۔ 7رجون 1949ء کو کراچی اور ماسکو سے اعلان کیا گیا کہ پاکستان کے وزیراعظم لیاقت علی خان نے دورۂ ماسکو کی دعوت قبول کر لی ہے۔ لیکن حکومت پاکستان میں سوویت دشمن عناصر کی سازشوں اور حکومت برطانیہ کے دباؤ کی وجہ سے لیاقت علی

خان اس اعلان پر عمل نہ کر سکا حالانکہ پاکستان کے عوام نے اس اعلان کی پر جوش تائید وحمایت کی تھی۔ لیاقت علی خان کے اس دورے کے لئے 20راگست 1949ء کی تاریخ مقرر ہوئی تھی مگر سوویت یونین کی تجویز پر یہ دورہ 7رنومبر 1949ء تک ملتوی کر دیا گیا تھا۔ روسیوں کی خواہش تھی کہ اس دورہ سے قبل دونوں ملکوں کے درمیان سفارتی تعلقات قائم ہو جائیں مگر ظفر اللہ خان ایسا کرنا ضروری نہیں سمجھتا تھا۔ حالانکہ 1948ء میں دونوں ملکوں کے درمیان سفارتی تعلقات کے قیام کے لئے پہل ظفر اللہ خان نے ہی کی تھی۔ چونکہ اس کی یہ تجویز نیک نیتی پر مبنی نہیں تھی اس لئے اس نے بعد میں اس پر عمل نہ کیا۔

11۔ جولائی 1949ء میں سوویت یونین کا ایک تجارتی وفد پاکستان آیا۔ یہ وفد تقریباً تین ماہ تک کراچی میں بیٹھا رہا لیکن حکومت پاکستان نے اس سے کوئی بار آور بات چیت نہ کی۔ چنانچہ بالآخر یہ وفد کسی تجارتی معاہدہ کے بغیر ہی واپس ماسکو چلا گیا۔

12۔ 30راکتوبر 1949ء کو ماسکو میں پاکستانی سفیر کی حیثیت سے شعیب قریشی کی نامزدگی ہوئی۔ مگر اسے اپنا عہدہ سنبھالنے میں کوئی جلدی نہیں تھی اور پھر جب کئی مہینے کے بعد یہ ماسکو پہنچا تو اس کے ساتھ اپنے عملہ کے صرف تین چار ارکان تھے۔ اس وقت لیاقت علی خان کے دورۂ ماسکو کا پروگرام بالکل کھٹائی میں پڑ چکا ہوا تھا۔

13۔ دسمبر 1949ء میں لیاقت علی خان کو صدر ٹرومین کی طرف سے دورۂ امریکہ کی دعوت موصول ہوئی تو اس پر عملدرآمد میں تاخیر نہ ہوئی۔ پروگرام کے مطابق لیاقت علی مئی 1950ء کے اوائل میں امریکہ روانہ ہو گیا۔ امریکہ میں اس نے تقریباً ایک ماہ تک تقریریں کیں اور اس کے بعد وہ کینیڈا اور برطانیہ سے ہوتا ہوا جولائی 1950ء کے وسط میں واپس پاکستان پہنچا۔ اس نے اپنی تقریروں میں امریکیوں کو بار بار یقین دلایا کہ ایشیا میں اشتراکیت کے سدباب کے لئے پاکستان اس کا ساتھ دے گا۔ اٹاوہ میں اس نے سوویت یونین کا ذکر کرتے ہوئے پاکستان کی شمال مغربی سرحد کی اہمیت کا بھی ذکر کیا اور بتایا کہ پاکستان کو روس کے مقابلے کے لئے اسلحہ کی ضرورت ہے۔

14۔ 20رمئی 1950ء کو سڈنی میں دولت مشترکہ کانفرنس نے یہ فیصلہ کیا کہ جنوب اور

جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک کو کمیونسٹ خطرے کے سد باب کے لئے 15 ملین پونڈ کی امداد دی جائے گی۔ پاکستان اس فیصلے میں شریک تھا۔

15۔ 26/مئی 1950ء کو فلپائن میں ہندوستان، پاکستان، آسٹریلیا، انڈونیشیا، تھائی لینڈ اور سیلون کے نمائندوں کی اینٹی چائنا کانفرنس ہوئی۔ مقصد یہ تھا کہ اشتراکی چین کے خلاف ایشیائی ملکوں کے درمیان گٹھ جوڑ کے لئے زمین ہموار کی جائے مگر ہندوستان کی مخالفت کے باعث ایسا نہ ہوسکا اور امریکہ بھی اس وقت انگریزوں کی زیر سرپرستی اس قسم کے گٹھ جوڑ کے حق میں نہیں تھا۔

16۔ 25/جون 1950ء کو امریکہ کی تحریک پر جنوبی کوریا اور شمالی کوریا کے درمیان جنگ چھڑی تو وزیر اعظم لیاقت علی خان نے 27/جون کو بوسٹن کے ہسپتال سے ہی اس جنگ میں سلامتی کونسل یعنی امریکہ کی غیر مشروط حمایت کا اعلان کر دیا کیونکہ اس کی رائے یہ تھی کہ شمالی کوریا نے جارحیت کا ارتکاب کیا ہے۔

17۔ 28/جون 1950ء کو برطانیہ کی وزارت خارجہ نے اعلان کیا کہ کمیونسٹوں کے خلاف استعمال کے لئے برما کی حکومت کو 60 لاکھ پونڈ کا قرضہ دیا جائے گا۔ قرضہ کی اس رقم میں ہندوستان کا حصہ دس لاکھ پونڈ اور پاکستان کا حصہ پانچ لاکھ پونڈ ہوگا۔

18۔ 2/جولائی 1950ء کو وزیر اعظم لیاقت علی خان نے لندن میں اعلان کیا کہ پاکستان جنوبی کوریا کی حسب استطاعت ہر ممکن امداد کرے گا۔ پاکستان میں اس کے ان اعلانات کے خلاف زبردست عوامی احتجاج ہوا۔ لیاقت علی خان جنوبی کوریا میں پاکستانی فوج کا ایک بریگیڈ بھیجنے پر آمادہ تھا مگر وہ عوامی احتجاج کے پیش نظر ایسا نہ کرسکا۔

19۔ 10/جولائی 1950ء کو ماسکو کے ہفت روزہ نیوٹائمز کا تبصرہ یہ تھا کہ وزیر اعظم لیاقت علی خان کی طرف سے امریکیوں کی خدمت گزاری پاکستان کے لئے نہایت اہم اور نہایت افسوسناک نتائج پیدا کرسکتی ہے اور 26/جولائی کو ماسکو کے جریدے لٹریری گزٹ کی رائے یہ تھی کہ پاکستان برطانیہ کی نوآبادی سے تبدیل ہو کر امریکیوں کی نوآبادی بن گیا ہے۔ لیاقت علی خان پاکستان کا چیانگ کائی شیک یا سنگمن ری ہوگا۔

20۔ 11رجولائی کو برطانیہ کے چیف آف امپیریئل سٹاف فیلڈ مارشل سر ولیم سلم کی کراچی میں تجویز یہ تھی کہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان اطلانتک پیکٹ کی طرح کا ایک دفاعی معاہدہ ہونا چاہیے۔ کراچی کے کسی سرکاری اہلکار نے اس تجویز کی مخالفت میں ایک لفظ بھی نہ کہا جبکہ پاکستانی عوام میں اس پر بہت مخالفانہ ردعمل ہوا تھا۔

21۔ 12رجولائی 1950ء کو برطانیہ کے وزیر امور دولت مشترکہ گارڈن واکر نے پارلیمنٹ کو بتایا کہ پاکستان اور برطانیہ کے درمیان مشترکہ دلچسپی کے دفاعی مسائل اکثر زیر بحث آتے ہیں اور یہ کہ ہندوستان کا رویہ پاکستان کے ساتھ قریبی فوجی تعلقات کے راستے میں حائل نہیں ہے۔

22۔ 10راکتوبر 1950ء کو وزیر اعظم لیاقت علی خان نے اعلان کیا کہ اقوام متحدہ نے کوریا میں 38ویں خط متوازی کو کبھی بھی تسلیم نہیں کیا اس لئے اقوام متحدہ کی فوجوں کو بھی یہ سرحد عبور کر کے شمالی کوریا پر حملہ کرنے کا حق حاصل ہے۔

23۔ 25رنومبر 1950ء کو وزیر اعظم لیاقت علی خان نے پارلیمنٹ میں اینگلو۔مصری تنازعہ میں مصر کی حمایت کرنے سے احتراز کیا۔ اس کا اس سلسلہ میں اعلان یہ تھا کہ مصر سے برطانوی فوجوں کے اخراج کا مسئلہ مصر اور برطانیہ کا باہمی مسئلہ ہے۔ حکومت پاکستان کا اس معاملہ سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔

24۔ دسمبر 1950ء میں پاکستان اور امریکہ میں معاہدہ ہوا جس کے تحت یہ فیصلہ ہوا کہ امریکہ پاکستان کو فوجی ساز وسامان دے گا۔ اس ساز وسامان میں جدید اسلحہ شامل نہیں تھا۔

25۔ 11رجنوری 1951ء کو لندن میں برطانیہ کے وزیر خارجہ ارنسٹ بیون نے پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خان سے مشرق وسطیٰ کے دفاع کے مسئلہ پر بات چیت کی جبکہ وہ دولت مشترکہ کے رکن ممالک کی امداد سے تنازعہ کشمیر کا تصفیہ کرانے میں ناکام رہا تھا۔

26۔ جب اپریل 1951ء میں تیل کی صنعت کو قومیانے کے مسئلے پر برطانیہ اور ایران کے درمیان تنازعے میں بہت شدت پیدا ہوگئی اور برطانیہ ایران پر حملے کی دھمکیاں

دینے لگا تو وزیر اعظم لیاقت علی خان نے پاکستانی عوام کے زوردار مطالبے کے باوجود ایران کے قوم پرستوں کی حمایت کا اعلان نہ کیا۔

27۔ مئی 1951ء میں ترکی کی طرف سے کمیونزم کے مقابلے کے لئے مشرق وسطیٰ کے ممالک کے ساتھ فوجی بلاک بنانے کے تحریک ہوئی تو وزیر خارجہ ظفر اللہ خان نے اس تحریک کی حمایت کی اور پھر 7/ جولائی 1951ء کو وزیر اعظم لیاقت علی خان نے یہ تجویز پیش کی کہ مغربی ممالک اور اشتراکی ممالک کی طرح اسلامی ممالک کو بھی بلاک بنانا چاہیے۔ اس نے اپنی اس تقریر میں اینگلو۔مصری تنازعے یا اینگلو۔ایرانی تنازعے کا کوئی ذکر نہ کیا۔

28۔ 7/ ستمبر 1951ء کو پاکستان کے وزیر خارجہ ظفر اللہ خان نے سان فرانسسکو کانفرنس میں جاپان کے ساتھ معاہدہ امن کی اسلامی نقطہ نگاہ سے زوردار حمایت کی۔ یہ صلح نامہ امریکہ اور برطانیہ نے تجویز کیا تھا اور اس کے تحت امریکہ کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ جاپان میں اپنی افواج رکھ سکے گا۔ ہندوستان نے اس کانفرنس کا بائیکاٹ کیا تھا اور سوویت بلاک نے اس معاہدے کی مخالفت کی تھی۔ ظفر اللہ خان کی اس تقریر کی نیویارک ٹائمز اور امریکی وزیر خارجہ ڈین اچی سن نے تعریف کی تھی اور جان فاسٹر ڈلس سے اس کی ''دوستی'' کی ابتدا اسی کانفرنس میں ہوئی تھی۔

لیاقت علی خان کے عہد میں پاکستان کے ارباب حل وعقد اپنی اس سامراج نواز پالیسی کا اشاروں کنایوں میں یہ جواز پیش کرتے تھے کہ چونکہ ہندوستان کے ارباب اقتدار نے پاکستان کے وجود کو تسلیم نہیں کیا اور وہ اس نوزائیدہ اسلامی مملکت کو سن بلوغت میں پہنچنے سے پہلے ہی ختم کر دینے کے درپے ہیں اس لئے اس کے تحفظ کے لئے اینگلو۔امریکی بلاک کی سرپرستی میں رہنا ضروری ہے۔ کراچی میں بعض بااختیار لوگ تو یہ کہتے تھے کہ ہندوستان کی غلامی سے بہتر ہے کہ یہ ملک اینگلو۔امریکی بلاک کے طفیلی ملک کی حیثیت سے زندہ رہے۔ اس طرح اسے مغربی ممالک سے مالی وفوجی امداد ملے گی اور پھر ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ یہ ملک اتنا مضبوط اور طاقتور ہو جائے گا کہ ہندوستان اس کی طرف میلی آنکھ سے دیکھنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ اس دلیل میں پاکستانی عوام کو گمراہ کرنے کے لئے کافی مواد موجود تھا۔ اس لئے کہ پاکستانی عوام کا

ہندوستانی توسیع پسندوں سے حقیقی تضاد تھا۔ 3/جون 1947ء کو برصغیر کے تقسیم کے اعلان کے بعد کانگرس کی مجلس عاملہ کی قرارداد یہ تھی کہ یہ تقسیم عارضی ہے اور وہ وقت دور نہیں جب پورا برصغیر پھر متحد ہو جائے گا۔ اور اس کے بعد دہلی میں کانگرسی حکومت نے پاکستان کے خلاف پے در پے ایسے معاندانہ اقدامات کئے تھے کہ جن سے بالکل واضح ہوتا تھا کہ ہندو زعما پاکستان کو بلاتاخیر تباہ و برباد کرنے کا عزم کئے ہوئے ہیں۔ پھر 14/اگست 1947ء کے بعد جواہر لال نہرو، سردار پٹیل، راجندر پرشاد، شیاما پرشاد مکرجی، اچاریہ کرپلانی اور دوسرے ممتاز کانگرسی لیڈروں کی تقریروں اور بیانات سے یہی تاثر ملتا تھا کہ ان لیڈروں نے پاکستان کے وجود کو واقعی تسلیم نہیں کیا اور وہ ہر ممکن طریقے سے اسے ختم کرنا چاہتے ہیں۔ پاکستانی عوام ہندوستانی لیڈروں کے ان عزائم سے خوفزدہ تھے اور وہ اپنے وطن عزیز کے تحفظ کے لئے ہر طاقت سے سمجھوتہ کرنے پر آمادہ تھے۔ لیکن ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ برطانیہ کی سرپرستی قبول کر کے پاکستان کا تحفظ کیونکر ہو سکے گا۔

برطانوی سامراج نے برصغیر کی تقسیم کو طوعاً و کرہاً قبول کیا تھا اور ہندوستان میں اس کا نمائندہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن پاکستان کو ختم کرنے کی سازشوں میں عملاً شریک تھا۔ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان سرحد بندی میں بے انصافی اسی کی وجہ سے ہوئی تھی اور تنازعہ کشمیر بھی اسی کا پیدا کردہ تھا۔ اس پس منظر میں پاکستانی عوام یہ باور نہیں کر سکتے تھے کہ برطانیہ پاکستان کی آزادی کو برقرار رکھنے میں مدد دے گا۔ لہٰذا وہ ہندوستانی توسیع پسندوں کے علاوہ برطانوی سامراجیوں کو بھی اپنا قومی دشمن تصور کرتے تھے۔ پاکستانی عوام کی سمجھ سے یہ باتیں بھی بالاتر تھیں کہ اگر پاکستان کی خارجہ پالیسی کا اولین مقصد ان کے ملک کو ہندوستانی توسیع پسندوں کی دستبرد سے بچانا ہے تو پھر سوویت مخالف باتیں کیوں ہوتی ہیں۔ پاکستان کے پہلے ہی بجٹ میں ہندوستان کی بجائے سوویت یونین کو دشمن کیوں تصور کیا جاتا ہے؟ سوویت یونین کے خلاف ہندوستان کے ساتھ فوجی اشتراک عمل کا تذکرہ کیوں ہوتا ہے؟ پاکستان کی شمال مغربی سرحدوں پر روس کے خطرے کا ہوا کیوں کھڑا کیا جاتا ہے؟ برما اور مشرق بعید کے دوسرے ممالک میں کمیونسٹ بغاوتوں کو کچلنے کے لئے ہندوستان کے ساتھ گٹھ جوڑ کیوں کیا جاتا ہے؟ امریکہ اور برطانیہ ہندوستان اور جواہر لال نہرو کو ایشیا کا لیڈر بنانے کا کھلم کھلا اعلان کرتے ہیں تو پھر ان سے یہ توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ وہ پاکستان کو ہندوستان کی دستبرد سے بچائیں گے؟ امریکہ اور برطانیہ کے

ہندوستان نواز رویے کے پیش نظر سوویت یونین کی دعوت پر دورہ ماسکو کے پروگرام پر عمل کیوں نہیں کیا جاتا ہے؟ جب امریکہ ہندوستان کے حملے کی صورت میں پاکستان کی امداد کا وعدہ کرنے سے انکار کرتا ہے تو پھر اینگلو۔امریکی بلاک سے وابستہ رہنے کا جواز کیا ہوسکتا ہے؟ برطانیہ کے خلاف مصراور ایران کے قوم پرستوں کی حمایت کیوں نہیں کی جاتی ہے؟اور فلپائن میں چین مخالف کانفرنس میں شرکت کیوں کی جاتی ہے؟ پاکستانی ارباب اقتدار کے لئے یہ سارے سوالات بہت مشکل تھے۔ بالخصوص ایسی صورتحال میں کہ سوویت یونین نے اگست 1947ء میں قیام پاکستان کے بعد سے لے کر مئی 1950ء میں لیاقت علی خان کے دورہ امریکہ تک کوئی ایسی کاروائی نہیں کی تھی اور کوئی ایسی بات نہیں کی تھی جو حکومت پاکستان یا پاکستانی عوام کے لئے باعث شکایت ہوسکتی تھی۔ بعض حلقے صرف ایک شکایت کرتے تھے کہ قیام پاکستان کے موقع پر سوویت یونین کی حکومت نے قائداعظم کو مبارک باد کا پیغام نہیں بھیجا تھا۔ لیکن یہ اتنی معمولی شکایت تھی کہ دو ملکوں کے درمیان دشمنی کی وجہ نہیں بن سکتی تھی۔ سوویت حکومت نے پاکستان کو تسلیم کرنے میں کوئی تاخیر نہیں کی تھی۔ اس نے اقوام متحدہ میں پاکستان کی رکنیت کے راستے میں کوئی رکاوٹ حائل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی حالانکہ اس نے سیلون کی اقوام متحدہ میں شمولیت کی مخالفت کی تھی۔ جب اقوام متحدہ میں تنازعہ کشمیر زیر بحث آیا تھا تو سوویت مندوب نے غیر جانبداری کے رویے کا مظاہرہ کیا تھا۔ جب اپریل 1948ء میں ظفر اللہ خان نے سوویت یونین اور پاکستان کے درمیان سفارتی تعلقات کی تجویز پیش کی تھی تو سوویت حکومت نے فوراً اس سے اتفاق کیا تھا اور پھر جب اپریل 1950ء میں لندن میں وزیراعظم لیاقت علی خان اور پاکستان کی توہین کی گئی تھی تو سوویت یونین نے لیاقت علی کو دورۂ ماسکو کی دعوت دے کر بین الاقوامی طور پر پاکستان کا وقار بلند کیا تھا۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی کہ اگست 1947ء میں سوویت ارباب اقتدار غلط طور پر اس رائے کے حامل تھے کہ برصغیر کی تقسیم برطانوی سامراج کی سازش کی وجہ سے ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے انہوں نے ہندوستان کی آزادی کا بھی خیر مقدم نہیں کیا تھا۔ وہ اس کی آزادی کو جعلی آزادی تصور کرتے تھے اور جواہر لال نہرو کو سامراج کا پٹھو قرار دیتے تھے۔ سوویت حکومت کے سربراہ مارشل سٹالن نے ہندوستانی سفیر وجے لکشمی پنڈت کو اس کے ماسکو میں قیام کے دوران کبھی ملاقات کا موقع نہیں دیا تھا۔ اس نے مسز پنڈت سے رسمی طور پر صرف الوداعی ملاقات کی تھی۔

مزید برآں ہندوستانی کمیونسٹوں نے سوویت یونین کی ترغیب پر نہرو حکومت کے خلاف 1950ء تک علم بغاوت بلند کئے رکھا تھا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود حکومت ہندوستان نے اپنے سوویت یونین کے ساتھ تعلقات میں دشمنی کا عنصر شامل نہیں ہونے دیا تھا۔

جب وزیراعظم لیاقت علی خان اور اس کے رفقا کی توجہ ان حقائق کی طرف مبذول کرائی جاتی تھی تو ان سے کوئی جواب نہیں بن پڑتا تھا۔ پرائیویٹ گفتگو میں وہ یہ کہا کرتے تھے کہ سوویت یونین ہمیں کوئی مالی یا فوجی امداد نہیں دے سکتا۔ ہمیں صنعتکاری اور فوجی طاقت میں اضافہ کرنے کے لئے صرف اینگلو۔ امریکی بلاک ہی سے امداد مل سکتی ہے۔ اس لئے مصلحت یہی ہے کہ برطانیہ اور امریکہ سے تعلقات نہ بگاڑے جائیں۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ان کی امداد سے اقتصادی طور پر اور فوجی لحاظ سے اتنی طاقت حاصل کر لی جائے گی کہ ہندوستان کو پاکستان پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں ہوگی اور ہم بزور قوت کشمیر حاصل کر سکیں گے۔ لیکن اعلانیہ طور پر وہ سوویت یونین کے ملحدانہ اشتراکی نظریے اور اسلام کے توحیدی نظریے میں تصادم کی باتیں کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اسلامی طرز زندگی اور اشتراکی طرز زندگی کا ملاپ نہیں ہوسکتا۔ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ اس میں جدلیاتی مادیت کے نظریے کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے لیکن وہ اپنی سوویت دشمنی کے جواز میں جو سب سے زوردار نعرہ لگاتے تھے وہ پان اسلام ازم کا نعرہ تھا۔ وہ غیر سرکاری ملاؤں کی وساطت سے سوویت یونین میں دو کروڑ مسلمانوں پر اشتراکی نظام کے ''مظالم'' کی داستانیں بیان کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ان ''مظلوم'' مسلمانوں کو سوویت چنگل سے نجات دلانے کے لئے اور ایشیا و افریقہ کے سارے مسلم ممالک کو اشتراکیت کے سیلاب سے بچانے کے لئے ضروری ہے کہ ان مسلم ممالک کا پاکستان کی زیر قیادت ایک بلاک قائم کیا جائے جب یہ مسلم ممالک اسلامی رشتہ اتحاد میں منسلک ہوں گے تو ساری دنیا میں اسلام کا بول بالا ہو جائے گا۔ پاکستان کی جانب سے سرکاری طور پر سب سے پہلے پان اسلام ازم یا اتحاد اسلامی کا نعرہ قائداعظم محمد علی جناح کے خصوصی نمائندہ ملک فیروز خان نون نے 29 ر اکتوبر 1947ء کو لگایا تھا جبکہ اس نے استنبول میں یہ کہا تھا کہ ''مستقبل قریب میں مسلم ممالک کے ایک بلاک کا قیام عمل میں آجائے گا اور ترکی اس بلاک کا لیڈر رہو گا'' پھر اس کے بعد:

1۔ 3 ر نومبر کو صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ خان عبدالقیوم خان نے یہ تجویز پیش کی کہ عرب

لیگ کو جلد از جلد ایک پان اسلامی کانفرنس منعقد کرنی چاہیے۔

2۔ 22 رنومبر 1947ء کو لاہور کے ایک اجتماع میں ''اسلامک ورلڈ ایسوسی ایشن'' کا قیام عمل میں آیا۔ اس موقع پر پنجاب کے وزیر اعلیٰ افتخار حسین آف ممدوٹ اور مرکزی وزیر بحالیات راجہ غضنفر علی خان بھی موجود تھے۔

3۔ 8 ردسمبر 1947ء کو قائداعظم محمد علی جناح نے امریکی صدر ٹرومین کے نام ایک اپیل میں فلسطین کی تقسیم کے مسئلہ کو بالواسطہ طور پر اسلام کا مسئلہ قرار دیا۔ ان کی رائے یہ تھی کہ اقوام متحدہ نے اس سلسلے میں جو فیصلہ کیا ہے اس سے عالم اسلام کو صدمہ پہنچا ہے۔

4۔ 19 ردسمبر 1947ء کو فیروز خان نون نے کراچی میں کہا کہ اب ترکوں میں عربوں کے لئے ہمدردی کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ ترکی کو روس سے حقیقی خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ ترکوں کا خیال ہے کہ روس کی نظریں درہ دانیال اور باسفورس پر لگی ہوئی ہیں اور وہ بحیرہ روم تک رسائی حاصل کرنا چاہتا ہے۔

5۔ 15 رمارچ 1948ء میں سوویت یونین کا الزام یہ تھا کہ اینگلو۔ امریکی بلاک ترکی، مصر، عراق، عرب، ایران اور پاکستان پر مشتمل ایک اسلامی بلاک بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔

6۔ 30 رمارچ 1948ء کو استنبول کے ایک اخبار ''التصویر'' میں ایک سیاسی لیڈر کی تجویز یہ تھی کہ بلقان یونین کی طرز پر مشرق وسطیٰ کے اسلامی ممالک کی بھی ایک یونین بنانی چاہیے۔ افغانستان، ایران اور ترکی پر روس کی طرف سے جس قسم کا دباؤ ڈالا جا رہا ہے اس کی روک تھام کے لئے ایسی صورت ہو سکتی ہے کہ یہ تینوں ممالک برطانیہ اور امریکہ کے ساتھ اپنی ایک یونین بنالیں۔

7۔ 18 رمئی 1948ء کو ''تہران'' کے اخبار ''کیہان'' نے پاکستان کے گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح سے یہ منسوب کیا کہ مسلم ورلڈ میں پاکستان اور ایران پر مشتمل ایک طاقتور یونٹ تشکیل کرنا چاہیے۔

8۔ 30 رجون 1948ء کو پاکستان مسلم لیگ کے چیف آرگنائزر چودھری خلیق الزماں نے یہ رائے ظاہر کی کہ ایک خلیفہ کی سربراہی میں سارے اسلامی ممالک کی ایک

فیڈریشن قائم ہونی چاہیے۔

9۔ 27رجولائی 1948ء کو پاکستان کے بین الاقوامی امور کے ادارے نے ایک پمفلٹ شائع کیا جس میں اس نظریے کا اظہار کیا گیا کہ اگر مشرق وسطیٰ کے تحفظ کو کوئی خطرہ ہو گا تو وہ پاکستان کے تحفظ کے لئے خطرہ سمجھا جائے گا۔

10۔ 6راگست 1948ء کو قائداعظم نے مسلم دنیا کے نام اپنے عیدالفطر کے پیغام میں کہا کہ ''ہم سب انتہائی خطرناک زمانہ سے گزر رہے ہیں۔ فلسطین، انڈونیشیا اور کشمیر میں طاقتی سیاسیات کا جوڈرامہ کھیلا جارہا ہے اس سے ہماری آنکھیں کھل جانی چاہئیں۔ ہم صرف متحدہ محاذ پیش کر کے ہی مجالس عالم میں اپنی آواز محسوس کرواسکتے ہیں۔''

11۔ 14راگست 1948ء کو پاکستان کے وزیر تعلیم فضل الرحمان نے کہا کہ آج کل اسلامی برادری مشکل حالات سے گزر رہی ہے اور اسے بہت سے خطرات درپیش ہیں۔ ہمیں اتحاد اور چوکسی کی جتنی آج کل ضرورت ہے اتنی پہلے کبھی نہ تھی۔ اگر ہم قائداعظم کی تجویز کے مطابق متحدہ محاذ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ہمارے درمیان رابطہ کی صرف ایک ہی زبان ہوسکتی ہے اور وہ قرآن مجید کی زبان ہے۔

12۔ 18راگست 1948ء کو روزنامہ ڈان کا تبصرہ یہ تھا کہ روحانی طور پر تو مسلم ممالک کے درمیان متحدہ محاذ پہلے ہی سے قائم ہے لیکن یہ کافی نہیں ہے۔ یہ متحدہ محاذ ایسا ہونا چاہیے کہ یہ ممالک فوجی اور معاشی لحاظ سے ایک دوسرے کی ضروریات پوری کریں۔

13۔ 10رستمبر 1948ء کو کراچی کے ایک جلسہ عام میں مولانا شبیر احمد عثمانی کی تقریر یہ تھی کہ دنیا کی سب سے بڑی مسلم مملکت کی حیثیت سے پاکستان کی ذمہ داری اس کی اپنی آزادی کے تحفظ کی حد تک ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس کے لئے لازمی ہے کہ یہ چھوٹی مسلم مملکتوں کا بھی تحفظ کرے۔ اس جلسہ کی صدارت وزیراعظم لیاقت علی خان نے کی تھی۔

14۔ 9راکتوبر 1948ء کو وزیراعظم لیاقت علی خان نے قاہرہ میں عرب لیگ کے سیکرٹری جنرل سے ملاقات کے بعد کہا کہ مسلم اقوام کے درمیان اسلام کے رشتے کبھی نہیں ٹوٹیں گے بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ بندھن اور بھی مضبوط ہوں گے۔

15۔ 29/ اکتوبر 1948ء کو برطانوی نیوز ایجنسی سٹار نے یہ خبر دی کہ وزیر اعظم لیاقت علی خان اور عرب لیگ قطعی طور پر روس کے خلاف ایک عرب۔ پاکستان محاذ قائم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

16۔ 5/ نومبر 1948ء کو وزیر اعظم لیاقت علی خان نے قاہرہ میں اپنی نشری تقریر میں کہا کہ پاکستان کے عوام مصری عوام کے ساتھ قریب ترین تعلقات قائم کرنا چاہتے ہیں۔

17۔ 14/ دسمبر 1948ء کو پاکستان کے گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین نے کہا کہ پاکستان مسلم قومیت کے تصور کی بنا پر قائم ہوا ہے۔ اس لئے یہ قدرتی بات ہے کہ پاکستان اسلامی اتحاد کے لئے عملاً اقدام کرے گا۔

18۔ 24/ دسمبر 1948ء کو وزیر خزانہ غلام محمد نے پان اسلامک کمرشل انڈسٹریل کانفرنس منعقد کرنے کی تجویز پیش کی۔

19۔ 6/ جنوری 1949ء کو وزیر داخلہ خواجہ شہاب الدین کی جماعت اخوت الاسلامیہ نے ورلڈ مسلم کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔

20۔ 15/ جنوری 1949ء کو قاہرہ کے اخبار ''المصور'' کی اطلاع یہ تھی کہ برطانیہ اور امریکہ مشرق قریب کا ایک بلاک بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس بلاک میں ترکی اور دیگر عرب ممالک شامل ہوں گے۔

21۔ 26/ جنوری 1948ء کو برطانیہ کے وزیر خارجہ ارنسٹ بیون نے کہا کہ آئندہ مشرق وسطیٰ کی سیاست میں پاکستان کو جو پوزیشن حاصل ہوگی اسے نظر انداز کیا گیا تو یہ بات انتہائی احمقانہ ہوگی۔

22۔ 9/ فروری 1949ء کو چودھری خلیق الزماں نے یہ تجویز پیش کی کہ سارے اسلامی ممالک کی ایک مرکزی اتھارٹی قائم کی جائے۔

23۔ 18/ فروری 1949ء کو مولانا شبیر احمد عثمانی کی زیر صدارت کراچی میں ورلڈ مسلم کانفرنس منعقد ہوئی جس میں مصر، سعودی عرب، عراق، افغانستان، ایران، انڈونیشیا، تیونس، یمن، فلسطین، لبنان، لیبیا، شام، لنکا اور ملایا کے مندوبین نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں جن لوگوں نے اتحاد اسلامی کے وقوع پر تقریریں کیں ان میں پاکستان

کے وزیر مواصلات سردار عبدالرب نشتر اور وزیر تعلیم فضل الرحمان بھی شامل تھے۔

24۔ 20 رفروری 1949ء کو پاکستان مسلم لیگ کے صدر چودھری خلیق الزماں نے یہ تجویز پیش کی کہ دنیا کے سارے مسلم ممالک کو مدغم کر کے ایک اسلامی مملکت یا اسلامستان کا قیام عمل میں لایا جائے۔ اس نے کہا کہ ایک اسلامستان لیگ بھی قائم کی جائے۔ اس لیگ کی رکنیت سازی کی جائے اور ورلڈ اسلامک سٹیٹ کے لئے آئین مرتب کیا جائے۔

25۔ 4 رمارچ 1949ء کو کراچی میں مؤتمر عالم اسلامی کا قیام عمل میں آیا۔ پروفیسر اے۔ بی۔ اے۔ حلیم اس تنظیم کا کنوینر مقرر رہا۔

26۔ 7 رمارچ 1949ء کو وزیر اعظم لیاقت علی خان نے پاکستان کی پارلیمنٹ میں قرارداد مقاصد پیش کی جو چار پانچ دن کی بحث کے بعد 14 رمارچ کو منظور ہوئی۔

27۔ یکم اپریل 1949ء کو قاہرہ میں پاکستانی سفارت خانے کے لئے ایک ترجمان نے یہ انکشاف کیا کہ عرب ممالک اور دوسرے مسلم ممالک میں متعینہ پاکستانی سفیروں کی ایک میٹنگ ماہِ رواں کے اواخر میں تہران میں ہوگی جس میں یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ آئندہ عرب ممالک اور پاکستان کی پالیسی ایک جیسی ہوگی۔

28۔ 13 رمئی 1949ء کو وزیر اعظم لیاقت علی خان نے قاہرہ میں لندن ٹائمز سے ایک انٹرویو میں کہا کہ اس وقت دنیا کے ممالک دو گروہوں میں منقسم ہو گئے ہیں۔ ایک گروہ ان ممالک کا ہے جو کمیونزم کی حمایت کرتے ہیں اور دوسرا گروہ ان ممالک کا ہے جو کمیونزم کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس صورتحال میں قاہرہ اور کراچی کے درمیانی علاقے کے مسلم ممالک کا کردار بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

29۔ 30 رمئی کو ایسوسی ایٹیڈ پریس آف پاکستان نے کراچی کے باخبر حلقوں کے حوالے سے یہ خبر دی کہ آئندہ چند ماہ میں پاکستان اور دوسرے مسلم ممالک کے درمیان دوستی کے رسمی معاہدوں پر دستخط ہو جائیں گے۔ پاکستان نے عرب لیگ کے اندر اور باہر کے تمام مسلم ملکوں کو آئندہ موسم سرما میں سرکاری سطح کی کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی ہے۔

30۔ 7رجون 1949ء کو وزیراعظم لیاقت علی خان کے نام مارشل سٹالن کے دعوت نامے کا اعلان ہوا تو اس سے اگلے دن چودھری خلیق الزماں نے ایک بیان میں مسلم ممالک کے اتحاد کی اہمیت پر زور دیا اور کہا کہ اس کی مجوزہ علاقائی گروپنگ سے مسلم ممالک کو ایک دوسرے سے بے پناہ فوائد حاصل ہوں گے۔ اس نے 8رجون کو سارے مشرق وسطیٰ میں اسلام لیگ کے قیام کی بھی تجویز پیش کی۔

31۔ 10رجون 1949ء کو یہ خبر چھپی کہ بین الاقوامی اسلامک اکنامک کانفرنس کے انعقاد کے لئے 22 مسلم ممالک کو دعوت نامے بھیج دیئے گئے ہیں۔ یہ کانفرنس کراچی میں نومبر کے مہینے میں ہوگی۔ برطانیہ کے سیاسی واخباری حلقوں نے اس خبر کا خیر مقدم کیا۔

32۔ 19راگست 1949ء کو سوویت فوج کے اخبار ریڈ سٹار نے ایک مقالہ افتتاحیہ میں لکھا تھا کہ مشرق وسطیٰ کے تیل پر قبضہ جمانے کے لئے امریکہ جو چالیں چل رہا ہے ان کا مقابلہ کرنے کی غرض سے برطانیہ مصر سے پاکستان تک ایک مسلم فیڈریشن قائم کرنا چاہتا ہے۔

33۔ 19راگست 1949ء کو چودھری خلیق الزماں نے بتایا کہ وہ اسلامستان کی تبلیغ کے لئے مشرق وسطیٰ کا دورہ کرے گا۔

34۔ یکم ستمبر 1949ء کو چودھری خلیق الزماں نے مسلم ممالک کی ایک عوامی تنظیم کی تشکیل پر زور دیا۔ گویا وہ سیکولر عرب لیگ کو ختم کر کے اسلام لیگ بنانے کا خواہاں تھا۔

35۔ 13رستمبر 1949ء کو چودھری خلیق الزماں مشرق وسطیٰ کے دورے پر روانہ ہو گیا۔ وہ سب سے پہلے بغداد پہنچا جہاں اس نے اسلامستان کی تجویز کے بارے میں سرکاری اور غیر سرکاری زعما سے ملاقاتیں کیں۔ پھر 23رستمبر کو اس نے تہران پہنچ کر وہاں کے لیڈروں سے بات چیت کی۔

36۔ 25رستمبر 1949ء کو ڈان کی رپورٹ یہ تھی کہ اگر اسلامستان کے نظریے کے بارے میں بغداد اور تہران کے ردعمل کو پیش نظر رکھا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ مسلم ممالک کی گروہ بندی توقع سے پہلے ہی عمل میں آجائے گی۔

37۔ 11راکتوبر 1949ء کو ڈان کی عرفات (سعودی عرب) سے خبر یہ تھی کہ فلسطین کے

مفتیٔ اعظم امین الحسینی نے چودھری خلیق الزماں کو اسلامستان کی تجویز کی مکمل حمایت کا یقین دلایا ہے۔

38۔ 27؍اکتوبر 1949ء کو چودھری خلیق الزماں نے قاہرہ میں بتایا کہ مصر میں ایسے لوگ موجود ہیں جو ''متحدہ اسلامستان'' کی طرف مائل ہیں۔ سارے مسلم ممالک کی جغرافیائی اور سیاسی پوزیشن اس مقصد کے لئے موافق ہے۔

39۔ 31؍اکتوبر کو 1949ء کو چودھری خلیق الزماں نے قاہرہ سے لندن پہنچ کر بتایا کہ مشرق وسطیٰ کے متعدد بادشاہوں، صدور، وزرائے اعظم، صنعت کاروں اور سیاسی لیڈروں نے مشرق وسطیٰ کے ممالک کی گروہ بندی کی تجویز سے اتفاق کیا ہے۔ کسی نے اس خیال کی مخالفت نہیں کی۔

40۔ 3؍نومبر 1949ء کو چودھری خلیق الزماں نے لندن میں برطانیہ کے وزیر امور دولت مشترکہ گارڈن واکر سے ملاقات کے بعد ایک انٹرویو میں بتایا کہ میں مشرق وسطیٰ کے ممالک کی گروپ بندی کے بارے میں برطانوی حکومت کا ردعمل معلوم کرنے کے لئے یہاں آیا ہوں۔ اسلامستان قائم ہو کر رہے گا۔ اس اسکیم کا مقصد مشرق وسطیٰ کے ممالک میں سیاسی و اقتصادی تعاون ہے تاکہ یہ ممالک غیر ممالک کی طرف سے جارحانہ کاروائی کی صورت میں متحدہ محاذ قائم کر سکیں۔

41۔ 4؍نومبر 1949ء کو خلیق الزماں نے برطانوی محکمہ خارجہ کے ایسٹرن ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ برنارڈ بروز سے ملاقات کر کے اس سے اسلامستان کی تجویز کے بارے میں ایک گھنٹہ تک بات چیت کی۔

42۔ 7؍نومبر 1949ء کو خلیق الزماں نے لندن کے اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ برطانیہ کو پاکستان اور مشرق وسطیٰ کے دوسرے ممالک پر بھروسہ کرنا چاہیے اور اسلامستان کے بارے میں ہمدردانہ رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ مشرق وسطیٰ کا علاقہ امن عالم کے لئے نہایت اہم ہے اور دفاعی مقاصد کے لئے اس علاقے کے ممالک کی گروپنگ کے بارے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہونا چاہیے۔ اسلامستان سے مشرق وسطیٰ کے دفاع کی ضمانت ملے گی۔

43۔ 9رنومبر 1949ء کو خلیق الزماں نے ڈان کے نمائندے سے انٹرویو میں کہا کہ اسلامستان کے تصور کا پہلا ٹھوس نتیجہ یہ نکلے گا کہ پاکستان سے لے کر ترکی تک مسلم ممالک کے درمیان دفاعی معاہدہ ہو گا۔ اطلانتک پیکٹ نے ہماری اسکیم کو آگے بڑھایا ہے۔

44۔ 15رنومبر کو ڈان نے اپنے اداریے میں چودھری خلیق الزماں کی اسلامستان کے بارے میں برطانوی ارباب اقتدار سے گفت وشنید پر نکتہ چینی کی اور یہ رائے ظاہر کی کہ چودھری خلیق الزماں نے اسلامستان کے لئے یہ دورہ خواہ کیسی ہی نیک نیتی سے کیا ہو اس سے پاکستان کو اتنا فائدہ نہیں پہنچا جتنا نقصان ہوا ہے۔

45۔ 25رنومبر 1949ء کو کراچی میں انٹرنیشنل اسلامک اکنامک کانفرنس ہوئی جس میں 16 مسلم ممالک کے مندوبین نے شرکت کی۔ وزیر خزانہ غلام محمد نے اس کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے مسلم ممالک کو مشورہ دیا کہ وہ اجتماعی سوداکاری اور اجتماعی تحفظ کا سسٹم وضع کریں۔ ماسکو کے ہفت روزہ نیوٹائمز کی رائے یہ تھی کہ اس کانفرنس کا مقصد یہ ہے کہ سوویت یونین کے خلاف مسلم ممالک کا ایک فوجی اور سیاسی بلاک بنایا جائے۔

46۔ 27رنومبر 1949ء کو چودھری خلیق الزماں نے کراچی میں کہا کہ برطانیہ مسلمانان عالم کی بین الاقوامی تنظیم کے خلاف نہیں ہے۔ برطانیہ اس قسم کی تنظیم کے حق میں ہے۔

47۔ یکم دسمبر 1949ء کو اسلامک اکنامک کانفرنس میں ایک انٹرنیشنل فیڈریشن آف اسلامک چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور پھر 5ردسمبر کو ایک مستقل انٹرنیشنل اسلامک آرگنائزیشن قائم کی گئی۔ غلام محمد اس تنظیم کا صدر منتخب ہوا۔ اسی دن چودھری خلیق الزماں نے ایک انٹرویو میں کہا کہ اسلامستان لازماً وجود میں آئے گا۔

48۔ 2رفروری 1950ء کو ایران میں پاکستان کے سفیر راجہ غضنفر علی خان نے کراچی میں یہ خوشخبری سنائی کہ مشرق وسطیٰ کے عوام کا خیال ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ دنیا کے سارے مسلمان ''بطور ایک قوم'' متحد ہو جائیں۔ مسلم علما کا خیال یہ ہے کہ سارے مسلمانوں کی ایک مملکت ہونی چاہیے۔

49۔ 21رمارچ 1950ء کو چودھری خلیق الزماں نے اسلامی ممالک کے تقریباً 200 قائدین اور علما کو لکھا کہ وہ اسلامی ممالک کی کسی دارالحکومت میں کانفرنس بلائیں تا کہ اسلامستان کو ایک حقیقت بنانے کے لئے تبادلہ خیالات کیا جائے۔

50۔ 18رمئی 1950ء کو وزیر اعظم لیاقت علی خان نے لاس اینجلز میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کے ایک حصے کا محل وقوع مشرق وسطیٰ کے تیل کے بھرپور علاقوں کی مواصلات کے نقطہ نگاہ سے بہت اہم ہے۔ پاکستان کا یہ حصہ ان پہاڑی دروں کو بھی کنٹرول کرتا ہے جہاں سے ماضی میں برصغیر پر 90 مرتبہ حملے ہوئے تھے۔

51۔ 12رجولائی 1950ء کو برطانیہ کے وزیر امور دولت مشترکہ گارڈن واکر نے پارلیمنٹ میں بتایا کہ پاکستان اور برطانیہ کے درمیان مشترکہ دلچسپی کے دفاعی سوالات اکثر زیر بحث آتے ہیں۔

52۔ 12رستمبر 1950ء کو جماعت احمدیہ کے سربراہ مرزا بشیر الدین محمود نے کراچی میں ایک تقریر کے دوران ایک پان اسلامک سٹیٹ کے قیام کی زوردار وکالت کی۔

53۔ 22رستمبر 1950ء کو لندن کے اخبار ڈیلی ٹیلیگراف کی رپورٹ یہ تھی کہ اس وقت پاکستان کی حکومت، وہاں کے اخبارات اور تمام سیاستدان اشتراکیوں اور ان کے حامیوں کے خلاف پان اسلام ازم کی تبلیغ کر رہے ہیں اور دوسرے مسلم ممالک سے ثقافتی، تجارتی اور سفارتی تعلقات استوار کرنے پر زور دیا جا رہا ہے۔ پاکستان مسلم ممالک کے مؤثر اتحاد میں نمایاں حصہ لینے کی تمنا رکھتا ہے۔

54۔ 2را کتوبر 1950ء کو تہران میں دوسری انٹرنیشنل اسلامک اکنامک کانفرنس ہوئی۔ پاکستان کے وزیر خزانہ غلام محمد نے اس کانفرنس میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے مسلم ممالک کو مشورہ دیا کہ وہ معاشی و صنعتی ترقی کے لئے بین الاقوامی امداد سے فائدہ اٹھائیں۔

55۔ 25رنومبر 1950ء کو جب پاکستان کی پارلیمنٹ میں برطانوی فوجوں کے انخلا کے بارے میں اینگلو۔مصری تنازعہ پر بحث ہوئی تو وزیر اعظم لیاقت علی خان پان اسلام ازم یا اتحاد اسلامی کے بارے میں اپنی حکومت کے موقف کو بھول گیا۔ اس نے کہا کہ

''مصر سے برطانوی فوجوں کے اخراج کا مسئلہ مصر اور برطانیہ کا باہمی مسئلہ ہے اور حکومت پاکستان کا اس معاملہ سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔'' اسے برما اور کوریا کے معالات میں دلچسپی تھی لیکن مصر کے معاملہ میں اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

56۔ 6؍ستمبر 1950ء کو ایسوسی ایٹیڈ پریس نے یہ خبر دی کہ مختلف مسلم ممالک کے ممتاز عوامی لیڈروں نے مسلم پیپلز کانفرنس منعقد کرنے کے بارے میں چودھری خلیق الزماں کی تجویز سے اتفاق کرلیا ہے اس کانفرنس میں ان مسائل کو حل کرنے کے طریقوں پر بحث ہوگی جو آج کل اسلامی دنیا کو درپیش ہیں۔

57۔ 27؍دسمبر 1950ء کو رائٹر نے واشنگٹن سے اطلاع دی کہ امریکی وزارت خارجہ نے مشرق وسطیٰ کے سات ملکوں (جن میں مصر، عراق، شام اور سعودی عرب شامل ہیں) کے سفیروں کو مطلع کیا ہے کہ امریکہ نے سارے محاذوں پر کمیونزم کا سختی کے ساتھ مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر رکھا ہے۔

58۔ 11؍جنوری 1951ء کو وزیراعظم لیاقت علی خان نے لندن میں برطانیہ کے وزیر خارجہ ارنسٹ بیون سے ملاقات کی جس کے دوران مشرق وسطیٰ کے دفاع کا مسئلہ زیر بحث آیا۔

59۔ 13؍جنوری 1951ء کو چودھری خلیق الزماں نے مسلم ملکوں کی ایک ایسی مستحکم فیڈریشن کے قیام کی اہمیت پر زور دیا اور یہ بھی کہا کہ سارے مسلم ممالک کی ایک پیپلز آرگنائزیشن قائم کی جائے۔

60۔ 21؍جنوری 1951ء کو لاہور کے روزنامہ ''امروز'' میں مصر کے اخبار الاہرام کی یہ رپورٹ شائع ہوئی کہ لندن میں دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کی جو کانفرنس ہوئی ہے اس میں ایک عرب اسلامی بلاک بنانے کا مسئلہ پر بھی غور وخوض ہوا ہے۔

61۔ 9؍فروری 1951ء کو کراچی میں مؤتمر عالم اسلامی کی کانفرنس ہوئی جس میں وزیراعظم لیاقت علی خان نے اعلان کیا کہ پاکستان مسلم ممالک کے درمیان دوستی وتعاون کو فروغ دینے کے لئے ہر ممکن کوشش کرے گا۔ وزیر داخلہ خواجہ شہاب الدین کی تجویز یہ تھی کہ اتحاد اسلامی کو فروغ دینے کے لئے ایک پان اسلامک ریلوے لائن تعمیر کی جائے۔

62۔ 13رفروری 1951ء کو مؤتمر عالم اسلامی کانفرنس میں یہ قرارداد منظور ہوئی کہ اگر کسی ایک مسلم ملک کے خلاف جارحیت کا ارتکاب ہوا تو یہ جارحیت سارے مسلم ممالک کے خلاف تصور ہوگی۔

63۔ 27رفروری 1951ء کو لاہور کے روزنامہ امروز نے مصر کے اخبار ''الاہرام'' کی یہ خبر شائع کی کہ امریکہ اس بات پر آمادہ ہے کہ بحراوقیانوس کے سواحل سے لے کر پاکستان تک اسلامی بلاک قائم کرنے میں مدد دی جائے۔

64۔ 2راپریل 1951ء کو قاہرہ کے اخبار ''الاہرام'' نے یہ اطلاع دی کہ شاہ عبداللہ والئی شرق اردن ایک اسلامی بلاک تشکیل دینے کے لئے مسئلہ میں دلچسپی لے رہا ہے۔ شاہ عبداللہ نے اس سلسلے میں ترکی اور ایران کے ساتھ ابتدائی بات چیت بھی کر لی ہے۔

65۔ 20راپریل 1951ء کو روس کے اخبار پراودا کا اداریہ یہ تھا کہ امریکہ برطانیہ کے ساتھ اپنے فوجی اشتراک عمل سے فائدہ اٹھا کر مشرق وسطیٰ میں بڑی تیزی کے ساتھ وہ معاشی پوزیشن حاصل کر رہا ہے جو برطانیہ کو حاصل رہی ہے۔

66۔ 29رمئی 1951ء کو برطانوی نیوز ایجنسی نے یہ خبر دی کہ ترکی میں اب یہ جذبہ پیدا ہو رہا ہے کہ محض یونان سے اتحاد و تعاون اور اطلانٹک پیکٹ سے وابستگی کافی نہیں۔ ترکی کو مشرق وسطیٰ کے ملکوں سے بھی رابطہ کرنا چاہیے اور ان ممالک سے مل کر کمیونزم کے مقابلہ کے لئے ایک بلاک بنانا چاہیے۔ حکومت ترکی نے یہ تحریک مشرق وسطیٰ میں برطانوی فوج کے کمانڈر انچیف جنرل رابرٹس کی ترکی کے فوجی حکام سے بات چیت کے بعد کی تھی۔

67۔ 10رجون 1951ء کو پاکستان کے وزیر خارجہ ظفر اللہ خان نے ترکی کی اس تحریک پر یہ تبصرہ کیا کہ ایسی ساری تحریکوں کا خیر مقدم کرنا چاہیے جن کا مقصد یہ ہو کہ کسی علاقے کے ممالک قریبی روابط قائم کر کے اپنے مشترکہ مسائل کو نمٹائیں کیونکہ ایسی کاروائیوں کی حیثیت صحیح سمت میں اقدامات کی ہوگی۔

68۔ 14رجون 1951ء کو عرب لیگ کا سیکرٹری جنرل حکومت ترکی کی دعوت پر انقرہ گیا اور اس نے وہاں ترکی کے ارباب اقتدار سے مشرق وسطیٰ میں مجوزہ بلاک کے بارے میں

بات چیت کی۔ اس سے ایک دن پہلے برطانوی پارلیمنٹ کے 60 ارکان نے ایک تحریک کے ذریعے مطالبہ کیا تھا کہ مشرق وسطیٰ کے لئے دفاعی منصوبہ تیار کیا جائے۔

69۔ 7؍جولائی 1951ء کو وزیراعظم لیاقت علی خان نے کراچی کے ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''اگر مغربی جمہوریتیں اپنے طرز زندگی کے تحفظ کے لئے معاہدے کر سکتی ہیں، اگر کمیونسٹ ممالک اپنے نظریے کی بنیاد پر بلاک بنا سکتے ہیں تو مسلم عوام اپنے تحفظ کے لئے اکٹھے کیوں نہیں ہو سکتے...... اگر مسلم عوام کی جانب سے اپنی آزادی کے تحفظ کے لئے اور اپنی طاقت میں اضافہ کے لئے اتحاد کی کوئی تحریک ہوئی تو پاکستان صدق دل سے اس تحریک میں شامل ہو کر اپنا کردار ادا کرے گا۔''

70۔ 7؍اگست 1951ء کو سعودی عرب کا وزیر خارجہ امیر فیصل لندن پہنچا اور وہاں اس نے برطانوی حکام سے خفیہ بات چیت کی۔

71۔ 22؍اگست 1951ء کو لندن کے باخبر سیاسی حلقوں نے خیال ظاہر کیا کہ امریکہ مشرق وسطیٰ کے دفاع کی ذمہ داری میں برطانیہ کے ساتھ شریک ہونے پر آمادہ ہو گیا ہے کیونکہ اب اسے یہ احساس ہو گیا ہے کہ نہر سویز کا علاقہ افریقہ اور ایشیا کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتا ہے اور یہاں سے مشرق وسطیٰ کے تیل کے ذخائر اور مشرق بعید کی طرف جانے والی شاہراہ کا بہترین تحفظ ہو سکتا ہے۔

72۔ 12؍ستمبر 1951ء کو پاکستانی اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ دمشق میں 3؍نومبر 1951ء کو جو تیسری انٹرنیشنل اسلامک اکنامک کانفرنس ہو رہی ہے وہ بہت اہم ہے کیونکہ شام نے یہ تحریک کر رکھی ہے کہ سارے مسلم ممالک کو دفاعی معاہدہ کرنا چاہیے۔

73۔ 20؍ستمبر 1951ء کو اٹاوہ میں اطلانٹک کانفرنس ہوئی تو یہ اعلان ہوا کہ وزرائے خارجہ نے ترکی اور یونان کی اس پیکٹ میں شمولیت کی منظوری دے دی ہے اور اب اس پیکٹ کے رکن ممالک مڈل ایسٹرن کمانڈ کی تشکیل کے منصوبہ پر غور کریں گے۔ تجویز یہ تھی کہ اس فوجی تنظیم میں ترکی، مصر، عراق، شام، سعودی عرب، اردن، لبنان اور اسرائیل شامل ہوں گے۔

74۔ 4؍اکتوبر 1951ء کو لاہور کے روزنامہ امروز نے قاہرہ میں پاکستانی سفارت خانے

کی بابت سے جاری کردہ یہ اپیل شائع کی کہ ''عرب ممالک کو معمولی معمولی اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر اپنے مطمع نظر کو وسیع تر کرنا چاہیے اوران غیر عرب ممالک کو اپنے مذاکرات میں شامل کرنا چاہیے جن کے عرب ممالک کے ساتھ نہ ٹوٹنے والے روحانی تعلقات ہیں۔'' مگر حکومت پاکستان کی اس سرکاری اپیل کا شام کے سوا عرب لیگ کے دوسرے رکن ممالک پر کوئی اثر نہ ہوا۔

75۔ 13راکتوبر 1951ء کو فرانس، ترکی، برطانیہ اور امریکہ نے مصر کو الائیڈ مڈل ایسٹ ڈیفنس کمانڈ کا منصوبہ پیش کر دیا۔ اس منصوبے میں یہ بتایا گیا تھا کہ برطانیہ کے نہر سویز کے علاقے میں جو فوجی اڈے ہیں وہ اس نئی فوجی تنظیم کو منتقل ہو جائیں گے۔

76۔ 15راکتوبر 1951ء کو مصر کے نمائندگان کے دونوں ایوانوں نے 1936ء کے اینگلو۔مصری معاہدے کی تنسیخ کے بل کی متفقہ طور پر منظوری دے دی۔

77۔ 16راکتوبر 1951ء کو وزیر اعظم لیاقت علی خان کو راولپنڈی میں قتل کر دیا گیا۔

پاکستان کے ارباب اقتدار کی جانب سے اسلامی متحدہ محاذ یا اسلامی بلاک یا اسلامی فیڈریشن یا اسلامستان یا اتحاد اسلامی یا پان اسلام ازم کی تحریکوں کی طویل داستان کے اس خلاصے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ تحریکیں اس لئے نہیں کی گئی تھیں کہ وزیر اعظم لیاقت علی خان اور اس کے رفقا محض اسلام دوستی کے جذبے کے تحت عالم اسلام کو سیاسی، معاشی، معاشرتی، ثقافتی اور فوجی لحاظ سے متحد کر کے پوری دنیا میں اسلام کا بول بالا کرنے کے متمنی تھے اور نہ ہی محض اس لئے کی گئی تھیں کہ وہ پاکستان کو عالم اسلام سے منسلک کر کے وطن عزیز کو ہندوستانی توسیع پسندوں کے دستبرد سے محفوظ کرنا چاہتے تھے بلکہ انہوں نے یہ تحریکیں اس لئے کی تھیں کہ پہلے برطانیہ اور پھر امریکہ و برطانیہ دونوں ہی اسلام کے نام پر مشرق وسطیٰ میں سوویت مخالف بلاک بنانے کے خواہاں تھے۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ مشرق وسطیٰ میں قوم پرست تحریکیں ان کے سامراجی مفادات کو کوئی خطرہ لاحق نہ کریں۔ چونکہ پاکستان کے حکمران اپنے طبقاتی مفادات کی وجہ سے روایتاً مغربی سامراج کے وفادار تھے، اس لئے انہوں نے پان اسلام ازم کے بے شمار نعرے لگا کر برطانیہ اور امریکہ کے اس منصوبے کی تکمیل میں مدد کرنے کی حتی الامکان کوشش کی مگر انہیں کامیابی اس لئے نہ ہوئی کہ انہوں نے بھی برطانیہ اور امریکہ کے حکمرانوں کی طرح مشرق وسطیٰ

میں سیکولر قوم پرستی کی تحریکوں کی قوت کا اور عربوں اور عجمیوں کے تاریخی تضاد کی شدت کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ تاہم انہیں اندرون ملک اتحاد اسلامی کے ان دلکش نعروں سے خاصا سیاسی فائدہ ہوا۔ پاکستان، بالخصوص پنجاب کا درمیانہ طبقہ ان نعروں سے بہت متاثر ہوا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس طبقہ کا خیال تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جو قومی تضاد ہے وہ اسلامی اتحاد کے ذریعے پاکستان کے حق میں حل ہو جائے گا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اٹھارہویں صدی میں مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد برصغیر میں ہر طبقہ کے مسلمان، سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی لحاظ سے بہت ذلیل ہو گئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد ان مسلمانوں کا درمیانہ طبقہ عالم اسلام کے ساتھ اتحاد کر کے ہندوستانی مسلمانوں کی دوسو سالہ ذلت کا ازالہ کرنا چاہتا تھا۔ یہ طبقہ بحیثیت مجموعی بہت قدامت پرست تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ پان اسلام ازم کے ذریعے نہ صرف برصغیر میں بلکہ پوری دنیا میں مسلمانوں کی عظمت کو بحال کیا جا سکتا ہے۔ اٹھارہویں صدی اور انیسویں صدی میں شاہ ولی اللہ اور جمال الدین افغانی کی تحریکوں کا بیسویں صدی کے پہلے اور دوسرے عشرے میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی جوہر وغیرہ کی ادبی، صحافتی، سیاسی اور مذہبی قیادت کا اور تیسرے اور چوتھے عشرے میں علامہ سر محمد اقبال کی ولولہ انگیز شاعری کا پیغام یہی تھا۔ باوجودیکہ برصغیر اور مشرق وسطیٰ میں پان اسلام ازم کی تحریک کی تاریخ برطانیہ، جرمنی، فرانس، روس اور دوسری مغربی طاقتوں کی سامراجی سازشوں سے خالی نہیں تھی اور اس تحریک سے سلطنت عثمانیہ کے سلطان اور دوسرے مسلم ممالک کے فرمانرواؤں، شیوخ، نوابوں اور جاگیرداروں کے مفادات وابستہ رہے تھے۔

باب: 1 پاکستان بنتے ہی پاکستانی رہنماؤں کا روس کے خلاف اور اینگلو امریکی سامراج کے مفاد میں اسلامی بلاک کی تشکیل کا نعرہ

1۔ محمد ظفر اللہ خان، سر۔ تحدیث نعمت۔ ڈھاکہ۔ 1971ء۔ ص 489

2- R. Palme Dutt, *The Crisis of Britain and The British Empire*, London, 1957, p.36

3۔ جمال الدین افغانی۔ ردنیچریت۔ مکتبہ شعر و ادب لاہور۔ (n-d) ص ص 55۔152، 175

4۔ ابوالاعلیٰ مودودی۔ اسلام اور جدید معاشی نظریات۔ لاہور۔ 1963ء۔ ص 69

5- *The Eastern Times*, September 3, 1947

6- *The Pakistan Times*, September 5, 1947

7۔ نوائے وقت۔ 17 ستمبر 1947ء

8- *The Eastern Times*, September 18, 1947

9- *Ibid*; September 24, 1947

10- *Ibid*; October 2, 1947

11- *Ibid*; September 30, 1947

12۔ محمد ظفر اللہ خان۔ محولہ بالا۔ ص ص 25۔524

13۔ اسلامی مملکتوں کے پاکستان سے تعلقات، ایک جائزہ۔ وزارت امور خارجہ، حکومت پاکستان، اسلام آباد 1977ء ص ص 6-5

14- Chaudhry Mohammad Ali, *The Emergence of Pakistan*, Lahore, 1973, p.132

15- Quoted in G.W.Choudhry *Pakistan's Relations with India (1947-1966)*, London, 1968, pp. 40-41

16- Margaret Bourke-White, *Halfway to Freedom,* NewYork 1949 p.49

17۔ نوائے وقت۔26/اکتوبر1947ء

18- *The Pakistan Times*, October 30, 1947

19- *Ibid*; November 2, 1947

20۔ نوائے وقت۔3/نومبر1947ء

21۔ ایضاً۔5/نومبر1947ء

22- *The Eastern Times*, November 22, 1947

23۔ نوائے وقت۔26/اکتوبر1947ء

24- *The Pakistan Times*, November 21, 1947

25- *Ibid*; November 23, 1947

26۔ نوائے وقت۔20/نومبر1947ء

27۔ ایضاً۔27/نومبر1947ء

28- *The Eastern Times*, November 5, 1947

29۔ نوائے وقت۔24/نومبر1947ء

30- *The Eastern Times*, November 27, 1947

31- *The Pakistan Times*, November 28, 1947

32۔ نوائے وقت۔4/دسمبر1947ء

33۔ ایضاً۔11/دسمبر1947ء

34- *The Pakistan Times*, December 20, 1947

35۔ نوائے وقت۔3/جنوری1948ء

36۔ ایضاً۔4/دسمبر1947ء

37۔ ایضاً۔5/دسمبر 1947ء

38۔ ایضاً۔6/دسمبر 1947ء

39۔ ایضاً۔18/مارچ 1948ء

40۔ ایضاً۔یکم اپریل 1948ء

41- *The Constituent Assembly (Legislature) of Pakistan Debates (28th February) Vol 1, 1948*, Karachi. 1948, p.34

42- *Dawn*, March 12, 1948

43۔ انقلاب۔یکم اپریل 1948ء

44۔ نوائے وقت۔7/اپریل 1948ء

45۔ انقلاب۔18/اپریل 1948ء

46۔ ایضاً۔25/اپریل 1948ء

47۔ ایضاً۔30/اپریل 1948ء

48۔ ایضاً۔22/مئی 1948ء

49- *Dawn*, May 15, 1948

50- *Ibid*; May 20, 1948

51۔ انقلاب۔5/جون 1948ء

52۔ نوائے وقت۔27/جون 1948ء

53۔ ایضاً۔3/جولائی 1948ء

54۔ امروز۔12/جولائی 1948ء

55۔ ایضاً۔29/جولائی 1948ء

56۔ ایضاً۔30/جولائی 1948ء

57۔ ایضاً۔29/مئی 1948ء

58- *Dawn*, August 6, 1948

59- *Ibid*; August 7, 1948

60- *Ibid*; August 7, 1948

61- *Ibid*; August 10, 1948

62- *Ibid*; August 14, 1948

63- *Ibid*; August 15, 1948

64- *Ibid*; August 18, 1948

65- *Ibid*; August 28. 1948

66۔ نوائے وقت۔2/ستمبر 1948ء

67۔ انقلاب۔4/ستمبر 1948ء

68- *Dawn*, September 11, 1948

69- *The Paksitan Times*, September 11, 1948

باب:2 لیاقت علی کا دورہ برطانیہ اور سوویت یونین کے خلاف ہر قسم کے اسلامی وغیر اسلامی بلاک بنانے کے سلسلے میں تعاون کی یقین دہانی

1- *Dawn*, September 23, 1948

2۔ نوائے وقت۔24/ستمبر 1948ء

3- *Dawn*, October 1, 1948

4- *The Paksitan Times*, October 5, 1948

5- *Dawn*, October 5, 1948

6۔ امروز۔6/اکتوبر 1948ء

7۔ نوائے وقت۔7/اکتوبر 1948ء

8- *Dawn*, October 10, 1948

9۔ امروز۔ 12/اکتوبر 1948ء

10- *Dawn*, October 10, 1948

11- *Ibid*; October 12, 1948

12- *The Pakistan Times*, October 16, 1948

13- *Dawn*, October 16, 1948

14۔ امروز۔21/اکتوبر 1948ء

15- *The Pakistan Times*, October 24, 1948

16۔ امروز۔24/اکتوبر 1948ء

17- *Dawn*, October 27, 1948

18۔ امروز۔20/اکتوبر 1948ء

19۔ نوائے وقت۔30/اکتوبر 1948ء

20۔ امروز۔3/نومبر 1948ء

21- *The Pakistan Times*, November 4, 1948

22۔ نوائے وقت۔7/نومبر 1948ء

23۔ ایضاً۔8/نومبر 1948ء

24- *The Pakistan Times*, November 6, 1948

25- *Ibid*; November 9, 1948

26۔ امروز۔14/نومبر 1948ء

27۔ نوائے وقت۔12/نومبر 1948ء

28۔ ایضاً۔24/نومبر 1948ء

29- *The Pakistan Times*, November 16, 1948

30۔ نوائے وقت۔22/نومبر 1948ء

31- *The Pakistan Times,* December 1, 1948

32۔ نوائے وقت۔3/دسمبر 1948ء

33- *The Pakistan Times*, December 15, 1948

34- *Ibid*; December 15, 1948

35۔ نوائے وقت۔18/دسمبر 1948ء

36۔ ایضاً۔25/دسمبر 1948ء

37۔ ایضاً۔25/دسمبر 1948ء

38- *The Pakistan Times*, December 27, 1948

39۔ نوائے وقت۔یکم جنوری 1949ء

40۔ امروز۔4/جنوری 1949ء

41۔ نوائے وقت۔5/جنوری 1949ء

42۔ ایضاً۔8/جنوری 1949ء

باب:3 ورلڈ اسلامک کانفرنس اور سوویت مخالف مغرب نواز اسلامی بلاک کی تشکیل کے لئے سرگرمیاں

1- *Dawn*, January 7, 1949

2- *Ibid*; January 8, 1949

3- *Ibid*; January 8, 1949

4- *Ibid*; January 11, 1949

5- *Ibid*; January 12, 1949

6- *Ibid*; January 4, 1949

7۔ نوائے وقت۔17/جنوری 1949ء

8۔ ایضاً۔11/جنوری1949ء

9- *Dawn*, January 18, 1949

10- S.M. Burke, *Mainsprings of Indian And Pakistani Foreign Policies*, Karachi, Lahore,1975, pp.126-27

11- *Dawn*, January 13, 1949

12- Sisir Gupta, *India And Regional Integeration In Asia*, Bombay, 1967, p.42

13- *Dawn*, January 16, 1949

14۔ امروز۔25/جنوری 1949ء

15- *Dawn*, January 24, 1949

16- *Ibid*; January 28, 1949

17- *Ibid*; January 27, 1949

18۔ نوائے وقت۔28/جنوری 1949ء

19۔ امروز۔یکم فروری 1949ء

20- *Dawn*, February 1, 1949

21- *Ibid*; February 6, 1949

22- *Ibid*; February 9, 1949

23۔ امروز۔7/جنوری 1949ء

24- *The Pakistan Times*, February 18, 1949

25- *Dawn*, February 19, 1949

26- *The Pakistan Times*, February 22, 1949

27- *Dawn*, February 19, 1949

28- *Ibid*; February 24, 1949

29- *Ibid*; February 25, 1949

30- *Ibid*; December 1, 1948

31- *Ibid;* February 7, 1949

32- *The Pakistan Times*, February 24, 1949

33- *Dawn*, March 5, 1949

34- *The Pakistan Times*, March 5, 1949

35۔ نوائے وقت۔9/مارچ 1949ء

36- *Dawn*, March 10, 1949

37- *Ibid*; March 11, 1949

38- *Ibid*; March 7, 1949

39- *Ibid*; March 13, 1949

40۔ نوائے وقت۔19/مارچ 1949ء

41- *Dawn*, March 18, 1949

42- *The Pakistan Times*, March 19, 1949

43- *Ibid*; March 19, 1949

44- *Ibid*; March 18, 1949

45۔ نوائے وقت۔21/مارچ1949ء

46- *Dawn*, March 24, 1949

47- *Ibid*; April 2, 1949

48۔ نوائے وقت۔20/مارچ 1949ء

49۔ ایضاً۔21/مارچ 1949ء

50۔ ایضاً۔25/مارچ 1949ء

51۔ ایضاً۔21/مارچ 1949ء

52۔ ایضاً۔27/مارچ 1949ء

53- *Dawn*, February 27, 1949

54- *Ibid*; March 10, 1949

55- *The Pakistan Times*, March 11, 1949

56۔ امروز۔15/مارچ 1949ء

57- *Dawn*, February 20, 1949

58- *Ibid*; February 20, 1949

59- *The Pakistan Times*, March 19, 1949

60- *Ibid*; March 24, 1949

61- *Ibid*; March 27, 1949

62- *Dawn*, March 15, 1949

63- *Ibid*; March 23, 1949

64- *Ibid*; March 27, 1949

65- *The Pakistan Times*, March 29, 1949

66۔ نوائے وقت۔3/اپریل 1949ء

67۔ ایضاً۔3/اپریل 1949ء

68- *Dawn*, April 3, 1949

باب:4 لیاقت کا دورہ برطانیہ ومشرق وسطیٰ......اینگلوامریکی سامراج کے حق میں اسلامی بلاک وضع کرنے کی ابتدائی کوشش

1- *Dawn*, April 6, 1949

2۔ نوائے وقت۔7/اپریل 1949ء

3۔ امروز۔5/اپریل 1949ء

4- *Dawn*, April 8, 1949

5۔ نوائے وقت۔9/اپریل 1949ء

6۔ ایضاً۔14/اپریل 1949ء

7- *Dawn*, April 30, 1949

8- *Ibid*; May 3, 1949

9- *Ibid*; May 7, 1949

10- *Ibid*; May 8, 1949

11- *Ibid*; May 9, 1949

12۔ نوائے وقت۔11/مئی 1949ء

13- *Dawn*, May 11, 1949

14- *Ibid*, May 12, 1949

15۔ نوائے وقت۔14/مئی 1949ء

16- *Dawn*, May 13, 1949

17- *Ibid*; May 14, 1949

18۔ نوائے وقت۔18/مئی 1947ء

19- *Dawn*, May 15, 1949

20- *Ibid*; May 16, 1949

21- *Ibid*; May 15, 1949

22- *The Pakistan Times*, May 18, 1949

23- *Dawn*, May 22, 1949

24- *The Pakistan Times*, May 19, 1949

25- *Ibid*; May 18, 1949

26- *Dawn*, May 20, 1949

27۔ نوائے وقت۔25/مئی 1949ء

28۔ ایضاً۔21/مئی 1949ء

29۔ ایضاً۔6/اپریل 1949ء

30- *The Pakistan Times*, May 20, 1949

31- *Dawn*, May 22, 1949

32۔ امروز۔25/مئی 1949ء

33- *Dawn*, May 25, 1949

34- *Ibid*; May 26, 1949

35- *Ibid*; May 26, 1949

36- *Ibid*; May 27, 1949

37- *The Pakistan times*, May 27, 1949

38۔ امروز۔28/مئی 1949ء

39- (i) *Dawn*, May 31, 1949

(ii) *The Pakistan Time*, June 1, 1949

40- *Dawn*, May 31, 1949

41- *The Pakistan Times*, June 2, 1949

42۔ امروز۔3/جون 1949ء

43۔ نوائے وقت۔4/جون 1949ء

44- *Dawn*, June 3, 1949

45۔ نوائے وقت۔4/جون 1949ء

باب:5 لیاقت نے دورہ سوویت یونین کی دعوت قبول کرنے کا ڈھونگ، محض اینگلو امریکی سامراج کی زیادہ توجہ لینے کی خاطر رچایا

1- S.M. Burke, *Pakistan's Foreign Policy*, Karachi, 1973, p.97

2- *Dawn*, May 7, 1948

3- *Ibid*; June 9, 1949

4- G.W. Choudhry, *India, Pakistan, Bangladesh and the Major Powers*, London, 1975, pp.10 and 13

5- S.M. Burke, *op.cit*; p.99

6۔ نوائے وقت۔ 11/جون 1949ء

7- *Dawn*, June 8, 1949

8- *Ibid*; June 9, 1949

9- *The Pakistan Times*, June11, 1949

10- *Dawn*, June 13, 1949

11- *The Pakistan Times*, June 19, 1949

12۔ امروز۔ 2/جولائی 1949ء

13- S.M. Burke, *The Mainsprings op.cit*; pp.130,139

14- *The Pakistan Times*, June 23, 1949

15- *The Civil And Military Gazette*, June 24, 1949

16- *Dawn*, July 2, 1949

17۔ امروز۔ 26/جون 1949ء

18۔ نوائے وقت۔ 26/جون 1949ء

19۔ نوائے وقت۔ 29/جون 1949ء، یکم جولائی 1949ء

20- S.M. Burke, *The Mainsprings, op.cit*; p.131

21۔ امروز۔ 3/جولائی 1949ء

22- *Dawn*, February 24, 1949

23- *Ibid*; July 16, 1949

24- *The Pakistan Times*, July 17, 1949

25۔ نوائے وقت۔17/جولائی1949ء

26- *Dawn*, July 28, 1949

27- *The NewYork Times*, March 27 and July 24, 1949

28- *The Pakiatan Times*, August 2, 1949

29- *Ibid*; August 2, 1949

30۔ امروز۔6/اگست 1949ء

31۔ ایضاً۔3/اگست 1949ء

32- *Dawn*, August 3, 1949

33۔ امروز۔3/اگست 1949ء

34۔ ایضاً۔8/اگست 1949ء

35- *The Civil And Military Gazette*; August 10, 1949

36- *Ibid*; August 11, 1949

37- *Dawn*, August 19, 1949

38۔ امروز۔ 11/اگست 1949ء

39۔ نوائے وقت۔19/اگست 1949ء

40۔ ایضاً۔19/اگست 1949ء

41۔ 19/اگست 1949ء

باب:6 خلیق الزماں کا دورہ مشرق وسطیٰ برائے ''اسلامستان''

برطانوی سازش کا بھانڈا جو لندن کے چوراہے میں پھوٹا

1- *Dawn*, August 18, 1949

2- *Ibid*; August 18, 1949

3- *Ibid*; August 20, 1949

4- *Ibid*, August 21, 1949

5۔ نوائے وقت۔22/اگست 1949ء

6- *Dawn*, August 23, 1949

7۔ امروز۔23/اگست 1949ء

8۔ ایضاً۔29/اگست 1949ء

9۔ ایضاً۔29/اگست 1949ء

10- *Dawn*, September 2, 1949

11- *Ibid*; September 5, 1949

12۔ نوائے وقت۔27/اگست 1949ء

13۔ امروز۔یکم ستمبر 1949ء

14۔ ایضاً۔11/ستمبر 1949ء

15۔ ایضاً۔14/ستمبر 1949ء

16- *Dawn*, October 4, 1949

17۔ امروز۔16/ستمبر 1949ء

18- *Dawn*, September 25, 1949

19- G.W. Chaudhry, *op.cit*; p.12

20- *Ibid*; p.13

21- *Ibid*; p.14

22۔ امروز۔ 22/ستمبر 1949ء

23- *Dawn*, October 11, 1949

24- *The Pakistan Times*, September 29, 1949

25۔ نوائے وقت۔2/اکتوبر 1949ء

26۔ ایضاً۔4/اکتوبر 1949ء

27۔ ایضاً۔19/اکتوبر 1949ء

28- *The Pakistan Times*, October 21, 1949

29۔ نوائے وقت۔19/اکتوبر 1949ء

30- *Dawn*, October 28, 1949

31- *Ibid*; October 30, 1949

32۔ نوائے وقت۔30/اکتوبر 1949ء

33- *Dawn*, October 31, 1949

34۔ امروز۔یکم نومبر 1949ء

35- *The Pakistan Times*, November 1, 1949

36۔ نوائے وقت۔5/نومبر 1949ء

37- *Dawn*, November 4, 1949

38- *Ibid*; November 7, 1949

39- *Ibid*; November 9, 1949

40- *Ibid*; November 10, 1949

41- *Ibid*; November 15, 1949

42۔ امروز۔17/نومبر 1949ء

43- *The Pakistan Times*, November 19, 1949

44۔ امروز۔2/نومبر 1949ء

45۔ نوائے وقت۔11/نومبر 1949ء

46- *The Pakistan Times*, October 1, 1949

47۔ امروز۔8/نومبر 1949ء

48- *Dawn*, November 5, 1949

49- *Ibid*; November 6, 1949

50- *Ibid*; November 9, 1949

51- *Ibid*; November 12, 1949

52۔ نوائے وقت۔13/نومبر 1949ء

53- *Dawn*, November 16, 1949

54- *Ibid*; November 22, 1949

باب:7 اسلام کے نام پر سوویت مخالف، سامراج نواز محاذ کے قیام کا منصوبہ عرب وعجم میں اثر پذیر نہ ہوسکا

1- *The Civil And Military Gazette*, November 25, 1949

2- *Ibid*; December 4, 1949

3- S.M. Burke, *The Foreign Policy, op.cit*; p.100

4- *Dawn*, November 27, 1949

5- *Ibid*; November 27, 1949

6- *The Civil And Military Gazette*, November 26, 1949

7۔ امروز۔4/دسمبر 1949ء

8- *The Civil And Military Gazette*, December 3, 1949

9- *The Pakistan Times*, December 3, 1949

10- *The Civil And Military Gazette*, December 6 and 7, 1949

11۔ نوائے وقت۔10/دسمبر 1949ء

12۔ ایضاً۔11/دسمبر 1949ء

13- *The Civil And Military Gazette*, December 7, 1949

14- *Ibid*; December 6, 1949

15۔ امروز۔10/دسمبر 1949ء

16- *The Civil And Military Gazette*, December 11, 1949

17۔ نوائے وقت۔16/دسمبر 1949ء

18- *The Civil And Military Gazette*, November 30, 1949

19- *Ibid*; December 8, 1949

20- *Ibid*, December 10, 1949

21- *Ibid*; December 11, 1949

22- *Ibid*; December 13, 1949

23- *Ibid*; December 14, 1949

24- *Ibid*; December 14, 1949

25۔ امروز۔11/جنوری 1949ء

26- *Dawn*, January 22, 1950

27۔ نوائے وقت۔25/جنوری 1950ء

28- *The Pakistan Times*, January 26, 1950

29- *Ibid*; January 28, 1950

30- *Dawn*, February 3, 1950

31- *Ibid*; February 3, 1950

32- *The Pakistan Times*, February 8, 1950

33- *Dawn*, February 9, 1950

34- *Ibid*; February 7, 1950

35- *Ibid*; February 17, 1950

36- *Ibid*; February 19, 1950

37- *Ibid*; February 19, 1950

38- *The Pakistan Times*, March 5, 1950

39- *Dawn*, February 17, 1950

40- *Ibid*; March 1, 1950

41- *The Pakistan Times*, February 24, 1950

42- (i) *The Pakistan Times*, March 16, 1950

(ii) *Dawn*, March 16, 1950

43- *Dawn*, March 25, 1950

44- *The Pakistan Times*, March 5, 1950

45۔ امروز۔25/نومبر 1949ء

46۔ نوائے وقت۔21/جنوری 1950ء

47- *The Pakistan Times*, February 11, 1950

48- *Ibid*; February 22, 1950

49۔ امروز۔4/مارچ 1950ء

50- *Dawn*, March 5, 1950

51- *Ibid*; March 8, 1950

52- *Ibid*; March 17, 1950

53- *The Pakistan Times*, March 21, 1950

54۔ امروز۔19/مارچ 1950ء

55۔ ایضاً۔26/مارچ 1950ء

56۔ نوائے وقت۔27/مارچ 1950ء

57۔ امروز۔یکم اپریل 1950ء

58۔ ایضاً۔5/اپریل 1950ء

59- *Dawn*, April 10, 1950

60- *The Pakistan Times*, April 6, 1950

61۔ نوائے وقت۔11/اپریل 1950ء

62- *Dawn*,April 10, 1950

63۔ نوائے وقت۔12/اپریل 1950ء

64۔ ایضاً۔17/اپریل 1950ء

65۔ ایضاً۔20/اپریل 1950ء

66۔ ایضاً۔یکم مئی 1950ء

باب:8 لیاقت کا دورہ امریکہ اور جنگ کوریا میں اس کا امریکی پٹھو کا کردار

1- *Dawn*, May 5, 1950

2- *Speeches And Statements of Quaid-i-Millat Liaqat Ali Khan (1941-51*), Rafiq Afzal M.(Ed), Lahore,1975, pp.366-67

3- *Ibid*; pp. 369-71, 373

4- S.M., Burke, *Foreign Policy, op.cit*; p.125

5- *The Pakistan Times*, May 6, 1950

6- *Dawn*, May 21, 1950

7- S.M. Burke, *op.cit*; pp.123-24

8- Liaqat Ali Khan, *Speeches, op.cit*; p.411

9- *Dawn*, May 25, 1950

10- *The Pakistan Times*, May 12, 1950

11- *Dawn*, June 3, 1950

12- *The Pakistan Times*, June 1and3, 1950

13- *Dawn*, June 28, 1950

14- *The Pakistan Times*, June 30, 1950

15- *Ibid*; July 1, 1950

16- *Dawn*, July 2, 1950

17- *The Pakistan Times*, July 2, 1950

18- *Dawn*, July 4, 1950

19- *Ibid*; July 4, 1950

20- Quoted in S.M. Burke, *op.cit*; p.128

21۔ نوائے وقت۔6/جولائی1950ء

22- *Dawn*, July 4, 1950

23- *Ibid*; July 8, 1950

24- M. Aslam Qureshi, *Anglo Pakistan Relations, 1947-76*, Lahore,1976, p.168

25- *Dawn*, July 14, 1950

26۔ نوائے وقت۔10/جولائی1950ء

27- *The Pakistan Times*, July 16, 1950

28۔ نوائے وقت۔13/جولائی1950ء

29۔ ایضاً۔18/جولائی1950ء

30- *Dawn*, July 16, 1950

31- Liaqat Ali Khan, *Speeches, op.cit*; pp.430-31

32- *Dawn*, July 26, 1950

33۔ نوائے وقت۔3/اگست1950ء

34- S.M. Burke, *op.cit*; p.55

35۔ نوائے وقت۔27/اپریل1950ء

36- *The Pakistan Times*, April 30, 1950

37- *The Civil And Military Gazette*, July 12, 1950

38۔ نوائے وقت۔14/جولائی1950ء

39۔ ایضاً۔یکم مئی1950ء

40۔ ایضاً۔4/مئی1950ء

41۔ ایضاً۔7/مئی1950ء

42- *The Pakistan Times*, May 25, 1950

43۔ نوائے وقت۔29/مئی1950ء

44۔ ایضاً۔5/جون1950ء

45- *Dawn*, June 3, 1950

46۔ نوائے وقت۔19/جون1950ء

47- *The Pakistan Times*, May 25, 1950

48۔ نوائے وقت۔21/جون1950ء

49۔ ایضاً۔31/جولائی1950ء

50- *The Pakistan Times*, August 6, 1950

51- *Dawn*, August 10, 1950

52- *Ibid*; August 14, 1950

53- *Ibid*; August 7, 1950

54- *The Pakistan Times*, August 13, 1950

55- *Dawn*, August 14, 1950

56- *Dawn and The Pakistan Times*, August 24, 1950

57۔ امروز۔2/ستمبر1950ء

58- *The Pakistan Times*, September 13, 1950

باب:9 مسئلہ نہر سویز اور لیاقت علی کی برطانیہ نواز پالیسی، کمیونزم کے خلاف مذہب کے استعمال میں اضافہ

1- *The Civil And Military Gazette*, August 31, 1950

2۔ نوائے وقت۔2ر ستمبر 1950ء

3۔ نوائے وقت۔10ر ستمبر 1950ء

4- *Dawn*, September 13, 1950

5۔ امروز۔9ر ستمبر 1950ء

6۔ نوائے وقت۔24ر ستمبر 1950ء

7۔ امروز۔4ر اکتوبر 1950ء

8- *The Civil And Military Gazette*, October 6, 1950

9- *Dawn*, October 7, 1950

10- *Ibid*; October 12, 1950

11- *Ibid*; October 15, 1950

12۔ نوائے وقت۔ 15ر نومبر 1950ء

13- *Dawn*, November 17, 1950

14۔ نوائے وقت۔ 19ر نومبر 1950ء

15۔ امروز۔22ر نومبر 1950ء

16۔ نوائے وقت۔23ر نومبر 1950ء

17۔ ایضاً۔24ر نومبر 1950ء

18- *Dawn*, November 23, 1950

19۔ نوائے وقت۔25ر نومبر 1950ء

20- *The Pakistan Times*, November 25, 1950

21۔ نوائے وقت۔27/ نومبر1950ء

22۔ ایضاً۔29/ نومبر1950ء

23۔ امروز۔یکم دسمبر1950ء

24۔ نوائے وقت۔14/ دسمبر1950ء

25۔ ایضاً۔18/ دسمبر1950ء

26- *Dawn*, December 3, 1950

27- *Ibid*; December 13, 1950

28۔ نوائے وقت۔5/ نومبر1950ء

29- *Time*,October 30, 1950

30- *The Civil And Military Gazette*, November 7, 1950

31- *Ibid*; October 16, 1950

32۔ امروز۔8/ نومبر1950ء

33- *The Civil And Military Gazette*, November 9, 1950

34- *Dawn*, November 12, 1950

35- *Ibid*; November 13, 1950

36۔ امروز۔14/ نومبر1950ء

37- *Dawn*, November 17, 1950

38۔ امروز۔24/ نومبر1950ء

39- *Dawn*, December 7, 1950

40- *Ibid*; December 3, 1950

41- *Ibid*; December 8, 1950

42- *Ibid*; December 13, 1950

43- *Ibid*; December 21, 1950

44- *The Civil And Military Gazette*, December 22, 1950

45- *Dawn*, December 27 and 29, 1950

46۔ نوائے وقت۔29/دسمبر1950ء

47- *The Civil And Military Gazette*, December 24, 1950

48- *Dawn*, December 28, 1950

49- *Ibid*; December 30, 1950

باب:10 لیاقت کی سامراج نواز خارجہ پالیسی اور ملک میں اسلام فروشی کا کاروبار

1- *Dawn*, December 18, 1950

2- *Ibid*; December 21, 1950

3- *The Pakistan Times*, December 28, 1950

4- *Ibid*; December 29, 1950

5۔ نوائے وقت۔2/جنوری1951ء

6۔ ایضاً۔3/جنوری1951ء

7۔ ایضاً۔5/جنوری1951ء

8۔ ایضاً۔6/جنوری1951ء

9۔ ایضاً۔7/جنوری1951ء

10۔ ایضاً۔7/جنوری1951ء

11۔ ایضاً۔8/جنوری1951ء

12۔ ایضاً۔10/جنوری1951ء

13۔ ایضاً۔3/جنوری1951ء

14- *Dawn*, January 6, 1951

15۔ نوائے وقت۔8/جنوری1951ء

16- *The Pakistan Times*, January 10, 1951

17- *Dawn*, January 7, 1951

18۔ نوائے وقت۔13/جنوری1951ء

19- *Dawn*, January 9, 1951

20- *Ibid*; January 12, 1951

21۔ امروز۔13/جنوری1951ء

22۔ نوائے وقت۔14/جنوری1951ء

23- *The Pakistan Times,* January 15, 1951

24۔ نوائے وقت۔18/جنوری1951ء

25- *Dawn*, January 23, 1951

26- *Ibid*; January 15, 1951

27- *Ibid*; January 19, 1951

28- *Ibid*; January 23, 1951

29- *The Pakistan Times*, January 19, 1951

30۔ امروز۔21/جنوری1951ء

31۔ ایضاً۔14/جنوری1951ء

32۔ ایضاً۔21/جنوری1951ء

33- *Dawn*, January 28, 1951

34- *Ibid*; January 21, 1951

35- *Ibid*; January 23, 1951

36۔ نوائے وقت۔26/جنوری1951ء

37۔ ایضاً۔27/جنوری1951ء

37- *Dawn*, January 26, 1951

38- *Ibid*; January 27, 1951

39۔ نوائے وقت31/جنوری1951ء

40۔ امروز۔3/فروری1951ء

40- *Dawn*, January 31, 1951

41- *The Pakistan Times*, February 3, 1951.

42- *Ibid*; February 7, 1951

43- *Dawn*, February 6, 1951

44- *Ibid*; February 7, 1951

45- *Ibid*; February 8, 1951

46- *Ibid*; February 9, 1951

47۔ امروز۔9/فروری1951ء

48- *Dawn*, February 9, 1951

49- *Ibid*; February 10, 1951

50- *Ibid* February 10, 1951

51- *Ibid*; February 10, 1951

52۔ امروز۔12/فروری1951ء

53- *Dawn*, February 10, 1951

54- *Ibid*; February 11, 1951

55- *Ibid*; February 12, 1951

56- *Ibid*; February 12, 1951

57- *Ibid*; February 13, 1951

58- *Ibid*; February 12, 1951

59- *Ibid*; February 13, 1951

60- *Ibid*; February 14, 1951

61- *Ibid*; February 16, 1951

62۔ امروز۔22/فروری1951ء

63۔ ایضاً۔27/فرروی1951ء

64- *Dawn*, February 16, 1951

65- *Ibid*; February 20, 1951

66- *The Pakistan Times*, March 27, 1951

67- *Ibid*; March 3, 1951

68۔ امروز۔9/مارچ1951ء

69۔ ایضاً۔9/مارچ1951ء

70- *Speeches of Liaqat Ali Khan op.cit*; pp.537.538

71- G.H. Jansen, *Afro-Asia Non-alignment*, London,1966. p.107

72- *Dawn*. February 25, 1951

باب:11 مشرق وسطیٰ پر غلبہ کے لئے امریکہ اور برطانیہ میں کشمکش اور برطانیہ نواز لیاقت علی خان کا قتل

1- *Dawn*. March 20, 1951

2- *Ibid*; March 16, 1951

3۔ نوائے وقت۔23/مارچ1951ء

4۔ ایضاً۔19/مارچ1951ء

5۔ ایضاً۔20/مارچ1951ء

6- *The Pakistan Times*, March 23, 1951

7- *Dawn*, March 24, 1951

8- *Ibid*, March 24, 1951

9- *Ibid*; March 21, 1951

10۔ نوائے وقت۔13/مارچ1951ء

11۔ ایضاً۔28/مارچ1951ء

12۔ ایضاً۔23/مارچ1951ء

13- *The Civil and Military Gazette*, April 1, 1951

14- *The Pakistan Times*, April 3, 1951

15- *Dawn*, April 6, 1951

16- *Ibid*; April 7, 1951

17- *Ibid*; April 11, 1951

18- *Ibid*; April 21, 1951

19- *Ibid*; March 3, 1951

20۔ نوائے وقت۔11/اپریل1951ء

21- *Dawn*, February 16, 1951

22۔ جہاد۔18/اپریل1951ء

23- *The Pakistan Times*, April 28, 1951

24۔ جہاد۔یکم مئی1951ء

25- *The Pakistan Times*, May 3, 1951

26۔ جہاد۔2/مئی1951ء

27۔ ایضاً۔4/مئی1951ء

28- *The Pakistan Times*, May 2, 1951

29- *Ibid*; May 3, 1951

30۔ جہاد۔6/مئی1951ء

31۔ ایضاً۔6/مئی1951ء

32۔ ایضاً۔8/مئی1951ء

33- *The Pakistan Times*, May 9, 1951

34۔ جہاد۔20/مئی1951ء

35۔ ایضاً۔9/مئی1951ء

36- *The Pakistan Times,* May 12, 1951

37- *Ibid*; May 12, 1951

38- *Dawn*, May 13, 1951

39- *Ibid*; May 14, 1951

40- *Ibid*; May 16, 1951

41- *Ibid*; May 19, 1951

42- *Ibid*; May 23, 1951

43۔ جہاد۔23/مئی1951ء

44۔ ایضاً۔24/مئی1951ء

45- *Dawn*, May 24, 1851

46- *Ibid*; May 27 & 28, 1951

47- *Ibid*; June 2, 1951

48- *Ibid*; June 3, 1951

49- *Ibid*; June 8, 1951

50- *Ibid*; May 26, 1951

51۔ جہاد۔9رمئی1951ء

52- *Dawn*, May 15, 1951

53- *The Pakistan Times*, May 15, 1951

54۔ جہاد۔ 3رجون1951ء

55- *Dawn*, June 2, 1951

56- *Ibid*; June 11, 1951

57- *Ibid*; June 17, 1951

58- *Ibid*; June 21, 1951

59- *Ibid*; July 2, 1951

60- *The Pakistan Times*, June 6, 1951

60۔ نوائے وقت۔7رجون1951ء

61- *Dawn*, May 26, 1951

62- *Ibid*; May 26, 1951

63- *Ibid*; June 3, 1951

64- Aslam Qureshi, *op.cit*; Lahore 1976

65- *Dawn*, June 22, 1951

66- *Ibid*; June 23, 1951

67- *Ibid*; June 26, 1951

68- *Ibid*; July 8, 1951

69۔ جہاد۔29رجون1951ء

70۔ ایضاً۔30رجون1951ء

71۔ ایضاً۔3رجولائی1951ء

72۔ ایضاً۔7رجولائی1951ء

73- *Dawn*, July 8, 1951

74۔ جہاد۔9/جولائی 1951ء

75- *Dawn*, June 23, 1951

76۔ جہاد۔18/جون 1951ء

77۔ ایضاً۔3/جولائی 1951ء

78۔ ایضاً۔7/جولائی 1951ء

79۔ ایضاً۔12/جولائی 1951ء

80۔ ایضاً۔12/جولائی 1951ء

81- *Dawn*, July 12, 1951

82- *Ibid*; July 17, 1951

83- *Ibid*; July 17, 1951

84- *Ibid*; July 31, 1951

85- *Ibid*; August 5 & 7, 1951

86۔ امروز۔6/اگست 1951ء

87- *Dawn*, August 6, 1951

88- *Ibid*; August 23, 1951

89۔ نوائے پاکستان۔7/ستمبر 1951ء

90- *Dawn*, September 8, 1951

91۔ نوائے پاکستان۔11/ستمبر 1951ء

92- *Dawn*, September 8, 1951

93۔ نوائے پاکستان۔14/ستمبر 1951ء

94- *Dawn*, September 11, 1951

95- *Ibid*; September 13, 1951

96- *Ibid*; September 18, 1951

97۔ نوائے پاکستان۔6/اکتوبر1951ء

98۔ امروز۔26/ستمبر1951ء

99۔ امروز۔4/اکتوبر1951ء

100- *The Pakistan Times*, October 9, 1951

101۔ نوائے پاکستان۔12/اکتوبر1951ء

102- *The Pakistan Times*, October 11, 1951

103- Aslam Qureshi, *op.cit*; Lahore 1976

104۔ فضل مقیم خان۔تگ وتاز جاودانہ۔لاہوری1967۔ص175

باب:12 اسلامی اتحاد کی آڑ میں سامراجی عزائم کی تکمیل کے لئے پاکستان کے کردار کا اجمالی جائزہ(1947-51ء)

1۔ محمد ظفر اللہ خان۔تحدیث نعمت۔محولہ بالہ ص522

2۔ ایضاً۔ص525،526

3۔ ایضاً۔ص524

کتب (اردو)

فضل مقیم خان (میجر جنرل)۔تگ وتاز جاودانہ۔آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔لاہور 1967ء

محمد ظفر اللہ خان، (سر) چودھری۔تحدیث نعمت، ڈھاکہ۔بینوویلنٹ ایسوسی ایشن ڈھاکہ 1971ء

مودودی، سید ابوالاعلیٰ، اسلام اور جدید معاشی نظریات۔اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، لاہور۔1976ء

کتب (انگریزی)

Ali, Chaudhry Mohammad, *The Emergence of Pakistan*, Originally Published by Columbia University Press, New York & London 1967. Reprinted by The Research Society of Pakistan, University of Punjab, Lahore, 1973.

Bourke, White Margaret, *Halfway to Freedom*, Simon & Schuster, New York, 1949.

Burke, S.M., (1) *Mainsprings of Indian and Pakistani Foreign Policies*, Oxford University Press, Karachi, 1975

(2) *Pakistan's Foreign Policy*, Oxford University Press, Karachi, 1973

Chaudhry G.W. (1) *Pakistan's Relations with India (1947-1966)*; Pall Mall Press, London, 1968

(2) *India, Pakistan, Bangladesh and the Major Powers*; Collier Mcmillan Publishers, London 1975.

Gupta Sisir, *India and Regional Integration in Asia*, Asia Publishing House, Bombay, 1967.

Jansen, G.H; *Afro-Asia Non-alignment*, Faber & Faber, London, 1966.

Plame-Dutt, R. *The Crises of Britain and the British Empire*, Lawrence and Wishart Ltd., London, 1957.

Qureshi, M. Aslam, *Anglo Pakistan Relations 1947-76*, Research Society of Pakistan, Lahore, 1976.

Speeches And Statements of Quaid-i-Millat Liaquat Ali Khan 1941-51, Rafiq Afzal M.(Ed), Research Society of Pakistan, Lahore, 1975.

سرکاری دستاویزات ومطبوعات

اسلامی مملکتوں کے پاکستان سے تعلقات۔ایک جائزہ۔وزارت امور خارجہ، حکومت پاکستان، اسلام آباد 1977ء

Debates, The Constitutional Assembly (Legislature) of Pakistan (28th February) Vol-1, 1948, Karachi, 1948.

اخبارات وجرائد

امروز لاہور۔فائلیں۔برائے 1948ء، 1949ء، 1950ء، 1951ء

انقلاب لاہور۔فائلیں۔برائے 1948ء

جہاد لاہور۔فائل اپریل، مئی 1951ء

نوائے پاکستان لاہور۔ستمبر 1951ء

نوائے وقت لاہور۔فائلیں برائے 1947ء، 1948ء، 1949ء، 1950ء اور 1951ء

Dawn, Karachi, Files of 1947, 1948, 1949, 1950, and 1951

The NewYork Times, File of 1949.

The Pakistan Times, Lahore, Files of 1947, 1948, 1949, 1950, and 1951.

The Civil & Military Gazette, Files of 1949,1950

The Eastern Times, Lahore, Files of 1947

Time, The Weekly, October,1950

اشاریہ

ا

آ

ب

پ

چ

ح

خ

د

ذ

ر

ش

ع

غ

ف

ق

ن